بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلک آثارنا تدل علینا

فانظروا بعدنا الی الآثار

حضرت

مولانا اصغر علی روحی

قدس سرہٗ

احوال و آثار

اور

اُن کے عربی دیوانِ شعر کی جمع و ترتیب

بتحقیق و تنقیح

محمد ذوالفقار علی رانا

برائے امتحان پی ایچ، ڈی

زیرِ نگرانی: ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی مدظلہ العالی

سابق وائس پرنسپل و صدر شعبۂ عربی و اسلامیات، گورنمنٹ کالج، لاہور

۱۹۸۴ء

لا تنکرن إذا أهديت نحوك من علومك الغرّ أو آدابك النتفا

فقيّم الروض قد يهدى لصاحبه برسم خدمته من روضه التحفا

اِنتساب

میں اس ناچیز کوشش کو حضرت مولانا اصغر علی روحی علیہ الرحمۃ کے نامِ نامی اور اسمِ گرامی سے بصد ادب و عقیدت معنون کرتا ہوں

جن کے

خاندان سے وابستگی عربی زبان میں میرے ذوق و شوق کا موجب ہوئی اور جن کے سوانح اور اخلاقِ فاضلہ نے مجھ پر نہایت گہرے اثرات چھوڑے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

ہیچ میرز

علی

محمد ذوالفقار رانا

فہرست

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال	۴۱
بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں	۴۴
سر میاں محمد شفیع	۴۶
سر میاں فضل حسین	۴۷
چوہدری سر شہاب الدین	۴۹
شیخ سر عبد القادر	۵۰
مولانا کے ازدواجی حالات	۵۲
مولانا کی اولاد	۵۲
مولوی فضل حق مرحوم	۵۴
حافظ عبد الحق	۵۷
ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی	۵۸
ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا	۶۹
محمد مظہر الحق رانا	۷۰
وفات	۷۱

32

باب دوم

(سیرت و کردار)

مسلک	۷۴
امر بالمعروف و نہی عن المنکر	۸۱
اخلاقی جرأت اور دینی غیرت	۸۷
مذاہب باطلہ کا رد	۹۴
اہل اللہ سے عقیدت	۱۱۴
روزمرہ کے مشاغل	۱۲۱
زہد و تقویٰ	۱۲۹

7

مولانا کی زندگی کا روحانی پہلو	۱۳۹
رویائے صادقہ	۱۴۷
اخلاق و عادات	۱۵۱
مزاح وظرافت	۱۵۶

باب سوم

(تحریک ترکِ موالات)

تحریک ترکِ موالات	۱۶۶

باب چہارم

(علمی و ادبی خدمات)

مولانا مرحوم کی علمی و ادبی خدمات	۱۷۷
مافی الاسلام	۱۸۲
الجفاء و الوفاء	۱۹۱
امیر الکلام من کلام الامام	۱۹۳
الآیۃ الکبریٰ فی اسماء اللہ الحسنیٰ	۱۹۴
سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام	۱۹۶
تجلیات فی شرح الاشارات	۱۹۸
اطباق التردہ فی حل ابیات البردہ	۲۰۰
دبیر عجم	۲۰۲
العروض والقوافی	۲۰۶
تحفۂ شروان	۲۰۸
الہدائے	۲۱۱

باب پنجم

(گاؤں)

گاؤں کی زندگی		۲۱۹
گاؤں کے سربرآوردہ لوگ		۲۲۱

باب ششم

(شاعری)

فصل اوّل

(برصغیر پاک و ہند میں عربی شاعری)

برصغیر پاک و ھند میں عربی شاعری کا مختصر خاکہ			۲۲۳
مسعود سعد سلمان	المتوفی	۵۱۵ ھ	۲۲۸
حسن بن محمد صغانی	//	۶۵۰ ھ	۲۳۰
امیر خسرو دہلوی	//	۷۲۵ ھ	۲۳۳
نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودی	//	۷۵۷ ھ	۲۳٤
عبدالمقتدر بن محمود کندی	//	۷۹۱ ھ	۲۳٤
شیخ احمد بن محمد تھانیسری	//	۸۲۰ ھ	۲۳۷
شیخ زین الدین بن علی المعبری	//	۹۲۸ ھ	۲۳۸
شاہ احمد شرعی چندیروی	//	۹۲۸ ھ	۲۳۹
ابوالفیض فیضی	//	۱۰۰۴ ھ	۲٤۰
الشیخ احمد بن علی المالکی	//	۱۰۰۹ ھ	۲٤۱
شیخ عبدالقادر العیدروس	//	۱۰۳۸ ھ	۲٤۲
شیخ غلام نقشبند لکھنوی	//	۱۱۲۶ ھ	۲٤۳
مولانا السید عبدالجلیل بلگرامی	//	۱۱۳۸ ھ	۲٤٤
سید طفیل محمد بلگرامی	//	۱۱۵۱ ھ	۲٤۶

15

شیخ سید محمد یوسف بلگرامی	المتوفی	۱۱۷۲ھ	۲۴۷
شیخ الاسلام ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی	〃	۱۱۷۶ھ	۲۴۸
شیخ محمد بن عبد الجلیل بلگرامی	〃	۱۱۸۵ھ	۲۵۰
مولانا غلام علی آزاد بلگرامی	〃	۱۲۰۰ھ	۲۵۱
قاضی عبد القادر اورنگ آبادی	〃	۱۲۰۴ھ	۲۵۴
سید مرتضیٰ الحسینی الزبیدی	〃	۱۲۰۵ھ	۲۵۵
مولانا باقر بن مرتضیٰ المدراسی	〃	۱۲۲۰ھ	۲۵۶
شیخ قاضی احمد بن مصطفیٰ گوپاموی	〃	۱۲۳۴ھ	۲۵۷
شیخ عبد العزیز دہلوی	〃	۱۲۳۹ھ	۲۵۸
شیخ رفیع الدین دہلوی	〃	۱۲۴۹ھ	۲۵۹
شیخ اوحد الدین بلگرامی	〃	۱۲۵۰ھ	۲۶۱
سید احمد بن الحسن القنوجی	〃	۱۲۷۷ھ	۲۶۲
مولانا فضل حق خیرآبادی	〃	۱۲۷۸ھ	۲۶۳
مولانا علی عباس چڑیاکوٹی	〃	۱۳۰۲ھ	۲۶۴
مولانا یعقوب نانوتوی	〃	۱۳۰۲ھ	۲۶۵
مولانا فیض الحسن سہارنپوری	〃	۱۳۰۴ھ	۲۶۶
قاضی طلا محمد پشاوری	〃	۱۳۱۰ھ	۲۶۷
مولانا ذوالفقار علی دیوبندی	〃	۱۳۲۲ھ	۲۶۸
مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی	〃	۱۳۲۷ھ	۲۶۹
مولوی نذیر احمد دہلوی	〃	۱۳۳۰ھ	۲۷۰
مفتی عبد اللہ ٹونکی	〃	۱۳۳۹ھ	۲۷۲
مولوی احمد رضا خان بریلوی	〃	۱۳۴۰ھ	۲۷۳
حکیم اجمل خان دہلوی	〃	۱۳۴۶ھ	۲۷۵
مولانا سید انور شاہ کشمیری	〃	۱۳۵۲ھ	۲۷۶
مولانا کفایۃ اللہ دہلوی	〃	۱۳۷۲ھ	۲۷۷
سید سلیمان ندوی	〃	۱۳۷۳ھ	۲۷۹
متفرق			۲۸۰

فصل دوم

(مولانا روحی کے دیوان پر تنقید)

مولانا روحی کی شعر گوئی ۲۸۳

مولانا کی شعر فہمی ۲۹۲

نعتیہ قصائد ۳۰۰

مرثیہ نگاری ۳۰۲

متفرق نظمیں ۳۰۳

مولانا کا فارسی دیوان ۳۰۴

فصل سوم

(دیوان روحی علیہ الرحمۃ)

فی نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰۹

وبما قال مقرظًا ۳۱٤

قال مرتجلاً بمناسبۃ رجوع ابنہ الاکبر بعد زیارۃ خالہ الاکبر ببلدۃ سدنی فی استریلیا ۳۱۶

فی النصیحۃ والموعظۃ ۳۱۷

فی الغزل ۳۱۹

تاریخ تعمیر مدرسۃ قاسمۃ العلوم لاھور ۳۲۰

ولہ فی تاریخ وفات خواجہ محمد غوث الجشتی ۳۲۱

فی نعت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ۳۲۲

وقال حین ورود وفد المصریین ببلدۃ لاھور ۳۲۶

قال فی خیانۃ الدنیا متضمنًا ۳۲۸

اھدیٰ لہ السید عبد الحق حقی الاعظمی البغدادی الازھری (نزیل بلدۃ لاھور)

کتاب مقامات الزمخشری، فقال مرتجلاً ۳۲۹

بلیت بربوع الدین ۳۳۰

وقال عند خطب جلیل ۳۳۶

قال فی صباه	٣٣٧
ومما قال مرتجلاً فی السفیر العثمانی	٣٣٨
وقال فی وفد المصریین	٣٣٩
وقال یرثی القاضی حمید الدین اللاهوری	٣٤٠
وقال حین ورود بعض رؤسا الترك وهو یصافحه	٣٤٣
وقال یتشوّق إلی صاحب الطیبة علیه افضل الصلوات	٣٤٤
حفظ اللسان	٣٤٥
سماط الله واسع	٣٤٦
العرف یسترقّ	٣٤٧
ومما ترجم مرتجلاً	٣٤٨
طوبی لقوم جاهدوا	٣٤٩
وقال مرتجلا یمدح ابابکر محمد بن یحیی الصولی مؤلف ادب الکاتب	٣٥١
جاء هذه الابیات فی قصیدته النعتیة فی اللغة الفارسیة وهی مطبوعة	٣٥٢
وقال فی بعض المتنبئین فی الهند	٣٥٣
تاریخ عمارة المسجد الذی بناه القوم	٣٦٢
ارسل الیه بعض الادباء قصیدته النعتیة من بلدة بهائی بشمال الهند فطرب	-
بها وکتب الیه مرتجلاً	٣٦٣
تب قبل الممات	٣٦٥
وله یناجی ربّه	٣٦٦
وقال یرثی	٣٦٧
قال مرتجلاً فی وصف الکتاب العزیز	٣٧٠
فی ردّ منکری الحدیث	٣٧١
ومما قال مرتجلا فی الحسین البلجرامی	٣٧٢
قال فی وفد المصریین	٣٧٤
فی وصف الربیع	٣٧٥
ومما قال فی بعض احواله	٣٧٦
41 یوجد هذا البیت فی نظمه بالفارسیة وهو معنون "بانگ درا" وهو مطبوع	٣٧٧

المعاصی والمغفرة ۳۷۸
قال بمناسبة الحفلة السنویة للمدرسة النعمانیة بلاهور ۳۷۹
ومما قال مقرظاً (عذب المناهل لعطاش الکامل (للمبرد) للمولوی نور الحق العلوی) ۳۸۳
وله فی تاریخ طبع الوشاح علی عروض المفتاح
تألیف القاضی ظفر الدین احمد استاذ دار العلوم الشرقیة لاهور ۳۸۵
قال یخاطب مبشری النصاری ۳۸۶
فی رد منکری الحدیث ۳۸۸
ومما کتب إلی بعض الفضلاء ۳۸۹

فصل چہارم

(نثر)

۳۹۱—۳۹۲

خطبة القاها فی بعض نوادی القوم ۳۹۳
خطبة القاها فی ندوة العلماء فی شهر رجب ۱۳۱۸ھ بعظیم آباد پٹنہ وقد
طبعت فی مجلة هذا المجلس ۳۹۵
مقدمة کتاب الآیة الکبری فی شرح اسماء اللّٰہ الحسنیٰ ۳۹۸
تقریظ علی کتاب حسن الجہد فی شرح قصیدة البردہ
للمولوی عبد المالک ۳۹۹
تقریظ علی الرسالة الموسومة باحسن المقال فی عدم اعتبار الخط فی
رؤیة الهلال مؤلفه مولانا مولوی عبد الرزاق ۴۰۰

فہرست الملحقات

باب اوّل

(تقاریظ)

احکام شب براءۃ	٤٠٢
ارکان خمسہ	٤٠٣
اسرار التنزیل	٤٠٤
اسلام کی پہلی و دوسری کتاب	٤٠٥
اسلام کی حسنات - اسلام کی حمایت - اسلام کا اتالیق - علاج مصیبت - قال الرسول	٤٠٦
اسلام کے عقائد - اسلام کی خوبیاں - اسلام کی ترقی	٤٠٧
اسلام میں نکاح بیوگان	٤٠٨
اصول علاج المائیہ	٤١٠
اطباق التردہ فی حل ابیات البردہ	٤١١
الامامۃ بالعمامۃ و الصلوۃ بالمروحۃ	٤١٢
انوار آفتاب صداقت	٤١٤
انوار الصوفیہ	٤١٦
انوار القدسیۃ	٤١٧
انیس الطالبین	٤١٨
برق اسلام بر ترک اسلام	٤١٩
بشارت محمدیہ	٤٢٠
البلاغۃ	٤٢١
پند جامی	٤٢٢
تاریخ سلاطین ہند	٤٢٤

١٩

عنوان	صفحہ
تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان	۴۲۵
التسہیل فی حل الواب التنزیل	۴۲۶
تعزیرات ہند وضابطہ فوجداری	۴۲۷
تفسیر نبوی	۴۲۸
تمرینات النحو	۴۲۹
توحید مقبول	۴۳۰
جدید صرف بہائی	۴۳۱
جلوۂ حق	۴۳۲
حکمت	۴۳۳
چہل حدیث	۴۳۴
خزینۃ المیراث	۴۳۵
خطبات الاسلام للجمعۃ والایام العظام	۴۳۶
خوارق البوارق	۴۳۸
دانائی کا سبق - نالۂ صدر	۴۳۹
دیوان طرزی	۴۴۰
الذکر الحکیم	۴۴۱
رسوم جاہلیت	۴۴۲
ریاض الاخبار	۴۴۳
الزہر الجنی من ریاض المیمنی	۴۴۴
ستہ ضروریہ	۴۴۵
سفرنامہ بلاد اسلامیہ	۴۴۶
شرح آئینہ عجم	۴۴۷
شرف المحترفین	۴۴۸
صابون سازی	۴۴۹
صحیفہ ادب	۴۵۰
الصنعت	۴۵۱
عذب المناہل لعطاش الکامل	۴۵۲

A6

عربی بول چال حصہ اول ٤٥٤

عربی بول چال حصہ دوم ٤٥٥

عزیز القلوب ٤٥٦

عصر جدید ٤٥٧

عقد انامل ٤٥٨

غایۃ المراد فی احتفال المیلاد ٤٦٠

القاسم ٤٦٢

قاعدہ عربی و سیپارہ الم ٤٦٣

قبسۃ الخاطی الشادی و جذوۃ شاطی الوادی الایمن ٤٦٤

قرآن مجید (مطبوعہ انجمن حمایت اسلام) ٤٦٦

کاشف الرموز شرح موجز ٤٦٨

کاشف العلوم ٤٦٩

الکتاب المجید فی وجوب التقلید ٤٧٠

گنجینہ حقیقت اسلام ٤٧١

مجمل ٤٧٢

مجموعہ خطب الاسلام ٤٧٣

محرم کی بدعتیں - اسلام کے نواہی ٤٧٤

محشرستان خیال ٤٧٥

مراد العاشقین ٤٧٦

مژدہ ہدیہ پیغمبری یعنی تفسیر مظہری ٤٧٧

مسلمان ٤٧٨

مصابیح الظلام ٤٧٩

مفصل ٤٨٠

النحو الجدید ٤٨١

نسخہ نصر المقلدین ٤٨٢

نعم التعویذ ٤٨٥

نماز مترجم ٤٨٧

نموذج الخطب ۴۸۸
واہ فیض ہدایت ۴۸۹
الہادی ۴۹۰
ہدایۃ الانسان إلی سبیل العرفان ۴۹۱
ھدایۃ الفریقین فی بیان ذکر شہادۃ الحسین ۴۹۲

باب دوم

(فتاوی)

پیغمبر علیہ السلام پر صدقہ کیوں حرام تھا؟ ۴۹۶
انگریزی شفاخانوں میں جن ادویہ کا استعمال ہوتا ہے ان میں عموماً کچھ نہ کچھ شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔ نیز ولایت سے جو مختلف قسم کی مرہمیں تیار ہوکر آتی ہیں۔ ان میں اکثر خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے۔ کیا مسلمانوں کو ایسی ادویہ یا مرہموں کا استعمال شرعاً جائز ہے؟ ۴۹۷
ایک اعتراض اور اس کا جواب (حکم پردہ کے متعلق) ۵۰۰
جناب پیغمبر علیہ السلام خطبۂ جمعہ میں کیا پڑھا کرتے تھے اور کس قدر؟ ۵۰۴
کیا مقلد حنفی مقلد شافعی کی نماز میں اقتدا کرسکتا ہے اور مقلد کا غیر مقلد کے پیچھے اور بالعکس نماز پڑھنا صحیح ہے؟ ۵۰۶
دو شخص پہلے اور بعد دو شخص دوسرے باری باری سے جنازہ کے آگے لا الہ الا اللہ نہایت بلند آواز سے کہتے چلتے ہیں جنکی آواز دو دو میل تک سنائی دیتی ہے کیا یہ عمل شرعاً جائز ہے؟ ۵۰۸
عورت کو جنازہ کے ساتھ قبرستان میں جانا چاہیے یا نہیں؟ ۵۰۹
خاوند کو عورت کے مرنے پر اسکی میت کو ہاتھ لگانا درست ہے یا نہیں؟ ۵۱۰

ایک شخص جو پیری و مریدی کرتا ہے اور اپنے مریدوں کی حرام یا مشتبہ کمائی کو حلال سمجھ کر ان کے ہاں ضیافتیں کھاتا اور نذر و نیاز لیتا ہے۔ شرعاً کس امر کا مستوجب ہے؟ نیز وہ شخص نا محرم عورتوں سے بھی نشست و برخاست کرتا ہے۔ ۵۱۱

ایک شخص اپنی آمدنی کو شریعت کے حصص معیّنہ کے مطابق اپنے اہل و عیال اور دیگر اقارب میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے اس کے والدین اور بیوی اور بال بچوں کو کیا ملنا چاہیئے؟ ۵۱۳

ایک شخص نے ایک مطلقہ عورت کی طلاق سے دو تین دن بعد ہی نکاح کر لیا۔ آیا کہ یہ نکاح شرعاً درست ہے؟ یہ عورت حاملہ بھی ہے جو نکاح سے پہلے ایک عرصے سے اپنے خاوند سے علیحدہ رہتی تھی ۵۱٤

کسی مرہونہ چیز مثلاً مکان یا زمین قابلِ کاشت سے فائدہ اٹھانا جائز ہو یا ناجائز؟ ۵۱۵

وحدت الوجود کے بڑے بڑے ماننے والوں کے نام تحریر فرمائیے اور اس مسئلہ میں حق کیا ہے؟ ۵۱٦

شریعت میں زلزلہ کی کیا حقیقت بتلائی گئی ہے؟ ۵۱۸

تصویر کے استعمال کا شرعاً کیا حکم ہے؟ ۵۱۹

ایک نومسلم کو یہ دھوکا دیا گیا کہ کفر کی حالت کا تمہارا نکاح صحیح نہیں، از سر نو نکاح پڑھواؤ۔ چنانچہ اس کو الفاظ "امرأتی طالق" تلقین کئے گئے۔ اس بے چارہ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس نے اس خیال پر کہ شاید اسلام لانے پر ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حسب تلقین وہ الفاظ کہہ دیئے۔ کیا از روئے شریعت ایسی طلاق واقع ہو گئی اور اب اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ بینوا توجروا۔ ۵۲۱

ھندو یا غیر مسلم دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑوں سے نماز جائز ہے یا نہیں؟ ۵۲۳

ولایت سے جو صابن آتا ہے اس کے استعمال کا شرعاً کیا حکم ہے؟ ۵۲٤

کوئی شخص روپیہ امانت چھوڑ گیا۔ کیا امین کو اس امانتی روپیہ سے تجارت

کرنا جائز ہے؟ ۵۲۴

خطبہ جمعہ میں بادشاہ اسلام کے لئے دعا کا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ۵۲۵

ایک صاحب بصورت سوال تحریر فرماتے ہیں کہ حاملانِ دین کے مفہوم میں کون کون لوگ شامل ہیں؟ ۵۲۵

سجدہ تلاوت قرآن کس طرح ادا کیا جائے۔ آیا یہ سجدہ واجب ہے یا سنت؟ ۵۲۹

بہشت موعود آسمان پر ہوگا یا اسی زمین پر؟ ۵۲۹

نماز میں جو تشہد پڑھا جاتا ہے وہ شب معراج میں متعین ہوا تھا۔ پہلے اس سے لوگ کیا پڑھا کرتے تھے؟ ۵۲۹

امام جماعت میں ہو اور باہر سے کسی شخص کے آنے کی آہٹ معلوم کرکے رکوع میں انتظار کر سکتا ہے اس خیال پر کہ وہ آنے والا رکعت میں شامل ہو جائے؟ ۵۳۰

نماز ظہر کے وقت کا اندازہ لگانے میں سایہ کا مثل واحد تک اعتبار کرنا چاہئے یا دو مثل تک؟ قول مفتی سے آگاہ فرماویں۔ ۵۳۱

نکاح متعہ کا کیا حکم ہے؟ ۵۳۳

زید عشر ادا کرتا ہے کیا اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہے اور نیز بالعکس؟ کیا معروض پر بھی عشر واجب ہے؟ کوئی شخص اگر عشر ادا کرے اور غلہ کو بیچ کر روپیہ بنالے تو اسی روپیہ پر پورا سال گزر جانے سے زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب ہوگا؟ ۵۳۶

بلی جو انڈے چٹ کر جائے اور اذیت پہنچائے اس کا قتل جائز ہے یا نہیں؟ ۵۳۶

کیا آیہ ولقد همت به وهم بها...... الخ سے یوسف علیہ السلام کا کسی قسم کے گناہ کا مرتکب ہونا پایا جاتا ہے؟ مدلل بیان فرمائیے کیونکہ خاکسار کو ایک صاحب بار بار ملزم قرار دیتے ہیں میں نے حتی الوسع جواب دیا ہے مگر وہ نہیں مانتے۔ جواب قرآن شریف میں سے ہونا چاہئے۔ ۵۳۷

کیا کسی قرآنی آیت یا حدیثِ صحیح سے اس امر کا پتہ لگ سکتا ہے کہ

دنیا کی مدت عمر کس قدر ہے؟ حالانکہ میرزا قادیانی کے مرید اس امر کے مدعی ہیں کہ دنیا کی مدت سات ہزار سال ہے۔ چنانچہ میرزا مذکور نے اپنے مسیح ہونے کی دلیل اسی خیال پر قائم کی ہے۔ بینوا توجروا۔ ۵۴۰

ایک شخص کہتا ہے کہ اجنبی عورتوں میں نشست و برخاست کرنے اور علیحدہ خلوت میں ان کے ساتھ موجود ہونے سے اس کو شیطانی وساوس اور دیگر امور ممنوعہ کی بابت اطمینان ہے اس لئے وہ مطلقاً اجتناب نہیں کرتا۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ ۵۴۲

تاریخ اسلامی شہادت دیتی ہے کہ زمانۂ معراج نبی صلعم میں مسجد اقصیٰ ویران پڑی تھی۔ پھر قرآن مجید کی آیت "سبحان الذی اسریٰ بعبدہ .... الخ کی صحیح توجیہ کیا ہوگی؟ یہ اعتراض درحقیقت ایک غیر مذہب کے مخالف کا ہے مگر عوام الناس کے اطمینان کے لئے جواب کی ضرورت ہے۔ ۵۴۳

مستورات کے لئے لکھنا سیکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ ۵۴۴

آیۂ فلما آتاھما صالحاً کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے بعض توجیہات قلمبند کی ہیں جو معترض کے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔ اس آیۂ شریفہ کی تفسیر بروجہ تفصیل لکھیں تاکہ تسلی ہو کیونکہ اس آیت کے رو سے آدم اور حوا علیہما السلام کا مشرک ہونا لازم آتا ہے۔ معاذ اللہ۔ ۵۴۵

حدیث لو علم العباد ما فی رمضان لتمنت امتی ان یکون رمضان السنۃ کلھا کی بابت محدثین نے کیا لکھا ہے؟ بعض واعظین اسکو وعظ میں سنایا کرتے ہیں۔ کیا بصورت اس کے موضوع یا ضعیف ہونے کے ایسا جائز ہے؟ ۵۴۷

فرقہ باطنیہ (جس کا ذکر کبھی کبھی الھدیٰ میں ضمناً آیا ہے) کے عقائد کیا تھے اور کیا اب بھی اس فرقے کے لوگ پائے جاتے ہیں ۵۴۷

اراضی وقف میں پیپل کا درخت ہے متولی کو اس کا خرید کرکے اپنے مصرف میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ ۵۵۳

مالِ زکوٰۃ سے آلات طبابت خرید کرکے کسی طبیب کے

تصرف میں دے دیا تاکہ عوام کو فائدہ پہنچے اور خود زکوٰۃ دینے والا بھی گاہے
گاہے منتفع ہو۔ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ ۵۵۳

زید اپنے پدر بکر کی وصیت کے مطابق خالد کو حج بدل کرنے کے لئے بیت
اللہ شریف کو روانہ کرتا ہے۔ تب اخراجات ضروریہ کے علاوہ خالد
کو اس سفر پر اجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟ ۵۵۴

ملک ہندستان (جس میں اسلامی ریاستیں بھی داخل ہیں) کی
اراضیات عشری ہیں یا خراجی اور ان میں کیا امتیاز ہے؟ ۵۵۴

ہندستان دار الحرب ہے یا نہیں اور بینک سود کا حکم شرعی کیا ہے؟ ۵۵۵

کیا آیہ یا معشر الجن والانس الم یأتکم رسل منکم ....
.... الخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوع جن میں جن انبیاء مبعوث
ہوئے ہیں؟ ۵۵۵

زکوٰۃ کا روپیہ ان لڑکوں کو جو مدرسہ میں پڑھتے ہیں یا مہتمم مدرسہ
کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۵۵۶

کیا قرآن مجید کی تفسیر جو بعض اخبارات لکھتے ہیں پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ ۵۵۶

کیا زمین کی پیداوار سے ہندستان کے لوگوں پر عشر کا ادا کرنا واجب
ہے اور کس کس چیز پر عشر ادا کرنا چاہیے؟ ۵۵۶

جب اسماء الرجال کی مختلف کتابوں میں ایک راوی کو قابل اعتبار لکھا
ہے اور اسی کو دوسری کتاب میں دروغ گو لکھا ہے تو کیوں کر صحیح
اور غلط کی تمیز ہو سکتی ہے؟ اور اسی بنیاد پر سید صاحب نے
حدیث پر چنداں اعتبار نہیں کیا۔ ۵۵۷

امام ہمام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں
میں لکھا ہے اور علماء شافعیہ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ چالیس
برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ کیا یہ صحیح ہے؟ ۵۵۸

کیا نزول مسیح کی حدیث مرزا قادیانی کی مؤید ہے؟ ۵۵۹

ایک شخص قدم عالم اور آریہ مذہب کے مطابق لامتناہی کا
قائل ہے۔ اس کا جواب درکار ہے۔ ۵۶۲

ذات باری سبحانہ کو تمام افراد انسانی سے یکساں تعلق ہے کیونکہ

سب کے سب اسی کے مخلوق ہیں۔ پھر کسی کو اعلیٰ کسی کو ادنیٰ بنانے میں کیا حکمت ہے یا بعض افراد عیش و آرام میں نظر آتے ہیں اور بعض رنج و تکلیف میں اس کی کیا ضرورت ہے؟ جواب استدلال عقلی پر مبنی ہونے کے پیرایہ میں۔ ۵۶۵

آلہ گراموفون وغیرہ میں جو ایک نئی ایجاد ہے۔ آیات قرآنیہ یا درود شریف یا اور کوئی مذہبی کلام کی آواز بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ۵۷۲

بیمہ زندگی کرانے کے بارے میں فتویٰ ۵۷۳

کیا زید کی بہن رضاعی سے زید کا باپ نکاح کر سکتا ہے؟ ۵۷۴

زید کچھ عرصہ سے دیوانہ ہے۔ اسکی عورت اپنے نان و نفقہ کے لئے محتاج ہے۔ زید کچھ وجہ معاش نہیں رکھتا۔ نہ اسکی کوئی جائداد ہے کیا اسکی عورت شرعاً دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے؟ ۵۷۴

ہمارے گاؤں میں اکثر ناخواندہ لوگ نکاح کے وقت ایک ایسی فرضی رقم مہر کی مقرر کر دیتے ہیں جس کو خاوند ادا نہیں کر سکتا اور اس سے صرف دنیوی نمائش مقصود ہوتی ہے۔ کیا شریعت میں حق مہر کی کوئی مقدار معین ہے؟ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کیا ہونی چاہئیے؟ ۵۷۴

اکثر جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ ان کے ہاں رسمی پیر سالانہ نذرانہ لینے کے لئے آنکلتے ہیں اور زکوٰۃ کا روپیہ وصول کر لیتے ہیں یا خوش عقیدہ لوگ خود اپنی مرضی سے زکوٰۃ کی نیت پر انہیں کچھ دے دیتے ہیں۔ کیا اس طرح پر زکوٰۃ شرعاً ادا ہو جائے گی۔ ۵۷۵

مجلس میلاد شریف کا انعقاد کیوں کر اور کس زمانہ سے شروع ہوا؟ ۵۷۶

ایک شہر میں متعدد مسجدوں میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ ۵۷۸

عام طور پر یہ بات مروج ہے کہ عند الضرورت کسی دوسرے شخص سے غلہ گندم یا جو یا نخود موجودہ نرخ سے کم نرخ پر بطور ادھار (نسیہ) لیا جاتا ہے اور مدت معینہ گزرنے پر قیمت ادا کی جاتی ہے کیا شرعاً ایسی بیع جائز ہے؟ ۵۷۸

تصویر روضۂ نبوی علی صاحبہا التحیۃ والسلام بغرض حصول ثواب

جائز ہے یا نہیں؟ ۵۷۸

بازاری عورت نے اپنی حرام کی کمائی سے مسجد بنوائی ہے کیا اس میں نماز جائز ہے؟ ۵۷۹

جھینگا جو بنگال میں بکثرت کھایا جاتا ہے حلال ہے یا حرام؟ ۵۸۰

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی کا مذہب در بارہ تقلید صحیح طور پر اگر آپ کو معلوم ہو تو ارقام فرماویں کیوں کہ اُن کے بعض رسائل سے تقلید کے برخلاف مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ ۵۸۰

مولود شریف کی مجلس میں قیام اور خوشبوئی کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ ۵۸۱

عورت اپنے خاوند کے گھر سے بلا اجازت اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو اس صورت میں مہر خاوند کے ذمہ واجب الادا ہوگا؟ ۵۸۲

فوٹو کی تصویر کا شرعاً کیا حکم ہے؟ ۵۸۲

مجلس مولود اور اس میں قیام کا کیا حکم ہے؟ ۵۸۳

بعض لوگ کفار افسروں کو تحف و نذرانہ بعض تقریبات پر دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ ۵۸۳

تصور شیخ کا ثبوت شرعی کیا ہے؟ ۵۸۳

اگر زید کی زوجہ نے زنا کیا ہو تو کیا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا؟ ۵۸۴

مردہ کے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں پر جمع ہونا اور کھانا تصدق کرنا درست ہے یا نہیں؟ ۵۸۴

ایک نابالغہ کی چچی نے اس کا نکاح کسی نابالغ سے کر دیا۔ کیا نابالغہ کو بلوغ پر حق فسخ حاصل ہے؟ ۵۸۴

حدیث "اول ما خلق اللہ نوری" سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ وجود باوجود جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمیع حضرات انبیاء علیہم السلام سے آخر میں ظہور پذیر ہوا۔ ۵۸۵

نُصیریہ کون ہیں اور ان کے کیا عقائد ہیں؟ ۵۸۷

ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور تاریخ نکاح سے ساڑھے چھ ماہ کے قریب ایک لڑکی پیدا ہوئی اور وہ شخص مر گیا۔ اب وارثوں میں جھگڑا ہے کہ وہ لڑکی متوفی کی دختر ہوگی یا نہیں؟ ۵۸۸

ایک شخص نے اپنی عورت کو ناراض ہو کر یوں کہہ دیا۔ میری طرف سے تجھے طلاق اور طلاق اور طلاق اگر خدا کو منظور ہوا تو یونہی ہوگا۔ کیا عورت پر طلاق پڑ جائے گی؟ ۵۸۸

ایک مسلمان دکاندار سے جب کوئی شخص روپیہ کا خوردہ (توڑ) لیتا ہے تو تین پائی بطور معاوضہ کے لے لیتا ہے۔ آیا از روئے شریعت دکاندار کو ایسا منافع لینا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔ ۵۸۹

اگر عورت نے اپنا مہر خاوند سے نہ لیا ہو اور عورت اور خاوند ہر دو مر جائیں تو کیا عورت کے ورثاء کو خاوند کی جائداد سے مطالبہ کا حق شرعاً حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔ ۵۸۹

جناب پیغمبر علیہ السلام کی کتنی اولادیں تھیں اور کس تفصیل کے ساتھ؟ ۵۹۰

خون اور خنزیر کی حرمت شرعی اور ربوٰ کی حرمت کس مصلحت پر مبنی ہے؟ ۵۹۱

جو شخص فری میسن ہو جائے اسکی نسبت شریعت اسلامی کیا حکم دیتی ہے؟ ۵۹٤

کیا تناسخ الارواح کے بطلان میں کوئی آیت آچکی ہے؟ ۵۹۵

تصوف میں شریعت کے علاوہ کوئی نئی بات ہوتی ہے یا صرف شریعت کی کامل پابندی کا نام ہے اور اگر کوئی شخص شریعت کی پوری پابندی کر لے تو پھر کسی شیخ کی بیعت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب مفصل تحریر فرمائیے کیوں کہ بعض صاحبان بیعت کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ ۵۹۷

باب سوم

(تاثرات)

فصل اوّل

(تلامذہ)

میاں امیر الدین ۶۱۰
بشیر احمد شبلی مرحوم ۶۱۱
حفیظ اللہ ۶۱۳
شیخ سردار علی ۶۱۴
پروفیسر میاں شمس الدین ۶۱۷
میاں شمس الدین مرحوم ۶۲۳
مولانا ظفر اقبال ۶۳۱
عبد البشیر آذری مرحوم ۶۳۵
عبد الحمید مرحوم ۶۳۹
ماسٹر عبد الرحیم ۶۴۰
پروفیسر عبد القیوم ۶۴۱
چوہدری عبد المجید ۶۴۵
شیخ عبد الواحد یوسفی ۶۴۶
خواجہ عبید الرحمٰن ۶۴۹
ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ ۶۵۱
مولانا غلام رسول مہر مرحوم ۶۵۳
چوہدری شیخ محمد بٹالوی ۶۶۸
شیخ محمد امین ۶۶۹
مولوی محمد بخش مسلمؔ ۶۷۴
محمد حسین ملک ۶۷۸
میجر (ریٹائرڈ) ملک محمد خاں ۶۸۲
مولوی محمد شفیع مرحوم ۶۸۵
محمد علی ملک مرحوم ۶۸۹
محمد نصیر ہمایوں مرحوم ۶۹۲
چوہدری محمد یعقوب ۶۹۲
مولا بخش خضر تمیمی مرحوم ۶۹۳
سید ناصر حسین رضوی ۶۹۶
سید نذیر نیازی مرحوم ۶۹۸
محمد الدین رضوانی مرحوم ۷۰۰

فصل دوم
(معاصرین)

حفیظ جالندھری مرحوم ۷۰۱
دلاور علی المعروف میرزا ادیب ۷۰۲
سعید شبلی ۷۰۹
قاضی سید احمد ۷۱۰
مولانا عبدالعزیز المیمنی مرحوم ۷۱۱
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ۷۱۲
مولانا علم الدین سالک مرحوم ۷۱۵
عنایت اللہ چشتی ۷۱۸
مولانا غلام مرشد مرحوم ۷۱۹
پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری ۷۲۰
ڈاکٹر پیر محمد حسن ۷۲۱
میاں محمد شفیع (م۔ش) ۷۲۲
بدر محی الدین (سجادہ نشین) ۷۲٤

فصل سوم
(اہلِ محلہ)

میاں حبیب اللہ عرف میاں عبدالباقی ولد میاں قدرت اللہ مرحوم ۷۲۶
خلیل الرحمٰن کاتب ولد میاں قدرت اللہ مرحوم ۷۳۷
میاں عبدالعزیز مرحوم ۷٤۰
غلام محی الدین ۷٤۲

محمد اختر ولد محمد عبداللہ مرحوم ۷۴۳
میاں محمد اصغر مرحوم ۷۴۸
میاں محمد حنیف خلف میاں عبدالغنی مرحوم نمبردار ۷۴۹
میاں محمد سعید ۷۵۲
محمد شفیع ولد میاں غلام نبی مرحوم ۷۵۵
محمد شفیع ولد حاجی دین محمد مرحوم ۷۵۸
محمد عبداللطیف ۷۶۰
محمد عثمان فاروقی ۷۶۱
محمد عزیز الرحمٰن ۷۶۲
حکیم معراج دین بٹ مرحوم ۷۶۳
شیخ مقبول احمد ۷۶۵
شیخ نثار احمد مرحوم ۷۶۶
میاں نجم الدین مرحوم ۷۶۸
نسیم حسین انصاری ۷۷۱
میاں عبدالغنی مرحوم ۷۷۷

فصل چہارم
(اہلِ خانہ)

فضل حق مرحوم ۷۷۹
بیگم فضل حق مرحوم ۷۷۹
حافظ محمد عبدالحق ۷۸۲
ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی ۷۸۳
ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا ۷۸۴
محمد مظہر الحق رانا ۷۸۵

قاضی نعیم الرحمٰن ۷۹۱
قاضی افضال ربانی ۷۹۴

فصل پنجم
(متفرقات)

ڈاکٹر قریشی احمد حسین احمد قلعداری ۷۹۶
حامد علی خاں ۸۰۱
جسٹس ذکی الدین پال ۸۰۳
ذوالفقار علی ۸۰۴
مولانا عطا محمد چشتی ۸۰۵
غلام جیلانی اصغر ۸۰۶
صوفی فضل کریم نقشبندی مجددی ۸۰۸
صاحبزادہ محبوب عالم ۸۰۸
محمد اشرف ۸۰۹
حافظ محمد افضل فقیر ۸۱۰
حافظ محمد شفیع مگھیانوی ۸۱۰
قریشی محمد عبداللہ شاہ مرحوم ۸۱۲
چوہدری محمد علی ۸۱۵
حافظ محمد مظفر ۸۱۶
ڈاکٹر نذیر احمد ۸۱۷

باب چہارم

(مطبوعہ مواد)

اردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز) لاہور	۸۲۱
اردو ڈائجسٹ	۸۲۱
ارکان خمسہ	۸۲۲
استقلال	۸۲۳
اسلام زندہ باد	۸۲۴
الاشراق / لاہور	۸۲۴
الاعلام / لاہور	۸۲۴
اقبال اور انجمن حمایت اسلام	۸۲۴
اقبال کی صحبت میں	۸۲۵
اقبال نامہ	۸۲۶
انجام آتھم	۸۲۶
انجمن نعمانیہ لاہور کا ماہواری رسالہ	۸۵۹
ائمۂ تلبیس	۸۲۶
بینات کراچی	۸۲۷
پرشین کمیونیکیشن	۸۲۹
تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند	۸۲۹
تذکرہ اکابر اہل سنت (پاکستان)	۸۲۹
تذکرہ علماء اہل سنت و جماعت	۸۳۲
تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی)	۸۳۲
تذکرہ علمائے پنجاب	۸۳۲
تعارف نامہ	۸۳۴
تفسیر روحی	۸۳۴

۳۷

روزنامہ جنگ لاہور	۸۳۶
خزینۂ معرفت	۸۳۷
دائرۃ الاصلاح لاہور کی پنج سالہ کارگزاری	۸۳۷
لاہور کے دو قدیم صوفی	۸۳۷
روئداد انجمن نعمانیہ	۸۳۸
رئیس قادیان	۸۳۸
سب رنگ ڈائجسٹ	۸۳۸
سبیل الرشاد	۸۵۹
روزنامہ سراج الاخبار جہلم	۸۳۹
سوانح مرحوم خواجہ دل محمد ایم اے	۸۳۹
سیرت بلال رض	۸۳۹
شعر العرب فی الگجرات	۸۴۰
ضیائے حرم	۸۴۰
عصر جدید	۸۴۱
علمائے ساہو والا (سیالکوٹ) کا ایک غیر مطبوعہ تذکرہ	۸۴۱
فارسی گویان پاکستان	۸۴۲
الفقیہ امرتسر	۸۴۵
فیصلہ کن مناظرہ	۸۴۶
الکاویہ علی الغاویہ	۸۴۶
کریسنٹ	۸۴۶
گلزار ادب یعنی ضمیمہ کلیات گوشہ نشین	۸۴۸
مختصر تاریخ انجمن حمایت اسلام لاہور	۸۴۹
مرآۃ التصانیف (جلد اول)	۸۵۰
روزنامہ مشرق لاہور	۸۵۲
مقالات دینی و علمی	۸۵۲
میرے حضور	۸۵۳
ندائے ملت	۸۵۳

۹ غ

نقوش ۸۵۳

THE PAKISTAN TIMES ۸۵۵

روزنامہ نوائے وقت ۸۵۵

مراجع ۸۶۱

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ الطاہرین والطیبین والعاقبۃ للمتقین۔

ذاتِ باری کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے پردۂ غیب میں بعض ایسے امور مقدّر کر رکھے ہیں جن کا انسان کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا اور جب وہ امور ہمارے سامنے آتے ہیں تو منعمِ حقیقی کی حکمتوں اور قدرتوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کو کبھی نہ کبھی ایسے ہی بعض واقعات سے دوچار ہونے کا موقع ضرور ملتا ہے یہی بات مجھ پر بھی صادق آئی اور آج سے دس بارہ سال پہلے میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے میری آئندہ زندگی کا دھارا ہی بدل دیا۔ میں جس محلہ میں رہتا تھا وہاں اپنے ایک اور بھائی اور والد صاحب کے ہمراہ قریبی مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتا تھا اور نماز بھی بڑی باقاعدگی سے ادا کی جاتی تھی۔ محلہ کے لوگوں اور اپنے گھر والوں سے بھی میں نے مولانا اصغر علی روحی علیہ الرحمۃ سے متعلق بعض باتیں سُن رکھی تھیں اور مجھے افسوس ہوتا تھا کہ میں ایسے شخص کی زیارت نہ کر سکا۔ ورنہ شاید میں اپنی زندگی میں مزید کامیابیاں حاصل کرتا۔ کیونکہ سب لوگ یہ کہتے تھے کہ مولانا مرحوم کی خدمت میں جو بھی حاضر ہوتا اُسکی زندگی دینی و دنیوی لحاظ سے نہایت کامیاب سمجھی جاتی تھی۔ یہ وہی مسجد تھی جس میں مولانا مرحوم قریباً چالیس سال تک امامت و خطابت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

حسنِ اتفاق سے مجھے آہستہ آہستہ یہ پتہ چل گیا کہ مولانا مرحوم اُس مسجد کے متّصل فلاں مکان میں رہا کرتے تھے اور اُن کے اہل و عیال ابھی تک اُسی مکان میں مقیم ہیں۔ اُن کے ایک فرزند ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صاحب صوفی بھی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ محلہ میں آتے جاتے میں نے اُن کو پہلے بھی دیکھ رکھا تھا اور مجھے کئی دفعہ خیال آیا کہ میں اُن کو سلام کروں لیکن جھجک مانع رہی۔ ایک دن جب میں مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو مجھے اور میرے چھوٹے بھائی سے انہوں نے پوچھا کہ تم کس جماعت میں پڑھتے ہو؟ جواب ملنے پر دوسرا سوال انہوں نے یہ کیا کہ تمہارے والد صاحب کہاں ہیں؟ اتفاق سے وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم نے بتایا کہ وہ ہمارے والد صاحب ہیں۔ یہ سُن کر انہوں نے تعجب کیا اور کہا کہ ان کے ساتھ تو میری علیک سلیک پہلے ہی ہے اور میں انہیں احترام اور عزت کی

نظر سے دیکھتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہوکر صوفی صاحب ہمیں اپنے ساتھ اپنی بیٹھک میں لے گئے اور کچھ مزید باتیں دریافت
کرنے کے بعد ہمیں کچھ پھل کھلایا۔ اس طرح ہم دونوں بھائیوں کا صوفی صاحب کے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔
میں اُن دنوں ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ صوفی صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم نے عربی کا
مضمون کیوں نہیں رکھا تو میں نے جواب دیا کہ سُنا ہے وہ مشکل زبان ہے اور میں نے کسی جماعت میں عربی
نہیں پڑھی۔ انہوں نے کہا کہ اب تو امتحان قریب ہے اس لئے اب جو مضمون پہلے سے پڑھتے آئے ہو انہیں میں امتحان
دے دو لیکن تم مجھ سے تھوڑی تھوڑی عربی پڑھ لیا کرو تاکہ قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ سمجھ سکو۔ اس طرح انہوں نے
مجھے بعد ازاں تھوڑی بہت عربی پڑھانی شروع کر دی اور اس طرح چھٹی سے لے کر دسویں تک کی نصابی کتابیں انہوں نے مجھے
پڑھا دیں۔ وہ ہر پندرہ دن کے بعد عربی میں میرا امتحان بھی لیا کرتے تھے اور میں بڑے اچھے نمبر حاصل کر لیتا تھا جس
سے میرا دل بہت خوش ہوتا اور پھر انہوں نے مجھے ایف۔ اے کا کورس بھی پڑھا دیا۔ ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے مجھے
بی۔ اے میں عربی کا مضمون رکھ لینے کا مشورہ دیا اور میں بھی خوشی سے اس پر رضامند ہو گیا۔ مجھے انہوں نے نہایت محبت اور
محنت سے اتنی عربی پڑھا دی کہ جب میں نے بی۔ اے کا امتحان دیا تو خدا کی مہربانی سے میں عربی کے مضمون میں یونیورسٹی کے
تمام بی۔ اے کے طلبہ میں اول رہا اس شاندار کامیابی سے میرا دل بڑھ گیا اور سب دنگ رہ گئے۔ یونیورسٹی کی طرف سے
مجھے ایک سونے کا تمغہ اور آئندہ عربی کی مزید تعلیم ایم۔ اے میں جاری رکھنے کے لئے وظیفہ دیا گیا۔ گورنمنٹ کی طرف
سے بھی وظیفہ کی پیشکش کی گئی مگر قواعد و ضوابط کے مطابق میں ایک طرف سے ہی وظیفہ لے سکتا تھا اس لئے
مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ ایم۔ اے عربی کے لئے میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخل ہو گیا لیکن صوفی صاحب نے
مجھے داخل کرانے سے پہلے کہہ دیا تھا کہ تم صرف پڑھائی کی طرف توجہ رکھنا اور طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں میں
کسی عہدہ وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ اس کام میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے
اپنے آپ کو ایسی باتوں سے الگ تھلگ رکھا لیکن ایک دن جب میں کالج گیا تو معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں
تمام طلبہ نے مجھے بلا مقابلہ انجمن عربی کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا ہے۔ میں نے اصرار کے ساتھ اس پیشکش کو
شکریہ کے ساتھ واپس کرنے کی کوشش کی لیکن طلبہ نے میری بات نہ مانی۔ گھر آ کر جب میں نے صوفی صاحب کو
بتایا تو انہوں نے یہی کہا کہ اب دیکھ لینا کہ کتنا وقت ضائع ہو گا۔ اس سے زیادہ انہوں نے اور کچھ نہ کہا۔ انجمن
عربی کے کئی اجلاس ہوتے رہے اور مجھے سیکرٹری کے عہدہ پر متعین ہونے کی وجہ سے اُس کے ہر کام میں دلچسپی
لینا پڑتی تھی۔ بہر صورت کام چلنے لگا اور وہ سال بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ دوسرے سال تمام اساتذہ اور طلبہ نے
انجمن عربی کے کاموں میں میری کارگزاری دیکھ کر متفقہ طور پر پھر میری مرضی دریافت کئے بغیر مجھے اس
انجمن کا صدر چن لیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ عہدہ کسی اور طالب علم کو دیا جائے لیکن میں اس کوشش
میں پھر ناکام رہا۔ چنانچہ مجھے آخر سال تک انجمن عربی کی صدارت کے فرائض انجام دینے پڑے۔ میری کارگزاری
سے بفضلہ تعالیٰ نہ صرف تمام طالبعلم بلکہ تمام اساتذہ بھی مطمئن اور خوش تھے

کالج میں ایم ۔ اے کی تعلیم سمیسٹر سسٹم کے مطابق دی جاتی تھی۔ اس طرز تعلیم کے کچھ فائدے بھی تھے لیکن اس کے نقصانات زیادہ تھے۔ نتائج کا انحصار کلی طور پر اساتذۂ کرام کے اختیار میں تھا۔ اگر وہ کسی طالب علم سے خوش ہوں تو اُسے بڑے اچھے نمبر مل سکتے تھے ورنہ اُسے کم سے کم نمبر دیئے جاتے۔ بہرصورت میں ایم ۔ اے کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں دوم رہا اور "اے" گریڈ میں پاس ہوا۔ اس طرز تعلیم میں ہر طالب علم کو کافی کام کرنا پڑتا تھا اور تین (۳) سے زائد مقالات عربی زبان و ادب کے بارے میں لکھنے ضروری تھے۔ میرے لئے سہولت یہ تھی کہ ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صاحب صوفی کا کتب خانہ ہر وقت میری دسترس میں تھا اور بعض مشکل موضوعات پر مجھے اُن کی راہبری کا موقع بھی ملتا رہتا تھا۔ صوفی صاحب نہ صرف اپنے زمانۂ طالب علمی میں بلکہ ملازمت کے دوران بھی محنت اور تحقیق کرنے کے عادی تھے۔ اور وہ مجھے بھی اسی طریق پر چلانا چاہتے تھے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد صوفی صاحب نے اپنے والد بزرگوار مرحوم و مغفور کے عربی و فارسی کلام پر تحقیق کرنے اور اُن کے حالاتِ زندگی جمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جب میں ایم ۔ اے کے امتحان سے فارغ ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے والد مرحوم کے عربی دیوان سے روشناس کرایا بلکہ کہا کہ اگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد والد مرحوم کے حالات کو جمع کرنے اور اُن کے عربی دیوان کو مرتب کرنے کے موضوع پر کام کرنے کی اجازت دے دیں تو تم ان شاء اللہ بخوبی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکو گے لیکن چونکہ اُن پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا اور نہ اُن کے حالات کسی نے یکجا جمع کئے ہیں اسلئے نہایت محنت اور تگ و دو سے کام لینا پڑے گا۔ میں خود اس کام کو کرنا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس کام کو سر انجام دو اور یونیورسٹی سے اس موضوع کی منظوری حاصل کرو چنانچہ میں نے اُن کی ہدایت کے مطابق درخواست دی جو مختلف مراحل سے گزر کر بفضلہ تعالیٰ منظور کرلی گئی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے یہ موضوع متعین کیا گیا۔

انہی دنوں یونیورسٹی نے اخبار کے ذریعے مختلف مضامین میں ریسرچ اسکالرز کی اسامیوں کے لئے درخواستیں مانگیں۔ میں نے بھی شعبہ عربی میں ریسرچ اسکالر کے لئے درخواست دے دی۔ میرے ساتھ اور بھی چند امیدوار تھے چنانچہ انٹرویو ہوا اور مجھ سے موضوع کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے پی ایچ ڈی کے لئے یہ موضوع مقرر کروایا ہے۔ انہوں نے اسی موضوع کو میری ریسرچ کا موضوع بھی منظور کرلیا اور میں نے کام شروع کردیا۔ شروع شروع میں تو کافی دقت کا سامنا ہوا کیونکہ مولانا مرحوم کے اکثر شاگرد اور اُس زمانے کے لوگ عالم آخرت کو سدھار چکے تھے۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ اور ریسرچ اسکالر کے کام کا نگران جناب ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صاحب صوفی کو مقرر کیا گیا کیونکہ مولانا مرحوم کے تمام اہل خانہ میں سے وہ اُن کے دیوان کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے انہوں نے اس موضوع پر کام کرنے کو اپنے لئے پسند کیا تھا لیکن انہوں نے بعد میں مجھے اس موضوع پر لکھنے کی اجازت دے دی اور خدا کے فضل سے پی ایچ ڈی اور ریسرچ اسکالر کی اسامی دونوں کے لئے یہی موضوع یونیورسٹی نے منظور کرلیا جس میں

میرے اساتذہ کرام بالخصوص جناب ڈاکٹر ذوالفقار علی صاحب ملک ، ڈاکٹر ظہور احمد صاحب اظہر اور
پروفیسر سید محمد کبیر احمد صاحب مظہر کی توجہ کو کافی دخل تھا۔

صوفی صاحب نے مولانا مرحوم کے بعض تلامذہ اور ہم عصر لوگوں سے کچھ حالات پہلے ہی
حاصل کر رکھے تھے تاکہ وہ اس کام کو سر انجام دیں لیکن اُن کا جمع کردہ تھوڑا بہت مواد جو موجود تھا انہوں
نے مجھے دے دیا اور اُن کی زیر نگرانی میں نے اللہ کا نام لے کر کام کو آگے بڑھانا شروع کر دیا

میں نے اپنے مقالے کو مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق جمع کیا ہے :

بابِ اول

مولانا مرحوم کے سوانح

باب دوم

مولانا کی سیرت و کردار

باب سوم

تحریک ترک موالات سے مولانا کا تعلق

باب چہارم

مولانا کے علمی و ادبی کارنامے

باب پنجم

مولانا کی دیہاتی زندگی کا پہلو

باب ششم

مولانا کی شاعری

اس باب کو مندرجہ ذیل چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

فصل اول

برصغیر پاک و ہند میں عربی شاعری کا مختصر خاکہ۔ یہ حصہ اس لئے لکھنا پڑا تاکہ
ہر زمانہ کے مشہور عرب شعراء کے کلام کے نمونے قارئین کے سامنے آجائیں اور اسکے بعد مولانا مرحوم کی شاعری کا
مقام متعین کیا جا سکے۔

فصل دوم

مولانا کے عربی دیوان پر مختصر تنقید

فصل سوم

مولانا کے عربی دیوان کا متن اور اس کے تحقیقی حواشی

دیوان کے اشعار کو عنوانات کے تحت ردیف وار جمع کیا گیا ہے۔ تحقیقی حواشی کے سلسلہ میں، میں نے مستند کتب لغت مثلاً لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔

اِن اشعار کی قوافی کے لحاظ سے فہرست دیوان کے آخر میں دے دی گئی ہے

فصل چہارم

دیوان شعر کے علاوہ مولانا کے بعض تبرکات عربی نثر کی صورت میں بھی دستیاب ہوئے گو یہ چیزیں مقالہ کا حصہ نہ تھیں لیکن چونکہ وہ بہت مختصر مواد تھا اسلئے میں نے دیوان کے آخر میں ان تبرکات کو بھی نقل کر دیا ہے۔

یہاں تک مقالہ کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا حصہ جو

مُلحقات

کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شروع ہوتا ہے جس کے مواد کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

باب اول

مختلف کتب و رسائل پر مولانا کی تقاریظ۔ جن میں بعض تو براہ راست اُن کتابوں سے نقل کی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو مولانا نے اپنے ماہانہ رسالہ "الھدیٰ" میں طبع کی تھیں۔ ان تقاریظ کو متعلقہ کتب کے نام کے تحت لکھا گیا ہے اور ان کتب و رسائل کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

باب دوم

مولانا کے فتاویٰ

اس عنوان کے تحت ہی تمام وہ فتاویٰ جو رسالہ "الھدیٰ" میں چھپے تھے یا مصنفینِ کتب نے اپنی کتابوں میں شائع کئے تھے جمع کر دیئے گئے ہیں۔

باب سوم

تاثرات

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مولانا روحی مرحوم پر کوئی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی اسلئے مجھے تمام تر مواد خود ہی جمع کرنا پڑا۔ اُن کے بعض تلامذہ اور احباب کے ہاں بار بار جانا رہا لیکن آج کل کا زمانہ چونکہ کاروباری ہے اسلئے اگرچہ کسی صاحب نے مواد مہیا کرنے سے انکار تو نہ کیا بلکہ سب بطیبِ خاطر جلدی ہی فراہمیٔ مواد کا وعدہ کرتے رہے لیکن عملی طور پر شاید ہی

کسی صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق میری امداد فرمائی ہو۔ مولانا کے زیادہ تر احباب اور شاگرد لاہور ہی میں تھے اسلئے مجھے بار بار جانے میں گو ذہنی کوفت تو ہوتی تھی مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اسلئے صبر و تحمل کے ساتھ سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔ لاہور سے باہر متعدد شہروں میں بھی مولانا موصوف سے تعلق رکھنے والے موجود تھے مثلاً ساہیوال، گجرات، راولپنڈی، کراچی، سرگودھا اور فیصل آباد وغیرہ۔ جن بزرگوں سے میں ملا اُن میں سے بعض اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں مگر وہ آخر دم تک وعدہ پر ہی ٹالتے رہے اور بعض بار بار یاد دلانے پر ناراض بھی ہو گئے۔ تاہم مجموعی طور پر میں اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ فالحمد للّٰہ علی ذالک۔

اس طرح جو مواد جمع ہوا۔ اُس کو مختلف عنوانات کے ذیل میں ترتیب دینا پڑا جس کی تفصیل یوں ہے:

فصل اول

تلامذہ

اس میں ایسے اصحاب کا مہیا کردہ مواد دیا گیا ہے جو براہ راست مولانا کے کالج میں یا پرائیویٹ طور پر شاگرد رہ چکے تھے۔

فصل دوم

معاصرین

یعنی وہ اصحاب جنہوں نے مولانا سے باقاعدہ استفادہ نہ کیا لیکن اُن سے اکثر ملتے رہے۔

فصل سوم

اہل محلہ

اس عنوان کے تحت اُن اصحاب کا فراہم کردہ مواد جمع کیا گیا ہے جو مولانا کی زندگی میں اُسی محلہ میں مقیم تھے یا مسجد میں بطور مقتدی اُن کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان اصحاب میں سے کچھ تو فوت ہو چکے ہیں اور کچھ اس محلہ سے نقل مکانی کر کے کسی دوسری جگہ مقیم ہیں۔

فصل چہارم

اہل خانہ

یعنی مولانا مرحوم کے اعزہ و اقارب کا فراہم کردہ مواد۔ گو اس عنوان کے تحت ایسے اصحاب بھی شامل ہیں جنہوں نے آج تک باوجود وعدوں کے کچھ مدد نہیں کی۔

فصل پنجم

متفرقات

اس میں تمام اُن اصحاب کا فراہم کردہ مواد جمع کیا گیا ہے جو سلسلہ بالا چار عنوانات کے تحت نہیں آسکے۔ ان میں وہ اصحاب بھی شامل ہیں جو خود تو مولانا سے استفادہ نہ کر سکے

البتہ انہوں نے اپنے والد صاحب یا کسی اور بزرگ سے مولانا کے متعلق کچھ حالات سُن رکھے تھے چنانچہ انہوں نے وہی چیزیں لکھ دیں۔

باب چہارم

مطبوعہ مواد

اس حصہ میں تمام وہ مواد جو مولانا سے متعلق کسی کتاب، رسالے یا اخبارات میں طبع ہوا۔ خواہ وہ مختصر ہی ہو جمع کیا گیا ہے۔ ان کتب و رسائل وغیرہ کو بھی حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر صفحات وغیرہ کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

مُلحقات کا حصہ دراصل اس لئے ضروری تھا تاکہ مواد فراہم کرنے والے اصحاب نے جو کچھ لکھ کر دیا وہ من و عن سامنے آجائے اور تمام روایات کی ذمہ داری مواد فراہم کرنے والے اصحاب ہی کی سمجھی جائے۔

مقالہ سے متعلق بعض اشیاء کی فوٹو سٹیٹ نقول بھی مناسب جگہوں پر شامل کر دی گئی ہیں تاکہ وہ ملحقات کی طرح دستاویزی ثبوت کا کام دے سکیں۔

اس تحریر کے آخر میں مجھے تمام اُن بزرگوں اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میری استدعا پر لبیک کہا اور مرحوم مولانا سے متعلق مواد کی فراہمی میں مختلف طریقوں سے میری اعانت فرمائی۔

میں جناب پیرزادہ بہاء الحق قاسمی امرتسری کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے قلمی معاونت کے علاوہ مجھے جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری سے متعارف کرایا جن کی معرفت میں مختلف ایسے اصحاب سے روشناس ہوا جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں میرے ساتھ تعاون کرنے میں لیت و لعل سے کام نہ لیا۔ میں اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ علوم مشرقیہ کے انچارج جناب سید جمیل احمد رضوی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے نہایت مستعدی سے جس کتاب کی بھی ضرورت پڑی ہر ممکن مدد سے دریغ نہ کیا۔ گو زیادہ تر کتابیں تو مجھے مولانا کے خاندانی کتب خانے سے ہی مل گئی تھیں لیکن جب بھی یونیورسٹی لائبریری کی کسی کتاب کی ضرورت پڑی تو جمیل صاحب حتی الوسع تعاون کرنے کو باعث فخر سمجھتے رہے۔

کتابوں کے سلسلے میں جناب مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا شکریہ ادا کرنا بھی میں ایک خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں جنہوں نے اپنے ذاتی کتب خانہ سے بعض کتابیں کافی مدت تک میرے استعمال

کے لئے وقف کر رکھیں

یونیورسٹی لائبریری کے علاوہ میں نے **انجمن حمایت اسلام** لاہور **کے دفتر** میں جا کر مولانا کے زمانے کا پرانا ریکارڈ تلاش کیا مگر بعد زمانہ کی وجہ سے ریکارڈ ہاتھ نہ لگ سکا لیکن انجمن حمایت اسلام کے چند ماہوار رسالے دستیاب ہوئے جن میں انجمن کے جلسوں کی روئیدادیں اور کوائف درج تھے۔ وہ میں نے اپنے ہاتھ سے نقل کئے۔

اس کے علاوہ **انجمن نعمانیہ ہند لاہور** کے **کتب خانہ، لاہور میوزیم لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری لاہور** میں بھی بار بار جانا پڑا اور بعض کتابیں جن پر مولانا کی تقاریظ درج تھیں مجھے نظر آئیں اور میں نے اپنا مفید مطلب مواد وہاں سے نقل کر لیا۔ میں ان سب لائبریریوں کے **جملہ کارکنوں** کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس سلسلے میں میری مدد فرمائی۔

مجھے اپنے اساتذہ کرام بالخصوص جناب پروفیسر **ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک** صدر شعبہ عربی و پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، جناب پروفیسر **ڈاکٹر حافظ ظہور احمد اظہر** اور جناب پروفیسر **سید محمد کبیر احمد مظہر** کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس مقالہ کی منظوری دلانے اور ریسرچ اسکالر کے عہدہ پر میری تقرری اور بعض دیگر امور مثلاً ریسرچ کی مدت میں توسیع کرانے میں میری امداد فرمائی۔

فجزاهم الله احسن الجزاء

سب سے آخر میں میں اپنے محسن و مشفق **نگران**

پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی

سابق صدر شعبہ عربی و علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج لاہور

کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ بفحوائے

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله"

جن کا کتب خانہ اور تمام خاندانی ریکارڈ بآسانی میری دسترس میں آیا اور جنہوں نے مولانا مرحوم کے بعض تلامذہ اور ایسے اصحاب کا پتہ دیا جن سے میں نے مواد حاصل کیا۔ ان کی نگرانی مجھے ہر وقت حاصل رہی۔

فجزاه الله احسن الجزاء

میں سید انور حسین نفیس رقم اور جناب ظہور کاظمی صاحبان کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس مقالہ کے سرورق کی تزئین کے سلسلے میں مدد دی۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مقالہ کو میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور ٹائپ نہیں کروایا جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ٹائپ میں بعض حروف واضح نہیں ہوتے اور بے شمار غلطیاں اور خامیاں رہ جاتی ہیں۔ چونکہ مجھے تصنیف و تالیف کا تجربہ نہیں اس لئے ممکن ہے کہ اس مقالے میں کچھ نقائص

رہ گئے ہوں یا کچھ غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں جن کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ ناظرینِ کرام اغماض سے کام لیں گے کیوں کہ

الانسان مرکب من الخطاء والنسیان

بے عیب اور کامل ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسان تو غلطیوں کا پتلا ہے۔

حقیقت شناسانِ معنیٰ نظر
نگارند بر عیب چشمِ ہنر

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

محمد ذوالفقار علی رانا

باب اوّل

(سوانح)

NEW CHINA STATIONERS LAHORE

باب اوّل

مولانا اصغر علی روحیؒ

(حالاتِ زندگی)

نام و نسب اور مولد

(مولانا) اصغر علی پنجاب کے مردم خیز ضلع گجرات سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر گجرات دریائے چناب سے قریباً پانچ میل کے فاصلے پر اب بھی ریلوے سٹیشن ہے۔ گجرات کا ضلع آج سے کچھ مدت پہلے مٹی کے برتنوں کی وجہ سے مشہور تھا لیکن آج کل برقی مصنوعات بالخصوص برقی پنکھوں کے لئے شہرہ آفاق ہے۔ یہ شہر زمانۂ قدیم سے ہی بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ اور آماجگاہ بنا رہا ہے۔ یہ ضلع مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے میں وجود میں آیا ورنہ اس سے پہلے وہ ضلع سیالکوٹ کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر قریشی احمد حسین قلعداری (پروفیسر زمیندارہ کالج گجرات) اپنی کتاب "گجرات بعہدِ قدیم و جدید"[1] میں لکھتے ہیں:

موجودہ شہر گجرات کی بنیاد شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے میں رکھی گئی۔ شہنشاہ جہانگیر اپنی کتاب تزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے کہ جب شہنشاہ اکبر تیسری دفعہ کشمیر کے سفر کو جا رہا تھا۔ اس نے دریائے چناب کے کنارے ایک قلعہ بنوایا اور گرد و نواح کے لوگوں کو جو چوری چکاری اور لوٹ مار پر گزارہ کرتے تھے، لاکر اس قلعے میں آباد کیا۔ گوجروں کے یہاں آباد ہو جانے سے اس کا نام گجرات رکھ کر اسے ایک علیحدہ پرگنہ بنا دیا گیا۔

1 ص ۳۸-۳۹

ایک اور روایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اس جگہ پر گوجر اور جاٹ لوگوں کے مویشی چرا کرتے تھے جس کی وجہ سے اُن میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ۹۹۷ھ میں جلال الدین محمد اکبر بادشاہ اس راستے سے کشمیر جا رہا تھا اُس نے یہ منظر دیکھا تو فتنہ و فساد ختم کرنے کے لئے حکم دیا کہ وہاں ایک قلعہ تعمیر کر دیا جائے چنانچہ اکبر نے اپنے دو درباریوں دیانت رائے اور وزیر خاں کو گجرات آباد کرنے کا حکم دیا۔ مذکورہ قلعہ کی تعمیر ماہ چیت ۱۶۶۰ بکرمی کو مکمل ہوئی اور گوجر اور جاٹ کے الفاظ کو جمع کر کے اس علاقے کا نام گجرات رکھ دیا گیا۔

مولوی عبدالمالک مصنف تاریخ شاہانِ گوجر اس لفظ کی ترکیب "جر واٹ" بتاتے ہیں یعنی "گوجروں اور جاٹوں کا علاقہ"۔

قریشی احمد حسین لکھتے ہیں کہ گجرات کرانیکل میں ایک دلچسپ حکایت درج ہے کہ جب یہ علاقہ آباد ہوا تو گوجروں نے مطالبہ کیا کہ اس شہر کا نام اُن کے نام پر گوجر واللہ رکھا جائے اور جاٹ کہتے تھے کہ جاٹ والا ہونا چاہیے۔ اکبر نے کہا کہ جو قوم مجھ کو سوا لاکھ روپے نذرانہ دے گی اُن کے نام پر اس بستی کا نام رکھا جائے گا۔ اس شرط میں جاٹ ہار گئے۔ گوجروں میں ایک شخص فتح محمد نامی کے پاس بے شمار دولت تھی۔ گوجروں نے اُس سے رقم کا مطالبہ کیا۔ فتح محمد نے کہا کہ میں سوا لاکھ روپے گنتا نہیں چاہتا ایک ٹوپہ لے آئیے جتنے ٹوپے بھر کر آپ لے جائیں گے بعد میں مجھے اتنے واپس کر دینا۔ چنانچہ وہ روپے ٹوپے سے ناپے گئے اور شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔

اسی طرح مولوی محمد دین فوق اپنی کتاب سوانح ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی[1] میں لکھتے ہیں:

اکبر کے عہد میں ہندوستان کی تقسیم صوبوں کے علاوہ باؤنیوں پر بھی تھی سیالکوٹ بھی ایک باؤنی کا صدر مقام تھا، جس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے گاؤں کے علاوہ بڑے بڑے دیہات بھی تھے۔ یہی باون (۵۲) دیہات ایک باؤنی کہلاتے تھے۔ جموں، امین آباد، سودھرہ، شیخوپورہ وغیرہ

---

[1] صفحہ ۱۰۵-۱۰۶

سب مقامات سیالکوٹ کے ماتحت تھے۔ اُس زمانے میں دریائے چناب کے پار سے ڈاکو اور راہزن آتے تھے اور چھاپہ مار کر چلے جاتے تھے۔ حکام سیالکوٹ، جن کے ماتحت وہ علاقہ تھا، اُن کے انتظام سے عاجز تھے۔ اکبر ۹۹۲ھ کے بعد سفرِ کشمیر سے واپس آیا اور مجھر کے قرب و جوار کے لوگوں نے گوجروں کی لوٹ مار کی شکایت کی تو اکبر نے گجرات کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا جہاں سیالکوٹ سے بھی بہت لوگ آکر آباد ہوئے اور اس گاؤں کو جس میں گوجروں کی آبادی دیگر اقوام سے زیادہ تھی، سیالکوٹ سے بالکل الگ کر دیا۔

آجکل گجرات کافی پھیل چکا ہے اور پنجاب کا ایک اہم ضلع سمجھا جاتا ہے۔ اس کی سرزمین سے حسن و عشق کی رومانی یادداشتیں بھی وابستہ ہیں اور دوسری طرف اس سرزمین سے متعدد علماء، ادباء اور شعراء نے یہاں جنم لیا ہے۔

چنانچہ پروفیسر احمد حسین قلعداری نے اپنے مقالہ "شعر العرب فی گجرات" میں عربی کے چونتیس (۳۴) شعراء کا ذکر کیا ہے جو اس ضلع سے تعلق رکھتے تھے لیکن بخوفِ طوالت اُن سب کے نام نظرانداز کئے جاتے ہیں۔ فارسی شعراء میں ملا غنیمت کنجاہی مرحوم کا نام یقیناً سرفہرست ہے، جو اپنی مشہور مثنوی "شاہد عزیز" کے علاوہ اپنے فارسی دیوان کے لئے بھی مشہور ہیں۔ اُن کے یہ دونوں تبرکات چھپ چکے ہیں۔

مولانا اصغر علی روحی کے آباؤ و اجداد جو قومیت کے لحاظ سے راجپوت نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ شروع میں موضع کا ہنانوالہ (ضلع سیالکوٹ) کے باشندے تھے۔ اُن کے والد بزرگوار قاضی شمس الدین بن پیر بخش بن رکن الدین بن حامد بن عیسیٰ پہلے شخص تھے جو موضع کاہنانوالہ سے نقل مکانی کر کے تحصیل و ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے گاؤں "کنجھالہ"[1] میں آکر مقیم ہوئے جو شہر وزیرآباد اور گجرات

---

[1] اس گاؤں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دو روایات مشہور ہیں۔ اول تو یہ کہ گزشتہ زمانے میں اردگرد کے مختلف دیہات کے معاملات نپٹانے کے لئے یہاں لوگوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا کیونکہ یہ اُن تمام دیہات کی نسبت شاہراہ کے زیادہ قریب بھی تھا اور یہاں ڈاکخانہ، ریلوے سٹیشن اور بچوں کے لئے مدرسہ بھی موجود ہونے کی وجہ سے تمام دیہات میں ممتاز تھا۔ غالباً آبادی کے لحاظ سے بھی یہ سب سے زیادہ گنجان تھا۔ گویا اصل میں "کٹھا لکا لفظ" "اکٹھوالا" تھا۔ پھر کثرتِ استعمال سے اُس نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔ (صفحہ آئندہ)

کے قریباً وسط میں شاہراہِ اعظم (جی ٹی روڈ) کے کنارے آباد ہے۔ اس گاؤں کُتھالہ کو مولانا کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس گاؤں کا اپنا ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ یہاں سے دریائے چناب زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلے پر مشرقی سمت میں محوِ خرام ہے۔ مولانا اصغر علی روحی مرحوم نے اپنے وطن کی یاد میں اس دریا کا ذکر کرتے ہوئے چند فارسی شعر یادگار چھوڑے ہیں۔ ؎

خوشا چناب و آبِ خوشگوارش — کہ باد از چشمِ زخم ایمن کنارش
لطافت زادگانِ لالہ و گل — در آباں گلشن آرائے بہارش
بحسرت رفت اسکندر ز آبے — کہ میریزد ز کہسار آبشارش
خوشا بختِ کسے کاندر رہِ عمر — فرود آید دمے بر رود بارش
نسیمِ صبح از زنجیرِ ریزی — بیاد آید رُخِ زیبا نگارش
بسانِ مارِ سیمیں پیچ در پیچ — میانِ کوہ ساراں رہگذارش
بآبش چشمۂ حیواں نیرزد — وگر صد خضر باشد خواستگارش
سحر گاہاں صبا چوں عاشقِ زار — ز فرطِ شوق باشد ہمکنارش
بگردابش ز عکسِ ماہ بینی — بسیمیں حقہ دُرِّ شاہوارش
بشوقِ رودِ چناب است روحی — برنگِ مرغِ زارِ مرغزارش

مولانا کے والد ماجد

قاضی شمس الدین علیہ الرحمۃ صوفی منش اور درویش صفت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳

دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دریائے چناب چونکہ اس کے بہت قریب ہے اور پہلے اس سے بھی زیادہ قریب تھا اس لئے دریا کے رستے لکڑی کی بہت سی گیلیاں پہاڑی علاقوں سے بہہ کر دریا میں آتی تھیں اور اس جگہ تھوڑے سے فاصلہ پر لکڑی کی منڈی موجود تھی اور لکڑی کو ہندی میں "کاٹھ" کہتے ہیں گویا پہلے اس کا نام "کاٹھ والا" تھا اور بعد میں اُسے کُتھالہ کہا جانے لگا۔ اب بھی کُتھالہ سے چند میل کے فاصلے پر "ہری پور" کے نام سے ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن موجود ہے۔ جہاں دریائی لکڑی جمع کی جاتی ہے۔

شخص تھے اور اُن کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت اور عامۃ الناس کے رشد و ہدایت میں صرف ہوتا تھا وہ مقامی مدرسہ کے مدرس اعلیٰ بھی تھے اور ایک مسجد کے خطیب و امام بھی۔ تقویٰ اور شرافت کی بنا پر سرکاری طور پر انہیں اس علاقے کا عہدہ قضا سونپ دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ عام طور پر قاضی کہلاتے تھے علوم مشرق بالخصوص عربی و فارسی زبانوں میں اچھا درک رکھتے تھے۔ اس دور میں چونکہ کتابوں کی طباعت اتنی عام نہیں تھی اسلئے انہوں نے عرق ریزی اور محنت سے اپنے مطالعہ کے لئے قریباً پندرہ بیس کتابیں جن میں بعض بڑی ضخیم ہیں اپنے ہاتھوں سے نقل کیں جو اب بھی اس خاندان کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور جن کو دیکھ کر نقل کرنے والے کی قابلیت اور ذوق و شوق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتابیں زیادہ تر فارسی اور کچھ عربی زبان میں ہیں۔ اُن کا موضوع تفسیر، حدیث، فقہ، طب، نجوم اور ادب سے متعلق ہے۔ اُن میں سے اکثر کتابیں اب مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں۔ ایک کتاب "اسلام میں احتساب اور محتسب اعلیٰ کے فرائض" سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر کتاب کے آخر میں ناسخ نے اپنا شجرہ نسب میاں عیسیٰ تک پہنچایا ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اور اپنے آپ کو ناسخ نے موضع کا منانوالہ (پرگنہ سیالکوٹ) کا باشندہ ظاہر کیا ہے۔

ان قلمی کتابوں کی تفتیش کے وقت کچھ ایسے کاغذات بھی نظر سے گزرے جن سے قاضی شمس الدین مرحوم کے حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے چنانچہ ایک دستاویز کا مضمون یوں دیکھنے میں آیا:

"۱۸۶۶ء میں مالکان اراضی نے درخواست دی کہ ہم چالیس (۱۰) کنال لو مرلے (۹) بیس (۲۰) فٹ اراضی منجملہ شاملات دہ بطور معافی شمس الدین کو دینا چاہتے ہیں۔ ۱۳ر اپریل ۱۸۶۷ء کو اُس وقت کے کلکٹر بندوبست نے درخواست کو منظور کیا اور شمس الدین اُس اراضی پر اپنی وفات یعنی ۱۸۷۹ء تک قابض رہا۔"

اس دستاویز میں جو کافی لمبی ہے، یہ بھی درج کیا گیا تھا کہ "شمس الدین کی اگر کوئی نرینہ اولاد ہوئی تو یہ اراضی شمس الدین کے بعد اُن کے نام منتقل کر دی جائے گی اور اگر نرینہ اولاد نہ ہوئی تو مالکان اراضی کو واپس کر دی جائے گی" قاضی شمس الدین کے ہاں بفضلہ تعالیٰ پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے ایک نو عمری ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ باقی چاروں کے نام علی الترتیب

محمد علی، محبوب علی، اکبر علی اور اصغر علی تھے۔ گویا مولانا اصغر علی ان چاروں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اُن کی ولادت اوائل ۱۸۷۱ء ہی میں کٹھالہ ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جو اُس وقت عربی اور فارسی کی کتابوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے اپنے والد بزرگوار (یعنی قاضی شمس الدین) سے حاصل کی۔ والد بزرگوار کی وفات جیسا کہ اوپر کی دستاویز سے ظاہر ہے ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اُس وقت (مولانا) اصغر علی کی عمر تقریباً آٹھ (۸) سال تھی۔ گویا لڑکپن میں ہی وہ اپنے شفیق والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے لیکن قدرت کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ مولانا دیہاتی ماحول میں پیدا ہو کر وہاں کے لوگوں کے نقش قدم پر زندگی گزارتے رہے۔ اُن کے والد مرحوم نے ابتدائی کتابیں اُن کو ازبر کرا دی تھیں اور اُن میں مزید تعلیم کا شوق ہر وقت چٹکیاں لیتا تھا۔ وہ دہلی اور لاہور کے بارے میں کئی بار سنتے رہے کہ یہ دونوں علمی شہر ہیں اور وہاں ہر وقت تعلیم و تعلّم کا چرچا رہتا ہے لیکن وہ اندر ہی اندر کڑھتے رہتے تھے اور ان دونوں شہروں میں جا کر اعلیٰ تعلیم پانے کا خیال ہر وقت اُن کے دل کو گدگداتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ اپنی بیوہ والدہ محترمہ سے اس کا ذکر کرتے لیکن اُن کی والدہ مرحومہ اُن کو ان شہروں میں جانے کی اجازت دینے کا تصور بھی نہیں کرتی تھیں کیونکہ باقی تمام بیٹوں سے بڑھ کر اپنے اس چھوٹے بیٹے سے زیادہ محبت تھی (مولانا) اصغر علی اس سلسلے میں کسی کو اپنا ہمراز نہ پا کر اپنی حالت پر بہت افسوس کرتے تھے۔ باقی بھائیوں نے ضلع گجرات کے بعض مدرسوں میں ابتدائی تعلیم پائی تھی لیکن اپنے وطن سے باہر جانے کا خیال تک بھی انہیں نہیں آیا تھا۔ اس لحاظ سے بھی (مولانا) اصغر علی انوکھی طبیعت کے مالک تھے۔ انہیں صرف سوائے اس ایک فکر کے اور کوئی چیز پریشان نہیں کرتی تھی۔ وہ موقع پا کر کئی بار اپنی والدہ محترمہ سے اجازت مانگتے رہے لیکن اُن کی والدہ ماجدہ اُن کی رائے سے اتفاق نہ کرتی تھیں۔ الغرض بار بار کے کہنے سننے کا آخر یہ اثر ہوا کہ والدہ ماجدہ نے کلیجے پر پتھر رکھ کر انہیں وطن سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔

لاہور میں آمد اور تعلیم

والدہ سے اجازت پانے پر (مولانا) اصغر علی بہت خوش ہوئے۔ اس وقت مالی طور پر مولانا کے اہل خانہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اسلئے وداع کے وقت والدہ ماجدہ نے انہیں صرف ڈیڑھ روپیہ دیا اور کہا کہ اس سے زیادہ کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ بڑے بھائیوں

میں سے ابھی تک کوئی بھی برسرِ روزگار نہیں تھا اسلئے مولانا کی بیوہ والدہ اس سے زیادہ کیا مدد کر سکتی تھیں۔

ان حالات میں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ نامساعد حالات انسانی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں بعض وقت بہت دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر توفیقِ ربانی شاملِ حال ہو تو کسی شخص میں بلند ہمتی، محنت، تندہی اور جانفشانی جیسے اوصاف اُس کا خاصہ بن جاتے ہیں لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو وہی شخص آرام طلبی، دون ہمتی اور لاپرواہی کو اپنا وتیرہ بنا لیتا ہے اور اس کا مستقبل تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے۔ ؎

یغوص البحر مَن طلب اللآلی ۔۔۔ ومَن طلب العلیٰ سہر اللیالی

ومن طلب العلیٰ من غیر کدّ ۔۔۔ اضاع العمر فی طلب المحالِ

یہ مولانا کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کے دل میں بچپن سے ہی حصولِ علم کے شوق کے ساتھ محنت و مشقت برداشت کرنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ شہر لاہور ہمیشہ سے تعلیم و تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا رہا ہے اسلئے مولانا نے لاہور کا رُخ کیا جو آپ کے وطن کنجاہ سے تقریباً ۷۰/۹۲ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اُن دنوں ریل کے کرائے بہت کم ہوتے تھے چنانچہ وہ ریل کے ذریعے لاہور آگئے جہاں ایک یتیم بچے کے لئے جو ابھی نوجوان ہی تھا لاہور میں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر چونکہ ایک نیک مقصد لے کر آپ گھر سے نکلے تھے اور رحمتِ خداوندی آپ کی دستگیر تھی اسلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی اور سرفرازی سے ہمکنار کر دیا۔ آپ کی زندگی میں یہ ایک اہم موڑ تھا جس نے آپ کی آئندہ نسل کے لئے ترقی کی راہ ہموار کر دی۔

آپ کے صاحبزادوں کا بیان ہے کہ ہمیں جب وہ اس زمانے کے واقعات کا ذکر سنایا کرتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے اور ہمیں تلقین کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ تمھیں سب کچھ بیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے اور تمہیں اُن صبر آزما اور جاں گُسل مراحل سے گزرنا نہیں پڑا۔ لاہور میں پہنچ کر آپ نے لوہاری منڈی کی مشہور عبادت گاہ مسجد پٹولیاں میں پہلی نماز ادا کی۔ جہاں عبدالوہاب نامی ایک بزرگ امام تھے۔ جو قرآن مجید کے حافظ مگر آنکھوں سے نابینا تھے نماز سے فارغ ہو کر مولانا خلوت میں اُن سے ملے اور اپنے لاہور میں آنے کا مقصد بیان کیا اور اُن سے مشورہ کیا کہ وہ کیا راستہ اختیار کریں۔

حافظ صاحب نے اُن کی داستان کو بڑے غور سے سُنا اور مسجد میں ہی قیام کرنے اور اُن سے عربی صرف و نحو پڑھنے کی پیشکش کی۔ اس علم کی ابتدائی سوجھ بوجھ (مولانا) اصغر علی میں اُن کے والد مرحوم نے پیدا کر دی تھی چنانچہ حافظ صاحب نے اُن سے چند ابتدائی صرف و نحو کے قاعدے پوچھے تو صحیح جواب سُن کر بہت خوش ہوئے اور اللہ کا نام لے کر انہیں اپنے شاگردوں کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ وہ (مولانا) حافظ صاحب کی مالی خدمت تو کیا کر سکتے تھے البتہ اُن کو مٹھیاں بھرا کرتے تھے۔ یہ ۱۸۸۱ء کا واقعہ ہے۔ حافظ صاحب نے مولانا کو اورینٹل کالج لاہور کی "منشی" کلاس میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا اُس وقت اورینٹل کالج نیا نیا بنا تھا اور عموماً فیسیں یا تو معاف کر دی جاتی تھیں یا ماہوار چند آنے فیس وصول کی جاتی تھی۔ اورینٹل کالج میں داخلے کے بعد آپ اس کالج کے ہوسٹل میں مقیم ہو گئے تھے، جو اُس وقت شاہی مسجد لاہور سے متصل بالائی کمروں میں تھا۔ جب انہوں نے امتحان دیا تو بہت اچھے نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ جس سے اُن کا حوصلہ بڑھ گیا۔ پھر آپ نے اورینٹل کالج میں رہ کر ۱۸۹۲ء تک جو امتحانات دیئے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱)	منشی	۱۸۸۲ء
(۲)	منشی عالم	۱۸۸۳
(۳)	مولوی	۱۸۸۴
(۴)	انٹرنس اورینٹل فیکلٹی	۱۸۸۵
(۵)	منشی فاضل	۱۸۸۶
(۶)	ایف او ایل مع ریاضی	۱۸۸۷
(۷)	انٹرمیڈیٹ اورینٹل فیکلٹی	۱۸۸۸
(۸)	مولوی عالم	۱۸۸۹
(۹)	بی او ایل (عربی)	۱۸۹۰
(۱۰)	مولوی فاضل	۱۸۹۱
(۱۱)	ایم او ایل (عربی)	۱۸۹۲

مندرجہ بالا امتحانات میں اکثر آپ تمام یونیورسٹی میں یا تو اول آتے یا دوم۔ ان

امتحانات میں کامیابی کی اسناد میں سے جو دستیاب ہو سکی ہیں اُن کی فوٹو کاپیاں مقالے کے آخر میں تتمہ کے طور پر لگا دی گئی ہیں۔

عربی میں ایک محاورہ ہے:

"کُن عصامیاً ولا تکن عظامیاً" [1]

یعنی تو اپنے اندر خود کوئی جوہر پیدا کر اور اپنے بزرگوں کی ہڈیاں نہ بیچ۔ عصام بن شہبر الجرمی، نعمان بن منذر بادشاہ کا دربان تھا اور یہ عہدہ اُس نے اپنی قابلیت کی بنا پر حاصل کیا تھا۔ محاورہ کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنی ذات میں کوئی خوبی پیدا کر اور اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر نہ کر۔ مولانا اصغر علی نے گویا اس محاورے پر پورا اُتر کر ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس عزت و شہرت کے مستحق تھے۔ جو انہوں نے اپنی محنت اور تگ و دو کی بنا پر حاصل کی تھی۔ ایسے شخص کو عربی زبان میں "خارجی" بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ شخص جس کی عزت یا شرافت اُس کے ذاتی امتیاز کی وجہ سے کی جائے چنانچہ صاحب تاج العروس لکھتے ہیں: [2]

"الخارجیّ کلّ ما فاق جنسہٗ و نظائرہٗ"

ایسے ہی شخص کے بارے میں مولانا حالی کہتے ہیں ؎

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں ۔۔۔ فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

اسی طرح ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

کَمْ مِنْ اَبٍ قَدْ عَلَا بِابْنٍ ذُرَی شَرَفٍ ۔۔۔ کَمَا عَلَتْ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ عَدْنَانُ

کتنے ہی باپ ہیں جو کسی بیٹے کی وجہ سے بلند ہو جاتے ہیں شرافت کی چوٹیوں پر۔ جس طرح کہ تمام بنی عدنان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے سربلند ہو گئے۔

1۔ تاج العروس ۸: ۳۹۹

2۔ ۲: ۳۱

اساتذہ

قاضی ظفر الدین

(۱۲۷۵ھ — ۱۳۲۲ھ)

قاضی ظفر الدین بن امام الدین اسی دور کے مشہور ادیبوں میں سے تھے۔ اُن کی پیدائش موضع جنڈیالہ ضلع گوجرانوالہ میں ہوئی[1]۔ انہوں نے فارسی تعلیم مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد ابو احمد مراد علی اور مولوی عبداللہ شاگرد مفتی سعد اللہ مراد آبادی سے حاصل کی۔ حدیث میں وہ سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مفتی علاء الدین محمد کے شاگرد تھے۔ عربی ادب مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کیا اُن سے انہوں نے کچھ طبی کتابیں اور علم معقول بھی پڑھا۔ فقہ میں وہ مولانا غلام قادر بھیروی کے تلامذہ میں سے تھے۔ انہیں عربی ادب کے ساتھ حقیقی لگاؤ اور اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی نئی تحقیق میں لگے رہتے۔ انہوں نے ایک عربی اخبار "نسیم الصبا" شروع کیا تھا جو دو تین سال جاری رہ کر عوام کی ناقدر دانی سے بند ہو گیا۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ الباکورۃ الشھیۃ فی شرح الالفیۃ

۲۔ نیل المرام فی اصول الاحکام

۳۔ نیل الادب من مصادر العرب

۴۔ سلک الجواھر

۵۔ علق نفیس (یہ سبع معلقات کی شرح ہے)

۶۔ سبیل النجاۃ

---

[1] صاحب نزھۃ الخواطر نے اُن کا مولد موضع کوٹ قاضی لکھا ہے۔ لیکن میں نے خود مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے رسالہ الہدیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے موضع جنڈیالہ لکھا ہے کیونکہ قاضی صاحب کی وفات پر مولانا روحی مرحوم نے اپنے رسالہ میں اظہار افسوس کیا تھا (النزھۃ ۸: ۲۰۸)، (الہدیٰ ۱: ۱۲)

وغیرہ بتائی جاتی ہیں۔

مولانا روح ؒ نے اُن کی ایک کتاب جو مفتاح العلوم سکاکی کے حصہ عروض المفتاح ہے کا پتہ بھی دیا ہے جو چھپ گئی تھی اور لکھا ہے کہ مصر کے مشہور رسالہ المنار کے فاضل ایڈیٹر نے اس کتاب پر اپنے رسالہ میں تقریظ شائع کی تھی، جس میں ایک جملہ یہ تھا:

"وینبیٔ عن سعة اطلاع مؤلفها"

آخر عمر میں انھوں نے لغات القرآن لکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا، جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ وہ مرض سل میں مبتلا تھے اور زیادہ کمزور ہو چکے تھے۔ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے رد میں تقریباً تین سو (۳۰۰) اشعار پر مشتمل ایک عربی قصیدہ لکھا تھا جو نہایت فصیح و بلیغ اور متین تھا۔ اورینٹل کالج میں وہ قریباً ۲۵ سال تک درس دیتے رہے۔

نہایت منکسر المزاج اور شریف الوضع آدمی تھے اور لوگ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ آپ کا نام تاریخی تھا۔ آپ نے اپنے وطن میں بعارضہ سل وفات پائی۔

ماخوذ از نزهة الخواطر جلد ۸ و رسالہ الهدیٰ جلد اول

مولانا عبد الحکیم کلانوری

آپ ادبیات فارسی کے فاضل مدرس تھے ۱۸۷۱ء میں اورینٹل سکول سے انٹرنس اور منشی عالم کا امتحان پاس کیا۔ منشی عالم کے امتحان میں اول آئے۔ ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج سے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا اور اسی سال کالج میں مدرس فارسی مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں مولوی فاضل کے امتحان میں شریک ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج میں اس سال عربی کا یہ پہلا بڑا امتحان تھا۔ مولوی عبد الحکیم اس امتحان میں اول آئے۔ دوسرے نمبر پر مولوی جلال الدین تھے۔ اس کے بعد مولوی عبد الحکیم صدر مدرس فارسی بنائے گئے۔ سبکدوش ہونے تک وہ اسی منصب پر فائز رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۸۹۰ء میں شعبہ فارسی کے سپرنٹنڈنٹ (تصنیف و تالیف) بنائے گئے۔ ۱۹۰۳ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۲ء میں تقریباً ۴۴ برس کی ملازمت کے بعد دو سال کی رخصت سبکدوشی پر چلے گئے۔ اردو، فارسی، عربی میں کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً

۱۔ مبہمات القرآن

۲۔ کنز الادب

۳۔ قواعد فارسی

۴۔ رسالہ صنائع بدائع

۵۔ ھدایت الاملا

۶۔ تاریخ عجم (فارسی تاریخ، مرتبہ ۱۸۸۴ء—۱۸۸۵ء)

۷۔ انتخاب درۂ نادرہ (تاریخ)

۸۔ انتخاب ناسخ التواریخ

۹۔ جلاء القلوب (۱۸۹۸ء)

۱۰۔ تفسیر المبہمات (علم تفسیر)

۱۱۔ شرح قصیدہ لامیہ (۱۹۱۲)

ماخوذ از تاریخ اورینٹل کالج مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین

مولانا غلام قادر بھیروی

(— ۱۳۲۶ھ)

آپ اپنے زمانے کے مشہور حنفی علماء میں سے تھے اور اُس دور میں طالب علموں کے مرجع اور بڑے بڑے علماء کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے مفتی صدر الدین دہلوی اور اُن کے بعض ہم عصر علماء سے استفادہ کیا تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے تک لاہور کی مشہور بیگم شاہی مسجد میں خطابت کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ حکیم نور الدین بھیروی اور مولانا غلام احمد ساکن کوٹ اسحٰق (ضلع گوجرانوالہ) کے خاص تلامذہ میں سے تھے وہ مذہبی معاملات میں نہایت تشدد روا رکھتے تھے۔ اُن کی وفات ۸۰ سال کی عمر میں ہوئی۔

ماخوذ از نزھۃ الخواطر جلد ۸

(۱۸۱۶ء — ۱۸۸۷ء)

مولانا فیض الحسن بن علی بخش القرشی الحنفی السہارنپوری۔ آپ برصغیر میں عربی زبان و ادب کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ آپ سہارنپور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار حافظ خلیفہ علی بخش ایک عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد بزرگوار سے ہی حاصل کی اور مروجہ عربی و فارسی کتب پڑھیں۔ ۱۹ / ۲۰ سال کی عمر میں شادی ہو گئی لیکن تحصیل علم کے شوق میں دلی پہنچے۔ یہاں مفتی صدر الدین آزردہ سے اکتساب فیض کیا۔ شاہ احمد سعید مجددی اور آخون صاحب ولایتی (اخوند شیر محمد) سے حدیث کا درس لیا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے معقولات و ادبیات کے اسباق پڑھے۔ مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خان مومن، اسد اللہ خان غالب اور خاقانی ہند ابراہیم ذوق کی شعری و ادبی محفلوں میں شریک رہے۔ فن شعر میں مولانا صہبائی کے شاگرد تھے۔ دلی کے نامور طبیب حکیم امام الدین خان سے طب کی کتابیں پڑھیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد دلی میں درس و تدریس کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دلی سے نکلے اور سہارنپور چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ طب کی پریکٹس کرتے رہے۔ پھر علی گڑھ میں عربی کی چند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے ان کی خدمات اورینٹل کالج کے لئے حاصل کر لیں۔ لاہور میں مولانا فیض الحسن کا قیام بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ میں رہا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں وہ اکثر سہارنپور چلے جایا کرتے تھے۔ ان کی علمی و تدریسی شہرت دور دراز گوشوں تک پہنچ چکی تھی اور اسی شہرت کی بنا پر تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کے لئے لاہور کا رخ کرنے لگے۔

مولانا فیض الحسن اورینٹل کالج کی عربی کی جماعتوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج کی آرٹس کی جماعتوں کو بھی درس دیتے رہے۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم، ادیب، شاعر اور مصنف تھے۔ کبھی فیض اور کبھی خیال تخلص کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے باکمال ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مولانا اپنی تدریسی اور تصنیفی

مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ اورینٹل کالج کے ماہوار علمی و تحقیقی مجلہ "شفاء الصدور" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

اورینٹل کالج میں ۱۲ بر س تک تدریسی و تصنیفی خدمات سر انجام دینے کے بعد ۶ فروری ۱۸۸۷ء کو رحلت فرما گئے۔ اُن کی نعش سہارنپور لے جائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی۔

مولانا کے شاگردوں میں سر سید احمد خان، علامہ شبلی، مولانا حالی، مولانا وحید الدین سلیم، مولانا محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا اصغر علی روحی اور مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی جیسے فاضل اور یگانۂ روزگار علماء شامل ہیں۔

تصنیفات:-

۱۸۷۱ء میں انہوں نے سنین اسلام (اسلام کی سیاسی و علمی تاریخ ۲ جلد) کی تالیف میں ڈاکٹر لائٹنر کا ہاتھ بٹایا۔

شرح سبعہ معلقہ (عربی، فارسی، اردو)، شرح حماسہ (عربی)، رشیدیہ، فیضیہ (علم مناظرہ - اردو) کی تالیف کے علاوہ انہوں نے دیوان حسان مرتب کیا۔ التعلیقات علی الجلالین، تحفہ صدیقیہ، عروض المفتاح، ریاض الفیض، دیوان الفیض، حل ابیات بیضاوی وغیرہ بھی تصنیف کیں۔

ان میں سے اکثر طبع ہو چکی ہیں مگر افسوس کہ اُن میں طباعت کی بے شمار اغلاط ہیں۔

ماخوذ از تاریخ اورینٹل کالج، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (دوسری جلد)، نزھۃ الخواطر جلد ۸

مفتی مولانا محمد عبد اللہ ٹونکی

(۱۳۳۹ھ)

مفتی عبد اللہ بن صابر علی مشہور قصبہ ٹونک میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پانے کے بعد تحصیل علم کے لئے مختلف علاقوں میں پھرتے رہے چنانچہ عربی ادبیات کی تعلیم مولانا فیض الحسن سے حاصل کی اور دینیات کا درس مولانا احمد علی محدث سے لیا۔ یکم مئی ۱۸۸۳ء سے اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس دوم مقرر ہوئے۔ تنخواہ چالیس (۴۰) روپے ماہوار تھی۔ ۱۸۸۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کا مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے انتقال (۶ فروری ۱۸۸۷ء) کے بعد عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور تنخواہ اسی (۸۰) روپے ماہوار ہو گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے سبکدوش ہونے کے بعد مفتی عبد اللہ ٹونکی شعبہ عربی کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہو گئے اس وقت تنخواہ سو (۱۰۰) روپے اور ۱۸۹۵ء سے ایک سو بیس (۱۲۰) روپے ہو گئی۔ ۱۸۹۷ء میں چند ماہ کے لئے قائم مقام پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیئے۔ چنانچہ اس سال کالج کی سالانہ رپورٹ انہوں نے پیش کی۔ ۱۹۰۳ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۸ء میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ ۱۹۱۳ء میں طویل رخصت پر چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں واپس آئے اور ۱۹۱۷ء میں تقریباً ۳۴ سال کی ملازمت کے بعد رخصت سبکدوشی پر چلے گئے۔ کچھ عرصہ دار العلوم ندوہ کے مدرس اعلیٰ رہے۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ یہاں سے بیمار ہو کر اپنے صاحبزادہ مفتی انوار الحق ایم۔ اے (پنجاب) ناظم و مشیر تعلیمات بھوپال کے پاس چلے گئے جہاں ۷/ نومبر ۱۹۲۰ء کو بعارضہ فالج انتقال کیا۔ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق وفات کے وقت مفتی صاحب کی عمر ستر (۷۰) سال کے قریب ہو گی۔

تصانیف:۔

۱۔ التعلیقات علی شرح سلّم العلوم۔

۲۔ عجالۃ الراکب فی امتناع کذب الواجب۔

۳۔ فتاویٰ صابریہ (شرع محمدی اردو) چہار جلد ۱۹۰۸ء – ۱۹۱۱ء۔

۴۔ تحریر اقلیدس (عربی سے اردو ترجمہ) جلد اول ۱۹۰۲ء۔

۵۔ الأنوار الزاهیه فی دیوان أبی العتاهیه۔

ماخوذ از تاریخ اورینٹل کالج و نزہۃ الخواطر جلد ۸

مولوی نذیر حسین دہلوی

(۱۲۲۵ھ — ۱۳۲۰ھ)

ان کا نام و نسب یوں ہے: سید نذیر حسین بن جواد علی بن عظمۃ اللہ بن اللہ بخش الحسینی البہاری الدہلوی۔ ان کی پیدائش علاقہ بہار کے ایک گاؤں سورج گڑھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد عظیم آباد کو آئے جہاں سید احمد بن عرفان حسنی بریلوی اور شیخ اسمعیل بن عبد الغنی دہلوی کے علاوہ شیخ عبد الحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی بھی موجود تھے۔ یہ ۱۲۳۷ھ کا واقعہ ہے۔ یہاں انہیں اللہ تعالیٰ کا نورِ معرفت حاصل ہوا۔ اسکے بعد کچھ عرصہ کے لئے انہوں نے شہر الہ آباد میں بھی تحصیل علم کے لئے قیام کیا۔ بعد ازاں کئی مقامات پر ٹھہرتے ہوئے ۱۲۴۳ھ میں دہلی پہنچے۔ یہاں انہوں نے درسی کتابیں سید عبد الخالق دہلوی، شیخ شیر محمد قندھاری اور علامہ جلال الدین ہروی سے پڑھیں اور سیرت احمدیہ کے مؤلف شیخ کرامت علی اسرائیلی سے علم اصول، علم بلاغت اور تفسیر قرآن کا علم حاصل کیا۔ شیخ محمد بخش دہلوی سے علم ہیئت اور حساب پڑھا۔ علم ادب میں اُن کے استاد شیخ عبد القادر رامپوری تھے۔ یہ تمام علوم انہوں نے پانچ سال کے عرصہ میں پڑھ لئے اور پھر اپنے استاد شیخ عبد الخالق مذکور کی صاحبزادی سے اُن کا نکاح ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبد العزیز کے نواسے شیخ اسحٰق بن محمد افضل العمری الدہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اُن سے اُن کو ۱۲۵۸ھ میں فارغ التحصیل ہونے کی سند ملی، جبکہ شیخ اسحٰق مکہ مکرمہ کو ہجرت کر گئے۔ اُن کے جانے کے بعد سید نذیر حسین بطورِ استاذ درس اور فتویٰ دینے لگے اور خود ہر علم کی درسی کتب بالخصوص علم فقہ

اور علمِ اصول کی تحصیل میں لگے رہے۔ انہیں حنفی فقہ کا بہت اچھا مذاق تھا۔ ۱۲۷۰ھ تک ان علوم کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر اُن کو قرآن مجید اور حدیث سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی تاہم علم فقہ کو بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔

نزھۃ الخواطر کے مؤلف علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ میں ۱۳۱۲ھ میں اُن کے درس میں حاضر ہوتا رہا۔ جس کی وجہ سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ صحیح العقیدہ اور حدیث و قرآن میں پوری مہارت رکھنے والے ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور کثرتِ نوافل کے ساتھ ساتھ بارگاہ ایزدی میں خشوع و خضوع اور گریہ وزاری سے کام لیتے تھے۔ اخلاقاً نہایت متواضع اور حلیم تھے اور جراُت و دلیری سے متصف تھے۔ شریعت کے معاملے میں اپنے مخالفین کو بہت بُرا سمجھتے تھے اور انہیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں طویل عمر عطا کی اور اُن سے بے شمار عرب و عجم کے لوگ مستفید ہوتے رہے اور ھندستان میں علم حدیث کی ریاست اُن کو نصیب ہوئی۔

آپ کے مخالفین آپ کو اذیت پہنچاتے رہے اور اُن کے بارے میں یہ مشہور کردیا کہ یہ اہلِ سنت وجماعت کے گروہ سے الگ ہوگئے ہیں اور ھندستان کے فرمانرواؤں کے خلاف باغی ہیں۔ جس پر سلطنتِ انگلشیہ نے انہیں ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۱ھ میں گرفتار کرلیا اور انہیں راولپنڈی کے شہر میں نظربند رکھا۔ وہ پورے ایک سال بعد رہا ہوگئے اور پھر دہلی آکر درس و تدریس میں لگ گئے۔ ۱۳۰۰ھ میں جب انہوں نے حجازِ مقدس کا سفر کیا تو اُن کے معتزلی ہونے کا شوشہ چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ خنزیر کی چربی کو حلال سمجھتے ہیں۔ بعض ایسی باتیں جو اسلام میں ممنوع ہیں اُن کی طرف منسوب کی گئیں مثلاً یہ کہ خالہ اور پھوپھی کے ساتھ نکاح جائز ہے اور یہ کہ مالِ تجارت پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اس قسم کی بے سروپا باتیں آپ کی طرف منسوب کردی گئیں حالانکہ وہ ان سب سے بَری تھے۔ اُن کے معاملہ کو مکہ معظمہ کے والی تک پہنچایا گیا جس نے انہیں گرفتار کرادیا اور ایک دن اور رات جیل میں رکھنے کے بعد انہیں آزاد کردیا۔ وہ پھر ھندستان لوٹ آئے لیکن لوگوں نے سلف صالحین کی طرح انہیں بدعتی اور کافر کہنا شروع کردیا۔

علامہ عبدالحی لکھتے ہیں کہ وہ تقویٰ، دیانت، زہد، علم اور عمل، قناعت،

توکل، راست بازی، خوفِ خدا، لوگوں سے بے نیازی اور اللہ اور اُس کے رسول سے محبت رکھنے میں یگانۂ روزگار تھے کسی نے حسین بن محسن انصاری یمنی سے یہ پوچھا کہ سید نذیر حسین دہلوی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا سید نذیر حسین دہلوی اپنے زمانے کے یکتائے روزگار اور اپنے وقت کے بے نظیر محدث تھے۔ ملک ہند میں علم، حلم اور تقویٰ میں اُن کا کوئی ثانی نہیں وہ قرآن مجید اور سنت پر عمل پیرا ہونے پر بہت زور دیتے ہیں۔ سرزمینِ ہند میں وہ اس زمانے کے تمام علماء کے سردار ہیں بلکہ اُن میں سے اکثر اُن کے شاگرد اور خادم ہیں۔ اُن کا عقیدہ جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے گزشتہ بزرگوں کے عین مطابق ہے جو شخص ایسے امام اور راہنما کی توہین کرے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کبھی سرخرو نہیں ہو سکتا تصنیف و تالیف کی طرف سید نذیر حسین نے بہت کم توجہ دی۔ کیونکہ انہیں اس کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ صرف اردو زبان میں اُن کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے ملتے ہیں مثلاً معیار الحق، ثبوت الحق الحقیق اور فلاح الولی باتباع النبی۔ انہوں نے بہت سے فتوے بھی دیئے جنہیں یکجا جمع نہیں کیا گیا اُن کے شاگرد بے شمار تھے، جن میں سے بہت سے مشہور عالم اور نقاد بھی ہوئے۔ ہندوستان میں جو لوگ مشہور علماء کہلائے اُن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اُن کا بیٹا سید شریف حسین، جو اُن کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔

۲۔ مولوی عبد اللہ غزنوی اور اُن کی اولاد یعنی مولانا محمد، مولانا عبد الجبار، مولانا عبد الواحد، مولانا عبد اللہ۔

۳۔ شیخ محمد بشیر سہسوانی

۴۔ شیخ عبد المنان وزیرآبادی

۵۔ شیخ محمد حسین بٹالوی

۶۔ علامہ عبد اللہ بن عبد الرحیم غازی پوری

۷۔ سید مصطفیٰ بن یوسف الحسنی الطوکی

۸۔ قاضی طلا محمد پشاوری

۹۔ شیخ عبد اللہ بن ادریس حسنی مغربی

۱۰۔ مولانا اصغر علی روحی

مولانا عبدالحی کہتے ہیں کہ میں دہلی میں کچھ عرصہ اُن کی خدمت میں حاضر رہا اور انہوں نے تحصیل فراغت کی سند ۱۳۱۲ھ میں اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر مجھے دی۔ اُن کی وفات ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ میں شہر دہلی میں ہوئی۔

ماخوذ از نزھۃ الخواطر جلد ۸ و
مجلہ کریسنٹ میگزین اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سالنامہ ۱۹۳۰ء۔

مولانا کی شہرت اور ملازمت

مختلف امتحانات میں اول آنے کی وجہ سے آپ کو یونیورسٹی کی طرف سے وظیفہ بھی ملنا شروع ہو گیا۔ اس وقت یونیورسٹی کا قاعدہ یہ تھا کہ مولوی فاضل میں جو طالب علم اول آتے اُسے منشی کلاس کا استاد بنایا جاتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ پرائیویٹ طور پر طالب علموں کو درس و تدریس میں راہنمائی کرتے رہے۔ شروع میں آپ کو چار روپے وظیفہ ملتا تھا جو اُس زمانے میں ایک شخص کے گزارے کے لئے کافی تھا چنانچہ مولانا خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ بورڈنگ میں سکونت کا کرایہ چار آنے تھا اور ماہوار کھانے پینے کا خرچ دو روپے کے قریب ہوتا تھا۔ مختلف امتحانات میں اول آنے کی وجہ سے وظیفہ کی مقدار بھی بڑھتی گئی چنانچہ ٣٣ روپے اور پھر بڑھ کر ٥٠ روپے تک ہو گئی۔ والدہ کی خدمت کا خیال انہیں ہر وقت دامن گیر رہتا اس لئے آپ اپنی ضروریات کے مطابق کچھ رقم پاس رکھ کر باقی والدہ کو ارسال کر دیا کرتے تھے۔ موجودہ ٹریننگ کالج اس وقت گورنمنٹ کالج کے نچلے مغربی حصہ میں اور اورینٹل کالج مشرقی حصہ میں واقع تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر آنجہانی نے گورنمنٹ کالج قائم کیا تھا اور وہ بیک وقت اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر پنجاب یونیورسٹی نے آپ کو اورینٹل کالج میں ہی کچھ عرصہ کے لئے استاد رکھ لیا۔ اس کے صلہ میں آپ کو پچاس روپے ماہوار تنخواہ دی جانے لگی لیکن جلدی ہی آپ کی قابلیت کا شہرہ انجمن حمایت اسلام کے اراکین کے کانوں تک پہنچا اور انجمن کے سیکرٹری کی طرف سے آپ کو اسلامیہ کالج (جو اس وقت دسویں تک ایک سکول کی صورت میں تھا) میں ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ اُس وقت اسلامیہ کالج شیرانوالہ دروازہ اور پھر موری دروازہ کے اندر راجہ پٹیالہ کی حویلی میں تھا اسی حویلی میں منتقل ہو جانے پر اسلامیہ کالج کو ایف۔ اے تک کا درجہ دے دیا گیا جس وقت مولانا کو انجمن حمایت اسلام کی طرف سے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ آپ اُن دنوں موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کے لئے اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ کٹھالہ میں مقیم تھے۔ ملازمت کی خوشخبری سُن کر والدہ نے اپنے بیٹے کو بہت پیار کیا اور بہت خوش ہوئیں اور دعائیں اُن کے منہ سے بے اختیار نکلیں جو خدا کے فضل سے پوری ہوئیں۔ چنانچہ مولانا اورینٹل کالج کی ملازمت چھوڑ کر ١٨٩٢ء کے آخر میں اسلامیہ کالج لاہور میں عربی و دینیات کے استاد مقرر کر دیئے گئے۔

٭ راجہ پٹیالہ کی حویلی کے بعد اسلامیہ کالج موچی دروازہ سے باہر ڈاکٹر میر شام

کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد انجمن نے کالج کی موجودہ بلڈنگ ۱۹۰۵ء میں تعمیر مکمل کی اور اسی سال وہاں اسلامیہ کالج منتقل ہو گیا۔ بعد میں اس عمارت میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔

ہر کام کے لئے قدرت نے وقت متعین کر رکھا ہے۔ مولانا درس و تدریس کے علاوہ شعر و شاعری کا شغل بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے عربی و فارسی کے اعلیٰ امتحانات پاس کر لئے تھے اور ان دونوں زبانوں کے شعراء کے کلام کو زیر مطالعہ رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ میں شعر گوئی کا ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُن دنوں مولانا جوانی کے عالم میں تھے اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں شامل ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ وہ قریباً ہر سال اردو میں تقریر کے علاوہ اپنا فارسی کلام جلسے میں سنایا کرتے تھے۔ اُن دنوں انجمن کے جلسوں میں تمام ہندوستان کے اچھے اچھے شعراء، علماء اور اکابر حاضری دیا کرتے تھے۔ مثلاً مولانا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، سر سید احمد خان، نواب بہاولپور، مولانا حالی پانی پتی، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا محمد شبلی، نواب محسن الملک، علامہ محمد اقبال وغیرہ۔

انجمن کے سالانہ جلسوں میں اپنی تقریر اور اشعار سنانے کی بنا پر سب لوگ آپ سے متعارف ہو گئے اور سر سید احمد مرحوم نے ڈپٹی برکت علی کی معرفت مولانا سے یہ فرمائش کی کہ آپ اگر علی گڑھ میں تشریف لے آئیں تو آپ کو شعبہ عربی کا صدر بنا دیا جائے گا۔ لیکن آپ نے جواب دیا کہ سر سید احمد خان نے جس ادارے کی بنا رکھی ہے وہ بھی اسلامی ہے اور جس کالج میں، میں اس وقت ملازم ہوں وہ بھی اسلامی ہے۔ اسلئے آپکی اس پیشکش کا شکریہ۔ لیکن مجھے معاف رکھا جائے کیونکہ لاہور ہندوستان میں علم کا بہت بڑا مرکز ہے اور میں اپنی بیوہ والدہ سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتا۔

اسی طرح سر سید کے علاوہ پشاور اسلامیہ کالج کے ارباب حل و عقد نے بھی مولانا کو اپنے ہاں لے جانے کی فرمائش کی جس کے جواب میں مولانا نے فرمایا ع

از ضعف بہر جا کہ نشستیم، نشستیم

الغرض مولانا آخیر عمر یعنی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے تک انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ کالج لاہور ہی سے وابستہ رہے۔

انجمن کی ملازمت تو محض ایک سلسلہ معاش تھا جو آپ نے انتہائی خلوص، دیانتداری اور مستعدی سے سرانجام دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء کے آخر میں جب آپ کالج کی ملازمت سے سبکدوش

(۲۷۵)

ہے تو آپ کو دو سو پچھتر روپے مشاہرہ ملا کرتا تھا۔ آپ اپنی والدہ ماجدہ کو کنجاہ سے لاہور لے آئے تھے کیونکہ آپ اُن کی بہترین خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت مولانا کے بڑے بھائی محمد علی بھی گاؤں کے مدرسہ میں پچیس روپے ماہوار تنخواہ پر متعین ہو گئے تھے۔ دوسرے بھائی مولوی اکبر علی بھی ضلع گجرات کے مختلف سکولوں میں جو اس وقت لوئر مڈل کے درجہ تک تھے ملازمت کرتے رہے۔ مولانا کے چوتھے بھائی مولوی محبوب علی کو بھی مولانا نے اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر انجمن حمایت اسلام کے دفتر میں ملازمت دلا دی تھی۔ انہوں نے کشمیری بازار لاہور میں کتب فروشی کی ایک دکان بھی جاری کی تھی۔ بعد میں انجمن کی ملازمت چھوڑ کر وہ میوہ منڈی لاہور کے آڑھتیوں کا حساب و کتاب رکھنے اور اس سلسلے میں رسل و رسائل لکھنے کا کام بجا لاتے رہے۔

مولانا کے ایک ہم وطن جن کا نام نامی مولوی عبدالمالک تھا۔ ریاست بہاولپور میں مشیر مال کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ ضلع گجرات کے علاقے موضع گھوڑیکی کے باشندہ تھے۔ انہیں مولانا سے بہت عقیدت اور محبت تھی۔ انہوں نے مولانا کو بہاولپور میں تشریف لانے کی فرمائش کی چنانچہ تین چار سال گرمی کی چھٹیوں میں وہاں جاتے رہے۔ مولوی عبدالمالک کی معرفت مولانا کی وہاں کے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو گئی۔ مولانا وہاں دو تین ہفتہ قیام فرماتے اور انجمن حمایت اسلام کے لئے ان سے چندہ جمع کر کے خاصی رقم لایا کرتے تھے بعض وقت اس چندے کی رقم پانچ سو کے لگ بھگ ہوتی جو اس وقت ایک گراں قدر رقم سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بہاولپور کے اکابر میں نواب کے ایک وزیر مرزا چند وڈے خاں، خان صاحب محمود خان (افسر صیغہ مال) اور مولوی عبدالرحمٰن خاں (فوجی افسر) گراں قدر عطیے دیا کرتے تھے۔ مولانا پائی پائی کا حساب انجمن کے خزانے میں جمع کرا دیا کرتے تھے۔ اور جن لوگوں کی طرف سے وہ امداد کی جاتی تھی اُن کی ایک فہرست بنا کر انجمن کو مہیا کر دیتے تھے۔

بہاولپور کے علاوہ پنجاب کے بعض دوسرے شہروں میں مثلاً ایبٹ آباد، جہلم، سیالکوٹ، جھنگ، فیروزپور وغیرہ میں بھی آپ کے بے شمار شاگرد سکونت پذیر تھے۔ آپ ان شہروں میں تشریف لے جاتے اور موسم گرما کی تعطیلات کو آپ غنیمت سمجھتے ہوئے وہاں سے انجمن کے لئے چندہ جمع کر کے لاتے اور انجمن کے خزانچی کی معرفت دفتر میں جمع کرا دیتے۔

طریقۂ تعلیم

استاد اور شاگرد کے درمیان ایک ایسا پاکیزہ رشتہ ہے کہ وہ جتنا گہرا ہوتا ہے اتنا ہی دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم قدیم زمانہ کے اساتذہ کی طرح اپنے شاگردوں سے نہایت مشفقانہ سلوک کرتے تھے بالخصوص جس طالب علم میں انہیں قابلیت کا جوہر نظر آتا اُس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کوشاں رہتے۔ اپنے بچوں کی طرح اُس سے بے تکلف ہو جاتے اور پیار سے اُس کے کانوں کو اینٹھتے اور عموماً اُس کا کوئی لقب یا عرف تجویز کر دیتے اور ہمیشہ اُسے اسی نام سے یاد کیا کرتے۔ ہر طالب علم یہی سمجھتا کہ مولانا مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ایک دفعہ شاگردوں میں سے کسی نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کے الفاظ سے جواب دیا۔ اُس نے اپنے دوستوں کے سامنے اس کا فخریہ انداز میں ذکر کیا۔ اُس کے بعد ایک اور طالب علم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکوہ کرتے ہوئے کہنے لگا کہ آپ نے میرے سلام کے جواب میں صرف وعلیکم السلام فرمایا تھا مگر فلاں لڑکے کے سلام کے جواب میں آپ نے ورحمۃ اللہ کا بھی اضافہ کر دیا۔ اُس کی یہ شکایت سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا کہ اگر یہی بات ہے تو میں تمہارے سلام کے جواب میں اب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ دیتا ہوں۔ یہ سن کر وہ طالب علم بہت خوش ہوا۔

تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں کہ وہ انسان کو آئندہ زندگی میں مسائل معاش کے حل کرنے میں کارگر ثابت ہو بلکہ اس سے بھی اہم ایک اور مقصد یہ ہے کہ تعلیم طالب علم کے اخلاق و عادات کو سنوارے اور سیرت و کردار کو اسلامی رنگ میں رنگ دے ورنہ طالب علم پر یہ ضرب المثل صادق آئے گی:

"چار پایہ بر و کتابے چند"

یا جیسا کہ قرآن مجید نے فرمایا ہے:

"کمثل الحمار یحمل اسفارا" (۵:۶۲)

مولانا مرحوم کو اپنے شاگردوں کی اخلاقی و روحانی تربیت کا پہلو بالخصوص مدنظر تھا۔ اُن کی اخلاقی کمزوریوں اور بد عادتوں پر ہمیشہ کڑی نگاہ رکھتے۔ خود تو لباس، گفتگو، خوراک، غرض زندگی کے ہر شعبے میں سادگی پسند اور تکلف سے دور اور مغربی تمدن و معاشرت اور تہذیب سے سخت بیزار تھے ہی۔ وہ یہ بھی چاہتے کہ اُن کے شاگرد ان چیزوں کو اپنائیں اور اسی روش پر وہ بھی

چلیں۔ چنانچہ جو طالب علم انگریزی لباس اور مغربی تراش خراش کے زیادہ دلدادہ تھے اُن کو سرزنش کرنے سے نہ چوکتے اور انہیں اسلامی اقدار کو اپنا شعار بنانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ذہین اور محنتی طلبہ کی ہر طرح مدد پر آمادہ رہتے۔ اگر اُن میں سے کوئی نادار اور مفلس ہوتا تو اپنی استطاعت کے مطابق اسکی مالی اعانت بھی فرماتے۔ تعلیم کا شوق رکھنے والے طلبہ کے لئے آپ کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے تھے۔ ضرورت مند طلبہ وہاں حاضر ہو کر اُن سے بلا معاوضہ استفادہ کیا کرتے تھے۔ اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود ایسے طلبہ کے لئے کوئی نہ کوئی وقت نکال لیتے۔ چنانچہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، جو آپ کے نہایت مقرب اور قابل شاگرد تھے، لکھتے ہیں [1]

" اُن سے استفادے کا سلسلہ اُس وقت بھی جاری رہا جب میں خود یونیورسٹی میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گیا۔ اُس زمانے میں مجھے مختصر المعانی کے مطالعے کے وقت بعض مقامات پر اشکالات درپیش تھے۔ مولانا کی طرف رجوع کیا تو بوجہ کم فرصتی انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج سے گھر واپس جاتے وقت راستے میں وہ اُن اشکالات کو رفع کر دیا کریں گے۔ اُن دنوں کالج شیرانوالہ دروازہ میں تھا اور وہ بھاٹی دروازہ میں رہتے تھے۔ اس راستے کو طے کرتے وقت میں اُن کے ہم رکاب کتاب ہاتھ میں لے کر مشکل مقامات پڑھتا جاتا تھا اور وہ اُن کو حل کرتے جاتے تھے۔ بازاروں کی گہما گہمی کسی طرح بھی اس سلسلے میں حارج نہ ہوتی تھی۔"

جماعت میں درس کتاب پڑھاتے وقت آپ بالعموم کتاب سامنے نہیں رکھتے تھے بلکہ زبانی پڑھاتے تھے۔ آپ کا انداز تعلیم نہایت بلند پایہ اور آواز گرجدار تھی۔ درس کے دوران حسب ضرورت کتاب کے مضمون کی تائید میں عربی، فارسی، اردو اور پنجابی اشعار سنا کر درس کو اس طرح دلچسپ اور مرغوب بنا دیتے تھے کہ بقول مولانا غلام رسول مہر مرحوم خشک سے خشک موضوع بھی آسان معلوم ہونے لگتا اور ہر طالب علم یہی چاہتا کہ مولانا اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔

اُن کا درس معلومات افزا اور پُر مغز ہوتا۔ کوشش یہ کی جاتی کہ طلبہ کی

[1] مقالات، ۲: ۱۸۱

نظر صرف نصابی کتاب تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرکے اپنے معلومات میں گہرائی اور گیرائی اور اپنی نظر میں وسعت پیدا کریں۔ اس سلسلے میں آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صاحب نے ایک دلچسپ لطیفہ بیان کیا اور کہا کہ

جس زمانے میں، میں بی۔اے کے امتحان کے سلسلے میں عربی کا نصاب اُن سے پڑھ رہا تھا تو والد صاحب مرحوم اپنے معمول کے مطابق لمبی چوڑی تفصیل میں چلے جاتے اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے درس میں بمشکل کتاب کا ایک آدھ صفحہ ختم ہوتا لیکن چونکہ امتحان قریب تھا اور وقت تھوڑا۔ اس لئے میں اندر ہی اندر جھنجھلاتا۔ میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے دبی زبان میں کہا کہ کام زیادہ ہے اور وقت تھوڑا اس لئے آپ مجھے صرف امتحانی نقطۂ نظر سے راہنمائی فرمائیں۔ اتنی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میری یہ بات سُن کر وہ سخت طیش میں آگئے اور فرمایا:

اُٹھ جاؤ میاں سے، جس طرح تم پڑھنا چاہتے ہو، نہ میں نے خود اس طرح پڑھا ہے نہ آج تک کسی کو اس طرح پڑھایا ہے۔ ہمارا مقصد استعداد پیدا کرنا ہے نہیں بلکہ بی۔اے کا گیٹ پروانہ حاصل کرنا ہے۔ پھر آپ نے پوچھا کہ بھلا بتاؤ B.A. کن الفاظ کا مخفف ہے۔ میں نے جھٹ جواب دیا کہ Bachelor of Arts۔ فرمایا نہیں۔ یہ بی۔اے جو تم کررہے ہو اس سے Big Ass بنتا ہے یعنی پرلے درجے کا گدھا۔ میں یہ سُن کر سخت نادم ہوا۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی کا بیان ہے:

جن دنوں میں اسلامیہ کالج میں بی۔اے کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اُن دنوں ہمیں کالج میں عربی کا مضمون ایک اور پروفیسر صاحب پڑھایا کرتے تھے جو یوں تو پی۔ایچ۔ڈی (عربی) بھی تھے اور یہ ڈگری انہوں نے کسی مغربی ملک سے حاصل کی تھی لیکن عربی زبان کو سمجھنے کا وہ بہت کم سلیقہ رکھتے تھے۔ میری عادت یہ تھی کہ کلاس میں جو سبق پڑھایا جاتا ہو، میں وہ والد صاحب مرحوم سے پہلے پڑھ کر جاتا اور جہاں پروفیسر صاحب غلط پڑھاتے۔ میں کلاس میں ہی اُن پر اعتراض کردیتا اور وہ اسے بُرا مانتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ درس کے دوران "ماالذی یُبکیک" (تجھے کون سی چیز رلاتی ہے یعنی تم کیوں روتے ہو) عربی کے اس چھوٹے سے جملے کو انہوں نے "ماالذی یَبکیک" پڑھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ لفظ یَبکیک ہے یا یُبکیک۔ انہوں نے جواب دیا یَبکیک۔ ترجمہ

تو انہوں نے صحیح کیا کہ تم کیوں ہنستے ہو۔ لیکن اعراب غلط پڑھے۔ انہیں میرے متعلق معلوم تھا کہ یہ مولانا
روحی صاحب کا بیٹا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے خلوت میں سٹاف روم میں بلا کر کہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم
بڑے قابل ہو اور قابل آدمی کے بیٹے ہو لیکن کلاس روم میں مجھ پر نکتہ چینی نہ کیا کرو بلکہ کلاس سے باہر
اپنا شک و شبہ دور کر لیا کرو۔ ایسا کئی بار ہوا۔ آخر میں نے اُن پر اعتراض کرنا چھوڑ دیا اور اُن
کے پڑھانے کی پرواہ نہ کی کیونکہ انہوں نے تنگ آ کر ایک دن مجھ سے یہ کہا کہ بھئی اصل بات یہ ہے کہ میرا
مضمون تاریخ اسلام ہے۔ عربی پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں لیکن چونکہ مجھے عربی کی یہ کلاس دے دی
گئی اسلئے مجھے جو سمجھ آتا ہے پڑھا دیتا ہوں۔ کچھ دنوں کے لئے وہ پروفیسر صاحب رخصت پر چلے گئے
اور ایک اور صاحب جو علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لائے تھے بجائے پڑھانے پر مامور ہوئے۔ وہ بھی
علی ھذا القیاس تھے۔ اُن کا قاعدہ یہ تھا کہ جو سبق پڑھانا ہو اُس کا ترجمہ باضروری تشریحات وہ
ایک کاغذ پر لکھ لایا کرتے اور وہ کاغذ کتاب کے ایک صفحہ پر رکھ کر دیکھتے جاتے اور یہی پڑھاتے جاتے۔

ایک دن اچانک کالج کا چپراسی پرنسپل صاحب کا ایک نوٹس لے کر آیا تاکہ طالب علموں
کو سنا دیا جائے۔ انہوں نے کتاب میز پر رکھ دی اور نوٹس لے کر سنانا شروع کیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ کمرے
میں بجلی کے پنکھے چل رہے تھے جس کی وجہ سے وہ کاغذ جس پر انہوں نے ترجمہ لکھ رکھا تھا پنکھے کی ہوا سے اُڑ
کر نیچے گر گیا۔ جب وہ نوٹس سنانے کے بعد آگے پڑھانے لگے تو اُس کاغذ کو انہوں نے بہت تلاش کیا لیکن
وہ نہ ملا کیونکہ وہ ایک ڈیسک کے نیچے داخل ہو گیا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ طلبہ کو اُس کاغذ کا پتہ
چل جائے۔ آخر پروفیسر صاحب نے یہ کہہ کر کلاس کو چھٹی دے دی کہ مجھے ایک ضروری کام کے لئے جانا ہے اسلئے
آج کا سبق یہیں ختم کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ وہ کاغذ کی مدد کے بغیر پڑھانے سے معذور تھے۔
پروفیسر صاحب کے چلے جانے کے بعد وہ کاغذ طالب علموں نے اٹھا کر دیکھا تو سارے سبق کا ترجمہ پروفیسر
صاحب نے اُس پر لکھ رکھا تھا۔

اس واقعہ کا بیان اس لئے کر دیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مولانا روحی اور
دوسرے عربی کے پروفیسروں کے درمیان طریقۂ تعلیم میں کیا فرق تھا۔ مولانا مرحوم تو کتاب بھی سامنے
نہیں رکھتے تھے کیونکہ ہر سال پڑھاتے پڑھاتے اُن کو وہ کتاب تقریباً حفظ ہو جاتی تھی۔

حادثۂ چشم

مولانا مرحوم کو ملازمت کے تیسرے سال یعنی ۱۸۹۵ء میں حادثۂ چشم پیش آیا۔ جو یہ تھا:

پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو انگریزی زبان میں ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں آپ کو کسی امتحان میں ممتحن بننے کی پیشکش کی گئی تھی۔ مولانا چونکہ خود انگریزی پڑھے ہوئے نہیں تھے اسلئے اپنے ایک ہم کار میر عبدالواحد سے جو سائنس کے استاد تھے وہ چٹھی پڑھانے کے لئے گئے۔ میر صاحب اس وقت لڑکوں کو سائنس کا کوئی عملی تجربہ کرا رہے تھے۔ ایک طالب علم نے ہائیڈروجن کی ٹیوب بھاپ کے آگے کی جس سے وہ ٹیوب پھٹ گئی اور اس کا ایک ریزہ مولانا کی آنکھ میں آ لگا۔ انہیں فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا جو کامیاب ہو گیا اور آپ کی آنکھ پر پٹی باندھ دی گئی۔ مولانا کو ڈاکٹر نے چند دن ہسپتال ہی میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا لیکن مولانا نے باصرار ڈاکٹر سے گھر آنے کی رخصت لے لی۔ گھر آکر ڈاکٹر کی نگرانی میسر نہ ہو سکتی تھی اور ہسپتال جیسی احتیاط بھی ممکن نہ تھی اسلئے اس آنکھ کی بینائی بحال نہ ہو سکی لیکن چونکہ آپ کو کتب بینی کا انتہائی شوق تھا اسلئے ایک ہی آنکھ سے کام لیتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری آنکھ کی بینائی بھی کمزور ہو گئی حتیٰ کہ نزول الماء کا مرض لاحق ہو گیا۔ بعض احباب آپ کو آپریشن کرانے کا مشورہ دیتے رہے لیکن ہسپتال میں ٹھہرنے کی پابندی آپ کو گوارا نہ تھی اسلئے آپریشن کا خیال آپ نے چھوڑ دیا۔

اس حالت میں کتب بینی تو بالکل ختم ہو گئی بلکہ قرآن مجید کی تلاوت بھی جس کے آپ عادی تھے ختم ہو گئی اور اس دور میں آپ اپنے کسی صاحبزادہ یا کسی اور عزیز سے باقاعدگی کے ساتھ قرآن مجید سنتے رہے۔ اس حادثہ فاجعہ کے بارے میں آپ نے فارسی اشعار میں ایک نظم بھی کہی جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔

ملازمت سے سبکدوشی

اہل خانہ کا بیان ہے کہ مرحوم و مغفور مولانا کی عام صحت بہت اچھی تھی۔ وہ روزانہ مسواک کرنے کے عادی تھے، چنانچہ آخر عمر تک ان کے تمام دانت صحیح طور پر کام کرتے رہے۔ گاہے ماہے معمولی نزلہ و زکام کی شکایت ہو جایا کرتی تھی۔ ایسی صورت میں بھی وہ اپنی

ذمہ داری کو محسوس کرتے تھے فرائض منصبی بدستور بجا لاتے رہے۔ وہ کالج سے رخصت لینے کے عادی نہ تھے۔
مولانا کی اس صفت کا ذکر علامہ علاء الدین سالک مرحوم نے بھی کیا ہے۔ انجمن کے قواعد کے مطابق
اُن کو ملازمت سے سبکدوشی ۱۹۲۹ء میں ہو جانی چاہئیے تھی لیکن اُن کے حسن کارکردگی اور ذمہ داری
کے احساس کی بنا پر انجمن انہیں سبکدوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسلئے ملازمت میں انہیں ایک سال کی
توسیع دے دی۔ سال گزر جانے کے بعد انہیں دوبارہ ایک سال کی مزید توسیع دی گئی حالانکہ آپ کمزوریٔ
نظر کی وجہ سے آمد و رفت میں تکلیف محسوس کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء کے آخر میں انجمن نے انہیں اور توسیع دینے
کا ارادہ کیا لیکن مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میری نظر چونکہ صحیح کام نہیں کرتی اسلئے ازراہ مہربانی مجھے مزید توسیع
سے معاف رکھا جائے۔ چنانچہ آپ دسمبر ۱۹۳۱ء کے آخر میں کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اُس وقت
اُن کی تنخواہ تقریباً پونے تین سو روپے ماہوار تھی۔ اس قدر قلیل تنخواہ کے باوجود اُن کی قناعت پسندی
اور نیک نیتی کی وجہ سے انہیں مالی معاملات میں کبھی کوئی تکلیف پیش نہ آئی۔ انہوں نے اپنے تمام
بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے بعد اُن کی شادیاں بھی کیں اور اپنے بعد کچھ جائداد بھی چھوڑی مثلاً گاؤں
میں معافی والی زمین کے علاوہ کچھ زمین بھی خریدی۔ لاہور میں چار پانچ کنال سفیدہ زمین بھی چھوڑی
لاہور میں دو مکان بھی آپ نے اسی تنخواہ میں تعمیر کرائے اور کچھ نقد مال بھی چھوڑا۔

آپ کی خدمات کا اعتراف

انجمن حمایت اسلام ایک رفاہی ادارہ تھا جس کی بیشتر
آمدنی کا دار و مدار قومی چندوں پر تھا اسلئے اُس کے ملازمین کی سبکدوشی کے موقع پر کسی ملازم
کو پنشن یا وظیفہ دئیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے وقت صرف
آپ کا سب سے بڑا صاحبزادہ محکمۂ اکاؤنٹس میں ملازم تھا اور باقی تمام بیٹے ابھی زیر تعلیم تھے۔
چنانچہ آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کالج کمیٹی نے تاحینِ حیات آپ کو ایک
معقول رقم بطور پنشن دینے کی تجویز اپنی سفارش کے ساتھ انجمن کی جنرل کاؤنسل کو بھیج دی۔ اجلاس
میں گو بعض ارکان نے یہ کہا کہ مولانا کا بڑا صاحبزادہ اچھے عہدہ پر متعین ہے اور مولانا کی زندگی بہت
سادہ ہے اور انجمن کے پاس کسی کو پنشن یا وظیفہ دینے کے لئے کوئی فنڈ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود مولانا کی
سہ ماہی وظیفہ کی شکل میں مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ پنشن ۱۹۳۲ء کے شروع سے لیکر

آپ کی وفات یعنی مئی ۱۹۵۲ء تک دی جاتی رہی

اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کالج کے بعض دیگر اساتذہ نے اپنی اپنی سبکدوشی کے موقع پر انجمن والوں کو پنشن یا وظیفہ کی درخواستیں بھیجیں اور انتہائی کوششوں کے باوجود انجمن کے ارباب حل و عقد نے یہ کہہ کر اُن کی درخواستوں کو رد کر دیا کہ مولانا روحی کے معاملہ کو پیش نظر رکھ کر اس قسم کی درخواست منظور نہیں کی جاسکتی کیونکہ اُن کی خدمات منفرد اور بے نظیر ہیں۔ چنانچہ شیخ ایم ۔ اے غنی (پروفیسر انگریزی)، سید عبدالقادر (پروفیسر تاریخ)، خواجہ دل محمد (پروفیسر ریاضی) مولانا محمد عمر (پروفیسر فارسی و دینیات) وغیرہ سب نے لمبی مدت تک انجمن کی ملازمتیں کیں لیکن اُن میں سے کسی کو بھی اس شرف سے نہ نوازا گیا۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور اُن کی خدمات جلیلہ کے اعتراف کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ (۶۲ : ۴)

اس کے علاوہ اسلامیہ کالج سے متعلق کریسنٹ ہوسٹل کے مختلف حصوں کو چھ بلاکوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اُن کے نام بعض ممتاز پروفیسروں کے ناموں پر رکھے گئے چنانچہ اُن چھ بلاکوں کے نام حسب ذیل ہیں [1]

(۱) روحی بلاک
(۲) ایم ۔ اے غنی بلاک
(۳) شیرانی بلاک
(۴) تاثیر بلاک
(۵) ایچ ۔ اے خان (حمید احمد خان) بلاک
(۶) محمد عمر بلاک

تلامذہ

مولانا روحی کے دور میں مسلمان طلبہ کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے صرف دو ادارے ایسے تھے جن میں انہیں آسانی سے داخلہ مل جاتا تھا اول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسرے

1 The Crescent Hostel Directory and Diary 1963/64

اسلامیہ کالج لاہور۔ ہندوؤں اور سکھوں کے کالجوں میں مسلمانوں کے داخلے میں سخت دقت پیش آتی تھی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی بڑے بڑے آدمیوں کے بچوں یا اُن طالب علموں کو جن کی بہت اعلیٰ سفارش ہوتی، داخلہ ملتا تھا اور ایسے مسلمان طلبہ کی تعداد آٹے میں نمک کی طرح تھی۔ اُس وقت تقریباً تمام نامور سیاست دان، ادباء، شعراء، اساتذہ، صحافی، سول اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر اگر کوئی مسلمان کسی اسامی پر لگایا جاتا تو انہی دونوں اداروں سے فارغ التحصیل ہوتا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی چونکہ لاہور سے کافی دور تھی اسلئے پنجاب کے اکثر و بیشتر طالب علم مالی وسائل کے پیشِ نظر اسلامیہ کالج لاہور ہی میں داخل ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ مولانا روحی مرحوم کے تقریباً چالیس سالہ تدریسی دور میں ہزارہا شاگردوں نے اُن سے فیض پایا۔ عربی کے علاوہ چونکہ مولانا مرحوم دینیات کے بھی استاد تھے جو کالج کے تمام طلبہ کے لئے اسلامیہ کالج میں ایک لازمی مضمون خیال کیا جاتا تھا، اس لئے تقریباً ہر طالب علم کا آپ سے پالا پڑتا تھا۔

علاوہ ازیں ہفتہ وار مذہبی لیکچر میں بھی تمام طلبہ کی حاضری لازمی تھی اسلئے تقریباً کالج کے تمام طلبہ کا کسی نہ کسی طرح مولانا مرحوم سے تعلق ہو جاتا تھا۔ ایسے شاگردوں کی ایک مکمل فہرست اتنے عرصہ کے بعد شاید تیار نہ ہو سکتی ہو لیکن بعض ایسے شاگردوں کے نام جو بعد میں بعض کلیدی اسامیوں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے حسبِ ذیل ہیں:

(۱) بابائے لاہور میاں امیر الدین (صدر انجمن حمایت اسلام لاہور)

(۲) قاضی بشیر احمد شبلی مرحوم (ہیڈ ماسٹر چشتیہ ہائی سکول لاہور)

(۳) آغا بیدار بخت خان مرحوم (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب لاہور)

(۴) جناب حفیظ اللہ صاحب (ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر بہاولپور)

(۵) جناب حمید نظامی مرحوم (بانی روزنامہ نوائے وقت لاہور)

(۶) چوہدری خوشی محمد ناظر مرحوم (سابق گورنر ریاست جموں و کشمیر)

(۷) خواجہ دل محمد مرحوم (پروفیسر ریاضی و سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور)

(۸) چوہدری رحمت علی مرحوم (جنہوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا)

(۹) جناب ایس۔ اے ہارون (سابق پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور)

(١٠) مولوی سراج الدین پال مرحوم (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب لاہور)

(١١) شیخ سردار علی صاحب (پروفیسر ایچی سن کالج لاہور)

(١٢) خلیفہ شجاع الدین مرحوم (بار ایٹ لاء ہائی کورٹ پنجاب لاہور)

(١٣) میاں شمس الدین مرحوم (مالک مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور)

(١٤) میاں شمس الدین صاحب مرحوم (سابق پرنسپل اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور)

(١٥) ڈاکٹر صدر الدین مرحوم (سابق صدر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج لاہور)

(١٦) مولوی ظفر اقبال صاحب (ریٹائرڈ رجسٹرار امتحانات محکمہ تعلیم پنجاب، لاہور)

(١٧) پروفیسر عبد البشیر آذری مرحوم (شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

(١٨) مفتی عبد الحمید مرحوم (ریٹائرڈ چیف پوسٹ ماسٹر جی پی او، لاہور)

(١٩) میاں عبد الرحیم صاحب (ریٹائرڈ ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی دروازہ لاہور)

(٢٠) پروفیسر عبد القیوم صاحب بٹ (سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)

(٢١) مرزا عبد اللہ انور بیگ صاحب (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب، لاہور)

(٢٢) جناب عبد المجید صاحب (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکولز سرگودھا)

(٢٣) مولانا عبد المجید سالک مرحوم (سابق ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" و مؤلف کتب کثیرہ)

(٢٤) جناب عبد الواحد صاحب یوسفی (ریٹائرڈ سیکشن آفیسر پنجاب گورنمنٹ لاہور)

(٢٥) جناب عبد الرحمن صاحب (پرنسپل اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی)

(٢٦) ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم (سابق صدر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج و پنجاب یونیورسٹی لاہور)

(٢٧) ڈاکٹر غلام جیلانی برق (پروفیسر گورنمنٹ کالج کیمبلپور و مؤلف کتب کثیرہ)

(٢٨) مولانا غلام رسول مہر مرحوم (سابق ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" و مؤلف کتب کثیرہ)

(٢٩) ملک غلام محمد مرحوم (سابق گورنر جنرل اسلامی جمہوریہ پاکستان)

(٣٠) چوہدری فتح محمد بٹالوی مرحوم (جیل روڈ لاہور)

(٣١) خان صاحب قاضی فضل حق مرحوم (سابق صدر شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج لاہور)

(٣٢) شیخ فضل محمد صاحب (ایڈووکیٹ ساہیوال)

(۳۳) ماسٹر فقیر محمد مرحوم (پروفیسر گورنمنٹ کالج گجرات)

(۳۴) مولوی کریم بخش مرحوم (شعبہ عربی گورنمنٹ کالج لاہور)

(۳۵) خواجہ گلزار احمد صاحب (مالک خواجہ بک ڈپو، اردو بازار لاہور)

(۳۶) سردار محمد ابراہیم (سابق صدر آزاد کشمیر)

(۳۷) شیخ محمد امین صاحب (سابق لائبریرین اسلامیہ کالج لاہور)

(۳۸) مولوی محمد بخش مسلم (خطیب مسجد مینار والی لوہاری دروازہ، لاہور)

(۳۹) ابوالعالم مولوی محمد حبیب اللہ گجراتی مرحوم (جامعہ پنجاب شعبہ عربی کے استاد سید محمد کبیر احمد مظہر کے جد امجد)

(۴۰) شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی مرحوم (سابق پرنسپل طبیہ کالج لاہور)

(۴۱) چوہدری محمد حسین مرحوم (سابق انچارج گورنمنٹ پریس لاہور)

(۴۲) ملک محمد حسین صاحب (ریٹائرڈ پرنسپل کینٹ پبلک سیکنڈری سکول راولپنڈی)

(۴۳) چوہدری محمد خان مرحوم (ٹیچر زمیندارہ ہائی سکول گجرات)

(۴۴) ملک محمد خان صاحب (ریٹائرڈ میجر، ماڈل ٹاؤن لاہور)

(۴۵) ستارہ پاکستان خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج و صدر شعبہ اردو دائرۃ المعارف)

(۴۶) مولوی محمد شفیع مرحوم (سابق ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی دروازہ لاہور)

(۴۷) چوہدری محمد علی مرحوم (سابق وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان)

(۴۸) ملک محمد علی مرحوم (سابق پروفیسر فارسی گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان)

(۴۹) جناب محمد نصیر ہمایوں (مالک قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور)

(۵۰) چوہدری محمد یعقوب صاحب (ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز سرگودھا ڈویژن)

(۵۱) میاں مولا بخش خضر تمیمی مرحوم (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب لاہور)

(۵۲) سید ناصر حسین رضوی (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ جیل، لاہور)

(۵۳) جناب نذیر نیازی، مرحوم (گالف روڈ، لاہور)

مندرجہ بالا اسمائے گرامی حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیئے گئے تھے لیکن بعد میں کچھ ناموں کا پتہ چلا جو یہ ہیں۔ ا۔ سید سعادت علی شاہ مرحوم سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج ساہیوال، مولوی عبدالرحمن کشمیری ہیڈ ماسٹر ہائی سکول لاہور، جناب علم الدین مرحوم پروفیسر فارسی گورنمنٹ کالج سرگودھا، مولوی غلام محمد مرحوم جھنگ، جناب فیروز حسن بٹ مرحوم، تاجر کتب اردو بازار لاہور، محمد امین مرحوم ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی لاہور۔

مندرجہ بالا حضرات میں سے کئی تو مدت ہوئی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بعض ایسے ہیں جن کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور بعض چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔ ان میں سے جن حضرات سے مولانا مرحوم کے بارے میں کچھ حالات دستیاب ہوئے۔ مقالہ کے آخر میں دستاویزی ثبوت کے طور پر ضمیمہ کی شکل میں مرتب کر دئیے گئے ہیں اور کوشش یہی کی گئی ہے کہ اُن حضرات نے جن الفاظ میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے اُن کو من و عن نقل کر دیا جائے تاکہ اُن کے عطا کردہ مضمون کی روایت کی ذمہ داری انہیں پر رہے۔ گو ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی ہیں جن سے بار بار اپنے خیالات کے اظہار کی نسبت کہنا پڑا اور بعض نے بار بار وعدے کر کے توڑ دئیے لیکن اس کام کے لئے کسی کو زبردستی مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہر صورت جنہوں نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اُن سب کا شکر گزار ہونا ضروری ہے۔ بعض وعدہ کرتے کرتے دنیا سے ہی چل بسے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

ملازمت کے علاوہ دیگر مشاغل

مولانا مرحوم کسی صورت میں بھی حتی الوسع وقت کو ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہی عادت تھی جس کی بدولت وہ یتیم ہو جانے کے بعد تنگ دستی، فاقہ کشی اور ہمت و استقلال سے کام لے کر اس حالت کو پہنچے تھے۔ ملازمت کی ذمہ داریوں کے علاوہ وہ اور رفاہی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۸۹۶ء[1] کو خلیفہ حمید الدین (قاضی لاہور) کا انتقال ہوا۔ خلیفہ صاحب انجمن حمایت اسلام کے میر مجلس تھے اور اُن کی سرپرستی میں انجمن نے بہت ترقی کی تھی انہیں اللہ تعالیٰ نے کئی نعمتوں سے ممتاز فرمایا تھا۔ قرآن مجید کا حافظ ہونے کے علاوہ وہ زیارت حرمین سے بھی مستفید ہو چکے تھے۔ اُن کا شمار صاحب فتویٰ علماء میں ہوتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ اُن کی وفات انجمن حمایت اسلام کے لئے سخت نقصان کا موجب ثابت ہوئی۔ اپنے اس قسم کے محسن کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے انجمن کی مجلس منتظمہ نے ستمبر ۱۸۹۷ء میں یہ فیصلہ کیا کہ جناب خلیفہ حمید الدین صاحب مرحوم کی یاد میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے اور اُسے مدرسہ حمیدیہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔[2]

1 ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور بابت ماہ مئی ۱۸۹۶ء ص ۳۳ تا ۳۶

2 ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور بابت ماہ اگست ۱۸۹۷ ص ۳۰

مولانا روحی مرحوم نے خلیفہ صاحب کی وفات پر عربی میں ایک نہایت اعلیٰ مرثیہ لکھا جو اُن کے عربی دیوان میں دیکھا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اس فیصلہ کے پیشِ نظر ۱۷ر اکتوبر ۱۸۹۷ء کو اس مدرسہ کا اجراء عمل میں آیا۔ اس مدرسہ کا نصاب خلیفہ حمید الدین صاحب مرحوم کی وفات سے پہلے اُن کی زیرِ نگرانی تیار کیا گیا تھا۔ یہ نصاب ندوۃ العلماء ہند، جامعہ ازہر مصر اور پنجاب یونیورسٹی کے اس دور کے نصاب کو مدِ نظر رکھ کر ایسی طرح تیار کیا گیا تھا، جس سے ایک پرائمری پاس طالب علم چھ سال کے عرصہ میں یعنی بیس یا بائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک دینی تعلیم کو مکمل کر سکتا تھا۔ اس مدرسہ کی ضرورت خلیفہ صاحب مرحوم کی زندگی میں ہی محسوس ہوتی تھی۔ ابھی اس مدرسہ کا اجراء زیرِ تجویز ہی تھا کہ خلیفہ صاحب انتقال فرما گئے اسلئے اس مدرسہ کو انہیں کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔[1]

اجراء کے موقع پر مولانا روحی مرحوم نے ایک فارسی نظم لکھی جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

۱۔ جن اساتذہ کو اس مدرسہ کی تدریس کے لئے منتخب کیا گیا اُن میں مولانا روحی بھی شامل تھے جیسا کہ علامہ محمد اقبال فاروقی لکھتے ہیں:[2]

" اس مدرسہ حمیدیہ نے مسلک اہلِ سنت کی بہت زیادہ خدمات انجام دیں اور ملک کے بڑے بڑے لائق اساتذہ نے اس میں بطور مدرس کام کیا جن میں سے مفتی عبداللہ ٹونکی، حکیم غلام مصطفیٰ (ایم۔او۔ایل)، مولانا محمد ذاکر بگوی اور مولانا اصغر علی روحی رحمہم اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۰ء تک بڑے انتظام و اہتمام سے کام کرتا رہا۔ "

۲۔ انجمن نعمانیہ ہند لاہور بھی دینی تعلیم کا ایک پرانا ادارہ ہے جو سنہ ۱۳۰۴ھ میں قائم کیا گیا اور آج تک بھاٹی دروازہ کے اندر ٹبی پولیس اسٹیشن کے قریب کامیابی سے چل رہا ہے۔ گو زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں بھی وہ بات نہیں رہی جو ابتدائی مراحل میں نمایاں تھی تاہم اُس کا وجود غنیمت ہے۔ وہ بھی انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی طرح اپنے سالانہ جلسے نہایت اہتمام سے منعقد کرتی تھی۔

مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ اس انجمن کے دینی مدرسہ میں بھی اعزازی طور پر درس و تدریس کا

۱۔ سالانہ رپورٹ انجمن حمایتِ اسلام لاہور، بابت ۱۸۹۷ء ص ۱۳ تا ۱۵

۲۔ تذکرہ علماء اہلِ سنت و جماعت ص ۲۵۰-۲۵۱

کام کرتے تھے اور اُن کے سالانہ جلسوں میں تقریر کے علاوہ اپنا فارسی کلام بھی سنایا کرتے تھے۔ عربی میں بھی ایک قصیدہ اس انجمن کے سنہ ۱۳-۱۳۱۲ھ کے جلسہ میں آپ نے پڑھا جس میں امام اعظم نعمان بن ثابت یعنی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی منقبت پیش کی کیونکہ یہ انجمن انہی کے نام سے منسوب ہوتی تھی۔ یہ قصیدہ آپ کے عربی دیوان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس انجمن کے سلسلے میں ایک واقعہ جو انجمن نعمانیہ کی روئداد[1] میں بھی چھپا حسب ذیل ہے

"خداوند قادر مطلق کریم و رحیم نے ماہ مئی ۱۹۳۶ء میں انجمن کو اپنے فضل و کرم سے مبلغ ایک ہزار ایک صد پچھتر روپیہ (۱۱۷۵/-) کی رقم نقد غیر مترقبہ عطا فرمائی جس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک مائی صاحبہ مسماۃ سردار بیگم حج بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لے گئیں۔ وہاں پر ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا مبلغ پندرہ صد روپیہ (۱۵۰۰/-) حاجی جہانگیر صاحب پیش امام اونچی مسجد بھاٹی دروازہ کے پاس امانت تھا۔ اُن کو مرحومہ کی وصیت تھی کہ یہ رقم کسی کار خیر پر خرچ کریں۔ ورثاء مرحومہ نے عدالت میں دعوےٰ دائر کیا اور جہاں فریقین کی مرضی سے وہ رقم جناب شیخ عبد الحمید صاحب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کے پاس اس وقت تک امانت رکھی گئی جب تک کہ مولانا اصغر علی صاحب روحی تمام حالات کی تحقیقات کر کے شرعی فیصلہ فرما دیں۔ یہ معاملہ ہماری انجمن کے صدر جناب خانصاحب حاجی سراج دین صاحب کے علم میں آیا جو حکیم محمد شریف صاحب اکسیر گر نے بتلایا تھا انہوں نے حاجی جہانگیر صاحب سے اسکی تصدیق کی اور دبیر کو معہ شمول میاں مولا بخش صاحب رکن شوریٰ مولانا روحی صاحب موصوف کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ انجمن کے حالات ماضیہ اور حقوق انجمن ان پر ظاہر کریں۔ مولانا موصوف نے جو انجمن کے حالات سے زمانہ قدیم سے واقف چلے آتے ہیں کچھ ایک استفسارات فرمائے جن کے تسلی بخش جوابات دبیر نے پیش کئے۔ مولانا موصوف نے مرحومہ کے تمام حالات اور رقم امانت وغیرہ کی نسبت مکمل تحقیقات فرما کر فیصلہ دیا کہ نظر بحالات مالی انجمن نعمانیہ ہند لاہور جو ایک دینی ادارہ ہے حقوق انجمن فائق ہیں اور جناب حاجی شیخ عبد الحمید صاحب نے مبلغ گیارہ صد پچھتر روپے (۱۱۷۵/-) انجمن کو دلا دئیے اس کار ثواب میں میاں مشیر محمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) ان کے بھانجے اور بھتیجے چوہدری درگاہ حضرت داتا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین اور ورثاء مرحومہ ہیں اور حاجی چوہدری اللہ دتہ صاحب بہشتی مالی نیز حاجی شیخ عبد الحمید صاحب نے کافی سعی فرمائی اور ان سب صاحبان اور جناب مولانا موصوف کا خاص شکریہ ہے"

[1] روئداد انجمن نعمانیہ ۱۹۳۶ء جلد ۵۰ شمارہ ۱ تا ۱۲ صفحہ ۷-۸

اللہ تعالیٰ انہیں اجر دارین عطا فرمائے۔"

مذکورہ مدرسہ حمیدیہ کے قیام سے پہلے مئی ۱۸۹۶ء میں انجمن حمایت اسلام کی مجلس منتظمہ نے یہ تجویز پیش کی کہ عربی و دینی تعلیم کو وسعت دی جائے جو بالاتفاق منظور کر لی گئی اور اسی معاملے کے ہر ایک پہلو پر نظر کر کے یہ قرارداد منظور کی گئی کہ انجمن نعمانیہ کے دینی مدرسہ کو جو پہلے ہی سے لاہور میں جاری ہے اسلامیہ کالج کے متعلق کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ دونوں انجمنیں (انجمن حمایت اسلام اور انجمن نعمانیہ) مل کر اور یکجا ہو کر اس مدرسہ کو ترقی دیں۔ اس صورت میں انجمن کا مدعا حاصل ہونے کے علاوہ دونوں انجمنوں کے اتفاق اور اتحاد سے جو فائدہ حاصل ہوگا وہ قوم کے حق میں باعث برکت ہوگا۔ اگر خدانخواستہ انجمن کی کوشش کامیاب نہ ہو تو پھر کالج کے متعلق خالص دینی تعلیم کی شاخ کھولی جائے۔ چنانچہ جنرل کمیٹی کی اس قرارداد کے مطابق سیکرٹری انجمن حمایت اسلام (منشی شمس الدین صاحب مرحوم) نے انجمن نعمانیہ کے سیکرٹری (مفتی سلیم اللہ صاحب) کے ساتھ اس سلسلے میں خط و کتابت شروع کی اور ۲ (۲) جون ۱۸۹۶ء کو سیکرٹری انجمن نعمانیہ کے نام پہلا خط لکھا اور یہ سلسلۂ خط و کتابت[1] جولائی ۱۸۹۷ء تک جاری رہا۔ دونوں انجمنوں کے وکیلوں کا اجتماع ۲ (۲) اگست ۱۸۹۷ء کو شاہی مسجد میں ہوا جس میں کسی قدر گفتگو کے بعد خان بہادر شیخ خدا بخش صاحب جج عدالت خفیفہ نے فرمایا کہ "نظر بر حالات و خیالات مجلسین میرے نزدیک ابھی ان دونوں مجلسوں کے ملنے کا موقع نہیں آیا۔ پس یہ دونوں اپنے اپنے طریق کے مطابق اپنا اپنا کام کریں۔ اگر کوئی اور مدرسہ دینیہ جاری بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ قوم کو ایسے کئی مدرسوں کی ضرورت ہے۔"

جناب شیخ صاحب کی اس رائے کے ساتھ اکثر حاضرین نے اتفاق کر لیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انجمن نعمانیہ اپنی ترکیب اور اپنے سارے سلسلے کو صرف حنفیوں تک محدود رکھنا چاہتی تھی اور انجمن حمایت اسلام کے اغراض و مقاصد وسیع تھے جو تمام کلمہ گو مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس فیصلے کو جب مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اگست ۱۸۹۷ء میں پیش کیا گیا تو بالاتفاق یہ فیصلہ کیا گیا کہ ساری خط و کتابت ممبران انجمن کی اطلاع کے لئے جو ایک عرصہ سے اس کے نتیجے کے منتظر ہیں بذریعہ رسالہ شائع کی جائے۔ نیز یہ بھی قرار پایا کہ حسب ہدایت و فیصلہ جلسہ عام منعقدہ ۱۷ مئی ۱۸۹۶ء

1۔ یہ تفصیل اور دونوں انجمنوں کی باہمی خط و کتابت کے لئے انجمن حمایت اسلام کا ماہوار رسالہ بابت اگست ۱۸۹۷ء ص ۳ تا ۳۰ دیکھئے۔

اسلامیہ کالج کے متعلق مدرسہ عربیہ دینیہ کی ایک شاخ کھول دی جائے اور اُس سے متعلق تجاویز پر غور کرنے کے لئے چھ ممبروں کی ایک سب کمیٹی مقرر کر دی گئی۔

ان مصروفیات کے علاوہ مولانا روحی رسالہ الہدیٰ کے ترتیب دینے اور اس کے لئے مفید مضامین لکھنے پر بھی کافی وقت صرف کرتے تھے۔ اسی رسالہ کا مفصل ذکر اُن کی علمی خدمات کے ضمن میں ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ اگر کوئی طالب علم پرائیویٹ طور پر آپ سے دینی علوم سے متعلق کوئی کتاب پڑھنا چاہتا تو اُس سے بھی آپ نے کبھی انکار نہ کیا بلکہ کوئی نہ کوئی وقت اُس کے لئے حالات کے پیش نظر مقرر فرما دیتے تھے اور کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ عموماً عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت اسی کام کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ آپ کے پاس بہت سے استفتاء بھی آیا کرتے جن کا جواب لکھنے میں کتب کے حوالے اور اُن کے مطالعہ پر بھی وقت صرف ہوتا۔ عبادت اور ریاضت میں بھی وہ صبح و شام مصروف رہتے۔ ان کی عادت کم خوردن، کم گفتن، کم خفتن تھی لیکن عمل کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

اگرچہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجتماعات اب بھی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے وسیع میدان میں منعقد ہوتے رہتے ہیں مگر اُن میں قومی تشخص، وقار، جوش و ولولہ اور اُس شان و شوکت کا عشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا جو اُس دور کے جلسوں کا خاصہ تھا۔ اس کا ایک سبب تو غالباً اُس جذبہ مسابقت کا فقدان ہے جو غیر مسلم اقوام کے یہاں رہنے سے مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھا۔ دوسری وجہ ایسے راہنمایانِ قوم اور بے لوث اکابرِ ملت کا دنیا سے اُٹھ جانا ہے جو دینِ حنیف کی عظمت اور سطوت کو آسمان رفعتوں سے ہم کنار دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اُن میں سر سید احمد خان، حافظ ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد اور علامہ اقبال رحمہم اللہ کے نام نامی فخر سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف مسلمان والیانِ ریاست مثلاً نواب بہاولپور، نظام دکن وغیرہ کی شرکت اُن جلسوں کی رونق اور چہل پہل کو چار چاند لگا دیا کرتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

غرض اُس زمانے میں انجمن کے جلسوں کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے بڑے بڑے جیّد علماء، ادباء، شعراء شرکت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ جلسے کیا تھے؟ تبلیغ اسلام کے

جذبے سے سرشار حضرات کے لئے بہترین اور زرین مواقع تھے۔

مولانا روحی مرحوم بھی اُن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے اور "اسلامی نظریہ تعلیم، اسلام اور علوم جدیدہ، حقیقت نبوت اور توحید ذات باری" وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر اپنے گراں مایہ خیالات کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی ان تقاریر کے متون آج بھی انجمن حمایت اسلام کے ماہوار رسالے کی پرانی فائلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ اکثر تقریر کے علاوہ اپنے فارسی اشعار بھی ان جلسوں میں پیش کیا کرتے تھے۔ اسی سے آپ کی علمیت وقابلیت کا لوگوں کو پتہ چلا اور سر سید احمد خاں مرحوم نے ڈپٹی برکت علی مرحوم کی معرفت مولانا کو علی گڑھ اینگلو محمڈن سکول میں بطور صدر معلم عربی کا عہدہ دینے کی پیشکش کی۔ یہی سکول ترقی کے مدارج طے کر کے بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کہلانے لگا۔

مولانا روحی کے تلامذہ، معتقدین اور احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا جو ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن میں سے بعض اعلیٰ سرکاری عہدوں اور حکومت کی اسامیوں پر فائز تھے اور بعض چوٹی کے رئیس اور زمیندار ہونے کے باعث اپنے اپنے حلقوں میں بہت اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ یہ سب لوگ اپنی اکثر اپنے ہاں مذہبی جلسوں میں شرکت کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں آپ کو کئی بار بہاولپور اور دہلی جانے کا اتفاق ہوا اور صوبہ پنجاب کا تو شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو جہاں آپ نے تبلیغی دورہ نہ کیا ہو۔ شہروں کے علاوہ دور افتادہ دیہات میں بھی تشریف لے جانے میں تکلیف محسوس نہ کرتے تھے کیونکہ دل میں خلوص تھا اور طرز بیان انتہائی موثر اور دلنشین اسلئے جہاں ایک دفعہ ہو آتے وہاں کے باشندے بار بار آپ کی دعوت نامے بھجواتے رہتے اور بالاصرار آپ کو اپنے ہاں لے جاتے مختصر یہ کہ آپ نے ہر ممکن طریقے سے کلمۂ حق سنانے کی کوشش کی اور ایک انتہائی مصروف زندگی گزاری اور سوائے کالج سے تنخواہ پانے کے کسی کام کا کوئی معاوضہ نہ لیا۔

مولانا کا حلقہ احباب

چونکہ مولانا مرحوم کالج میں استاد ہونے کے علاوہ لاہور کے سربرآوردہ علماء میں سے تھے اور وہ بیک وقت عالم دین ہونے کے علاوہ مفتی بھی تھے۔ امام اور خطیب بھی تھے۔ مقرر اور مصنف بھی تھے۔ صحافی اور شاعر بھی تھے۔ صاحب حال اور صاحب قال بھی تھے اسلئے انہوں نے ایک بھرپور مجلسی زندگی بسر کی جس کی وجہ سے اُن کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا جس میں شہر کے بڑے بڑے علماء

اور امراء کے علاوہ معمولی تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل تھے۔ مولانا سب کے حسبِ حال اُن سے گفتگو فرماتے اور وہ مختلف حیثیتوں سے ملک بھر کے لوگوں سے روشناس تھے۔ اس سلسلے میں اُن کے فاضل شاگرد ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم بیان کرتے ہیں[1]

"اُس وقت جن اساتذہ سے میں نے فیض پایا اُن میں شمع جمع انجمن مولانا اصغر علی روحی مرحوم کا ذکر سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ مولانا روحی کو فارسی اور عربی زبان و ادب میں تبحر کے علاوہ علوم جدیدہ سے بھی واقفیت حاصل تھی۔ وہ صاحبِ علم بھی تھے اور صاحبِ عمل بھی، دانشمند اور درویش صفت جن کے اخلاق نیک مردوں کے تھے۔ پرانے بزرگوں کی طرح اُن کی زندگی جوارِ مسجد میں گزری۔ ہر طرح کی سادگی سے آراستہ اور ہر طرح کے تکلفات سے بری۔ صحیح ادبی ذوق اور نقد سخن میں انہیں قوی ملکہ حاصل تھا۔ کالج میں اور گھر پر محاسن و معائب سخن کے پرکھنے پر وہ ہمیشہ زور دیتے تھے۔ ایک زمانے میں "الہدیٰ" کے نام سے انہوں نے ماہوار دینی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ناقدانِ بصیر اُسے بہت پسند کرتے تھے۔ مگر اس قسم کے رسالوں کے مصارف کثیر ہوتے ہیں اور صرف چندے سے انہیں پورا کرنا بہت دشوار۔ چند سال کے بعد وہ رسالہ بند ہو گیا۔ مولانا روحی فارسی اور عربی دونوں میں استادانہ شعر بھی کہتے تھے۔ مگر ابھی تک اُن کا کلام جمع نہیں ہوا۔ اپنے بچوں کو عربی اور فارسی کے اعلیٰ ادب کا تمام نصاب انہوں نے سبقاً سبقاً خود پڑھایا۔ اپنی کثیر مصروفیتوں اور مشاغل کے باوجود یہ کام وہ پوری توجہ سے اور ایک طویل مدت تک التزام کے ساتھ سرانجام دیتے رہے اور اس بارے میں انہوں نے قابلِ تقلید مثال قائم کی۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ مولانا روحی نے خیر الناس من ینفع الناس کو اپنا شعارِ زندگی قرار دے رکھا تھا اسلئے اُن کے مداحوں اور عقیدت مندوں کی تعداد کیسے کم ہو سکتی تھی۔ اُس دور کی چند نہایت اہم اور چیدہ شخصیتوں سے آپ کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ یہ لوگ اُن کے متبحر عالم اور دینی پیشوا ہونے کی بنا پر آپ کے بہت قدردان تھے۔ مثلاً

(۱) سر میاں محمد شفیع مرحوم (بار ایٹ لاء اور مسلمانوں کے مشہور سیاسی راہنما)

(۲) میاں سر فضل حسین مرحوم (وزیر تعلیم اور مسلمانوں کے قومی راہنما)

[1] مقالات دینی و علمی ۲ : ۱۴۰—۱۴۱

(۳) شیخ سر عبد القادر مرحوم (جج ہائیکورٹ پنجاب و ایڈیٹر رسالہ مخزن لاہور)

(۴) چوہدری سر شہاب الدین مرحوم (سپیکر متحدہ پنجاب اسمبلی)

(۵) شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم (لاہور کے مشہور طبیب)

(۶) بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں مرحوم (ایڈیٹر جریدہ زمیندار)

(۷) خان بہادر مولوی محرم علی چشتی مرحوم (لیڈر اور صحافی)

(۸) علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم (شاعر مشرق)

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

مؤخر الذکر یعنی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کئی سال تک بھاٹی دروازے کے اندر مولانا مرحوم کے قریب ہی اقامت گزین رہے۔ وہ اور مولانا روحی اُس مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے جو بھاٹی دروازے کے اندر بیٹھک حکیم شہباز دین رئیس منعقد ہوا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال کئی علمی نکات اور مباحث پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے بکثرت مولانا کے ہاں آتے جاتے رہے۔ انہی دنوں مندرجہ ذیل واقعہ پیش آیا جو خود علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: [1]

"کچھ عرصہ ہوا ایک دولت مند، تعلیم یافتہ، روشن خیال اور کاروباری ہندو مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے پاس آیا۔ اس نے مولانا سے درخواست کی کہ آپ ایک الگ کمرے میں آجائیں۔ مولانا اُسکی درخواست کے مطابق تنہا کمرے میں چلے آئے اور فرمایا کیا ارشاد ہے؟ نووارد نے کہا۔ مولانا مجھے مسلمان بنا لیجیے۔ چنانچہ مولانا نے اسلام کی تلقین کی اور خدا کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اُس سے اقرار لیا اور پوچھا کہ آپ اس طرح تنہائی میں کیوں داخل اسلام ہوئے ہیں؟ نووارد نے بیان کیا: "میں نے کوئی اسلامی کتاب نہیں پڑھی۔ کسی مسلمان عالم سے دین اسلام کو نہیں سمجھا لیکن خوش قسمتی سے مجھے کئی مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی ہے۔ اب میں حضور کی محبت میں بیتاب ہوں اور اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوں"۔ مولانا نے پوچھا کہ آپ فیروزپور سے چل کر لاہور کیوں آئے

---

[1] کتاب اسلام زندہ باد ص ۲۰-۲۲

اور کھلے بندوں کیوں اسلام قبول نہیں کیا؟ نو وارد نے اس سوال کے جواب میں مولانا کے سامنے اپنی تعلیم، ملازمت، کاروبار اور جائداد وغیرہ کے حالات بیان کئے اور کہا کہ "ان حالات کی بنا پر میں اعلان سے معذور ہوں لیکن میں آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بنانے آیا ہوں۔ میں اللہ کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے ایمان کی شہادت دیجئے۔ میری یہ عرصہ سے آرزو تھی کہ میں اس دنیا میں کسی نیک مسلمان کو اپنے ایمان کا گواہ بنالوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میری یہ آرزو پوری ہو گئی"

شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم مولانا کے نہ صرف حلقہ احباب میں شامل تھے بلکہ وہ اُن کی علمی بصیرت کے بھی قائل تھے اور انہیں ایک مستند عالم خیال کرتے تھے۔ چنانچہ تیس ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے ایک مکتوب [1] میں لکھتے ہیں

شاہ رمز آگاہ شد محو نماز	خیمہ برزد از حقیقت در مجاز
نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت	دشت و دراز ہیبتش لرزندہ گشت

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے مجھے مولوی اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے لیکن فی الحال ان پیش کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار روز تک نتیجہ عرض کروں گا۔ ان اسناد کو ملاحظہ فرمائیے اور بتائیے کہ کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے۔

ایک اور روایت کے مطابق علامہ اقبال مرحوم واضح الفاظ میں مولانا روحی مرحوم کی علمی بصیرت و فضیلت کا اقرار کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں [2]

"آپ (مولانا روحی) علم کے بحرِ زخّار تھے۔ کبھی کبھی علامہ آپ کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے علامہ فرماتے ہیں کہ محاورۃً پڑھا ہے کہ دریا کوزے میں بند کر دیا گیا۔ مگر جب سے مولانا روحی سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ اس شخص میں علم کا دریا بند ہے۔ علامہ اُن کے علمی کمالات کے معترف تھے"

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ

میں ایک مرتبہ جب جنوبی ہند کے سفر سے واپس آیا اور مولانا کالج کے کمپاؤنڈ میں حسب عادت

[1] اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب اقبال) ص ۹۷

[2] ماہوار رسالہ "ضیائے حرم" اپریل ۱۹۷۵ ص ۷۶

محلات میں رہے تھے۔ طلبہ نے مولانا سے ذکر کر دیا کہ میں کمپاؤنڈ میں سے گزر کر کمرہ میں جا رہا ہوں تو آپ نے فوراً اُسی لڑکے کو میرے پیچھے بھیج دیا۔ میں مولانا کے ادب اور عظمت کو مدنظر رکھ کر ذرا مؤدب ہو کر حاضر ہو گیا اور سلام کیا فرمانے لگے کہ تم کہاں تھے نظر نہیں آئے۔ میں نے سفر کا ذکر کیا اور ساتھ سفر کی صعوبت اور حالات بیان کئے تو آپ نے فوراً فرمایا: "السفر سقر بل وسیلة الظفر" فرمانے لگے کہ علامہ اقبال کا کیا حال ہے؟ چونکہ میں اگلی شام مل چکا تھا تو میں نے فوراً کہا کہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔ بخیریت ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی گزشتہ ملاقات کا ذکر فرمایا جو علامہ سے میرے توسط سے ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ابھی میں سفر سے واپس آیا ہوں اور مختصر ملاقات میں، میں علامہ سے کوئی مفصل گفتگو نہ کر سکا۔ مولوی اصغر علی روحی صاحب نے تمام خیریت و حالات دریافت فرمائے۔

خواجہ نسیم حسین انصاری لکھتے ہیں:[1]

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ، مولانا احمد علی، خوشی محمد ناظر اور مولانا ظفر علی خاں بھی مولانا کے پاس تشریف لاتے اور گھنٹوں مختلف علمی، سیاسی اور دینی موضوعات پر اُن سے گفتگو کرتے۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:[2]

"لیکچروں کی تیاری کے سلسلے میں علامہ اکثر علمائے دین سے مشورہ کرتے تھے۔ مولانا سید طلحہ مرحوم نے مشورہ دیا تھا کہ امام شاطبی کی کتاب الموافقات کا مطالعہ قیاس کے ضمن میں کیا جائے۔ اسی طرح مولانا اصغر علی روحی کو بھی میں ایک روز علامہ کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ کوٹھی کے درمیانی حصے میں بیٹھے تھے اور حقہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ مولانا نے بے تکلفی سے حقے کا رُخ اپنی طرف کر لیا مگر معلوم ہوا کہ حقہ بجھا ہوا ہے۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ میں تو حقے سے محض باتیں کر رہا تھا۔ یہ کہہ کر علی بخش کو حقہ تازہ کر کے لانے کو کہا اور مولانا روحی اپنے مخصوص رنگ میں گفتگو کرنے لگے۔ بعض حوالوں کے سلسلے میں مولانا نے کہا کہ وہ لوگ بکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مترادفات سے ایک ہی طرح کے معنی مقصود ہیں۔ نہیں، ہر لفظ الگ الگ اپنا خاص معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:[3]

---

1. ہفت روزہ "استقلال" لاہور مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۸۳ء ص ۱۹
2. اقبال کی صحبت میں، ص ۴۴
3. ایضاً، ص ۳۰۲

"اس زمانے میں لدھیانہ کے مدرسہ اہلِ حدیث میں ایک مولوی محمد امین صاحب لدھیانوی رہتے تھے یہ مدرسہ میاں عبدالحی کے خسر میاں عبدالرحیم صاحب نے اپنے مکان سے ملحق مسجد میں قائم کر رکھا تھا۔ دوسرے روز علامہ کے فرمانے پر میں مولوی محمد امین مرحوم کو مدرسے سے علامہ کی خدمت میں لے آیا۔ وہ علمِ معقولات کے ضمن میں نہایت عمدہ قابلیت رکھتے تھے۔ علامہ نے ان سے بھی اجماع کے موضوع پر گفتگو کی۔ مگر ہنوز گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہم لدھیانہ سے لاہور آگئے لیکن یہاں بھی یہ سلسلۂ گفتگو برابر جاری رہا۔

چنانچہ لاہور آکر میں علامہ کے حکم پر ان کی خدمت میں مولوی سید طلحہ، مولوی اصغر علی روحی اور مولوی غلام مرشد صاحب کو لے کر گیا اور ان کے ساتھ طویل ملاقاتیں ہوئیں۔"

مولوی ضیاء محمد صاحب ریٹائرڈ پروفیسر فارسی لکھتے ہیں کہ "ایک دن آپ (مولانا روحی) کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ شیخ اقبال آجکل کیا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ فی الحال تو میں ان کے ہاں جا نہیں سکا۔ فرمانے لگے کہ شیخ صاحب نے مجھے شیخ محی الدین ابن العربی کی کتاب سے کچھ اقتباسات ترجمہ اور تشریح کے لئے بھیجے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ علامہ اقبال ان دنوں جاوید نامہ سپردِ قلم کر رہے تھے۔"

بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں

مولانا روحی مرحوم و مغفور کے صاحبزادہ ڈاکٹر محمد سجاد الحق رانا بیان کرتے ہیں کہ

۱۹۳۷ء میں ایک بار مولانا ظفر علی خاں مرحوم ہمارے ہاں تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی آمد سے ایک دن قبل والد مرحوم سے ملاقات کے لئے عصر کا وقت طے کر رکھا تھا۔ چنانچہ دوسرے روز وہ دو آدمیوں کی معیت میں جب ہمارے مکان پر پہنچے تو اس وقت والد مرحوم مسجد میں تشریف رکھتے تھے جو آپ کے مکان سے متصل تھی۔ میں نے وہاں جا کر انہیں مولانا ظفر علی کی تشریف آوری سے مطلع کیا۔ فرمانے لگے کہ ان سے کہو۔ "خیر البلاد عند اللہ المساجد"۔ میں نے واپس آکر یہی جملہ مولانا ظفر علی کے گوش گزار کیا۔ وہ سن کر مسکرائے اور ملاقات کے لئے مسجد ہی میں چلے آئے۔ اس موقع پر والد بزرگوار نے ایک چھوٹی سی خوبصورت فارسی نظم استقبالیہ کے طور پر انہیں پیش کی جسے پڑھ کر سنانے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ مولانا ظفر علی مرحوم رخصت ہوتے وقت اس نظم کی ایک نقل اپنے ہمراہ لے گئے اور دوسرے دن اپنے

روزنامہ زمیندار میں مع تبصرہ اُسے بڑی آب و تاب سے شائع کیا اور لکھا کہ اس نظم کے مطالعہ سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ شاعر خود تو بوڑھا ہو سکتا ہے مگر اُس کا کلام کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

ضیافتِ طبع کے لئے اس نظم کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

نہاں بر خاطرِ ما آشکار است ظفر در باغِ ملّت نوبہار است

بسعیت فتنۂ الحاد و باطل عروسِ زشت از پیرایہ عاطل

ظفر خواہی بہمت آشنا شو بزعمِ دشمناں مردِ وغا شو

جبیں سائے جنابِ کبریا باش فدائے خاکِ پائے مصطفیٰ باش

اگر دردش رگِ جانت خراشد ازیں بہ حاصلِ عزت نباشد

کسے کش نیست از دردش نصیبے بود رنجورِ مہجورُ الطبیبے بر

زفیضِ روحِ پاکاں بہرہ بردار کہ حرزِ جانِ تو آید بہرکار

بہنگامِ وداعِ دارِ فانی کشاید عقدہ از رازِ نہانی

دعائے نیم شب حصنِ حصین است تکلف برطرف نعم القرین است

توکل کن بلطفِ ربِّ ذوالمنن میندیش از بلائے شرِّ دشمن

زمن ایں حرف در آب و گلت باد فراموشی فراموشِ دلت باد

چو روحیؔ گرچہ از بزمِ تو دورم ولے چوں معنیٔ بین السطورم

خواجہ نسیم حسین انصاری کا بیان ہے:[1]

جب مولانا ظفر علی خان نے الگ جماعت "اتحادِ ملت" بنائی تو "مجلسِ احرار" سے اُن کی ٹھن گئی۔ حضرت مولانا روحی نے مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنے پاس بلایا اور انہیں ایک ہو کر کام کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے مولانا عبداللہ سلیمان کنجاہی کو فریقین میں سمجھوتہ کرانے پر مامور کیا اور اُن کی کوشش سے وقتی طور پر سمجھوتہ ہو گیا۔ جہاں مولانا روحی رہتے تھے وطن اور گرد و نواح میں اُن کے نظر آتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے ایک دفعہ مولانا روحی سے ملاقات کے بعد زمیندار میں ایک نظم لکھی

[1] ہفت روزہ "استقلال" لاہور مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۸۳ء ص ۱۹-۲۰

جس میں بتایا کہ مولانا روحی ایچوں کی فیکٹری کے درمیان رہائش رکھتے ہیں اور جس طرح مکہ مکرمہ میں بیت اللہ ایک نگینہ کی حیثیت رکھتا ہے اُسی طرح مولانا روحی کا وجود اسی علاقہ میں ایک پاکیزہ نگینہ ہے۔

سر میاں محمد شفیع

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی کا بیان ہے کہ سر محمد شفیع مرحوم کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کسی اعزاز ملنے کے موقع پر سعودی عرب کے حکمران کا تہنیت نامہ (جو عربی زبان میں تھا) اور ایک جبّہ (خلعت) موصول ہوا۔ سر شفیع مرحوم نے اپنے ملازم کو موٹر کار دے کر والد صاحب مرحوم کے پاس بھیجا۔ ملازم نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ سر شفیع آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ ایک ضروری کام کے لئے انہوں نے آپ کو تشریف آوری کی تکلیف دی ہے۔ والد صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر سر شفیع مرحوم نے چائے سے ہماری ضیافت کی اور یاد کرنے کی وجہ بیان کی اور سعودی عرب سے آمدہ جبّہ اور تہنیت نامہ دکھا کر مولانا سے اُس تہنیت نامے کا ترجمہ سمجھنا چاہا۔ والد صاحب نے انہیں اُس کا مفہوم بتایا تو سر شفیع بہت خوش ہوئے اور والد صاحب سے کہنے لگے کہ آپ اس تہنیت نامے کا جواب عربی میں لکھ کر مجھے روانہ فرمادیں بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کسی اچھے سے کاتب سے لکھوا کر مجھے دو تین روز تک بھجوادیں۔ چنانچہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد والد صاحب مرحوم اور میں سر شفیع کی اجازت سے اُن کی کار میں بیٹھ کر واپس لوٹے۔ اگلے روز صبح مجھے والد مرحوم نے ایک کاتب کو بلالانے کا حکم دیا جس کا نام غالباً فضل الٰہی تھا۔ والد صاحب مرحوم نے اُس تہنیت نامے کا جواب شام کو ہی مجھے لکھوا دیا تھا۔ کاتب سے آپ نے فرمایا کہ اسی کو نہایت عمدہ کاغذ پر خوش خط لکھ کر آج شام تک تیار کر دیں۔ کاتب نے حکم کی تعمیل کی اور شام کے وقت وہ نہایت خوبصورت انداز میں تہنیت نامے کا جواب لکھ لایا۔ اگلے دن والد صاحب مرحوم نے مجھے حکم دیا کہ اس کو لفافے میں ڈال کر سر شفیع تک پہنچا دو۔ چنانچہ میں اسی دن وہ لکھا ہوا خط سر شفیع مرحوم کو دے آیا۔ جس کا مطلب سمجھ کر انہوں نے بہت پسند کیا اور کہا کہ ماشاءاللہ میری امید سے بھی بہتر جواب لکھ دیا گیا ہے۔ میں اسے کل ہی حوالۂ ڈاک کر دوں گا۔

خواجہ نسیم حسین انصاری لکھتے ہیں کہ میاں سر محمد شفیع بھی مولانا روحی کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ ایک بار انہوں نے کچھ خطوط باہر بھیجنا تھے۔ انہوں نے ان خطوط کا عربی زبان

میں ترجمہ مولانا اصغر علی روحی سے کرایا تھا۔

میاں امیر دین صدر انجمن حمایت اسلام بیان کرتے ہیں کہ مولانا (روحی) بڑی جرأت والے اور بے باک بزرگ تھے۔ انگریز کے دورِ حکومت میں وہ حق بات کہنے سے کبھی نہ چوکے۔ وہ مرحلہ خصوصاً یادگار ہے جب جنگِ عظیم اول میں انگریزی حکومت کے حق میں مسلمان راہبرانِ ہند اور اسی طرح علماء سے انگریز کے حق میں (ترکوں کے خلاف) رائے اور فتویٰ طلب کیا گیا۔ اکثر و بیشتر نام نہاد علماء جھک گئے مگر علی الاعلان انکار کرنے والے جن علماء کا نام آج بھی حقیقت آگاہ لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے۔ اُن میں ایک نام اصغر علی روحی صاحب کا بھی ہے۔ سر شفیع نے بطورِ خاص اُن سے انگریز کے حق میں فتویٰ دینے کی التجا کی تھی۔ سر شفیع اس دور میں سب سے قوی مردِ سیاست تھے۔ اثر بھی اُن کا بے پناہ تھا۔ مگر مولانا اصغر علی روحی مرحوم نے سر شفیع کو دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ "انگریز کے حق میں فتویٰ! اس عالم میں کہ انگریز ترکوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے، میں نہیں دے سکتا۔ جاؤ اپنے آقا سے جا کر کہہ دو۔"

ظاہر ہے کہ آقا سے مراد انگریز تھا۔ حق یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ایمانی سطوت کی یاد سے مجھے آج بھی ایمانی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

یہی واقعہ میاں امیر الدین صاحب نے اپنی سوانح حیات لکھتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:
پنجاب میں ضلع کیمبلپور کے قصبہ واہ سے تعلق رکھنے والے نواب مظفر خان نے برعظیم کے گوشے گوشے سے بڑے بڑے پیر، سجادہ نشین اور عالم اکٹھے کئے۔ انہیں کھانے کی عظیم الشان دعوت دی اور انگریزوں کے حق میں فتویٰ طلب کیا۔ تقریباً سب نے انگریز کے حق میں فتوے دے دیئے مگر بعض اصحابِ ایمان اس فتویٰ میں شامل نہ ہوئے۔ ان منکرینِ سیاستِ انگریز میں مولوی عبدالباری فرنگی محلی بھی شامل تھے۔ جب اُن پر زور دیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہی بہت ہے کہ چپ ہوں۔" لاہور کے علماء میں مولانا اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور تھے۔ جنہوں نے سر شفیع کو فتویٰ کے ضمن میں ٹکا سا جواب دیا تھا۔

سر میاں فضل حسین

جس وقت میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم تھے تو گورنمنٹ کالج لاہور میں

شعبۂ عربی اور شعبۂ فارسی کی دو آسامیاں خالی ہوئیں۔ اُس وقت پبلک سروس کمیشن ابھی وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ کالجوں میں تقرری ڈائریکٹر محکمہ تعلیم اور وزیر تعلیم کے باہمی مشورے سے کی جاتی تھی۔ سر فضل حسین مرحوم نے مولانا روحی مرحوم سے پوچھا کہ ان دونوں آسامیوں کے لئے آپ اپنے شاگردوں میں سے جن کو اہل سمجھتے ہیں نام تجویز فرمائیے۔ مولانا روحی مرحوم نے ڈاکٹر صدر الدین مرحوم اور قاضی فضل حق مرحوم کے نام پیش کئے۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں کو گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کی اسامیوں پر لے لیا گیا۔ اور وہ مدت العمر اسی کالج میں تعلیمی خدمات بجا لاتے رہے۔

خواجہ نسیم انصاری کا ہفت روزہ "استقلال" لاہور میں لکھتے ہیں:[1]

جب میاں فضل حسین گورنمنٹ آف انڈیا سے ریٹائر ہو کر لاہور پہنچے تو مولانا نے مجھے اُن کے پاس بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ وہ میرے پاس آئیں۔ میاں فضل حسین نے یہ پیغام بھیجا کہ میں بیمار ہوں ایک دو روز تک خدمت میں حاضر ہوں گا۔ پھر میاں صاحب آئے تو مولانا روحی مسجد جنڈی والی میں تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے میاں صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اُن کا سر اپنے گھٹنوں میں لے لیا اور گردن پر تھپکیاں دیتے ہوئے فرمایا: بچے تم بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ اور میاں صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا حضور میں بخار کی وجہ سے فوراً آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا مرحوم نے میاں فضل حسین کی وفات پر چند فارسی شعر بھی لکھے تھے جن میں اُن کی وفات کی تاریخ نکالی تھی۔ منجملہ اشعار اُن کے فارسی دیوان میں موجود ہیں ؎

جوان مرد و جوان عزم و جوان بخت — علمبردار دانش دستگاہی
بحسنِ رائے او گردوں مفاخر — بفضلِ علم او عالم مباہی
جمالش راحتِ جانہائے محزوں — جلالش زینتِ ایوانِ شاہی
نسیمے از دمِ خلقِ عظیمش — معطر ساخت از مہ تا بماہی
اگر صد عقدہ برہم تافتندے — بسعیِ فکر وا کردے کماہی
بفخرِ دودماں از خاکِ پنجاب — علم برزد چو خورشیدِ پگاہی

[1] مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۸۳ء ص ۱۹

پیامِ حق شنید و گفت لبیک   کہ امر اوست گیتی را و ناہی

الا این مرقدِ فضل حسین است   کہ ایمن باد از دَورِ تباہی

بیا مرزاد، امین برلب آید   خداوندِ سپیدی و سیاہی

شبِ آدینہ خوش بنہاد از سر   کلاہِ حشمتِ مالی و جاہی

بنال اے گلزمینِ گلشنِ ہند   ز تاراجِ خزانِ بے پناہی

نماند او لیک ز و نام نکو ماند   بس است این از پئے عبرت نگاہی

درین وادی کہ ہستی نام دارد   بغفلت پا منہ گر مردِ راہی

مباش ایمن ز بطشِ چرخِ دوّار   کہ می گیرد بجرمِ بے گناہی

وجودِ تو بود آئینۂ مرگ   ازل دادی برین دعویٰ گواہی

کجا شد، کے شد، از روحی چہ پرسی   کز و جز حسرت و اندوہ چہ خواہی

درین بودم کہ ناگہ گفت رضواں

بظلِّ نورِ الطافِ الٰہی

۵۵ ہجری ۱۳

چوہدری سر شہاب الدین

جب سر شہاب الدین کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے صوبہ پنجاب کی وزارتِ تعلیم کا عہدہ سونپا گیا تو مولانا روحی مرحوم نے چند اشعار سر شہاب الدین مرحوم کو بطور تہنیت لکھ بھیجے جن کو سر شہاب الدین نے بہت تعریف کی اور وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

بیا اے سر شہاب الدین کہ امروز   بتو دستِ وزارت شد مسلّم

بشکرِ حضرتِ یزداں بدست آر   مرادِ خاطرِ یارانِ ہمدم

مسلماناں ز لطفت چشم دارند   کہ بربندی بزخمِ کہنہ مرہم

نمی گویم چنیں کن یا چناں کن   تو خود دانی کہ ایں بیش است و آں کم

شہاب آمد بنازی نجمِ ثاقب   درخشاں شو شبِ تاریک مبہم

سعید آں کسی کہ نام نیک دریافت　　کز و نبود گرامی تر بعالم
بکامِ دوستاں تا دورِ گیتی　　ز چشمِ زخمِ دوراں باش بے غم
چو رسم تہنیت رسم قدیم است
فرستادم بآں یادِ مکرّم

خواجہ نسیم حسین انصاری کا بیان ہے[1]:

متحدہ پنجاب کی اسمبلی کے سپیکر چوہدری سر شہاب الدین مولانا روحی کی خدمت میں بہت بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا روحی حاجت مندوں کو چوہدری صاحب کے پاس بھیجتے اور چوہدری صاحب اُن لوگوں کے کام کرا دیا کرتے تھے۔ چوہدری صاحب کہا کرتے تھے کہ میں جو کچھ ہوں مولانا کے طفیل ہوں میں مولانا کے ستو چوری کرکے کھا جایا کرتا تھا۔ اُن کی برکت سے ہی اللہ میاں نے مجھے کئی اعزاز دیئے۔

شیخ سر عبدالقادر

شیخ سر عبدالقادر اپنے ماہوار رسالہ "مخزن" میں طبع کرنے کے لئے مولانا روحی مرحوم سے وقتاً فوقتاً فرمائش کرتے رہتے کہ آپ اپنا اردو یا فارسی کلام اشاعت کے لئے روانہ فرمائیں لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مولانا اردو میں شعر نہیں لکھتے تھے۔ اس لئے آپ اپنی کوئی نہ کوئی فارسی نظم سر عبدالقادر مرحوم کو بھیج دیا کرتے تھے جو رسالہ مخزن میں چھپتی رہتیں۔ مثلاً

مخزن جلد ۲۲ عـ ۵ فروری ۱۹۱۲ء صـ ۷۱
" جلد ۲۳ عـ ۳ جون ۱۹۱۲ء صـ ۱۲
" جلد ۲۳ عـ ۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء صـ ۱۰

"مخزن"[2] رسالے کے یہ تمام شمارے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

---

1. ہفت روزہ "استقلال" لاہور مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۸۳ صـ ۱۹
2. کتب خانہ شعبہ اردو یونیورسٹی لائبریری میں مخزن رسالہ کا ریکارڈ جس نمبر کے تحت دیکھا جا سکتا ہے وہ (Ui XI 24) ہے

ان اکابر امراء کے علاوہ لاہور کے ہم عصر علماء کے ساتھ بھی مولانا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان علماء میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں :

(۱) پروفیسر مولوی کریم بخش مرحوم (گورنمنٹ کالج لاہور)

یہ بکثرت مولانا کے ہاں آمدورفت کیا کرتے تھے۔

(۲) مولوی احمد علی لاہوری مرحوم جن کی قائم کردہ انجمن خدام الدین کی طرف سے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے طبع ہوتے رہتے تھے اُن میں سے اکثر پر علمائے کرام کی تقاریظ بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ مولانا روحی کی تقاریظ بعنوان "تقاریظ" ضمیمہ کے طور پر نقل کر دی گئی ہیں۔ مولانا احمد علی مرحوم لاہور کے جید علماء میں سے تھے۔ انہوں نے ایک مدرسہ قاسمۃ العلوم کے نام سے جاری کیا تھا جس کے افتتاح کے موقع پر مولانا روحی مرحوم نے ایک عربی نظم لکھی تھی جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

مولانا روحی مرحوم نے اپنے اہل خانہ کو وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ دو علماء میں سے جو بھی اُس وقت میسر آسکے پڑھائی جائے۔ مولانا احمد علی رح بھی اُن دو علماء میں شامل تھے۔

(۳) مولوی ابوالرشید عبدالعزیز جو قصبہ مزنگ مضافات لاہور میں ایک مسجد کی امامت و خطابت پر مامور تھے۔ یہ ضلع گجرات کے باشندہ تھے جو مولانا روحی مرحوم کا بھی وطن تھا۔ یہ دوسرے بزرگ تھے جن کے بارے میں مولانا نے اپنی نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت اہل خانہ کو کی تھی۔

(۴) مولوی جمال الدین (مدرس مدرسہ انجمن نعمانیہ لاہور)

(۵) مولوی غلام مرشد مرحوم (خطیب شاہی مسجد لاہور)

(۶) مولوی نجم الدین مرحوم (پروفیسر عربی یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور)

(۷) مولوی نور الحق مرحوم (" " " " ")

(۸) مولوی محمد یار خلیق (خطیب سنہری مسجد لاہور)

(۹) مولوی نبی بخش حلوائی مرحوم (صاحب تفسیر نبوی)

(۱۰) مولوی نور بخش توکلی مرحوم (پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)

(۱۱) پیر عبدالغفار مرحوم (تکیہ سادھواں لاہور)

(۱۲) مولوی تاج الدین احمد تاج مرحوم (سیکرٹری انجمن نعمانیہ لاہور)

(۱۳) حافظ فتح محمد نقشبندی مرحوم (بانی مدرسہ فتحیہ اچھرہ لاہور)

(۱۴) میاں برکت علی مرحوم (مدرّس مدرسہ فتحیہ اچھرہ لاہور)

(۱۵) مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم (صدر مدرّس دارالعلوم دیوبند)

مولانا کے ازدواجی حالات

مولانا نے لاہور میں ملازم ہو جانے کے بعد دو شادیاں کیں۔ آپ کی پہلی بیوی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جو بچپن ہی میں فوت ہو گئی۔ اس کے بعد اس بچی کی والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ جس پر مولانا کو سخت رنج ہوا اور بعد میں آپ نے اس سانحہ پر ایک قصیدہ لکھا۔ مولانا کی دوسری شادی ۱۹۰۰ء کے قریب واقع ہوئی۔ یہ شادی آپ کے لئے باعث برکت ثابت ہوئی۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے سات بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ آپ کی پہلی صاحبزادی بچپن میں فوت ہو گئی اور دو بیٹے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس طرح مولانا کی وفات کے وقت آپ کے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی زندہ تھے۔ یہ شادی مولانا نے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں موضع لوھیاں والہ کے ایک بزرگ محمد عظیم نامی کی صاحبزادی سے کی۔ محمد عظیم محکمہ مال میں پٹواری تھے اور وہ ملازمت کے سلسلے میں ضلع جالندھر کے گاؤں موضع مسانی میں سکونت پذیر تھے۔ مولانا کی دوسری بیوی مولانا کی وفات کے بعد ۱۱ سال تک زندہ رہیں اور چھ ستمبر ۱۹۶۵ء میں عین اس وقت جب بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کیا انتقال فرما گئیں۔

مولانا کی اولاد

مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں سے نوازا اور دین و دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کا موقع دیا۔ چنانچہ ان نعمتوں میں سے ایک نعمت اولاد کی بھی ہے۔ اولاد انسان کی فطرت اور شخصیت کا بہترین مظہر اور اس کی تسکین کا ایک بہت بڑا سامان ہے اور ہر شخص جبلی طور پر اس کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ اپنے کئی معاملات میں اولاد کو اپنا ممد و معاون اور دکھ درد میں بہت مددگار و غمخوار سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض انبیاء کرام نے بھی حصول اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ~~[illegible]~~ حضرت ابراہیم، حضرت زکریا اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے واقعات

قرآن مجید نے وضاحت سے بیان کئے ہیں۔ اسلامی معاشرہ اولاد کو انسانی قدروں کی بقا اور تحفظ کا ضامن سمجھتا اور اُسے ایک بہت بڑی نعمت قرار دیتا ہے۔ اگر اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق انسان اولاد کے اخلاق و آداب کی نگرانی کرے اور اُسے زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے تو یہی اولاد والدین کے لئے ایک صدقۂ جاریہ ثابت ہو سکتی ہے جو اُن کی وفات کے بعد اُن کے حق میں دعائے مغفرت کرتی اور دنیا میں بھی اُن کی شہرت و عزت اور نیک نامی میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ مولانا نے اپنی ایک فارسی نظم میں تربیتِ اطفال کے عنوان سے چند اشعار قلمبند کئے تھے جس سے اولاد کی صحیح تربیت اور تعلیم کی اہمیت اور اُن کے ذاتی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اُن اشعار کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ذیل میں مولانا مرحوم و مغفور کے صاحبزادوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔

فضل حق مرحوم — تاریخ ولادت ۴ر رجب المرجب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۴ء

تاریخ وفات ۲۵ر محرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۹ء

حافظ عبدالحق صاحب — تاریخ ولادت ۲۱ر ذوالحجہ ۱۳۲۷ھ مطابق ۴ر جنوری ۱۹۱۰ء

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی — " " ۲۹ر ذوالقعدہ ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۲ر نومبر ۱۹۱۱ء

ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا — " " ۲۳ر محرم الحرام ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

محمد مظہر الحق رانا — " " ۶ر شوال ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۱ر مئی ۱۹۲۴ء

۱۹۵۲ء میں جب مولانا عالمِ جاودانی کو سدھارے تو انہوں نے اپنی بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹی نے قریباً ۶۰ سال کی عمر پائی۔ وہ یکم رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۳ر جولائی ۱۹۱۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ان کو مولانا نے گھر پر ہی دینی تعلیم سے آراستہ کر دیا تھا اسکے علاوہ انہیں خانہ داری سے متعلق ادارۂ خواتین میں سینا پرونا، کشیدہ کاری وغیرہ کی تعلیم بھی دلائی۔ وہ لاہور کے مختلف اداروں میں جو خواتین کے لئے مختص تھے ملازمت کرتی رہیں۔ انہیں کئی دفعہ ترقی دے کر لاہور سے باہر جانے کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے منظور نہ کیا اور اپنی ترقی کے مواقع لاہور سے باہر بھیجے جانے کی صورت میں اپنی مرضی سے چھوڑ دیئے۔ لاہور سے باہر جن کے قیام و طعام

کا کوئی بندوبست نہ تھا اور وہ گھر سے باہر اکیلا رہنے کو پسند نہ کرتی تھیں۔ جب مارچ ۱۹۲۶ء کے شروع میں
اُن کی وفات ہوئی تو لاہور ہی کے سر سکندر وو کیشنل انسٹی ٹیوٹ میں ملازمت کر رہی تھیں اور ملازمت کے دوران
ہی وفات پائی۔

مولوی فضل حق مرحوم

اولادِ ذکور میں سب سے بڑے صاحبزادے کا اسم گرامی فضل حق تھا۔
انہوں نے اپنے والد بزرگوار سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو کر بی۔اے
تک کے امتحانات پاس کئے اور پھر ایم۔اے عربی کے لئے یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے ایم۔اے
عربی کی سند حاصل کی اور ایم۔اے عربی کے امتحان میں اول آنے کی بنا پر انہوں نے تین طلائی اور نقرئی تمغے حاصل کئے
اور مبلغ سو روپے نقد بھی انہیں دئیے گئے کیونکہ اس زمانے میں ایم۔اے عربی میں اول آنے والوں کو یہی انعام دئیے
جاتے تھے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر متعین ہوئے۔ انہیں میکلوڈ ریسرچ اور بہاولپور
ریسرچ وظائف بیک وقت دئیے گئے۔ علاوہ ازیں انہیں عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیرونِ ملک جانے کا
وظیفہ بھی پیش کیا گیا۔ مگر اسی سال انہوں نے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے امتحان مقابلہ میں بیٹھ کر کامیابی
حاصل کی۔ اُن کے والد مرحوم اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ میرے اس بیٹے کو یہیں پنجاب ہی
میں کوئی قابلِ عزت عہدہ عطا فرما اور اُسے وظیفہ پر یورپ جانے کی ضرورت سے بے نیاز کر دے۔ خدا کی شان
کہ یہ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئی اور انہیں مقابلہ کا امتحان پاس کر لینے پر باہر جانے کا موقع نہ ملا۔
مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے سے پہلے وہ کچھ عرصہ کے لئے دہلی کے مشہور سینٹ سٹیفن کالج میں بطور لیکچرار
کام کرتے رہے۔ جب وہ اکاؤنٹس کے محکمہ میں متعین ہو گئے تو انہوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی۔ انہوں نے
اس محکمہ میں ترقی کرتے کرتے بڑے بڑے عہدے سنبھالے اور ہندوستان کے مختلف بڑے بڑے شہروں مثلاً
کلکتہ، ڈھاکہ، گورکھپور، اجمیر، دہلی، کراچی، پشاور اور لاہور میں اسی محکمہ میں اپنے فرائض بطریق احسن
انجام دئیے۔ جب مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو مدغم کر کے ون یونٹ کا درجہ دیا گیا تو آپ اس
کے پہلے اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر کر دئے گئے۔

اُن کو کچھ عرصہ تک پاکستان کے ڈپٹی آڈیٹر جنرل کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا

انہوں نے دسمبر ۱۹۷۹ء میں چھہتر سال کی عمر پاکر انتقال فرمایا اور اپنے آبائی گاؤں موضع کٹھالہ میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا کے یہ صاحبزادے صوم و صلوٰۃ اور تلاوت کلام اللہ کے علاوہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد وظائف و اوراد کے سختی سے پابند تھے اور سفر و حضر میں اُن کا یہ شیوہ ہمیشہ قائم رہا۔ ملازمت کے سلسلہ میں اُن کے نظم و ضبط کی دھاک بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سہل پسند اور کام چور ملازمین کو تکلیف ہوتی تھی لیکن اس معاملہ میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے اور محکمانہ کارروائی سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

اُن کے ایک بھانجے نے جو میرے اس مقالہ کے نگران بھی ہیں اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ سلسلہ ملازمت میں درخواست کے ساتھ تصدیق شدہ اسناد کی نقول کا بھیجا جانا ضروری تھا۔ انہوں نے فضل حق صاحب سے نقول کو تصدیق کر دینے کو کہا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس مہر یہاں نہیں ہے تم کل دفتر کے وقت میں وہاں آجانا تو میں تصدیق کر دوں گا۔ میں اگلے روز اسناد کی ٹائپ شدہ نقول اُن کے دفتر میں لے گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ اصل سرٹیفکیٹ کہاں ہیں جن کی یہ نقول ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں ساتھ نہیں لایا۔ گھر پر موجود ہیں۔ آپ میرے تمام کوائف سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسلئے میں نے اصل اسناد ساتھ لانے کو اہمیت نہیں دی۔ وہ کہنے لگے اصل اسناد کو دیکھے بغیر میں تصدیق نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مجھے ناکام واپس آنا پڑا اور مجھے ایک گونہ رنج بھی ہوا کہ سگے بھانجے کا یہ حال ہے لیکن وہ رنج ایک وقتی چیز تھا۔ اگلے روز میں اصل سرٹیفکیٹ ساتھ لے کر پھر دفتر گیا تو انہوں نے اُن نقول کی تصدیق کر دی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اُن کے سگے بھانجے اصول کے خلاف کوئی کام کرنے کو کہتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ یہ واقعہ مثال کے طور پر لکھ دیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اُن کو اپنے فرائض منصبی کو دیانتداری اور قاعدے کے مطابق بجالانے کا کتنا خیال تھا۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہیں کراچی میں وفاقی پبلک سروس کمیشن کا رکن نامزد کیا گیا لیکن چونکہ کراچی کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آتی تھی اسلئے آپ نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ وہ اکاؤنٹس کے محکمہ سے ۱۹۶۲ء کے آخر میں سبکدوش ہوئے کیونکہ اُن کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۲ء کے آخر میں تھی اور اس وقت ملازمین کو ساٹھ سال کی عمر میں سبکدوش کر دیا جاتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے زیارتِ حرمین شریفین کا شرف حاصل کیا۔ مولانا اصغر علی کی وفات کے بعد چونکہ وہ سب سے بڑے بھائی تھے۔ اُن کا باقی

چار بھائیوں سے سلوک بالکل باپ کی طرح تھا۔ ہر ایک کے جائز کام میں وہ ہر طرح کی مدد کو تیار تھے۔

مولوی فضل حق نے طویل عرصے تک اکاؤنٹس کے محکمے کی ملازمت کی لیکن اُن کے والد ماجد نے اُن میں مطالعہ کا شوق اور دلچسپی کا بیج پیدا کر دیا تھا اسلئے اُن کا ایک گھریلو کتب خانہ بھی تھا۔ جس میں قرآن مجید اور حدیث کے علاوہ تصوف اور ادب کی بڑی بڑی کتابیں موجود تھیں جو انہوں نے مختلف شہروں سے خرید رکھی تھیں۔ اُن کا سب سے زیادہ شغف قرآن و حدیث اور ادب کے ساتھ تھا۔ اُن کے کتب خانہ کی بیشتر کتب عربی یا فارسی میں تھیں۔ اپنے والد مرحوم کی طرح اُن کی یہ عادت تھی کہ وہ کتاب پڑھتے پڑھتے حاشیہ پر کچھ یادداشتیں یا اغلاط کی تصحیح اپنے ہاتھ سے کر دیا کرتے تھے۔ وہ جامعہ پنجاب کی لائبریری کے رکن بھی تھے۔ اور وہاں سے بیک وقت کئی کتابیں نکلوا کر زیرِ مطالعہ رکھتے اور ضروری اور اہم مضامین کے حوالے اپنی ڈائری میں درج کر لیا کرتے تھے۔ اُن کی یہ یادداشتیں اُن کے علمی ذوق اور شوقِ مطالعہ کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ قرآن مجید کے موضوع پر شاید ہی کوئی عربی کتاب اُن کے مطالعہ میں نہ آئی ہو۔ چنانچہ انہوں نے کئی تفسیری کتابوں کا نچوڑ اپنے ہاتھ سے اپنی ڈائریوں میں درج کر رکھا تھا۔

میرے معالجے کے نگران بتاتے ہیں کہ ہمارے والد بزرگوار کو پہلا بیٹا ہونے کی بنا پر ہمارے برادرِ بزرگ مولوی فضل حق کو عالم باعمل بنانے کا بہت شوق تھا۔ والد مرحوم کا اُس وقت عالمِ شباب تھا اور وہ جتنا وقت ممکن ہو سکتا تھا اپنے اس بیٹے کی تعلیم و تربیت میں صرف فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکاؤنٹس جیسے خشک محکمے میں رہ کر مولوی فضل حق کی معلومات بالخصوص قرآن و حدیث کے بارے میں بہت وسیع تھیں۔ والد بزرگوار نے گھر پر اپنے تقریباً تمام بیٹوں کو عربی و فارسی کی تعلیم مکمل کرائی۔ چنانچہ مولوی فضل حق نے ایم اے عربی میں شاندار کامیابی کے علاوہ ایم اے فارسی، مولوی فاضل، ایم او ایل وغیرہ کے اعلیٰ امتحان بھی پرائیویٹ طور پر پاس کر لئے۔ میرے نگران بتاتے ہیں کہ میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے یہ واقعہ سنا کہ

ایک دفعہ وہ اپنے فرزند مولوی فضل حق کو پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے فضل حق سے کوئی علمی بات پوچھی جو اُس وقت اُن کے ذہن میں نہیں تھی۔ جس پر والد بزرگوار کو سخت غصہ آگیا اور لوہے کا ایک سیر کا بٹہ جو قریب ہی پڑا تھا اُٹھا کر اپنے بیٹے کے سر پر دے مارا جس کا نشان مولوی فضل حق کے سر میں آخر دم تک موجود تھا۔ جسے والدہ ماجدہ چھپانے کے لئے آئے

بڑھیں تو والد مرحوم نے غصے میں اُن کے بازو کو بھی زخمی کر دیا اور اُس ضرب کا نشان والد مرحوم کے بازو پر موجود تھا۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے معاملہ میں مولانا اصغر علی کس قسم کا تشدد اپنے عزیزوں کے ساتھ برتتے تھے۔

مولوی فضل حق مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی نعمتوں سے نوازنے کے علاوہ صالح اولاد بھی عطا فرمائی اور ماشاء اللہ اُن کے ہاں اُن کی وفات کے وقت پانچ بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں جن میں سے چھ بیٹیاں اور تمام بیٹے اُن کی زندگی میں ہی بیاہ دیئے گئے تھے۔ ساتویں لڑکی کی شادی اُن کی وفات کے بعد کر دی گئی۔ اس طرح وہ اس فریضہ سے بھی سبکدوش ہو گئے تھے۔

حافظ عبدالحق

انہوں نے بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس لئے ان کو عموماً حافظ صاحب کہا جاتا ہے۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر ایم۔اے (ریاضی) تک کا ریکارڈ نہایت شاندار اور قابلِ تعریف رہا۔ اور ایف۔اے کے امتحان میں مسلم طلبہ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور ایم۔اے ریاضی کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے اور یہ اُس وقت بہت بڑا اعزاز تھا کیونکہ عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان طلبہ ریاضی میں بہت پیچھے ہیں۔

اُن کی ملازمت اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور سے شروع ہوئی جہاں خواجہ دل محمد مرحوم صدر ریاضیات متعین تھے۔ کچھ مدت بعد بہاولپور صادق ایجرٹن کالج میں ریاضی کے پروفیسر بن کر چلے گئے اور چند سالوں میں ہی حسنِ کارکردگی کی بنا پر انہیں پرنسپل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا اور وہ ایک طویل عرصے سے اسی عہدہ پر متعین رہے۔ پھر پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جب تمام ریاستیں مغربی پاکستان میں شامل کر کے ختم کر دی گئیں تو انہیں بہاولپور سے تبدیل کر کے ٹریننگ کالج ملتان کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ کچھ مدت بعد جب ملتان میں ثانوی تعلیمی بورڈ وجود میں آیا تو آپ اس کے سب سے پہلے چیئرمین بنا دیئے گئے۔ حتیٰ کہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ اسی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ آج کل آپ لاہور میں فارغ البالی

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کے چاروں لڑکے میڈیکل کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور دو پاکستان سے باہر ہیں امریکہ میں ہیں۔ تیسرا لڑکا لاہور میں پریکٹس کر رہا ہے اور چوتھا بھی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پاس کرنے والا ہے اس کے علاوہ دو لڑکیاں بھی ہیں جن میں سے ایک کی شادی ہو چکی ہے اور دوسری میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ہے

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی

ڈاکٹر صاحب مولانا کے بڑے صاحبزادے ہیں جو مجلہ اس مقالے کے نگران بھی ہیں۔ ملازمت سے پہلے انہوں نے عربی اور فارسی میں ایم۔ اے کر لیا تھا پھر ملازمت کے دوران انہوں نے علومِ اسلامیہ کے علاوہ اردو میں بھی ایم۔ اے کر لیا۔ ان کے علاوہ مولوی فاضل منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات بھی شاندار کامیابی سے پاس کئے۔ ایم۔ اے فارسی اور مولوی فاضل کے امتحانات میں یونیورسٹی بھر میں اول رہنے کی بنا پر انہوں نے بالترتیب طلائی اور نقرئی تمغے حاصل کئے اُن کی ملازمت کی ابتداء گورنمنٹ کالج جھنگ سے ہوئی جو اُس زمانے میں نویں جماعت سے لے کر ایف اے تک کی چار جماعتوں پر حاوی تھا۔ ۱۹۳۷ء کی ابتداء سے ۱۹۴۲ء کے قریباً وسط تک اُس کالج میں بطور عربی اور اردو لیکچرار کام کرتے رہے۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام بھی اتفاق سے اُس کالج میں پڑھا کرتے تھے اور وہ عربی میں صوفی ضیاء الحق صاحب کے شاگرد ہیں۔ وہ جب لاہور آتے ہیں تو اُن کے غریب خانہ پر ضرور حاضری دیتے ہیں۔

ان کے بارے میں صوفی صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا کہ جھنگ کالج میں اُس وقت ہندو، مسلم اور سکھ طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور عربی، فارسی اور سنسکرت میں سے ایف۔ اے میں ہر طالب علم کو ایک مضمون ضرور پڑھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب کبھی کالج کا امتحان ہوتا تو فارسی اور سنسکرت میں اول رہنے والے طلبہ (۱۴۰) بلکہ (۱۴۵) تک نمبر بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن عربی میں (ڈاکٹر) عبدالسلام اوّل تو آجاتے تھے لیکن اُن کے نمبر ۱۳۵ سے زیادہ کبھی نہ ہو سکے جس کی شکایت صرف عبدالسلام ہی کو نہیں بلکہ اُن کے والد بزرگوار کو بھی تھی۔ اُن کے والد ماجد محمد حسین صاحب (جو اب وفات پا چکے ہیں) مولانا مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس لئے وہ صوفی صاحب کا نہایت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے کسی دن موقع پاکر صوفی صاحب سے یہ شکوہ کیا کہ آپ میرے بیٹے کو نمبر بہت تھوڑے دیتے ہیں اس طرح اُسکی دل شکنی ہوتی ہے اور میرا

خیال ہے کہ وہ یونیورسٹی کے امتحان میں فارسی اور سنسکرت کے طلبہ کی نسبت کم نمبر حاصل کرے گا ۔ حالانکہ باقی تمام
مضامین میں اُس کے نمبر سب سے زیادہ تھے ہیں ۔ صوفی صاحب نے محمد حسین صاحب کو سمجھایا کہ ان شاء اللہ ایسا نہیں
ہوگا بلکہ آپ مطمئن رہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یونیورسٹی کے امتحان میں وہ عربی میں بھی نمبروں کے لحاظ سے سب کو
مات کر دے گا ۔ لیکن اس جواب سے محمد حسین صاحب مطمئن نہ تھے اور انہوں نے اس وقت کے پرنسپل
حکیم محمد حسین مرحوم کے پاس بھی یہی شکایت کی ۔ پرنسپل صاحب نے اُسی وقت صوفی صاحب کو بلا کر محمد حسین
صاحب کا شکوہ بیان کیا جس پر صوفی صاحب نے کہا کہ عربی کے باقی طلبہ کی کارکردگی کو جس معیار سے میں
جانچتا ہوں اُسی معیار پر عبدالسلام کو بھی نمبر دیتا ہوں کیونکہ میں دو عملی کے خلاف ہوں ۔ اگر آپ کو یا
محمد حسین صاحب کی تسلی نہیں ہوتی تو آپ کسی اور عربی کے استاد سے عبدالسلام کے پرچوں کو نمبر لگانے کے
لئے بھیج دیں ۔ بہر صورت میں ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا ہوں ۔

اس کے بعد یہ بات تقریباً ختم ہو گئی ۔ آخر جب یونیورسٹی کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو
عبدالسلام تمام یونیورسٹی میں اول رہا اور اُن کے والد صاحب اُن کے تمام اساتذہ کا منہ میٹھا کرانے کے لئے
سب کے گھر مٹھائی لے کر گئے ۔ صوفی صاحب کے ہاں جب وہ مٹھائی لے کر آئے تو انہوں نے کہا کہ اس مٹھائی کا
مجھے کوئی حق نہیں کیونکہ آپ بڑے زیادہ عربی نہ دینے کی وجہ سے شاکی رہے ہیں ۔ محمد حسین صاحب نے کہا کہ
وہ ایک وقتی بات تھی ۔ مجھے اس کا کوئی رنج نہیں ۔ صوفی صاحب نے مٹھائی لینے سے انکار کر دیا لیکن محمد حسین
صاحب واپس لے جانے پر رضامند نہ تھے اور چلے گئے ۔ صوفی صاحب نے مٹھائی اپنے ملازم کے ہاتھ
اُن کے گھر بھجوا دی اور کہلا بھیجا کہ میں مٹھائی تب قبول کروں گا جب آپ یونیورسٹی میں جا کر تمام مضامین
کے علیٰحدہ علیٰحدہ نمبروں کا ریکارڈ لائیں گے اور ان شاء اللہ مجھے یقین ہے کہ عربی میں عبدالسلام کے نمبر باقی
تمام مضامین کی نسبت زیادہ ہوں گے بلکہ سنسکرت اور فارسی پڑھنے والوں سے بھی غالباً اُن کے عربی میں
نمبر زیادہ ہی ہوں گے ۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد محمد حسین صاحب کو جب لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہ عبدالسلام
صاحب کے تمام مضامین کی علیٰحدہ علیٰحدہ تفصیل لے آئے اور صوفی صاحب کے پاس پہنچ گئے ۔ تقریباً ہر مضمون
میں عبدالسلام صاحب کے نمبر بہت اعلیٰ تھے لیکن عربی میں ایک سو پچاس میں سے ۱۵۰ نمبر تھے جو باقی
تمام مضامین کی نسبت بہتر تھے ۔ صوفی صاحب نے کہا کہ میری یہی حکمتِ عملی تھی اور میں نے اُس وقت بھی
یہی کہا تھا کہ آپ فکر نہ کریں کہ ان شاء اللہ یونیورسٹی کے امتحان میں اس کے بہت اچھے نمبر آئیں گے

جب صوفی صاحب نے محمد حسین صاحب سے کہہ کر ڈبل روٹی منگوائی تو وہ نہایت خوشی سے لے آئے۔

۱۹۴۳ء میں موجودہ شہر ساہیوال (منٹگمری) میں ڈگری کالج کی بنیاد رکھی گئی تو محکمہ تعلیم کے ارباب حل و عقد نے صوبہ بھر کے مختلف کالجوں میں سے بہترین قسم کے چیدہ چیدہ اساتذہ کو منٹگمری کالج میں متعین کر دیا۔ اسی طرح بغیر فرمائش کے صوفی صاحب جھنگ سے تبدیل ہو کر ساہیوال پہنچ گئے اور اس تاریخ سے لے کر ۱۹۵۸ء کی ابتداء تک وہاں عربی اور اردو کے پروفیسر اور کچھ عرصہ بعد بطور وائس پرنسپل کام کرتے رہے۔ اس وقت کے پرنسپل الفنسٹ ایم خان صاحب تھے جو تبدیل ہو کر خیرپور کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے اور نئے پرنسپل صاحب کے آنے میں کافی دیر لگی یعنی تقریباً چار مہینے تک مناسب شخص نہ مل سکا۔ اتنے وقت صوفی صاحب بطور پرنسپل ہی کام کرتے رہے۔ تدریسی اور انتظامی معاملات کے علاوہ صوفی صاحب کالج کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بنا دیئے گئے اور انہیں ہوسٹل ہی میں سکونت پذیر رہنا پڑتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں وارڈن ہوسٹل مقرر کر دیا گیا اور سکونت کے لئے نہایت خوبصورت بنگلہ دیا گیا جو پرنسپل صاحب کے بنگلہ کے بالکل متصل تھا۔ اس سے پہلے کالج اور ہوسٹل دونوں ایسی عمارتوں میں قائم تھے جو غیر مسلم لوگ خالی کر گئے تھے لیکن اب کالج کی نئی عمارت بن جانے کے علاوہ نیا ہوسٹل اور متعلقہ ملازمین کے لئے کوارٹر اور بنگلے تعمیر کر دیئے گئے اور اس لئے صوفی صاحب کو کالج سے تھوڑے ہی فاصلے پر وارڈن کے بنگلہ میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ کالج کے بہت سے اہم امور صوفی صاحب کے ذمہ تھے مثلاً کالج کے امتحانات کا ریکارڈ، سوالات کے پرچے طبع کرانا، مستحق اور غریب طلبہ سے وظائف اور معافی فیس کی درخواستیں طلب کر کے اُن پر سفارشات کے ساتھ پرنسپل کے سامنے پیش کرنا۔ داخلے کے وقت مضامین کی تبدیلی میں انتظامیہ کا ہاتھ بٹانا۔ کالج میگزین جو پہلے "آفتاب" کے نام سے اور بعد میں "ساہیوال" کے نام سے شائع ہوتا تھا، کے اردو حصہ کی نگرانی کرنا۔ ساہیوال میں صوفی صاحب ۱۹۵۸ء تک مقیم رہے۔

اور وہیں انہوں نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور چونکہ انہیں محنت کی عادت تھی اس لئے وہ علمی شغل میں مصروف رہنا چاہتے تھے۔ کالج کے کاموں میں اُن کا بہت سا وقت صرف ہوتا تھا تاہم انہوں نے عربی میں پی ایچ ڈی کرنے کا عزم کر لیا۔ جس کے لئے انہوں نے ابن قتیبہ اور اُس کی کتاب المعارف کا انگریزی ترجمہ اور تحقیقی حاشیہ لکھ کر سات آٹھ سال کی محنت کے بعد اپنے ہاتھوں سے ٹائپ کر کے یونیورسٹی میں پیش کر دیا۔ لاہور سے باہر رہ کر بغیر کسی راہنما یا نگران کے عربی میں تحقیقی کام کرنا خالہ جی کا گھر نہیں

[illegible] میں اُن کے نگران ڈاکٹر برکت علی قریشی مرحوم پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور تھے لیکن اُن سے بہت کم استفادہ کا موقع ملتا تھا۔ کچھ کتابیں صوفی صاحب کے والد صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھیں اور کچھ انہوں نے اپنی جیب سے خریدیں۔ پنجاب کے مختلف کالجوں کی لائبریریوں سے بھی چند کتابیں مستعار لی گئیں بلکہ بعض اُن شہروں سے بھی منگوائی گئیں جو تقسیم ملک کے وقت ہندوستان میں شامل کر دئیے گئے۔

صوفی صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے کا آغاز ۱۹۴۳ء/۴۴ میں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں متحدہ ہندوستان کو تقسیم کر دیا گیا۔ اُس وقت تک ہندوستان سے منگائی گئی کتابیں مالکوں کو واپس کر دی گئیں۔ تقسیم ملک کے فوراً بعد جب کالج کی نئی عمارت ابھی نہیں بنی تھی صوفی صاحب کو ایک غیر مسلم خاندان کی کوٹھی میں قائم ہونے والے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا جو نہایت بوسیدہ اور خستہ حالت میں تھی۔ وہ اپنا مقالہ رات کو تنہائی میں بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے ٹائپ کیا کرتے تھے۔ ٹائپ شدہ کاغذات اپنے سکونتی کمرے کی ایک الماری میں رکھ دیتے تھے اور اصل مسودہ بھی اُسی الماری میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ایک رات نہایت موسلادھار بارش ہوئی اور بدقسمتی سے اُس کمرے کی چھت ساری رات ٹپکتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمارت کی مٹی بارش کے پانی میں بہہ کر دیوار کے ساتھ ساتھ الماری تک پہنچ گئی اور بہت سے ٹائپ شدہ اور اصل مسودے کے کاغذات کیچڑ میں اس طرح لت پت ہو گئے کہ کچھ پڑھا نہ جاتا تھا۔ جب صبح کے وقت صوفی صاحب کی آنکھ کھلی اور الماری کو قرآن مجید نکالنے کے لئے کھولا تو مسودہ اور ٹائپ شدہ کاغذات کی یہ صورت حال دیکھ کر بے اختیار اُن کے آنسو نکل گئے کیونکہ اپنے سالوں کی محنت پر پانی پھر گیا۔ صوفی صاحب نے تہیہ کر لیا کہ یہ کام چھوڑ دیا جائے کیونکہ جن کتابوں کے حوالے اور صفحات حواشی کی صورت میں درج کئے گئے تھے اُن میں سے بعض کتابیں ہندوستان سے منگائی گئی تھیں جو واپس کر دی گئی تھیں اور اُس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات انتہائی بگڑے ہوئے تھے اور ڈاک کے آنے جانے کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا۔

اتفاق سے اُن کے بڑے بھائی مولوی فضل حق مرحوم اپنے سرکاری دورہ کراچی سے واپسی پر منٹگمری میں صوفی صاحب سے ملنے کے لئے ٹھہرے اور انہوں نے پوچھا کہ مقالہ کہاں تک مکمل ہوا ہے جس

پر صوفی صاحب نے مذکورہ بالا افسوسناک حادثہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ ان کے بھائی صاحب
نے کچھ عرصے سے الدرہ اس مسودہ اور لغت شعر کا غزالت دیکھ کر افسوس کیا اور کہا کہ اتنے سالوں کی محنت ضائع
کر دینا درست نہیں اس لئے جو کتابیں اب نہیں ملتیں ان کے حوالہ جات درج نہ کئے جائیں اور کام کو
جلدی ختم کرکے مقالہ مکمل کر دینا چاہئے۔ انہوں نے بار بار تاکید کی کہ اس کو ضرور مکمل کریں۔ بھائی صاحب کے
چلے جانے کے بعد صوفی صاحب سوچتے رہے اور خراب شدہ کاغذات کو صاف کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بعض
چیزیں تو یاد آ گئیں مگر کچھ حصہ محذوف ہی رہا۔ اسلئے اس کی طرف توجہ کا خیال چھوڑ دیا گیا اور جوں
توں کرکے مقالہ مکمل کیا۔ آخر خدا خدا کرکے ۱۹۵۱ء میں انہوں نے عربی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری
یونیورسٹی کی طرف سے حاصل کر لی۔

۱۹۵۶ میں گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر عنایت اللہ مرحوم سرکاری ملازمت
سے سبکدوش ہو گئے اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں صدر شعبہ عربی کے طور پر متعین ہو گئے اس لئے
گورنمنٹ کالج کی یہ آسامی خالی ہو گئی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل مسٹر سراج الدین تھے جن کا
مضمون انگریزی تھا اور جو اپنے ماتحت ملازمین اور طلبہ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ محکمۂ
تعلیم کے ارباب حل وعقد نے سراج صاحب سے پوچھا کہ آپ اس آسامی کے لئے کس کی تقرری چاہتے
ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں یہ دستور چلا آتا تھا کہ عام متعین ہونے کے لئے اسی کالج کے پرنسپل اور صدر
شعبہ کی سفارش ضروری سمجھی جاتی تھی۔ صدر شعبہ چونکہ ریٹائر ہو گئے تھے اس لئے اب معاملہ صرف
پرنسپل کی سفارش سے حل ہو سکتا تھا۔ سراج صاحب نے عربی کے تین پروفیسروں سے متعلق
کوائف ملازمت کی فائلیں محکمۂ تعلیم سے منگوا کر مطالعہ کیں جن میں صوفی صاحب سب سے زیادہ
سینئر تھے اور ان کی ڈگریاں بھی سب سے زیادہ تھیں اسلئے وہ سوچتے تھے کہ یہ شخص میرے
پاس آئے تو میں اس کا نام سفارش کرکے آگے بھیجوں لیکن صوفی صاحب نے ادھر توجہ تک نہ دی۔
اس وقت منٹگمری کالج کے پرنسپل میاں اصغر علی مرحوم تھے۔ پنجاب کے مختلف پرنسپلوں
کا ایک اجلاس ۱۹۵۷ء کے آخر میں پنجاب یونیورسٹی میں ہوا جس میں سراج صاحب اور میاں اصغر علی
مرحوم بھی شامل ہوئے۔ سراج صاحب نے میاں صاحب سے پوچھا کہ منٹگمری میں عربی کا پروفیسر کون
ہے۔ انہوں نے صوفی صاحب کا نام لیا۔ سراج صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ عربی کی

صدارت کی کرسی خالی ہے اور یہ شخص ابھی تک مجھے نہیں ملا۔ آپ منٹگمری میں جا بیٹھے تو آج یہ بات سمجھائیں کہ گورنمنٹ کالج میں دستور یہی ہے کہ صدر شعبہ اور پرنسپل کی سفارش سے یہ کام ہوتا ہے اور میرے خیال میں یہ شخص رہنے والا بھی لاہور ہی کا ہے اس لئے وہ بخوشی یہاں آنے کو تیار ہوگا۔ چنانچہ میاں اصغر علی مرحوم منٹگمری واپس گئے تو انہوں نے صوفی صاحب سے کہا کہ سراج صاحب سے ضرور ملو تاکہ تمہیں گورنمنٹ کالج لاہور کے سٹاف میں لے لیا جائے۔ صوفی صاحب نے شعر پڑھا ؎

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

میاں اصغر علی ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ چونکہ وہاں دستور ہی یہ ہے اس لئے ایسا کرنے میں کیا حرج ہے۔ اب دسمبر کی چھٹیاں آنے والی ہیں۔ اُن میں جب تم لاہور اپنے گھر جاؤ تو سراج صاحب سے بھی مل لینا۔ صوفی صاحب نے کہا کہ یہ صرف آپ کا مشورہ ہے یا آپ کا حکم ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر یہ مشورہ دے رہا ہوں ورنہ تم نے جو کام اس کالج میں سنبھال رکھا ہے اُن کو بطریق احسن سرانجام دینے والا تمام سٹاف میں مجھے ایک شخص بھی نظر نہیں آتا لیکن میں تمہاری ترقی کے رستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا اس لئے میں پھر یہی مشورہ دیتا ہوں کہ سراج صاحب سے ضرور ملو لیکن صوفی صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اگر واقعی اس کرسی صدارت کا میں مستحق ہوں تو محکمے والوں کو از خود مجھے وہاں لگا دینا چاہئے اور اگر میں اس کا مستحق نہیں ہوں تو میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔ بہرصورت صوفی صاحب نے سراج صاحب سے ملنے کے معاملے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ بالآخر افسران بالا نے سراج صاحب کو لکھا کہ تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا ہے آپ نے عربی کے ٹیچر سینئر ملازموں کی فائلیں منگوائی تھیں تاکہ آپ مناسب شخص کا انتخاب کر سکیں لیکن ابھی تک آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اس لئے آپ جلدی فیصلہ کریں۔ چنانچہ سراج صاحب نے صوفی صاحب کے اُن سے ملنے سے مایوس ہو کر اُن کا نام افسران بالا کو بھیج دیا کہ اس شخص کی تبدیلی لاہور گورنمنٹ کالج میں کر دی جائے۔ کچھ عرصہ بعد محکمہ تعلیم کی طرف سے اس تبدیلی کی اطلاع منٹگمری کالج والوں کو دے دی گئی اور صوفی صاحب ۱۹۵۸ء کی ابتداء میں لاہور میں بطور صدر شعبہ عربی و اسلامیات آ گئے۔

لاہور آ کر سراج صاحب سے ملے تو باتوں باتوں میں سراج صاحب نے فرمایا کہ گو تم مجھے ملنے نہیں آئے حالانکہ اس کالج میں تقرری کا طریق کار یہی ہے کہ اپنے مضمون کے صدر شعبہ

اور پرنسپل سے پہلے مِل لیا جائے لیکن میں نے انہیں خوشخط بھیج کر تمہارا نام محکمے والوں کو بھجوا دیا تھا اس پر صوفی صاحب نے جواب دیا کہ مجھے آپ سے انصاف ہی کی توقع تھی اور میں سمجھتا تھا کہ اگر اس عہدے پر متعین ہونے کا حق میرا ہے تو پرنسپل صاحب جو منصف مزاج ہیں ضرور میرے حق میں سفارش کر دیں گے اور اگر میرا حق نہیں ہے تو میں کسی دوسرے کے حق کو غصب کرنا نہیں چاہتا۔ یہ سُن کر پرنسپل صاحب بہت خوش ہوئے۔

صوفی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۵۸ سے ۱۹۷۰ تک تعلیمی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں وہ یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور میں ایم اے عربی کے طلبہ کو بغیر کسی معاوضہ کے عربی قدیم شاعری کے پرچے کی تیاری بھی کراتے رہے۔ انہیں محکمۂ تعلیم کی طرف سے دو تین بار لاہور سے باہر گورنمنٹ کالجوں میں بطور پرنسپل جانے کی فرمائش کی گئی لیکن انہوں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ میرا مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ انتظامی معاملات سے مجھے معاف رکھا جائے کیونکہ پرنسپل کو اپنے کالج کے معاملات سے ہی اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنے مضمون میں مزید معلومات حاصل کر سکے لیکن مجھے اپنی معلومات کو وسیع کرنے اور مزید قابلیت پیدا کرنے کا شوق ہے جو لاہور سے باہر چلے جانے کی صورت میں یکسر ختم ہو جائے گا۔ محکمے والوں کا بھی زیادہ فائدہ اسی بات میں ہے کہ ملازم کی مرضی کے مطابق اُس سے کام لیا جائے۔ ملازمت سے سبکدوشی سے دو تین سال پہلے صوفی صاحب کو لاہور میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیم کے عہدے پر متعین کرنے کی تجویز اُن کے علم میں آئی لیکن صوفی صاحب نے متعلقہ افسران سے درخواست کی کہ یہ اسامی کسی اور صاحب کو سونپی جائے کیونکہ میرا مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ آخر کار یہ درخواست منظور کر لی گئی۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے سٹاف میں شعبہ شماریات کے ایک پروفیسر صاحب کو جب صوفی صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ اُن کے پاس دس بارہ ڈگریاں ہیں تو ایک دن صوفی صاحب سے کہنے لگے کہ آپ کو ضرور پرنسپل بن کر لاہور سے باہر چلا جانا چاہئے اسی طرح آپ کو ملازمت میں کلاس وَن آفیسر بننے کا موقع میسر آ جائے گا۔ ورنہ آپ کو یہ تو معلوم ہے عربی یا اسلامیات میں سارے پاکستان کے کسی کالج میں کلاس ون کی اسامی موجود نہیں اگر آپ یہیں بیٹھے رہے تو آپ مزید ترقی نہیں کر سکتے اور کلاس ون کبھی نہیں مل سکتے۔ بچوں کو پڑھانے کا کام تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے

لیکن آپ کی قابلیت اور دیانت داری شاید سب لوگوں میں نہ پائی جاتی ہو۔ اپنے ملک پاکستان کی خدمت
کرنا ہم سب کا فرض ہے اسلئے آپ کو ضرور کسی انتظامیہ اسامی پر متعین ہو جانا چاہئیے لیکن صوفی
صاحب اس سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر خدا
تعالیٰ کو منظور ہے تو شاید یہ کسی نہ کسی طرح کلاس روم میں ہی ہو جائے اور اگر نہ بھی ملے تو کوئی افسوس
نہیں ہوگا۔

قدرت کے کارخانے عجیب ہیں۔ اتفاق سے گورنمنٹ کالج لاہور میں محکمۂ تعلیم نے شام کے
وقت بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا جس کو نائٹ شفٹ کہا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ
عوام الناس کو شکایت رہتی کہ گورنمنٹ کالج کے داخلے پر بڑی پابندیاں ہیں اسلئے اس شکایت کا کچھ ازالہ
ہونا چاہئیے۔ شام کی درس و تدریس کے سرپرست شیخ عبدالحق تھے اور یہ اسامی وائس پرنسپل کے
نام سے موسوم تھی۔ ایک دو سال تک شام کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا لیکن اُس میں
خرابیاں نظر آئیں کہ Evening Shift میں داخل ہونے والے طلبہ صبح کے وقت بھی کالج میں پھرتے
رہتے اور اس وقت کے طلبہ کو خراب کرتے اور اُن کا وقت ضائع ہوتا جس کی وجہ سے کلاسوں میں
حاضری کم ہو گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ صبح کے طالب علم شام کے وقت کالج کے کمروں میں اپنی سوسائیٹیوں
اور کلبوں کے اجلاس کیا کرتے اور یہ سلسلہ ختم ہونا شروع ہو گیا کیونکہ کالج کے کمرے نائٹ شفٹ والے
طلبہ کے استعمال میں آجاتے تھے۔ علاوہ ازیں Evening Shift کے طلبہ کی کھیلوں کا کوئی
انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ یہ اور اس قسم کی مزید خرابیاں دیکھ کر پرنسپل صاحب نے محکمہ والوں
کو صورت حال سے آگاہ کیا اور Evening Shift کا معاملہ ختم کر دیا گیا۔ اس شفٹ کا سٹاف
کو علیحدہ رکھا گیا تھا مگر وہ تمام اسامیاں مستقل نہیں اسلئے فیصلہ یہ کیا گیا کہ نائٹ شفٹ
کے طالب علم Morning Shift کے طلبہ میں اور Evening Shift کا سٹاف صبح
والے سٹاف میں مدغم کر دیا جائے۔ Evening Shift کے نگران شیخ عبدالحق کی پہلی
حیثیت قائم نہ رہی بلکہ انہیں بھی دوسرے سٹاف کے ساتھ برابر کا درجہ مل گیا۔ اس لئے انہوں نے
اس اسامی سے تبدیل کئے جانے اور سیکرٹریٹ میں کسی انتظامیہ عہدے پر متعین کئے جانے کی
درخواست محکمہ والوں کو دی۔ جس پر انہیں محکمۂ تعلیم کا سیکشن آفیسر بنا دیا گیا۔ کالج میں

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اُن کی اسامی کلاس ون آفیسر کی تھی۔ اس عرصہ میں لاہور سے باہر کئی کالجوں میں
پرنسپل کی اسامیاں خالی ہو گئیں اور وہ سب کلاس ون آفیسر کی اسامیاں تھیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی
Evening Shift کی اسامی بھی کلاس ون کی تھی ان تمام اسامیوں کو پُر کرنے کے لئے سیکرٹری
تعلیم اور دوسرے اعلیٰ افسروں کا ایک بورڈ بنایا گیا اور تمام کلاس ون کی اسامیوں کے امیدواروں کو
انٹرویو کے لئے سیکرٹریٹ میں بلایا گیا تاکہ اُن سے بالمشافہ حالات کا پتہ چل سکے غالباً چار پانچ
اسامیاں پُر کی جانی تھیں۔ جب انٹرویو ہوا تو سب سے پہلے صوفی صاحب کو پیش ہونے کا موقع دیا گیا۔
بورڈ والوں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کو ایک دو بار پہلے بھی لاہور سے باہر پرنسپل کی اسامی پیش کی
جا چکی ہے لیکن آپ نے اُن مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب یہ ایک موقع ہے اسی لئے آپ باہر
چلے جائیں تو بہتر ہے تاکہ آپ کو پنشن کلاس ون آفیسر کے طور پر مقرر کی جا سکے ورنہ آپ کو مالی طور
پر نقصان رہے گا۔ صوفی صاحب نے بورڈ والوں کا شکریہ ادا کیا اور باہر جانے پر رضامندی کا اظہار
نہ کیا۔ بورڈ کے کل تین ممبر تھے جن میں سے دو میاں اصغر علی مرحوم اور ڈاکٹر جہانگیر خان (مشہور
کرکٹر ماجد خان کے والد) تھے جو گورنمنٹ کالج منٹگمری کے پرنسپل رہ چکے تھے اور صوفی صاحب کی
قابلیت، محنت اور جفاکشی کے قائل تھے۔ انٹرویو کے دوران ڈاکٹر جہانگیر خان صاحب نے صوفی
صاحب سے پوچھا کہ لاہور میں رہ کر آپ کیا کریں گے؟ صوفی صاحب نے کہا کہ میں جب سے لاہور
آیا ہوں تقریباً روزانہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ضرور جاتا ہوں اور میں نے عربی کی مشہور کتاب وفیات
الاعیان مصنفہ قاضی ابن خلکان پر تحقیقی کام شروع کر رکھا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ
خاص اچھی لائبریری ہو اور ملازمت کے اوقات کے سوا باقی وقت تحقیقی کام میں صرف کیا جا سکے
اگر مجھے پرنسپل بنا دیا گیا تو میرا یہ کام مجھ سے چھوٹ جائے گا۔ حالانکہ میں اپنے شوق سے اس کام
کو کر رہا ہوں اور میں اپنی موجودہ اسامی سے مطمئن ہوں۔ اگر مجھے کلاس ون ترقی نہیں مل سکی
تو میں محکمہ تعلیم کا شکر گزار ہوں کہ اتنی بار انہوں نے کلاس ون کی پوسٹ کی پیشکش کی ہے لیکن اگر
مجھے باہر بھی بھیجا گیا تو میں درس و تدریس کا کام ہی کرنا چاہتا ہوں۔ اسلئے اگر لاہور میں درس و تدریس
کے سلسلے میں ہی کلاس ون کی اسامی دے دی جائے تو میں بہت خوش ہوں گا۔ ورنہ مجھے کوئی
شکوہ نہیں۔

اس کے بعد صوفی صاحب انٹرویو سے فارغ ہو کر گھر آ گئے اور باقی امیدواروں کے انٹرویو ہوتے رہے
پندرہ بیس منٹ بعد محکمۂ تعلیم والوں نے تحریری طور پر صوفی صاحب سے پوچھا کہ اُس روز انٹرویو میں
آپ نے باہر جانے کی تجویز کو منظور نہیں کیا تھا ممکن ہے آپ نے بعد میں غور سوچا ہو اور کوئی اور رائے قائم
کی ہو اسلئے آپ تحریری طور پر جواب دیں اب کیا ارادہ ہے۔ صوفی صاحب نے حسبِ فرمائش تحریری طور
پر بھی یہی لکھ کر بھیجا کہ میری رائے وہی ہے جو میں نے انٹرویو کے موقع پر پیش کی تھی۔ اس تمام کشمکش کا نتیجہ
یہ نکلا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی Evening Shift کے سربراہ کی اسامی پر صوفی صاحب کو متعین
کر دیا گیا۔ اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد تھے اسلئے انتظامی امور کے وہ ذمہ دار
تھے اور صوفی صاحب کو درس و تدریس ہی کا کام کرنا پڑتا جو اُن کے حسبِ منشا تھا۔ صوفی صاحب
کہتے ہیں کہ خدا کی ذات خود بخود ایسے اسباب مہیا کر دیتی ہے جن سے انسان کی محنت، شوق اور
دیانتداری کا صلہ مل جاتا ہے ایسے ہی واقعات انسان میں خدا کی معرفت پیدا کر سکتے ہیں۔ فالحمد
للہ علی ذلک۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے صوفی صاحب نے قاضی ابن خلکان کی مشہور کتاب
وفیات الاعیان پر تحقیقی کام لاہور آنے کے بعد شروع کیا تھا اور آج کل اسی کام پر نظرثانی کر رہے ہیں
کیونکہ بعض کتب پہلے دستیاب نہ ہو سکی تھیں جو بعد میں انہوں نے بیرونِ ملک سے منگوائیں۔ دعا
ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو جلدی پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے ۱۹۷۰ سے سبکدوشی کے بعد آپ پنجاب
ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور میں عربی اور اسلامیات کے ماہرِ مضمون کے طور پر تقریباً ڈیڑھ سال تک کام کرتے
رہے۔ اُن کے ایک ہمکار شیخ عبدالحمید مرحوم (صدر شعبہ معاشیات و تاریخ، گورنمنٹ کالج لاہور)
ٹیکسٹ بک بورڈ میں ڈائریکٹر کے طور پر پہلے سے ہی کام کر رہے تھے انہوں نے باصرار صوفی صاحب سے
بار بار ٹیکسٹ بک بورڈ میں منصب بالا اسامی کے لئے فرمائش کی حتیٰ کہ صوفی صاحب مجبور ہو گئے
ورنہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کسی اور جگہ کام کرنا انہیں منظور نہ تھا۔ اسی طرح علامہ اقبال
واقع شاہی مسجد لاہور کے سربراہ ڈاکٹر یوسف گورایہ اور حافظ محمد الحسن صاحب (ریٹائرڈ
پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) صوفی صاحب سے ملے اور علامہ اکیڈمی کے طلبہ کو عربی ادب قدیم کی تدریس کی

فرمائش کی لیکن صوفی صاحب نے انکار پر انکار کیا لیکن حافظ نور الحسن صاحب کے ساتھ چونکہ اُن کے قدیم روابط تھے اسلئے آخر انہیں ماننا پڑ گیا اور تقریباً دو سال علامہ اکیڈمی کے طلبہ کو آپ نے پڑھایا۔ اسی دور میں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے صدر شعبہ عربی ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک صاحب نے صوفی صاحب کو اپنے تعلقات کی بنا پر بار بار فرمائش کرنے کے بعد شعبہ عربی میں ایم اے کی کلاسز کو قدیم ادب کا پرچہ پڑھانے کے لئے وائس چانسلر صاحب سے اجازت لے کر مقرر کرا دیا۔ یہاں بھی تقریباً دو سال تک انہوں نے کام کیا اور پھر تمام کاموں کو چھوڑ کر اپنے تحقیقی کام پر نظر ثانی کرنے کا تہیہ کر لیا جو ابھی تک جاری ہے

اُن کے بھائی ڈاکٹر دانا بہاء الحق صوفی صاحب کے بارے میں کہتے ہیں کہ

والد صاحب مرحوم و مغفور کے چشمۂ فیوض و برکات سے جس قدر استفادہ آپ نے کیا وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا۔ انہیں صحیح معنوں میں اپنے والد بزرگوار کا جانشین قرار دیا جا سکتا ہے۔ مطالعہ کے حد سے بڑھے ہوئے شوق نے انہیں تجرد کی زندگی گزارنے پر آمادہ کر لیا۔ کتابیں اُن کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ اگر انہیں فنا فی العلم کا لقب دیا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ والد صاحب مرحوم نے جو کتب خانہ چھوڑا تھا اُس میں نسبتاً مذہبی لٹریچر پر کتب زیادہ تھیں۔ آپ نے اُس میں ادبی کتب کا اضافہ کیا۔ چونکہ شروع ہی سے انہیں کلاسیکل ادب سے شغف تھا اس لئے اپنا تمام اندوختہ ایسی ہی نوعیت کی کتابیں خریدنے پر صرف کرتے رہے ہیں۔ قدیم شعراء کے دواوین اور علماء ادب کی تصانیف میں سے شاید ہی کوئی چھوٹی یا بڑی کتاب ایسی ہو جو آپ کے ذخیرۂ کتب میں موجود نہ ہو۔ بلکہ بعض ایسی نایاب کتب بھی آپ کے کتب خانہ کی زینت ہیں جو ملک کی بڑی بڑی لائبریریوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آئیں

١٩٦٠ء میں جب آپ اپنے افراد خانہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے گئے تو واپسی پر تحائف و تبرکات ہمراہ لانے کی بجائے تمام زرِ مبادلہ خرید کتب پر صرف کر کے اُن کی دو بوریاں بھر کر ساتھ لے آئے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی تلامذہ، احباب اور اعزہ و اقارب میں سے جب کوئی اُن سے ملاقات کے لئے جاتا ہے تو وہ ہمیشہ انہیں کتب بینی میں مستغرق اور مطالعہ میں منہمک پاتا ہے۔ انہوں نے اپنے کتب خانہ کی کسی کتاب پر قلم سے تشریحی حواشی درج کر رکھے ہیں۔ کسی پر مصنف کی فروگزاشت کی نشاندہی کی ہے اور طباعت کی غلطیوں کو درست کیا ہے۔ کہیں کسی کتاب کے

مختلف ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ کر کے اُن کے صفحات کے نمبروں میں باہمی تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ جس کتاب کی فہرست موجود نہیں، یا جس کے کچھ اوراق دریدہ یا سرے سے غائب ہیں تو اپنے قلم سے لکھ کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اگر اُن کا تحقیقی کام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو گیا تو ان شاء اللہ العزیز ایک بیش بہا علمی خدمت متصور ہوگا۔ خدا کرے یہ کام اُن کی حیاتِ مستعار میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ آمین۔

وہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر دسترس رکھتے ہیں۔ بالخصوص تخرجہ اور تعمیہ کے بغیر مادۂ تاریخ نکالنے میں آپ کو یدِطولیٰ حاصل ہے جو انہیں وراثت میں ملا ہے۔ چنانچہ بعض اکابرِ ملّت اور افرادِ خاندان کی وفات کے علاوہ عزیزوں اور دوستوں کی تقاریبِ نکاح کے مواقع پر بے تکلف مادہ ہائے تاریخ آپ نے برآمد کئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر بے ساختہ آپ کی مہارتِ فن کی داد دینا پڑتی ہے۔ نمونے کے طور پر اُن میں سے صرف ایک کا ذکر آگے چل کر مولانا کی وفات کے عنوان کے تحت ان شاء اللہ کیا جائے گا۔ اُن کا مجموعۂ شعری ابھی تک قلمی شکل میں ہے اور اس کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا

ڈاکٹر صاحب نے عربی، فارسی اور علوم اسلامیہ میں ایم اے کیا۔ کالج میں اُن کا مضمون عربی تھا لیکن انہوں نے فارسی کی تعلیم گھر پر اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ نیز علوم مشرقیہ یعنی مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل اور پنجابی فاضل کے تمام امتحانات میں درجہ بدرجہ شریک ہو کر بالعموم اول پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں ایک عربی تصنیف "مختال الامثال" کے ایک قدیم قلمی مگر دیمک خوردہ نسخہ کو جو جمال الدین الشیبی کی تصنیف تھا۔ تحقیق و تدقیق کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جس پر انہیں جامعہ پنجاب کی طرف سے عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔

انہوں نے سرکاری ملازمت کا آغاز ۱۹۴۵ء میں کیا اور انہیں امرتسر میں محکمۂ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں انسپکٹر متعین کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر وہ امرتسر سے تبدیل

ہو کر اپنے آبائی وطن ضلع گجرات میں چلے آئے۔ کچھ مدت بعد اُن کا تبادلہ مری میں کر دیا گیا مگر انہوں نے
وہاں جانے کی بجائے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۴۹ء میں انہیں جموں و کشمیر سے آنے والے
مہاجرین کے ایک کیمپ کا کمانڈنٹ مقرر کر دیا گیا اور جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں اُن کی تقرری عمل
میں آئی۔ یہاں وہ دو سال تک اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے ۱۹۵۱ میں محکمہ تعلیم سے منسلک
ہو کر وہ گورنمنٹ کالج ساہیوال بھیج دیئے گئے جہاں اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد ضیاء الحق پہلے سے موجود
تھے۔ تقریباً چھ سال تک وہ علوم اسلامیہ کی تدریس کرنے کے بعد ایک مذہبی مسئلہ پر پرنسپل
صاحب سے انہوں نے اختلاف کیا جس کے نتیجے میں اُن کا تبادلہ میانوالی کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں
میانوالی سے گوجرانوالہ اور وہاں سے شیخوپورہ کے کالج میں تبدیل کر دیا گیا اور آخر ۱۹۶۳ء کے آخر
پر وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے جہاں سے وہ ۱۹۸۱ء کے آخر میں عزت کے ساتھ ملازمت
سے سبکدوش ہو گئے۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد انہیں لاہور سے باہر مثلاً بہاولپور، اسلام آباد
وغیرہ میں اُن کی مرضی کے مطابق کاموں کے لئے دعوت دی جاتی رہی لیکن انہوں نے اپنے بچوں کی صحیح
تعلیم و تربیت کی خاطر لاہور سے باہر جانا نہ چاہا بلکہ اسے وہ ایک ضروری فریضہ اور عام کاموں سے زیادہ
اہم خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران بہت سے لوگوں کے کام اپنے اثر و رسوخ سے سر انجام
دیئے اور اسی سلسلے میں خلقِ خدا کی بہت خدمت کی۔ جزاہ اللہ تعالیٰ

محمد مظہر الحق رانا

مولانا مرحوم کے یہ پانچویں بیٹے ہیں اور تمام بھائیوں میں سب سے چھوٹے
ہیں۔ انہوں نے بھی بچپن میں عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ مولانا رحمۃ
اللہ کو ریاضیات سے کافی لگاؤ تھا اور اس کا ذکر وہ اپنے اساتذہ کے سلسلے میں عموماً
کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ریاضیات میں اُن کے اورینٹل کالج میں استاد مولانا غضنفر علی مرحوم
تھے۔ بڑے بھائی حافظ عبدالحق صاحب کی طرح رانا مظہر الحق صاحب کا رجحانِ طبع بھی زیادہ تر
علم ریاضی کی طرف تھا۔ انہوں نے ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر صوفی کے
پاس منٹگمری کالج میں داخل ہو کر پاس کئے اور ایم۔ اے کے لئے انہیں لاہور آنا پڑا۔ ایم۔ اے کر لینے

کے بعد پہلے انہیں رحیم یار خان کے کالج میں ریاضی کا استاد متعین کیا گیا۔ تقسیم ملک کے بعد جب ریاست
بہاولپور کا الحاق مغربی پاکستان میں کر دیا گیا تو وہ پنجاب میں آ گئے اور کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور
میں گزارنے کے بعد شیخوپورہ کالج میں تبدیل ہو گئے اور وہاں سے گورنمنٹ کالج ساہیوال میں بھیج دیئے
گئے اور آج تک بفضلِ تعالیٰ وہ وہیں صدر شعبہ ریاضی کی حیثیت سے اپنے فرائض بجا لا رہے ہیں
رانا صاحب بہت قابل استاد ہیں اور اُن کے تلامذہ اُن کے بہت مداح ہیں۔ وہ پرائیویٹ
طور پر ریاضی کے مضمون میں کئی ایک طلبہ کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

وفات

مولانا اصغر علی روحی مرحوم نہایت اچھی صحت کے مالک تھے اسکی وجہ یہ ہے
کہ وہ نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ جب تک صحت اجازت دیتی رہی وہ ہر کام کو نہایت دانشمندی
اور تندہی سے بجا لاتے رہے۔ پبلک جلسوں میں بھی وہ شد و مد کے ساتھ آمد و رفت کرتے رہے
چونکہ اُن کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی اور دوسری سے ہی کام لیتے رہے اسلئے آخر عمر میں اُن کی
بصارت بہت کمزور ہو گئی اور ہر قسم کی آمد و رفت ختم ہو کر رہ گئی۔ اب سوائے مسجد اور گھر کے
انہوں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ اس کا اُن کی زندگی اور صحت پر ناخوشگوار اثر پڑا اور اُن کے
قویٰ روز بروز کمزور ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اُن کی صحت تیزی سے رو بزوال ہونا
شروع ہو گئی۔ ثقلِ سماعت اور پیر دھول کے عارضہ نے بھی آ گھیرا۔ ڈاکٹری علاج سے تو وہ ہمیشہ
ہی نفرت رکھتے تھے۔ دیسی علاج سے مستفید ہوتے رہے لیکن صحیح معنوں میں اُن کی مشغولیات
میں بہت فرق آ گیا۔ دو تین سال تک صاحبِ فراش ہو کر رہ گئے اور آخر ۳۰ مئی ۱۹۵۴ء
بمطابق ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ بروز دوشنبہ عصر کی نماز کے وقت یہ علم و فضل
کا آفتاب عالمتاب قریباً ۸۳ سال ضیا پاشی کے بعد ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا للّٰہ
و انا الیہ راجعون

اُن کی وفات پر کئی اصحاب نے اُن کی تاریخ ہائے وفات لکھیں جو جرائد و
رسائل میں طبع ہوتی رہیں۔

ایک تاریخ وفات آپ کے شاگرد مولانا غلام دستگیر نامی نے کہی جو یہ ہے اور

اُسکے آخری مصرعہ سے ۱۹۵۲ء کا سال نکلتا ہے ۔

مرگِ عالمِ دیں مثلِ روحی فوتِ عالم شد

ہمہ گفتند چوں ناگاہ شد اصغر علی روحی

بطاعاتِ خدا و مصطفےٰ عمرے بسر کردہ

سوئے جنت بعزّو جاہ شد اصغر علی روحی

بسالِ انتقالِ آں یگانہ عالم و فاضل

بگو ناصر " جدا اے آہ شد اصغر علی رُوحی "

۱۹ عیسوی ۵۲

آپ کے فرزند ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی نے اُن کی متعدد تاریخہائے وفات نکالی ہیں لیکن ایک تاریخ جو رباعی کی شکل میں حسب ذیل ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ سال ہجری کے ساتھ یوم وفات یعنی ۲۷ رمضان کا ذکر بھی موجود ہے ۔

بیدار چو شد فتنہ و چوں امن بخفت

روحی زجہاں زیرِ زمیں روئے نہفت

تاریخ وفاتش چو زہاتف جستم

" سہ یوم چو ماندہ زمہِ رمضان گفت "

۱۳ ہجری ۷۳

وفات کے وقت اتفاقاً آپ کے سب سے بڑے صاحبزادہ مولوی فضل حق مرحوم کراچی سے سرحد کی طرف دورہ کے لئے جا رہے تھے کہ ایک رات کے لئے لاہور آئے اور والد صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ٹھہرے ۔ اُسی روز جب آپ کو عصر کی نماز کے لئے جائے نماز پر بٹھایا گیا تو آپ دو رکعتیں ادا کرنے کے بعد جائے نماز پر ہی لیٹ گئے ۔ اُن کے صاحبزادہ نے عرض کیا کہ عصر کی چار رکعتیں پڑھنی چاہیئے تھیں لیکن آپ نے دو رکعتیں پڑھ کر ہی سلام پھیر دیا ہے اس پر مولانا نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ خاموش رہو ۔ جائے نماز پر لیٹے ہی

آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جب اُن کو بلایا جُلایا گیا تو آپ واصل بحق ہو چکے تھے۔ بعد میں اُن کے صاحبزادے نے بتایا کہ چونکہ آپ کو سفرِ آخرت پیش آگیا تھا اس لئے آپ نے مسافرانہ حیثیت میں نماز قصر ادا کی اور چلتے بنے۔ بعد میں صوفی صاحب نے جب اُن کی عمر کا حساب کیا تو لیلۃ القدر خیر من الف شہر کی آیتِ مبارکہ کے مطابق اُن کی عمر ۸۳ سال ۴ مہینے تھی یعنی پورے ایک ہزار مہینے تک۔

آپ کی نمازِ جنازہ اگلے روز بھاٹی اور موری دروازہ کے درمیان باغ میں ادا کی گئی جس میں اعزہ و اقارب کے علاوہ ہزاروں معتقدین اور تلامذہ شامل تھے۔ حالانکہ کسی کو دعوت دے کر نہ بلایا گیا تھا۔

آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نمازِ جنازہ یا تو مولوی احمد علی صاحب (شیرانوالہ دروازہ) اور یا مولوی عبدالعزیز (مرحوم) پڑھائیں۔ چنانچہ مولانا احمد علی تشریف لے آئے تھے جب اُن سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے اچھرہ کے مدرسہ فتحیہ کے ایک استاد مولانا حافظ محمد کو آگے کر دیا چنانچہ انہوں نے ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

آپ کی دلی وصیت یہ تھی کہ مجھے گاؤں میں اُس مسجد کے قریب جو آپ نے بنوائی تھی دفن کیا جائے لیکن چونکہ آپ کے تمام صاحبزادے لاہور سے باہر ملازم تھے اور دو دو تین تین دن کے لئے لاہور آئے تھے اسلئے مولانا کی نعش کو ایک تابوت میں بند کر کے اُن کے مکان کے قریب ہی تکیہ بناریاں میں امانت کے طور پر دفن کیا گیا۔ پھر دو ماہ کے بعد جب تعطیلات گرما شروع ہوئیں تو حسبِ وصیت اُن کا تابوت تکیہ بناریاں سے نکال کر ڈپٹی کمشنر کی اجازت سے گاؤں لے جایا گیا اور اُن کی حسبِ منشا اُن کی بنا کردہ مسجد نور کے قریب آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اللھم اغفر لہ۔

انہوں نے اپنی وفات سے پہلے دو فارسی قطعات لکھے تھے اور وصیت فرمائی تھی کہ اُن کو کسی پتھر پر لکھوا کر میری قبر پر کتبہ کے طور پر لگوا دیئے جائیں چنانچہ آپ کی اسی وصیت کے مطابق کتبہ تیار کر کے قبر پر لگا دیا گیا۔

باب دوم

(سیرت و کردار)

باب دوم

مسلک

مولانا مرحوم اسلام کے فرقہ اہلِ سنت وجماعت سے وابستہ تھے۔ فقہی معاملات میں وہ ائمۂ اربعہ میں سے امام اعظم رحمہ اللہ کے مسلک کے پیرو تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس امر کی صراحت مندرجہ ذیل فارسی اشعار میں کی ہے ؎

زدین دارم بخود کاں شد مرا بس — بآوازِ دُہل گویم بہر کس
کتاب وسنت واجماعِ امّت — قیاسِ مجتہد در چار ملّت
فروغِ شمعِ حبِّ آل واصحاب — کزو غیرت برد مہرِ جہانتاب
دریں راہ گامزن شو بے خطر باش — زغولانِ درِ رہِ دیں بُرحذر باش
کہ گر منکرے را مکتب شد — خداوندش بمحشر محتسب شد

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مدح میں انہوں نے عربی زبان میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جو انجمن نعمانیہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انہوں نے پڑھا۔ یہ قصیدہ اُن کے عربی دیوان میں موجود ہے۔

حنفی فقہ کا پیرو ہونے کے باوجود وہ دیگر ائمۂ فقہ کی عظمت، علم اور دینی خدمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے۔ جب کبھی اُن کا ذکر آتا تو نہایت ادب اور احترام سے اُن کو یاد کرتے اور فرطِ عقیدت سے اُن کی گردن جھک جاتی۔

اپنے اسی مسلک کے مطابق قریباً نصف صدی تک وہ اپنے محلہ کی مسجد میں خالصۃً لوجہ اللہ امامت و خطابت کے فرائض بجا لاتے رہے اور زندگی میں کئی بار انہیں متحدہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مذہبی جلسوں میں شرکت کا موقع ملتا رہا اور اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں بھی ہر اتوار کو وعظ و نصیحت اور رُشد و ہدایت، کالج کے عام

طلبہ اور اساتذہ کی موجودگی میں قریباً چالیس (۴۰) برس تک اُن کی آواز گونجتی رہی، لیکن آپ نے کبھی فرقہ وارانہ اختلافات اور متنازعہ فیہا مسائل پر لب کشائی نہ کی بلکہ وہ مذہبی تعصب سے کوسوں دور اور باہمی رواداری کے سختی سے پابند تھے۔ ہمیشہ آپ سُنّی، وہابی، دیوبندی، بریلوی اور اہلِ تشیّع یا دوسرے اسلامی فرقوں کی اسی چپقلش اور کشمکش کو مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب قرار دیتے اور فرماتے کہ ان فرقوں کے علماء نے عوام الناس کو اپنی دکانداری چلانے کے لئے بلا ضرورت ایسے بیہودہ اور لغو قسم کے مسائل میں الجھا رکھا ہے جن کا نجاتِ اخروی سے کوئی واسطہ نہیں۔ عوام الناس بے چارے خود تو قرآن و سنت کا علم نہیں رکھتے کہ وہ اصل حقیقت سے آگاہ ہوں اسلئے جب کوئی عالمِ دین اپنی کسی مسئلے کا حل کچھ بتاتا ہے اور دوسرا کچھ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے دلوں میں شکوک و اوہام اور مختلف قسم کے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دین سے اعراض کر لیتے اور مذہب سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اُن کے صاحبزادہ رانا بہاء الحق کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت والد صاحب نمازِ عصر کے بعد مسجد میں تشریف فرما تھے کہ کوئی ملاقاتی آیا اور اپنی گفتگو کے درمیان اُس نے آپ سے پوچھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا تم مجھ سے ایسی بات کے متعلق کیوں پوچھتے ہو جس کا آخرت کی نجات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ تم سے ہرگز یہ سوال نہیں کرے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا علم تھا یا نہیں۔ اگر میری یہ بات پوری نہ ہوئی تو میرا گریبان ہوگا اور تمہارا ہاتھ۔

اُن کی فراخدلی، رواداری اور بے تعصبی ہی کا نتیجہ تھا کہ کسی فرقے کے لوگ بھی اُن سے پرخاش یا بغض نہیں رکھتے تھے بلکہ موقع بموقع اپنی مذہبی مجالس میں شرکت کی دعوت دیتے رہتے۔ محرم الحرام کے دنوں میں جب نواب قزلباش خاندان کی طرف سے مجالسِ عزا کا اہتمام کیا جاتا تو انہیں ہر سال دعوت دی جاتی۔ ایک بار اُن کے کسی عقیدت مند کے سامنے یہ دعوت نامہ آپ کو ملا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ قبلہ کیا آپ بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا: اگر شیعہ سے تمہاری مراد اہلِ بیت کی محبت ہے تو میں ایک غالی شیعہ ہوں کیونکہ میرا ایمان ہے کہ جس شخص کا دل محبتِ اہلِ بیت سے خالی ہے، وہ مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں۔ لیکن اگر شیعہ سے تمہاری مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب و شتم کرنا ہے تو حاشا و کلا میں ہرگز شیعہ نہیں ہوں

اسی سلسلہ میں آپ کو کئی بار مختلف فرقوں کے باہم مناظروں کی مجالس میں حَکَم یعنی جج
مقرر کیا جاتا تھا جس پر فریقین کو اتفاق ہوتا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آپ عادل منصف مزاج اور حق پرست
عالم ہیں اور بے لاگ رائے دیں گے۔ چنانچہ رانا بہاء الحق کا بیان ہے کہ

۱۹۳۲ء میں جب میں طالب علم تھا۔ دیوبندی اور بریلوی علماء کے درمیان ایک مناظرہ طے پایا
جو لاہور کی سنہری مسجد میں منعقد کیا جانا تھا۔ یہ قدیم تاریخی مسجد کشمیری بازار کے شروع میں واقع
ہے۔ اس کے لئے بڑے زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ ہر دو فریق کے چیدہ چیدہ علماء ہندوستان کے کونے
کونے سے لاہور میں جمع ہو گئے۔ ثالثی کے انتخاب کا مسئلہ نزاع کا باعث بن گیا۔ دیوبندی حضرات اگر
کسی شخص کا نام تجویز کرتے تو دوسرے فریق والے اُس پر اعتراض کرتے اسی طرح جب بریلوی علماء کسی فرد کا
نام پیش کرتے تو دیوبندی علماء کو اس سے اتفاق نہ ہوتا۔ آخر طویل کشمکش کے بعد [illegible] مرحوم اور
ڈاکٹر علامہ اقبال کے تقرر پر فریقین کا اتفاق ہو گیا۔ اسی سلسلے میں چند افراد ایک وفد کی صورت میں والا صاحب
مرحوم سے اُن کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے ہمارے ہاں آئے۔ آپ نے فرمایا کہ میرا تجربہ ہے کہ اس قسم کے
مذہبی مباحثے یا مناظرے بیکار ہیں۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوتا ہے کیونکہ فریقین پہلے ہی سے اس بات
پر تلے ہوتے ہیں کہ ہمارے مخالف لوگ خواہ لاکھ دلیلوں سے ہمیں قائل کرنے کی کوشش کریں ہم کسی طرح بھی
اُن کے موقف کو تسلیم نہیں کریں گے۔ گویا اُن کا مطمح نظر پہلے ہی بغضاً بینہم ہوتا ہے اور حق کی تلاش
مقصود نہیں ہوتی۔ جب یہ صورت حال ہے تو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے کیا فائدہ ہے۔ اسلئے بہتر یہ
ہے کہ آپ صاحبان مجھے اس عزت افزائی سے معاف رکھیں لیکن وفد کے اراکین آسانی سے اُن کا پیچھا چھوڑنے
والے نہیں تھے۔ چنانچہ وہ اصرار کرنے لگے اس لئے والا صاحب نے ناچار اپنی رضامندی کو دو باتوں سے
مشروط کر دیا۔ پہلی شرط یہ تھی کہ اگرچہ مجھے ڈاکٹر اقبال کے تقرر پر کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ اُن کے علمی
کمالات اور خدمت قوم سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا بالخصوص شعر و ادب میں اُن کا رتبہ بہت
بلند ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے حَکَم یعنی ثالث کوئی ایسا شخص ہونا چاہیئے جو قرآن و سنت میں پورا
درک رکھتا ہو اور اس کی تمام عمر اسلام کے مطالعہ میں صرف ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اُسے علوم عربیہ پر
بھی گہری اور وسیع نظر ہو۔ مناسب یہ ہے کہ میری امداد کے لئے ان اوصاف سے متصف کسی عالم دین کو
شریک کیا جائے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ ہم مناظرہ کی تمام کاروائی سننے کے بعد اُسی جگہ اور فوری

طے یہ فیصلہ نہیں دیں گے بلکہ ایک دو دن باہمی تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد کسی متفقہ نتیجہ پر پہنچ کر اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

یہ شرطیں سن کر اس وفد کے ارکان رخصت ہو گئے اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے مولانا مرحوم کے ہاں واقع ہونے والے تمام ماجرا کو سن کر مولانا مرحوم کی تمام باتوں کی تعریف کی اور مناظرہ میں تشریف لے جانے سے معذرت کر دی۔ اس وقت تک مناظرہ منعقد کرنے کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے اور دور دراز سے لوگ جوق در جوق لاہور پہنچ گئے تھے اس لئے اب مناظرہ کا التوا ممکن نہ تھا۔ آخر سوچ کر منتظمین نے اس دور کے نامور صحافی سید حبیب مرحوم کو جو روزنامہ سیاست کے ایڈیٹر تھے ثالث بننے کی دعوت دی جو انہوں نے منظور کر لی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ سردیوں کا موسم تھا۔ صبح آٹھ نو بجے کا وقت تھا میں اپنے سکول کے دو اساتذہ کی معیت میں سنہری مسجد پہنچ گیا۔ مسجد کا صحن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ ابھی تک بدستور آ رہے تھے۔ مناظرہ کرنے والے علماء بڑے بڑے عمامے باندھے مقطع اور متشرع داڑھیوں سے آراستہ رنگ برنگ جبوں میں ملبوس بغلوں میں بھاری بھرکم کتابیں دابے مسجد میں داخل ہوئے تھے وہ دو چوبی منبروں کے پیچھے صف در صف بیٹھ گئے۔ یہ منبر مسجد کے شمالی اور جنوبی اطراف میں انہیں کی خاطر رکھے گئے تھے۔ یوں سمجھئے کہ گویا یہ دو مورچے تھے۔ یہاں سے فریقین عنقریب ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے والے تھے۔ سید حبیب مرحوم وسط میں ایک چھوٹے سے قالین پر دوزانو بیٹھے تھے تاکہ طرفین کے سوال وجواب اور پھر جواب الجواب ایک دوسرے تک پہنچا سکیں۔

خدا خدا کر کے مناظرہ شروع ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ سوالات کا آغاز کس جانب سے ہوا۔ بہر صورت ایک طرف سے سوال کیا گیا جو سید حبیب کی وساطت سے دوسرے فریق تک پہنچا دیا گیا۔ دوسری طرف بیٹھے ہوئے مخالف علماء نے اس کا جواب ڈھونڈنے کے لئے اپنی کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی اور ساتھ ہی اپنی طرف سے ایک سوال کا جواب سید حبیب مرحوم کے ذریعے سے فریق اول سے مانگا۔ سوال وجواب کا یہ سلسلہ طول پکڑ گیا حتیٰ کہ جب یہ سلسلہ عروج تک پہنچا تو نماز ظہر کا وقت شروع ہو گیا اس لئے فریقین کو مجبوراً بحث ومباحثہ سے رکنا پڑا۔ اتنے میں مسجد کے صحن سے بیک وقت دو اذانوں کی صدائیں بلند ہوئیں جن کے بعد فریقین نے اپنے اپنے امام کی اقتدا میں الگ الگ نماز باجماعت ادا کی۔ مسجد کے قرب وجوار میں

ہندو دکاندار یہ منظر دیکھ کر نقلیں اتار رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ مسلمان جس نماز باجماعت کو باہمی اتحاد و تعاون کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ آج اس کا عملی مظاہرہ ہو رہا ہے۔ میرے کانوں میں بھی ان الفاظ کی بھنک پڑ گئی۔ میں اپنی کم عمری کے باوجود عرق انفعال میں ڈوب گیا۔ نماز سے فراغت ہونے کے بعد خدا جانے کس بات پر فریقین میں دھینگا مشتی اور جوتی پیزار کا وہ بازار گرم ہوا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ مسجد کا صحن ایک اچھی خاصی رزم گاہ بن گیا۔ اس دلخراش منظر کو دیکھ کر شریف اور بھلے مانس لوگ وہاں سے کھسکنے لگے۔ اس وقت امن عامہ کے تحفظ کا سوال تھا۔ پولیس والے بھی قریب ہی تھے۔ انہوں نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لئے ہلکا سا لاٹھی چارج بھی کیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنے والد بزرگوار کی فراست اور پیش بینی کی صداقت کی داد دینی پڑی۔ اس واقعہ سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ تمام فرقوں کے لوگ مولانا روحی کو کس درجہ کے غیر جانبدار اور بے تعصب عالم دین سمجھ کر ان پر اعتماد رکھتے تھے۔

اس مقالہ کی تحقیق کے دوران ایک مختصر سا رسالہ اسی قسم کے ایک اور مناظرہ کے متعلق دیکھنے میں آیا جو " فیصلہ کن مناظرہ " کے نام سے مولانا محمد منظور نعمانی نے لکھا ہے اور اسے مکتبۂ مدنیہ باغبانپورہ جدید گوجرانوالہ میں طبع کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۳۳ تا ۳۵ کا ایک اقتباس یہ ہے:

" یہ رسالہ " فیصلہ کن مناظرہ " جو دراصل مولوی احمد رضا خان صاحب کے فتویٰ " حسام الحرمین " کا مفصل جواب اور مدلل رد ہے۔ ناظرین کو مطالعہ سے پہلے اس کی دلچسپ تاریخ اور اس کی خاص نوعیت بتا دینا ضروری ہے:

اب سے اکیس (۲۱) بائیس (۲۲) سال پہلے کی بات ہے شوال ۱۳۵۲ ھ میں حسام الحرمین کے مضامین پر ایک خاص نوعیت کا مناظرہ لاہور میں ہونا قرار پایا تھا۔ اس کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ فریقین کے ان مقامی نمائندوں نے جن کو ابتدائی بنیادی امور طے کرنے کے لئے فریقین نے اپنی اپنی طرف سے نامزد کیا تھا اس مناظرہ کو فیصلہ کن بنانے کے لئے تین نہایت اہم اور ممتاز شخصیتوں کو اس مناظرہ کا حکم بھی تجویز کر دیا تھا۔ ایک ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال مرحوم، دوسرے علامہ اصغر علی صاحب روحی (پروفیسر اسلامیہ کالج) اور تیسرے شیخ صادق حسین صاحب (بیرسٹر ایٹ لاء، امرتسر) اور ان تینوں حضرات نے فریقین کی درخواست پر حکم بننا منظور بھی فرما لیا تھا

واقعہ یہ ہے کہ بریلی کے تکفیری فتنہ کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بریلویوں کے

نمائندوں نے اس نزاع کے فیصلے کے لئے تحکیم کے اصول کو مانا اور مذکورہ بالا تینوں شخصیتوں پر اتفاق بھی ہو گیا۔ ہم نے اس موقع کو بہت غنیمت جانا اور طے کر لیا کہ جس طرح بھی ہو یہ مناظرہ ہو ہی جانا چاہیئے۔ اس مناظرے میں مولوی احمد رضا خاں صاحب کے تکفیری فتوے حسام الحرمین کے متعلق یہ ثابت کرنے کی ذمہ داری کہ وہ غلط اور باطل ہے اور اُسکی بنیاد جعل سازی اور اختراع پردازی پر ہے جماعت دیو بند کے نمائندہ اور وکیل کی حیثیت سے راقم سطور کے سپرد تھی اور اس سلسلہ میں مجھ کو جو کچھ اپنے پہلے بیان میں حکم صاحبان کے سامنے کہنا تھا اور حسام الحرمین پر جو بحث کرنی تھی اُس کو میں نے اس خیال سے قلمبند بھی کر لیا تھا کہ اُسکی ایک نقل اُسی وقت حکم صاحبان کو اور ایک نقل فریق مخالف کو دی جا سکے لیکن اس مناظرے کا حشر یہ ہوا کہ جب وہ تاریخ قریب آئی اور ہم لوگ (راقم سطور محمد منظور نعمانی اور جناب مولانا ابو الوفا صاحب شاہجہانپوری اور جناب مولانا محمد اسمعیل صاحب سنبھلی جو اس دور میں میرے ساتھ اس تکفیری فتنہ کے مقابلے میں اکثر ایسے موقعوں پر ساتھ رہا کرتے تھے) لاہور پہنچے تو بریلوی نمائندوں نے اس مناظرہ میں اپنی شکست بلکہ صحیح یہ ہے کہ اپنے برپا کئے ہوئے تکفیری فتنہ کی موت دیکھتے ہوئے اپنی روایتی چال بازیوں کے ذریعے سے پہلے تو تحکیم کی طے شدہ قرارداد سے انحراف کیا اور اسکے بعد اپنے مفسدانہ مظاہروں اور اشتعال انگیزیوں کے ذریعے امن کے ذمہ دار حکام کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ سرے سے مناظرہ ہی نہ ہونے دیں۔ بالآخر یہی ہوا اور ہماری ہر طرح کی کوششوں کے باوجود وہ مناظرہ نہ ہو سکا۔ ان تمام واقعات کی پوری تفصیل چونکہ اُسی زمانہ میں رسالہ "الفرقان" کے ابتدائی نمبروں میں اور اس رسالہ "فیصلہ کن مناظرہ" کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہو چکی ہے اس لئے اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ قصہ مختصر جب لاہور میں یہ مناظرہ نہ ہو سکا تو اس عاجز نے اپنا بیان جو اس مناظرہ کے لئے قلمبند کیا تھا پہلے قسط وار رسالہ "الفرقان" میں اور اُسکے بعد مستقل کتابی شکل میں "فیصلہ کن مناظرہ" کے نام سے شائع کرا دیا۔ "

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صاحب کے پاس عطائی دروازہ لاہور کی مرشد اونچی مسجد کے ایک امام صاحب جن کا نام غالباً مولوی محمد عبداللہ تھا۔ عربی ادب پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے صوفی صاحب سے پوچھا کہ آپ کے والد ماجد نے ماشاء اللہ بہت اچھی کتاب لکھی ہے جو دیوبندی اور بریلوی مذہبوں کے بارے میں نہایت دلچسپ ہے اور اس میں انہوں نے حق کا ساتھ دیا ہے۔ صوفی صاحب حیران

ہم کو پوچھنے لگے۔ آپ کی مراد کون سی کتاب سے ہے۔ انہوں نے کہا "دیوبندی اور بریلوی مذاہب کی حقیقت"۔ صوفی صاحب نے کہا مجھے تو اس کتاب کا کوئی علم نہیں ہے، وہ کتاب آپ کے پاس ہے۔ کہنے لگے ہاں۔ صوفی صاحب نے کہا کل جب آپ آئیں تو از راہ مہربانی اسے ساتھ لیتے آئیں۔ چنانچہ اگلے روز وہ ایک مختصر سی طبع شدہ کتاب ساتھ لے آئے جو کراچی کے کسی پروفیسر فیروزدین روحی صاحب نے لکھی تھی۔ "روحی" کا لفظ دیکھ کر مولوی عبداللہ صاحب نے یہ سمجھا کہ صوفی صاحب کے والد کا نام فیروزدین ہوگا اسلئے انہوں نے اس کتاب کی تعریف کی تھی۔ جب انہیں حقیقت کا علم ہوا تو وہ نادم ہوئے۔ صوفی صاحب نے کہا کہ والد صاحب مرحوم اس کوچہ کے آدمی نہ تھے وہ اہل سنت و جماعت کے صحیح مسلک کے پابند تھے۔ وہ پارٹی بازی اور فرقہ پرستی سے کوسوں دور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلک کا فرقہ انہیں اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ دین اسلام کے بنیادی عقائد وہ کسی قسم کی بیرونی آمیزش کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے جیسا کہ ان کے ماہوار رسالہ "الہدیٰ" کی جلدوں سے واضح ہے۔ انہوں نے اس رسالہ کے سرورق پر اس رسالہ کے اجراء کا مقصد بیان کر دیا تھا۔ مثلاً قرآن مجید کی اپنی رائے سے تعبیر کرنا یا معجزات انبیاء کی غلط تاویل پیش کرنا، توحید و رسالت کے بارے میں لوگوں کو گمراہ کرنے والی باتوں کا بیان کرنا۔ وہ گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ ان باتوں کو مومنین کے لئے زہر قاتل خیال کرتے تھے۔ وہ تمام مسلمانوں کو باہم شیروشکر اور ایک پلیٹ فارم پر متحد دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ الحب للہ والبغض فی اللہ کے قائل تھے اور منحنی سے اس پر کاربند اور بے جا رواداری کے خلاف تھے۔ کسی فرقہ کے عقائد میں اگر انہیں بال برابر باطل کی آمیزش یا حق سے انحراف نظر آتا تو وہ "لومۃ لائم" کی پروا کئے بغیر اس کے خلاف سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ملحدانہ اور زندیقانہ عقائد کی دھجیاں بکھیر دیا کرتے تھے۔ ماہوار رسالہ "الہدیٰ" دس سال تک یہی خدمت بجا لاتا رہا اور پھر انہوں نے اپنے آخری دور میں "منافی الاسلام" جیسی مستند اور ضخیم کتاب لکھ کر ان تمام مذاہب باطلہ پر ایک کاری ضرب لگائی۔ بالخصوص قادیانی فتنہ کے استیصال اور قلع قمع کرنے کے لئے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

چونکہ یہ بحث مجھے اس موضوع تک لے آئی ہے اسلئے آپ کے ذہن کا یہ پہلو اجاگر کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

مذہب اسلام اپنے ماننے والوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر معاشرہ کی اصلاح کا حکم دیتا ہے۔ اگر انسان پہلے خود احکام خداوندی پر پوری طرح کاربند ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کو بھی صلاح و فلاح کے طریقے اور اصول پر کاربند ہونے کا حکم دے۔ دراصل یہ منصب انبیاء کا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قوانین کو دنیا بھر میں قابل عمل طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اسلام سب سے پہلے اپنی ذات اور اس کے بعد اعزہ و اقارب اور پھر اُن آدمیوں کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھنے کا حکم دیتا ہے جو اُس کے زیر اثر آئے ہیں۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں صرف اپنی ذات کا ذمہ دار ہوں دوسرے خواہ اچھے کام کریں یا بُرے وہ اپنے اعمال کے جواب دہ خود ہوں گے۔ اُن کا یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

"قوا انفسکم واھلیکم نارا" ۶۶ : ۶

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت کی مخالفت کی گئی ہے۔ اسی کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:

"کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" المناوی ۲ : ۱۵۸

جس کا مطلب یہ ہے کہ گھر کا سربراہ اپنے اہل خانہ کا، کسی ملک کا حاکم اپنی رعایا کا، استاد اپنے شاگرد کا، افسر اپنے ماتحت کا، آقا اپنے غلام کا، پیر اپنے مرید کا، امام اپنے مقتدیوں کا اور ایک دینی پیشوا تمام قوم کا نگہبان ہے۔ ان میں سے ہر شخص پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے زیر تربیت افراد اور اپنے حلقہ اثر میں آنے والے مسلمانوں کے طرز عمل اور کردار کی اصلاح کا ذمہ لے۔ اپنی ذات کے بعد سب سے پہلا مرحلہ اپنے اہل خانہ کی اصلاح کا ہے جن کے ساتھ ہر شخص براہ راست روزانہ اٹھتا بیٹھتا ہے کیونکہ گھر کا سربراہ ساتھ رہنے والوں کے نفع و نقصان کا بھی نگران ہے اسلئے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ترغیب اور ترہیب کے ذریعے اُن کی اصلاح کرے۔

اس سلسلے میں مولانا روحی مرحوم نے کسی قسم کی کمی اور کوتاہی روا نہ رکھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کو بچپن سے ہی دینی و اخلاقی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں اور اپنے ایک بیٹے کو قرآن مجید کا حافظ بھی بنایا۔

اُن کے فرزند ڈاکٹر سجاد الحق رانا بیان کرتے ہیں کہ جب میں بی۔ اے کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا اور اُس کے شروع ہونے میں چند دن رہ گئے تو میں صبح کے وقت اُٹھ کر اپنا نصاب پڑھا کرتا۔ ایک دن جب والد بزرگوار مسجد میں جانے کے لئے بالائی منزل سے نیچے تشریف لائے تو انہوں نے بیٹھک میں جھانک کر دیکھا اور مجھے مطالعہ میں مستغرق پایا اور فرمانے لگے۔ دیکھو یہ دنیا جس کے پیچھے دن رات ہاتھ دھو کر پڑے ہو اگر اسی تندہی اور شوق سے خدا کی عبادت میں محنت کرو تو یقیناً ولی اللہ بن جاؤ۔

آپ اپنے بیٹوں کو انگریزی فیشن کے بال رکھنے اور داڑھی منڈوانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اُن کے بچپن میں اپنی نگرانی میں اُن کا سر استرے سے منڈوا دیتے تھے اور ہمیشہ یہ آیت سنایا کرتے تھے۔

"وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا" (۲۰:۱۳۱)

الغرض مولانا مرحوم نے اپنی تمام اولاد کی صحیح تربیت اور نگرانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اہل خانہ کے بعد اہل محلہ کا رشد و ہدایت دوسرا مرحلہ تھا۔ مولانا کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کی عملی زندگی میں جو نقائص نظر آتے تھے اُن کو دور کریں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ صرف نماز پڑھ لینا ہی کافی نہیں۔ اس نماز کا انسانی اعمال پر ضرور اثر مرتب ہونا چاہیئے جیسا کہ قرآن مجید نے اعلان کیا ہے کہ

"إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" (۲۹:۴۵)

جب آدمی کو اپنی نماز سے یہ فائدہ نہیں پہنچتا تو اُسکی نماز درحقیقت نماز ہی نہیں بلکہ محض رسمی طور پر اٹھنے بیٹھنے کی حرکات سمجھی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اس محلہ میں زیادہ تر بنیا یعنی گوجر اور کچھ ارائیں لوگ آباد تھے وہ بظاہر نماز پڑھنے تو لگ گئے تھے مگر اُن کی عملی زندگی اسلام کے مطابق بہت کم تھی۔ موقع و محل کی مناسبت سے وہ گوجروں کو یہ تلقین فرماتے کہ دودھ میں پانی مت ملایا کرو اور ناپ تول میں کمی بیشی نہ کیا کرو۔ اسی طرح بنیا یا قوم کو یہ تلقین فرماتے کہ سونا چاندی کے زیورات بنانے میں کوئی ملاوٹ یا بے ایمانی نہ کیا کرو۔ اسی واسطے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: "کلّموا الناس علیٰ قدرِ عقولہم"

یہ درست ہے کہ بعض وقت غیرتِ ایمانی کے جوش میں وہ قدرے درشت اور سخت
لہجہ بھی اختیار کر لیتے تھے لیکن موقع پا کر وہ انہیں نبھا دیا کرتے تھے۔ میرا اندازِ بیان جس طرح کا بھی ہے
اس سے غرض صرف تمہاری اصلاحِ احوال ہے اور میں اتمامِ حجت کرنا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے
روز کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں دنیا میں نیک و بد اور خیر و شر سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

ایک دفعہ ایک صاحب جو محلہ میں نہیں رہتے تھے بلکہ اجنبی تھے جمعہ کی نماز میں
حاضر تھے اور وہ بڑے انہماک سے مولانا کے وعظ کو سنتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے دبی
زبان سے مولانا کی تلخیٔ لہجہ کا ذکر کیا جس پر مولانا نے یہ شعر پڑھا ؎

بگو ہر چہ دانی کہ حق گفتہ بہ ... نہ رشوت ستانی و نے عشوہ دہ

سامعین میں ہر درجے کے لوگ تھے کہ بعض عمر میں مولانا سے بھی بڑے تھے لیکن آپ کسی کی پروا
نہ کرتے تھے اور کسی کو چون و چرا کی بھی مجال نہ ہوتی اس چیز کا نتیجہ یہ تھا کہ سامعین پر اچھے اثرات
مترتب ہوتے گئے اور وہ تمام رسوماتِ بد جو پہلے اہلِ محلہ میں عام تھیں بالکل ختم ہو گئیں۔ سوائے
ایک آدھ بدبخت کے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ ہو اور عملی زندگی میں بھی کچھ
نہ کچھ اثر مترتب نہ ہوا ہو۔

مولانا جہاں سکونت پذیر تھے اس گلی کے آخر میں جنڈ کا ایک درخت تھا چونکہ
اس محلہ کے قریب ہی غیر مسلم لوگ بھی آباد تھے مثلاً کوچہ وسطی رام اور محلہ جلوٹیاں وغیرہ اس لئے
وہ لوگ اس درخت کی تعظیم اور پوجا کیا کرتے۔ اس کی جڑوں میں دودھ ڈالتے اور اُس کے ساتھ
رنگین دھاگے (جنہیں موہلیاں کہا جاتا تھا) باندھتے۔ مولانا نے نہایت حکمتِ عملی سے کام لے کر
اُس درخت کا ایسا قلع قمع کیا کہ وہ خشک ہو کر ناکارہ ٹنڈ منڈ رہ گیا۔ آخر اُسے میونسپل
کارپوریشن والوں نے کاٹ دیا۔ اسی محلے میں اُن کا یہ کارنامہ اب تک لوگوں کو یاد ہے۔

اہلِ محلہ کے لئے تیسرا مرحلہ عام امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ہے۔ اس مقصد کے
لئے مولانا مرحوم نے جو طریقِ کار اختیار کر رکھا تھا اُس کا مظاہرہ تین مقامات پر ہوتا رہا۔

۱۔ کالج ۲۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجتماعات ۳۔ ہندوستان بھر کے

بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہونے والے مذہبی جلسے ۔

کالج میں انجمن حمایت اسلام نے ہر طالب علم کے لئے دینیات کا مضمون لازمی قرار دے رکھا تھا ۔ عربی زبان و ادب کے علاوہ مولانا مرحوم مختلف جماعتوں کو دینیات کی تعلیم دینے پر بھی مامور تھے ۔ طلبہ دوران درس اُن سے مذہبی نوعیت کے اکثر سوالات پوچھتے جن کا آپ انہیں تسلی بخش جواب دیتے ۔ اس طرح انگریزی خواں طلبہ کو جب آپ مذہب سے باغی اور دین سے برگشتہ دیکھتے تو صراحت کے ساتھ اُن کو اُن کے غلط رویہ سے باز آجانے کی تلقین فرماتے ۔

اس کے علاوہ کالج کے حبیبیہ ہال میں ہر اتوار کو دنیوی تعلیم شروع کرنے سے پہلے پہلا پیریڈ وعظ و نصیحت (SERMON) کے لئے وقف تھا ۔ اسی مجلس میں تمام طلبہ اور اساتذہ کی حاضری لازم تھی ۔ ایک اتوار مولانا مرحوم اور دوسرے اتوار کو مولانا محمد عمر خاں ٹونکی مرحوم باری باری اسلامی تعلیمات کے مختلف موضوعات پر اظہار خیال فرمایا کرتے ۔ کالج کی طرف سے اسلامی تعلیم کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی خاص عنوانات مقرر نہ تھے لیکن چونکہ مولانا مرحوم کا خیال یہ تھا کہ دین کے معاملے میں بنیادی چیز انسان کا عقیدہ ہے اور اُسکی صحت پر ہی اعمال صالحہ کا دارومدار ہے اسلئے آپ اپنی تقریر میں بیشتر اسلام کے اعتقادی مسائل کے بارے میں بحث کیا کرتے اور عقلی و نقلی دلائل سے اسلام کی صداقت و حقانیت پر روشنی ڈالتے تھے ۔ دوسری طرف مولانا محمد عمر مرحوم عموماً اسلام کے عملی پہلو یعنی عبادات اور معاملات کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے ۔

اس طرح دونوں بزرگوں کے باہمی تعاون اور اُن کی مشترک کوششوں سے اسلام کی صحیح اور واضح تصویر قوم کے نوجوانوں ، نو نہالوں کے ذہن میں نقش فی الحجر کی طرح ثبت ہو جاتی اور وہ سمجھ لیتے کہ اسلام عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کے مجموعے کا نام ہے ۔ اُس دور میں آج کل کے نوجوانوں کی طرح مذہب سے ناواقف یا باغی نہ تھے بلکہ اُن کی دلچسپی اور شغف کا اندازہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ

" کالج کے زمانے میں ہفتہ وار وعظ کا انتظام تھا ، علوم مشرقیہ کے اساتذہ باری باری سے وعظ کہتے تھے ۔ طلبہ سب سے زیادہ مولانا روحی کے پُر مغز وعظ کو پسند کرتے تھے ، اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ بعض طلبہ کو مولانا کے مواعظ حسنہ سننے کا شوق ہی کالج کے

ایک درجے کے بعد دوسرے درجے میں دوبارہ کھینچ لایا کرتا تھا۔"

بعض وقت اپنی تقریر کے دوران میں دنیا کے دوسرے مذاہب پر اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لئے مغربی تہذیب و تمدن کا خوب خاکہ اڑایا کرتے اور فرنگی تہذیب و تمدن کے دلدادہ شائقین، طلباء اور طلبہ کو بڑی شدّومد کے ساتھ اس سے باز رہنے کی تلقین کرتے۔

حضر تمیمی مرحوم کے قول کے مطابق مولانا کو اپنی تحریک راحی کی صحت کا اسی قدر یقین ہوتا کہ بڑے بڑے افراد کو بھی ڈانٹ دیتے تھے۔ وہ مغرب زدہ لوگوں کو ان الفاظ سے خطاب کرتے۔ "اے تہذیبِ مغرب کے اندھے ہوئے گدھو!" جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا حق بات کہنے میں صرف اسلام کی صحیح تعلیم کے مطابق عمل پیرا ہونے کو صحیح راستہ خیال کرتے تھے۔ اس دور میں اسلام کے مقابلے میں غیر اسلامی رسوم و رواج کی دھجیاں اڑاتے دیکھ کر کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ معترض ہوتا بلکہ سب چھوٹے بڑے اُن کے وعظ و نصیحت کو غور سے سنتے اور دل ہی دل میں مولانا کی عظمت اور مذہبی غیرت کے قائل ہو جاتے۔

مولانا علم الدین سالک مرحوم کا بیان ہے:

"کالج کے ایک پروفیسر صاحب جو کیمبرج سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ ماہ رمضان کا احترام ملحوظ خاطر نہیں رکھتے تھے اور سٹاف روم میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے رہتے تھے جس سے طالب علموں پر نہایت بُرا اثر پڑتا تھا۔ جب مولانا نے اُن کو اس بات سے روکا تو انہوں نے کہا کہ میں نے روزہ نہیں رکھا۔ مولانا نے کہا کہ روزہ نہ رکھنے کا کوئی سبب بھی تو ہونا چاہئیے اور اگر روزہ نہیں بھی رکھا تو رمضان شریف کا احترام تو بہت ضروری ہے۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ کیا یہ منافقت نہیں کہ صرف لوگوں کے دکھانے کے لئے میں اپنے آپ کو روزہ دار ظاہر کروں کیونکہ خدا کو تو علم ہے کہ میں روزے سے نہیں ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ کچھ ایسے کام بھی ہوتے ہیں جو شرعاً، اخلاقاً، قانوناً اور معاشرتاً جائز ہیں لیکن لوگوں کے سامنے وہ نہیں کئے جا سکتے۔ پروفیسر صاحب نے کہا ایسا کون سا کام ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ شوہر اور بیوی میں جو تعلقات ہیں اور جس مقصد کے لئے شادی کی جاتی ہے۔ اس کے پیش نظر خاوند اور بیوی جو کام خلوت میں کرتے ہیں وہ کسی کے سامنے کبھی نہیں کرتے حالانکہ خدا کو ہر چیز کا علم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام ضرور

پائے جاتے ہیں جو ہر طرح جائز ہیں مگر انہیں عوام الناس کے سامنے نہیں کیا جا سکتا۔ ماہِ رمضان میں سگریٹ پینا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ یہ مثال سُن کر پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے اور آئندہ ماہِ رمضان میں کسی کے سامنے سگریٹ پینے سے توبہ کر لی۔"

اس قسم کی اخلاقی جرأت اور حق گوئی کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں ورنہ ایک عربی اور دینیات پڑھانے والے استاد کو کون پلّے باندھتا ہے۔ چونکہ مولانا حق بات کو بغیر کسی جھجک کے محض اللہ کی خاطر دوسروں کے سامنے پیش کرتے تھے اس لئے سب اسی خلوص کا نتیجہ تھا۔

اس دور میں مولانا پر جوانی کا عالم تھا اور اپنے پنجاب کے قریباً ہر ضلع میں مذہبی جلسوں اور محفلوں میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی مثلاً امرتسر، غیرہ، سیالکوٹ، ایبٹ آباد، جھنگ، میانوالی وغیرہ۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنا صرف لاہور تک ہی نہیں بلکہ قریباً تمام پنجاب میں اُن کا مشغلہ بن گیا تھا۔ لاہور کی مختلف مساجد میں یکے بعد دیگرے آپ درسِ قرآن و حدیث دیتے رہے۔ مثلاً سنہری مسجد، مسجد بکن خان، مسجد گمٹی بازار اور مسجد قاضیاں والی جو موچی دروازہ کے اندر واقع تھی اور سب سے آخر اپنے محلہ کی مسجد جہاں وہ مستقل طور پر امامت و خطابت کی خدمت فی سبیل اللہ قریباً پچاس سال تک بجا لاتے رہے۔

وہ اسلام کے اختلافی مسائل کا اپنے وعظ میں ذکر نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اُن کا فرمانا تھا کہ صرف نماز ادا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اُس کا اثر انسان کی زندگی پر مترتب نہ ہو۔ صرف باتیں کر چھوڑنا اور زندگی میں انقلاب پیدا نہ کرنا اُن کے نزدیک محض بیکار تھا۔ چونکہ وہ اس کام کو انتہائی خلوص اور حق گوئی سے انجام دیتے تھے اس لئے کسی سے نہ دبتے تھے۔ آجکل کے علماء عموماً جان بوجھ کر اپنے مسلک کی تائید کی خاطر دوسرے مسلک پر ہر طرح کا کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں جس سے اسلام کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار متحد رہنے اور اختلاف کو ہوا نہ دینے کا حکم دیا ہے مثلاً

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا" (۱۰۳:۳) اور "ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا" (۱۰۵:۳)

اخلاقی جرأت اور دینی غیرت

یہ ایک نہایت اچھا وصف ہے لیکن اس کے حصول کے لئے دو چیزیں بنیادی شرط ہیں۔ اول یہ کہ ذاتِ باری پر ایسا پختہ ایمان ہو کہ انسان اُس کے سوا کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانے میں صاحبِ اختیار نہ سمجھے۔ دوسرے یہ کہ کسی انسان کا کردار بالکل بے داغ ہو۔ حتیٰ کہ کسی شخص کو بھی انگشت نمائی یا حرف گیری کا موقع نہ مل سکے۔ ہمارے گزشتہ بزرگانِ دین اور سلف صالحین میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ حضرات امام اعظم، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات سے تاریخِ اسلام بھری پڑی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطانٍ جائرٍ" (المناوی ۱: ۸۱)

مولانا مرحوم بفضلہ تعالیٰ اس صفت سے صحیح معنی میں متصف تھے۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر ہمیشہ خدا لگتی بات کہتے۔ اُن کی زندگی میں ایسے کئی مواقع پیش آئے جہاں ایک آدمی حالات سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر آپ ایک پہاڑ کی طرح آخر دم تک اپنے موقف پر قائم رہے اور دنیا کا کوئی خوف یا طمع انہیں جادۂ حق سے ہٹ جانے یا اُن کے عزم کو کمزور نہ کر سکا۔

اُن کی زندگی میں ایسے کئی مواقع پیش آئے جن میں حق گوئی اور بے باکی کا پورا طرح مظاہرہ ہوتا تھا مثلاً

۱۔ جنگِ عظیم اول کے زمانے میں سلطنتِ برطانیہ ترکوں کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کو شامل ہونے پر آمادہ کرنے کے لئے ہندوستانی علماء سے جواز کا فتویٰ لینے لگی تو مولانا کسی قیمت پر بھی ایسے فتویٰ پر دستخط کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کا مختصر ذکر بعنوان "مولانا کا حلقۂ احباب" کے تحت گزر چکا ہے۔

اس واقعہ کو مولانا علم الدین سالک مرحوم سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے بھی ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جنگِ عظیم اوّل کا دور تھا جس میں برطانیہ اور ترکیہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے

انگریزوں کو خدشہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ترک بھائیوں کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ نہیں دیں گے کیونکہ وہ ترکی کو اسلام کا قلعہ سمجھتے ہیں اور اُسکی کمزوری یا شکست اُن کے نزدیک اسلام کی توہین کے مترادف ہے۔ اسلئے حکومت برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کے تعاون کے حصول اور اُن کی تسلی کے لئے اعلان کر دیا کہ یہ جنگ مذہبی نوعیت کی نہیں بلکہ ایک عام دنیاوی جنگ ہے۔ پھر عامۃ المسلمین کو راضی ہموار کرنے کے لئے لاہور سے ایک سرکاری اخبار "حق" کا اجراء کیا گیا اور اسی کے ساتھ ہی ہندوستانی علماء اور مشائخ سے فتاوی حاصل کرنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ مذکورہ بالا اخبار حق کے ایڈیٹر شیخ عبدالعزیز مرحوم تھے جو اتفاق سے اُن دنوں انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری بھی تھے۔ علامہ مرحوم چونکہ انجمن ہی کے کالج میں ملازم تھے اسلئے اسی تقریب کے موقع پر دستخط کرانے کے لئے ان کے پاس تشریف لائے اور فتوی پر دستخط کرنے کے لئے انہیں آمادہ کرنا چاہا۔ انہوں نے شمس العلماء کے خطاب اور کئی مربع اراضی کے انعام کا لالچ بھی دیا مگر مولانا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر جب مولانا پیہم اصرار سے تنگ آگئے تو بڑے سخت لہجے کے ساتھ واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ میں ہرگز اس پر دستخط کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں چنانچہ انہوں نے دستخط نہ کئے اور شیخ عبدالعزیز بے نیل مرام واپس آگئے۔

سالک مرحوم کہتے ہیں کہ اس فتوی کی ایک نقل آج بھی ترکوں کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ جن لوگوں کو وہاں جا کر اُسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اُن کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم کے سوا اُس پر کئی ایک ہندوستانی علماء کے دستخط ثبت ہیں۔

۳۔ مولانا سالک مرحوم یہ روایت کرتے ہیں کہ انجمن حمایت اسلام کے ارباب بست و کشاد سالانہ جلسے سے چند دن پہلے ہر سال ایک جلوس کا اہتمام کیا کرتے تھے جو اسلامیہ کالج سے شروع ہوتا اور شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتا پھرتا واپس اسلامیہ کالج میں ہی پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا۔ اُس میں انجمن حمایت اسلام کے عہدیدار اور اراکین شرکت کرتے جو عموماً اپنی گاڑیوں اور گھوڑوں میں سوار تھے اُن کے پیچھے پیچھے اسلامیہ کالج کے اساتذہ پیدل چلا کرتے تھے۔ اس جلوس کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو انجمن کے کارناموں سے متعارف کرانے کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی جاتی تاکہ بھاری مقدار میں چندہ اور عطیات حاصل ہو سکیں

راہ ہموار ہو جائے۔ اساتذہ انجمن کے اس طرزِ عمل سے سخت کبیدہ خاطر اور شاکی تھے اور اسے طرح بدل جانے میں اپنی توہین محسوس کرتے تھے مگر چونکہ وہ انجمن کے ملازم تھے اسلئے کھل کر صدائے احتجاج بلند نہ کر سکتے تھے۔

ایک دفعہ جلوس کا پروگرام طے کرنے کے لئے انجمن نے اپنا اجلاس طلب کیا اس زمانے میں انجمن کے جنرل سیکرٹری مولانا غلام محی الدین قصوری تھے۔ تقریر کے لئے اٹھے اور جلوس کی اہمیت، افادیت اور پروگرام پر روشنی ڈالنے لگے۔ مولانا مرحوم نے قصوری صاحب کو ٹوک کر کہا کہ میں مفتیٔ دین کی حیثیت سے فتویٰ دیتا ہوں کہ اس نوعیت کے جلوس شرعی لحاظ سے جائز نہیں ہیں۔ قصوری صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر مولانا نے اپنا عصا ہوا میں لہراتے ہوئے میز پر دے مارا اور کہا کہ آپ مفتیٔ دین کی توہین کر رہے ہیں اس پر اجلاس میں سناٹا چھا گیا اور آخر یہی فیصلہ ہوا کہ آئندہ جلوس نہ نکالا جائے۔

۳۔ مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سیالکوٹ میں سر سید احمد خاں مرحوم کی یاد میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں سر سید مرحوم کی قومی خدمات کو سراہا گیا اور اُن کی ذات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ استاذِ گرامی مولانا روحی مرحوم بھی اُس جلسہ میں شریک تھے۔ ایک مقرر صاحب اُٹھے اور انہوں نے سر سید کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کئے۔ اگر وہ یہیں تک محدود رہتے تو کوئی حرج نہ تھا لیکن مقرر صاحب اپنی تقریر کا رُخ بدل کر علمائے اسلام کے خلاف زہر اُگلنے لگے اور جی بھر کر انہیں کوسنا شروع کر دیا اور کہا کہ علماء نے ناحق سر سید مرحوم پر کفر کے فتوے عائد کئے۔ مقرر صاحب اپنے جوشِ خطابت میں حدِ اعتدال سے نکل کر سب و شتم پر اتر آئے تو استاذِ گرامی سے نہ رہا گیا اور وہ حق گو علماء کی تحقیر کو برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ جہاں تک سید احمد خاں کی تعلیمی خدمات کا تعلق ہے۔ ہم اُن کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہوں نے خفتہ قوم کو بیدار کرنے کے لئے جو مساعی کی ہیں۔ ہم انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن انہوں نے مذہب کے بارے میں دخل دے کر اپنے من مانی تاویلات سے قرآنی آیات کا جو حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی ہے اور دور از کار توجیہات کے پردہ میں جن

ملحدانہ اور بیہودہ عقائد کی اشاعت کی ہے۔ ہم کسی صورت بھی اُسے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم آج بھی اُس دور کے علماء سے ہم آہنگ ہیں اور سید پر تکفیر کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن علمائے حق کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتے۔ اس پر بشیر صاحب کی شعلہ بیانی سرد پڑ گئی اور وہ کھسیانے ہو کر چپکے سے اپنی نشست پر آ بیٹھے۔

۴۔ جناب تاج محمد صاحب خیال مرحوم (جن کی ساری عمر محکمہ تعلیم سے وابستہ رہی اور کسی زمانے میں وہ اسلامیہ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے اور مولانا روحی کی شخصیت کو اچھی طرح جانتے تھے اور جو آخری دور میں جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے) نے رانا احسان الحق صاحب کو بتایا کہ میں نے اپنی ملازمت کا آغاز اسلامیہ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کیا۔ اُس زمانے میں مولانا روحی مرحوم بھی وہیں تھے۔ ایک روز میں پرنسپل صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا انہوں نے کسی کام کے سلسلے میں مولانا مرحوم کو چپراسی کے ذریعے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مولانا اُس وقت کلاس کو درس دے رہے تھے اسلئے آپ نے جواباً کہلا بھیجا کہ میں کلاس سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد آپ تشریف لے آئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُن کی نظر اُس میز پوش پر پڑ گئی جو پرنسپل صاحب کی میز پر بچھا ہوا تھا۔ اُس پر ڈی۔ ایم۔ سی کے رنگین دھاگوں سے مختلف پرندوں اور جانوروں کی شکلیں کڑھی ہوئی تھیں۔ مولانا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اُس میز پوش کو ایک کونے سے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ میز پر پڑی ہوئی فائلیں، کتابیں، قلمدان اور گلدان غرض سب چیزیں زمین پر آ رہیں۔ ساتھ ہی کہنے لگے کہ اسلامیہ کالج میں ہوتے ہوئے اس قسم کی بت گری اور بت پرستی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پرنسپل صاحب انگشت بدنداں رہ گئے۔ فطری طور پر انہیں مولانا کی اس حرکت پر سخت طیش آیا۔ انہوں نے کالج کے ارباب حل و عقد سے مولانا کے اس رویہ کی شکایت کی۔ میرا اور تمام دوسرے اساتذہ کا خیال تھا کہ مولانا روحی کو اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے لیکن کچھ وقت کے بعد خلاف توقع یہ معاملہ رفت و گزشت ہو گیا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

۵۔ مولانا علم الدین سالک مرحوم بیان کرتے ہیں کہ

ایک دفعہ پنجاب یونیورسٹی نے پروفیسر مارگولیتھ انگلستانی مستشرق کو

عربی میں خطبہ پر لیکچر دینے کے لئے بلایا۔ وہ اسلامیہ کالج میں بھی آیا۔ مولانا کا تعارف عبداللہ یوسف علی
پرنسپل نے کرایا۔ مارگولیتھ نے عربی بولنا شروع کیا۔ مولوی صاحب اٹک اٹک کر بولتے تھے۔ اس کے
چہرے سے استہزا ظاہر ہوا۔ پرنسپل نے بات کی تو مولانا نے حماسہ منگایا اور ۵ شعروں پر نشان
لگا کر کہا ان کو حل کرو۔ مارگولیتھ نے کہا وقت دو۔ مولوی صاحب نے پوچھا ایک ہفتہ، ایک ماہ
یا ایک سال؟ اپنے مددگاروں کو بھی لگا لو اور حل کرو۔ پھر مولوی صاحب نے بلیک بورڈ پر ایک
بے اعراب شعر لکھا مگر وہ نہ پڑھ سکا۔ اسکو اعتراف عجز کرنا پڑا۔ جو لوگ یورپ سے پی ایچ
ڈی کر کے آتے تھے ان کو دخاترہ کہتے تھے

۶۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

میں نے ۱۹۳۰ء میں ایم اے عربی میں داخلہ لیا۔ پڑھتا یونیورسٹی میں تھا اور رہتا
اسلامیہ کالج لاہور کے ہوسٹل کریسنٹ میں۔ اسلامیہ کالج کے جن پروفیسر حضرات سے میرے روابط
نیازمندی بہت عمیق تھے۔ ان میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر سر فہرست تھے۔ میں عموماً اتوار کا دن
ان کے ہاں گزارتا۔ میرے ساتھ عموماً محمد خان ("تحفۂ احمدیہ" کا مصنف) یا قاضی گل محمد (اب پرنسپل گورنمنٹ کالج
تھے۔ چونکہ میں مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل اور درس نظامی کا فارغ التحصیل بھی تھا۔ اسلئے
ایک اتوار کو ڈاکٹر تاثیر نے مجھے حکم دیا کہ میں خطبہ پیش کروں۔ انکار کی ہمت نہ تھی۔ اسلئے تعمیل
ارشاد کی۔ میری تقریر کا موضوع تھا۔ "علماء کا جمود" سارا ہال طلبہ اور اساتذہ سے بھرا ہوا تھا
حضرت روحی بھی تشریف فرما تھے۔ جب چالیس منٹ کے بعد میری تقریر ختم ہوئی تو قبلہ روحی صاحب سٹیج
پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اس وقت ہماری نظریاتی سرحدوں پر کئی طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔
پادریوں، آریہ سماجیوں کے علاوہ خود اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اسلامی حصار پر
گولہ باری کر رہے ہیں۔ ان میں سر فہرست لکھنؤ کے نیاز فتحپوری ہیں، جن کا رسالہ نگار
تخریب اسلام اور تشکیک کے لئے وقف ہے۔ آج کے مقرر جن کا نام غلام جیلانی برق
ہے اور ایم اے عربی کے طالب العلم ہیں، نیاز کے چیلے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا ان شیاطین سے ملک
کو محفوظ رکھے۔

قبلہ روحی کی اس بیباک اور مومنانہ تنقید سے طبیعت بڑی خوش ہوئی اور آپ سے

میری عقیدت میں اضافہ ہو گیا۔

خواجہ نسیم حسین انصاری لکھتے ہیں[1]: مولانا اصغر علی روحی ہر سال انجمن حمایت اسلام کے اجلاس سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں صوبے کا گورنر بھی انجمن کے سالانہ اجلاس کی کسی نہ کسی نشست میں ضرور شرکت کیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز مولانا روحی انجمن کے ایک اجلاس میں تقریر فرما رہے تھے کہ گورنر بھی پہنچ گئے۔ اس پر شیخ سر عبدالقادر نے مولانا سے درخواست کی کہ گورنر آگئے ہیں اسلئے چند لمحوں کے لئے آپ رُک جائیں لیکن مولانا روحی نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اتنے میں صوبائی گورنر سٹیج پر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے اور شیخ سر عبدالقادر نے مولانا روحی سے پھر کہا کہ میں کوئی اعلان کرنا چاہتا ہوں اسلئے چند لمحوں کے لئے تقریر بند کر دیں۔ اس پر مولانا روحی کو غصہ آگیا اور انہوں نے تقریر بند کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا۔ میں بکواس نہیں کر رہا۔ اللہ اور رسول کا نام لے رہا ہوں۔ مولانا روحی کے اس ارشاد کے بعد گورنر نے کہا مولانا ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں انہیں تقریر جاری رکھنے دیں۔

ویسے سر عبدالقادر حضرت مولانا اصغر علی روحی کا بےحد احترام کرتے تھے۔ وہ اُن کے پاس اکثر تشریف لاتے اور دیر تک علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔

اسی طرح خواجہ صاحب کہتے ہیں[2] کہ پاکستان کے پہلے چیف جسٹس میاں عبدالرشید درس لینے کے لئے مولانا روحی کے پاس آیا کرتے۔ ایک بار انہوں نے میری موجودگی میں مولانا سے کہا کہ قرآن حکیم کی زبان بلاشبہ بڑی شیریں ہے مگر شیکسپیئر کے ڈراموں کی زبان بھی بڑی شیریں ہے۔ اس پر مولانا اصغر علی روحی نے ناراض ہو کر فرمایا: تم اللہ کے کلام کا مقابلہ ایک انسان سے کرتے ہو یہ سخت بے ادبی ہے۔ اب کفارہ کے طور پر تین روزے رکھو اور قربانی بھی دو۔ اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف فرمائیں گے۔

خواجہ انصاری صاحب کا یہ بیان ہے[3] کہ مولوی روحی مرحوم نے ۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک کے دوران یہ فتویٰ دیا تھا کہ انگریز کی فوج میں نوکری کرنا حرام ہے۔ چنانچہ سیاسی و دینی

[1] ہفت روزہ "استقلال" لاہور مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۸۳ء ص ۱۹
[2] ایضاً"
[3] ایضاً" ص ۲۰

راہنماؤں کا ہمیشہ اُن کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ ایک دفعہ مولانا روحی نے یہ واقعہ سنایا:

علامہ اقبال، ملک میراں بخش، چوہدری محمد حسین اور بعض دوسرے لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے مکان خریدنے کے لئے بنک سے کچھ روپیہ نکلوانا چاہا اور چوہدری محمد حسین نے بنک سے مجھے روپیہ لا دیا۔ جو میں نے ایک صندوق میں رکھ دیا۔ جب یہ سب لوگ چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ روپیہ موجود نہیں۔ جنڈی والی مسجد کے خادم مولوی قدرت اللہ کو روپیہ گم ہونے کا پتہ چلا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ میں لوٹا گھماتا ہوں جس سے چور کا پتہ چل جائے گا۔ میں نے قدرت اللہ کو اس سے بہت روکا لیکن مولوی قدرت اللہ نہ مانا۔ اُس نے تین چار بار لوٹا گھمایا۔ چنانچہ کبھی ملک میراں بخش کا نام اور کبھی علامہ اقبال کا نام نکل آتا۔ اس پر میں خاموش ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد مکان کی سفیدی کرائی گئی تو صندوق کے پیچھے سے روپیہ مل گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے چار یا پانچ سال کی عمر کے بیٹے نے یہ روپیہ اٹھا کر صندوق کے پیچھے پھینک دیا تھا۔

مذاہب باطلہ کا رد

۱۔ ابوالقاسم رفیق دلاوری صاحب مرحوم اپنی گراں قدر کتاب ائمہ تلبیس میں لکھتے ہیں:[1]

ہمارے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے ازراہ نادانی اپنے رسالہ اعجاز احمدیہ کو معجزہ کی حیثیت سے پیش کرکے علمائے امت سے اس کا جواب لکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس چیلنج کے جواب میں قاضی ظفرالدین صاحب مرحوم جو ہمارے ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے اور مولانا اصغر علی صاحب روحی اور بعض دوسرے علماء نے اس سے کہیں بہتر عربی قصائد لکھ کر شائع کر دیئے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے دوسرے علمائے حق کی طرح کوئی قصیدہ تو نہ لکھا البتہ ایک مہتم بالشان کارنامہ یہ انجام دیا کہ سیف چشتیائی میں "اعجاز المسیح" کے اغلاط اور سروقات کا انبار لگا کر مرزائی عربی دانی کی دھجیاں بکھیر دیں۔

۲۔ دلاوری صاحب اس کتاب کے دوسرے مقام پر یوں رقمطراز ہیں:[2]

اس نام نہاد قصیدہ کے مقابلہ میں قاضی ظفرالدین صاحب مرحوم سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور جو ہمارے ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ ایک قصیدہ بنام قصیدہ رائیہ شائع کیا جس کے ۶۲ اشعار نمونۃً کتاب الہامات مرزا صفحہ ۱۰۳ — ۱۰۵ میں نقل کئے گئے ہیں۔ اعجاز احمدی کے جواب میں مولانا غنیمت حسین صاحب مونگیری نے بھی ایک کتاب "ابطال اعجاز مرزا" دو حصوں میں لکھی۔ پہلے حصہ میں مرزائی نظم کے اغلاط ظاہر کئے اور دوسرے حصہ میں سوا چھ سو اشعار کا نہایت فصیح و بلیغ عربی قصیدہ لکھا۔ یہ رسالہ چھپ چکا ہے اور پنجاب میں بعض حضرات کے پاس موجود ہے۔ مولانا اصغر علی صاحب سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے بھی اعجاز احمدی کے جواب میں ایک قصیدہ شائع کیا۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ تھا:

تسیر الی ربع الحبیب الرواحل فیالک شوقا ہیجتہ المنازل[3]

(اونٹنیاں منزل حبیب کی طرف جا رہی ہیں۔ اللہ رے وہ شوق جس کو منازل نے ابھارا ہے)

۱۔ ص ۱۹۵

۲۔ ائمہ تلبیس ص ۴۸۰

۳۔ پورا قصیدہ مولانا کے عربی دیوان میں دیکھا جا سکتا ہے

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:[1]

ایک مرتبہ انہوں نے مرزا کی بعض عربی کتب میں سے شرمناک قسم کی غلطیاں نکال کر مرزا کو لکھ بھیجیں۔ مرزا نے اخبار الحکم[2] قادیان میں یہ لکھ کر ان سے پیچھا چھڑایا کہ نہ میں عربی کا عالم ہوں اور نہ شاعر ہوں۔

ایک دفعہ انہوں نے مرزا کے رسالہ "حمامۃ البشریٰ" کی غلطیاں نکال کر مرزا کے حواری خواجہ کمال الدین کو خفا کر دیا تھا۔ یہ واقعہ رئیس قادیان میں ملاحظہ فرمائیے۔[3]

۳۔ کتاب رئیس قادیان مرتبہ ابوالقاسم رفیق دلاوری کے بعنوان باب ۵۸ میں "حکیم نور الدین سے مولانا اصغر علی روحی کی ایک علمی چھیڑ" حسب ذیل دلچسپ واقعہ درج ہے:[4]

قادیانی صاحب سخن سازی اور پروپیگنڈا بازی کے فن میں تو طاق تھے لیکن علمی استعداد سے ایک بڑی حد تک بے نصیب تھے۔ البتہ مولوی حکیم نور الدین اور مولوی محمد احسن امروہی مرزائیوں میں ذی علم اور صاحب استعداد ہستیاں مانی جاتی تھیں اور یہی وہ دو شہپر تھے جن کے سہارے الہامی صاحب اتنا زمانہ فضائے تعلّی میں پرواز کرتے رہے۔ پھر ان دونوں میں حکیم نور الدین صاحب کو خاص اہمیت حاصل تھی بلکہ اصل یہ ہے کہ وہی مرزائیت کی عمارت کے بانی و مؤسس تھے اور مرزا جی تو محض آلۂ کار اور کٹھ پتلی کا حکم رکھتے تھے۔ جب حکیم صاحب پیچھے سے ڈوری کھینچتے تو یہ پتلی حرکت میں آجاتی۔ ایک مرتبہ بانیٔ سلسلہ حکیم نور الدین لاہور تشریف لائے اور کشمیری دروازہ میں محرم علی چشتی کے مکان میں ٹھہرے۔ مولوی محرم علی سے حکیم صاحب کی پرانی دوستی تھی۔ ایک نہایت معمر طبیب نے جو مہاراجہ جموں و کشمیر کی ملازمت میں حکیم نور الدین صاحب کے رفیق کار تھے۔ مجھے بتایا کہ حکیم نور الدین اور مولوی محرم علی ایک ساتھ جموں سے خارج کئے گئے تھے

---

1. الجزء تلبیس ص ۸۰،۴
2. مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۳ء ص ۵
3. افسوس کہ دلاوری صاحب مرحوم اپنی کتاب رئیس قادیان کی پہلی دو جلدیں لکھ کر اللہ کو پیارے ہوگئے اسلئے مذکورہ بالا واقعہ طبع شدہ جلدوں میں موجود نہیں غالباً کسی اگلی جلد میں اسے لکھنے کا ارادہ ہوگا جو پورا نہ ہو سکا۔
4. رئیس قادیان ۲: ۱۳۷

جب حکیم صاحب لاہور آکر مولوی محرم علی چشتی کے مکان میں ٹھہرے تو مولانا اصغر علی روحی سابق پروفیسر
اسلامیہ کالج لاہور ان کے دیکھنے کے لئے گئے۔ اس وقت مولانا اصغر علی صاحب کا عنفوانِ شباب تھا۔ ان کے
جانے سے پیشتر مولوی زین العابدین مدرس عربی اسلامیہ ہائی سکول دروازہ شیرانوالہ لاہور، جو مولوی
غلام رسول ساکن قلعہ میاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ کے اقربا میں سے تھے۔ حکیم صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔ مولوی
زین العابدین اچھے لسان اور منطقی نہیں تھے۔ ایک سوال کے جواب میں مولوی زین العابدین نے کہا کہ اس سے تو
ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ حکیم نورالدین نے کہا کہ ترجیح بلا مرجح تو محض منطقیوں کا ایک ڈھکوسلا ہے
ترجیح بلا مرجح جائز ہے۔ مولوی زین العابدین نے پوچھا وہ کیسے؟ حکیم صاحب نے دو روپے جیب سے نکال
کر ہاتھ پر رکھے اور مولوی صاحب سے کہا ایک اٹھا لیجئے۔ انہوں نے ایک روپیہ اٹھا لیا۔ پوچھا اس دوسرے کو
کیوں نہیں اٹھایا؟ مولوی زین العابدین سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ مولانا اصغر علی صاحب ایک طرف بیٹھے تھے
مولوی زین العابدین سے کہنے لگے مولوی صاحب کہہ دیجئے کہ ارادۂ ازلی اس ایک کے اٹھانے سے متعلق تھا دوسرے
سے متعلق نہیں تھا۔ یہی وجہ ترجیح ہے۔ حکیم نورالدین نے کہا لو صاحب یہ ٹھیک نہیں۔ یا یہ بولیں یا
آپ خود گفتگو کر لیں۔ مولوی زین العابدین اور روحی صاحب سے کہنے لگے اچھا آپ آکر گفتگو فرمائیے۔ اس
مجلس میں فقیر جلال الدین مرحوم مجسٹریٹ بھی موجود تھے۔ وہ بولے ہاں مولوی صاحب آپ آئیے اور گفتگو
فرمائیے۔ غرض مولانا روحی کو زبردستی اُن کے مقابل کر دیا۔

اس سے پیشتر حکیم صاحب بہت لاف زنی مار چکے تھے کہ ہم نے مصر سے منطق کی ایک نئی کتاب
منگوائی ہے جس میں منطقیوں کے متعدد نظریات غلط اور باطل ثابت کئے گئے ہیں اور اسی سلسلۂ گفتگو
میں وہ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ پر بھی ہاتھ صاف کر گئے تھے۔ روحی صاحب نے سوال کیا کہ آپ نے
منطق کو باطل کہا ہے کیا ساری منطق باطل ہے یا اس کے کوئی خاص قواعد یا اس کا کوئی حصہ؟ حکیم
نورالدین نے کہا یہ بتانا تو مشکل ہے کہ منطق کا کتنا حصہ باطل اور کتنا صحیح ہے۔ مولانا اصغر علی نے فرمایا کہ
اگر یہ نہیں بتلا سکتے تو ممکن ہے کہ آپ اثنائے گفتگو میں کسی سوال کے جواب میں کہہ دیں کہ یہ غلط اصول
پر مبنی ہے۔ میں اسکو نہیں مانتا اسلئے جب تک یہ مسئلہ صاف نہ ہو جائے کہ آپ کون کون سے اصول
مانتے ہیں اور کون کون سے نہیں مانتے۔ اس وقت تک گفتگو بیکار ہے۔ حکیم صاحب لاجواب ہو گئے اور
سوچنے لگے۔ اُن ایام میں مولانا روحی کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔ جب دیکھا کہ

حکیم صاحب کے منہ پر بالکل مہر سکوت لگ گئی تو جوش میں آکر کہنے لگے۔ اسی برتے پر آپ نے امام غزالیؒ اور امام رازیؒ پر حملہ کر دیا تھا۔ یہی آپ کی استعداد ہے؟ آپ کو تو مڈل والے لڑکوں کے برابر بھی لیاقت نہیں۔

یہ سُن کر مولوی محترم علی چشتی اور فقیر جلال الدین کہنے لگے۔ نہیں مولوی صاحب جانے دیجئے ایسا نہیں ہے۔ چونکہ نمازِ عصر کا وقت قریب تھا۔ یہ لوگ کہنے لگے اچھا کسی دوسرے موقع پر گفتگو ہوگی۔ مولانا روحی چلے آئے اور یہ خبر بجلی کی رو کی طرح شہر میں پھیل گئی کہ روحی صاحب نے حکیم نور الدین کو پچھاڑ دیا۔

پھر دوسری مرتبہ حکیم نور الدین جو یلی کالج میں آ کر اقامت پذیر تھے۔ صوفی غلام محی الدین وکیل انجمن حمایت اسلام لاہور اور مولوی زین العابدین مولوی روحی صاحب کے مکان پر گئے اور کہا کہ حکیم نور الدین آئے ہوئے ہیں۔ آپ چل کر مرزا کے دعاوی کے متعلق ان سے گفتگو کیجئے۔ روحی صاحب نے کہا: اغلب ہے کہ حکیم صاحب گفتگو پر راضی نہیں ہونگے۔ مولانا روحی نے اُن کے کہنے پر حکیم صاحب کو رقعہ لکھا کہ مرزا کے دعاویٔ باطلہ کے متعلق میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ حکیم صاحب نے جواب میں لکھا کہ چونکہ آپ میرے پیر کی توہین کرتے ہیں اس لئے میں آپ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے بعد شاید ۱۹۱۵ء میں حکیم صاحب لاہور آئے۔ روحی صاحب کے ایک شاگرد نے کہا کہ حکیم نور الدین آئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ ان سے گفتگو کرنا چاہیں تو میں جا کر دریافت کروں؟ مولوی صاحب نے کہا ہاں جا کر پوچھو۔ وہ گیا اور قاضی ظہور الدین اکمل مرزائی متوطن گولیکی سے جا کر اس خواہش کا اظہار کیا۔ قاضی ظہور الدین کہنے لگے واقعی مولوی اصغر علی مناظرہ کرنا چاہتے ہیں؟ شاگرد نے کہا: ہاں واقعی چاہتے ہیں۔ قاضی ظہور الدین نے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا ہم کسی مولوی سے گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ اصغر علی ہو یا کوئی اور۔

اس وقت بابو عبد الحق اکاؤنٹنٹ نے جو کئی سال تک مرزائی بلکہ مرزا کے خاص حواری رہ کر تائب ہوئے تھے مرزا کے رد میں ایک رسالہ چھپوایا تھا اور وہ شہر بھر میں مفت تقسیم کرا رہے تھے۔ اسی طرح مولانا محمد عالم آسی امرتسری اپنی کتاب الکاویہ علی الغاویہ (جو مرزا غلام احمد قادیانی کے رد سے متعلق ہے) لکھتے ہیں۔[1]

[1] ص ۸۴ — ۸۵

جب مرزائیوں کو مُد میں شکست فاش ہوئی تو مرزا صاحب کو بڑا طیش آیا اور عربی نظم میں تک بندی لگانی شروع کردی۔ فرطِ جوش غضب میں پانچ سو سے زیادہ شعر لکھ مارے جن میں مولوی ثناء اللہ صاحب کو دل کھول کر گالیاں دیں اور جب وہ بخار نکل گیا تو اپنے دعاوی کی رٹ لگانی شروع کر دی۔ اخیر میں جب اس سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب اور سید علی حائری اور مولوی اصغر علی صاحب روحی وغیرہ کو کوسنا شروع کر دیا اور کچھ ایسے الفاظ بھی کہے کہ اگر ان بزرگوں کے متعلق کچھ ذرہ بھر بھی حالات دگرگوں ہونے کی خبر مرزائیوں کو لگ جاتی تو آج بھی اس کو پیشین گوئی کے سانچے میں ڈھالیں۔ یہ قصیدہ نام کو تو الہامیہ اور اعجازیہ ہے مگر اس قدر شاعرانہ انداز سے گرا ہوا ہے کہ اگر کسی غلط شعر کا حوالہ دیا ہو تو اس قصیدے سے بڑھ کر کوئی مصالحہ زیادہ نہ ہوگا۔ بایں ہمہ مرزا صاحب نے اپنی ہمہ دانی کا یوں غرور دکھلایا تھا کہ لوگوں کو بڑی عجلت کے ساتھ ویسا ہی جواب لکھنے پر دعوت دی جس کا جواب مولوی اصغر علی صاحب روحی اور دیگر بزرگوں نے لکھا اور اخبارات میں شائع کیا اور عموماً اہل علم نے اس کو اس لئے نظر انداز کر دیا کہ غلط اشعار کا جواب کیا دیا جائے۔

پھر اسی کتاب[1] میں آسی صاحب نے مرزا صاحب کے قصیدۂ اعجازیہ سے ۲۲۔ اشعار نقل کئے ہیں اور ان کی غلطیاں نکالی ہیں۔ ان اشعار میں شعر ۹ میں تین بزرگوں کا نام آتا ہے یعنی مولوی محمد حسین بٹالوی، قاضی ظفر الدین مرحوم اور مولانا اصغر علی روحی مرحوم۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ففکر بجہدک خمس عشرۃ لیلۃ   فناد حسینا او ظفرا او اصغرا

مرزا غلام احمد قادیانی اپنے مخالفین کو اپنی مختلف تحریروں کے ذریعے خوب کوستے اور گالیاں تک بھی دیا کرتے تھے چنانچہ اپنی کتاب انجام آتھم میں لکھتے ہیں[2]

اب ہم ان مولوی صاحبوں کے نام ذیل میں لکھتے ہیں جن میں سے بعض تو اس عاجز کو کافر بھی کہتے ہیں اور مفتری بھی اور بعض کافر کہنے سے تو سکوت اختیار کرتے ہیں مگر مفتری اور کذاب اور دجال نام رکھتے ہیں۔ بہرحال یہ تمام مکفرین اور مکذبین مباہلہ کے لئے بلائے گئے ہیں اور ان کے ساتھ وہ

---

۱ الکاویہ؛ ص ۳۹۷-۳۹۸

۲ ص ۶۹

سجادہ نشین بھی ہیں جو مکفر یا مکذب ہیں ——— وہ لوگ جو مباہلہ کے لئے مخاطب کئے گئے ہیں یہ ہیں :

مولوی نذیر حسین دہلوی ، شیخ محمد حسین بٹالوی ، مولوی رشید احمد گنگوہی ، مولوی عبدالحق حقانی مفسر دہلوی ، مولوی ثناء اللہ امرتسری ، مولوی عبدالجبار غزنوی ، مولوی اصغر علی لاہوری ، مولوی عبدالواحد غزنوی ، مولوی عبدالحق غزنوی ، مولوی عبداللہ ٹونکی ، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی ، مولوی دلدار علی الوری یہ کل ۵۸ نام ہیں جن میں مولانا روحی کا نام ۱۹ پر ہے اس کے بعد سجادہ نشینوں کے ۴۸ نام ہیں جن میں ظہور الحسین صاحب گدی نشین بٹالہ ، صادق علی صاحب گدی نشین دنر چھتر ، مہر علی شاہ سجادہ نشین گولڑہ بھی شامل ہیں

اسکے بعد ایک خط شروع ہوتا ہے[1] جو عربی میں ہے لیکن اس کے نیچے بین السطور فارسی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس خط کا عنوان یہ ہے " المکتوب الی علماء الهند ومشائخ هذه البلاد وغيرها من البلاد الاسلامية "

اسکے بعد ایک ہجزیہ قصیدہ ہے[2] - اس خط میں "تسعة رهط من الاشرار[3] " کے زیر عنوان بعض علماء کو برا بھلا کہا گیا ہے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں -

(۱) الرسل بابا امرتسری (مولوی غلام رسول) (۲) مولوی اصغر علی لاہور (۳) مولوی محمد حسین بٹالوی (۴) مولوی نذیر حسین (۵) مولوی عبدالحق دہلوی (۶) مولوی عبداللہ ٹونکی (۷) مولوی احمد علی سہارنپوری (۸) مولوی سلطان الدین جے پوری (۹) مولوی محمد احسن امروہی (۱۰) مولوی رشید احمد گنگوہی (۱۱) شیخ اللہ بخش تونسوی (۱۲) شیخ غلام نظام الدین تونسوی -

مولوی رسل بابا پر دو صفحے[4] ، مولوی اصغر علی پر تین صفحے[5] ، مولوی محمد حسین پر ساڑھے دس صفحے[6] - اس کے بعد باقیوں پر ایک ایک یا دو دو سطریں دی گئی ہیں[7]

---

۱ ص ۲۳۷ تا ۲۶۶
۲ ص ۲۶۶ تا ۲۸۲ (کتاب کے آخری صفحہ تک)
۳ ص ۲۳۶
۴ ص ۲۳۶ تا ۲۳۷
۵ ص ۲۳۸ تا ۲۴۰
۶ ص ۲۴۱ تا ۲۵۱
۷ ان کا ذکر ۲۵۲ پر ختم ہو جاتا ہے اور وہ خط جاری رہ کر کتاب کے آخر تک چلا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی اصغر علی کے متعلق جو لکھا ہے اسکی عبارت یہ ہے:

ومن الشیعة الذین اشرتُ الیہم رُجَیْلٌ یقال لہ اصغر، و انہ یزعم فی نفسہ کانّہٗ اکبر، ویزدرینی مفتریاً من غیر استحیاء، ویَسْتَبِیْنُ فی محافل و املاءٍ - فسیعلم کیف یُجعل من الاصغرین۔ انہ یتبع الہوی ویجری طلقاً مع التقوی - یرید أن یفضّ خُتوم الشہوات و لو بالجنایات و یجتنی قطوف اللذات ولو بالمحرّمات وکذلک تأهبتْ لہ الرفاق و ازدادَ من المنافقین النفاق - واستحکم فی الطباع الذمیمة حتی سبق اخوانہ فی النمیمة وما اری مُدَّخَرَةً لشیطانہ الّا أن ادعُوَہ لِامتحانہ فأُقبِل علیہ اقبالَ طالب الناضل لتبیین امر الجاهل و الفاضل - و انہ کان یطلبنی لوغاہ فالیوم نرضیہ بما یہواہ و قد خاطَبْتُہٗ من قبل ذات العُوَیم لأُزِیْلَ ما علا قلبہ کالغیم - فقلتُ: اتنی کالرائد وتمتع من الموائد، فان کنت رأیناک کسحاب مطیرٍ او ثبت معک من البلاغة کثیر، فنؤمن بک (ص ۲۳۹) وبحسن بیانک و نشیعُ صفاتَ علوّ شأنک - فیسوغُ لک بعدہ أن تغلّطنا فی املاءنا و تاخذ اغلاط انشائنا کما انت تظنّ کالجاهلین الغافلین - ومع ذلک نحسبک انک ذو مقولٍ جریّ و نابغة کلام عربی - و یجوز لک ما لا یجوز لغیرک من ازدراء والطعن علی املاء و تُحمد عند الناس کالفاضلین المؤدبین - واما طرز ازدرائک قبل اثبات علمک وعلاءک فہذا الالیق سفیہ یترک الحیاء وعادةَ ضریرٍ لا یری الأَضواءَ - فیحسبُ النہارَ المنیرَ ظلاما و الوابل جہاما - و ان کنت من رجال هذا المضمار و ولیجةَ اهل هذہ الدار فارنا کمال انشاءک قبل ازدرائک - و أتِ بکتاب من مثل هذا الکتاب ثمّ اجعل بینی و بینک حکما احدًا من اولی الالباب - فان شهد الحکم علی کمالک وحسن مقالک و ظنّ انک جئتَ باحسن من کلامی وادیتَ نظامًا (۲۴۰) اجمل من نظامی فلک ان تتّخذ جدّی عبثا و تجعل تِبْرِی خُبثًا و ان تحسب درر الغُرّ کلیلٍ دامسٍ و بیانی الواضح کطریقٍ طامسٍ - و تشیعُ عِنادی فی العالَمین و ان لم تفعل و لن تفعلَ فاتّقِ لعن اللّاعنین۔

الا لا تُعِبْنِی کالسفیہ المشارزِ — وان کنت قد ازمعت حربی فبارزِ

وانک تذکرنی کرجلٍ مُحقّرٍ — وتَلْمِذُنی فی کلّ آنٍ کمارزِ

وإنّا سمعنا کلّ ما قلتَ نَخْوَةً — أتحسبُ حضرانی کحق کنارزِ

وما کنت صوّالا ولکن دَعَوْتَنِی — و قد بانَ انک تزدرینی کغارزِ

ولا خیر فی طَغْوائک یا ابنَ تکبّرٍ — و یبقاً ربّی عین دون معارزِ

فرِّج علی نفسٍ تبیدکَ واجتنبْ　　مناهج فقاً فاجتُثّکُ کفارزٍ

ولا تنتہجْ سُبُلَ الغوایة واکتئبْ　　علی ما عراکَ و تُبْ بقلبٍ آرزٍ

اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۴ پر یہ عبارت پائی جاتی ہے۔

فان بقیَ احدٌ منکم سالماً الی سنة فاُقرُّ بانّی کاذب و اُحییکم بعجزٍ و توبةٍ و احرق کُتُبی و اشیعُ ھذا الامرَ بخلوص نیّة (ص ۱۶۴) و احسب انکم من الصادقین۔

مرزائیت کے علاوہ مولانا اپنے رسالہ الہدیٰ میں بد اعتقادوں، زندیقوں اور دہریوں کے عقائد کا رد بھی کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں وہ کسی سے دبتے نہ تھے۔ چاہے کوئی شخص کتنا نامی گرامی ہو۔ چنانچہ انہوں نے سر سید احمد خاں مرحوم کے بعض عقائد پر جرح و تنقید کی اور اپنی کتاب "مافی الاسلام" میں بھی وضاحت سے عقلی و نقلی دلائل کے ذریعے ایسے عقائد کا بطلان کیا۔ وہ کسی کے ساتھ پرخاش یا عداوت نہیں رکھتے تھے بلکہ جو خوبی کسی میں ہوتی اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتے لیکن اس کے نقائص اور اغلاط کی طرف سے چشم پوشی کرنا یا وقتی مصلحت کو مدّنظر رکھنا ان کا شیوہ نہیں تھا۔

ہندوستان کے ایک صاحب غلام الثقلین سیکرٹری صیغۂ اصلاح تمدن ایجوکیشنل کانفرنس ایک رسالہ بنام عصر جدید کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ مالیر کوٹلہ سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا کے رسالہ الہدیٰ کا مطالعہ یہ صاحب بغور کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے الہدیٰ پر اپنی رائے دیتے ہوئے اپنے رسالہ عصر جدید[1] میں بعنوان (ہمارے سنجیدہ رسالے اور تہذیب الاخلاق کا احیاء) چند مندرجہ ذیل سطور طبع کیں:

"ایک رسالہ علمائے حنفیہ کی طرف سے تائید الاسلام کے واسطے مولوی اصغر علی صاحب روحی نے بنام "الہدیٰ" لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ کافی لیاقت کے ساتھ مرتب ہوتا ہے اور اس کے بعض مضامین مثلاً "خیرات" یا "احادیث" یا "ترجمہ کلمات جناب امیر" قابل تعریف ہیں۔ مگر بڑی خرابی اس رسالہ میں وہ ہے جو عموماً آجکل کے ہندی اسلامی متکلمین کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ مولوی صاحب موصوف بڑے زور شور سے سر سید کی تفسیر اور مضامین کے جواب میں عبارت آرائی کرتے ہیں مگر نہ تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کیا اعتراض ہے جس کی پیش بندی کے لئے سید صاحب مرحوم نے یہ تفسیر لکھی ہے۔ نہ وہ موجودہ زمانے کے اصول تنقید سے واقف ہیں۔ نہ فلسفہ اور سائنس کی ان عمیق وادیوں میں گئے ہیں جن کے مناظرے سے متاثر ہو کر معترض اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے۔ یہ

[1] جلد ۱ عـ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۲۳

رائے ہم صرف الہدیٰ ہی کی بابت نہیں رکھتے بلکہ جملہ رسائل اسی طرح اندھیرے میں لاٹھی چلاتے ہیں۔"

اسکے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

الہدیٰ جلد ۱ عدد ۱۱ ابھی ابھی آیا ہے اُس کے صفحہ ۲۸ کی پہلی صرف دس سطروں میں اہل فلسفہ کے واسطے الفاظ ذیل تو ہر حشان ہم نے ہیں:

۱۔ نجاست خوار ۲۔ خدا کی زندہ لعنت ۳۔ ہم ان کی کتب سینڈواس وپاخانہ میں پھینک دیں ۴۔ فلاسفۂ ملاعین کا خطاب آنحضرت نے عطا ہوا ہے۔

مندرجہ بالا تنقید کا جواب مولانا اصغر علی روحی مرحوم نے اپنے رسالے میں یوں دیا:

"الہدیٰ[1] اور بعض ہم عصر"

رد و قبول خلق کہ رنگِ تعلق است
پیرا ہنے است خوش کہ دریدم بروزگار
(روحی)

اجرائے رسالے کے وقت یہ امر ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اظہار حق سے اگر کوئی صاحب ناراض ہوں تو ہمیں ہرگز ان کی رنجش سے متاثر نہیں ہونا ہوگا۔ خاکسار کو شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ قوم کے تمام افراد کو کوئی شخص بھی خوش نہیں کر سکتا اسلئے ہمارا فرض ہے کہ جب تک ہم کام کرتے ہیں بلا رو رعایت کریں اپنی و آں کی رائے زنیوں کی پروا نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں ہر کسی شخص کا فرض ہے یا اخلاقی فرض ہے کہ ذاتیات کو بالکل نظر انداز رکھے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ الہدیٰ چونکہ نیچریت و دہریت کے حق میں شمشیر بُرّاں کا کام دے رہا ہے اسلئے وہ لوگ جو نیچریت کی آب و ہوا میں پلے ہوئے ہیں اُن کے لئے خار در چشم ہے مگر مشکل یہ ہے کہ میں رسالہ کا بند کر دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر نہ کیا جاوے۔ الہدیٰ کے متعلق مختلف آراء موصول ہوتی رہتی ہیں جن کا بیشتر حصہ تائید و تعریف کی طرف معلوم ہوتا ہے مگر بعض ہم عصر کبھی کبھی رمز و کنایہ سے الہدیٰ کی تحریروں سے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ایک صاحب نے کھلم کھلا یہ لکھ دیا کہ اہل فلسفہ کو بُرے الفاظ سے

---

[1] الہدیٰ: ج ۲ شمارہ ۲ ص ۳۹ تا ۴۱

یاد کیا جاتا ہے مگر ایسا نہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ الہدیٰ کے مضامین میں صرف انہی اہل فلسفہ کو برا کہا جاتا
ہے جو دین حق کی تکذیب کرتے ہیں۔ اگر کوئی فلسفی اپنے فلسفہ سے دین کی تائید کرے تو وہ مسلمانوں کے
زمرۂ متکلمین میں داخل ہے۔ اُسکو برا کہنا کوئی بھی مسلمان پسند نہیں کرے گا۔ ہاں ایک بات ضرور قابل
غور ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم عصر موصوف نے صرف اسی وجہ پر اعتراض کیا ہے کہ الہدیٰ میں سید صاحب کے
بعض معتقدات پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ سو اس کا جواب بجز اسکے کچھ نہیں کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں کتاب
وسنت کو بلا کسی قسم کی لا یعنی تاویل کے جو شیوۂ ملحدین ہے اسکی تائید میں لاتا ہوں۔ ممکن ہے کہ
کہیں میرا استدلال غلط ہو کیونکہ مجھے ہمہ دانی کا ہرگز دعویٰ نہیں۔ مگر معترض کا صرف اعتراض کر دینا
اور دلائل سے کسی استدلال کا غلط نہ ثابت کرنا کوئی حجت نہیں ہو سکتی۔ ہم عصر موصوف لکھتے
ہیں کہ ایڈیٹر الہدیٰ نہیں جانتے کہ سید صاحب نے کن مشکلات کو رفع کرنا چاہا تھا اور فلسفہ کی
عمیق وادیوں میں نہیں گھوسے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال آپ کا غلط ہے مجھے بخوبی معلوم ہے کہ
سید صاحب نے اپنی تفسیر اور دیگر تحریرات میں کن مشکلات کو رفع کرنا چاہا ہے اور مجھے بفضلہ تعالیٰ فلسفہ[1]
سمجھنے کا مادہ خدا نے کسی قدر عطا کیا ہے مگر سید صاحب کی طرف سے آپ کا یہ عذر پیش کرنا ایسا ہی ہے
جیسے کوئی شخص کہدے کہ زید کو جس نے چوری کی ہے سزا نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ چوری کرنے سے اسکا
ارادہ یہ تھا کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے فنڈ میں چندہ دے گا۔ کوئی عاقل اسکو تسلیم کرے گا؟ سر سید
صاحب نے جس طریق پر مشکلات کو دور کرنا چاہا ہے وہ بعینہ مذکورہ بالا مثال کا مشابہ ہے۔ انکا رو
تاویل سے نو تعلیم یافتگان کو خوش تو کر لیا مگر عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق بن گئے۔ کیسی غلطی ہے
اُن لوگوں کی جو سید صاحب کی مذہبی تحقیقات کو بلا علم قرآن و سنت صحیح سمجھنے کا دعویٰ کر
بیٹھتے ہیں اور محض اُن کے قومی کارناموں کے حسن ظن پر جن سے مجھے بھی انکار نہیں اُنکی ہر ایک
تحقیق کو سر اور آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں۔ کیا یہ اندھی تقلید نہیں ہے جس کی تمام نیچری دہائی
دیتے ہیں۔ کسی قوم میں جب تک حق سننے کا مادہ پیدا نہ ہو وہ قوم بے جا تعصب کے گرداب

---

۱ فلسفہ سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ علت و معلول میں صحیح ربط پیدا کیا جائے سو خدا کے فضل سے ہمیں کافی طور پر حاصل ہے اور ایسے فلسفہ کی
وادیوں میں گھومنے سے ہمیں معذور سمجھا جائے جس کا نتیجہ تکذیب دین ہے۔ ۱۲ منہ

سے کچھ نہیں نکلتی۔ میں نے کبھی سید صاحب کے ذاتیات پر حملہ نہیں کیا اور نہ اُنکی اصلاحی حرکت عملی کی
بیجا مذمت کی ہے۔ مذہبی تحقیقات میں زور سے ان کی تردید کرتا ہوں اور صرف انہیں کی نہیں بلکہ ہر ایک
ایسے شخص کی اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔ خود سید صاحب نے سلف کی تحریرات پر کس قدر نکتہ چینیاں کی
ہیں؟ میری تحریروں کو پڑھکر کیوں خواہ مخواہ جوش ظاہر کیا جاتا ہے کیا اس لئے کہ ایک مذہبی رسالہ
قرآن و سنت کی اشاعت اور نیچریت و دہریت کا استیصال کرتا ہے۔

(خاکسار ایڈیٹر)

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی لیکن رسالہ الہدیٰ[1] میں مولانا مرحوم نے " فلاسفہ کی بد اعتقادیاں "
کے عنوان سے آٹھ صفحہ کا ایک مضمون لکھا جس پر رسالہ عصر جدید کے ایڈیٹر پھر سیخ پا ہو گئے اور اپنے
رسالہ میں مولانا روحی کے خلاف کچھ لکھ دیا جسے مولانا نے پڑھ کر الہدیٰ[2] میں " ایک غلط فہمی پر اصرار " کے
عنوان سے چند سطریں جواب میں لکھیں اور کہا کہ ایڈیٹر عصر جدید نے اپنی سابقہ غلط فہمی پر بس نہ
کرکے گزشتہ پرچے میں پھر ہمارے برخلاف چند سطریں گھسیٹ ماریں اور بجائے جواب کے پھبتیاں
سنانے لگے۔ اگر وہ کوئی تحقیقی بات کہتے تو ہم جواب بھی دیتے مگر بازاری باتوں کا جواب دینا ہمارے
موضوع رسالہ سے خارج ہے۔

اس سے قبل مولانا روحی اپنے رسالہ[3] میں لکھ چکے تھے کہ ہم نے کسی گزشتہ نمبر میں
بعنوان " فلاسفہ کی بے اعتقادیاں " لکھا تھا کہ اکثر حکماء کے کلام میں زندقہ اور الحاد مضمر ہے اور
طوسی، شیخ بوعلی کی کتاب اشارات کو خواص کا قرآن کہا کرتا تھا اس پر ایڈیٹر عصر جدید نے
مخالفت کی اور حکماء کی حمایت میں بے جا طور پر چند ایک سطریں میں کچھ عامیانہ سے خیالات کا
اظہار کیا جو محض غیر محققانہ حسن ظن پر مبنی تھے۔ طوسی کے متعلق آپ نے لکھا تھا کہ ہم نے مذکورہ
بالا خیال میں اُس پر اتہام کیا ہے حالانکہ ہمارے خیال کا ماخذ حافظ ابن قیم کی زبردست کتاب
" اغاثۃ اللہفان " موجود ہے۔ ہماری عادت نہیں کہ ہم خواہ مخواہ کسی ہم عصر سے دست و گریبان

۱ جلد ۲ شمارہ ۵

۲ جلد ۲ شمارہ ۱۰

۳ جلد ۲ شمارہ ۹

ہیں۔ بعض تنگ مزاج لوگوں نے اپنا شیوہ بنالیا ہے کہ جہاں کسی نے اُن کے برخلاف کچھ لکھا یا اُن کے
مذہب پر جائز یا ناجائز حملہ کیا تو خواہ مخواہ شَیں شَیں اور تُو تُو پر اُتر آتے ہیں۔ ہم بفضلہٖ تعالیٰ
وسیع حوصلہ رکھتے ہیں اور اپنے ابنائے عصر کی بیسیوں غلطیوں سے اغماض کرجاتے ہیں اور کبھی اُن کی تصحیح
نہیں کی۔ حالانکہ اظہارِ حق اکثر حالات میں واجب ہوجاتا ہے مگر ہمیں یقیناً معلوم ہے کہ جہاں کچھ کسی کے برخلاف
لکھا ٹھنڈے دل سے کوئی نہیں سُنے گا۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب پہلے ہی سے مختلف مذاہب کے ماننے
والوں میں سوءِ ظن برابر چلا آتا ہے۔ مقلّد کسی غیر مقلّد کی بات کیوں سننے لگا اور اسی طرح برعکس
علیٰ ھذا القیاس سُنّی کسی شیعہ کے قول کی کب وقعت دے سکتا ہے اور اسی طرح برعکس۔ سو ایسے
حالات میں ہم نہیں چاہتے کہ ناحق دردِ سر کو خرید لیں۔ یہ منصب انہیں اصحاب کو شایاں ہے جن
کو یہ خیال ہے کہ ایک کے بدلے دس نہ سنائیں تو دل ٹھنڈا نہیں ہوگا اور نہایت شرمناک طریق پر اس نفسانیت
کا نام حمایتِ دین رکھا جاتا ہے۔ الغرض ہم نہیں چاہتے کہ ایڈیٹر موصوف کو جو اپنے خیال میں نہایت
منصفانہ اور آزادانہ طریق کے پابند ہیں ایک مختصر سی بات میں مخاطب کریں اور اپنی طرف سے انہیں خواہ
مخواہ کبیدہ خاطر بنالیں مگر چونکہ اُن کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے بلا حوالہ کتاب بلا سوچے
سمجھے علماء اسلام، خصوصاً نصیر طوسی پر اتّہام کیا ہے اس لئے محض اس خیال سے کہ ہم اُن کے اس
سوءِ ظن کو رفع کردیں۔ امام ابن قیّم کی کتاب "اغاثۃ اللہفان" مطبوعہ مصر کے صفحہ ۳۶۹
تا ۳۷۰ سے ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں تاکہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوجائیں اور جو کچھ اپنی
ہماری نسبت خیال پیدا ہوا تھا وہ ابن قیّم کی نسبت قائم کریں۔ البتہ ہم ایڈیٹر موصوف کو اس امر
پر آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ پہلے اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیں کہ نصیر طوسی حضرات
شیعہ کے متکلمین کا ایک آدمی ہے۔ پھر اسکی استعداد اور خیالات کا موازنہ کیجئے گا۔

اس کے بعد مولانا موصوف نے ابن قیّم کی کتاب کی طویل عبارت نقل کرکے اُس کا اردو ترجمہ
بھی لکھ دیا ہے تاکہ ایڈیٹر عصرِ جدید اُس پر غور کرسکیں۔

اس کے بعد آخر میں مولانا لکھتے ہیں:

الغرض یہ ملحد اور اُسکے پیچھے لگنے والے سب کے سب منکرینِ خدا، ملائکہ، کتب و
رسل اور منکرینِ قیامت تھے اور اُسکے پیروان میں جس فلسفہ کا رواج پایا جاتا ہے وہ اسی کی کتابوں

یا اُن کے امام ابن سینا کی کتابوں سے ماخوذ ہے اور کچھ ابو نصر فارابی اور کسی قدر ارسطو کے کلام سے اخذ کیا گیا ہے۔ غالباً ایڈیٹر صاحب موصوف کو کلی اطمینان ہو گیا ہوگا کہ جو کچھ فلاسفہ اور بالخصوص نصیر طوسی کی نسبت ہم نے لکھا تھا ابن قیم کی تحریر کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا۔ اب آپ مختار ہیں کہ ابن قیم کی تحریر کا رد لکھیں مگر واضح رہے کہ تاریخی واقعات اور نفس الامری امور کا رد کوئی آسان کام نہیں۔

سر سید احمد خاں چونکہ عقائد کے بارے میں افراط و تفریط سے کام لیتے تھے اور انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے شکوک و شبہات کو خوب سمجھتے تھے اسلئے انہوں نے قرآن مجید کی متعدد آیات کی تفسیر اپنی رائے سے لکھی تاکہ قرآن مجید کی آیات کا انکار لازم نہ آئے لیکن صرف مولانا روحی ہی نہیں بلکہ اور بھی صحیح العقیدہ علماء سر سید احمد خاں کی تفسیر کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ سر سید احمد خاں کی اس خوبی کے مولانا قائل تھے کہ انہوں نے اس دور میں جب کہ مسلمان طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالجوں میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا تھا، مسلمان طلبہ کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد رکھی جس طرح لاہور میں انجمن حمایت اسلام نے اسی مقصد کے پیش نظر اسلامیہ کالج قائم کیا۔ آخر جب سر سید احمد خاں کی وفات ہوئی تو مولانا روحی نے اپنی ایک فارسی نظم میں اُن کا نہایت اعلیٰ مرثیہ لکھا جس کے متعلق مولوی محمد اقبال صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الحق صوفی کو بتایا کہ سر سید احمد خاں کی وفات پر کئی لوگوں نے مرثیے کہے لیکن مولانا حالی اور مولانا آزاد دونوں کا خیال تھا کہ مولوی روحی کا لکھا ہوا مرثیہ باقی سب کی نسبت پُر زور ہے۔

مولانا روحی مرحوم کا رسالہ الہدیٰ جاری کرنے کا مقصد صرف اصلاح مفاسد دینیہ اور تردید معتقدات باطلہ فلسفیہ تھا۔ کسی خاص شخص کی خواہ مخواہ مخالفت کرنا اُن کا ہرگز شیوہ نہیں تھا لیکن اسلام کے صحیح عقائد و اعمال کے خلاف اگر کوئی بات اُن کے علم میں آتی تو وہ اس کا پُر زور رد کرتے تھے خواہ اس بات کا کہنے والا کتنا ہی مشہور یا بڑا آدمی سمجھا جاتا ہو۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کے بارے میں اپنے رسالہ[1] میں انہوں نے لکھا کہ منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی اپنے ایک مضمون میں مختلف اقوام کے لئے ضرورت اتفاق پر لکھتے ہیں کہ متحد ہونے کے لئے ما بہ الامتیاز کو معدوم کر دیا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ لا مذہبی پھیل جانی چاہیئے۔

۱ جلد ۳ عـ ۱۲ صـ ۴

مولانا شبلی کے متعلق لکھتے ہیں[1]:

مولوی شبلی نعمانی صاحب نے "الندوہ" میں ایک مضمون مسئلہ قضا و قدر پر لکھا ہے جس میں انہوں نے جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انسان کی شامت ہے کہ جس کام کا وہ اہل نہ ہو اُسے ہاتھ نہ لگائے مگر کتنے ہیں جو اپنا اندازہ آپ لگا سکیں

اسی طرح اسی مقام پر لکھتے ہیں:

ایڈیٹر عصر جدید لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک فرقہ کافروں سے سود لینا جائز رکھتا ہے۔ علمائے اہل سنت کیوں مخالفت کرتے ہیں حالانکہ جس فرقہ کا آپ حوالہ دیتے ہیں اُسکے نزدیک مسلمانوں کے دیگر فرقوں سے بھی سود لینا جائز ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے بارے میں لکھتے ہیں[2]:

مولانا حالی صاحب پانی پتی "عصر جدید" میں شیعہ سنی کے اتفاق پر ایک مضمون لکھتے ہیں۔ مضمون مختصر ہے اور اچھا ہے لیکن ہمیں آپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ ہندوستان میں شیعہ سنی کے جھگڑوں کی ابتداء اہل السنت والجماعت کی طرف سے ہوئی۔ جن سنی مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے اگر اُن کے اسباب تالیف پر مولوی صاحب غور کرتے تو کبھی ایسا نہ لکھتے کیونکہ کتب مذکورہ بالا بطور اتمام حجت آخری مرحلہ تھا۔

پھر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ

فرقہ شیعہ کا رسالہ "اصلاح" متجاوز عن الحد ہو کر افساد کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم اپنے رسالہ کو بلاوجہ مناظرہ کا مرقع نہیں بنانا چاہتے ورنہ یہاں کس چیز کی کمی ہے ؎

نداند کہ مارا سر جنگ نیست   وگرنہ مجال سخن تنگ نیست

ایڈیٹر نے بدگوئی بزرگان دین میں لکھنؤ کے مفتی عباس اور ایران کے ملا مجلسی کو بھی مات کر دیا ہے افسوس ہے ایسی اشاعت دین پر۔

پھر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں:

[1] الہدیٰ ج ۳ ع ۱۲ ص ۴۰

[2] " ج ۴ ع ۵ ص ۴۲

اڈیٹر عصر جدید نے سرسید کے اصول تفسیر پر کچھ بحث کی ہے چونکہ اڈیٹر موصوف کا محاکمہ بربنائے اصول اثنا عشریہ ہے اس لئے ہم خواہ مخواہ دخل در معقولات کا مصداق نہیں بنتے ہاں اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ سرسید کے اصول تفسیر سے ہمیں بالکلیت[1] انکار ہے اور جو محاکمہ کیا گیا ہے اُس کی ایک دو باتوں کے سوا باقی سب مخالف اصول اہل سنت و جماعت ہیں ۔

رسالہ الہدیٰ کے اسی صفحہ پر اسلامی خبروں کے تحت لکھا ہے ۔ میرزا قادیانی نے مریدوں کو حکم دے دیا ہے کہ جو مرزائی طاعون سے مرے اُسے بلا غسل دفن کیا جائے اور صندوقوں سے مردہ اٹھوایا جائے اور سو گز کی دوری پر جنازہ رکھ کر نماز پڑھی جائے ۔ پہلے تو الہام تھا کہ انہ آوی القریۃ یعنی قادیان میں طاعون نہیں پڑے گا اور اُسکی توسیع یوں کی گئی تھی کہ جہاں جہاں کوئی ہمارا مرید ہوگا محفوظ رہے گا مگر شان ایزدی کہ بڑے بڑے کرانڈیل مرزائی بھی طعمہ طاعون بن گئے جو بلا غسل مدفون ہوئے ۔

اسی طرح رسالہ الہدیٰ میں لکھتے ہیں کہ[2]

ہمعصر "وکیل" مجریہ ۲۳ اپریل میں کوئی صاحب ابوالکلام دہلوی ایک اعتراض کے جواب میں جو کسی شخص نے ان کی تقریر پر کیا ہوگا لکھتے ہیں کہ "معترض کو صبر و تحمل سے کام لے کر غور کرنا تھا کہ اشاعرہ کے سوا اور اسلامی فرقے معجزے کو دلیل نبوت نہیں تسلیم کرتے معتزلہ معجزہ کے وجود ہی سے منکر ہیں ۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ ایک اتہام اور افتراء ہے جو محض ظن کاذب پر مبنی ہے ۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو معجزہ کو تسلیم نہ کرتا ہو اور جو معجزہ کے وجود کو تسلیم کرتا ہے وہ اس دلیل نبوت کو بھی تسلیم کرتا ہے ورنہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ معجزہ محض ایک مفہوم ذہنی ہے جس کا وجود خارجی ممکن نہیں ۔ معتزلہ صرف کرامت اولیاء کا انکار کرتے ہیں ۔ معجزہ کا کبھی انہوں نے انکار نہیں کیا ۔ بے شک بعض ملاحدہ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے معجزہ اور اسکی حجیت سے انکار کیا ہے مگر ایسے لوگ اول تو کسی اسلامی فرقہ سے مخصوص نہیں بلکہ فلسفہ و طبیعات کے ماننے والے تھے اور انہیں مذہب سے اسی قدر واقفیت تھی جس قدر راجہ رنجیت سنگھ کو انگلستان کے قانون

۱ چونکہ ہم سید صاحب کے اصل اول توحید باری کے قائل بھی نہیں کیونکہ جس خدا تعالیٰ کی توحید وہ پیش کرتے ہیں وہ سائنس اور فلسفہ کی زنجیروں میں مقید ہے ۔ ۱۲ منہ

۲ جلد ۳ عدد ۵ صہ ۴۱-۴۲

سیاسی ہے۔ دوم ایسے دعوے بمقابلہ نصوص قرآنیہ اور سنت صحیحہ اور اجماع امت کے کسی شمار و قطار میں آسکتے ہیں۔ دیکھو علامہ تفتازانی شرح مقاصد جلد دوم مطبوعہ مصر صفحہ ۱۷۷ پر لکھتے ہیں:

قدح بعض المنكرين للنبوة في معجزات بأن تجويز خوارق العادات سَفْسَطَةٌ ۔ یعنی منکرین نبوت نے درباره معجزات یہ نکتہ چینی کی ہے کہ خرق عادات کا قائل ہونا باطل ہے۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معجزات کا انکار صرف انہیں لوگوں نے کیا ہے جو نبوت کا انکار کرتے ہیں کیونکہ نبوت کی صداقت تسلیم کر لینے پر معجزہ کا تسلیم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اب بتلائیے کہ مسلمانوں میں کوئی ایسا بھی فرقہ ہے جو نبوت کو تسلیم نہیں کرتا؟ یہ محض نیچریوں کی چالاکی ہے کہ ناواقفوں کو یہ دھوکا دیا جائے کہ بجز اشاعرہ کے سب نے معجزہ کے دلیل ہونے کو تسلیم نہیں کیا۔ شارح مواقف نے بعض الناس کا لفظ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز چند جہال کے سب معجزہ کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں اس امر میں ضرور اختلاف ہے کہ جب معجزہ دلیل نبوت ہے تو اس کی کیفیت دلالت کس طرح ہے یعنی کیونکر معجزہ مستلزم ثبوت نبوت ہوتا ہے۔ سو یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس سے ہمیں اس وقت بحث کرنا مدنظر نہیں۔

رسالہ الہدیٰ کے ایک پرچے[1] میں "ایڈیٹر اہلحدیث کی غلط فہمی" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

مولوی ثناء اللہ صاحب نے ایک گزشتہ نمبر میں خاکسار کی نسبت ایک شکایت کی ہے جو ان کے ایک لاہوری دوست کے خط پر مبنی تھی۔ ہمیں افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے جلدبازی سے کام لیا اگر قبل از اشاعت خاکسار سے حقیقت حال دریافت فرما لیتے تو غالباً انہیں ایسا موقع نہ آتا۔ خاکسار کا مشرب ہمیشہ معتدل رہا ہے۔ کسی شخص کی غلطی کو غلطی اور صحت کو صحت ہی کہا کرتا ہے خواہ کوئی ہو۔

رہا مولوی صاحب کے نامہ نگار پشاوری کے مشاہدہ عن الحد کے الفاظ کا جواب سو اس کے متعلق اپنا شعر ذیل کافی سمجھتا ہوں ؎

[1] ۷ : ۸ ص ۸۰

رد و قبول خلق کہ دنگر تعلق است

پیرایۂ است خویش کہ دریدم بروزگار

انکی نکتہ چینیاں میرے نزدیک پرِ کاہ کا حکم بھی نہیں رکھتی ہیں۔ میں جس مسلک کا پابند ہوں اس پر علی وجہ بصیرت کاربند ہوں۔ رہا مناظرہ جس کو آج کل مشاغلہ کہنا چاہئیے۔ سو خاکسار کے مسلک سے بعید ہے۔ گو نامہ نگار صاحبان اسکی وجہ کچھ ہی سمجھیں۔ ہمیں افسوس ہے ایسے لوگوں کی حالت پر جو اپنی تمام عمر لغو مناقشات اور بیہودہ بحث میں ضائع کر رہے ہیں اور بزعم خود محقق بننے کے مدعی ہیں

اللهم انی اعوذبک من علم لا ینفع

ایڈیٹر

الہدیٰ ہی کے ایک پرچے میں[1] مولوی حاجی الٰہی صاحب مدرس صادق ہائی سکول بہاولپور کا ایک مضمون اعجاز القرآن کے نام سے چھپا ہے جس کا آغاز اس طرح ہے:

مولوی شبلی نعمانی نے رسالہ الندوہ میں ایک مضمون اعجاز القرآن پر لکھا ہے جس میں آپ بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ یہ آپ ہی کی طبیعت رسا کا نتیجہ ہے یعنی ۱۳۰۰ سال سے تو اعجاز القرآن کو فصاحت و بلاغت ہی میں منحصر کرتے آئے ہیں[2] لیکن ہمیں یہ سوجھی ہے کہ یہ بالکل درست نہیں، بلکہ قرآن مجید کا معجزہ تزکیہ نفس و ہدایت ہے۔ نہ فصاحت و بلاغت۔ آپ اس کو ایک عجیب استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس کو ہم مغالطہ منطقی سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے ----------

---------- مضمون کے آخر میں صاحب مضمون لکھتے ہیں:

مولوی شبلی صاحب ادب و زبان کے لائق استاد و پردازی ہیں اور ہم نے اپنی ذاتی علم سے ان کی اس قابلیت کا موازنہ کیا ہے مگر وہ مذہبی تحریرات کے میدان میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ کتب فقہ و حدیث

---

1 ۷ : ۶ ص ۳۹ - ۳۳

2 ابوبکر باقلانی کی کتاب اعجاز القرآن، دیباچہ تفسیر کشاف، ملل و نحل، ابن حزم اور شفاء قاضی عیاض وغیرہ کتب مولوی شبلی صاحب کے خیالات کو باطل ثابت کرتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

اور اصول سے وہ مطلق ناآشنا ہیں۔ لہٰذا اُن کا علوم دینیہ میں قدم اٹھانا محض ہوس ناکی ہے۔ یہ امر کچھ موجب نقصان نہیں کیونکہ دنیا میں جامع کمالات کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب نے علم کلام پر جو دو رسالے لکھے ہیں ان میں سے پہلا حصہ ایک دوست کی معرفت خاکسار نے مختلف مقامات سے مطالعہ کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو علوم عربیہ دینیہ سے مس تک نہیں کیونکہ اس میں ایسی فاش غلطیاں موجود ہیں جن سے مولوی صاحب کی ناواقفیت مسائل کلامیہ کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ایک معزز تعلیم یافتہ دوست نے خاکسار کو ایک دفعہ ان پر دو رسالے کے رد لکھنے کے لئے کہا مگر خواہ مخواہ ایک سر دردی اور بکھیڑا سمجھ کر ٹال دیا گیا کیونکہ مسلمانوں کو اس قسم کی تحریرات سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں مسلمانوں کو قرآن و سنت کی طرف متوجہ کرنا چاہئیے نہ مباحثات و مناظرات میں تضییع اوقات کرنا۔ چنانچہ الہدیٰ کے پہلے دو رسالوں میں سید احمد خان علیگڑھی کے بعض عقائد باطلہ کا رد شائع ہو رہا ہے مگر اس کے لئے چند ایک وجوہ تھیں۔ بالآخر ایڈیٹر نے ایسے رد کا لکھنا ترک کر دیا۔

مولوی شبلی صاحب ذہین طبیعت کے آدمی ہیں اور ان کی طبیعت میں اردو مضمون نگاری کی قابلیت ہے اور بعض تاریخی امور میں انہیں ایک حد تک نظر ہے مگر ہم ان کی مذہبی تحریرات کو اسلامی پبلک کے لئے گمراہ کن سمجھتے ہیں۔ مسئلہ تقدیر، مسئلہ اعجاز القرآن، مسئلہ معجزات وغیرہ کو انہوں نے فی الحقیقت نہیں سمجھا۔ ان مسائل میں ان کا طریق بعینہ سید احمد خان کا سا طریق ہے جس کا بطلان آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ مولوی صاحب کی ادبی تحقیقات کا یہ حال ہے کہ اپنی کتاب المامون کے ایک مقام پر دیوان الحماسہ کے شعر ذیل کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں ؎

قومی ھُم قتلوا اُمیمَ اخی ــــ الخ

"میری قوم ہی نے میرے بھائی امیم کو قتل کیا ہے۔"

حالانکہ اُمیم منادیٰ مرخم ہے جو اصل میں یا امیمۃُ ہے اور امیمہ شاعر کی عورت کا نام ہے مگر مولوی صاحب نے شاعر کے بھائی کا نام قرار دیا ہے۔ اصل ترجمہ یہ ہے کہ اے امیمہ میری اپنی قوم ہی نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ مولوی صاحب نے قلت عربیت کی وجہ سے اس

بات کو نہیں سمجھا کہ امیم اسم مصغر اسم غیر منصرف نہیں پھر مبنی علی الفتح کیوں پڑھا جاتا ہے؟ علی هذا ایمان اور عمل کی بحث میں فاتقوا اللہ اور واتقوا اللہ کے امتیاز کو اٹھا کر آیہ کو غلط لکھ مارا یہ سب کچھ ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اگر مولوی صاحب اپنا قلم شاعرانہ مذاق اور تاریخی مضمون نگاری تک محدود رکھیں تو نہایت مناسب ہوگا یہ کیا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ ہر ایک علم میں محقق بننے کا خیال دل میں جما لیا جاوے۔ مثل مشہور ہے ؎ ہر کسے را بہر کارے ساختند

الہدیٰ کے ایک پرچہ میں[1] " حقیقۃ الرسالۃ عند النیاجرۃ " کے عنوان سے ایڈیٹر نے ایک مضمون طبع کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ یہ مضمون تقریباً دس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اسلئے مقالہ کی طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

" الہدیٰ کی نوعیت مضامین " کے تحت لکھتے ہیں :[2]

بعض ناظرین کبھی کبھی یہ بھی تحریک کیا کرتے ہیں کہ الہدیٰ میں ایسے مضامین بھی شائع ہونے چاہئیں جو مسلمانوں کی موجودہ قومی ضرورتوں پر بحث کرتے ہوں مگر ہم انہیں کہتے ہیں کہ ایسے مضامین الہدیٰ کے موضوع میں داخل نہیں۔ مسلمانوں میں روحانیت، اخلاص اور کتاب اللہ کا جاننا اور اسلاف کے حالات سے واقف ہونا مفقود ہو گیا ہے اور انہیں ان ضروری امور سے بالکل غفلت ہو گئی ہے حالانکہ اسلام کی مقدس تعلیم یہی امور ہیں۔ مع ہذا قومی دنیوی ضرورتوں پر بحث کرنے کے لئے بہتیرے اخبارات جاری ہیں جن میں جھوٹی خوشامد اور اپنی ذاتی اغراض کے لئے حق کو باطل اور باطل کو حق بنا لینے اور لغو مدح و ذم کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر الہدیٰ بھی ایسا ہی پرچہ ہو تو پھر دینی پرچہ نہ ہوگا۔ ہم ایسے مضامین سے کوسوں دور ہیں۔ اگر ہم کسی ایڈیٹر کے جھوٹے خیالات یا لغو مدح و ذم یا خود غرضانہ نکتہ چینی پر بحث کرنے لگیں جیسا کہ دیگر ہم عصروں کا قاعدہ ہے تو یقیناً اپنے موضوع سے باہر نکل جائینگے۔ لہٰذا ہم سے ایسی لغو توقع رکھنا فضول ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی دینی مضمون کی طرف خاکسار کو توجہ دلائی جائے۔

---

1. ج ۷ عـ ۱ صـ ۲۱ ـ ۳۰
2. ج ۸ عـ ۲ صـ ۳۹

اس خیال کا اعادہ الہدیٰ کے ایک اور پرچے میں کیا گیا ہے[1]

ملحدانہ اور زندیقانہ اعتقادات کو مولانا کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن مجید اور وحیٔ ربانی کی تاویلات باردہ کا منہ توڑ جواب دیا کرتے تھے۔ مرزائیت کے علاوہ بعض دیگر فرقوں مثلاً اہل تشیع اور منکرین حدیث کے مقابلے میں وہ اسلام کی صحیح صورت عوام الناس کے سامنے پیش کرتے تھے اور اپنے رسالے میں وقتاً فوقتاً اسی قسم کے مضامین تحریر کیا کرتے تھے۔

اسلام کے مختلف گمراہ فرقوں کی مخالفت کے علاوہ وہ عیسائیت کے رد میں بھی پیش پیش تھے۔ چنانچہ اُن کی تصانیف میں سیف الاسلام، ثالوث مقدس کی توحید پر تنقید اور اسلام اور عیسائیت کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں:

پہلی کتاب کے شروع میں فرماتے ہیں:

"مجھے اس رسالہ کے لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ مشنریوں کی یاوہ گوئی زد خروع اسلام سے جاری ہے اور رہیگی۔ مگر میرے ایک معزز دوست نے مجھے چند رسالے بھیجکر استدعا کی کہ میں ان کے جوابات لکھوں۔ یہ رسالے حسب دستور لدھیانہ کرسچین لٹریچر سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئے ہیں جو اَز سر تا پا بہتان و افتراء محض ہیں۔ چنانچہ آئندہ سطور میں ہم ان شاء اللہ تعالیٰ اس امر کا کامل ثبوت دیں گے۔ عمران سوسائٹی اور نیز دیگر پادری صاحبان سے التماس ہے کہ اگر اس رسالہ کا جواب لکھنا چاہیں تو نہایت ضروری شرط یہ ہے کہ کسی فاضل آدمی کو جو انصاف پرست اور فلسفہ و منطق سے خوب واقف ہو اس کام کے لئے تجویز کریں کیونکہ جس پادری صاحب کے قلم سے رسائل مذکورہ بالا نکلے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسے دلیل و مدلول کے مفہوم اور ان کے ربط و لزوم کی کچھ خبر نہیں۔ چنانچہ جابجا اس امر کا اشارہ ہے گا"

[1] الہدیٰ، ج ۹ ع ۵ ص ۳۱

اہلِ اللہ سے عقیدت

مولانا روحی اولیاء اور فقراء سے انتہائی عقیدت اور ارادت رکھتے تھے اور ایسے کسی شخص کا جب آپ کو علم ہوتا تو بعض دفعہ بذاتِ خود اُن سے ملتے اور بعض مواقع پر اپنے مصاحبین میں سے کسی کو اُن کی خدمت میں بھیجتے اور دعائے خیر کی درخواست کرتے۔ ذیل میں چند ایسے واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ جس زمانے میں اُن کے سب سے بڑے صاحبزادہ مولوی فضل حق مرحوم دہلی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر فائز تھے تو مولانا ایک دفعہ موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کے لئے اُن کے پاس چلے گئے۔ اُن کے دوسرے صاحبزادہ راجا بہاء الحق صاحب بتاتے ہیں کہ میں بھی اُن کے ہمراہ تھا دہلی پہنچ کر آپ نے وہاں کے مقبروں میں آرام کرنے والے اولیائے کرام مثلاً خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، امام الہند شاہ ولی اللہ اور اُن کی اولاد امجاد شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ اجمعین کے مزارات پر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا۔ چونکہ ہمارا قیام نئی دہلی میں تھا اور مذکورہ بالا بزرگان کے مزارات پرانی دہلی کے دور دراز گوشوں میں واقع تھے اور وہاں تک پہنچنے میں سخت دقت کا سامنا تھا۔ موسم گرما کی چلچلاتی ہوئی دھوپ، پانی کی قلت، تانگے کی سست رفتاری غرضیکہ کئی مشکلات حائل تھیں۔ بعض مزارات کم و بیش پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع تھے لیکن چونکہ اُن کے دل میں خلوص و محبت کا جذبہ موجزن تھا اس لئے وہ ان تکالیف کو خاطر میں نہ لاتے اور باری باری تمام مقدس مقامات پر گئے اور وہاں گھنٹوں بیٹھے ذکر و اذکار میں مشغول رہے بالخصوص شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا مزار نہایت دور افتادہ بیابان میں واقع تھا جہاں تک پہنچنے میں کافی فاصلہ پیدل بھی طے کرنا پڑا۔

۲۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ایک ماموں صاحب میرٹھ شہر میں محکمۂ بجلی میں ملازم تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور ذکر کیا کہ یہاں ایک بہت بڑے بزرگ ولی اللہ موجود ہیں جن سے مل کر آپ کو خوشی ہوگی۔ چنانچہ رخصتوں میں والد صاحب میرٹھ گئے اور مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ ایک دو دن کے بعد انہوں نے اُن بزرگ ہستی سے ملنے

کا پروگرام بنایا اور ماموں صاحب کو بھی ساتھ لے لیا۔ چنانچہ وہ بزرگ شہر کے دوسرے کنارے پر ایک کمرے میں تشریف فرما تھے اور اُن کے معتقدین اُن کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ ماموں صاحب نے بتایا تھا کہ عموماً لوگ کوئی کھانے پینے کی چیز وہاں لے جاتے ہیں اور اگر وہ بزرگ اُس میں سے کچھ کھا لیں تو یہ اس بات کی نشانی سمجھا جاتا ہے کہ آنے والے شخص کی مراد پوری ہو جائے گی اور اگر اُس چیز کو بزرگ اہمیت نہ دیں بلکہ بچوں میں بانٹ دیں جو ہر وقت وہاں جمع رہتے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آنے والے کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ہم جب اُن کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ بزرگ اپنی جگہ سے اُٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ والد صاحب مرحوم کا استقبال کیا اور فرمایا "یہ لٹھ مولوی[1] کدھر سے آیا ہے۔" ہم قیمے کی روٹیاں پکوا کر ساتھ لے گئے تھے۔ اُن بزرگ نے ہمیں بھی اپنے ساتھ بٹھا کر اپنے سے کھلایا۔ والد صاحب نے دعا کی التجا کی۔ بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر تین دفعہ "اللّٰھم ارحمنا" کہا۔ پھر اپنے ارد گرد بیٹھنے والے صاحبوں کو ایک ایک لقمہ بطور تبرک دیا پھر اچانک اُس بزرگ نے اپنے بیٹھے ہوئے معتقدین میں سے ایک کو کہا کہ آج شام سے پہلے ہی کہیں اور چلے جاؤ کیونکہ آج رات اس عمارت کو آگ لگ جائے گی۔ اُس معتقد نے کہا کہ میرے مکان کی بیٹھک حاضر ہے۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلے آئے۔ اگلے روز یہ خبر شہر بھر میں مشہور ہو گئی کہ فلاں عمارت کو رات آگ لگ گئی ہے۔ یہ سُن کر ہمیں اُس بزرگ سے مزید عقیدت ہو گئی۔

۳۔ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری قدس سرہٗ سے بھی مولانا روحی بہت مانوس تھے اور اکثر اُن کی خدمت میں شرقپور جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا مرحوم بعارضہ نمونیہ صاحب فراش ہو گئے اور باوجود علاج معالجہ کے حالت بہت بگڑ گئی حتیٰ کہ بظاہر اُن کے جانبر ہونے کی امید نہ رہی۔ انھوں نے اپنے ہمسایہ میاں محمد اسمعیل مرحوم نمبردار کو پیغام بھیج کر بلایا۔ اُس وقت نماز عشاء ہو چکی تھی اور لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب حاجی اسمعیل صاحب تشریف

---

[1] جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مولانا مرحوم کالج یا کسی اور جگہ جاتے وقت اپنے ہاتھ میں ایک بھاری لمبا سا عصا رکھتے تھے اسلئے اسی بزرگ نے لٹھ مولوی کے نام سے یاد کیا۔

لے آئے تو آپ نے اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی شخص حضرت میاں صاحب کی خدمت میں
شرقپور جائے اور میاں صاحب سے میری صحت کے لئے دعا کرائے تو ممکن ہے اللہ تعالیٰ مجھے شفاء عطا
کر دے۔ میاں محمد اسمٰعیل جو میاں شیر محمد صاحب کی خدمت میں اکثر حاضری دیا کرتے تھے اور اُن کے بہت
معتقد تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت تو کافی رات گزر گئی ہے خدا خیر کرے تو صبح ان شاء اللہ میں
کسی کو بھیج کر آپ کی خواہش پوری کروا دوں گا۔ یہ وعدہ کر کے میاں اسمٰعیل صاحب اپنے گھر آ
گئے۔ سحری کے وقت جب نماز تہجد کا وقت ہوا تو مولانا مرحوم کے دروازے پر کسی نے دستک دی
پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت میاں شیر محمد صاحب تشریف لائے ہیں۔ دروازہ کھولا گیا اور میاں
صاحب مکان کی درمیانی منزل میں جہاں مولانا مرحوم صاحب فراش تھے۔ تشریف لے آئے۔ مزاج
پرسی کے بعد میاں صاحب نے کچھ پڑھا اور اپنا دست مبارک اُن کی پیٹھ پر پھیرتے ہوئے فرمایا کوئی فکر کی
بات نہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد صحت ہو جائے گی۔ مولانا مرحوم اُن کی اچانک اور غیر متوقع تشریف
آوری پر سخت متعجب ہوئے اور پوچھنے لگے کہ میری تکلیف کا علم آپ کو کیونکر ہوا۔ میاں صاحب نے
فرمایا آپ نے رات مجھے یاد کیا تو میں آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں صاحب نے واپسی کی اجازت
مانگی لیکن مولانا مرحوم نے بااصرار استدعا کی کہ اب صبح ہونے والی ہے۔ یہیں مسجد میں نماز ادا کرنے
کے بعد ناشتا کر کے تشریف لے جائیے لیکن میاں صاحب رضامند نہ ہوئے اور معذرت کرتے ہوئے فرمایا
کہ میں نے اپنی والدہ (کہا جاتا ہے کہ والدہ جو سوتیلی تھیں سگی نہیں) سے اتنی دیر تک شرقپور سے
غیر حاضر رہنے کی اجازت حاصل نہیں کی۔ مولانا مرحوم نے بار بار اُن کو کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے کہا
اور بتایا کہ اس وقت تو آپ کو لے جانے کے لئے کوئی سواری بھی دستیاب نہیں ہو گی اور
خواہ مخواہ آپ کو پریشانی اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر میاں صاحب اس درخواست کے
پورا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ جو خدا مجھے یہاں تک لایا ہے وہ
میری واپسی کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا

اُس زمانے میں لاہور سے شرقپور جانے کے لئے کوئی پکی سڑک نہ تھی اور نہ
لاریاں یا بسیں چلتی تھیں بلکہ ریڑھوں کے ذریعے سفر کیا جاتا تھا۔ یہ ریڑھے صبح کی نماز کے
بعد چلنا شروع ہوتے اور شام سے پہلے پہلے اُن کی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی اور پھر اگلی صبح

کہ یہ سلسلہ جاری ہوتا۔

جس روز حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ مولانا مرحوم کی عیادت کو آئے تھے اُسی دن سے مولانا کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی اور وہ رو بصحت نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ چار پانچ روز میں وہ پوری طرح صحت یاب ہو گئے اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے ؏

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جو لوگ اولیاء اللہ کی کرامتوں کو نہیں مانتے اُن سے بادب یہ پوچھا جاتا ہے کہ لاہور اور شرقپور کے درمیان لاسلکی کا کون سا انتظام موجود تھا جس کے ذریعہ میاں صاحب کو مولانا مرحوم کی خواہش کا علم ہوا۔ یہ واقعہ کتاب خزینۂ معرفت[1] (جو میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کے حالات پر مشتمل ہے جو اُن کے ایک معتقد صوفی محمد ابراہیم نے لکھی ہے) میں قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ محلہ کے بعض عمر رسیدہ لوگ بھی آج کل اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

۴۔ جب میاں صاحب قدس سرہٗ سے مولانا مرحوم کی پہلی ملاقات ہوئی اور مولانا اُن کی زیارت کے لئے شرقپور میں گئے تو اس وقت میاں صاحب اپنے محلہ کے کتوں کو روٹی کے ٹکڑے ڈال رہے تھے۔ کتے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے اُن کو احساس تھا کہ ہم ایک ولی اللہ کی نظروں کے سامنے ہیں کیونکہ اپنی طبیعت کے خلاف وہ چھینا جھپٹی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنی اپنی جگہ اطمینان اور سکون سے کھڑے تھے۔ جس کتے کی طرف میاں صاحب روٹی کا ٹکڑا پھینکتے وہی آگے بڑھ کر اُس کو لے لیتا۔ میاں صاحب نے ایک کمزور اور لاغر کتیا کی طرف روٹی کا ایک ٹکڑا پھینکا تو ایک موٹا تازہ کتا اُس کی طرف لپکا۔ یہ دیکھ کر میاں صاحب نے اُسے ڈرانے دھمکانے کی بجائے بہت نرم الفاظ میں یہ کہا کہ یہ تمہارے لئے تو نہیں ہے۔ یہ سُن کر وہ کتا پیچھے ہٹ گیا حتیٰ کہ اُس کتیا کا حصہ کتیا نے ہی کھایا۔ مولانا مرحوم یہ واقعہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور میاں صاحب کے پاس اکثر آنے جانے لگے۔ مولانا مرحوم اپنے اہل خانہ کو یہ واقعہ کئی بار سنایا کرتے تھے۔

---

[1] ص ۲۲۳

۵ - ڈاکٹر محمد ضیاء الحق بیان کرتے ہیں کہ والد صاحب مرحوم کے ایک شاگرد میاں عبدالغنی تھے
جو حیانگر ضلع گوجرانوالہ میں تحصیلداری کے عہدہ پر متعین تھے۔ وہ اکثر اپنے استاد کی خدمت میں
حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ میاں شیر محمد صاحب شرقپوری علیہ الرحمۃ
کا ذکر شروع ہو گیا۔ جسے سُن کر میاں عبدالغنی کو بھی میاں صاحب کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور
انہوں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ جب آئندہ میاں صاحب کی خدمت میں جائیں تو مجھے بھی
ہمراہ لے چلیں۔ والد صاحب عموماً جمعہ کے روز (جب اسلامیہ کالج میں رخصت ہوا کرتی تھی) میاں
صاحب کی خدمت میں جایا کرتے تھے اور نماز جمعہ وہیں ادا کرنے کے بعد شام سے پہلے واپس آجایا
کرتے تھے۔ انہوں نے میاں عبدالغنی سے کہا کہ آئندہ جمعہ کو انشاء اللہ جانے کا ارادہ ہے اسلئے
آپ اُس دن صبح دس گیارہ بجے تک لاہور پہنچ جائیں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ میاں عبدالغنی اُس روز
یہ وعدہ کرکے واپس چلے گئے اور اگلے جمعہ کو دس بجے کے قریب پھر لاہور آگئے۔ والد صاحب
مرحوم اُن کے ساتھ تانگے پر سوار ہو کر شرقپور شریف لے گئے۔ نماز جمعہ کا وقت قریب تھا اسلئے
انہوں نے میاں عبدالغنی صاحب سے کہا کہ انشاء اللہ نماز کے بعد میاں صاحب سے ملیں گے۔ جب نماز
جمعہ سے فراغت ہوئی تو والد صاحب نے میاں صاحب سے ملے اور میاں عبدالغنی کا بھی اُن سے تعارف
کرایا۔ میاں صاحب انہیں مل کر بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ ایک صالح اور نیک شخص تھے اور اُن کی
شکل و صورت حکم شریعت کے مطابق تھی۔ میاں صاحب نے عبدالغنی صاحب کو پڑھنے کے لئے کچھ وظیفہ
بتلایا جس سے میاں عبدالغنی بہت خوش ہوئے۔ جب رخصت ہونے لگے تو انہوں نے اپنی جیب سے
دو روپیہ نکال کر مصافحہ کرتے وقت میاں صاحب کی مٹھی میں رکھنے چاہے۔ میاں صاحب نے اپنے
ایک ہاتھ سے تو میاں عبدالغنی صاحب کے ہاتھ کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اُن کی داڑھی پکڑ کر کہا۔
میں جانتا ہوں تم مالدار شخص ہو اور تمہارا نام بھی عبدالغنی ہے لیکن یہ بتلاؤ کہ کیا نبی صلی اللہ
علیہ وسلم بھی اپنے ملنے والوں یا صحابہ کرام کے ساتھ اسی طرح پیش آتے تھے اور کیا یہ کام
سنتِ نبوی کے مطابق ہے۔ خبردار اگر آئندہ ایسا کیا تو پچھتاؤ گے۔ یہ دو روپے فوراً اپنی
جیب میں ڈالو۔ یہ سُن کر میاں عبدالغنی نادم ہوئے اور معافی چاہی۔

۶ - مولانا مرحوم کے دورانِ ملازمت میں کالج کا ایک طالب علم ملحدانہ اور زندیقانہ

عقائد کا حامل تھا اور مولانا روحی اُسے کئی طرح کی عقلی اور نقلی دلیلیں دے کر صحیح عقائد کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے لیکن "خوئے بد را بہانہ بسیار" کے مطابق وہ قائل نہیں ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے اس جواب سے تسلی نہیں ہے۔ آخر ایک دن مولانا مرحوم نے اُس سے کہا کہ تم میرے ساتھ شرقپور میں میاں صاحب کی خدمت میں چلو۔ وہ مان گیا اور واقعی ایک دن وہ مولانا مرحوم کے ساتھ شرقپور میں میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مولانا مرحوم نے اُس کا تعارف کرانے کے بعد اُس کی حالت کا ذکر کیا اور میاں صاحب سے درخواست کی کہ وہ اُس سے خطاب کریں۔ اس طرح میاں صاحب نے ایک آنکھ بھر کر اُسے دیکھا اور نصیحت کی کچھ باتیں بتائیں جن کو سنتے ہی اپنی بدعقیدگی سے اُس نے توبہ کر لی اور وہ ایک نیک اور دینِ اسلام پر چلنے والا صحیح العقیدہ مسلمان بن گیا اور اُس نے داڑھی بھی رکھ لی۔

یہ واقعہ بھی خزینۂ معرفت میں موجود ہے۔[1]

جب میاں صاحب مرحوم نے ۱۳۴۷ھ میں وفات پائی تو مولانا مرحوم نے فارسی میں اُن کا قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

۷۔ اس مقالہ کے شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ مولانا مرحوم کا وطن ضلع گجرات تھا۔ اس شہر میں سائیں کرم الٰہی جو سائیں کانواں والا کے نام سے مشہور تھے، قیام پذیر تھے۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جو شخص اُن سے ملنے جاتے اُس کو وہ بہت مغلظ گالیاں دیتے تھے اسلئے لوگ اُن کے سامنے جانے سے گریز کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا مرحوم نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی وہ اپنے گاؤں سے الگ نسبتاً کے ہمراہ گجرات گئے اور سائیں صاحب سے ملاقات کی۔

میاں محمد حنیف نبیرہ میاں محمد اسمٰعیل نمبردار کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مولانا اپنے گاؤں سے والپس تشریف لائے تو فرمایا کہ اس دفعہ میں گجرات میں سائیں کرم الٰہی عرف کانواں والا سرکار سے مل کر آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ سنا ہے کہ سائیں صاحب تو ہر آنے جانے والے کو سخت فحش گالیاں دیتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ہم تو قریباً ایک گھنٹہ سائیں صاحب کے پاس بیٹھے اور لوٹ آئے

---

[1] ص ۳۶۶-۳۶۷

جاتے رہے مگر انہوں نے ان کے سامنے تو کسی کو کوئی گالی نہیں دی۔

۸۔ میاں محمد حنیف صاحب ہی بیان کرتے ہیں کہ شیخ المشائخ پیر فضل عمر عرف ملا شور بازار افغانی جو حضرت مجدد صاحب کی اولاد میں سے تھے، ایک دفعہ کابل سے میرے تایا میاں قمر الدین مرحوم سے ملنے آئے۔ میاں صاحب نے پیر صاحب سے مولانا کا ذکر کیا تو وہ اچھرہ سے میاں قمر دین کے ہمراہ مولانا کو ملنے آئے۔ مولانا نے ان کی خاطر تواضع کی۔ عشاء کی نماز کے وقت مولانا نے پیر صاحب سے جماعت کرانے کی درخواست کی۔ پیر صاحب نے فارسی میں جواب دیا کہ میں آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کو اپنی سعادت خیال کرتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے امام بن کر نماز پڑھائی اور پیر صاحب نے اقتداء میں نماز پڑھی۔

۹۔ اسی طرح شہر گجرات میں ایک اور درویش سائیں غلام نبی عرف سائیں بیلے والا کے پاس بھی مولانا جایا کرتے تھے۔ وہ اہل علم کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مولانا کو اپنی مسند پر اپنے ساتھ بٹھاتے اور باہم تصوف اور معرفت ذات باری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ صاحب ہوش و حواس عالم شخص تھے اور اپنی عادات و اخلاق کے سبب عوام الناس میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ جب سائیں کانواں والا اور سائیں بیلے والا نے وفات پائی تو مولانا مرحوم نے دونوں کے الگ الگ قطعہ تاریخ ہائے وفات لکھے جو ان کے فارسی دیوان میں موجود ہیں۔

۱۰۔ حضرت مخدوم علی ہجویری (جو داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں) کا مزار پرانے بھاٹی دروازہ سے باہر مولانا کے مسکن کے قریب ہی تھا۔ مولانا کسی زمانے میں اُن کے مزار پر باقاعدہ جایا کرتے تھے لیکن وہاں کئی قسم کی بدعتیں دیکھ کر انہوں نے باقاعدگی سے آنا جانا چھوڑ دیا۔ کئی لوگوں کو انہوں نے مشرکانہ عادات اور غلو اعتقاد کے بارے میں سمجھایا کہ یہ چیزیں اسلام کے خلاف ہیں لیکن لوگ باز نہ آئے اور مولانا کی بات کو کوئی وقعت نہ دی جس کی وجہ سے آپ نے آمد و رفت بند کر دی کیونکہ مشہور حدیث ہے:

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان۔ (المناوی ۲ : ۲۹۵ — ۲۹۶)

۱۱۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی بیان کرتے ہیں کہ ایک بزرگ حاجی امام الدین ہمارے ہاں سال میں دو تین مرتبہ تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ موضع مخدوم پور پہوڑاں ضلع ملتان کے باشندے تھے۔ انہوں نے چودہ(۱۴) کے قریب حج کر رکھے تھے۔ وضع قطع سادہ اور درویشانہ تھی تشریف لاتے تو والد صاحب مرحوم کئی کئی گھنٹے اُن سے شریعت و طریقت کی باتیں کیا کرتے۔ جس سے متاثر ہو کر والد صاحب مرحوم نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انہوں نے شیخ ابو الحسن شاذلی کا مشہور وظیفہ دعائے حزب البحر پڑھنے کی اجازت بھی عطا فرمائی اور وہ اپنے ایک معتقد کے ہاتھ سے لکھوا کر والد صاحب مرحوم کو دے گئے کہ وہ اُسے زبانی یاد کر لیں اور صبح و شام اُسے اپنے دینی و دنیوی مقاصد کے لئے پڑھا کریں۔ یہ بزرگ نقشبندی سلسلہ طریقت میں منسلک تھے

روزمرہ کے مشاغل

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مولانا روحی بچپن سے ہی کچھ ایسی صفات کے حامل تھے جو ایک انسان کو کندن بنا دیتی ہیں۔ اس میں سراسر قدرت کارفرما ہوتی ہے۔ جو شخص اوائل عمر میں ہی یتیم ہو جائے اُس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں جن میں سے کسی ایک پر چل کر وہ یا تو بگڑ جاتا ہے اور یا انتہائی کامیاب زندگی گزارتا ہے۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ مولانا روحی خود ساختہ (Self made) انسان تھے۔ وہ ایام طفولیت سے ہی جدوجہد اور مشقت برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ تمام عمر تن آسانی اور عیش و عشرت کو انہوں نے اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ لاہور میں آکر پہلے وہ بانسوں والا طویلہ کے علاقے میں ایک کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر تھے جہاں وہ قریباً" دس بارہ سال مقیم رہے۔ یہ مکان ایک مسجد کے بالکل قریب تھا۔ وہ پانچ وقت کی نماز اُسی مسجد میں ہی ادا کرتے رہے۔ اُسی زمانے میں مسجد سنہری میں درس قرآن بھی دیا کرتے تھے۔ یہ مسجد اُن کے مکان سے قریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ وہاں درس قرآن کی مجلس میں ڈبی بازار اور کشمیری بازار کے قریباً تمام تاجر لوگ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حاجی قمر الدین مرحوم رئیس و ذیلدار اچھرہ نے اتفاقیہ طور پر مولانا کے پیچھے نماز ادا کی اور اُس کے بعد درس میں شریک ہو گئے۔ وہ مولانا کے درس سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر وہ باقاعدگی سے درس میں شریک ہونے لگے

انہوں نے مولانا کے کوائف وہاں کے لوگوں سے معلوم کئے اور انہیں اپنا اتا پتہ بتایا۔ اس وقت
حاجی قمر الدین بھاٹی دروازہ کوچہ خراطاں میں اپنے والد بزرگوار حاجی میاں محمد اسمٰعیل کے ساتھ رہتے تھے۔
انہوں نے اپنے والد سے مولانا کا ذکر کیا۔ اس مدت میں حاجی محمد اسمٰعیل مرحوم کے ساتھ والا مکان فروخت
ہونے کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ حاجی قمر الدین صاحب نے اپنے والد سے مشورہ کیا کہ مولانا روحی کو اس مکان
میں کرایہ پر آباد کیا جائے۔ چنانچہ حاجی قمر الدین نے مولانا روحی سے یہ درخواست کی کہ آپ بھاٹی دروازہ
میں نقل مکان کر لیں۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ والا مکان فروخت ہو رہا ہے۔ ہر دو چار روز کے بعد حاجی
قمر الدین تبدیلیٔ مکان پر رضامند کرنے کی کوشش کرتے رہتے لیکن مولانا روحی اس بات کو خاص اہمیت نہ دیتے
تھے۔ اس دور میں اسلامیہ کالج میں جمعہ کے روز تعطیل ہوتی تھی۔ اس لئے جمعہ کے آنے سے پہلے میاں قمر الدین نے
مولانا کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ آئندہ جمعہ کو میں کسی مزدور کے ذریعے آپ کا سامان بھاٹی دروازے
لے جاؤں گا اور واقعی جمعہ کے دن وہ مزدور لے کر آ گئے۔ مولانا نے کہا تم نے جلد بازی سے کام لیا ہے
ذہنی طور پر مولانا روحی منتقل ہونے پر آمادہ نہیں تھے لیکن میاں قمر الدین نے اُن کو اس پر رضامند کر لیا۔
چنانچہ وہ گھر کا سامان لے کر بھاٹی دروازہ پہنچ گئے اور پھر مولانا اور اُن کے اہل و عیال کو تانگہ میں سوار
کر کے بھاٹی دروازہ لے آئے۔

بانسانوالہ بازار کے باشندوں نے مولانا کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میاں قمر الدین
زبردستی مولانا کو بھاٹی دروازہ لے آئے۔ یہ واقعہ قریباً سنہ ۱۹۰۹ء کا ہے۔ اُس وقت سے لے
کر آخری دم تک آپ بھاٹی دروازہ میں ہی مستقل طور پر مقیم رہے۔ یہاں بھی مسجد بالکل مکان کے متصل
تھی۔ اُس وقت اس مسجد کے امام ایک صاحب میاں قدرت اللہ تھے۔ جو امامت کے علاوہ دودھ
دہی کی دکان بھی کرتے تھے اور یہ دکان مسجد کے نیچے واقع تھی۔ بالائی حصہ میں وہ اور اُنکے اہل و عیال
مقیم تھے۔ میاں قمر الدین نے اہل محلہ کو مولانا روحی سے متعارف کرایا اور بتایا کہ وہ نہایت بلند پایہ عالم
اور اسلامیہ کالج میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ میاں قدرت اللہ دین اسلام کی ابتدائی تعلیم سے تو واقف تھے
لیکن درس اور وعظ کرنے کی ہمت اُن میں نہ تھی۔ اس لئے میاں قمر الدین نے اپنے والد اور دیگر اہل محلہ سے
مشورہ کر کے مولانا روحی سے درخواست کی کہ اُس مسجد کی امامت و خطابت اور درس قرآن و حدیث
کی ذمہ داری قبول فرمائیں اور انہیں اس کے معاوضہ میں کچھ ماہوار دینے کا بھی ارادہ کیا لیکن

مولانا نے پہلے تو اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا اور معاوضہ لینے سے تو صاف انکار کر دیا
چند روز تک اہل محلہ بار بار اصرار کرتے رہے اور بالآخر مولانا کو اس بات پر رضامند کر لیا۔ آپ نے
فرمایا مشاہرہ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں خدا کے فضل سے اسلامیہ کالج سے تنخواہ
وصول کر لیتا ہوں جو میرے لئے کافی ہے۔ دین کی خدمت کا میں کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔ کیونکہ
قرآن مجید میں آیا ہے:

ما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین (۲۶ : ۱۰۹)

بہرصورت مولانا روحی اس وقت سے اپنے آخری دنوں تک یہ خدمت محض فی سبیل اللہ بجا لاتے رہے۔
اس محلے میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے گو تعداد میں مسلمان زیادہ تھے لیکن اُن کی
مذہبی حالت سخت قابل افسوس تھی۔ شادی و غم کے مواقع پر مشرکانہ اور ہندوؤں کی رسمیں جاری و
ساری تھیں۔ مثلاً شادی کے موقع پر آتش بازی، جوا، شراب نوشی اور بعض وقت مجرا کرانا وہ
ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں کے لوگ بیشتر گوجر، نیاریے اور ارائیں تھے لیکن ان میں دینی تعلیم تو کیا
ہوتی وہ دنیوی تعلیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ مولانا ہر جمعہ کے خطبہ میں اسلام کی صحیح تعلیم اُن کے سامنے
پیش کرتے۔ اس کے علاوہ پانچ وقت کی نماز پڑھاتے۔ صبح کی نماز فجر کے بعد درس قرآن اور شام کو
درس حدیث کی مجالس قائم ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ مولانا کے درس کا شہرہ دور دور تک
پہنچ گیا اور بعض تعلیم یافتہ لوگ بھی باقاعدگی سے اُس میں شریک ہونے لگے۔

میاں قدرت اللہ جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ مسجد کی امامت و خطابت سے بھی آزاد ہو
گئے۔ دکان کے علاوہ وہ جائیداد خریدنے اور بیچنے کے سلسلے میں دلالی کا کام بھی کرتے تھے۔ انہوں
نے کچھ تانگے بھی بنا رکھے تھے جن کو چلانے کے لئے تنخواہ پر ملازم رکھے ہوئے تھے اور اُن سے میاں قدرت
اللہ ایک معقول رقم شام کو وصول کر لیتے۔ علاوہ ازیں میاں قدرت اللہ لاہور شہر کے تمام گوجروں
کی شادی بیاہ کے موقع پر تنبول نویسی (نیوتہ وصول کرنا) کا کام بھی کیا کرتے تھے جس کے لئے
انہیں باقاعدہ کچھ رقم دی جاتی تھی۔ مولانا روحی کے آ جانے پر وہ مسجد کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ
ہو گئے اور پھر تن من دھن سے ان تین چار کاموں میں مشغول ہو گئے۔ وہ فطرتاً نہایت شریف
انسان تھے لیکن دینی تعلیم میں معمولی شد بد رکھتے تھے۔ چونکہ انہوں نے کئی ذمہ داریاں اپنے اوپر

New China Stationers, Lahore

عادت کر رکھی تھی اسلئے انہیں اتنا وقت ہی نہ ملتا تھا کہ وہ رات کو اپنی نیند پوری کر سکیں۔ صبح کی نماز کے بعد وہ تلاوت قرآن کرنے بیٹھتے لیکن کم خوابی کی وجہ سے وہ اونگھتے رہتے۔ ایک دن ایک نمازی نے انہیں قرآن مجید سامنے رکھے ہوئے اونگھتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ آپ سو رہے ہیں یا قرآن مجید پڑھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وقت نہیں ملتا اور میری نیند پوری نہیں ہوئی مگر اُن کا یہ معمول اسی طرح جاری رہا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں چلتے پھرتے ہی اپنی نیند پوری کر لیتا ہوں۔

مولانا روحی کے درس میں جو تعلیم یافتہ اصحاب شریک ہوتے تھے اُن میں مولانا غلام رسول مہر اور چوہدری محمد حسین (انچارج پبلک برانچ) کے علاوہ چوہدری فتح محمد بٹالوی بھی شامل تھے بعد میں کئی اور تعلیم یافتہ اصحاب بھی درس میں شامل ہوتے رہے۔ مولانا روحی اس فرمان رسول کا مجسم تھے: "مَن یرد اللّٰہ بہ خیرًا یفقہہ فی الدین" (المناوی ۲:۳۲۱) یعنی جس آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ اُس کو دین کی صحیح سمجھ دے دیتا ہے۔ ابتداء ہی سے انہیں شب خیزی کی عادت تھی اسلئے نماز عشاء کے بعد وہ جلد سو جاتے اور رات کے پچھلے حصّے میں بیدار ہو کر نماز تہجد ادا کیا کرتے تھے۔ اگر سردی کا موسم ہو تو اُن کی زوجہ محترمہ انہیں پانی گرم کر دیا کرتی تھیں۔ مولانا اپنی زوجہ کی اس خدمت کی بیحد قدر کرتے بلکہ وہ کئی دفعہ فرمایا کرتے کہ پانی گرم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اُن کی زوجہ محترمہ بالالتزام یہ خدمت بجا لاتی رہیں۔ وضو کرنے کے بعد مکان کی چھت پر قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا کے لئے ہاتھ بلند فرماتے اور نظر آسمان کی طرف رہتی۔ کئی منٹ تک دل ہی دل میں دعائیں پڑھتے رہتے۔ اُس کے بعد وتر کی نماز اور نوافل تہجّد ادا فرماتے۔ پھر مصلّی پر بیٹھ کر اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ رات کے سنّاٹے میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرتے اور بعض وقت اُن کے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے اور دل پر ایک رقّت طاری ہوتی وہ بڑی دیر تک عربی و فارسی اشعار جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور مناجات پر مشتمل ہوتے، پڑھتے۔ انہوں نے خود فارسی زبان میں کچھ مناجاتیں تیار کر رکھی تھیں، جن کا وہ روزانہ اسی وقت وظیفہ کیا کرتے اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز آتی اور آپ فجر کی سنتیں پڑھ کر مسجد میں تشریف لے جانے سے پہلے اپنے اہل خانہ کو نماز پڑھنے کے لئے جگاتے اور اس بارے میں وہ نہایت سختی سے کام لیتے۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیاء الحق صوفی کا بیان ہے کہ وہ ہمیں مسجد جانے سے پہلے جگا کر اپنا فریضہ ادا کرتے اور ہم

لوگ اُن کو دکھانے کے لئے اُٹھ کر بیٹھ جاتے لیکن جونہی وہ سیڑھیاں اتر جاتے تو ہم پھر چارپائی پر
دراز ہو کر اوپر کپڑا اوڑھ لیتے۔ لیکن بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ والد صاحب نماز باجماعت پڑھا دینے
کے بعد واپس تشریف لاتے تاکہ دیکھیں کہ ہم لوگ پھر تو نہیں سو گئے۔ اگر یہی سوا ہوا پاتے تو سخت
سرزنش فرماتے اور بعض دفعہ جوتے سے ہماری مرمت بھی کر دیتے۔ پھر آپ دوبارہ مسجد میں چلے جاتے۔

دورانِ تہجد اُن کی دردناک آواز میں شعر پڑھنے کی عادت روزانہ کا معمول
بن گئی تھی جس سے نہ صرف اہلِ خانہ بلکہ ہمسایوں کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ مسجد میں نماز پڑھانے کے بعد
درسِ قرآن کی مجلس شروع ہو جاتی جس میں اہلِ محلہ کو قال اللہ اور قال الرسول سے روشناس کراتے
درس کی مجلس کے بعد اپنے بچوں سے قرآن مجید کا سبق سنتے۔ اس کے بعد وہ اپنے اوراد و وظائف میں مشغول
رہتے حتیٰ کہ جب سورج کسی قدر بلند ہو جاتا تو نماز اشراق ادا فرماتے۔ اتنے میں کالج جانے کا وقت ہو جاتا
اور وہ تھوڑا بہت ناشتا کر کے پیدل کالج چلے جاتے۔ یہ کالج جیسا کہ بیان ہو چکا ہے شیرانوالہ دروازہ
میں تھا۔ بعد میں ریلوے روڈ پر ۱۹۰۵ء میں منتقل ہو گیا۔ دونوں جگہ پیدل آمدورفت کرنا ہی اُن کا
معمول رہا۔ اور اسی بہانے کچھ سیر بھی ہو جاتی۔ ریلوے روڈ پر کالج کے منتقل ہونے کے بعد اُس زمانے میں
گنج عالیے اور سرکلر روڈ کے درمیان پیدل چلنے والوں کے لئے ایک سڑک شہر کے ارد گرد بنا دی
گئی تھی جس پر تانگے یا کاریں وغیرہ نہیں چل سکتی تھیں بلکہ وہ صرف پیدل چلنے والوں کے لئے مخصوص
تھی۔ موچی دروازہ تک اسی سڑک کے رستے تشریف لے جاتے اور پھر سرکلر روڈ جسے جرنیلی
سڑک کہا جاتا تھا کے ذریعہ انجمن حمایت اسلام کے دفتر واقع ریلوے روڈ تک اسی سڑک پر چل کر
دفتر کے ساتھ ملحق رستے کے ذریعے جو کالج کی عمارت تک پہنچا دیتا تھا آپ چلے جاتے۔ ایک
عصا ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا جو ماشاء اللہ کافی وزنی تھا اور جس کے بارے میں آپ کے شاگرد
مولا بخش خضر تمیمی مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ ہماشما سے اٹھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سٹاف
روم میں پہنچ کر وہ عصا ایک کونے میں رکھ دیتے اور سٹاف روم میں درس کے لئے گھنٹی بجنے کا
انتظار فرماتے۔ گھنٹی ہو جانے پر آپ فوراً رجسٹر حاضری لے کر کلاس روم میں چلے جاتے۔ کمرے
میں داخل ہوتے ہی طلبہ کو السلام علیکم کہتے اور جو لڑکا عربی کے مضمون میں قابل ہوتا۔ اُس کو حکم دیتے
کہ تم ان کے نام پکارو اور ان کی حاضری لگاؤ۔ حاضری ختم ہونے کے بعد آپ کرسی پر تشریف

رکعت اور سبق پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔ اُن کی عادت تھی کہ باری باری تمام طالب علموں سے نصاب کی عبارت پڑھاتے اور اگر کوئی اعراب غلط پڑھتا تو اسکی درستی فرماتے۔ تمام عمر درسی کتابوں کو پڑھانے کے وقت کتاب کبھی سامنے نہ رکھی تھی۔ آپ پہلے کتاب کی عبارت کا لفظی ترجمہ سمجھاتے اُس کے بعد اُسکی تشریح اور تفصیل بیان کرتے۔ اگر کوئی تلمیح یا واقعہ وضاحت طلب ہوتا یا عربی زبان کا کوئی محاورہ آجاتا تو اسکو اچھی طرح واضح فرماتے۔ چونکہ آپ انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے اسلئے اگر پرنسپل صاحب کی طرف سے کوئی نوٹس آجاتا تو کسی طالب علم سے اُسے پڑھاتے اور نوٹس کے مطابق طالب علموں کو تعمیل کا حکم دیتے۔ انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی اداروں میں یہ ضروری تھا کہ دینیات کا مضمون ہر طالب علم پڑھے خواہ وہ آرٹس کا ہو یا سائنس کا اسلئے عربی کے علاوہ آپ کو دینیات کا مضمون بھی پڑھانا پڑتا تھا۔ آپ کی عادت یہ تھی کہ اہل سنت و جماعت کے صحیح عقائد کے مطابق لیکچر دیتے لیکن طلباء میں ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد موجود تھے۔ آپ کسی فرقہ کی حمایت یا مخالفت نہ فرماتے۔ ہاں اگر کوئی طالب علم اسلام کی کسی بات پر اعتراض کرتا تو آپ عقلی و نقلی دلائل سے کام لے کر اُس کے اعتراض کو رد فرمانے کی کوشش کرتے۔ تاہم اُس دور میں بریلوی اور دیوبندی مسلک کے لوگوں میں اس قدر وسیع خلیج حائل نہ تھی جیسا کہ آج دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض طلبہ محض تنگ کرنے اور وقت گزارنے کے لئے اوٹ پٹانگ اعتراض بھی کر دیتے تھے لیکن آپ نے کبھی غصے میں آکر کسی طالب علم کو اعتراض کرنے سے نہ روکا۔ درس کے ختم ہونے کی گھنٹی بجتی تو آپ پھر سٹاف روم میں واپس آجاتے اور اگر وہ پیریڈ خالی ہوتا اور یہ عموماً خالی ہی ہوتا تھا تو آپ کالج کی عمارت سے متصل مسجد میں تشریف لے جاتے اور چاشت کی نماز کے نوافل ادا فرماتے۔ وہاں سے فارغ ہو کر اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میاں فضل دین مرحوم (جو گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے والے پروفیسر عبدالقیوم کے والد بزرگوار تھے) کے پاس تشریف لے جاتے جو مبارک مسجد کی محراب کی طرف دکان کیا کرتے تھے۔ اُن سے آپ کا قدیم رابطہ تھا۔ حالانکہ وہ اہل حدیث مسلک کے آدمی تھے لیکن آج کل کے علماء کی طرح اُن میں تعصب نہیں تھا۔ مولانا روحی مرحوم چونکہ حقہ نوشی کے عادی تھے اور مولوی فضل دین صاحب بھی حقہ پیتے تھے اسلئے بھی اُن کے باہمی تعلقات دوستانہ تھے۔ پھر فارغ ہو کر سٹاف روم میں آجاتے اور کسی دوسرے درس کے وقت شروع

بچے کا انتظار فرماتے۔ جب کالج سے آپ فارغ ہو جاتے تو آپ اُسی رستے سے گھر واپس تشریف لے آتے۔ عموماً علم دوست طلبہ میں سے ایک دو ہمیشہ آپ کے ساتھ آتے جانے میں فخر محسوس کرتے اور اُن سے کئی علمی مسائل دریافت کرتے رہتے۔ ظہر کی نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے آپ گھر تشریف لے آتے اور کھانا تناول کر کے تھوڑی دیر کے لئے حقہ نوشی کی عادت پوری کرتے پھر اذان ہوتے ہی مسجد میں تشریف لے جاتے اور اقامت کے فوراً بعد الظہر ادا کر کے سنن و نوافل پڑھنے کے بعد گھر واپس تشریف لے آتے۔ ظہر کے بعد آپ اپنے مکان کی نچلی منزل میں تشریف رکھتے جہاں کوئی کرسی وغیرہ موجود نہ تھی بلکہ چٹائی اور اُس کے اوپر چادر وغیرہ بچھی ہوتی۔ ایک ڈیسک آپ کے سامنے پڑا رہتا تاکہ اُس پر کوئی کتاب یا کاغذ رکھی جا سکے۔ آپ کا کتب خانہ بھی اسی کمرے میں ہوتا۔ آپ چونکہ ماہوار رسالہ بھی شائع کیا کرتے اسلئے اُسکی جمع و ترتیب کی طرف متوجہ رہتے۔ کسی کتاب کی ضرورت پڑتی تو خود اُٹھ کر اس کو تلاش کرتے۔ اس اثنا میں اگر کوئی طالب علم یا احباب میں سے کوئی شخص ملاقات کے لئے آتا تو اُس سے مشغول گفتگو ہو جاتے۔ نماز عصر کی اذان ہونے پر مسجد میں تشریف لے جاتے۔ نماز کے بعد پھر گھر آ کر مغرب کی اذان تک تصنیف و تالیف کے کام میں لگے رہتے۔ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد صلاۃ الاوابین کے نوافل پڑھتے۔ جن کے ختم ہونے تک عشاء کی اذان ہو جاتی اس وقت نمازیوں میں سے کوئی نہ کوئی شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ اس کی عقل کے مطابق اُسے اسلام کے صحیح عقائد اور اعمال صالحہ کے بارے میں تلقین فرماتے۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد فارغ ہو کر پھر گھر تشریف لے آتے اور نوافل ادا کرتے۔ پھر شام کا کھانا کھا کر کچھ وقت حقہ نوشی کرتے اگر اُن کے کسی بچے نے کچھ پڑھنا ہوتا تو اس وقت پڑھا دیا کرتا۔ اس کے بعد آپ سو جاتے۔

سکول اور کالج کی تعلیم کے علاوہ آپ نے اپنے بچوں کو عربی اور فارسی کی کئی کتابیں پڑھائیں تاکہ اُن کی معلومات میں وسعت پیدا ہو۔ اپنے بچوں کو پڑھاتے وقت بہ قاعدہ تھا کہ عربی یا فارسی (جیسا موقع ہو) کی مستند لغات بچوں کو ساتھ رکھ لینے کی ہدایت فرماتے اور بعض عربی الفاظ جو سبق کے دوران آتے اُن کا معنی سمجھنے کے لئے وہ اُس بچے سے کہتے کہ وہ لغت دیکھ کر بتائے کہ اس کے کیا معنی لکھے ہیں۔ عربی لغت کی کتاب عموماً منتہی الارب کا استعمال آپ بہت فرماتے تھے جو چار (۴) جلدوں میں تھی۔ وہ آج بھی مولانا کے چھوڑے ہوئے کتب خانہ میں

موجود ہے۔ عربی الفاظ کی تلاش میں بچوں کو تکلیف پیش آتی تھی کیونکہ عربی کی لغت مادہ کے معلوم ہونے پر
کام دے سکتی ہے۔ عام معمولی فارسی یا انگریزی کتب لغات کی طرح نہیں۔ اُس وقت تکلیف زیادہ ہوتی
تھی جب کسی عربی مادے میں واؤ یا ی آجاتی کیونکہ بچوں میں واؤ اور ی کی صورت میں صحیح مادہ کا معلوم
کرنا آسان کام نہیں۔ اگر بچہ لفظ کی تلاش میں دیر لگاتا تو اس سے آپ پوچھتے کس مادے کے تحت دیکھ
رہے ہو اور عموماً بچہ غلط جواب دیتا۔ آپ ابتداء میں تو اُسکی تصحیح کر دیتے لیکن چند روزہ مشق کے
بعد اگر بچہ غلطی کرتا تو اُس پر ترشروئی کرتے اور سرزنش فرماتے۔ بچوں کو سبق پڑھا دینے کے بعد
آپ قیلولہ کر کے سو جاتے۔ سونے کے لئے آپ کی چارپائی شمالاً جنوباً ہوتی تاکہ داہنی کروٹ لینے سے
چہرہ قبلہ کی جانب رہے۔

سونے کے وقت آپ کا دستور تھا کہ ہرڑ کا مربّہ اور کچھ بادام تناول فرماتے جو آپ
کی زوجہ محترمہ یا کوئی بچہ تیار رکھتا۔ یہ معمولات اُس وقت تک جاری رہے جب تک ملازمت ختم ہوئی
اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ایک آنکھ کے ضائع ہو جانے کے بعد زیادہ بوجھ پڑا اور بصارت میں کچھ فرق
آنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوشت و خواند اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اوپر بیان کئے
گئے روزمرہ کے معمولات میں کچھ تبدیلی آگئی اور وہ یہ کہ اب عصر کے بعد گھر تشریف نہ لاتے۔ بلکہ مغرب
اور عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں ہی تشریف فرما رہتے۔ اُس وقت اگر کوئی طالب
علم کچھ پڑھنے کے لئے آجاتا تو آپ اُسے پڑھاتے یا آپ کے معتقدین میں سے کوئی شخص مسئلہ
پوچھتا تو اُس کو اسلام کے مطابق راہنمائی فرماتے اور اگر آپ اکیلے بیٹھے ہوتے تو اپنے اوراد و
وظائف میں مشغول رہتے۔ آپ کے پاس ایک تسبیح ہر وقت موجود رہتی تھی۔ جس پر صبح و
شام آپ اللہ کا ذکر کرتے رہتے۔ مسجد میں تشریف رکھنے کے اوقات میں اگر کوئی شخص (خواہ
کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو) ملاقات کے لئے آجاتا تو اہل خانہ انہیں مسجد میں ہی تشریف لے جانے
کی فرمائش کرتے اور اُسے وہیں حاضر ہو کر اپنا مقصد بیان کرنا پڑتا تھا۔ کسی کی خاطر مسجد سے
اُٹھ کر گھر پر آنا گوارا نہ تھا۔

زہد و تقویٰ

تقویٰ مادہ و ق ی سے ماخوذ ہے جس کے معنی بچنا، ڈرنا، احتیاط اور پرہیز کرنا وغیرہ بتائے جاتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ وقایۃ سے مراد ہے "حفظ الشیٔ مما یؤذیہ ویضرہ" یعنی کسی چیز کی اس چیز سے حفاظت کرنا جو اسکو ایذا یا نقصان پہنچائے۔

شرعی اصطلاح میں یہ اس جذبے کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا اور رسول کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی رغبت اور اسکی مخالفت سے سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ تقویٰ کے پابند ہوتے ہیں وہ خدا اور رسول کی خوشنودی کے لئے سخت سے سخت مصیبت بھی برداشت کرتے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحب تقویٰ شخص کو مصیبتوں اور بلاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسے نہ صرف حرام بلکہ مشتبہ چیزیں بھی چھوڑنی پڑتی ہیں لیکن صاحب تقویٰ لوگ یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں تاکہ آخرت میں بارگاہ ایزدی سے وہ اجر پانے کے مستحق ہوں اسی لئے تو قرآن مجید میں آیا ہے: "والآخرۃ عند ربك للمتقین" (۴۳ : ۳۵)

مولانا روحی علیہ الرحمۃ کی زندگی میں ایسے کئی مواقع پیش آئے جن میں وہ کئی قسم کے دنیاوی فائدے اٹھا سکتے تھے لیکن انہوں نے ان سب کو لات مار دی اور ذات باری اور اسکے پیغمبر کے احکام سے حتی الوسع تجاوز کرنے کو جائز نہ سمجھا۔ ذیل میں چند ایک ایسے واقعات مختصراً بیان کئے جاتے ہیں:

1 ۔ مولانا مرحوم کے مکان کے قریب بھاٹی دروازے کے اندر نور محلہ ایک مشہور کوچہ ہے۔ اس محلہ میں مولانا کے ایک ارادت مند شیخ محمد کریم بخش مرحوم کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ محکمہ پولیس میں عرصہ تک سب انسپکٹر رہ کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے شیخ علی ہجویری کے مزار کے عقب میں ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اس مکان میں منتقل ہونے سے پہلے فال نیک کے طور پر اس کا افتتاح اپنے استاد گرامی سے کرائیں۔ جب مکان زیر تعمیر تھا تو وہ مغرب کی نماز کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب مکان مکمل ہو گیا تو انہوں نے ایک پر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا اور نماز مغرب کے بعد وہ کار لے کر مولانا مرحوم کی خدمت میں آئے اور تشریف لے چلنے کی عرض کی۔ مولانا کو چونکہ انکے پروگرام کا علم ہو چکا تھا اسلئے اس شام وہ خلاف معمول نماز مغرب پڑھانے کے بعد

فوراً گھر تشریف لے آئے اور نوافل گھر پر ادا کئے۔ جب کریم بخش صاحب مسجد میں پہنچے تو مولانا کو موجود نہ
پا کر متفکر ہو گئے۔ مقتدیوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ گھر تشریف لے گئے ہیں۔ مولانا کا گھر بھی
چونکہ مسجد کے قریب ہی تھا اسلئے وہ وہاں آگئے اور دروازے پر دستک دیتے رہے۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے
مولوی فضل حق مرحوم کو جب کریم بخش صاحب کے آنے کا علم ہوا تو وہ بالائی منزل سے نیچے آکر ان سے
ملے۔ کریم بخش صاحب نے پہلے تو مولانا کی خیریت دریافت کی اور پھر اپنے آنے کا مطلب اور غرض بیان کی۔
صاحبزادے صاحب نے آکر مولانا مرحوم کو صورت حال سے مطلع کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ یہ شخص ساری عمر پولیس میں
ملازم رہا ہے۔ خدا جانے اس کی آمدنی کیسی ہے۔ میں تو اس کی ضیافت میں حاضر نہیں ہو سکوں گا۔
بہتر یہ ہے کہ تم اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ لے جاؤ تاکہ وہ خوش ہو جائے کیونکہ وہ بڑی محنت سے میرے
پیچھے پڑا تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی نہ گیا تو خواہ مخواہ اسکی دل شکنی ہوگی اور اُس کی دعوت کا مقصد فوت
ہو جائے گا۔ ویسے بھی یہ بات اخلاقاً مناسب نہیں۔ مولوی فضل حق مرحوم کہنے لگے کہ آپ کا خیال ٹھیک ہے
لیکن آپ جس کھانے کو مشتبہ سمجھ کر اُس سے گریز کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے بھی کیسے جائز ہو سکتا ہے۔
اسکے علاوہ چونکہ یہ ضیافت تو آپ ہی کے اعزاز میں دی جا رہی ہے۔ صرف ہم بچوں کی حاضری سے اسکی
دیرینہ خواہش کیونکر پوری ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ بات معقول تھی اسلئے تھوڑی دیر خاموش رہ کر
فرمانے لگے اچھا تو کوئی مناسب عذر اُسکے سامنے پیش کر دو۔ ابھی باپ اور بیٹا اسی ادھیڑ بن
میں تھے کہ کریم بخش صاحب جو ایک گھڑی پریشانی میں گزار رہے تھے بلند آواز سے فضل حق صاحب کو
پکارنے لگے۔ وہ دنیاوی طور پر بڑے سمجھدار اور کامیاب پولیس افسر رہ چکے تھے وہ تاڑ گئے اور
معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ مولوی فضل حق صاحب نے نیچے آکر والد صاحب مرحوم کی ناسازیٔ
طبع کا عذر پیش کیا تو وہ اس عذر کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور کہا بیٹا میں اصل وجہ خوب
سمجھتا ہوں۔ میں چونکہ پولیس کے محکمے سے وابستہ رہا ہوں اسلئے مولانا میری آمدنی کو مشکوک
خیال کرتے ہیں۔ لیکن میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس ضیافت پر خرچ آنے والی تمام رقم میں نے اپنی
جائز کمائی یعنی حکومت کی طرف سے ملنے والی گریجوٹی کی رقم سے حاصل کی ہے۔

کافی دیر تک وہ اسی بات کو بار بار پیش کرتے رہے۔ آخر نہایت افسردگی میں یہ
کہہ کر چلے گئے کہ اب میں انہیں زبردستی لے جانے سے تو رہا۔ مولوی فضل حق صاحب مرحوم نے اوپر

آکر پورا ماجرا مولانا کے گوش گزار کر دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کریم بخش صاحب پھر آ گئے اب
اُن کے ساتھ تین ملازمین نے اپنے سروں پر چاولوں کے طباق اور سالن کے دیگچے وغیرہ اٹھا رکھے
تھے۔ وہ زبردستی یہ تمام اشیاء مکان کی ڈیوڑھی میں پٹخ کر چلے گئے۔

۳۔ اُن کے صاحبزادہ رانا بہادر الحق بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں میں بی۔ اے کا طالب
علم تھا تو مجھے پولیس میں ملازمت کرنے کا شوق چرایا۔ اتفاق سے انہی دنوں اخبار میں اسسٹنٹ
سب انسپکٹر کی گیارہ اسامیاں کے خالی ہونے کا اشتہار شائع ہوا۔ مجھے چونکہ والد صاحب مرحوم کے
متعلق پتہ تھا کہ وہ محکمہ پولیس کی ملازمت کے خلاف ہیں اسلئے میں نے اُن سے مشورہ کئے بغیر اپنی
درخواست بھجوا دی۔ جس کے لئے مجھے کئی مشکلات کا سامنا پیش آیا اور بڑی دوڑ دھوپ کے بعد درخواست
بھیجنے کی تمام شرطیں پوری کرنی پڑیں اور بھی کئی بے شمار درخواستیں ارباب حل و عقد کے پاس پہنچ چکی تھیں
ان اسامیوں کے لئے لاہور ڈویژن کے پانچ اضلاع یعنی لاہور، امرتسر، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور
سیالکوٹ سے سینکڑوں امیدواروں نے درخواستیں بھیج دیں۔ امیدواروں کا انتخاب کرنے کے لئے جو
کمیٹی تشکیل دی گئی وہ تین ممبروں پر مشتمل تھی۔ جن میں سے دو تو ایس پی تھے یعنی ایک ہندو
دوسرا سکھ اور تیسرا ممبر اس کمیٹی کا چیئرمین مسٹر سکاٹ نامی ایک انگریز تھا جو لاہور کا ڈی آئی
جی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سفارش کے بغیر یہاں دال نہیں گل سکتی۔ میں ایک معمولی نوجوان ایسی سفارش
کہاں سے لاتا۔ آخر سوچ سوچ کر والد صاحب مرحوم کے شاگرد چوہدری محمد حسین ایم۔ اے سے
مدد لینے کا فیصلہ کیا جو میری ابتدائی تعلیم کے زمانے میں میرے اتالیق رہ چکے تھے۔ وہ اُن دنوں لاہور
میں بطور ایس پی متعین تھے۔ ڈی آئی جی یعنی مسٹر سکاٹ کے ساتھ اُن کے گہرے روابط تھے
میں اُن سے ملا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا اس سلسلے
میں تم نے اپنے والد صاحب سے رضامندی حاصل کر لی ہے۔ میں نے جھوٹ بولتے ہوئے اثبات میں جواب دیا
اس پر انہوں نے مدد کرنے کا وعدہ کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں آج شام تمہارے ہاں آؤں گا اگر
تمہارے والد بزرگوار نے اجازت دی تو میں سکاٹ صاحب سے تمہاری سفارش بھی کروں گا۔ یہ بات سُن
کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ والد بزرگوار کو تو اس بات کا بالکل علم ہی نہ تھا۔ دوسرے مجھے
یہ بھی یقین تھا کہ وہ کسی طرح بھی میرے اس محکمہ میں ملازمت کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے چنانچہ

ایسا بھی ہوا۔

اُس دن والد صاحب مرحوم نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر آ رہے تھے کہ چوہدری محمد حسین مرحوم بھی حسبِ معمول پہنچ گئے۔ وہیں گلی میں کھڑے کھڑے علیک سلیک کے بعد انہوں نے والد صاحب سے میری بابت پوچھا کہ آپ نے برخوردار کو اس کے متعلق یعنی محکمہ پولیس میں ملازمت کی اجازت دے دی ہے۔ چونکہ والد صاحب اس سے مطلقاً بے خبر تھے اسلئے پہلے تو وہ بات ہی کو نہ سمجھ سکے۔ پھر جب چوہدری محمد حسین نے بات کی وضاحت کی تو بڑے تلخ لہجے میں فرمایا کہ میرے نزدیک تو ایسی آمدنی مجرم ہونے کی نسبت اگر یہ گھاس گٹھا لے کر در بدر گھوما کرے اپنے پیٹ کی آگ بجھا لے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ یہ کہہ کر والد مرحوم مکان کے اندر تشریف لے گئے اور چوہدری صاحب بھی اپنے گھر چلے گئے اور میں ششدر ٹھٹکا دیر تک وہاں کھڑا رہا۔

۳۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الحق بیان کرتے ہیں کہ جب ۱۹۳۱ء میں میں نے امتحان بی۔اے میں کامیابی حاصل کی تو اپنے کئی ہم جماعت طلبہ کے کہنے سننے پر قانونی یعنی لاء کی تعلیم حاصل کرنے یعنی ایل ایل بی کی کلاس میں داخلہ لینے کا پروگرام بنایا جس کا ذکر میں نے والد صاحب مرحوم سے کیا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ آج تک میں نے اپنے اہل خانہ کو حرام لقمے سے بچایا ہے لیکن اگر تم حرام کی روزی کھانا پسند کرتے ہو تو کرتے پھرو۔ میں تو اسکی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ سُن کر میرے لئے سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا۔

۴۔ موجودہ دور کے بعض بڑے بڑے مذہبی علماء نے کیمرے سے فوٹو اتروانا جائز قرار دے رکھا تھا بلکہ بعض اُن میں سے ایسے بھی ہیں کہ اگر دورانِ تقریر اُن کا فوٹو نہ اتارا جائے تو وہ بُرا مانتے ہیں۔ اخبارات میں تقریباً تمام علماء کی فوٹو دیکھنے میں آتے ہیں اور اُن کی تصویریں ملکی اور غیر ملکی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن مولانا روحی مرحوم نے تمام عمر تصویر نہیں اتروائی حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مجالس میں شرکت کی اور علمی و ادبی اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ کالج میں بھی اُن کے چالیس سالہ دورِ ملازمت میں ہزاروں مواقع فوٹو اتروانے کے آئے لیکن وہ ہمیشہ اُن سے مجتنب رہے۔ عموماً وہ ایسی مجالس میں حاضر ہی نہیں ہوتے تھے۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے حبیبیہ ہال میں اب بھی قدیم اساتذہ کے گروپ

فوٹو ہال کی دیواروں پر آویزاں ہیں۔ کالج کے میگزین کریسنٹ کے پرانے شماروں میں بھی سٹاف کی کئی فوٹو دیکھی جا سکتی ہیں لیکن مولانا روحی کا فوٹو کہیں بھی آپ نشان دہی نہیں کر سکیں گے۔

ایک دفعہ جب کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا اول تو میرا عقیدہ ہے کہ فوٹو اتروانا شرعاً حرام ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم مشتبہ ضرور ہے۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مشتبہ چیزوں سے گریز کرے چنانچہ صحیحین کی اس حدیث سے میری رائے کی تائید ہوتی ہے:

"فمن اتقی الشبہات فقد استبرأ لعرضہ ودینہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام" (المناوی ۱: ۲۶۱)

۵۔ صحت اور بیماری انسانی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور اس سے کوئی فرد بشر خالی نہیں۔ مولانا روحی متعدد بار بیمار ہوئے اور بعض وقت تو جان کے لالے تک پڑ گئے لیکن اُن کے اہل خانہ اور اہل محلہ کے بیان کے مطابق انہوں نے انگریزی ادویہ کا استعمال کبھی نہ کیا۔ اگر اہل خانہ میں سے کوئی شخص شدت مرض سے گھبرا کر اُن کی اجازت کے بغیر کسی ڈاکٹر کو بلا بھی لایا تو وہ فقط مرض کی تشخیص کرانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ چونکہ وہ یونانی طریق علاج کے بارے میں خود کافی معلومات رکھتے تھے اس لئے عموماً وہ اپنے لئے دیسی ادویہ خود ہی تجویز فرما لیتے یا کسی یونانی طبیب سے مشورہ لے کر اُسکی دوائی استعمال میں لاتے۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ اُن کے تلامذہ میں سے بہت سے لوگ انگریزی ادویہ کے ڈاکٹر تھے اور انہوں نے مولانا کو بتا رکھا تھا کہ ہر انگریزی دوائی کا ایک ضروری جزو الکحل بھی ہے ممکن ہے یہ خیال سو فیصد حقیقت پر مبنی نہ ہو لیکن وہ اسے مشتبہ سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ اہل خانہ اُن سے کہتے کہ قرآن مجید میں یہ ذکر بھی آیا ہے: فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ (۲: ۱۷۳) لیکن وہ اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ یہ عادت بھی اُن کے تقویٰ کا نتیجہ تھی۔

۶۔ یہ بات اوپر بیان کی جا چکی ہے کہ وہ نیا کپڑا سیئے جانے کے بعد دھلائے بغیر نہیں پہنتے تھے۔ اسکے علاوہ اُن کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ دھوبی سے دھلائے گئے کپڑے پہننے سے پہلے دوبارہ دھلاتے اور فرماتے کہ دھوبی یا لانڈری کا دھلا ہوا کپڑا صاف تو ہو جاتا ہے لیکن اس کا پاک ہونا یقینی نہیں کیونکہ غیر مسلم یا بے نماز مسلمان جو طہارت اور نجاست کے مسائل سے آشنا نہیں ہوتے اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کپڑے کیسے پانی سے دھوئے ہیں اور

خشک کرنے کے لئے کسی جگہ پر پھیلائے ہیں اسلئے ایسے دھلے ہوئے کپڑوں سے نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ کسی زمانے میں ایک دھوبی جو صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا گھر آ کر میلے کپڑے لے جایا کرتا تھا لیکن وہ کسی اور جگہ چلا گیا تو آپ نے اپنی رشریکۂ حیات کے ذمے یہ کام لگا دیا۔ جسے انہوں نے آخر دم تک نباہا چنانچہ وہ گھر پر دھلائے گئے کپڑوں میں نماز ادا فرماتے اور استری تک کرانے کے بھی روادار نہیں تھے۔

۷۔ ملازمت کے دوران اسلامیہ کالج لاہور میں متعدد پرنسپل صاحبان آئے اور گئے جن میں مسٹر عبداللہ یوسف علی ایک مشہور آئی سی ایس افسر تھے۔ وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل بن کر آئے۔ وہ نہایت جابر قسم کے آدمی تھے اور نظم و ضبط کے معاملے میں اُن کی سختی ضرب المثل تھی کیونکہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ میں گزار چکے تھے۔ اسلئے فرنگی تہذیب کے بہت دلدادہ اور مغربی آداب معاشرت کے شیدائی تھے۔ ہر اتوار کے دن کالج میں تعلیم شروع ہونے سے پہلے SERMON یعنی وعظ کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری تھا جس میں تمام طلبہ اور اساتذہ کی حاضری لازمی تھی۔ اس مجلس میں جو کالج کے ہال میں منعقد ہوتی صدارت کے فرائض پرنسپل صاحب خود انجام دیتے تھے اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ایک اتوار مولانا روحی اور دوسرے اتوار کو اُن کے رفیق کار مولانا محمد عمر خان ٹونکی وعظ کہا کرتے تھے۔ پرنسپل صاحب نے حکم دے رکھا تھا کہ مجلس کے اختتام پر سب حاضرین ننگے سر کھڑے ہو کر سر جھکائے اور بازو نیچے لٹکائے کھڑے رہیں۔ پھر پرنسپل صاحب انگریزی زبان میں کچھ دعائیہ کلمات بولتے تھے۔ تمام اساتذہ اور طلبہ سختی سے اس تاکیدی حکم پر عمل کرتے تھے مگر صرف مولانا روحی ایک واحد شخص تھے جو کرسی پر بیٹھے رہتے اور اسلامی طریقے کے مطابق ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے۔ مولانا کی اس روش پر ایک دو بار پرنسپل صاحب نے اعتراض بھی کیا مگر مولانا نے یہ کہہ کر پرنسپل کی زبان بندی کر دی کہ میرے نزدیک مذہب کے احکام کی پابندی کالج کے قواعد و ضوابط کی پابندی سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے بعد پرنسپل صاحب نے کبھی اُن سے تعرض نہ کیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ بشیر احمد شبلی (سابق ہیڈ ماسٹر چشتیہ ہائی سکول لاہور) نے بیان کیا ہے۔

اسلامیہ کالج کا پرنسپل سخت اور جابر انسان تھا جس کا نام مسٹر عبداللہ یوسف علی تھا اور آئی۔ سی۔ ایس ریٹائرڈ تھا اور بالکل انگریز نما افسر ٹائپ آدمی تھا۔ اُس کے سامنے کسی کو مجال تاب نہیں تھی۔ مگر حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ نظر بے تحقیق ہم علماء کو کس میٹر اور معیار سے ناپتا ہے ہمارے پرکھنے کی اس کے پاس کیا کسوٹی ہے غرضیکہ ایسے جابر انسان کے سامنے بھی آپ بلا جھجک گفتگو فرماتے بلکہ وہ خود آپ سے مرعوب رہتا۔

اُسکے جبر و استبداد کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ایک منسٹر پروفیسر پاس بیٹھے تھے اُن کا ٹیلیفون آیا۔ پرنسپل صاحب نے ریسیور (Receiver) اٹھا کر کہا:

"It is Principal's office."

اور ریسیور رکھ دیا۔ دوبارہ گھنٹی ہوئی۔ پھر پرنسپل صاحب نے یہی جواب دیا۔ تیری مرتبہ کہا:

"I have already told you that this is Principal's office. I would not allow anybody to use my telephone."

۸۔ مولانا کے وطن کُھوڑا (ضلع گجرات) میں کچھ زرعی زمین اُن کی ملکیت تھی جس میں سے کچھ تو آپ کی زر خرید تھی۔ یہ زمین مزارعین کو کاشت کے لئے آپ نے دے رکھی تھی۔ مزارعین دیانت داری سے کام نہیں لیتے تھے اور زمین کی پیداوار میں کئی قسم کا خورد برد کرتے رہتے تھے۔ اُن کے صاحبزادہ رانا بہاء الحق نے مزارعین کے طرزِ عمل سے تنگ آ کر ایک سال اپنے والد بزرگوار سے مشورہ کئے بغیر یہ زمین بٹائی کی بجائے ٹھیکے پر کاشت کے لئے دے دی۔ اتفاقاً اُس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے پیداوار کم ہوئی۔ مزارعین نے بڑی مشکل سے ٹھیکے کی طے کردہ رقم کے مطابق غلّہ کی پیداوار پوری کر کے رانا بہاء الحق کے حوالے کر دی۔ رانا صاحب کا بیان ہے کہ جب میں گندم کی بوریاں گدھوں پر لدوا کر گھر لایا تو سب سے پہلا سوال جو والد مرحوم نے مجھ سے کیا یہ تھا کہ ٹھیکہ ادا کرنے کے بعد مزارعین کے پاس کتنا غلّہ باقی بچا۔ جب انہیں حقیقتِ حال بتائی گئی تو سخت مضطرب ہوئے اور فرمایا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر بٹائی کی بجائے زمین ٹھیکے پر کیوں دی اور سخت ناراض ہوئے اور مجھ سے کہا کہ نصف غلّہ ابھی جا کر مزارعین کے حوالے کرو۔ وہ غریب سارا سال کہاں سے کھائیں گے۔ یہ تو بہت بڑا

ظلم ہے اسکے بعد ہمیشہ کے لئے آپ نے یہ ہدایت فرمائی کہ آئندہ زمین کاشت کے لئے ٹھیکے پر ہرگز نہ دی جائے بلکہ بٹائی پر دی جائے خواہ اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو ۔

٩ ۔ مولانا کا وطن لکھال جی ٹی روڈ کے بالکل کنارے پر واقع ہے اور اس کا اپنا ریلوے سٹیشن ہے ۔ ریلوے سٹیشن کے بالمقابل مولانا مرحوم کی ملکیتی کچھ زمین موجود ہے اسی زمین کے ایک حصے میں انہوں نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی جس کا نام مسجد نور رکھا تھا ۔ جن دنوں یہ مسجد تعمیر ہو رہی تھی اسکے اخراجات کا حساب کتاب رکھنا اُن کے صاحبزادہ ڈاکٹر ضیاء الحق رانا کے ذمے تھا ۔ ایک دفعہ جب بھٹے والا اینٹیں لایا تو رانا صاحب نے اُن کو گنا تو پانچ اینٹیں زیادہ تھیں جنکی قیمت اُس زمانے کے مطابق بمشکل چار پانچ آنے بنتی تھی ۔ مولانا مرحوم نے رانا ضیاء الحق سے پوچھا کہ کیا اینٹیں پوری تھیں تو انہیں بتایا گیا کہ پانچ اینٹیں زیادہ تھیں ۔ بھٹے والا جب اگلی دفعہ پھر اینٹیں لے کر آیا تو مولانا نے اس سے فرمایا کہ پچھلی دفعہ تم جو اینٹیں لائے تھے اُن میں پانچ اینٹیں زیادہ تھیں اسلئے ان کی قیمت وصول کر لو ۔ بھٹے والا یہ سُن کر ہنس پڑا اور کہا کوئی بات نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن مولانا بضد تھے کہ یا اپنی اینٹیں لے جاؤ یا قیمت وصول کرو ۔ بھٹے والا بار بار یہی کہتا رہا کوئی بات نہیں لیکن آپ نے کہا یا قیمت لے لو یا یہی کہو کہ میں فی سبیل اللہ ان پانچ اینٹوں کی قیمت سے دستبردار ہوتا ہوں ۔ آخر بھٹے والے کو یہ الفاظ کہنے پڑے ۔

١٠ ۔ ڈاکٹر ضیاء الحق صوفی کا بیان ہے کہ جب آپ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ملازمت کی تمام مدت میں جو جی پی فنڈ انجمن حمایت اسلام والے ہر ماہ تنخواہ سے کاٹ لیا کرتے تھے انجمن نے واپس دینا چاہا ۔ دستور یہ تھا کہ ہر ملازم کے جی پی فنڈ کا حساب بینک میں جمع ہوتا رہتا اور اُس ملازم کے نام پر ایک پاس بک بنائی جاتی تھی جس میں ہر مہینے کاٹی جانے والی رقم کا اندراج ہوتا رہتا تھا ۔ یہ پاس بک انجمن کی تحویل ہی میں رہتی تھی ۔ ظاہر ہے کہ بینک جمع شدہ جی پی فنڈ پر ہر سال میں دو دفعہ سود کا حساب بھی جمع کر دیا کرتا تھا ۔ جب آپ کے نام کی پاس بک دی گئی تاکہ آپ اُس کے مطابق بینک سے رقم وصول کر لیں تو مجھے یاد ہے کہ اُس زمانے میں تمام ملازمین کے جی پی فنڈ کا حساب سنٹرل کو اپریٹو بینک میں جمع تھا ۔ والد صاحب مرحوم نے مجھے وہ پاس بک دے کر فرمایا کہ پتہ یہ لگاؤ کہ اس میں میری اصل رقم جو ہر ماہ جمع ہوتی رہی ہے وہ کیا ہے اور کتنی ہے اور اتنی

سالوں کا جو سود جمع ہوا ہے اسکی رقم کتنی ہے جب میں نے اُس پاس بک کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہر چھ ماہ کے بعد سود کی رقم جمع کر دی گئی تھی ۔ میں نے تمام سود کی جمع شدہ رقم کو یکجا جمع کر کے بتایا کہ کاپی کے حساب سے اسکی مقدار اتنی بنتی ہے ۔ اس بینک میں آپ کا ایک ارادتمند بھی ملازم تھا ۔ والد صاحب نے فرمایا کہ اُس کے پاس جا کر پوچھو کیونکہ تمہیں سمجھ نہیں آسکتے ۔ اندازاً حساب کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں ۔ ملازمین کا چونکہ روزمرہ کا کام ہے اسلئے اسکا بیان صحیح ہوگا ۔ میں وہ پاس بک لے کر آپکے ارادتمند کے پاس گیا ۔ اُس نے کہا پاس بک چھوڑ جاؤ اور میں کل تک حساب بنا کر رکھوں گا ۔ اگلے روز میرے جانے پر اُس نے حساب بنا کر رکھا تھا ۔ انجمن کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر ملازم نے جتنا جی پی فنڈ جمع کرایا ہو اتنی ہی رقم وہ اپنے پاس سے عطیہ کے طور پر ملازم کو دیا کرتے تھے ۔ بینک کا سود اسکے علاوہ بنا کرتا تھا ۔ اُس شخص نے تینوں رقمیں علیحدہ علیحدہ کر رکھی تھیں ۔ میں نے والد صاحب کے پاس آکر صورتحال سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ میری جمع شدہ رقم اور انجمن کے عطیہ کی رقم کا جو مجموعہ بنتا ہے وہ تو بینک سے نکلوا لاؤ لیکن سود کی رقم ابھی وہیں جمع رہنے دو چنانچہ میں نے آپ سے چیک پر دستخط کروا کر سود کی رقم چھوڑ کر باقی تمام رقم بینک سے نکلوا لی اور لا کر آپ کے حوالے کر دی ۔ سود کی رقم کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میں اُسے گھر میں نہیں لانا چاہتا بلکہ وقتاً فوقتاً جو محتاج اور قابل امداد لوگ آئیں گے اُن کو دینے کے لئے اسے وہیں جمع رہنے دو ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔

میں جب ضرورت ہوتی آپ سے چیک پر دستخط کروا کر اتنی رقم بینک سے نکلوا لاتا اور سوالی کی مدد کر دی جاتی حتیٰ کہ یہ تمام رقم خرچ ہو گئی ۔

مقصد یہ ہے کہ آپ ہر قسم کے سود کو خواہ وہ کسی ایک فرد سے وصول کیا جائے یا کسی ادارے یا کمپنی سے ، حرام مطلق خیال کرتے تھے ۔ اُس زمانے میں چونکہ انگریزوں کی سلطنت تھی اور آپ کو بتایا گیا تھا کہ اگر بینک سے سود وصول نہ کیا جائے تو عیسائی قوم اُس رقم کو اپنے مذہب کی اشاعت پر صرف کر دیتے ہیں ۔ اسلئے آپ کا خیال تھا کہ بینک سے تو سود وصول کر لینا چاہیئے لیکن اُسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کی اجازت نہیں بلکہ وہ کسی مناسب ضرورت کے پیش آنے پر خرچ کیا جا سکتا ہے مثلاً کسی شخص پر خواہ مخواہ کا تاوان یا ایسا ٹیکس عائد کر دیا جائے جس میں اسلام کی اجازت نہیں یا کسی بیوہ عورت کو جو صاحب نصاب نہ ہو امداد کے طور پر یا کسی

نوجوان لڑکی کی شادی کے موقع پر بشرطیکہ اُسکے ورثاء غریب اور قابلِ امداد ہوں یا کسی لاوارث میت کے کفن دفن پر خرچ کیا جا سکتا ہے

اس سلسلے میں مولانا روحی کے استاد مفتی محمد عبداللہ ٹونکیؒ نے ایک انجمن جس کا نام "مستشار العلماء" تھا قائم کر رکھی تھی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ باضابطہ طور پر ایک مستقل ادارہ موجود ہونا چاہیئے جس میں ہر مسلک کے خیال کے لوگ شامل ہوں اور متفقہ طور پر لوگوں کے دینی مسائل کے حل کرنے کے لئے فتووں کی شکل میں فیصلہ دیا کریں۔ ورنہ تمام علماء یکساں نہیں۔ کوئی مولوی صاحب کچھ فتویٰ دے دیتے ہیں اور دوسرے مولوی صاحب اُس کے بالکل برخلاف فتویٰ لکھ دیتے ہیں۔ اسطرح مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے اسلئے فتویٰ دینے کیلئے ایک مستند ادارہ ہونا چاہیئے جس کو سب مانتے ہوں۔

چوہدری فتح محمد جالندھری مرحوم کا بیان ہے کہ مفتی عبداللہ ٹونکی صاحب بینک سے سود لے لینے کو جائز قرار دیتے تھے لیکن اُن کے شاگرد مولانا اصغر علی روحی اسکے برخلاف ہر قسم کے سود کو یکساں حرام سمجھتے تھے اور اپنے استاد کی مخالفت کی انہیں پرواہ نہیں تھی کیونکہ اُن کا معاملہ خدا کیساتھ تھا جناب فتح محمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ۔

قبلہ روحیؒ کے استاد جناب عبداللہؒ ٹونکیؒ نے بینکوں کے سود کے متعلق جواز کا فتویٰ دیا تھا مگر حضرت روحی کو اس سے اختلاف تھا۔ صاحب عزیمت اور دین میں متصلب اور پختہ واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے استاد کے فتویٰ کے خلاف رائے قائم کی اور اسی پر آخری عمر تک قائم رہے۔ کوئی وقتی مصلحت ان کی اس رائے کو بدل اور عقیدہ کو متزلزل نہ کر سکی۔ حضرت روحیؒ کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ "الہدیٰ" میں اس مسئلہ پر سیر حاصل مواد موجود اور تفصیلات درج ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر محمد صوفی کا بیان ہے کہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے آپ نے اپنے کتب خانہ کی فہرست تیار کرائی اور جو کتابیں مطالعہ کیلئے آپ نے مختلف لوگوں سے لے رکھی تھیں وہ سب مالکوں تک پہنچا دیں۔ ایک کتاب یعنی ابن اسحاق کی سیرۃ النبی (انگریزی) آپ کے ایک شاگرد نے آپ کے پڑھنے کے لئے پنجاب پبلک لائبریری سے نکلوا رکھی تھی اور آپ کا وہ شاگرد وفات پا چکا تھا اس لئے آپ نے مجھے حکم دیا کہ یہ کتاب لائبریرین صاحب کو دے آؤں [illegible] کتاب لائبریری میں جمع کرا کر رسید لے آیا تاکہ [illegible] صاحب کو اطمینان ہو

مولانا کی زندگی کا روحانی پہلو

ایک حدیث قدسی مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
میرا بندہ نفل عبادت و ریاضت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ میں اسکے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اسکی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اسکی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔

اسی بنا پر مولانا روم نے یوں کہا ہے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مولانا روم کی اجتماعی زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ آپ فرائضِ شرعیہ کو سختی کے ساتھ ادا کرنے کے باوجود اپنی مرضی سے ہر قسم کی عبادت و ریاضت پر عامل تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ نہ صرف شریعت کے بہت بڑے عالم تھے بلکہ آپ کی روحانی زندگی کا پہلو بھی آپ کے ہر کام میں جلوہ نما تھا

چنانچہ آپ کے شاگرد میاں شمس الدین مرحوم (مالک مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور) لکھتا ہے:

"شیخ حسن دین مرحوم نے آپ کے بارے میں کہا تھا "آپ صاحبِ دل بھی تھے" آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ان الفاظ پر غور کرتا ہوں تو چند واقعات ایسے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں جو نہ صرف ان کے قول کی تصدیق کرتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے مجھے نیا زاویہ نگاہ بخشتے ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے صرف دو واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔

پہلا واقعہ براہ راست مجھ سے اور میرے ایک کرم فرما مولوی محمد بشیر مرحوم سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں بلا کم و کاست اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑے بزرگوں کی زندگیوں کو محض ان کی کرامات کے آئینہ میں کبھی نہیں دیکھا مگر ساتھ ہی ساتھ مابعد الطبیعاتی حقائق سے انکاری بھی نہیں ہوں۔ کچھ افعال ایسے ضرور تھے ہیں جو صرف اللہ کے برگزیدہ بندوں ہی سے منصۂ شہود پر آ سکتے ہیں۔ عام آدمی کی نگاہ سوائے استعجاب و حیرت کے ان کی کنہ سے کچھ سروکار نہیں کر سکتی

ان میں پہلا واقعہ یوں ہے کہ ایک روز ہم اور میرے دوست مولوی محمد بشیر مرحوم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ کے چہرے سے کچھ فکرمندی اور قدرے پریشانی کے آثار مترشح تھے مگر طبیعت بہ دستور مائل بہ انشراح تھی۔ ہماری طرف رُخ کر کے حاکمانہ انداز میں فرمایا: "بیٹے! اٹھو اور بادامی باغ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچو۔ وہاں میرا لڑکا جو گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا ہے موجود ہوگا اسے کہو" وہ واپس گھر آجائے اور کسی دوسرے شہر جانے کا خیال دل سے ترک کر دے"۔ مولانا کے اس ارشاد پر مولوی بشیر نے کچھ جرأت کر کے کہا: "مولانا! میں خوب جانتا ہوں کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو چکی ہوگی۔ میں گاڑیوں کے آنے جانے کے اوقات سے اچھی طرح باخبر ہوں۔" اس پر مولانا نے پھر وہی کلمات دہرائے اور یقین اور قطعیت بھرے لہجے میں فرمایا: "وہ لاہور نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے کہو گھر واپس آجائے۔"

مولانا کے ان الفاظ نے ہمارے دلوں میں یقین کی ایسی حرارت پیدا کر دی کہ دفعتاً ہمارے قدم سٹیشن کی جانب اُٹھ گئے۔ میں مولوی بشیر مرحوم کے بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے دل میں یقین و گمان کی کیفیت کس تناسب میں تھی۔ مگر اپنے بارے میں حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے اور مولانا کے صاحبزادے بھی وہیں موجود ہیں۔ چنانچہ جب ہم بھاگم بھاگ اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی لیٹ ہونے کی بنا پر ابھی روانہ نہ ہوئی تھی۔ کئی اشخاص سے اس کے لیٹ ہونے کا سبب پوچھا مگر ایک آدمی بھی معقول جواب نہ دے سکا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا۔ "صاحب پتہ نہیں چلتا کہ گاڑی کیوں لیٹ ہے۔"

اُدھر اُن کے صاحبزادے کو دیکھا تو وہ مضطربانہ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں آن واحد میں ان کے قریب پہنچے اور انہیں مولانا کے حکم سے آگاہ کیا۔ وہ مولانا کا پیغام سنتے ہی بلا چون و چرا ہمارے ساتھ واپس چل پڑے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ واقعہ سرے سے کسی اہمیت کا حامل ہی نہ تھا اور ہم تو محض مولانا کے اشارے پر عمل کر رہے تھے۔

دوسرا واقعہ کسی دوست نے مجھ سے بیان کیا۔ کہنے لگے کہ ایک بار نصف شب کے قریب مولانا کے گھر میں چور گھس آئے۔ اس وقت آپ بالائی منزل میں یادِ الٰہی میں محو تھے

محو تھے۔ ان کی گفتگو سنی تو نیچے صحن کی جانب گردن جھکا کر فرمایا:

"دوستو! کمرے کی بائیں جانب ایک صندوقچے پر مٹی کی ٹھلیا رکھی ہے۔ اس میں کچھ روپے امانت کے ہیں جو میرے نہیں۔ بقیہ مال فقیر کا ہے جسے بلاخوف و خطر لے جاؤ۔"

چوروں نے جب یہ کلمات سنے تو فوراً مکان سے باہر نکل گئے اور علی الصباح چھبیس تیس آدمیوں کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور بار بار معافی مانگنے اور اپنے کئے پر پشیمان ہونے کے بعد اصرار کرنے لگے کہ انہیں مرید کر لیا جائے۔ مولانا نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس واقعہ نے چوروں میں رشد و ہدایت کی راہ کھول دی ہے مگر ساتھ ہی فرمایا: "مجھے پیری مریدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں بھی اللہ کے دوسرے گنہگار بندوں کی طرح اس کا ایک گنہگار بندہ ہوں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں نیکی کی راہ دکھا دی ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس ستار العیوب کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمارے گذشتہ گناہوں کو معاف فرمائے اور آئندہ نیکی کی توفیق عطا کرے۔"

اس پر سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور مولانا نے نہایت خشوع و خضوع سے اپنے لئے اور ان کے لئے دعا فرمائی۔ پھر وہ لوگ مولانا سے معانقہ کر کے رخصت ہو گئے۔"

مولانا کے صاحبزادہ محمد مظہر الحق رانا کا بیان ہے کہ

ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب گھر والے گاؤں میں اکٹھے تھے۔ میں اور میری والدہ مرحومہ باہر صحن میں سوئے ہوئے تھے اور والد صاحب قبلہ برآمدے میں سوئے ہوئے تھے۔ اُن کی نظر اس وقت خراب ہو چکی تھی۔ گاؤں میں چونکہ اس وقت بجلی نہ تھی، والدہ نے لالٹین جلا کر اور مدھم کر کے طاق میں جو والد صاحب کی چارپائی کے پائنتی کی طرف تھا اس میں رکھی ہوئی تھی۔ آدھی رات کو (وقت کا صحیح پتہ نہیں) میری آنکھ کھل گئی اور میری نظر والد صاحب کی چارپائی کی طرف چلی گئی تو اس مدھم لالٹین کی روشنی میں، میں کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور جیسے گرمی لگ رہی ہو پیچھے سے ململ کا کرتا (جو اکثر گرمیوں میں پہنتے تھے) اٹھایا ہوا ہے اور کوئی اُن کو ہاتھ کا پنکھا کر رہا ہے۔ صرف ہاتھ اور پنکھا نظر آتا تھا باقی کس کا ہاتھ ہے وہ مجھے معلوم نہ ہو سکا

پہلے میں نے سوچا شاید والدہ ہیں مگر وہ میرے ساتھ والی چارپائی پر سو رہی تھیں۔ پھر میں نے یہ
سوچا کہ شاید دوسرے گھر کے افراد سوئے ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کون
ہے۔ میں ننگے پاؤں چپل پہنے بغیر اُن کی چارپائی کی طرف گیا اور دیکھا کہ نہ وہاں کوئی ہاتھ ہے اور نہ
پنکھا۔ صرف والد صاحب اُسی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ میں نے کوئی کھٹکا وغیرہ نہیں
کیا۔ جب اُن کے پاس پہنچا تو وہ یکدم بول اُٹھے۔ کون ہے؟ مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے کہہ دیا
کہ میں ہوں۔ جس طرح کوئی بات ناگوار ہو سے کہ جاتی ہے اس طرح مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم
اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے جھوٹ بول دیا کہ مجھے پیاس لگی تھی۔ کہنے لگے جاؤ جا کر
سو جاؤ یعنی میرا آنا انہیں اچھا نہ لگا۔ صبح سویرے جب وہ نماز اشراق (جو باقاعدگی کے ساتھ
پڑھتے تھے اور ۹/۱ بجے نفل پڑھ کر فارغ ہوتے تھے) کے بعد اور ناشتا کرنے کے بعد میں نے
معمول میں سے اُن سے پوچھا رات کو آپ کو پنکھا کون کر رہا تھا۔ جواب نہ دیا۔ میں نے پھر
کہا ابا جی کس نے؟ پھر بھی سوال کیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر تیسری مرتبہ میں نے بہت ضد
کی کہ آپ بتاتے کیوں نہیں۔ پھر کہنے لگے ضرورت نہیں تمام باتوں کا جواب دیا جائے۔
اس کے بعد پھر میں نے سوال نہ کیا اور مجھے آج تک معلوم نہیں کہ یہ کیا ماجرا تھا

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی کا بیان ہے کہ بجانب گاؤں کھمرا سے چار پانچ میل کے فاصلے
پر وزیر آباد کا شہر اب بھی مشہور ہے۔ وہاں پر والد بزرگوار کے ایک ارادتمند قاضی باقی شاہ
مرحوم رہا کرتے تھے جو گرما کی تعطیلات میں والد صاحب کو بالالتزام ہر سال اپنے ہاں دو تین
دنوں کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں بھی اُن کے ساتھ وزیر آباد گیا تو قاضی
باقی شاہ صاحب نے بتایا کہ ایک شخص بہت سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ مولانا اصغر علی روحی کو آپ
وزیر آباد آنے کی دعوت دیں تو میں اُن سے اپنی لڑکی کے بارے میں کچھ باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں
جس کے سر پر کوئی آسیب ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے اُس شخص کو بلا بھیجا کہ مولانا روحی
تشریف لائے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص لڑکی کے ساتھ قاضی باقی شاہ کے ڈیرے پر
آ گیا اور اُس نے بتایا کہ کوئی بدروح میری لڑکی کو تنگ کرتی ہے اور وہ عجیب و غریب
حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ آپ اُسکو دم کر دیں یا کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے میری لڑکی

کو صحت ہو جائے۔ والد صاحب نے کہا کہ میں ایسی روحانی چیزوں یعنی آسیب اور جن وغیرہ کا عامل نہیں ہوں۔ یہ کام کسی عامل سے کرانا چاہیئے لیکن وہ شخص بضد تھا کہ مجھے آپ پر اعتقاد ہے کیونکہ آپ عالم باعمل ہیں۔ آپ کی طفیل ان شاء اللہ وہ رو بصحت ہو جائے گی۔ آخر والد صاحب نے فرمایا کہ تم لڑکی کو لے آؤ میں دم کر دیتا ہوں۔ وہ لڑکی شرم و حیا کی وجہ سے ایک طرف کونے میں چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ والد صاحب نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ چونکہ والد صاحب کو حقہ نوشی کی عادت تھی اسلئے انہوں نے کلّی کرنے کے لئے پانی منگوایا کیونکہ وہ عموماً باوضو رہتے تھے۔ کلّی کرنے کے بعد آپ نے منہ کا پانی ایک کھڑکی سے باہر پھینک دیا جو قریب ہی تھی۔ اُس وقت لڑکی کی حالت بالکل ٹھیک تھی۔ والد صاحب نے کافی دیر کچھ پڑھنے کے بعد لڑکی کے جسم کو تین بار دم کیا اور اُس کے والد سے کہا کہ اللہ تعالیٰ رحم کرے میں یہی کر سکتا تھا۔ اگر لڑکی ٹھیک ٹھاک ہو جائے تو فبہا ورنہ کسی عامل کی مدد سے یہ کام کروانا چاہیئے۔ میں عامل نہیں ہوں۔ وہ شخص شکریہ ادا کرنے کے بعد جانے لگا تو میں بھی اسکے ساتھ گیا۔ سیڑھیاں اترتے ہی لڑکی کے اطوار بدل گئے اور وہ مردانہ لہجے میں کہنے لگی:

" لائے تھے بڑے مولوی صاحب کو۔ وہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں جس وقت آپ کے مولوی صاحب نے کلّی کر کے پانی کھڑکی کی طرف پھینکا تھا تو وہیں تو میں بیٹھا تھا۔ اس کلّی سے بچنے کے لئے میں ایک طرف ہو گیا تھا۔ ہم نے ایسے ہزاروں مولوی دیکھے ہیں "

الغرض وہ لڑکی اسی قسم کی باتیں کرتی رہی اور اپنے گھر پہنچ کر پھر وہی حرکتیں کرنی شروع کر دیں۔ میں نے چونکہ اس قسم کا واقعہ کبھی دیکھا نہیں تھا اسلئے میں گھبرا کر تیز تیز قاضی صاحب کے ڈیرے پر واپس آ گیا۔

محمد اختر صاحب ولد محمد عبداللہ مرحوم ساکن بہار کالونی ۳ لاہور کا بیان ہے کہ مولانا روحی کی زبانی میں نے یہ واقعہ سنا:

مولوی صاحب نے فرمایا: ایک دن ظہر کی نماز کے بعد جب تمام نمازی چلے گئے اور میں اپنے گھر جانے لگا تو مسجد کے اندر صحن میں جو جوتے رکھنے والا خانہ تھا اُس میں سے میں نے اپنا جوتا اٹھایا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ تقریباً دو سوا تر موٹا اور تقریباً چار انچ لمبا سانپ

ادھر ادھر پھر رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ میں نے اس سے اسے مارنے کی کوشش کی۔ چھڑی اس کے سر پر لگی اور وہ سانپ جوتوں والے خانے کی نچلی طرف چلا گیا اور میری کوشش کے باوجود مجھے نہیں ملا۔ چونکہ گھر نزدیک تھا۔ میں گھر سے ہو کر کچھ وقت بعد واپس آگیا اور مسجد کے اندر صحن میں بیٹھ گیا۔ میرے تن پر ایک ململ کا جبہ تھا سر پر سادہ سی پگڑی تھی۔ ایک سپاہی آیا اس نے مجھے بتایا کہ میاں صاحب کچہری جانا ہے۔ چونکہ مجھے فتویٰ دینے کے اختیارات تھے اس لیے میں نے اسے قابل تعجب نہ سمجھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے میں اس سپاہی کے ساتھ چل دیا۔ حکومت برطانیہ میں کچہری کا وقت چار بجے تک تھا۔

بھاٹی کے چوک میں بکر منڈی موجود تھی اس سے ذرا آگے بائیں طرف بیری والا احاطہ تھا جو اب بھی موجود ہے۔ ان باتوں کا ذکر کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ جب میں بیری والے احاطے تک پہنچا چونکہ یہ راستہ کچہری کا تھا اس لئے میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ احاطے سے گزرتے ہوئے اچانک میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس سے آگے تمام عمارتیں غائب اور ایک جنگل بیابان تھا۔

میں نے سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائی صاحب مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ آگے مجھے کوئی آبادی نظر نہیں آرہی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میاں صاحب تھوڑے سے قدم اور۔ وہ سامنے کچہری ہے۔ اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف جب میں نے دیکھا تو بہت سارے لوگ ایک اجتماع کی صورت میں اکٹھے ہیں اور ایک تخت نما جگہ پر ایک معتبر سا انسان بیٹھا تھا۔ وہ سپاہی مجھے ان کے پاس لے کر چلا گیا۔ میں نے انہیں السلام علیکم کہا اور انہوں نے بھی اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ اتنی دیر میں اجتماع میں سے ایک فرد کھڑا ہوا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس نے ہاتھ کا اشارہ کر کے یہ بات کہی اپنے اس سردار کو جو تخت پر بیٹھا ہوا تھا کہ حضور یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے مارا ہے۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

ایک اور فرد اس اجتماع میں سے کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے سردار سے کہا:

"چونکہ یہ میرے استاد ہیں، میں نے ان سے تعلیم حاصل کی ہے اس لئے ان کی طرف سے میں بولوں گا"۔ سردار نے اجازت دے دی۔ اس نے کہا: حضور عالی! گزارش یہ ہے کہ چونکہ سانپ اور انسان ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں اس لئے مولانا صاحب نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنی حفاظت کے لئے کیا ہے۔ اس کا حق نہیں بنتا تھا کہ اس صورت میں مسجد میں داخل ہوتا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فرماتے ہیں کہ میں اب سمجھا کہ

صورت حال کیا ہے اور مجھے یہاں کس لئے بلایا گیا ہے۔

سردار نے اُس کو جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، مخاطب کیا اور کہا: یہ واقعہ بیان کیا جائے۔

ایک بشر اور فرد اُس اجتماع میں سے کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا: حضور اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں کیونکہ میں اُس وقت اس کے ساتھ تھا

سردار نے اجازت دے دی۔

مخلوق جنات کے اُس فرد نے سردار کو مخاطب کر کے کہا کہ چونکہ میں نے بھی انہیں سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان کا ذکر اکثر اپنے دوستوں سے کرتا تھا۔ اس پر دوست نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی اپنے استاد صاحب سے ملاؤ۔ میں اسکو ملانے کا وعدہ کر کے ساتھ لے گیا۔ ظہر کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ ہم گلی والے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے اندر جانے کی خواہش ظاہر کی میں نے اسے منع کیا کہ ابھی نہیں لیکن وہ بضد تھا کہ ابھی جانا ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور وہ اکیلا ہی مسجد کے اندر چلا گیا۔

اس کے بعد مولانا روحی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ شخص جو میری طرف سے بول رہا تھا اس نے اپنے سردار سے مخاطب ہو کر کہا کہ حضور اس نے استاد صاحب کو خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔ یہ اسکی اپنی غلطی تھی اور اسے سزا ملنی چاہیئے اور میرے استاد کو باعزت رخصت کیا جائے اتنی دیر میں چار پانچ افراد اور کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اپنے استاد کی حمایت کریں گے

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ سردار نے میرے لئے کرسی منگوائی اور عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا اور میری خدمت و خاطر کے لئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا: عصر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ مہربانی فرمائیں مجھے اجازت دی جائے۔ وہ جو میرے شاگرد تھے انہوں نے اپنے سردار سے کہا: چونکہ ہمارے استاد صاحب ہمارے ہاں پہلی مرتبہ آئے ہیں اس لئے ہم انہیں خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔ لہٰذا انہیں انعام دے کر رخصت کیا جائے

سردار نے اُن کی یہ عرض مان لی اور حکم دیا کہ ان کے لئے وہ انعام لاؤ۔ اتنے میں

انہیں افراد میں سے ایک شخص لوہے کی انگیٹھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے، لایا اور اپنے سردار کے پاس رکھ
دی۔ سردار نے مجھے مخاطب ہو کر کہا کہ جھولی اٹھائیں۔ میں نے اپنے کرتے کو پھیلا دیا۔ انہوں نے وہ
انگیٹھی اٹھا کر میری جھولی میں ڈال دی اور مجھے کہا کہ اس کو اوپر سے بند کر لیں اور گھر جا کر کھولیں۔
راستے میں نہیں کھولنا۔

اس کے بعد سردار نے اپنیں میں سے ایک کو حکم دیا کہ بڑی عزت و احترام کے ساتھ
مولانا صاحب کو واپس پہنچا دیا جائے۔ وہ مجھے لے کر وہاں سے چل پڑا۔ جب میں
بھاٹی دروازے کے باہر جانب بکر منڈی میں پہنچا وہاں ایک بوہڑ کا درخت ہے۔ اس سے چند قدم
پیچھے تھا کہ اس نے مجھ سے اجازت طلب کی اور چلا گیا۔

میرے ذہن میں یہ فکر تھی کہ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا ہے اور وہاں کوئی دوسرا
شخص بھی نہیں جو اذان دے سکے اسلئے میں تیز تیز چلنے لگا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ کیا
کوئلے سے میری جھولی میں ڈال دیئے ہیں۔ میں نے اس بوہڑ کے ساتھ اس جھولی کو الٹ دیا اور
بھاٹی دروازہ کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ یہاں تک کہ مسجد میں پہنچا۔ اذان دینے کے لئے وضو کرنے
لگا۔ ٹوٹیوں کے آگے جب میں بیٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کرتے میں ایک "کھنگر" سا
اٹکا ہوا ہے جس کا بعد میں مجھے علم ہوا کہ یہ ایک سونے کا کھنگر تھا۔ جس کا وزن تقریباً چار
پانچ تولے تھا۔ میں نے وضو کیا اذان دی اور بڑے اطمینان سے جماعت کروائی۔ جب لوگ چلے گئے تو
میں اٹھا اور بوہڑ کے پاس پہنچا جہاں پر میں نے کوئلے سمجھ کر اپنی جھولی الٹ دی تھی۔ وہاں
پر اب کچھ نہیں تھا اور مولانا صاحب نے ارشاد کیا کہ

بڑے شرارتی تھے یہ ہیں یہ۔ پہلے بھی دو تین کو اسی وجہ سے چھٹی دے چکا ہوں اور ساتھ
ہی یہ واقعہ بیان فرمایا:

ایک بچہ میرے پاس پڑھا کرتا تھا۔ میں نے ایک دن اس کی ڈیوٹی لگائی کہ بھینس
کے لئے سائیکل پر جا کر چار بجے چارہ لے آئے۔ شام کے قریب جب میں نے اس سے پوچھا تو
اس نے جواب دیا کہ میں نہیں لا سکا۔ میں نے غصے میں اس سے کہا کہ جاؤ اور ابھی لے کر
آؤ۔ اسی اثنا میں، میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا چارے کا گٹھا مسجد کی باہر والی

دیوار جو میرے گھر کے پاس تھی ایک آواز کے ساتھ وہاں پر گرا ہے۔

میں یہ سمجھ گیا کہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ اتنی چھوٹی عمر کا بچہ اتنا بڑا گٹھا نہیں لا سکتا۔ میں نے اُسے بلایا اور چھٹی دے دی۔ جاتے ہوئے اُس نے مجھ سے اجازت طلب کی کہ میری خواہش ہے کہ میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آجایا کروں۔ میں نے اُس کی یہ خواہش مان لی اور اُسے تنبیہ کی کہ وہ کبھی شرارت نہیں کرے گا۔ اُس نے وعدہ کر لیا اور اجازت لے کر چلا گیا۔

ڈاکٹر ضیاء الحق صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے محلہ کی مسجد میں جہاں والد صاحب امامت و خطابت کیا کرتے تھے۔ ایسا کئی بار ہوا کہ والد صاحب اکیلے بیٹھے اپنے اوراد و وظائف میں مشغول ہوتے اور ایک چھوٹی عمر کے نہایت خوبصورت بچے کی صورت میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکا اُن کے پاس آتا چنانچہ ایک دن جب میں کسی کام کے لئے والد صاحب کے پاس مسجد میں گیا تو اُس بچے کو دور سے دیکھ لیا۔ والد صاحب پہلے اُس سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اُس سے پوچھا تھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ اُس نے کہا کہ میں حافظ صاحب سے سبق پڑھ کر آیا ہوں۔ والد صاحب نے پوچھا کہ کون سے حافظ صاحب۔ تو اُس نے کہا حافظ امام دین صاحب جو کہ چھ دریاں میں بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ یہ وہی مسجد تھی جہاں میں نے اور میرے بڑے بھائی حافظ عبدالحق صاحب نے حافظ امام دین صاحب سے قرآن مجید پڑھا تھا۔ والد صاحب نے اس بچے سے پیار کرنے کے لئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھنے کا ارادہ کیا تو وہاں کچھ بھی موجود نہ تھا۔ غالباً وہ سیڑھیاں چڑھ جانے کی وجہ سے غائب ہو گیا۔ بعد میں اُس بچے نے والد صاحب کو بتایا تھا کہ حافظ امام دین صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ کے پاس جا کر بیٹھا کروں۔

رویائے صادقہ

مولانا روحی مرحوم نہایت صحیح العقیدہ اور راسخ الایمان عالم دین تھے۔ عبادت، مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت کی وجہ سے روحانی دنیا میں بھی اپنی ایک خاص مقام حاصل تھا چنانچہ بے شمار لوگ آپ کی خدمت میں صرف دعا کرانے کی خاطر آیا کرتے تھے۔ جس ماحول میں وہ قیام پذیر تھے وہاں کے لوگ اگرچہ روحانیت سے کوسوں دور تھے۔ تاہم مولانا روحی کی ارادت اور عقیدت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اُن کے ارد گرد

زیادہ تر گوجر اور پٹھان بسے آباد تھے اور اُن میں شاید ہی کوئی شخص تعلیم یافتہ نظر آتا ہو اس لئے وہ اس
علاقہ میں مولانا روحی کے متعلق اُن کے صحیح مقام سے آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔ گوجروں کا اُن پر اعتقاد
نہایت پختہ تھا اُن میں سے اگر کسی کی بھینس بیمار ہو جاتی یا کسی وجہ کی بنا پر دودھ نہ دیتی تو گوندھے
ہوئے آٹے کا ایک پیڑا سا بنا کر اُن کی خدمت میں لاتے جس پر مولانا روحی کچھ پڑھ کر پھونک دیتے اور
وہ آٹا گوجر لوگ اپنی بھینسوں کو کھلا دیتے جس سے وہ دودھ دینا شروع کر دیتی تھی لیکن اس سے زیادہ
ان لوگوں کو مولانا روحی کے روحانی تصرفات کا علم نہیں تھا۔ بعض لوگ اپنے بچوں کے دم کرانے کی
خاطر اُن کے پاس لاتے اور بعض کوئی نقش یا تعویذ اُن سے لکھوا لے جاتے اور اس طرح نہ صرف اپنے
ذہن کو مطمئن کرتے بلکہ اکثر اوقات جس مقصد کے لئے وہ نقش حاصل کرتے تھے وہ مقاصد پورے بھی ہو جاتے۔

علاوہ ازیں مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے رویائے صادقہ سے بھی مشرف کر رکھا تھا۔
چنانچہ اہل خانہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعض ایسے خواب دیکھا کرتے تھے جن کی صحیح تاویل بھی وہ
خود ہی جانتے تھے۔ ایسے صرف دو واقعات کا ذکر کرنا مثال کے طور پر کافی ہے۔

۱۔ جس روز اُن کے دوسرے صاحبزادہ یعنی حافظ عبدالحق پیدا ہوئے تو آپ نے دیکھا
کہ ایک نہایت بزرگ اور بارعب شخص نہایت سفید کپڑے پہنے کرسی پر بیٹھے ہیں اور مولانا اُن کی خدمت
میں حاضر ہیں۔ مولانا کو بزرگ نے ایک چاندی کا چمکتا ہوا سکہ مٹھی میں تھما دیا جس پر مولانا
بہت خوش ہوئے اور اُس بزرگ نے کہا کہ یہ بہت کام کی چیز ہے اسکو سنبھال کر رکھنا۔ اگلی صبح
کو جب مولانا نماز فجر پڑھنے اور اپنے اوراد و وظائف سے فارغ ہونے کے بعد گھر تشریف لائے تو
انہوں نے اپنے اہل خانہ کو یہ خواب بتایا اور اسکی یہ تاویل بھی بتائی کہ آج ان شاء اللہ تمہارے ہاں ایک
ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو قرآن مجید کا حافظ ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ کے اُس بیٹے کو قرآن
مجید کا حفظ کرنا بہت آسان ہو گیا۔ فالحمد للہ علی ذالک

۲۔ ایک اور واقعہ جو آپ کے سب سے بڑے بیٹے مولوی فضل حق مرحوم کے بارے میں ہے
یہ ہے کہ انہیں ایم۔ اے عربی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یورپ میں جا کر عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنے کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ دیا گیا۔ انہی دنوں مولوی فضل حق صاحب مرحوم انکم ٹیکس
کے محکمہ میں ملازمت کے لئے مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے جو جلدی شروع ہونے والا تھا۔ جب

امتحان ہو چکا تو امید تھی کہ ان شاءاللہ وہ اس میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ یورپ والے وظیفہ
کی اطلاع ملنے پر مولانا موحی بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا لیکن ان کی دلی خواہش یہ تھی
کہ اگر مقابلہ کے امتحان میں یہ بچہ کامیاب ہو جائے اور اسی ملک میں اسے کسی اعلیٰ اسامی پر متعین
کر دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یورپ کے کسی ملک میں جا کر عموماً نوجوان کئی خلافِ شرع امور کے مرتکب
ہو جاتے ہیں۔ وہ روزانہ سحری کے وقت تہجد کی نماز کے بعد بارگاہِ ایزدی میں یہی دعا کیا کرتے تھے کہ
بچے کو یہیں کوئی باعزت منصب مل جائے تاکہ اسے یورپ نہ جانا پڑے۔

اس معاملہ کے بارے میں انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک درویش صفت بزرگ ایک
کرسی پر تشریف فرما ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں مٹی کے دو کوزے ہیں ایک دائیں ہاتھ میں اور دوسرا بائیں میں
اُس بزرگ نے مولانا موحی سے کہا کہ تم کون سا کوزہ لینا پسند کرو گے بظاہر اُن دونوں کوزوں
میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ مولانا نے دائیں ہاتھ والے کو پسند کر لیا جو بزرگ نے انہیں دے
دیا اور مبارک باد بھی دی کہ تم نے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ صبح نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد
انہوں نے اپنے صاحبزادہ کو بلا کر کہا کہ غالباً آج تمہارا مقابلے کے امتحان کا نتیجہ نکل آئے گا اور تم
ان شاءاللہ اس میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ مولوی فضل حق مرحوم یہ سُن کر بہت خوش ہوئے لیکن اُس
دن امتحان کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی۔ یورپ میں جانے کے لئے جہاز کی کمپنی والوں نے
تاریخ روانگی مقرر کر کے مولوی فضل حق کو اطلاع دی کہ فلاں تاریخ تک کراچی پہنچ جاؤ۔ مولانا موحی
اس چٹھی کے موصول ہونے پر کچھ پریشان سے ہو گئے۔ اُس زمانے میں مقابلہ کے امتحانات کے نگران
دھڑا چار اہم لوگ تھے جن میں سر محمد شفیع، میاں فضل حسین اور غالباً جسٹس شاہ دین مرحوم بھی
شامل تھے۔ موسم گرمی کا تھا اور یہ تمام لوگ لاہور کو چھوڑ کر شملہ چلے گئے تھے تاکہ موسم گرما پہاڑی
علاقہ میں بسر کر سکیں۔ مولانا موحی بذاتِ خود شملہ تشریف لے گئے اور ان تینوں افسروں سے
مل کر اپنی صورتِ حالات سے آگاہ کیا کہ جہاز والوں نے تو روانگی کی تاریخ بھی متعین کر دی ہے
میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ابھی نتیجہ میں کتنی دیر اور لگے گی۔ اُن سب نے مولانا کو یہ
مشورہ دیا کہ امتحان کے نتیجہ نکلنے میں کم از کم آٹھ دس دن لگ جائیں گے اسلئے بہتر یہ ہے کہ
آپ کا صاحبزادہ جہاز کی کمپنی والوں کو یہ لکھ دے کہ روانگی کی جو تاریخ آپ نے مقرر کی ہے

اُس کو منسوخ کر کے ۱۵ روز کے بعد جو جہاز یورپ جانے والا ہو میری نشست کے لئے اُس میں انتظام کر دیا جائے کیونکہ بعض گھریلو حالات کی بنا پر آپ کی مقررہ تاریخ کو جانا میرے لئے ممکن نہیں ہو سکے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کمپنی والوں کو بھی جواب لکھ دیا گیا۔ اسی دوران مقابلے کے امتحان کا نتیجہ شائع ہو گیا اور پھر مولوی فضل حق صاحب نے کمپنی والوں کو لکھ دیا کہ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں چونکہ یہیں مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں اسلئے جہاز میں میری نشست کسی اور صاحب کو دے دی جائے۔ چنانچہ نتیجہ نکلنے پر مولوی فضل حق کے علاوہ جو اور وظیفہ ملنے کے امیدوار لوگ تھے اُن میں ایک ڈاکٹر عنایت اللہ مرحوم بھی تھے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبہ رہ کر ریٹائر ہو گئے لیکن اُس وقت وہ جھنگ کے انٹرمیڈیٹ کالج میں عربی کے لیکچرار مقرر تھے۔ شیخ عنایت اللہ صاحب مرحوم مولوی فضل حق صاحب کے پاس آئے اور اُن سے وظیفہ پر یورپ جانے کا خیال چھوڑ دینے کے بارے میں ایک چٹھی حاصل کر کے مقابلے کے امتحان کے متعلق افسروں کو بھجوا دی اور درخواست کی کہ ازراہِ مہربانی وہی وظیفہ مجھے دے دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر عنایت اللہ مرحوم یورپ سے پی ایچ۔ ڈی کر کے واپس آ گئے۔ مولانا موصوف نے بعد میں یہ بتایا کہ دوسرا کرتہ جو میں بزرگ کے بائیں ہاتھ میں تھا شراب میں بھیگا ہوا تھا جس سے حرام مال کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

مولانا روحی نے اپنی کتاب "ما فی الاسلام" جلد اول میں "حقیقت الرؤیاء" کے عنوان سے رویاء کے اقسام، اور روح کے بارے میں نہایت پر مغز معلومات درج کی ہیں اور اس عنوان کے آخر میں لکھتے ہیں:

"الغرض مصلحت مانع نہ ہوتی تو خاکسار مؤلف اپنی چند ایک رویاء بیان کرتا جن کی نسبت مجھے یقین ہے کہ وہ منجملہ انہیں مبشرات کے تھے جن کا ذکر حدیث میں آ چکا ہے اور جن کا ایفاء میری حالت میں کبھی خیال تک نہیں گزرا تھا اور جو صحیح طور پر پورے اترے۔" ما فی الاسلام ۱: ۲۷۲-۲۷۳

اس عبارت کے فقرہ پر مولانا نے حاشیہ پر لکھا ہے کہ حضور نے فرمایا کہ وحی منقطع ہو چکی ہے اور مبشرات باقی رہیں گے۔ پوچھا گیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ رؤیائے صالحہ جو مومن کو دکھایا جاتا ہے۔ یا کسی مومن کو کسی دوسرے مومن کی نسبت دکھایا جاتا ہے۔

اخلاق و عادات

ایک عالم دین کی خوبی یہ ہے کہ دین اسلام کی جو خوبیاں وہ لوگوں کو بتائے اُس پر خود بھی عامل ہو۔ اسلام چونکہ سادہ زندگی گزارنے کا سبق دیتا اور فخر و نمائش سے منع کرتا ہے اسلئے مولانا روحی عالم باعمل ہستی تھے اور آپ کے ہر قول و فعل، لباس، خوراک، گفتگو، نشست و برخاست الغرض زندگی کے ہر پہلو میں حتی الوسع سنت نبوی کی پیروی مدنظر ہوتی تھی۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے الفاظ میں "وہ دانشمند، درویش صفت جن کے اخلاق نیک مردوں کے تھے، پرانے بزرگوں کی طرح اُن کی زندگی جو اکثر مسجد میں گزری ہر طرح کی سادگی سے آراستہ اور ہر طرح کے تکلفات سے بری تھی۔"[1]

کالج جاتے وقت یا کسی تقریب میں شرکت کے موقع پر شلوار، قمیص اور اس کے اوپر لمبا کوٹ جس پر سفید ململ کا جبّہ ہوتا، پاؤں میں دیسی ساخت کا جوتا جو عموماً اپنے گاؤں سے بنوا لیا گیا ہوتا یا لاہور کے چھوٹے بازار سے خریدا جاتا استعمال میں لاتے تھے۔ تمام عمر عمامہ اور نیچے کلاہ کا استعمال رہا۔ آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ لگاتے۔ گھر سے نکلتے وقت ایک موٹا سا عصا ہاتھ میں ہوتا اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والے آپ کے شاگرد اس علاقے کی لکڑی کا بنا ہوا عصا اُن کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا کرتے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صاحب فرماتے ہیں کہ "ہمارے ہاں تقریباً ایک ہی قسم کے عصا دس بارہ جمع ہو گئے تھے"۔ کالج سے یا تقریب سے واپس آ کر اُن کا لباس ململ یا کھدر کے دیسی کرتے اور چادر (تہبند) استعمال میں لاتے۔ البتہ موسم سرما میں واسکٹ اور بعض وقت گھر کا بنا ہوا سویٹر پہنتے۔ جب کوئی نیا کپڑا سلواتے تو پہلے اسکو دھلواتے اور فرماتے کہ معلوم نہیں کس کس کے ہاتھ اسکو لگے ہیں اور یہ پاک ہے یا پلید۔ اگر کوئی نیک دوست اُن کے لباس کو استری کر دیتا تو منع نہ فرماتے لیکن بغیر استری کے لباس پہن لینا اُن کا عام شیوہ تھا۔ کرتے کی آستینیں گول ہوتیں جس میں بٹن کی ضرورت نہ پڑتی۔ جمعہ کے روز نماز سے پہلے باقاعدہ حجامت بنواتے اور سر کو استرے سے منڈوا دیا کرتے۔ سنت نبوی کے مطابق مونچھیں کترواتے اور ایک مٹھی سے زائد داڑھی کے بالوں کو کٹوا دیتے تھے۔ عالم جوانی گزارنے کے بعد داڑھی کو حنا کا خضاب لگایا کرتے تھے۔

---

[1] مقالات دینی و علمی ۲: ۱۹۰

خوراک کے معاملے میں وہ فارسی کے اس مقولے پر کاربند تھے:

"خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن"

آپ بقدرِ سدِّ رمق کھانے پر اکتفا کرتے تھے اور کسی کھانے میں کبھی کوئی نقص نہ نکالتے تھے۔ جس چیز کو دل نہ چاہتا ہو اُسے ویسے ہی چھوڑ دیتے تھے اور روٹی بغیر سالن کے کھا لیتے تھے۔

ڈاکٹر رانا بہار الحق صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار میں اُن کے ہمراہ گاؤں گیا۔ جب ہم منزلِ مقصود پر پہنچے تو سورج غروب ہو گیا تھا۔ اس وقت گاؤں کی دکانوں سے کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ گھر میں بھی سالن پکانے والا کوئی فرد موجود نہ تھا اس لئے میں نے خود ہی چنے کی دال لے کر ہنڈیا چولہے پر رکھ دی۔ چونکہ میں اس معاملے میں بالکل ناتجربہ کار تھا اس لئے دال کچی رہ گئی اور نمک کی زیادتی کی وجہ سے زہر سے زیادہ کڑوی ہو گئی۔ جب میں نے کھانا اُن کے سامنے چنا تو پہلا لقمہ زبان پر رکھتے ہی لاحول پڑھنے لگے اور مسکرا کر فرمایا کہ پانی کا ایک گلاس لے آؤ۔ میں نے پانی لا کر پیش کیا۔ وہ روٹی کا ایک نوالہ لیتے اور منہ میں ڈال کر ایک گھونٹ پانی لے لیتے۔ یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو گئے۔

پھلوں میں انہیں میٹھا خربوزہ اور آم مرغوب تھے۔ چنانچہ جب اُن کا موسم ہوتا تو بڑے اہتمام سے کسی کو میوہ منڈی بھیج کر منگوایا کرتے تھے۔ چونکہ روزانہ مسواک کرنے کے عادی تھے اس لئے اُن کے تمام دانت آخر عمر تک مضبوط اور سلامت رہے اور انہیں چبانے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔

حقہ نوشی کے بہت رسیا تھے۔ عموماً تلخ تمباکو پسند کرتے تھے۔ اگر تمباکو پھیکا یا کڑوا ہوتا تو ایک دو کش لگا کر چھوڑ دیتے اور دوبارہ چلم بھرنے کو کہتے۔ اُن کے تلامذہ اور احباب کو چونکہ اُن کی اس "کمزوری" کا علم تھا اس لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تمباکو، چلمیں اور حقے سوغات کے طور پر بھجواتے رہتے تھے۔

اُن کی ایک عادت یہ تھی کہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب قیلولہ کے لئے چارپائی پر لیٹتے تو کسی بچے کو بلاتے جو چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ جاتا۔ پھر اُسے آپ حکم دیتے کہ وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اُن کے پاؤں کے تلووں کو سہلائے یا چھوٹی سی چھڑی لے کر اُن کے تلووں پر ہلکی ہلکی ضرب لگائے۔ اس فعل کا اصطلاحی نام انہوں نے "آدھ مگت" رکھا ہوا تھا۔ جب یہ آدھ مگت ختم ہو جاتی تو پنڈلی کے بالوں کو ہاتھ کی دو انگلیوں سے آہستہ آہستہ نوچنے کو کہتے جس کا

نام انہوں نے "نتف الشعر" رکھا ہوا تھا۔ جب یہ کام ہو جاتا ہو اٹھ کر بیٹھ جاتے اور بچے کو پیار کرتے اور اپنے تہبند کے پلّے یا کرتے کی جیب سے کسی میٹھی چیز کا ایک ٹکڑا اُس کے منہ میں ڈال دیتے تھے۔ یہ گویا اُس کی محنت کا صلہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی بچہ پاؤں کو سہلاتے وقت پاؤں کے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان اپنے ہاتھ کی انگلی ڈال دیتا تو آپ اُسے زور سے بھینچتے جس سے بعض وقت بچہ بے اختیار بلند آواز میں چلانے لگتا۔

مولانا روحی مرحوم میں صلہ رحمی کا جذبہ فطری طور پر ودیعت رکھا گیا تھا۔ انہیں اپنے خاندان کے اعزہ و اقارب بالخصوص مالی طور پر کمزور رشتہ داروں کے نام اور پتے خوب یاد تھے۔ یہ لوگ گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور شیخوپورہ وغیرہ اضلاع کے دور افتادہ گاؤں میں تنگی ترشی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

ڈاکٹر ضیاء الحق صاحب کہتے ہیں کہ جب سال کے بعد زکوٰۃ ادا فرماتے تو حصہ رسدی مالی مدد حاصل کرنے کے لئے وہ لوگ لاہور آتے اور اپنی مشکلات اُن کو بتاتے لیکن وہ اُن سے اس بات پر ناراض رہتے کہ وہ اتنی دور سے تکلیف اٹھا کر خواہ مخواہ لاہور آتے ہیں جس کے لئے وہ کام کاج چھوڑ کر اور خود ہی کرایہ ادا کر کے آجاتے ہیں۔ آخر انہوں نے سختی کے ساتھ سب کو منع کر دیا۔ فرمایا کہ تمہیں تمہارا حصہ بذریعہ منی آرڈر گھر بھیج دیا جایا کرے گا۔ چنانچہ وقت آنے پر وہ ڈاکخانہ سے منی آرڈر کے فارم منگواتے اور تمام غریب قابلِ امداد غریبوں کو مناسب رقم منی آرڈر کے ذریعے بھجوا دیتے اور یہ خدمت میرے ذمے عائد کی جاتی تھی۔

چونکہ وہ خود بچپن میں یتیم ہو گئے تھے اسلئے یتیموں کا زیادہ خیال رکھتے تھے بالخصوص اُن سے جو طلب علم میں لگے ہوئے بہت مانوس تھے اور حتی الوسع اُن کی مدد کرتے رہتے تھے۔

اُن کی صلہ رحمی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے بڑے بھائی مولوی اکبر علی مرحوم گکھڑ میں اکیلے مجرد کی زندگی کافی دیر تک گزارتے رہے۔ وہ زمین کی نگرانی اور مزارعین کے ساتھ حساب کتاب کے لئے کبھی وقت بے وقت گھوما کرتے جس کی وجہ سے وہ کئی دفعہ بیمار ہو جایا کرتے تھے۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ وہ سخت بیمار ہو گئے تو اُن کے ایک ہمسایہ نے مولانا مرحوم کو بذریعہ تار مطلع کیا کہ مولوی اکبر علی صاحب سخت بیمار ہیں، اُن پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ جب یہ تار مولانا کو پہنچا تو شام کا کھانا تناول کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ہی لقمہ منہ میں ڈالا تھا کہ اس تار کا انہیں علم ہوا۔ آپ نے کھانا وہیں

چھوڑ دیا اور فی الفور اہل خانہ کو بتا کر چلے گئے۔ گھر والے کہتے رہے کہ آپ کھانا تو کھا لیں لیکن آپ نے اُن کی
اس درخواست کو نہ مانا اور جب تک وہ بیمار رہے مولانا مرحوم وہیں اُن کے علاج معالجہ کی خدمت بجا
لاتے رہے حتیٰ کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اسی طرح جب آپ کے دوسرے بڑے بھائی مولوی محبوب علی جو لاہور ہی میں مقیم تھے
اور اُن کے ماشاء اللہ دو جوان بچے بھی تھے، جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو مولانا روحی صاحب کالج
جانے کے باقی تمام وقت خود اُن کی خدمت بجا لاتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

گاؤں میں ہر سال موسم گرما کی تعطیلات کے موقع پر جب تشریف لے جاتے تو گاؤں
میں جتنی عورتیں بیوگی کی زندگی بسر کر رہی ہوتیں اُن کو بلا کر نقد دیتے جن میں سے اُن کا حصہ ادا فرماتے
اس معاملہ میں وہ نہایت سخت گیر اور پابندی کا خیال کرنے والے تھے۔

انہیں شہرت اور نام وری والے معاملات سے سخت نفرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کالج
میں ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے معمولی سی گھڑی بھی اپنے پاس نہ رکھی بلکہ ایک دفعہ اُن کے کسی عقیدت مند
نے ایک کلائی کی گھڑی انہیں بطور تحفہ پیش کرنی چاہی مگر اُس کا شکریہ ادا کر کے واپس کر دی اور فرمایا کہ
مجھے یہ نمائشی چیز پسند نہیں۔ اسی طرح اپنے عربی اور فارسی کلام کے طبع کرانے میں جب اُن کے صاحبزادوں
یا شاگردوں میں سے کوئی شخص ذکر کرتا تو اُن کا جواب یہ ہوتا۔ میں اپنی زندگی میں اُن کی طباعت نہیں کرانا
چاہتا۔ اگر میرے بعد کوئی اسے چھاپنا چاہے تو مجھ کو اعتراض نہیں۔ ہاں مولوی ظفر علی خاں مرحوم
اور سر عبدالقادر مرحوم اُن سے کبھی کبھی بڑے اصرار کے ساتھ اُن کی کوئی فارسی نظم بالترتیب جریدہ
زمیندار اور مجلہ مخزن میں طبع کرانے کے لئے اُن سے حاصل کر لیا کرتے تھے۔

گھر پر اور کالج میں وہ اپنی مادری زبان یعنی پنجابی میں ہی گفتگو فرماتے تھے لیکن
محفل مجالس یا علمی قسم کے جلسوں میں آپ کی تقریر بالالتزام اردو زبان میں ہوتی۔ پنجابی زبان کے
دو مرکبات اُن کا تکیہ کلام تھے۔ پہلا مرکب "کھوتی دا سر" یعنی گدھی کا سر تھا۔ یہ اُس
موقع پر استعمال کرتے تھے جب کسی چیز کو بالکل معمولی اور حقیر ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مرکب
"کی ناں لیندا اے" یعنی اس کا کیا نام ہے تھا جب کسی چیز کا نام یا اُس کا خیال ذہن سے
نکل گیا ہوتا اس وقت یہ بولتے تھے اور پھر اُسی وقت انہیں یاد آ جاتا۔ اُن کی طبیعت میں جمال جذب

کے مقابلے میں جلال و جذبہ زیادہ تھا۔ گو کسی بات پر انہیں غصہ ضرور آتا مگر آپ جلدی ہی اس کو دل سے نکال دیتے اور لاحول پڑھتے۔ اُن کی آواز پوری طرح مردانہ اور پُر رعب تھی۔ تقریر کرتے وقت دور دور تک اُن کی آواز سُنی جا سکتی تھی۔ طالب علموں کو پڑھاتے وقت بھی آواز مناسب حد تک بلند ہوتی تھی۔ گھر میں اپنے بچوں پر کسی کام کی خرابی کی وجہ سے اگر ناراض ہو کر انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے تو ہمسایوں کو بھی اس بات کی خبر ہو جایا کرتی اور وہ بچوں سے پوچھتے کہ آج کس کی خبر لی جا رہی تھی۔ مسجد میں بھی جمعہ کے وعظ کے دوران اپنے مقتدیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور سخت سست لفظ بھی استعمال فرماتے۔ حالانکہ سامعین میں بعض معمر اور بزرگ لوگ بھی موجود ہوتے۔ لیکن اُن کے اس غصے کا سبب احکام خداوندی کی نافرمانی اور جہالت ہوتا تھا جسے وہ کسی صورت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چونکہ وہ یہ کام محض فی سبیل اللہ بغیر کسی معاوضہ کے کرتے تھے اس لئے کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ آج کل کے ائمہ مساجد کی طرح نہیں جو تنخواہیں لے کر اور اہل محلہ کی روٹیاں جمع کر کے اپنی کنبہ پروری کرتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اہل محلہ کو سخت سست کہا تو ہماری روٹی بند ہو جائے گی۔ دین کے کام میں کسی سے کوئی معاوضہ لینا مولانا مرحوم کے نزدیک جائز نہیں تھا۔ خاص کر جماعت کرانے یا تبلیغی وعظ کرنے اور قرآن مجید پڑھانے یا اس قسم کے اور کسی کام کی اجرت لینا وہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح وہ خلوصِ نیت اور محض فی سبیل اللہ لوگوں کو شریعت حقہ کی طرف راغب کرتے اور دینی احکام سے مطلع فرماتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی دینِ اسلام کو توجہ اور خلوص کے ساتھ سُن کر اُن پر عمل پیرا ہوں۔ اس سے قارئین کو یہ گمان نہیں ہونا چاہئے کہ اُن کی طبیعت سخت گیر یا ظالمانہ تھی بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ متشدد طور پر پابندِ شریعت اور پیروِ سنت ہونے کے باوجود بعض خشک ملاؤں کی طرح عبوست یا یبوست کا شکار نہیں تھے بلکہ ایک زندہ دل اور شگفتہ مزاج عالم دین تھے۔ چنانچہ اُن کی ظرافت و مزاح کے بہت سے واقعات سننے میں آئے ہیں جس کی مثالیں ان شاء اللہ آگے پیش کی جائیں گی۔

مزاح و ظرافت

آپ کا چہرہ بالعموم اور آپ کا انداز بالخصوص متانت و سنجیدگی کا آئینہ
دار تھا مگر قدرت نے انہیں لطیف قوت اور جوہر عالی ظرفی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت کو مزاح
کے عنصر سے بھی نوازا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسا طنز بھر دیتے کہ سننے والا پہروں محظوظ ہوتا
سطحی مزاح پر طبیعت مائل ہی نہ ہوتی چونکہ مزاج درویشانہ اور قلب مومن کا پایا تھا۔ لہٰذا
انتہائی گہرے طنز میں بھی سننے والے کی دل آزاری نہ ہوتی۔ برخلاف اسکے وہ بات کی تہ کو پا جانے
کے بعد ذہنی انبساط حاصل کرتا۔

مزاح عربی زبان کا لفظ ہے جو عموماً اردو میں خوش طبعی، دل لگی اور ظرافت کے لئے
استعمال ہوتا ہے۔ مذہب کے دائرے کے اندر رہ کر اگر کسی شخص میں یہ عادت ہو تو اس کو اچھے اخلاق کی
نشانی اور خوبی خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد واقعات کتب و سیر و احادیث
میں ملتے ہیں جن سے آپ کی طبیعت میں اس وصف کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس عادت سے مقصود
یہ ہوتا ہے کہ کسی بات سے کوئی لطیفہ اور نادر نکتہ پیدا کر کے تھوڑی دیر کے لئے اپنا اور سامع کا دل بہلایا
جائے اور دماغی تفریح کا سامان مہیا کیا جائے لیکن شرط یہ ہے کہ اس بات میں حق گوئی کے خلاف
غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے۔ ورنہ یہی مزاح تمسخر اور ہزل میں تبدیل ہو کر قابل مذمت قرار پائے گا
جس کی قرآن مجید میں ممانعت آئی ہے۔

یا ایہا الذین امنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیراً منہم (۴۹ : ۱۱)

یعنی اے ایمان والو! ایک جماعت دوسری جماعت والوں کے ساتھ تمسخر سے کام نہ لے ممکن ہے کہ
وہ لوگ (جن سے تمسخر کیا جا رہا ہے) ان (تمسخر کرنے والے) سے بہتر ہوں۔

تمسخر میں کسی شخص کی اہانت اور اس کے عیب ظاہر کرنے کی نیت ہوتی ہے لیکن مزاح
میں صرف خوش طبعی اور دل لگی مقصود ہوتا ہے۔

مولانا کے مزاح کی چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں

۱۔ مجلس سے محبت کے سلسلہ میں آؤ بھگت اور نقد الشعور وغیرہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے

اس کا مقصد بھی بچوں کا دل بہلانا ہوتا تھا۔ روز مرہ کی "گفتگو" کے علاوہ اُن کے بعض اشعار میں بھی بعض
ایسی مثالیں مل جائیں گی اور خوش طبعی کی پائی جاتی ہیں۔ ایک فارسی نظم جس میں مزاح کا عنصر غالب ہے
نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ یہ اشعار اُن کے فارسی کلام کا ایک نادر نمونہ بھی ہیں۔ اس نظم سے
پہلے انہوں نے اس کا پس منظر بھی بیان فرما دیا ہے چنانچہ لکھی ہے

۳۔ فقیر مؤلف را وقتے در ایام شدتِ سرما بخانۂ دوستے لب آب اتفاق جمعیت
افتاد۔ بہ شیر و برنج لوازم ضیافت بجا آورد۔ چوں بہ بسترِ خواب مائل شدم گلیمے سبک
کہ پنبہ اش بغایت تنک و اجزائش از ہم گسستہ بود بزاویۂ گلیم مجتمع گشتہ بود پیش من آورد
طوعاً و کرہاً خود را بداں پیچیدم و شب آں ہمہ زحمتِ سرما کشیدم۔ لمؤلفہ ؎

میرس از من کہ چوں بگذشت آں شب
من و سرما و لب سرگرم یارب

بامداداں چوں سر از بالینِ خواب برداشتم بہ آب یخ بستہ دست بہ وضو برافراشتم
چوں از فراغ صبح فراغت یافتم آں دوست بہ تمہید عذر تقصیرے کہ معلوم او بود زبان بہ معذرت
برگشاد۔ روحی بخصت و دو سہ قطعہ کہ در کیفیتِ احوال آں شب گفتہ بود با علم مزاح برکشیدہ
بدستش داد۔ قطعہ این است۔

قطعہ:

نعوذ باللہ ازیں شہر سرد سیر زمیں
کہ از تطاولِ سرما نخفتہ ام ہمہ شب
گلیم کہنہ بہ برداشتم ز بد بختی
بہ تار ہاش دُرِ اشک سفتہ ام ہمہ شب
چو خار پشت سر و پائے من شدہ یکجا
تنک بہ دامنِ سرما نہفتہ ام ہمہ شب
ز سرد مہری یارانِ گرم خو گوئی
بہ غنچگی چو گُلِ تر شگفتہ ام ہمہ شب

فراخ بود سماط برنج و شیر کزاں

زکام و سرفہ و بلغم برفتہ ام ہمہ شب

باستخوانِ نحیفم برفت آنچہ برفت

ولے برسمِ تکلف نہ گفتہ ام ہمہ شب

کنارِ بعد دراں زمہریر خیز وثاق

خروشِ نالۂ بوحی شنفتہ ام ہمہ شب

۳۔ آپ کے ایک عزیز شاگرد مولوی غلام علی صاحب جھنگ میں ڈسٹرکٹ کورٹ میں ایک ملازم تھے۔ وہ مولانا کو جھنگ تشریف لے جانے کی دعوت دیا کرتے تھے چنانچہ آپ جب پہلی بار جھنگ گئے تو اتفاق سے وہاں ایک مذہبی جلسہ ہو رہا تھا جس میں مولانا کے لئے تقریر کا وقت رکھا گیا تھا۔ اُن دنوں جھنگ کا ریلوے سٹیشن ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا اسلئے شور کوٹ روڈ کے سٹیشن پر اتر کر لاری یا تانگے کے ذریعے جھنگ جانا پڑتا تھا۔ راستہ کچا تھا اور اس میں جابجا گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ جس سے تانگے کو سخت جھٹکے لگتے تھے۔ اس سے مولانا کو سخت تکلیف ہوئی۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے بعد جب صاحبِ خانہ سے ملے تو انہوں نے مولانا کی مزاج پرسی کی۔ مولانا نے فی البدیہہ یہ شعر پیش کیا ؎

فلک می داشت بار وحی سرِ جنگ — کہ آوردش بتانگہ جانبِ جھنگ

یہ شعر سن کر تمام حاضرین بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک ہنستے رہے۔ یہ واقعہ مولوی غلام علی صاحب مرحوم کے صاحبزادہ حافظ محمد شفیع صاحب نے بیان کیا۔

۴۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم فرماتے ہیں کہ جن دنوں میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ کالج کی عمارت کا مشرقی حصہ انجمن حمایت اسلام کے دفتر کے لئے مخصوص تھا۔ ایک دن اس دفتر میں انجمن کا کوئی اجلاس منعقد ہونے کو تھا جس میں شرکت کے لئے کالج کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر نبی بخش بیرسٹر تشریف لائے۔ ہم اس وقت مولانا روحی سے کالج کی گراؤنڈ میں دھوپ میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ سیکرٹری صاحب مولانا کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور سلام کئے بغیر انجمن کے دفتر کا پتہ پوچھا۔ استادِ گرامی کو اُن کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ انہوں نے نہایت بے اعتنائی سے اپنے عصا کے اشارے سے بتایا "اُدھر" وہ اُس سمت میں چلے گئے لیکن

تلاش میں ناکام رہے۔ لہٰذا واپس آگئے اور مولانا سے پھر پوچھا۔ مولانا نے حسبِ سابق اشارہ سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ اُس طرف۔ وہ دوبارہ ادھر گئے مگر بے سود۔ ناچار تیسری مرتبہ پھر آئے۔ بار بار سلسلۂ تدریس منقطع ہونے کے باعث استادِ گرامی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اسلئے ذرا تلخی کے لہجہ میں بولے "اے کہ شخص اُدھر جاؤ"۔ وہ کہنے لگے کہ میں انجن کے دفتر کا پتہ پوچھتا ہوں اور آپ کہتے ہیں اے کہ شخص ادھر جاؤ۔ یہ "اے کہ شخص" کا کیا معنی ہے؟ آپ کو جواب دینے کی بھی تہذیب نہیں۔ اس پر آپ سخت طیش میں آگئے اور فرمایا: اچھا تم مجھے تہذیب سکھانے آئے ہو۔ مگر تمھیں میاں "اے کہ شخص" نہ کہوں تو کیا "خرِ نامشخص" کہوں۔ یہ سُن کر وہ اپنا سا منہ لے کر چلے گئے اور تمام لڑکے اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکے۔

۵۔ ایک دفعہ مولانا اپنے گاؤں تشریف لے گئے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اُن کا ایک قدیمی خادم احمد دین مرحوم جو کفش دوزی کا کام کرتا تھا۔ حاضرِ خدمت ہوا اور مولانا کے پاؤں دابنے لگا تاکہ سفر کی تھکاوٹ دور ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے اُسے حکم دیا:

"حالا برخیز و قلیان چاق کن"

وہ بے چارہ بالکل ناخواندہ تھا۔ فارسی کب سمجھتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ معلوم نہیں آپ نے کیا فرمایا ہے؟ اُس کو اس حالت میں دیکھ کر مولانا فرمانے لگے اگر تم میری اس بات کا مطلب بتا دو تو ایک روپیہ انعام ملے گا۔ اس پر وہ اُٹھا اور حقہ تیار کر کے لے آیا۔ اس پر مولانا بہت متعجب ہوئے اور روپیہ اُس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگے تمھیں میرا مطلب کیسے پتہ چلا۔ اُس نے کہا حضور یہ کوئی مشکل بات ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تین چار گھنٹے کے سفر کے دوران میں پانی تو آپ نے پی ہی لیا ہوگا کیونکہ وہ تقریباً ریلوے کے تمام سٹیشنوں پر دستیاب ہو سکتا ہے حقہ چونکہ نہیں ملتا اسی لئے آپ ضرور ہی مانگتے ہوں گے اور گھر پہنچ کر ایک حقہ نوش انہیں دو چیزوں کا سب سے پہلے محتاج ہوتا ہے اور ہمارے ہیں بھی کہتے ہیں کہ اُس نے ہمیں حقہ پانی تک نہ پوچھا۔ یہ سُن کر مولانا مسکرا پڑے اور اُس کی فراست کی داد دیتے رہے۔

۶۔ ایک دفعہ ملنے والوں میں سے کوئی صاحب تشریف لائے اور کہا کہ میں نے اپنا پہلا مکان بدل لیا ہے کیونکہ اُسکی بہت خستہ حالت تھی اور اُس کی بجائے ایک اور مکان کرائے پر لے لیا ہے

جو بفضلِ خدا پہلے کی نسبت بہت کشادہ اور ہموار ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ کیا وہ منجّل اور منتاک ہے؟ یہ نامانوس الفاظ سُن کر وہ بیچارہ سوچ میں پڑ گیا اور پریشان ہو کر عرض کیا۔ حضرت میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا۔ دوبارہ ارشاد فرمائیے۔ آپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے لیکن اُس کے پلّے کچھ نہ پڑا اور بات کی وضاحت چاہی۔ فرمانے لگے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اُس مکان میں بجلی اور نلکے کی سہولتیں بھی ہیں یا نہیں۔ یہ سُن کر وہ شخص قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بار بار اُن لفظوں کو دہراتا رہا۔

۷۔ آپ کے عزیز شاگرد عبدالبشیر آذری صاحب مرحوم راوی ہیں کہ ایک روز استادِ گرامی کے دولت کدہ پر حاضر تھا۔ اس سے ایک دن پہلے موسلا دھار بارش ہوتی رہی تھی اور اُس دن بھی ہلکا ہلکا ترشّح ہونے لگا۔ اتنے میں مہترانی جو گھر کی صفائی پر مامور تھی اور لاہور کے قریب ہی کسی گاؤں سے آیا کرتی تھی، آ گئی۔ مولانا کی نظر جب اُس پر پڑی تو اس سے فرمایا:

"اری کیّاسہ تیرے قریہ میں بھی ایسا ہی تقاطر و تماطر ہوا ہے یا نہیں"

ظاہر ہے کہ وہ بیچاری اس سے کیا سمجھتی۔ استادِ گرامی نے بھانپ لیا کہ وہ بات کو سمجھنے سے قاصر ہے لیکن اپنی عادت کی بنا پر اپنی علمی شان کو مدِنظر رکھتے ہوئے عام لوگوں کی بولی پر اُترنا آپ نے گوارا نہ کیا اور فرمایا:

"تُو چاہے ادراک و تفہیم سے کام نہ لے لیکن اپنا طرزِ تکلّم اور اندازِ تخاطب علیٰ ہذا القیاس ہی رہے گا۔"

۸۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم راوی ہیں کہ ایک بار استادِ گرامی موسمِ سرما میں کالج گراؤنڈ میں درس دے رہے تھے اتنے میں ایک سپیرا آیا اور بین بجانے لگا۔ استادِ گرامی نے اُسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کیا بات ہے؟ اُس نے جواب دیا: جناب میرے پاس کچھ کیڑے (سانپ) ہیں جو میں آپ کو اور آپ کے شاگردوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔ فرمایا: اچھا دکھاؤ۔ اُس نے اپنی پٹاریوں سے ایک ایک سانپ نکال کر دکھانا شروع کیا اور آپ بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ ایک سانپ کے بارے میں آپ نے پوچھا کہ یہ کس قسم کا ہے۔ سپیرے نے کہا: جناب یہ کالر کے علاقے میں پایا جاتا ہے اور میں کل ہی اسے پکڑ کر لایا ہوں۔ یہ سُن کر فرمایا: یہ عجیب

نامعقول آدمی ہے ۔ میں صاحب کی نوعیت کی بابت پوچھتا ہوں اور یہ اُس کا جواب ظرفیت میں دیتا ہے اس پر وہ بیچارا اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ۔

یہ واقعہ مولانا مہر کے علاوہ اور بھی آپ کے کئی شاگردوں نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

۹ ۔ ایک دفعہ آپ کے گاؤں کا نمبردار اور سفید پوش جس کا نام فیض تھا ، آپ سے ملنے کے لیئے لاہور آیا ۔ آپ اُس وقت نماز عصر ادا کرنے کے بعد مسجد ہی میں تشریف رکھتے تھے ۔ چونکہ آنے والا شخص رات کو آپ کے ہاں ہی قیام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اسلیئے اہلِ خانہ کو اس بات سے مطلع کرنا ضروری تھا تاکہ وہ اس کے قیام و طعام کا بندوبست کر رکھیں ۔

ڈاکٹر رانا صاحب کا بیان ہے کہ والد مرحوم مغفور نے مجھے یاد فرمایا اور فارسی میں یوں کہا :

" نام این شخص را عکس کردہ اہتمام شب باشی بکن "

یعنی اس شخص کے نام کو الٹا کر اسکے یہاں رات ٹھہرنے کا بندوبست کرو ۔ چونکہ فیض کے لفظ کو الٹنے سے ضیف بنتا ہے جس کے عربی میں معنی مہمان کے ہوتے ہیں اسلیئے اس کنایہ سے ایک طرح سے یہ بتایا کہ یہ رات یہیں ٹھہرے گا ۔

۱۰ ۔ مولانا علم الدین سالک مرحوم نے بیان کیا کہ ملک غلام محمد مرحوم (سابق گورنر جنرل پاکستان) اور اُن کا ایک ساتھی طالب علم نور محمد نامی مولانا روحی سے عربی پڑھا کرتے تھے ۔ چند دن عربی پڑھنے کے بعد نور محمد نے آرٹس کے مضامین چھوڑ کر سائنس پڑھنا شروع کر دی ۔ ایک دن کالج کے برآمدے میں مولانا سے اُسکی مڈبھیڑ ہو گئی ۔ اُسے دیکھ کر پوچھا " ارے نورے تیری ماں کون سے جن (ربّ کے الجن) جنایا کرتی تھی کہ تو نے عربی چھوڑ کر سائنس پڑھنا شروع کر دیا ہے ؟ " یہ سُن کر نور محمد سخت سٹپٹایا ۔

مندرجہ ذیل دو عدد لطیفے روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں طبع ہوئے تھے ۔

۱۱ ۔ مولانا روحی اللہ بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے ۔ اُن کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ بول چال میں ہمیشہ علمی زبان استعمال کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایک لڑکا اُن کے کسی دوست کا جواب طلب خط لایا ۔ انہوں نے لڑکے کو زبانی ہی جواب دیا اور وضو کرنے چلے گئے ۔ لڑکا جب واپس پہنچا تو

دوست نے پوچھا کہ خط پڑھ کر مولانا نے جواب نہیں لکھوایا۔ لڑکا بولا سرکار خط پڑھ کر درود شریف پڑھتے ہوئے وضو کا لوٹا اٹھا کر چل دیئے۔

۱۲ - ایک مرتبہ مولانا برانڈرتھ روڈ پر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک لڑکا گول گپیوں کا خوانچہ لگائے کھڑا تھا۔ کھٹائی دیکھ کر مولانا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ رال ٹپکی۔ لڑکے سے پوچھنے لگے۔ میاں صاحبزادے یہ جنسِ لطیف عمدگا بیچتے ہو یا ونگا۔ لڑکا بولا بابا جی میرے گول گپے شان ویکھن لئی کجھ نئیں جیب تاں بس گل گپے ویکھن والی۔

مندرجہ بالا یہ واقعہ آپ کے متعدد شاگردوں نے بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے

۱۳ - مولانا کے صاحبزادہ صاحب ڈاکٹر محمد بہاؤالحق راز کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب موسم گرما کی تعطیلات میں والد صاحب مرحوم اپنے گاؤں میں مقیم تھے تو ضلع گجرات کے ڈپٹی کمشنر خان بہادر خورشید احمد اپنے کچھ ماتحت عملے کے ساتھ سرکاری دورے پر پھرتے پھراتے کنجاہ کی طرف آ نکلے۔ وہ والد صاحب مرحوم سے کالج میں پڑھتے رہے تھے۔ والد صاحب نے طالب علمی کے زمانے میں اُن کا نام "لگڑ بگڑ" رکھ چھوڑا تھا۔ جب ڈپٹی کمشنر صاحب کو معلوم ہوا کہ آج کل اُن کے استاد گرامی اپنے گاؤں میں تشریف رکھتے ہیں تو وہ اپنے عملہ اور گاؤں کے کچھ سربرآوردہ لوگوں کے ساتھ ملاقات کے لئے حاضر ہوئے حالانکہ وہ اس وقت بہت بڑے افسر تھے اور اُن کی عمر بھی پچاس سال سے زائد تھی اس کے باوجود جب انہوں نے والد صاحب سے مصافحہ کیا تو اُن کی کچھ گوشمالی کرنے کے بعد اُن کی گردن پر پیار سے دو تین چپت رسید کیں۔ وہ اس دوران فرطِ عقیدت سے اپنی گردن جھکائے کھڑے رہے۔ والد صاحب نے جب انہیں لگڑ بگڑ کہہ کر مخاطب کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہا کہ آپ کو آج تک میرا یہ نام کیسے یاد رہا اور وہ بہت خوش ہوئے

۱۴ - لاہور کے جس محلے میں آپ آخر دم تک قیام پذیر رہے بعض لوگ نماز سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں بیٹھا کرتے تھے کیونکہ انہیں آپ کے ساتھ بہت عقیدت تھی۔ بالخصوص عصر کے بعد جب لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے گھر آتے تو عصر کی نماز کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ تین نوجوان جو بڑے پکے نمازی بن گئے تھے اور تینوں ہم عمر اور آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اُن کے نام ۱ محمد سعید (ملازم ریلوے) ۲ محمد شفیع (گھڑی ساز) اور محمد امین (دکاندار) تھے

یہ تینوں اکثر آپ کے پاس بیٹھتے اور بار بار مٹھیاں بھی بھرتے تھے۔ مولانا مرحوم نے اُن کے نام اپنی عادت کے مطابق بالترتیب یہ رکھ چھوڑے تھے۔ خطرناک، سیل ہے اور پلکن۔

ایک دن ابن نے ان تینوں کے بارے میں چند اشعار اردو زبان میں موزوں کئے۔ جن میں سے صرف دو شعر ہی مل سکے ہیں جو یہ ہیں ؎

خطرناک و سیل ہے اور پلکن　　یہ ہیں تینوں بڑے چالاک و پرفن
خدا محفوظ رکھے ان کے شر سے　　کہ ہیں سب لوگ خائف ان کے ڈر سے

۱۵۔ محلے کی مسجد میں ہی ایک درویش غلام حسین نامی جو ضلع میانوالی سے تعلق رکھتا تھا رہا کرتا تھا۔ اُسے ملک کے سیاسی معاملات اور اخباری خبروں کے ساتھ بہت دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ وہ تقریباً سارا دن گھومتا پھرتا رہتا اور مغرب کی نماز کے بعد تقریباً روزانہ اِدھر اُدھر سے جمع کی ہوئی خبریں مولانا مرحوم کو سنایا کرتا تھا۔ اگر کسی دن وہ حاضر نہ ہوتا تو مولانا مقتدیوں سے پوچھتے کہ آج وہ موبائل رپورٹر کہاں گیا۔

۱۶۔ اسی طرح ارائیں برادری سے تعلق رکھنے والے دو اور شخص تھے جن کا نام علم دین اور مہر لدّا تھے۔ علم دین سبزی منڈی میں سبزی بیچا کرتا تھا اور مہر لدّا پھلوں کی دکان کیا کرتا تھا۔ علم دین کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت حریص ہے اور مہر لدّا روزانہ ورزش اور تن سازی کا بہت شوقین تھا۔ اس لئے وہ پورا جوان اور قوی شخص تھا۔ ان دونوں کے نام آپ نے "دھڑ بھکہ" اور "دھرتی دھکہ" رکھے ہوئے تھے۔

۱۷۔ اسی طرح کے نام اُن لوگوں کے رکھے جاتے تھے جن سے آپ بہت مانوس ہوتے تھے اور وہ لوگ اس کو اپنی خوش نصیبی اور سعادت محسوس کرتے۔ جب مولانا اُن کو اس نام سے یاد کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ اُن کے اپنے اہل خانہ بھی اس مشفقانہ روش سے بچے نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دن جب اُن کے صاحبزادہ رانا بہاء الحق صاحب اپنی ہمشیرہ کے ساتھ مل کر اپنے والد مرحوم سے جغرافیہ کی ایک کتاب پڑھ رہے تھے تو اس میں دو شہروں کا ذکر آیا جن کے نام پانڈی چری اور چرا پونجی تھے۔ چونکہ یہ انوکھے نام تھے اس لئے آئندہ کے لئے مولانا نے اُن دونوں کے یہی نام تجویز کئے اور بہت مدت تک اُن دونوں کو انہیں ناموں سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

۱۸ - ڈاکٹر ضیاء الحق صوفی بیان کرتے ہیں کہ جب قبلہ والد صاحب مرحوم تعطیلات گرما میں گاؤں تشریف لے جایا کرتے تو قریب ہی وزیر آباد کا شہر واقع تھا جہاں اُن کے ایک معتقد قاضی باقی شاہ مرحوم رئیس وزیر آباد مقیم تھے۔ قاضی صاحب کا ایک ملازم تھا جو قاضی صاحب کے مودی خانہ (رسد کا سٹور) کا محافظ تھا۔ (قاضی صاحب کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بالالتزام ہر سال والد صاحب مرحوم کو وزیر آباد جانے کی تکلیف دیا کرتے تھے) وہ عجیب قسم کا آدمی تھا وہ ہر وقت ایسے نظر آتا جیسے ناراض ہے اور ہر وقت چیں بجبیں دکھائی دیتا تھا۔ یہ اُس کی فطری عادت تھی کسی بات پر خوش بھی ہوتا تو بھی اُس کی تیوری چڑھی رہتی۔ اُس کا نام والد صاحب مرحوم نے "الذی لایتمیز غضبہ عن رضاہ" رکھ چھوڑا تھا اور قاضی صاحب مرحوم سے یہی نام لے کر اُس کا حال دریافت کرتے تھے۔

۱۹ - ڈاکٹر مولوی شفیع مرحوم بتاتے ہیں کہ باوجود زہد و تقشف کے ظرافت اور شگفتگی زمانہ طالب علمی میں بھی اُن کی فطرت میں تھی۔ اورینٹل کالج (ہوسٹل) اُن دنوں روشنائی دروازہ کے دروں میں تھا۔ وہاں مولانا کے زمانے کا جو باورچی تھا وہی ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں ٹریننگ کالج کے ہوسٹل میں ہمارا باورچی رہا جب کہ میں اُس کالج میں ایم۔اے کرنے کے لیے S.V. کلاس میں داخل ہوا۔ اُس باورچی نے بتایا کہ ماہ رمضان میں مولانا مذاق سے سحری ختم ہونے کے وقت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تو اذان کی آواز نہیں سُنی یا کہتے کہ میں نے تو صبح صادق کی روشنی نہیں دیکھی۔

۲۰ - مولوی محمد شفیع یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ تھوڑی بہت سیر کیا کریں کیونکہ قرآن مجید میں "سیروا فی الارض" آیا ہے۔ وہ ظرافت کے پیرائے میں فرمانے لگے کہ آفاق و انفس میں سے میں ابھی انفس سے ہی فارغ نہیں ہوا۔

۲۱ - میاں مولا بخش خضر تمیمی مرحوم لکھتے ہیں کہ میرے طالب علمی کے دور میں پروفیسر ڈاکٹر محمد دین تاثیر کالج کے مجلہ کریسنٹ کے نگران تھے اور میں اردو حصہ کا ایڈیٹر تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ جاؤ اور مولانا روحی سے غزل مانگ لاؤ، میں نے عرض کیا: "جی"! وہ تو مولوی ہیں وہ غزل کیسے کہتے ہوں گے۔ ڈاکٹر تاثیر نے فرمایا کہ تم کیا جانتے ہو وہ اس وقت عربی و فارسی علم و ادب اور دینی علوم کا ایک باوقار سنگم ہیں۔ چنانچہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور استاد تاثیر مرحوم کا پیغام اُن تک پہنچایا تو انہوں نے فارسی کی ایک غزل مرحمت فرمائی۔

اُس دن سے میں اپنی لگاؤ کی وجہ سے بھی مولانا کے زیادہ قریب ہو گیا۔ میں نے اُن دنوں داڑھی چھوٹی سی ہوتی تھی (جو بحمد اللہ ابھی تک برقرار ہے) اسلئے وہ اکثر فرماتے:

" او محض مولوی پھینک اپنے تئیں ادھر کو۔ "

۲۲ - ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم ایک دیہاتی علاقے میں کسی شادی میں شمولیت کے لئے گئے۔ یہ اُن کی جوانی کا زمانہ تھا۔ وہاں دیہاتی علاقے کے مطابق کھانا بالکل سادہ تھا اور حقیقت میں وہ بالکل دعوت شیرازی تھی۔ جب گھر آئے کسی نے روداد پوچھی تو آپ نے یہ دو شعر موزوں کر کے اُس کو سنائے ؎

کھانے آیا تھا میں کی روٹی — سر پہ ٹوپی تھی ہاتھ میں سوٹی
چند چاول تھے جن کی چوٹی پر — وحدہٗ لاشریک تھی بوٹی

۲۳ - ڈاکٹر قریشی صاحب اوپر بیان کی گئی دعوت کے علاوہ ایک اور دعوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ دعوت نہایت مختصر تھی اور حقیقت میں بالکل دعوت شیرازی تھی۔ مولانا جب گھر آگئے کسی نے روداد پوچھی تو آپ نے فرمایا: ؎

رکابی تنگ تر از چشم بلبل — دروں سالنے نہادہ ذرۂ گل
ز باورچی چو گفتم هست چیزے؟ — بگفتہ هیچ نے داریم بالکل

۲۴ - پروفیسر قریشی احمد حسین احمد قلعداری لکھتے ہیں کہ قاضی ارشاد علی ساکن قصبہ عنبرکلاں مولانا صاحب کے عزیز شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں گکھڑ گیا۔ چھٹیوں کا موسم تھا۔ مولوی صاحب گکھڑ میں ہی تھے۔ میں بھی رات وہیں رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا صاحب کے صاحبزادگان میٹرک اور مڈل کلاسوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ سردیوں میں مولوی صاحب رات کو تصنیف و تالیف میں مصروف اور بڑے صاحبزادے کو پاس بٹھا لیا کرتے۔ وقت زیادہ گزر گیا تو بچہ تھک گیا لیکن مولوی صاحب اسکو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اتفاق سے حقہ کی آگ سرد ہو گئی۔ مولانا آگ بنانے کے لئے بیٹھک سے نکلے۔ صاحبزادہ صاحب نے موقع غنیمت جانا ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ منہ پر کپڑا لیا اور بڑے ٹھاٹھ میں کہنے لگے: "میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے۔" مولانا صاحب سُن رہے تھے۔ بیٹھک میں تشریف لائے، کان سے پکڑا اور اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا: "کھلے آنکھ صلِّ علیٰ کہتے کہتے۔"

باب سوم

(تحریکِ ترکِ موالات)

باب سوم

تحریکِ ترکِ موالات

روزنامہ زمیندار[1] لاہور میں بعنوان "حضرت مولانا ابوالکلام کا فتویٰ" مندرجہ ذیل مضمون چھپا:

زمیندار کی اشاعت پیروزہ میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک فتویٰ بالفاظ ذیل شائع ہوا تھا۔

"احکامِ شرعیہ کے رو سے کسی مسلمان طالب علم کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ سرکاری کالج یا کسی ایسے کالج میں تعلیم حاصل کرے جو سرکار سے امداد قبول کرتا ہو اور سرکاری یونیورسٹی سے ملحق ہو۔"

اس میں شک نہیں کہ اس فتویٰ کے الفاظ میں قرآن مجید کی آیات و احادیث نبوی کا حوالہ نہیں دیا گیا لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ جس دن اسلامیہ کالج کے ہال میں کالج کے بڑے بڑے اربابِ اقتدار کا جلسہ منعقد ہوا تھا، اس دن جناب مولانا ابوالکلام نے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عدم تعاون کی فرضیت ثابت کر دی تھی۔ اس کے بعد طلبہ نے جناب مولانا سے مندرجہ بالا مختصر تحریر لکھوا لی تھی، جس میں آیاتِ قرآنی و احادیث کی اسناد بخوفِ طوالتِ کلام و عدم فرصت محذوف کر دی گئی تھیں اور صرف فتویٰ کا نفسِ مضمون رکھا گیا تھا کیونکہ مولانا آیات و احادیث متعلقہ کی تفسیر و تشریح اسی مجلس میں سنا چکے تھے اور تقریباً تمام حضارِ مجلس کو قائل کر چکے تھے چنانچہ انہوں نے دستخط بھی کر دئیے تھے۔ انجمن کی کونسل کے ایک نائب صدر فضل الدین صاحب وکیل عدم تعاون کے ذکر پر اس قدر بھنائے تھے کہ اس "آزمائش و ابتلا" کے دن جلوہ گاہِ امتحان سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے تھے۔ جب "زمیندار" میں مولانا کا فتویٰ مندرج تھا تو وہ اسے لے اڑے اور کسی پر تو بس چلا نہیں۔ اسلامیہ کالج کے علماء یعنی مولانا اصغر علی صاحب روحی، مولانا احمد علی صاحب اور مولانا محمد عمر خاں صاحب کو طلب کیا اور ان سے ایک تحریر اس مضمون کی لے لی۔ چونکہ ابوالکلام

---

[1] مورخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء ص ۳

کہ فتوے کے الفاظ میں کوئی دلیل مذکور نہیں۔ نہ کسی آیت و حدیث کا حوالہ ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے نہ تو یہ حجت شرعی ہے اور نہ قابل عمل۔ لہٰذا طلبہ کو کالج و سکول کی تعلیم کا حرج نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے بعض علماء بھی عجب موم کی ناک واقع ہوئے ہیں۔ متذکرہ بالا تحریر پر پاس خاطر مولوی فضل الدین صاحب نے دستخط کر دیئے لیکن جب ملک لال خان صاحب بحیثیت ناظم پنجاب خلافت کمیٹی ان علمائے کرام کی خدمت میں تشریف لے گئے اور مسئلہ عدم تعاون طلبہ کے متعلق دریافت کیا۔ تو انہوں نے مندرجہ ذیل تحریریں دیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مسئلہ عدم تعاون طلبہ کے متعلق یہ تینوں علماء خلافت تفیذب میں ہیں اور انہوں نے مندرجہ بالا تحریر میں صاف مولوی فضل الدین کے مجبور کرنے پر لکھ دی ہیں۔ تحریریں حسب ذیل ہیں:

مولانا محمد عمر خانصاحب

اس مسئلہ میں میں نے ابھی تک کوئی اپنی رائے قائم نہیں کی۔ میں اس کے متعلق ابھی تحقیقات کر رہا ہوں۔ میں نے صرف مجبوری سے دستخط کر دیئے تھے۔ مولوی فضل دین صاحب کے مکان پر یہ فتویٰ پیش ہوا تھا لہٰذا اس میں مولوی ابوالکلام صاحب کے فتویٰ کی تردید تھی جو ۲۲ اکتوبر ۲۰ء کے زمیندار میں شائع ہوا تھا۔

العبد

محمد عمر خان عفی عنہ

مولانا اصغر علی روحی

میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کے فتویٰ مندرجہ "زمیندار" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صرف فتویٰ مذکورہ کے الفاظ پر مبنی تھا جو دلائل قرآنیہ اور حدیث نبویہ کے الفاظ سے خالی ہیں۔ لہٰذا ایسا لکھنا مسئلہ متنازع فیہا کے متعلق کسی رائے کا قائم کرنا نہیں خیال کیا جاتا۔ ضمناً لکھتے وقت بھی میں نے یہی کہا تھا میں غور کر رہا ہوں اور موافق و مخالف پہلوؤں پر نظر کر رہا ہوں۔ آیات قرآنیہ میں اپنی ذاتی رائے کو دخل دینا میرا مسلک نہیں۔ جبکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ای سماء تظلنی وای ارض تقلنی اذا قلت فی القرآن برأیي" (التفسیر ۱: ۲۶۰)

یعنی کس آسمان کے نیچے رہوں گا اور کس زمین پر بسوں گا جب میں اپنی رائے سے قرآن بولوں۔

حدیث صحیح ہے:

"من فسّر القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار" (المناوی ۲: ۱۸۰م)

یعنی جو شخص قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرے وہ جہنم اپنا ٹھکانہ بنائے۔

تاحال میں نے کوئی فتویٰ اس مسئلہ متنازعہ فیہا کے متعلق قائم نہیں کیا۔

خاکسار

اصغر علی روحی عفا اللہ عنہ

۲۶ اکتوبر ۳۰ء

مولوی احمد علی صاحب

میں بھی مولوی اصغر علی صاحب کے مطابق ہوں۔ میری ابھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہوئی۔

احمد علی عفی عنہ

ہم مولوی فضل الدین صاحب اور ان جیسے دیگر حضرات سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آخر آپ کو ان مذبوحی حرکات سے کیا حاصل ہے۔ آپ کوئی کام کی بات کیجئے۔ اگر آپ عدم تعاون کے مخالف ہیں تو میدان میں آئیے۔ دلائل پیش کیجئے اور جواب لیجئے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ جب دلائل کا میدان گرم ہوتا ہے تو آپ بیٹھ دکھا جاتے ہیں اور گھر کے اندر پردہ نشین بن کر اس قسم کی کارروائیاں کرتے ہیں۔ جن پر نوعمر لڑکے بھی ہنستے ہنستے لوٹ ہو جاتے ہیں۔ آہ! ؎

پیرہا پیر از بیاضِ مُو شدند　　سُخرۂ بہر کودکان کو شدند

ہم اسلامیہ کالج کے محترم علماء سے نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آخر کب تک مخمصہ و خوض میں مصروف رہیں گے۔ آپ کو یہ بتانا ہے کہ جراغ دکھانا ہے کہ "مذبذبین" کی حیثیت دینی حقہ میں کیا ہے۔ (م: ۱۴۳)

مذبذبین بین ذالک لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا

اسلام پر مصیبت کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ ملک پر غلامی کی لعنت طاری ہے اور آپ ہیں کہ ابھی غور ہی نہیں کر چکتے۔ خدا کے لئے جلد فیصلہ کیجئے۔ اور میدان میں آئیے جب آپ ہی اپنے

فرائض سے غافل ہو گئے تو پھر ہم مسلمان اس جماعت کو کہاں ڈھونڈیں، جس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنہون عن المنکر" (۳: ۱۱۰)

اسکے بعد اسی روزنامہ میں یہ مضمون طبع ہوا۔[1]

اسلامیہ کالج لاہور کے علمائے محترم

"ایک غلط فہمی کا ازالہ"

حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی مدظلہ، مولانا احمد علی صاحب، مولانا محمد عمر خان صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر ہمارے پاس موصول ہوئی ہے

جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار، السلام علیکم۔ جناب مولوی ابو الکلام صاحب آزاد نے مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کے پرچہ "زمیندار" میں صرف یہی لکھا تھا کہ انگریزی کالجوں اور سکولوں میں از روئے احکام شریعت تعلیم حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس پر بعض اکابر قوم نے دریافت کیا کہ اس فتوے کے متعلق آپ از روئے شریعت کیا رائے رکھتے ہیں۔ چونکہ مولوی صاحب کی عبارت میں آیات و احادیث سے استدلال نہیں کیا گیا تھا۔ اسی لئے ہم نے تحریر کر دیا تھا کہ مولوی صاحب کی یہ عبارت شرعی حجت نہیں ہے اور یہ فی الواقع صحیح ہے کیونکہ فتویٰ کے لئے کتاب و سنت کی صریح عبارت کا نقل کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے دیگر مواقع پر ایسے استدلال پیش کئے ہوں اور اس لئے وہ حق بجانب ہوں۔ لیکن ان کی مذکورہ بالا عبارت یقیناً شرعی فتویٰ کی صورت نہیں رکھتی۔ اس واقعہ پر بعض اصحاب کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ ہم لوگ عدم تعاون کے خلاف ہیں، جس کا چرچا تمام ملک میں ہو رہا ہے حالانکہ یہ خیال سراسر غلط اور سوء ظن پر مبنی ہے اور قرآن مجید ایسی بدظنی سے منع فرماتا ہے جو شخص عیسائیوں کے اس سلوک سے جو بلاد اسلامیہ کے ساتھ، اسلام اور مسلمانوں سے کر رہے ہیں، آگاہ ہے اور اس کے دل میں ایمانی احساس ہے۔ ایک آن کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ عیسائی سلطنتیں اسلام اور مسلمانوں

[1] روزنامہ "زمیندار" ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء ص ۳

کی خیر خواہ ہیں بلکہ یقیناً وہ اسلام اور مسلمانوں کے مٹانے کے درپے ہیں۔ جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں حتی الوسع ان سے قطع تعلق کرنا عین غیرت ایمانی ہے جبکہ سورۂ مائدہ کے شروع آیات میں ایمانداروں کو گناہ اور ظلم پر باہمی اعانت سے منع کیا گیا ہے تو ان کفار کی اعانت جو اسلام اور مسلمانوں کے کھلم کھلا دشمن ہیں، خواہ کسی صورت میں کیوں نہ ہو بدرجۂ اولیٰ حرام شرعی ہے۔ اس لئے عام مسلمانوں کی آگاہی اور رفع سوء ظن کے لئے شائع کیا جاتا ہے کہ ہم عدم تعاون کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اسکے مؤید ہیں لیکن صرف انگریزی سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے یا نہ کرنے کے متعلق ہے جس کی نسبت حق یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنا نصاب تعلیم اور سرمایہ کا پہلے پورا انتظام کر لینا چاہئے اور اسکے بعد انگریزی سکولوں اور کالجوں سے فوراً قطع تعلق کر لیں۔ اس حق کو ہم نہایت مبارک خیال کریں گے کہ جس روز مسلمانوں کی تعلیم اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے شروع ہو جائے گی اور وہ انتظام تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں گے اور طوق غلامی و الحاد و زندقہ کو اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں گے۔ کیونکہ موجودہ تعلیم سراسر دہریت و نیچریت و لامذہبیت کے سوا کوئی معتدبہ نتیجہ نہیں دیتی۔

والسلام

اصغر علی روحی عفا اللہ عنہ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔

احمد علی عفی عنہ پروفیسر اسلامیہ کالج و خطیب شاہی مسجد لاہور

محمد عمر خان، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔

۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

مولانا اصغر علی روحی اور مولانا احمد علی کی ان تحریروں میں جو انہوں نے ملک لال خان صاحب نمائندہ پنجاب خلافت کمیٹی کو لکھ کر دی تھیں کوئی بات ایسی نہیں جس سے ذرا بھی بدگمانی پیدا ہو سکے ان میں تو صاف مذکور ہے کہ ہنوز وہ اس مسئلے پر غور و خوض نہیں کر چکے لیکن بجائے خود حل بل یقین مولوی یعنی مولانا محمد عمر خان صاحب نے ملک لال خان والی تحریر میں یہ لکھا تھا کہ میں نے مولوی فضل دین صاحب کے کہنے پر صرف مجبوری دستخط کر دیئے تھے لفظ "مجبوری" سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فی الحقیقت مولانا ابو الکلام کو حق پر سمجھتے تھے بلکہ مزید برآں ان کی تحریر کو فتویٰ کہنے کے لئے بھی تیار تھے لیکن صرف مولوی فضل الدین کے جبر سے مجبور ہو کر آپ کو دستخط کرنے پڑے.........

پھر اسی اخبار[1] میں مولانا ابو الکلام آزاد کا فتویٰ (خاص تار بنام زمیندار) کے عنوان سے یہ چند سطور شائع ہوئیں :

مولانا ابو الکلام آزاد کا فتویٰ

(خاص تار بنام زمیندار)

کلکتہ یکم نومبر ۔ میرا فتویٰ جو لاہور کے اخبارات میں چھپا ہے بہت مختصر ہے اور اسلامیہ کالج کے طلبہ کو محض اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ ان طلبہ کے لئے رائے دینا چاہتے تھے جو غیر حاضر تھے ۔ میرے پاس کافی ثبوت اور قوی دلائل تھے ۔ جن کی بنا پر میں نے اسلامیہ کالج لاہور کے لئے فتویٰ صادر کر دیا تھا ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی تعلیم گاہ اس بارے میں مذہبی احکام سے واقف ہو کر سرکاری تعلقات توڑ سکتی ہے تو میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ وہ حکومت سے لازماً ہر قسم کا تعلق قطع کر دے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو شریعت کسی طالب علم کو ایسی تعلیم گاہ میں تعلیم پانے کی اجازت نہیں دیتی ۔

(ابو الکلام)

بعد ازاں جریدہ زمیندار میں ہی بعنوان "انجمن حمایت اسلام لاہور" جنرل کونسل کا اجلاس[2] کے زیر عنوان ایک طویل مضمون طبع ہوا جس کے کچھ اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں ۔

انجمن حمایت اسلام لاہور

(جنرل کونسل کا اجلاس)

حلقہ بگوشان اسلام علامہ اقبال اور حاجی شمس الدین

(زمیندار کے نامہ نگار کے خصوصی قلم سے)

انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس زیر صدارت آنریبل سر ذوالفقار علی خان دیوان ہوسٹل

---

1 روزنامہ "زمیندار" مورخہ ۴ نومبر ۱۹۲۰ء

2 مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۲۰ء ، اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۹۶ — ۹۷

میں مورخہ ۱۲ نومبر کو ۸ ۱/۲ بجے صبح منعقد ہوا۔

اس جلسے میں بڑے بڑے "اکابر" قوم جمع تھے جن میں اکثر ایسے تھے جو اپنی سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے کبھی جنرل کونسل کے اجلاس کے قریب بھی نہ پھٹکے تھے لیکن اس دن جبکہ اسلامیہ کالج کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا سب جمع ہو کر آئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح "اپنے" کالج کو "تباہی" سے بچا لیں۔

سب سے پہلے صاحب صدر نے افتتاحی تقریر کی اور ان کے بعد ڈاکٹر محمد اقبال صاحب سیکرٹری نے جلسہ گزشتہ کی رپورٹ پڑھی اور بتایا کہ اس عرصے میں ہمارے پاس متعدد فتوے موصول ہو چکے ہیں جن میں علمائے سندھ کا ایک فتویٰ ہے جس پر ۳۹ علمائے کرام کے دستخط ہیں۔ علمائے فرنگی محل، علمائے دہلی، علمائے مدرسہ الٰہیات کانپور کے فتوے بھی موصول ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کا فتویٰ بھی پہنچا ہے۔ یہ سب فتوے عدم تعاون کے حق میں ہیں۔ میں نے پیر مہر علی شاہ صاحب (گولڑہ) کو لکھا تھا لیکن ان کی طرف سے اب تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ عدم تعاون کے خلاف جو فتوے میرے پاس موصول ہوئے ان میں ایک فتویٰ تو حاکم علی صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج کا ہے۔ دوسرا فتویٰ مولانا اصغر علی روحی کا ہے جس میں انہوں نے عدم تعاون کی تو تائید کی ہے لیکن سکولوں اور کالجوں کے متعلق لکھا ہے کہ جب تک کوئی اپنا انتظام نہ ہو جائے لڑکوں کو ان مدارس سے اٹھانا درست نہیں۔

اس کے بعد زمیندار میں ہی ڈاکٹر علامہ اقبال نے ایک تاریخی خط[1] مدیر کے نام ترک موالات اور اسلامیہ کالج کے یونیورسٹی سے الحاق کے بارے میں تحریر فرمایا۔ اس کے ذریعے بعض گوشے بالکل پہلی بار بے نقاب ہوتے ہیں۔ نیز علامہ اقبال کے مذہب اور سیاست کے بارے میں دو ٹوک نظریات کا پتہ چلتا ہے

مشفقی آج شام ہی میں نے ایک دوست سے سنا کہ پروفیسر حاکم علی صاحب اسلامیہ کالج نے

[1] مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۰ء ص ۱ ، اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۹۹ — ۱۰۰

اپنے فتویٰ کی تصدیق میں مولوی احمد رضا صاحب بریلوی سے ایک فتویٰ حاصل کیا ہے۔ پروفیسر صاحب خود
بریلی تشریف لے گئے تھے۔ لاہور واپس آنے پر انہوں نے مولوی اصغر علی صاحب روحی سے استدعا کی کہ وہ
بھی مولوی احمد رضا صاحب کے فتویٰ پر دستخط کریں لیکن چونکہ حضرات دیوبند و مولوی اشرف علی صاحب
تھانوی پر اس فتوے میں سب و شتم کیا گیا تھا اس واسطے مولوی اصغر علی صاحب نے اس پر دستخط
کرنے سے انکار کر دیا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

جریدہ زمیندار میں ترک موالات کی بحث کافی مدت تک چلتی رہی چنانچہ ایک پرچے میں [۱]
حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی کی ایک طویل تقریر طبع ہوئی جس میں

ترک موالات کی ابتداء (ایک کالم)
ترک موالات مذہبی حیثیت سے (پانچ کالم)
ترک موالات دوسری بطور کے ساتھ کیوں نہیں کیا جاتا (ڈیڑھ کالم)
ترک موالات و ترک تعلقات (ایک کالم)
ترک موالات اور اُسکے دفعات (ایک کالم سے کچھ زیادہ)

مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے "جمیعۃ العلماء ہند" کے جلسہ
منعقدہ دہلی میں بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ ایک طویل تقریر کی، جس کی ابتداء یوں ہوئی تھی:

ترک موالات کی ابتداء

حضرات۔ میں نے نہایت اختصار کے ساتھ جو حالات بیان کئے ہیں۔ انہیں کی وجہ سے عالم اسلام
بے چین ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس لئے کہ اُن کا تعلق اس گورنمنٹ کے ساتھ ہے جس کی ذمہ داری

۱ مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء صہ ۴

سلطنتِ عثمانیہ کے موجودہ مصائب کے متعلق سب سے زیادہ ہے اور جس کا طاقتور ہاتھ ہمیں اس خصوص میں سب سے زیادہ متحرک نظر آتا ہے۔ گورنمنٹ سے شاکی ہیں اور اپنے رنج و ملال کو مختلف آئینی صورتوں میں ظاہر کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں کمیٹیاں قائم ہوئیں اور انہیں وجوہ کی بنا پر ترک موالات کا ریزولیوشن سنٹرل خلافت کمیٹی اور اس کی شاخوں نے پاس کیا اور مسلمانوں کے ایک حصہ نے اس پر عمل درآمد بھی شروع کیا۔

چونکہ برادرانِ ہنود کا اتحاد مسلمانوں کے ساتھ ایک واقعہ حقیقت ہے اسلئے انہوں نے بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور ترک موالات میں حصہ لینا شروع کیا۔

حضرات! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پنجاب میں جو المناک واقعات پیش آئے وہ ہندو اور مسلمانوں کے لئے ایک مشترک مصیبت تھے اور چونکہ ہندوستان کی گورنمنٹ نے اُن اشخاص کو سزائیں نہیں دیں جن کی غلطیوں نے ہندوستانی آبادی کی سینکڑوں جانوں کو نقصان پہنچایا اسلئے ترک موالات کے لئے اب یہ بھی ایک سبب کے طور سمجھے جانے لگے اور انہیں دو اسباب کو سامنے رکھ کر ملک میں یہ تحریک روزمرہ وسعت پذیر ہوتی گئی یہاں تک کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ان دونوں ملکی اہم مسئلوں پر غور کرنے کے لئے اپنے خاص اجلاس کو بلاتی جو کلکتہ میں ستمبر ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا اور جس نے بہت غور کے بعد معقول کثرت رائے سے ترک موالات کے ریزولیوشن کو پاس کیا اور یہ کہا کہ خواہ مسئلہ خلافت ہو یا پنجاب کے مظالم ان کا انسداد اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جبکہ ہندوستان کو حکومت اختیاری ملے۔ اگر ہمارے اختیار میں فوج ہو گی تو ہم اسے دوسرے ملکوں میں لڑنے نہیں بھیج سکتے اور اگر ہمارے ہاتھ میں ملک کے انتظام کی باگیں ہوں تو پنجاب جیسے ہولناک واقعات کی تکرار ہندوستان میں نہیں ہو سکتی۔

ترک موالات کے متعلق میرے اس بیان سے آپ حضرات کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس طرح ہوئی اور اس نے کانگرس کے ریزولیوشن کے بعد کیا صورت اختیار کر لی ہے پہلے وہ صرف اسلامی مسئلہ تھا اور اب وہ ایک اہم ملکی مسئلہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

بہرصورت مسلمانوں پر اس کا اتباع اور اس کی عملی تکمیل کا بار کسی قدر زیادہ ہے۔ وہ
مذہبی طور پر جس طرح ترک موالات کرنے پر مجبور ہیں اسی طرح ملک کی حکومت حاصل کرنے کے لئے بھی
وہ ترک موالات میں اپنے دوسرے ملکی بھائیوں کے دوش بدوش چلنے کے لئے آمادہ ہیں۔

حضرات! گو میں یہ یقین کرتا ہوں کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان جس طرح وہ ایک طرف
اپنے مذہبی فرائض کو محسوس کرتے ہیں اسی طرح دوسری طرف خدا کے فضل سے وہ ملکی ضرورتوں کو بھی اچھی
طرح محسوس کرنے لگے ہیں اور اس لئے اس مسئلہ کے ساتھ انہیں بھی عام مسلمانوں کی مانند دونوں
قسم کی دلچسپیاں ہیں اور ہونی بھی چاہئیں۔ لیکن اس مجلس کے سامنے میں اس وقت ترک
موالات پر مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کرنی زیادہ موزوں خیال کرتا ہوں اور ساتھ ہی اس بات کا کھلے
دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی علمی بضاعت کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرتا اور بغیر کسی ہضم نفسی کے
یہ کہہ سکتا ہوں کہ "ایں شیوہ ختم است بر دیگراں" مگر علی گڑھ میں ایک مفتی صاحب کی ترک موالات
کے خلاف مذہبی تقریر سن کر اور پنجاب کے ایک ایم۔ اے صاحب کے فتویٰ کو اسی مضمون کے متعلق پڑھ
کر مجھ کو اپنے علم و فضل کے متعلق کچھ بدگمانی پیدا ہو گئی ہے جو اس عبارت کا باعث ہوئی ہے۔ امید ہے
کہ آپ صرف اشعاف فرمائیں گے۔

اس تقریر کا ذکر منشی تاج الدین احمد تاج کی کتاب "ہفوات ترک
موالات اور اجمل خانی فریب"[1] میں بھی موجود ہے جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

میں اس موضوع پر کچھ لکھنا ہی چاہتا تھا کہ حکیم اجمل خان صاحب نے ایک فرضی جمعیۃ العلماء
ہند کے جلسہ منعقدہ دہلی میں بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ موضوع زیر بحث پر ایک طویل تقریر کی۔ اس
تقریر کا زیادہ تر حصہ ابو الکلام اور محمود الحسن وغیرہ کا فضلہ ہے جو کئی دفعہ اخبارات کے صفحات میں
آ چکا ہے۔ میں اس وقت اور تمام باتوں کو نظر انداز کر کے حکیم صاحب کی تقریر کے صرف ایک حصہ پر
بحث کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حکیم صاحب نے مذہب کے ساتھ ترک موالات نہ کرنے کے جو عذر لنگ
پیش کئے ہیں وہ نہایت نا معقول ہیں۔ ابو الکلام، محمود الحسن اور اجمل خان نے آیات قرآنی

[1] ص ۳

کی ایسی ظالمانہ اور جابرانہ تاویلیں کی ہیں کہ جنہیں ایک سچا مسلمان ہرگز برداشت نہیں کر سکتا اور ہندوؤں کے مظالم سے ایسی آنکھیں بند کر کے تجاہلِ منافقانہ سے کام لیا ہے کہ جو ایک مسلمان کا شیوہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے[1]

[1] اس امر کی تفصیل کے لئے دیکھئے "ہندوؤں سے ترکِ موالات" صہ ۳

باب چہارم

(علمی و ادبی خدمات)

باب چہارم

مولانا مرحوم کی علمی و ادبی خدمات

مولانا مرحوم گو گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے بہت کم وقت تصنیف و تالیف کے سلسلے میں پاتے تھے۔ لیکن اس میدان میں بھی انہوں نے بہت گراں قدر کام کیا۔ کالج کی ملازمت، مسجد میں امامت و خطابت، درس و تدریس اور فتوی نویسی ایسی مصروفیات تھیں جن کے ہوتے ہوئے اگر وہ کوئی تصنیف و تالیف اپنی یادگار نہ بھی چھوڑتے تو بھی اُن کی علمیت اور شہرت میں کچھ کمی نہ آتی۔ اُن کی کچھ کتابیں تو اُن کی زندگی ہی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئی تھیں لیکن بعض کتابیں ابھی تک چھپ کر میدان میں نہیں آسکیں۔

تذکرہ اکابر اہل سنت[1] میں آپ کی آٹھ[(۸)] مطبوعہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے اور صاحب مراۃ التصانیف[2] کے بیان کے مطابق اُن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کی تعداد پچیس سے بھی زیادہ ہے۔ ذیل میں اُن کی تصانیف کا مضمون وار ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اہم کتابوں پر تنقید کی جائے گی۔

۱۔ علم تفسیر

۱۔ قرآن مجید کے آخری دو[(۲)] پاروں کی تفسیر (غیر مطبوعہ)

۲۔ تفسیر سورۂ یٰس   یہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں لکھی۔ جسے اُن کی وفات کے بعد مکتبہ علمیہ لیک روڈ لاہور کے مدیر مولانا عبیدالحق ندوی نے اپنے رسالہ "مسلم" میں قسط وار شائع کیا اور پھر اسے کتابی شکل دے دی گئی۔

---

[1] ص ۶۱-۶۲

[2] ۱: ۲۹۲

ب۔ علم کلام و عقائد

۱۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اُن کی ضخیم کتاب علم فی الاسلام نہایت اہم ہے۔ پہلی جلد سات سو (۷۰۰) سے اوپر اور دوسری جلد پانچ سو (۵۰۰) کے قریب صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں جلدیں اُن کی زندگی میں مطبع عام پریس لاہور سے شائع ہو گئی تھیں۔

۲۔ التنویر فی اسقاط التدبیر (غیر مطبوعہ)

۳۔ تذکرۃ الموتیٰ و القبور (مطبوعہ) یہ کتاب جامعہ پنجاب کی لائبریری میں مولوی محبوب عالم مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، جو شہر بنگلور میں مطبع نبوی سے طبع ہوئی تھی۔ افسوس اس پر طباعت کی تاریخ درج نہیں۔

ج۔ علم تصوّف

۱۔ الآیۃ الکبریٰ فی شرح اسماء اللّٰہ الحسنیٰ یہ بھی اُن کی زندگی میں قریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل اسلامیہ پریس لاہور سے طبع ہو گئی تھی

۲۔ أسرار التنزیل (غیر مطبوعہ) اس میں مسئلہ **وحدۃ الوجود** پر بحث کی گئی ہے

۳۔ نعم التعویذ العالی یہ امام غزالیؒ کے ایک رسالہ "نصیحۃ التلمیذ" کا اردو ترجمہ ہے جو اُن کی زندگی میں اسلامیہ پریس لاہور سے چھپ گئی تھی

د۔ علم اخلاق

۱۔ امیر الکلام من کلام الامام یہ بھی اُن کی زندگی میں تقریباً ایک سو تیس (۱۳۰) صفحات پر اسلامیہ پریس لاہور سے طبع ہوئی۔

۲۔ الجفاء و الوفاء یہ تقریباً پونے چار سو (۳۷۵) صفحات پر مشتمل ہے اور اُن کی زندگی میں ہی چھپ چکی تھی

۳۔ حکمت بالغہ چونسٹھ صفحات پر مشتمل اسلامیہ پریس لاہور سے اُن کی زندگی میں چھپ گئی تھی اور اب دوبارہ نظر ثانی کے بعد مکتبہ خلیل لاہور نے اسے دوسری بار طبع کیا ہے۔

ح۔ علم فقہ

اس موضوع پر وقتاً فوقتاً جو مسائل پوچھے گئے قرآن و سنت کی روشنی میں آپ نے

اُن کے جو جوابات دیئے وہ ابھی تک متفرق تھے انہیں مجموعی طور پر فتاویٰ نوحی کا نام دیا جاسکتا ہے۔
میں نے اُن کے تمام فتاویٰ کو جو دستیاب ہوسکے جمع کر کے اس مقالہ کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔

و ۔ علم ادب

۱۔ اطباق الشرده فی حل ابیات البردہ — یہ امام بوصیری رح کے مشہور قصیدہ بُردہ کی اردو شرح ہے جو تقریباً دو سو (۲۰۰) صفحات پر مشتمل آپ کی زندگی میں اسلامیہ پریس میں طبع ہو گئی تھی۔

۲۔ دیوان عربی — یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ میں نے اسے اپنے مقالہ کا ایک اہم حصہ بنایا ہے اور اُن کے اشعار پر عربی زبان میں حواشی تحریر کئے ہیں۔

۳۔ دیوان فارسی — یہ بھی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور ایک ضخیم مجموعہ ہے یہ پانچ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔

۴۔ تحفہ شروان (مطبوعہ)

ز ۔ علم بلاغت

۱۔ دبیر عجم — یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور آپ کی زندگی میں دو بار چھپی۔

ح ۔ علم عروض

۱۔ العروض والقوافی — اس نام سے ایک رسالہ آپ نے طبع کرایا۔ یہ دراصل دبیر عجم کا تتمہ تھا لیکن اسے فارسی کی بجائے اردو زبان میں آپ نے لکھا تاکہ طالب کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ یہ بھی دو دفعہ آپ کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔

ط ۔ علم فلسفہ

اس سلسلہ میں آپ نے اپنے فرزند اکبر مولوی فضل حق مرحوم کو شیخ بوعلی سینا کی کتاب الاشارات پر کچھ املائی نوٹ لکھوائے تھے جب کہ اُن کے فرزند مذکور مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ بعد میں انہیں کتابی شکل میں مولوی فضل حق مرحوم نے ان کی زندگی ہی میں طبع کرا دیا تھا جس کا نام تجلیات فی شرح الاشارات ہے۔

ی ۔ علم تاریخ و سیر

۱۔ عظماءِ اسلام۔ دراصل یہ سلسلہ آپ کے ماہوار رسالہ "الہدیٰ" میں قسط وار چھپتا رہا اور اس میں خلافتِ راشدہ کے دور کے اکابر کے حالات بیان کئے جاتے تھے۔ اگر ان کو کتابی شکل میں طبع کرادیا جائے تو اس دور کے بہت سے واقعات کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہوسکتی ہے۔

ک۔ علم ردّ عقائدِ باطلہ

۱۔ اتمام الحجۃ علیٰ من اعرض عن المحجۃ۔ شیخ غلام حیدر پنشنر لائل پوری نے مولانا کو حکیم نور دین قادیانی کا ایک رسالہ "القرآن فی رمضان" بھیجا جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کی صداقت کے بارے میں دلائل دیئے گئے تھے۔ شیخ صاحب نے مولانا سے درخواست کی کہ اس رسالہ کا رد لکھیں چنانچہ مولانا نے اپنے ماہوار رسالہ الہدیٰ میں اُن کی اس فرمائش کو پورا کیا اور اسے مندرجہ بالا عنوان کے تحت اپنے رسالہ میں شائع کر دیا۔

۲۔ عیسائیت اور اسلام۔ مصر سے ایک ماہوار رسالہ "الجامعۃ" کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا جس کا ایڈیٹر عیسائی تھا۔ اس رسالہ میں ایڈیٹر نے ایک مضمون میں یہ بحث شائع کی تھی کہ کیا مذہب اسلام علم و فلسفہ کے ساتھ زیادہ رواداری سے پیش آتا ہے یا مذہب عیسائیت اور رسالہ میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ مذہب عیسائیت میں اسلام کی نسبت بہت زیادہ رواداری پائی جاتی ہے۔ عیسائی ایڈیٹر کے اس فیصلے اور بحث کا جواب مصری عالم شیخ محمد عبدہٗ مرحوم نے نہایت وسیع النظری اور روشن خیالی سے لکھا تھا۔ مولانا مرحوم نے مفتی محمد عبدہٗ کے جواب کا اردو زبان میں ترجمہ کرکے اپنے رسالہ "الہدیٰ" میں ماہوار چھ (۶) قسطوں میں طبع کیا تھا۔ جو مختصر رسالہ کی شکل میں اگر چھپ جائے تو اسلام اور عیسائیت کا فرق واضح ہو جائے گا۔

۳۔ تالوثِ مقدس کی توحید پر تنقید۔ ایک عیسائی ڈاکٹر برخوردار خان سول سرجن ریاست کشمیر نے ایک رسالہ بنام "تالوثِ مقدس کی توحید" لکھا تھا اور اسلام پر بعض اعتراضات پیش کرکے دعویٰ کیا تھا کہ دنیا کا کوئی مسلمان عالم اس رسالہ کا رد نہیں لکھ سکتا۔ یہ رسالہ منشی عبدالحق خان ملازم ریلوے نے مولانا کو بھیج کر استدعا کی کہ اس کا رد لکھا جائے۔ مولانا نے اس کا رد اپنے رسالہ "الہدیٰ" میں سترہ (۱۷) قسطوں میں شائع کر دیا تھا اور اس کے آخر میں ایک فارسی نظم بھی "ردّ نصاریٰ" کے موضوع پر طبع کی تھی۔ یہ بھی کتابی شکل میں اسلام کی صداقت پر

ایک سند بن سکتا ہے۔

۴۔ سیطرۃ الإسلام علی النصاریٰ اللئام۔ اس کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ رسالہ قسط وار رسالہ الہدیٰ میں شائع ہوتا رہا اور بعد میں کتابی شکل میں بھی طبع کیا گیا، جو اب نایاب ہے۔ یہ ۱۷۲ صفحات میں مطبع اسلامیہ لاہور سے ۱۳۲۰ھ میں طبع ہوا۔

ل۔ متفرق

۱۔ مقالاتِ رُوحی۔ مولانا نے رسالہ الہدیٰ میں مذہب اسلام کے کئی ایک اہم پہلوؤں پر مقالات لکھے جن کو اگر جمع کر دیا جائے تو اہل السنت والجماعت کے بیشتر عقائد کے موضوع پر ایک مستقل ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے مثلاً

۱۔ مکسب حلال ۲۔ خوف و رجا ۳۔ جدید علم کلام ۴۔ الوحی و الإلہام

۵۔ قوانین فطرت اور معجزات ۶۔ حقوق الرجال والنساء ۷۔ دہریت

۸۔ ضرورتِ نبوت ۹۔ بیمۂ زندگی ۱۰۔ البدعات ۱۱۔ نیچریت

۱۲۔ عورتوں کے لئے حکم پردہ ۱۳۔ التوکل والتوسل ۱۴۔ خصائص النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

۱۵۔ التصوّف ۱۶۔ عصمت انبیاء علیہم السلام ۱۷۔ العقلیات والدیانات

۱۸۔ عذاب القبر ۱۹۔ ولادت المسیح ۲۰۔ زکوٰۃ الفطر ۲۱۔ ماوراء المادہ

۲۲۔ فلاسفہ کی بے اعتدالیاں وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ مولانا مرحوم ایک دینی رسالہ "الہدیٰ" بھی پورے دس[10] سال تک شائع کرتے رہے۔ اس رسالہ کا پہلا شمارہ ماہ ذی قعدہ ۱۳۲۱ھ میں منصّۂ شہود پر آیا اور آخری شمارہ ماہ شوال ۱۳۳۱ھ میں طبع ہوا۔

مندرجہ بالا کتب و رسائل میں سے بعض اہم کتب پر اُس دور کے اخبارات اور رسائل میں تنقید اور تبصرہ کرتے ہوئے مضامین چھپے تھے۔ اُن میں سے جو دستیاب ہو سکے، ہر کتاب کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں: اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ جامعہ پنجاب کے کتب خانہ میں انجمن اسلامیہ لاہور کے کتب خانہ کی طبع شدہ فہرست موجود ہے جس میں مولانا کی بعض تصانیف کا ذکر بھی ہے چنانچہ اس میں جمال الدین افغانی کے عنوان سے اسی میں ایک کتاب بھی مولانا کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

۱۔ ما فی الاسلام

یہ کتاب مولانا کی اردو میں سب سے بڑی اور آخری تصنیف ہے جو قریباً ۱۲۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ کتاب فرقۂ اہل سنت و جماعت کے عقائد کے مطابق لکھی گئی ہے اس لئے باقی اسلامی فرقے اگر اپنے عقائد و اعمال کے خلاف اس میں کوئی چیز پائیں تو اس میں مصنف کو ہدفِ طعن نہ بنائیں کیونکہ دنیا میں کوئی شخص تمام افراد انسانی کے خیالات کے ساتھ تو اپنے خیالات کو مطابقت نہیں دے سکتا۔

یہ کتاب مصنف علیہ الرحمۃ کے ذاتی مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہے انہیں بے شمار علمی و ادبی مجالس میں شریک ہونے کا موقع ملا اور وقتاً فوقتاً کئی علماء سے تبادلۂ خیالات بھی ہوتا رہا۔ تقریباً نصف صدی تک وہ مسجد میں امامت و خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے اور قریباً چالیس[(۱)] سال تک اسلامیہ کالج میں ملازمت کے دوران اُن کا واسطہ انگریزی خوان نوجوان نسل سے قائم رہا، جن کی آنکھیں مغربی تہذیب و تمدن کی دلفریب آب و تاب سے چکا چوند ہو رہی تھیں۔ اس طرح انہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ مجموعی طور پر مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں بے اعتدالیوں اور فروگزاشتوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت اُن کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ اس کے مطالعہ سے یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام نے اہل عالم کے سامنے کیا عقائد و اعمال پیش کئے تھے لیکن لوگوں نے اُسے کیا بنا دیا۔ اس کتاب میں بعض ایسے الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے جو ممکن ہے بعض احباب کی طبیعت پر شاق گذریں اور وہ انہیں پڑھ کر ناک بھوں چڑھائیں۔ مگر مولانا اس بارے میں خود فرماتے ہیں :-

" میرا یہ شیوہ رہا ہے کہ میں نے حتی الوسع حق گوئی اور غیرت ایمانی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا میرے الفاظ کا مخاطب اور مورد وہی لوگ ہیں جو اپنی بدعقیدگی کی وجہ سے مذہب اور اہل مذہب کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے کے علاوہ اُن کے بارے میں ہتک آمیز کلمات بھی منہ سے نکال پھینکا کرتے ہیں۔ "

اس کتاب کی پہلی جلد تمام تر مادیت، دہریت، نیچریت وغیرہ کے عقلی و نقلی دلائل سے رد پر مشتمل ہے اور اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عقل انسانی کا دائرہ عمل بہت محدود ہے اور حواسِ ظاہری سے ادراک کی جانے والی چیزوں کے سوا عموماً باطنی اور روحانی چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتی

کتاب کا پہلا حصہ سات بابوں پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں مادہ اور اس کے متعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں خالقِ کائنات کے وجود پر حکماء اور انبیاء کے اقوال سے استدلال کیا گیا ہے اور ذاتِ باری کی توحید، صفات اور ربوبیت پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت اور انیسویں صدی کے مادی فلسفی ڈارون کے مسئلہ ارتقاء پر تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان ابتداءً انسان ہی پیدا ہوا تھا۔ چوتھے باب میں مذہب اور نبوت کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ مختلف ادیانِ عرب قبل از اسلام مثلاً خدا پرستی، بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، ثنویت اور مجوسیت وغیرہ کے معتقدات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں باب میں فطری قوانین اور معجزات و کرامات کے بیان کے بعد مادہ پرست اور نیچری خیالات کے لوگوں کو گمراہ قرار دیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں فرشتوں اور جنوں کے بارے میں غلط قسم کے عقائد کا رد پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مسئلہ خیر و شر، جبر و قدر جیسے اہم مسائل پر دلائلِ عقلی و نقلی کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ ساتویں اور آخری باب میں امورِ بعد الموت مثلاً سماعِ موتیٰ، عذاب القبر، قبر لیلۃ دعا، جنت و جہنم، توبہ اور شفاعت، میزان، صراط اور علاماتِ قربِ قیامت وغیرہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جو زیادہ تر اسلامی عبادات و معاملات سے متعلق ہیں۔

چنانچہ آٹھویں یعنی اس حصہ کے پہلے باب میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقات اور حج وغیرہ کے احکام اور اسرار و رموز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نواں باب قوانینِ شرعی، رسم و رواج، رہبانیت، تصوف اور شریعت و طریقت وغیرہ سے مخصوص ہے۔ دسویں باب میں حدیثِ رسول کی ضرورت اور اہمیت اور شریعت میں ان کا اولین ماخذ ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ گیارھویں باب میں انسانی معاشرہ کے مختلف طبقات میں حقوق و فرائض کی اہمیت کا بیان ہے جس میں عامۃ المسلمین کے

حقوق، حقوقِ ہمسایہ، حقوقِ ذوی القربیٰ، حقوقِ معلّم، حقوقِ والدین و اولاد اور حقوقِ زوجین وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بارھویں باب میں موجودہ زمانے کے بعض اہم مسائل مثلاً مسلم عورتوں کے لئے پردہ، لاٹری، بیمۂ زندگی اور تعلیمِ نسواں وغیرہ کی شرعی حیثیت کا بیان کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا مندرجات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ یہ کتاب مذہبِ اسلام سے متعلق تقریباً تمام معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بلکہ اسے اسلامی انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسکی اسی اہمیت اور جامعیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جامعہ پنجاب کے اربابِ حل و عقد نے اسے ایم۔ اے اسلامیات کے امتحانی نصاب میں شامل کر رکھا ہے۔

کتاب کے شائع ہونے پر مختلف رسائل و جرائد نے اس وقت جو تنقیدی آراء لکھی تھیں اُن میں سے جو فراہم ہو سکیں، ذیل میں دی جاتی ہیں۔

انتقاد[1]

صافی الاسلام

یہ کتاب حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر السنہ شرقیہ اسلامیہ کالج لاہور کے خامۂ حقیقت طراز کے رشحات کا نتیجہ ہے۔ مولانا موصوف کا تبحرِ علمی اور شغف فی الدین پنجاب کے کسی مسلمان سے مخفی نہیں۔ آپ تیس سال سے مسلمان نوجوانوں کے امیال و عواطف کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عصرِ حاضر کی الحاد آمیز تعلیم کے وہ کون سے نکات ہیں جن سے نوجوان حکومت سے متاثر ہوتے ہیں۔ آپ اس حقیقت سے کماحقہٗ آگاہ ہیں کہ اغیار کے وہ کون سے اعتراضات ہیں جو ہمارے نوجوانوں کو قعرِ ضلالت میں گرا دیتے ہیں۔ ان جملہ حالات کو پیشِ نظر رکھ کر آپ نے یہ کتاب لکھی ہے۔

کتاب مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مادہ کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔ باب دوم میں صانعِ عالم کی ہستی کے نہایت مدلل و مسکت ثبوت پیش کرنے کے بعد توحیدِ ذاتِ باری سے بحث کی گئی ہے۔ بعد باب سوم میں ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء پر بحث کی گئی ہے وہ ہمارے نزدیک

۱۔ روزنامہ زمیندار، لاہور جلد ۱۸ عـ ۱۳۶، ۲ / صفر المظفر ۱۳۵۰ھ، مطابق ۱۹ / جون ۱۹۳۱ء

ناکافی ہے اور اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے ڈالٹن کے فلسفہ کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بہرحال جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت اچھا لکھا ہے۔ اسی طرح باقی ابواب میں نہایت اہم اور ضروری مسائل مثلاً معیارِ حق و باطل، ضرورتِ نبوت، الوحی والعلوم، حقیقت الرویا، ختم نبوت، معجزات، دین فطرت، جبر و اختیار، خیر و شر، معاد حقیقت، روح عبادت، علم حدیث اور حقوق والدین پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔

باب سیزدہم یعنی آخری باب میں صرف ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عصر حاضر میں پیدا ہوئے ہیں اور نہایت جامعیت سے ہر مسئلہ پر لکھا ہے۔ غرض مولانا ممدوح نے اپنی معلومات کے مطابق اس کتاب کو تعلیماتِ حقہ اسلامیہ کا انسائیکلو پیڈیا بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور ایسی اچھی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرنے پر جو عہد حاضر کی ظلمت کدہ میں ایک مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے ہم مولانا اصغر علی کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ جو صاحب خریدنے سے قبل اس کے مضامین سے کما حقہ آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ۱ر کا ٹکٹ بھیج کر اس کی فہرست منگا سکتے ہیں۔ ہم نے کتاب کے مسودہ اجزائے پریشان دیکھے ہیں اسلئے ضخامت اور قیمت کے متعلق صوفی ضیاء الحق کو جو ذیل دار اور عبالی سوانہ لاہور سے خط و کتابت کر لیجئے۔

ما فی الإسلام پر ایک نظر[1]

جناب مولانا حاجی عبدالستار صاحب سابق پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج پشاور کتاب ما فی الاسلام پر حسب ذیل تنقید فرماتے ہیں:

ما فی الاسلام مؤلفہ و مصنفہ جناب مولانا مولوی محمد اصغر علی روحی صاحب کا اکثر حصہ میں نے بہ غور مطالعہ کیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے غیر الحادی میں ایسی کتاب از بس ضروری تھی

[1] روزنامہ سیاست لاہور، ۲۱ر نومبر ۱۹۳۱ء

جناب مولانا صاحب کا پایۂ علم دینی اور ادب و فلسفہ جدید و قدیم میں اور مدت العمر کا تجربہ درس و تبلیغ میں محتاج بیان نہیں۔ ایسی جامع کتاب متعلق دین اسلام کی تصنیف آپ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ ما فی الاسلام کا کوئی پہلو نہیں جس کو انہوں نے معقول و منقول دلائل و براہین سے اپنی خاص پُرنور طرز تحریر میں نہایت عمدہ اسلوب سے نہ نبھایا ہو۔ سب سے بڑی بات اس کتاب کی تصنیف میں مصنف کی خلوص نیت اور پاکیزگی ارادت ہے۔ مخالف عقیدۂ اسلام و دیگر فرق و مذاہب کے پیشوایان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا ہے اور ان کے اعتراضات کا جواب نہایت شستہ پیرایہ میں دیا ہے۔ طرز بیان جناب مولانا صاحب کا خاص اپنا ہے اور کسی قدر مختصر و مخصوص اور کافی تدبر کا محتاج ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ بار بار اس کا مطالعہ کیا جائے اور خصوصاً آج کل کی نئی تعلیم کے مسلمان نوجوانان کے فائدہ کے لئے اس کا اسلامی مدارس میں نصاب تعلیم و دینیات مقرر کرنا نہایت ضروری ہے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم مولانا صاحب کو اس قدر محنت و خلوص عمل کا اجر عظیم عطا فرماوے۔ کتاب دو جلدوں میں منقسم ہے اور بارہ سو (۱۲۰۰) صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ کاغذ طباعت عمدہ، پہلے اس کی قیمت آٹھ روپیہ مقرر کی گئی تھی مگر بعض ہمدردان قوم کے مشورہ سے اشاعت عامہ کو ملحوظ رکھ کر حضرت مؤلف نے ہر دو جلد کی بجائے آٹھ کے چھ روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) کر دی ہے۔ پتہ ذیل سے طلب فرمائیں

صوفی محمد ضیاء الحق بی۔ اے۔ کوچہ ذیلداراں بھاٹی دروازہ لاہور

عبدالستار

تنقید

کتاب ما فی الاسلام [1]

مقدس اسلام میں صحت ایمان کا مدار عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ پر ہے۔ عملی حالت عقائد کے تابع ہے۔ عقائد کی بنیاد مضبوط ہو تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر عقائد میں

[1] روزنامہ سیاست لاہور، ۱۴ر جون ۱۹۳۱۔

کسی قسم کا فساد پایا جائے تو عملی حالت کبھی درست نہیں رہ سکتی۔ تعلیم یافتہ اصحاب میں جو عقائد و اعمال کی موجودہ حالت ہے کچھ شک نہیں کہ وہ یقیناً اصلاح کی محتاج ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ بعض اصحاب عقائد و اعمال کے رو سے حتی الوسع صراط مستقیم پر چلتے اور مذہبی حالت کی ضروری حفاظت کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر باایں ہمہ وہ تفصیلی طور پر عقائد و اعمال کی کیفیت و کمیت سے آگاہ نہیں۔ اس کا سبب دینی تعلیم کی طرف سے غفلت اور بے توجہی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور یہ ایک ایسی دینی کوتاہی ہے جس کو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زمانہ کی موجودہ رفتار اکثر اصحاب کو یہ موقع نہیں دیتی کہ وہ خود تحقیق مسائل کی طرف متوجہ ہو کر اس فرض کی بجا آوری سے سبکدوش ہوں اور مدت دراز کی غفلت بالآخر انہیں عمر بھر ایسے مسائل کے علم سے محروم رکھتی ہے جن پر آئندہ زندگی کی صلاح و فلاح اور نجات اخروی کا انحصار ہے۔ حالات حاضرہ میں مسلمانوں کی مذہبی حالت سخت قابل اصلاح ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً برادران اسلام صرف مسلمان کہلانے کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسی موجودہ خرابی کو مدنظر رکھ کر حضرت مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے عنوان بالا کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو درحقیقت تمام مسائل اعتقادیہ اور بعض دیگر مباحث ضروریہ کا جو عموماً آج کل زیر بحث رہتے ہیں ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ چونکہ استدلال عقلی و نقلی کی مطابقت آج کل بڑی ضروری سمجھی گئی ہے اسلئے حضرت مؤلف نے آیات اور احادیث کو ماخذ تحقیق قرار دے کر عقلی استدلال کے پیرایہ میں اہم مسائل کو ایسی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایک سلیم الفطرت اور حق پسند طبیعت اس کے مطالعہ سے محظوظ ہو کر خود بخود یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ ؏

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ہم حضرت مؤلف کے نہایت ہی ممنون ہیں کہ انہوں نے غایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ مسائل دینیہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کر دیا ہے جس سے ہر ایک درجہ کے اصحاب اپنے تمام مذہبی شکوک اور اوہام کو نہایت اطمینان کے ساتھ دور کر سکتے ہیں۔ یہ وہ قیمتی مجموعہ ہے جس میں بڑے بڑے حضرات اکابر اسلام کی تحقیقات کا نچوڑ ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں کوئی اہم مسئلہ نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ہم نہایت زور کے ساتھ اسلامی پبلک سے اس کتاب کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہونے

کی سفارش کرتے ہیں۔ یہ کتاب ہر مسلمان کے لئے جو حقیقت اسلام سے آگاہ ہونا چاہتا ہے حرز جان سے
کم نہیں۔ علوم عقلیہ کے دلدادگان جن کو بسا اوقات مذہبی عقائد پر نکتہ چینی کرتے دیکھا جاتا ہے آئیں
اور اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ توحید، صفات ذات باری، وحی، نبوت، کلام الٰہی، ملائکہ،
حشر و نشر، جسمانی عذاب قبر، جنت و دوزخ، ایصال ثواب، عصمت انبیاء، معجزات و کرامات،
قانون فطرت، جبر و قدر، تناسخ الارواح، حالات مابعد الموت، عالم برزخ، علامات قرب
قیامت، استجابت دعا۔ طاعون بھیجنے کی حقیقت، حقیقت رؤیا یعنی خواب، مختلف عبادات کی
حکمت اور ضرورت، اجتہاد، عصبیت مذہبی، رسوم و رواج، حقوق الرجال والنساء، رہبانیت،
تصوف، شریعت و طریقت، تالیف القرآن، اعجاز القرآن، تفسیر بالرائے، ضرورت علم حدیث الحقوق
حرمت سود، مسائل نکاح و طلاق، تعلیم نسواں وغیرہ وغیرہ ایسے ضروری مسائل ہیں جن کی
تحقیق صحیح کا ہر ایک شخص کو بہت کم موقع ملتا ہے۔ اس صورت میں ہم دوبارہ حضرت مؤلف کے
سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے عزیز اوقات کو ایک دینی خدمت کے لئے وقف کر کے اور خود اپنی گرہ سے
مصارف طبع برداشت کر کے برادران اسلام کو اپنی تحقیق سے جو ان کی عمر بھر کا خلاصہ ہے، مستفید
ہونے کا موقع دیا ہے۔ ہم اپنے بھائیوں سے قوی امید رکھتے ہیں کہ وہ کتاب ما فی الاسلام کے مطالعہ
کرنے کا عزم صمیم کر لیں گے

بشتاب اگر زاہل دلی دریاب اگر صاحب دلی

شاید کہ نتوان یافتن دیگر چنیں ایام را

کتاب مذکور دو جلدوں میں بارہ سو سے زیادہ صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ قیمت جلد اول
پانچ روپے اور قیمت جلد ثانی تین روپے، جو بمقابلہ کتاب کی اہمیت کے کوئی قیمت نہیں۔

در حقیقت کالج کلاس کے لئے اس سے بہتر نصاب دینیات تاحال ہمارے دیکھنے میں
نہیں آیا۔ کیونکہ اس میں تمام اہم مسائل پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مدلل و محققانہ
بحث کی گئی ہے

خط و کتابت کا پتہ: مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

نقد و نظر

مافی الاسلام [1]

یہ وہی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس کا ذکر اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ "الحکیم" کے صفحات میں ہو چکا ہے۔ علامۂ دہر حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی معلم دینیات و ادبیات اسلامیہ کالج لاہور کے نام نامی اور اسم گرامی سے کون واقف نہ ہوگا۔ یہ نسخۂ متبرک آپ ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے اور حال ہی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ عہدِ حاضر میں مادہ پرستی کے سیلاب نے مذہبی قصر کی بنیادوں کو جس طرح متزلزل کر دیا ہے۔ اس کی حقیقت کسی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں۔ موجودہ زمانہ میں علوم مادیہ کی غیر معمولی ترقی نے لوگوں کو معاد کی طرف سے بالکل غافل کر دیا ہے اور وہ "فکرِ معاش" اور "ذکرِ بتاں" میں اس درجہ محو و منہمک ہو گئے ہیں کہ انہوں نے اصل مقصود کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا ہے۔ کفر و الحاد کی آندھیاں چاروں طرف چل رہی ہیں۔ قوم کے امراء و اغنیاء کا طبقہ اپنے آپ کو مذہبی قیود و ضروریات سے بالاتر سمجھتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود شرعی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے مذہبی اصول پر نکتہ چینی اور تنقید اپنا اولین فرض قرار دیتا ہے۔ علماء کا طبقہ شکم پروری کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس طبقہ میں جو اصحاب اہل علم ہیں وہ عموماً انگریزی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ بعض اگرچہ اخلاص فی الدین کی توفیق تو رکھتے ہیں مگر ہر ایک قسم کی خرابیوں کو دیکھنے کے باوجود مدافعت کے لئے ان کے لبوں میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ غرض یہ اور اسی قسم کے بعض دیگر ناگفتہ بہ حالات تھے جنہوں نے فاضل مؤلف کو اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے عہدِ حاضر کی مذہبی ضروریات کی نباضی کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے پہلی جلد بڑی تقطیع کے سات سو بارہ (۷۱۲) اور دوسری جلد چار سو چوراسی (۴۸۴)

1 الحکیم بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ء مطابق جمادی الاول ۱۳۵۰ھ ص ۲۴ / روزنامہ سیاست لاہور، ۴ نومبر ۱۹۳۱ء

صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ کُل بارہ باب ہیں، جن میں سے آٹھ باب جلد اول اور چار باب جلد دوم
میں اختتام پذیر ہوئے ہیں۔ ہر ایک باب میں جن جن عناوین پر بحث کی گئی ہے ان کی فہرست اس قدر
طویل ہے کہ اس مختصر سی جگہ میں ان کے نقل کی گنجائش نہیں۔ مثلاً باب اول میں سب سے پہلے مادہ
کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مادہ کسی چیز کی علت نہیں ہو سکتا۔ تمام اشیائے
مادیہ متحد الاصل ہیں۔ سلسلۂ نظام عالم ایک قانون کلی کے زیر اثر چل رہا ہے۔ اشیائے
کائنات سب کی سب حادث ہیں۔ ہر ایک حادث فانی ہے۔ سلسلہ کائنات لامتناہی نہیں ہو
سکتا۔ تمام اشیاء عدم سے وجود پذیر ہوئی ہیں۔ خواص اشیاء کا حصر ناممکن ہے۔ ربط سبب
و مسبب اور حقائق غیر مادیہ یا ماوراء المادہ، حقیقت مادہ کے متعلق جدید تحقیقات،
الوسائط والاسباب، تجربہ و مشاہدہ، واقعات کا علم اور عقل، غایۃ العقل، دہریت، نیچریت
افراط و تفریط، ہماری فطری معذوری، عقل جزئی کا محدود ہونا، مخالف عقل و مافوق العقل،
بنا بریں حیثیت انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے چلے آئے ہیں۔ نیچریت اور ادبار قومی کا اصل
سبب ہے۔ علت اور سبب میں امتیاز، یہ مختصر فہرست باب اول کی ہے۔ اسی طرح ہر باب میں
تمام ضروری عنوانوں پر نہایت شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے اور کوئی بات ایسی نہیں جس کا ذکر
ضروری ہو اور نظر انداز کر دی گئی ہو۔ زبان نہایت سلیس اور رواں کہ معمولی قابلیت کا آدمی
بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مشکل مسائل بھی نہایت سہل طریق پر سمجھائے گئے ہیں۔ لکھائی، چھپائی،
کاغذ قابل تعریف، کوئی پڑھا لکھا مسلمان اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے کیونکہ اس کا مطالعہ نعمت
غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ قیمت جلد اول پانچ روپے، جلد دوم تین روپے علاوہ محصول ڈاک۔ اگرچہ
یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں لیکن فاضل مؤلف نے ہماری درخواست پر غیر مستطیع حضرات کے لئے دونوں
جلدوں میں دو روپے رعایت کر دی ہے۔
مولانا اصغر علی روحی معلم دینیات و ادبیات اسلامیہ کالج لاہور سے طلب فرمایئے

۲ ـــ الجفاء والوفاء

یہ دراصل عربی کتاب "الداء والدواء" مصنفہ امام ابن قیمؒ سے اخذ کی گئی ہے۔ یوں کہنا
چاہیئے کہ کتاب مذکور کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۳۷۷ھ میں دوبارہ مصر میں "الجواب الکافی لمن
سأل عن الدواء الشافی" کے نام سے محمد عبدالوہاب فائز کی تحقیق کے ساتھ طبع کی گئی ہے۔ امام ابن قیمؒ
آٹھویں صدی ہجری کے علماء کرام میں سے تھے۔ وہ فرقہ اہل السنت والجماعت کے شعبہ حنابلہ سے تعلق رکھتے
تھے اور شیخ ابن تیمیہ کے مشاہیر تلامذہ میں سے تھے۔ شریعت اسلام کے علوم اور دینیات میں اُن
کا پایہ بہت بلند ہے۔ علم حدیث اور سنت نبوی میں انہیں اس قدر ضبط اور تحفظ حاصل تھا کہ لوگ
اُن کی نسبت کہا کرتے تھے کہ جو حدیث انہیں ضبط نہیں وہ کوئی حدیث نہیں۔ قرآن مجید پر انہیں
ایسا قابو تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر فی الفور آیات قرآنیہ سے استدلال اور استشہاد پیش کر دیا
کرتے تھے۔ انہوں نے علوم دینیہ کے مختلف شعبوں میں مختلف کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں
اہل بدعت کے عقائد باطلہ کا رد کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت نے اگرچہ ہر گناہ کی حقیقت سے انسان کو مطلع کر دیا ہے اور تزکیۂ نفس کے متعلق
واضح ہدایات جاری فرمائی ہیں مگر چونکہ اکثر لوگ گناہ سے بچنے کے طریقے اور گناہ کے ضرر سے واقف نہیں
ہوتے۔ اسلئے علماء کرام نے بہت سی ایسی کتابیں لکھی ہیں جن کے مطالعہ سے انسان کو نفس امارہ کی چالبازیوں
اور شیطان رجیم کی چالاکیوں کی باریک سے باریک گتھیوں اور اُن کے بُرے نتائج کا علم ہو سکتا ہے۔ مگر
مصنف کا طرز بیان اور مسلک علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ ایسی کتابوں میں سے حافظ ابن قیمؒ کی مندرجہ بالا
کتاب بے نظیر ہے جس کی ضرورت امت مسلمہ کے لئے فی زمانا نہایت ضروری ہے۔ لطف یہ ہے کہ اہل
فاضل نے قرآن مجید اور سنت کے استدلال سے ہٹ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ یہی اس کتاب کی

ایک خاص وجہ امتیاز ہے اس کتاب کے بالاستیعاب پڑھ لینے کے بعد انسان کو چند ایک امور کا یقین ہو جاتا ہے مثلاً ۱۔ کوئی شخص خدا کی توفیق کے بغیر گناہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا

۲۔ سنت کی روشنی میں انسان ظلمت کدہ سے نکل سکتا ہے

۳۔ کتاب و سنت کی تشریح و تفسیر کے لئے علماء اعلام کی ضرورت ہے

یہ کتاب حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ایک استفتاء کے جواب میں لکھی تھی جو یہ تھا کہ

علمائے اسلام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص مصیبت گناہ میں مبتلا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اگر وہ یونہی اس حالت پر قائم رہا تو اس کے دین و دنیا تباہ ہو جائیں گے۔ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کو اس مصیبت سے رہائی حاصل ہو جائے مگر اس کی حالت اور بھی خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ سو ایسی حالت میں اسے کیا حیلہ اختیار کرنا چاہئے اور کس تدبیر کا پابند ہونا چاہئے تاکہ وہ اس بلائے عظیم سے رہائی حاصل کر سکے؟

مولانا مرحوم نے اس کتاب کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے سلاست اور روانی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کرنے کے دوران میں نہایت دقت نظری سے کام لیا گیا ہے تاکہ کتاب کے مصنف کا صحیح زاویۂ نگاہ واضح ہو سکے

۳۔ امیر الکلام من کلام الامام

علم و حکمت کا جو چراغ نبیٔ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم نے جلایا تھا اُسکی چمک دمک نے دنیا کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ جن لوگوں نے مشکوٰۃ نبوت سے اکتساب نور کیا وہ آفتاب عالمتاب کی طرح منور ہو گئے اور اُن کا فیضان اتنا عام ہوا کہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے کیونکہ ایک چراغ سے جتنے چراغ روشن کرنا چاہیں کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باب العلم قرار دیا تھا اور اُن کے علم و عمل کی شہرت عالمگیر ہے بلکہ مغربی مؤرخین نے بھی اس سلسلے میں اُن کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کی شجاعت و سخاوت کے علاوہ آپ کی فصاحت و بلاغت کا لوہا تمام دنیا میں مانا گیا ہے اہل دنیا کو جس قدر اسرار و رموز دین امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی طفیل معلوم ہوئے کسی اور مرد حکیم کی معرفت حاصل نہیں ہوئے اسکی وجہ یہ ہے کہ اُن کی تعلیم کا منبع تعلیم وحی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھوں تو اتنی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں جنہیں چالیس اونٹ بمشکل اٹھا سکیں۔

مندرجہ بالا نام کی ایک کتاب جس میں پانچ سو کے قریب اقوال حکیمانہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم نے جمع کر کے اُن کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ اور ضروری مقامات کی تشریح کر کے اُسے اپنی زندگی میں ہی طبع کرا دیا تھا۔ عربی زبان سے ناواقف اصحاب کے لئے مولانا کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ یہ اقوال زیادہ تر نہج البلاغت سے منتخب کئے گئے ہیں۔ کاش کوئی صاحب ان اقوال کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مغربی ممالک کو بھی اُن سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اسلام کے روحانی حکماء کا انداز فکر کتنا اعلیٰ اور بلند ہے۔ نئی روشنی کے دلدادہ لوگ عموماً اہل یورپ کے بعض اقوال کو بڑے فخر سے اپنی تقریروں میں حوالے کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے بزرگان سلف کے علمی کارناموں سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس گنجینۂ حکمت کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ الآیۃ الکبریٰ فی اسماء اللّٰہ الحسنیٰ

ذاتِ باری کی توحید کی حقیقت کو سمجھنا اُس کے اسماء و صفات کے معانی کے سمجھنے پر موقوف ہے
کلامِ ربانی میں جن اسماء و صفات کا ذکر آیا ہے وہ علمِ عقائد کے مسائل کا اصل اصول ہیں۔ اسلام میں جس قدر
عقائد تسلیم کئے جاتے ہیں اُن سب کا منبع ذاتِ باری کے یہی اسماء و صفات ہیں۔ جب تک ان اسماء و صفات
کا علم نہ ہو کوئی شخص عقائدِ صحیحہ حاصل نہیں کر سکتا اور نہ قرآن مجید کی آیات کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔
عربی میں اسماء و صفاتِ ذاتِ باری پر بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کا طرزِ
بیان مختلف ہے۔ مولانا مرحوم نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھ کر عوام الناس کو صحیح راہ پر چلنے کی تلقین
کی ہے۔ وہ خود اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس موضوع پر جتنی کتابیں میری نظر سے گزریں اُن
میں سے امام غزالی کی کتاب المقصد الاسنیٰ اور امام رازی کی کتاب لوامع البیّنات سب سے زیادہ
قابلِ اعتماد ہیں۔ میں نے انہیں دو کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔ گو دو تین اور کتابیں بھی میرے
زیرِ نظر رہی ہیں۔ امام غزالی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معرفتِ الٰہی کے سمندر سے موتی تلاش کر
رہے ہیں اور امام رازی عقلیات کے میدان میں چل رہے ہیں۔ امام رازی کا دینی علوم میں رتبہ بہت بلند ہے مگر
امام غزالی مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر صاحبِ حال ہیں۔ مولانا نے کتاب کے پہلے پچاس صفحات میں
بعض ایسے مسائل دلچسپ پیرایہ میں لکھے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد اسماء و صفاتِ باری کی حقیقت کو
سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان پچاس صفحات میں حسبِ ذیل عنوانات بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ اسماء و صفات منبع جمیع عقائد ہیں
۲۔ بحثِ اسم و مسمّیٰ
۳۔ اسماء و صفات میں فرق
۴۔ نفی و اثباتِ اسماء و صفات

۵۔ اسمائے ذاتِ باری توقیفی ہیں یا قیاسی۔

۶۔ کیا وجہ ہے کہ یہ اسماء پورے سو نہیں بلکہ ایک کم ہے۔

۷۔ فضیلت ذکر اسمائے حسنیٰ۔

۸۔ الإسم الأعظم۔

مولانا نے ان مباحث میں عقلی و نقلی دلائل سے استشہاد کیا ہے اور یہی بات اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہر مسلمان کے لئے جو قرآن مجید کی تلاوت اور اُسکے فہم معانی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس سے قرآن مجید کی آیات کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء آتے ہیں اُن کا ربط نہایت وضاحت کے ساتھ کھل جاتا ہے۔

۵۔ سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام

مذہب اسلام جس وقت سے دنیا میں رونما ہوا ہے۔ اسی وقت سے اہل کتاب اس پر اعتراضات اور مخالفت میں کوشاں رہے ہیں اور عیسائی مشنری بالخصوص اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف بیہودہ سرائی کرتے رہے ہیں۔ اُن کے بے بنیاد اور لغو قسم کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں حق گو علماء کو توفیق دیتا رہا ہے اور دیتا رہے گا، جو حقائق سے پردہ اٹھانے کی خدمت بجالا رہے ہیں۔ مولانا مرحوم نے اپنی اس کتاب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"مجھے اس رسالے کے لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ مشنریوں کی بلاوجہ گوئی شروع اسلام سے جاری ہے اور رہے گی۔ مگر میرے ایک معزز دوست نے مجھے چند رسالے بھیج کر استدعا کی کہ میں ان کے جوابات لکھوں۔ یہ رسالے حسب دستور اصحاب کرسچین لٹریچر سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئے ہیں جو از سر تا پا بہتان و افترا محض ہیں۔ چنانچہ آئندہ سطور میں ہم ان شاء اللہ تعالیٰ اس امر کا کامل ثبوت دیں گے۔ ممبران سوسائٹی اور نیز دیگر پادری صاحبان سے التماس ہے کہ اگر اس رسالے کا جو جواب لکھنا چاہیں تو نہایت ضروری شرط یہ ہے کہ کسی فاضل آدمی کو جو انصاف پرست اور فلسفہ و منطق سے خوب واقف ہو اس کام کے لئے تجویز کریں کیونکہ جس پادری صاحب کے قلم سے رسائل مذکورہ بالا نکلے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دلیل و مدلول کے مفہوم لسانی کے ربط و لزوم کی کچھ خبر نہیں۔ چنانچہ جابجا اس امر کا اشارہ ہوگا۔"

اس رسالہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ معترضین کی باتوں کا جواب دیتے وقت یا تو انجیل اور عیسائیوں کی دوسری کتابوں پر انحصار کیا گیا ہے اور یا عقلی دلائل کے ذریعے اُن کا رد کیا گیا ہے تاکہ معترضین کو مجال انکار نہ ہو سکے۔ اگرچہ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُن کی زبان بند ہو جائے۔

کیونکہ مختلف ملکوں اور زبانوں میں علمائے اسلام کی طرف سے کافی و شافی جوابات لینے کے باوجود بے انصاف دشمن ہٹ دھرمی اور بے باکی سے اپنے اعتراضات کو عوام الناس کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ عوام الناس عموماً کسی بات کی تصدیق و تردید کے دلائل سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اُن کا مطالعہ بھی بہت کم ہوتا ہے اسلئے وہ ان اسلام دشمن عیسائی لوگوں کے دام تزویر میں پھنس جاتے ہیں

رسالہ کے آخر میں مولانا مرحوم نے پادری صاحبان سے چند سوالات کئے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ مسیح خدا بھی ہے اور انسان بھی، کیونکر؟

۲۔ مسیح کا مصلوب ہونا تمام دنیا کے گناہوں کا کیونکر کفارہ ہو سکتا ہے؟ کفارہ اور مغفرت میں کس قسم کا تعلق ہے؟ کیا کسی قانونِ فطرت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے؟

۳۔ مسیح کی نبوت کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ کیونکہ تمہارے اناجیل تو تمہارے اپنے علماء کے خیال میں اصلی اناجیل نہیں اسلئے ان کا ثبوت قطعی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ مسیح خدا تھا تو پھر اپنے عاجز بندوں کے ہاتھ سے کیونکر ذلیل ہو کر مصلوب ہو گیا؟

۵۔ اناجیل کب اور کس نے جمع کیں؟

۶۔ کیا مسیح کی تعلیم مکمل ہے؟ اگر مکمل ہے تو اناجیلِ مروجہ میں معاشرت، سیاست، اخلاق، مبدأ و معاد وغیرہ امور کے متعلق کامل تعلیم کا نہ موجود ہونا اس کی تکمیل کا منافی ہے۔ پھر کیا خدا کی طرف سے کسی مکمل تعلیم کی ضرورت بندوں کے لئے نہیں تھی؟

۷۔ کیا مسیح کے معجزات کو یہود نے تسلیم کر لیا تھا؟

۸۔ کیا مسئلہ تثلیث کی عیسائیت کے سوا کسی دوسرے مذہب سے بھی تائید ہوتی ہے؟ دیگر صحائف انبیاء سے شہادت پیش کرنا ہوگی اور نیز کیا فطرتِ انسانی اس گورکھ دھندا کو حل کر سکتی ہے؟

۶۔ تجلیات فی شرح الاشارات

شیخ بوعلی سینا کی شہرت یونانی فلسفہ اور طب کے علاوہ دیگر علوم وفنون پر بھی مبنی ہے۔ انہوں نے مختلف علوم وفنون میں کئی کتابیں لکھیں اور فلسفہ کے مذاہب مختلفہ میں مطابقت پیدا کرنے میں کمال حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کے اکابر فلاسفہ کے پیشوا مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی علمی تحریکات میں نام پیدا کیا۔ فارابی یونانی فلاسفہ ارسطو کی کتابوں کی تشریح میں ملتا جلتا ہے۔ شیخ بوعلی سینا نے اپنی تحقیقات کے دائرہ کو وسیع کر کے یونانی فلسفہ اور ایشیائی حکمت کو ایسے طور پر منطبق کیا جس کی بنا پر انہیں محقق کہلانے کا حق حاصل ہو گیا۔ تقاضائے وقت کی بنا پر شیخ بوعلی سینا نے اپنے سے پہلے مصنفین فلسفہ سے الگ ہو کر ضروری سمجھا کہ قدیم فلسفہ کو نئے قالب میں ڈھالا جائے۔ انہوں نے فلسفہ کو منطقیات، طبیعیات اور الٰہیات میں تقسیم کر دیا۔ اُن کی بے شمار تالیفات میں ایک مشہور کتاب الاشارات بھی شامل ہے۔ یہ کتاب فلسفہ کی مؤخر الذکر دونوں شاخوں پر لکھی گئی ہے۔ باوجود مختصر ہونے کے یہ کتاب تمام بنیادی مسائل پر حاوی ہے۔ شیخ نے اسے واقعی اشارات بنا دیا ہے۔ اول تو موضوع خشک اور غیر دلچسپ ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کا متن نہایت مغلق ہے اور اس کی عبارات اور مطالب کو حل کرنے میں بڑے بڑے استاد بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب تجلیات شیخ بوعلی سینا کی اسی کتاب اشارات کی اردو شرح ہے۔ مولانا مرحوم کے فرزند اکبر مولوی فضل حق مرحوم نے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان "مولوی فاضل" میں شریک ہونے کا ارادہ کیا، جس کے نصاب میں شیخ کی کتاب الاشارات بھی شامل تھی۔ انہوں نے اپنے والد بزرگوار سے کتاب سبقاً سبقاً پڑھی اور والد ماجد اس کی جو تشریح فرماتے وہ اسے قلمبند کرتے رہے۔ امتحان سے فراغت پانے کے بعد انہوں نے سوچا کہ اس

امتحان کے امیدواروں کے لئے آسانی پیدا کرنا اور اپنے والد مرحوم کے لکھے ہوئے حواشی کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں مدون کرنا ضروری ہے۔ اسلئے اس کتاب کو مولانا مرحوم کے امالی کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔ مولوی فضل حق مرحوم نے ان امالی کو کتابی شکل میں طبع کرا دیا۔ اس شرح کے چھپ جانے سے اصل کتاب کے مطالب کا اخذ کرنا کوئی مشکل بات نہ رہی۔ معمولی استعداد کا طالب علم بھی تمام موضوعات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ فنی اصطلاحات کی ایک مکمل فہرست کتاب کے شروع میں دے دی گئی ہے۔ مطالعہ کرنے والا اگر ایک بار ان اصطلاحات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے تو شیخ کی کتاب اشارات، جو پہلے مشکل اور مغلق نظر آتی تھی اُسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں مولانا نجم الدین مرحوم (جو اس وقت یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ عربی کے صدر تھے) کی تقریظ بھی چھاپ دی گئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

"کتاب کیا ہے فلسفہ مشرق کا آئینہ مصفیٰ ہے، جس سے انگریزی خواں اصحاب بھی بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔" (تجلیات ص ۲۵۴)[۱۳]

۷۔ اطباق الشردہ فی حلّ ابیات البردہ

کلام مجید اور احادیثِ صحیح میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُسکے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت صحیح مومن بننے کے لئے نہایت ضروری ہے اور یہی محبت احکامِ قرآنیہ اور سنتِ نبویہ کی پابندی کے لئے اصل اصول ہے۔ ہر مسلمان کی کوشش ہونی چاہئیے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اپنا شعار بنائے کیونکہ اس کے بغیر عبادت کا ذوق حاصل نہیں ہو سکتا۔

قصیدۂ بردہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ایک مشہور نظم ہے۔ ناظم کا نام ابو عبداللہ شرف الدین محمد بن سعید ہے، جو مصر کے علاقہ البوصیر کے باشندے تھے۔ عام طور پر انہیں امام بوصیری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک نہایت جید ادیب اور بے مثال فصیح و بلیغ شاعر تھے۔ ابتدائی عمر میں وہ امراء و سلاطین کی مدح کرتے رہے جس کی وجہ سے وہ اُن کے ہاں وقار اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کچھ مدت بعد وہ مرضِ فالج میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی حالت بیان کر کے اس مرض سے نجات حاصل کی جائے۔ اسی جذبہ کو مدِ نظر رکھ کر انہوں نے یہ قصیدہ لکھا۔ جس رات یہ قصیدہ مکمل ہوا، وہ اسی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور آپ کے حضور میں انہوں نے یہ قصیدہ پڑھا۔ جب قصیدہ ختم ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اُن کے تمام بدن پر پھیرا۔ صبح جب بستر سے اٹھے تو مرض کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔

یہ معاملہ انہوں نے کسی پر ظاہر نہ کیا۔ پھر جب وہ گھر سے باہر نکلے تو اُن کی ملاقات شیخ ابو الرجاء رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی جو شیخ بوصیری کے دوست تھے اور نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قصیدہ کہاں ہے جو آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں رات کو پڑھا تھا؟ امام بوصیری نے پوچھا کہ آپ کو اس کا کیسے علم ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے گزشتہ رات آپ کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسرت کی وجہ سے ایسے جھوم رہے تھے جیسے پھول

داڑھیاں ہوا کے جھونکوں سے جھومتی ہیں۔

اس قصیدے کو دو ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک تو قصیدۂ بُردہ اور یہ نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اسے بُردہ کہنے کی بھی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ بُردہ فُعّلَة کے وزن پر اُس چیز کا نام ہے جس کو رگڑ کر ریتی سے چھیل دیا جائے چنانچہ عربی میں ریتی کو "مِبرد" کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ قصیدہ حشو و زوائد اور تعقید سے پاک صاف ہے اسلئے اسکا یہ نام رکھا گیا ہے۔ یا بَرد کے معنی سکون اور راحت سے مشتق ہے۔ چونکہ اس قصیدہ کے پڑھنے سے دل کو تسکین اور آرام حاصل ہوتا ہے اسلئے بھی یہ بُردہ کے نام سے موسوم ہے اور یا بُردہ بمعنی چادر ہے چونکہ امام بوصیری کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قصیدہ کو ختم کرنے کے بعد چادر مبارک عطا فرمائی تھی اسلئے اس کا نام قصیدۂ بردہ رکھا گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا نام بُردہ نہیں بلکہ بُرأۃ (جس کے معنی شفا کے ہیں) ہے۔ چونکہ امام بوصیری کو اس کے پڑھنے سے بیماری سے شفا حاصل ہوئی اس لئے اس نام سے موسوم ہوا۔

ایک صحیح العقیدہ اور کامل ایمان والے شخص کے لئے یہ قصیدہ ایک روحانی غذا ہے، جس کے پڑھنے سے دل کو سرور اور روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا ہر شعر کا معنی بخوبی سمجھتا ہو۔ چونکہ مطالب کا سمجھنا پوری توجہ کا محتاج ہے۔ مولانا مرحوم نے اردو زبان میں اس کی شرح لکھ دی۔ اسکو پڑھ کر ایک عام شخص بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ترجمے اور ترجمے سے پہلے ہر شعر کے مشکل الفاظ کے معانی بھی قلمبند کر دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اس شرح کو سامنے رکھتے ہوئے کسی دوسری شرح یا لغت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی

فصاحت و بلاغت کا فن علم ادب کی جان ہے۔ نثر ہو یا نظم، جب تک کوئی شخص فصاحت و بلاغت کے اصول و قوانین کو مدنظر نہ رکھے۔ اس سے اعلیٰ درجے کے کلام کی توقع رکھنا فضول ہے۔ یہ فن کسی کلام کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ اس فن کے علماء نے اسے مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ علم معانی ۲۔ علم بیان ۳۔ علم بدیع

مولانا مرحوم نے اس فن پر فارسی زبان میں دبیرِ عجم لکھی۔ اس کتاب سے پہلے بہت سی کتابیں اس فن پر فارسی زبان میں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو دہلوی کی کتاب اعجازِ خسروی غالباً پہلی کتاب ہے مگر اس میں فن بلاغت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا گیا۔ ساتویں صدی ہجری کے شروع میں جب فارس کے تختِ حکومت پر خاندانِ اتابک کی حکومت تھی تو اُن کے دور میں علامہ شمس الدین محمد بن قیس رازی نے اپنی مشہور کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم تصنیف کی، جس میں علم بدیع اور علم بیان کے علاوہ علم عروض پر بھی ضروری ہدایات پائی جاتی ہیں۔ بے شک یہ کتاب نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے مگر افسوس کہ اس میں علم معانی کے بارے میں کچھ لکھا نہیں گیا۔ اسی طرح فارسی کے مشہور شاعر رشید الدین وطواط نے بھی ایک مختصر رسالہ حدائق السحر کے نام سے تالیف کیا مگر وہ زیادہ تر صرف علم بدیع کے ذکر تک محدود ہے۔ تذکرہ آتش کدہ آذر میں عُبید زاکانی کی طرف ایک کتاب منسوب کی گئی ہے جو علم معانی کے مسائل پر بحث کرتی ہے لیکن وہ کتاب چونکہ چھپ نہ سکی اس لئے یہ معلوم نہیں کہ وہ عربی کے ادب سے تعلق رکھتی ہے یا فارسی کے۔ اس کے بعد میر شمس الدین فقیر دہلوی نے حدائق البلاغت کے نام سے ایک کتاب لکھی جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے اور فارسی امتحانات میں بطورِ نصاب شامل رہی ہے۔ اس کتاب میں علم بیان، علم بدیع اور علم عروض کے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں علامہ سعد الدین تفتازانی کی عربی کتاب مختصر المعانی کی بنیاد پر مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حدائق البلاغت کے عربی متن کو فارسی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ صرف مثالیں عربی کی بجائے فارسی ادب سے پیش کی گئی ہیں۔ حدائق البلاغت کو بعد میں مولوی امام بخش صہبائی دہلوی نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔ پھر ۱۲۲۵ھ کے لگ بھگ اکبر آباد کے ایک شخص محمد فائق نے مخزن الفوائد کے نام سے ایک کتاب لکھی جو زیادہ تر رازی کی کتاب المعجم پر مبنی ہے۔ مؤلف نے اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا لیکن علم معانی کا بیان اس کتاب میں بھی نہیں کیا گیا۔ عبدالواسع ہانسوی کے رسالہ کا بھی یہی حال ہے۔

منذکرہ بالا کوائف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں علم معانی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی حالانکہ یہ علم فن بلاغت کی روح رواں ہے۔ موازنہ اور تنقید کے اصولوں کی واقفیت علم معانی کے بغیر ناممکن ہے۔ مولانا مرحوم نے فارسی میں دبیرِ عجم لکھ کر اس کمی کو پورا کیا ہے اور اپنی کتاب کو پانچ بابوں میں مرتب کیا ہے۔ چنانچہ

پہلا باب متفرق مسائل پر مشتمل ہے۔ جو اگرچہ علم بلاغت کا حصہ تو نہیں لیکن ایک فصیح و بلیغ انشا پرداز کے لئے ان مسائل کا سمجھنا نہایت ضروری ہے مثلاً فارسی زبان کی امتیازی خصوصیات، شعر کی ماہیت، نظم کی مختلف قسمیں مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعی وغیرہ پر اجمالی تبصرہ، تخلص اور سرقاتِ شعریہ وغیرہ۔

دوسرا باب علم معانی پر مشتمل ہے جس میں فصاحت و بلاغت کی تعریف، مجاز لغوی، مسند اور مسند الیہ، التفات، تقدیم و تاخیر، خبر، حذف، اسم موصول، قصر، فصل و وصل اور ایجاز و اطناب۔

تیسرا باب علم بیان سے متعلق ہے جس میں تشبیہ، تشبیہ کی تقسیم، تشبیہ تمثیلی، حقیقت و مجاز، کنایہ، تشبیہ و استعارہ کا فرق، استعارہ کی تقسیم وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

چوتھا باب علم بدیع پر ہے جس میں لفظی اور معنوی صنائع اور اُن کی وضاحت کے لئے اساتذہ کے کلام سے متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

پانچواں اور آخری باب موازنہ و تنقید پر ہے۔

مولانا مرحوم نے اس موضوع کو علم بلاغت کا اہم ترین مقصد قرار دیا ہے۔ اس

میں قدیم اساتذہ مثلاً نظامی، سعدی، انوری، حافظ، قدسی، ظہوری، امیر خسرو، نظیری، عرفی، فردوسی وغیرہ کے اشعار کا حوالہ دے کر اُن کے کلام پر تنقید کی ہے اور بعض شعراء کا موازنہ کر کے ایک کلام کو دوسرے کلام پر فضیلت کی وجہ بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مرحوم نے ذاتی اجتہاد کی بنا پر بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی اُس کا جائز مقام دیا ہے، وہ کسی کی شہرت سے مرعوب نہیں ہوئے اور کسی مقام پر بھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑا مثلاً ایک مقام پر نظیری اور عرفی کے ہم وزن اور ہم قافیہ اشعار کے مقابلے کے بعد عرفی کو نظیری پر فضیلت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"می گفتم کہ نظیری در جواب شعر عرفی خود را اُضحوکۂ اساتذۂ این فن ساختہ و مرا از گفتن سخن حق دغدغۂ مزاحمتِ منکران باز نمی دارد. ما را بحق کار است، گو خواجہ راضی مباش"

ایک جگہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"مؤلف شعر العجم را عادت است کہ در تعریف ہر شاعرے الفاظ چند اختراع نمودہ و در مدح و ثنائے او مبالغہ دور از کار بکار می برد و بہ اطرائے تمام می کوشد، والحق در بعض از جادۂ اعتدال انحراف ورزیدہ"

چونکہ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ادبی نقطۂ نظر سے بھی کچھ بحث کی جائے تاکہ مولانا مرحوم کی ایک غیر ملکی زبان یعنی فارسی میں قابلیت اور عبور پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مادری اور ملکی زبان سے ہٹ کر کسی غیر زبان میں ایسے موضوع سے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھنے کی جسارت کرنا بچوں کا کھیل نہیں بالخصوص ایسے شخص کے لئے جو نہ تو اس ملک میں کبھی گیا ہو جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے اور نہ اُسے اہل زبان سے ملنے جلنے اور ہم کلام ہونے کا موقع ملا ہو بلکہ اُس کی قابلیت اور زبان دانی کا تمام انحصار شوق اور محنت سے ادبی کتب کی کثرتِ مطالعہ پر ہو۔

اس کتاب کا موضوع فارسی فصاحت و بلاغت ہے جو ایک روکھا پھیکا موضوع ہے لیکن اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے فقرے بڑے ناپ تول سے رکھے گئے ہیں۔ بعض جگہ تو اغلب بندی بھی پائی جاتی ہے۔

جس سے عبارت میں شعروں کی سی شان پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً کتاب کے آخر میں "پایان نامہ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

الٰہی گر دامان ارادت فراخ آری ذخیرۂ لآلئ آبدار بر داری۔ بہ یقین می دانم کہ آنچہ بر دست این فقیر بے بضاعت صورت اتمام پذیرفتہ کمتر ازان است کہ می خواستم و بیشتر ازان است کہ می کاستم ...... الخ

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موزوں اور ہم آہنگ الفاظ کے استعمال میں مصنف کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ تقریباً تمام متن نثرِ مسجع میں ہے۔ حالانکہ ایسی نثر میں بناوٹ اور تکلف کا خود بخود پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے لیکن از اول تا آخر عبارت میں روانی اور الفاظ میں تناسب کی وجہ سے یہ کتاب جاذبِ نظر شیریں اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ایسی عبارت کو ہی سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کتاب کسی غیر اہلِ زبان کا شاہکار ہے تو اس کے ایسا ہونے کا گمان بھی پیدا نہیں ہوتا

اسی انہی خوبیوں کی بنا پر جامعہ پنجاب نے مصنف کی زندگی ہی میں کافی دیر تک ایم۔ اے فارسی اور منشی فاضل کے امتحانات میں شامل نصاب کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں حیدر آباد دکن کی یونیورسٹی نے بھی اسے اپنے ہاں فارسی کے اعلیٰ امتحان میں داخل کر رکھا تھا۔ اب بھی جامعہ پنجاب نے فارسی کے اعلیٰ امتحانات میں بطور مجوزہ کتب کے سلسلے میں اسے مقرر کر رکھا ہے۔

۹۔ العروض والقوافی

دبیرِ عجم کی تالیف کے وقت مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ فنِ عروض بھی اسی کتاب کا ایک حصہ بنایا جائے گا۔ لیکن جب دبیرِ عجم اختتام کو پہنچی تو انہیں محسوس ہوا کہ فنِ عروض کے شامل کر لینے سے اس کا حجم بہت بڑھ جائے گا اس لئے العروض والقوافی کو اس میں شامل نہ کیا بلکہ اس کے لئے یہ علیحدہ ایک مستقل رسالہ العروض والقوافی کے نام سے لکھا۔ یہ گو فارسی عروض سے متعلق ہے لیکن اردو زبان میں لکھا گیا ہے تاکہ امتحانی امیدواروں کے علاوہ عوام الناس بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ یہ رسالہ صرف فارسی عروض کے لئے ہی کافی نہیں بلکہ عربی اور اردو عروض کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔

فنِ عروض علوم نقلیہ میں شامل ہے اور اس فن پر اس سے پہلے بھی کچھ رسائل لکھے گئے لیکن اُن کی پڑتال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مؤلفین نے اس فن کے تمام ضروری مسائل جمع نہیں کئے بعض میں کوئی بات رہ گئی ہے اور بعض میں وضاحت سے کام نہیں لیا گیا لیکن العروض والقوافی کے مصنف نے اس فن کے تمام اہم اور ضروری مسائل کو یکجا کر دیا ہے جس کے ہوتے ہوئے اس فن پر کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی

چونکہ یہ دبیرِ عجم کا تتمہ ہے جس کا موضوع فارسی فصاحت و بلاغت ہے اس لئے العروض والقوافی میں بھی تمام مثالیں فارسی اشعار سے دی گئی ہیں اس کے ساتھ اگر عربی اور اردو کی مثالیں بھی شامل کر لی جاتیں تو دورانِ مطالعہ طلبہ کے ذہن کی تشویش کا موجب بن سکتا تھا

رسالہ کے شروع میں علمِ عروض کے بانی خلیل بن احمد بصری کے مفصل سوانحِ حیات بھی لکھ دیئے گئے ہیں اس کے بعد رسالہ کے دو باب ہیں۔

پہلا باب علمِ عروض پر ہے جس میں شعر کی ابتداء، شعر اور عروض کا باہمی تعلق، ضرورتِ علمِ عروض، عروض کی تعریف اور وجہ تسمیہ، بحروں کی تعداد، ارکانِ بحور، قواعدِ تقطیع، دوائرِ خمسہ، زحافات اور رباعی کی اختراع وغیرہ پر مشتمل ہے۔

مصنف نے خلیل بن احمد کی ایجاد کردہ بحروں اور بعد میں اخفش نحوی کی بحر متدارک اور بعض فارسی میں تین نئی بحریں اختراع کئے جانے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس طرح کل انیس[19] بحریں بتائی گئی ہیں۔ جو عربی، فارسی اور اردو میں مستعمل ہیں۔

دوسرا باب علم قافیہ سے متعلق ہے اس میں لفظ قافیہ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق حروف قافیہ، حرکات قافیہ، احکام حروف و حرکات قافیہ، قافیہ اصل اور معمول، عیوب قوافی وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ بھی جامعہ پنجاب کے فارسی نصاب میں مدتوں داخل رہا ہے۔

۱۰۔ تحفۂ شروان

یہ فارسی کے مشہور شاعر خاقانی کے ایک قصیدہ کی اردو شرح ہے جو مولانا مرحوم کے عہد میں بی۔اے کے نصاب فارسی میں داخل تھا۔ خاقانی چونکہ شہر شروان کا رہنے والا تھا اس لئے اس کا نام تحفۂ شروان رکھا گیا۔ جس وقت یہ مختصر رسالہ شائع ہوا، انجمن حمایت اسلام لاہور کے ماہوار رسالہ میں اس پر ایک صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا لیکن لکھنے والے بزرگوار کا نام رسالہ مذکورہ میں نہیں ملتا۔ وہ لکھتے ہیں: [1]

تحفۂ شروان

میرے مخدوم مولوی اصغر علی صاحب روحی مدرسۃ المسلمین (اسلامیہ کالج) کے السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر نے کچھ عرصہ ہوا ہے، خاقانی خلاق معانی الملقب بہ حسان عجم کے قصائد میں سے بہت مگر مشکل اور نہایت مشہور قصیدے کی جس کے تتبع پر بڑے بڑے سخنوران زمانہ نے اپنے اپنے وقت میں زور طبیعت دکھایا ہے، شرح لکھی ہے۔ یہ قصیدہ بی۔اے کی جماعت کے فارسی خوان طلباء کے نصاب میں داخل ہے اور زیادہ تر انہیں کی سہولت کو مدنظر رکھ کر مولوی صاحب نے شرح لکھنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔

میری ذاتی استعداد ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ میں متن یا شرح پر رائے زنی کر سکوں مگر مجھے اس قدر یقین ہے اور یقین واثق ہے اور اس کا ظاہر نہ کرنا گناہ میں داخل ہے کہ اس شرح کی مدد سے طلباء اس قصیدے کو اس حد تک نہایت خوبی سے ضبط کر سکیں گے کہ امتحان میں اس کے متعلق

---

[1] انجمن حمایت اسلام کا ماہواری رسالہ، ماہ ذی الحج ۱۳۱۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۰۲ء جلد ۱۹ — عدد ۲ صفحہ ۱۳

تمام سوالات کے ضروری جوابات سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکیں اور نہ فقط طلباء بلکہ تمام وہ اصحاب جن کے کام و دہان فارسی زبان کی لطف و شیرینی سے آشنا ہیں فائدہ اٹھا کر محظوظ ہونگے

شارح نے ناظرین کی توسیع معلومات کے لئے جا بجا مناسب حالات لکھ کر قصیدے کے حل غوامض کے علاوہ تاریخی چاشنی کا بھی مزا چکھایا ہے۔

ملک کے ذی لیاقت حضرات سے امید ہے کہ اسے نہایت شوق سے دیکھیں گے اور شارح کی جانکاہی اور عرق ریزی کی داد دے کر حوصلہ افزائی کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔ اس سے اور اہل علم کو اشاعت علم کا شوق پیدا ہوگا اور ایسی ہی باتوں سے ملک کی آئندہ ترقی کی امید بندھتی ہے۔

شارح نے خود بھی دیباچۂ کتاب میں اس کو نہ کنایتاً بلکہ صراحتاً کہدیا ہے کہ

"اگر مجھے معلوم ہوا کہ طلباء نے اس کی قدر کی ہے تو میں کوشش کروں گا کہ بعض دیگر حصص مشکلہ مندرجۂ کورس (نصاب) کی شرح بھی لکھ دوں۔"

یہ شرح ۷۶ صفحوں پر ختم ہوئی ہے اور باہتمام صحت و صفائی لاہور کے ایک دخانی مطبع میں طبع کرائی گئی ہے۔ قیمت صرف ۳ر

جی چاہتا ہے کہ بطور نمونہ کے ایک شعر کی شرح درج کردی جاوے تاکہ ناظرین اس قلیل القیمت رسالے کے کثیر المنفعت ہونے کا اندازہ کرلیں :- ؎

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش   دم تسلیم سر عشر و سر زانو دبستانش

دل سے مراد یہاں وہ صنوبری شکل کا مضغۂ گوشت نہیں ہے جو بائیں جانب کی پسلیوں کے نیچے حرکت کرتا ہے بلکہ وہ لطیفۂ ربّانیہ مراد ہے جو انوار معرفت ذات باری کے حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُس کو روح کہنا چاہیئے، کما صرّح بہ الغزالی فی الاحیاء۔ پیر تعلیم۔ معلم علم دین کو بولتے ہیں۔ طفل زباندان۔ اس لڑکے کو کہتے ہیں جو پہلی دفعہ استاد کی تقریر کو سمجھ کر خوب ضبط کرے اور صاف سنا دے۔ دم تسلیم خاموشی۔ فرمانبرداری۔ رضا طلبی کو کہتے ہیں۔ سر عُشر اُس نقش یا نشان کو بولتے ہیں جو قرآن مجید کے حاشیہ پر ہر دس آیت کے خاتمے کے موقع پر لکھ دیتے ہیں اور نیز وہ پہلی دس آیتیں جو شروع قرآن سے پہلے بچے کو یاد کراتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ سر زانو۔ اضافت بیانی۔ دبستان۔ مکتب۔

سرِ زانو کو دبستان قرار دینے سے وہ حالت مراقبہ مراد ہے جس میں اہل اللہ کو عجائب و غرائب حقائق کا کشف ہوتا ہے۔ اسکی حقیقت سے کچھ وہی لوگ آگاہ ہوتے ہیں جو اس حالت میں ہوا کرتے ہیں۔ صائب اصفہانی کہتا ہے ؎

تو مرد صاحبِ دل نیستی چہ میدانی ۔۔۔ کہ سر بجیب کشیدن چہ عالمے دارد

ترجمہ۔ میرا دل میرا معلم ہے (جو مجھے حقیقت کا سبق دیتا ہے) اور میں اس کا طفل زباندان ہوں۔ یعنی (ایسا شاگرد جو اس کے فیضِ تعلیم کو فی الفور اسکی ہدایت کے مطابق ضبط کر لیتا ہے) اور خاموشی یا فرمانبرداری عشرہ جو شروع تعلیم سے پہلے ہی سکھایا گیا ہے یعنی (استاد کی پہلی ہدایت یہ ہے کہ بس دم بخود رہو) اور یہ سب تعلیم میں دبستان زانو یعنی مدرسۂ مراقبہ میں حاصل کر رہا ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسا جوہر مخفی ہے کہ جس سے جو یائے حقیقت پر از خود حقیقی علوم کا دروازہ کھل جاتا ہے مگر اس جوہر فطرت کو فعلی صورت میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان ریاضت نفس اختیار کرے اور اپنے وگن سے قطع تعلق کر کے بحرِ تفکر میں غوطہ لگائے۔ کسی استاد نے کہا ہے ؎

خونابۂ دل خور کہ شرابے بہ ازیں نیست ۔۔۔ دنداں بجگر زن کہ کبابے بہ ازیں نیست
در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدا را ۔۔۔ در صفحۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

۱۱۔ ماہوار رسالہ

الہدیٰ

پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مولانا روحی مرحوم نے ایک ماہوار رسالہ الہدیٰ[1] کے نام سے جاری کر رکھا تھا جس کا پہلا پرچہ ۱۳۲۱ھ کے ماہ ذیقعدہ میں منظرِ عام پر آیا اور ۱۳۳۱ھ یعنی متواتر دس[10] سال تک حتی الوسع باقاعدگی کے ساتھ طبع ہوتا رہا۔ ہر رسالے کے سرورق پر یہ عبارت ہوتی تھی:

"صرف بغرض اصلاح مفاسد دینیہ و رد معتقدات باطلۂ فلسفیہ و تائید احکام سنت سَنیّہ علی صاحبہا السلام والتحیہ۔"

اس رسالہ میں دین حنیف سے متعلق نہایت اہم مسائل پر مضامین طبع ہوتے رہے۔ اس رسالہ سے مقصود صرف مذہب اسلام کی تبلیغ اور مسائل کو صحیح شکل میں پیش کرنا تھا۔ اسے سیاست یا ادب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس میں جو مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے اکثر خود مدیر رسالہ کے قلم سے نکلتے تھے لیکن بعض مضامین اس دور کے دوسرے علماء سے بھی موصول ہوتے رہے جو وقتاً فوقتاً رسالہ کی زینت بنتے رہے۔ ایسے چند اصحاب کے نام یہ ہیں:

۱۔ مولوی احمد علی، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور ۲۔ مولوی فیروز دین ڈسکوی

۳۔ مولوی محمد عبدالحق مفسر قرآن ۴۔ مولوی محمد حسین بٹالوی

۵۔ ابوالکلام آزاد دہلوی ۶۔ مولوی مصباح الدین دہلوی

۷۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ۸۔ غلام دستگیر نامی

۹۔ مولوی عبدالحی بدایونی ۱۰۔ مولوی نجم الدین سیوہاری

۱۱۔ مولوی غلام حیدر پنشنر سرگودھا ۱۲۔ حافظ ابراہیم سیالکوٹی

۱۳۔ مولوی محمد عمر خاں ٹونکی ۱۴۔ مولوی معین الدین اجمیری

۱۵۔ مفتی سعد اللہ رامپوری ۱۶۔ مولوی حاجی احمد پروفیسر بہاولپور

۱۷۔ مولوی حبیب الرحمن بھیکن پوری ۱۸۔ مولانا محمود الحسن

۱۹۔ مولوی شبیر احمد عثمانی ۲۰۔ مولوی اشرف علی تھانوی

۲۱۔ مولوی عاشق الٰہی ۲۲۔ مولوی نور احمد لدھیانوی

مدیر رسالہ نے پہلے ہی پرچہ میں چند سطریں شکریہ کے عنوان سے اُس وقت کے نواب بہاولپور سے متعلق لکھیں جو حسب ذیل ہیں

شکریہ[1]

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ

(جو شخص اپنے محسنوں کا شکرگزار نہیں ہوتا وہ خدا کا بھی شکرگزار نہیں ہوتا)

میں نہایت اخلاص سے بندگانِ عالیجناب رکن الدولہ حافظ الملک مخلص الدولہ نصرت جنگ نواب محمد بہاول خان خامس عباسی فرمانروائے ریاست بہاولپور ادام اللہ ملکہ الی یوم النشور اور معزز ممبران کونسل ریاست عالیہ کا اپنی اور نیز کافۂ اہل اسلام کی طرف سے سچا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے خالصاً لوجہ اللہ اس دینی خدمت یعنی اجرائے رسالہ الہدیٰ کے ابتدائی مصارف کے لئے مبلغ دو سو[2] روپیہ کی نقد رقم سے خاکسار کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

خاکسار اصغر علی روحی ایڈیٹر الہدیٰ

[2] ہز ہائینس نواب صاحب دام اقبالہ مبلغ یکصد روپیہ۔ معزز ممبران کونسل عالیہ مبلغ یکصد روپیہ ——— الہدیٰ

[1] الہدیٰ؛ ۱:۱ ص۲

ذیل میں رسالہ میں چھپنے والے چند ایک مضامین کے عنوان لکھے جاتے ہیں تاکہ صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد کیا تھا۔

اسلام ، الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ، حکمت وضو ، اسرارِ جماعت ، علمائے دنیا و علمائے آخرت ، اخلاصِ نیت ، دین و دنیا ، اعجاز القرآن ، اہلِ فلسفہ و اہلِ دین ، حسنِ ظن ، تفسیر بالرائے ، مطالعۂ کتب ، نمازِ جمعہ ، خوف و رجا ، قوانینِ فطرت اور معجزات ، اسلام اور عیسائیت ، الوحی والالہام ، عید الفطر ، روزہ ، مکاشفہ ، صدقات ، جدید علمِ کلام ، روایت و درایت ، علمِ حدیث ، نمازِ تہجد وغیرہ۔

اس رسالہ کی اشاعت سے کوئی مالی منفعت مدِنظر نہ تھی بلکہ مدیر کے خلوص، حسنِ نیت اور اشاعتِ دین کا جذبہ کارفرما تھا۔ یہ ماہوار رسالہ عموماً کم و بیش چالیس پچاس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کا سالانہ چندہ صرف اڑھائی روپے تھا۔ طالب علموں سے ڈیڑھ روپیہ بھی قبول کر لیا جاتا اور نادار اور مستحق لوگوں کو بغیر کسی معاوضہ کے بھی بھیجا جاتا تھا۔ اس قدر حقیر رقم سے رسالہ کے مصارف کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ اس کا حلقۂ اشاعت وسیع ہوتا جاتا مگر مدیر کی بار بار یاددہانی کے باوجود اس طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ مدیر کی ذاتی آمدنی صرف وہی تنخواہ تھی جو انہیں اسلامیہ کالج سے حاصل ہوتی اسلئے آخر یہ رسالہ مسلمانوں کی مذہب سے بے اعتنائی اور علمی مضامین سے بے رغبتی کے باعث مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ مولانا مرحوم نے آخری پرچہ میں "تلک عشرۃ کاملۃ" کے عنوان کے تحت یوں لکھا:

تلک عشرة کاملة[1]

ناظرین عنوانِ بالا کو دیکھ کر ضرور سوچیں گے کہ عشرہ کاملہ سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ الہدیٰ نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر لئے۔ اس مختصر عرصہ میں ہمیں بخوبی تجربہ ہو گیا کہ جس قدر مذہبی تحریرات و رسائل کی طرف سے مسلمانوں کو نہایت بے اعتنائی ہو چکی ہے۔ اس کی وجوہ پر مفصل بحث کرنا خارج از آہنگ ہے مگر یہ بالکل صحیح ہے کہ قوم کا علمی مذاق یقیناً فاسد ہو چکا ہے۔ ناخواندہ لوگ تو مرفوع القلم ہیں۔ خواندہ اصحاب میں جنہیں کچھ فرصت ملتی ہے تو اخبارات ملکی یا ناولوں کے مطالعہ سے زیادہ انہیں کسی علمی یا دینی تحقیق سے کچھ وابستگی نہیں۔ عقائد کا حال تو ناگفتہ بہ ہے اور عملی حالت بدترین

1 الہدیٰ ؛ ۱۰ : ۱۲ ص ۳۹ - ۴۰

صورت اختیار کر چکی ہے اور قوم ہماری تن آسانی کا یہ عالم ہے کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان نے ہم سے ایک دن پوچھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا؟ ہم نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر کہا کہ جس قوم کے تعلیم یافتگان کا یہ مبلغ علم ہے ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ ہم سے بڑھ کر تعلیم یافتگان کی علمی اور مذہبی واقفیت کے اندازہ لگانے کا موقع بہت کم احباب کو حاصل ہوا ہوگا اور بایں ہمہ حالت انہیں مذہبی کتب کے مطالعہ کا نہ تو مذاق ہے اور نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

یہ مانا کہ سب لوگ علماء متبحر نہیں ہو سکتے مگر عقائد و اعمال کا علم تو ہر ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے لیکن قوم اس قدر کو بھی ضروری خیال نہیں کرتی۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

الہدیٰ نے جو کچھ کیا ناظرین اس سے آگاہ ہیں۔ خیال تو یہ تھا کہ یہ رسالہ ایک خاص ترقی کرتا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس نے روز بروز تنزل کیا اور اس حد تک تنزل کیا کہ اب بظاہر اس کا چلنا دشوار نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ایک مختصر رقم کے وصول کرنے کے لئے ایسی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کئی ایک احباب سے جو قابل اطمینان معاش کے لوگ ہیں، محجوب ہونا پڑتا ہے بہت ہی کم ناظرین ایسے ہوں گے جو بطیب خاطر چندہ ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسالہ کی چھپائی لکھائی پہلے پانچ سالوں کی نسبت ناقص حالت تک پہنچ گئی گو بعض دیگر رسائل کی نسبت اس نے زیادہ کامیابی حاصل کی کیونکہ اس عرصہ میں کئی ایک رسائل جاری ہوئے اور بحر فنا میں ڈوب گئے مگر سچ یہ ہے کہ ہمیں بھی اس کے چلانے میں کافی مالی امداد نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جنہیں موجودہ حالت میں برداشت کرنے کی طاقت ہم اپنے اندر نہیں دیکھتے۔ سو آخری اور قطعی رائے یہ ہے کہ اگر ناظرین اس رسالہ کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی مالی حالت کو قوی کریں جس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہر ایک صاحب کم از کم ایک خریدار تجویز فرما کر اس کا چندہ بذریعہ ڈاک یا وی پی ادا کریں اور اس صورت میں ممکن ہے کہ رسالہ کی لکھائی چھپائی میں جو کچھ نقص عائد ہو چکا ہے، رفع ہو جائے اور مضامین کی عمدگی پر زیادہ زور دیا جائے اور بروقت شائع نہ ہونے کا الزام بھی دور ہو سکے۔ ورنہ آئندہ جلد ۱۱ کے نمبر اول کے شائع ہونے سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ آخری اطلاع ہے جو بخدمت ناظرین الہدیٰ کی گئی ہے۔ جس صاحب کا کوئی بقایا ہمارے ذمہ ہو ہمیں لکھ دیں۔ ہم انہیں اپنی مطبوعہ

کتابیں ارسال کرکے سبکدوشی حاصل کرلیں گے ۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہوگئے خاک انتہا ہے یہ

راقم خاکسار ایڈیٹر

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں[1]:

" ایک زمانے میں الہدیٰ کے نام سے انہوں نے ایک ماہوار دینی رسالہ بھی جاری کیا تھا ۔ ناقدان بصیر اسے بہت پسند کرتے تھے مگر اس قسم کے رسالوں کے مصارف کثیر ہوتے ہیں اور صرف چندے سے انہیں پورا کرنا بہت دشوار ۔ چند سال کے بعد بند ہو گیا ۔ "

اس زمانے میں بعض لوگ اس رسالے کے قدردان بھی تھے چنانچہ مدیر رسالہ نے پہلے سال کے آخری پرچے میں یوں لکھا[2]:

" الہدیٰ کے متعلق مختلف اطراف و جوانب سے جو رائیں مجھ تک پہنچ چکی ہیں وہ قریباً قریباً متشابہ واقع ہوئی ہیں مگر بحیثیت مجموعی اہل علم نے اسے عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور بعض نے اعتدال سے بڑھ کر اس کی تعریف کی ہے ۔ مگر خاکسار کو ایسی لفاظیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں ۔ جہاں اصلاح مذہب کے لئے کوئی کام کرنا مدنظر ہو ایسے الفاظ کے سننے سے خوش ہونا بھی صریح نفس پرستی ہے جس سے اخلاص کا حبل متین ٹوٹ جاتا ہے ۔ بہرصورت یہ فقرات بھی بغرض ازدیاد شوق لکھے گئے ہیں نہ بطور فخر ۔ وما أبرئ نفسي إن النفس لأمارة بالسوء ——— الخ (۱۲ : ۵۳)

خاکسار ایڈیٹر

بعض اہل علم کی کچھ آراء ذیل میں نقل کی جاتی ہیں :

---

۱ مقالات دینی و علمی حصہ دوم ص ۱۴۱-۱۴۲

۲ الہدیٰ ؛ ۱ : ۱۲ ص ۱۵

حضرت سید مہر علی شاہ مرحوم ساکن گولڑہ (راولپنڈی) نے اس رسالہ کی خدمات جلیلہ کا ذکر فرماتے ہوئے لکھا ہے:[1]

جناب شیخ اجل عارف اکمل ھادی سبل رشاد قامع بدعت والحاد والادستگاہ حضرت سید پیر مہر علی شاہ صاحب چشتی از گولڑہ ضلع راولپنڈی

میں نے الہدیٰ کو ملاحظہ کیا۔ الحق یہی رسالہ ہے کہ جس کو بہ نسبت رسالہ جات شائعہ آجکل کے واقعی اور پورا بیان کرنے والا ان الدین عند اللہ الاسلام کا علی منہاج الصحابۃ والتابعین پایا۔ گویا انحصار بیان اسلام الہدیٰ میں ہی موجودہ زمانہ میں پایا جاتا ہے

عمر گفتیم والسلام علی تابع الہدیٰ

والصلوٰۃ والسلام علی النبی الہاشمی خیر الوریٰ و آلہ وصحبہ اہل التقیٰ والنقیٰ۔

العبد الملتجی الی اللہ المدعو بمہر علیشاہ عفا اللہ عنہ

ان کے بعد ایک اور بزرگ نے جو اُس وقت چورہ ضلع راولپنڈی میں علم و عرفان اور شریعت و طریقت کے علمبردار تھے، حسب ذیل رائے لکھی ہے:[2]

از سالک مسالک طریقت واقف منازل حقیقت جناب سید محمد عادل شاہ صاحب چورہ ضلع راولپنڈی۔

اللہم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منہم

---

۱ الہدیٰ ؛ ۱ : ۲ صـ۲۳

۲ ایضاً ؛ ۱ : ۳ صـ۳۴

برارباب اہلِ فضل و بلاغت و براصحاب اہلِ شرع و ہدایت مخفی نماند کہ دریں اوان بکمال فضل سبحانہ تعالیٰ و بشرف اتباع سنتِ خیرالوریٰ ۔ رسالۂ جناب مولانا اصغر علی صاحب روحی لاہوری دام فیضہ رسالہ دربارۂ تحریضِ اتباعِ سنت و امتناع بدعت بر طبق احکامِ شریعتِ حقہ و فوائدِ بہیہ و مقاصدِ اخرویہ، مترتب کردہ آں را طوقِ شاہدِ حق گردانیدہ اند و مضمونش از کنوزِ حقائقِ الٰہی است و فیوضش از فیضانِ لامتناہی است نصیبِ اہلِ بصارت بعدہ تا طلوعِ آفتاب قبول ارباب فضل و کمال بلو باشد، در اشاعت آں سفارش از تہِ دل است حتی الوسع از مطالعۂ رسالہ الہدیٰ محظوظ شدہ و در اشاعت آں بدل سعی کما ینبغی کردہ باشند کہ ربطِ اہلِ سلوک و مسلکِ اہلِ خیر دراں متصور است، اکثر الفاظ و مضامینِ آں بجائے توجہ مرشد کارگر است، برارباب سلسلہ لازم کہ خود را بزمرۂ خریداراں بسبقتِ تمام درکشند جملہ خواہش آں بمطالعہ محتاج اند ۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللّٰہ لمع المحسنین (۲۹ : ۶۹)

(محمد عادل شاہ صاحب)

ایک اور صاحب ابوالبیان حماد ساکن در بھنگہ نے رسالہ الہدیٰ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:[1]

پھر زمانے کو پیام حق سنائے الہدیٰ	خوابِ غفلت سے مسلماں کو جگائے الہدیٰ
راہِ ایماں اہلِ عالم کو دکھائے الہدیٰ	اور احکامِ الٰہی پر چلائے الہدیٰ
دہر میں توحید و سنت کا علمبردار ہو	نقشِ عرفاں یعنی ہر دل پر بٹھائے الہدیٰ
کب سے یہ بھٹکا ہوا انسانیت کا قافلہ	پھر نشانِ راہِ حق اس کو بتائے الہدیٰ
مشکلاتِ راہ سے ہرگز نہ گھبرائے کبھی	جانبِ منزل قدم اپنا بڑھائے الہدیٰ
اتحاد و امن کا پیغام ہے انسان کو	ٹوٹنے والوں کو آپس میں ملائے الہدیٰ
چاک کر دے ظلمت و جہل و ضلالت کے حجاب	پھر دلوں میں شمعِ ایماں جلائے الہدیٰ

[1] افسوس کہ یہ اردو نظم مجھے جس بزرگ (خان صاحب مفتی عبدالحمید بی اے سابق چیف پوسٹ ماسٹر جنرل پوسٹ آفس لاہور) سے حاصل ہوئی تھی ۔ وہ اس جہانِ فانی سے کچھ عرصہ ہوا انتقال فرما گئے ۔ غفراللہ لہ ۔

بزمِ عالم میں یہ بن جائے نقیبِ دینِ حق
دین کا پیغام ہی سب کو سنائے الہدیٰ

اس کا ہر مضمون اک گلدستۂ افکار ہو
دامنِ صفحات پھولوں سے سجائے الہدیٰ

دے جہاں والوں کو اخلاق و مروّت کا سبق
عظمتِ کردار کے گوہر لٹائے الہدیٰ

پھر سلیقے سے ہویدا کر کے اسرارِ خودی
نوعِ انساں کو ہلاکت سے بچائے الہدیٰ

دینِ قیم کی اقامت سے کبھی غافل نہ ہو
ہر گھڑی اللہ سے بس لَو لگائے الہدیٰ

اس کے سب رشحات ہوں تازہ بتازہ نو بہ نو
اک نئی محفل بطرزِ نو سجائے الہدیٰ

انقلابِ فکر، اصلاحِ عمل، اعلائے دیں
ان اصولوں کو ہدف اپنا بنائے الہدیٰ

الہدیٰ علم و ہدایت کا ہو شہکارِ عظیم
دہر میں اک انقلابِ تازہ لائے الہدیٰ

اُس کا نصب العین اے حماد ہو اظہارِ حق
نور کا مینار بن کر جگمگائے الہدیٰ

باب پنجم

(گاؤں کی زندگی)

باب پنجم

گاؤں کی زندگی

مولانا مرحوم کو اپنے گاؤں یعنی کٹھال سے بہت محبت تھی۔ چونکہ اُن کی ابتدائی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا تھا۔ اُن کے والد بزرگوار یعنی مولوی شمس الدین اُس علاقہ کے قاضی تھے اور وہ کئی سال تک وطن کے لوگوں کے باہمی تنازعات اور جھگڑے طے کرتے رہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادوں میں سے صرف مولانا اصغر علی اپنے زمانے کے سربرآوردہ علماء اور دینی علوم میں ممتاز تھے۔ اُن کے باقی بھائیوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے مواقع میسّر نہ آئے تھے اسلئے اہلِ دہ کو مولانا اصغر علی صاحب سے بھی اُس خدمت کی توقع تھی جو اُن کے والد ماجد بجالاتے رہے۔ ہر سال جب مولانا مرحوم تعطیلات گرما میں گاؤں تشریف لے جاتے تو تمام طبقوں کے لوگ اپنے اپنے جھگڑے اور مخالفتیں اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر پیش کرتے۔ گو وہ سرکاری طور پر اس خدمت کے بجا لانے پر مامور نہ تھے لیکن سب کو اُن کی ذات پر اتنا اعتماد اور اُن کی دین داری اور علمیت کی بنا پر گاؤں کے سارے لوگ اُن کی دل سے عزت کرتے اور اُن کے فیصلوں پر مطمئن ہو جاتے تھے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی بیان کرتے ہیں کہ اہلِ دہ کی باہمی رنجشیں اور مخالفتیں دور کرنے میں والد صاحب مرحوم نے نہایت شاندار کام کیا ورنہ وہ بھی عام دیہاتی جاہل لوگوں کی طرح چھوٹی چھوٹی بات پر سرکاری عدالتوں میں جانے اور خواہ مخواہ کا پیسہ ضائع کرنے پر تیار تھے۔ والد ماجد نے اپنی کوشش اور خدا خوفی کی بنا پر سینکڑوں مقدمات کو شریعت کے مطابق حل کیا۔ یہ اُن کا گاؤں میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ جب تک وہ گاؤں میں مقیم رہتے لوگ سارا سارا دن اُن کی خدمت میں آمد و رفت جاری رکھتے اور اپنی تکالیف اُن کے سامنے پیش کر کے اُن سے تصفیہ کراتے۔ علاوہ ازیں ارد گرد کے دوسرے گاؤں کے بعض ممتاز آدمی بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف قسم کے جھگڑے اُن سے چکایا کرتے چنانچہ چوہدری ظہور الٰہی مرحوم (مسلم لیگی راہنما و سابق وزیر) کے والد بزرگوار چوہدری سردار خان جو کٹھال سے دو تین میل کے فاصلے پر موضع "نت" کے

باشندہ تھے۔ آپ کی خدمت میں بہت آیا جایا کرتے تھے وہ موضع نت کے نمبردار بھی تھے۔ چونکہ مولانا کے
بہت سے شاگرد اچھے اچھے عہدوں پر متعین تھے اس لئے وہ غریب دیہاتی لوگوں کی تکالیف کو رفع
کرنے کے لئے اپنے اُن شاگردوں کو زبانی یا تحریری طور پر حق و انصاف سے کام لے کر اُن کی داد رسی
کرنے کی فرمائش بھی کرتے رہتے۔ بعض دن ایسے آتے کہ گاؤں کے لوگ اپنے مقاصد دیر تک بیٹھے حل کروایا
کرتے جس کی وجہ سے مولانا کے کھانے کا وقت بھی آگے پیچھے ہو جاتا لیکن وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے
یہ تمام کام وہ محض فی سبیل اللہ ان کو اپنے مسلمان بھائی اور ہم وطن خیال کر کے بجا لاتے تھے۔
گاؤں کا کوئی اہم شخص نہ تھا جو آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا تھا۔

علاوہ ازیں گاؤں کی اُس مسجد میں جہاں اُن کے والد مرحوم قاضی شمس الدین
امامت اور خطابت کی خدمت بجا لاتے رہے اور جو تقریباً گاؤں کے درمیان میں بوہڑ والی مسجد کے نام
سے مشہور تھی۔ مولانا موصوف بھی پانچ وقتی نماز میں امامت فرماتے۔ اس طرح مولانا کو گاؤں کے
تمام کاموں میں پوری دلچسپی اور بے لاگ خدمت کرنے کا موقع ملتا رہا۔ بعض لوگ اپنی امانتیں بھی
اُن کے پاس ودیعت کر جاتے تھے۔ جو لوگ گاؤں میں مالی امداد کے مستحق ہوتے یا جو عورتیں بیوہ
ہو گئی ہوتیں اُن کو بھی نظر انداز نہ فرماتے، بلکہ حصہ رسدی انہیں مالی امداد دیا کرتے تھے۔ جس
مکان میں مولانا سکونت رکھتے تھے۔ وہ کافی وسیع تھا اور اسکے صحن میں ایک انار کا درخت
بھی تھا جس پر بڑی اچھی قسم کے انار لگا کرتے تھے لیکن لوگ بالخصوص بچے، کچے انار ہی توڑ کر کھا
جایا کرتے تھے۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد مولانا ایک کیکر یا نیم کے درخت کے نیچے قیلولہ
فرماتے اور چونکہ اُن کے سارے دانت ماشاء اللہ صحیح کام کرتے تھے اسلئے ٹاپیں بہت شوق
سے تناول کیا کرتے تھے۔ ٹاپ ایک پتلی اور خشک قسم کی چپاتی ہوتی تھی، جو تنور میں روٹیاں
لگانے والی عورتیں پکاتی تھیں اور یہ اُس علاقے کے گاؤں کی سوغات سمجھی جاتی تھی۔ ارد گرد
کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے تمام لوگ اُن کو احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُن گاؤں
میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

پنڈی، نت، چک غازی، دھیر کے کلاں، دھیر کے خرد، موہلہ، سمال،
گرالی، گرالہ، گالرا وغیرہ۔ الغرض مولانا دیہاتی زندگی کے بہت دلدادہ تھے کیونکہ

وہاں کی آب و ہوا لاہور کی نسبت بہت اچھی تھی اور دریائے چناب کے کنارے پر آباد ہونے کی وجہ سے گرمی نسبتاً کم پڑتی تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ روزانہ اپنے ایک دو بچوں کو ساتھ لے کر دریائے چناب کی سیر کو بھی جایا کرتے تھے جو گاؤں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

گاؤں کی محبت کی وجہ سے ہی انہوں نے اپنے لواحقین کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ وفات کے بعد مجھے اُس مسجد کے قریب دفن کیا جائے جو انہوں نے اپنی زرعی زمین میں خود بنوائی تھی اور جس کا نام مسجد محمدی تھا۔ یہ مسجد جی۔ ٹی روڈ (جرنیلی سڑک) کے بالکل کنارے پر ریلوے سٹیشن کھاریاں کے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اب تک موجود ہے۔ مسجد کے ساتھ ہی انہوں نے دو منزلہ عمارت بھی تعمیر کی تھی کیونکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ نچلے حصے کو کوئی رفاہی ادارہ مثلاً ہسپتال یا ڈسپنسری یا دینی تعلیم کا مدرسہ اور سرائے کے طور پر استعمال کیا جائے اور بالائی حصے میں اُن کی یا اُن کے عزیزوں کی سکونت کا انتظام ہو۔

گاؤں کے سرکردہ لوگ

صرف کھاریاں ہی میں نہیں بلکہ اردگرد کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ بھی اکثر اُن کی خدمت میں آیا کرتے تھے کیونکہ وہاں کے باشندے یا تو بالکل جاہل یا بعض مڈل کی جماعت تک تعلیم یافتہ تھے اس لئے وہ ہر طبقہ کے لوگوں کی نظروں میں احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہاں کے چند رؤساء اور زمیندار طبقہ کے لوگوں کے چند نام حسب ذیل ہیں جو اکثر اُن کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے

نمبر ۱ چوہدری سید احمد، جو سید حویلی والا کے نام سے مشہور تھے کیونکہ جس حویلی میں وہ رہتے تھے وہ بہت وسیع تھی۔

نمبر ۲ چوہدری محمد خان، وہ ایک زمیندار رئیس تھے

نمبر ۳ چوہدری حاجی لال خان، زمیندار

نمبر ۴ چوہدری غلام حیدر عرف جھنڈے والا، زمیندار

نمبر ۵ چوہدری خان محمد، چوہدری حیات محمد اور ان دونوں کے والد چوہدری احمد خان، زمیندار جو گاؤں کے نمبردار بھی تھے

۶۔ چوہدری سلطان عالم ۔ زمیندار

۷۔ میاں محمد دین رنگریز ۔ یہ مولانا مرحوم کے ہم عمر اور لنگوٹیے دوست تھے۔

۸۔ چوہدری محمد دین ؛ جو مغربی جانب کی مسجد کے امام تھے۔ ہر سال تعطیلات گرما میں جب مولانا گاؤں جایا کرتے تھے تو بالالتزام وہ مولانا اور تمام کنبے کی ضیافت کیا کرتے تھے۔

۹۔ چوہدری سردار خان مرحوم ، چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کے والد محترم

۱۰۔ چوہدری فیض احمد سفید پوش ۔ یہ آپ کے بہت معتقد تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ مجھے سفید پوشی کا منصب مولانا مرحوم کے طفیل ملا ہے۔

گاؤں کے تمام باشندوں کو مولانا مرحوم پر پورا اعتماد تھا کہ وہ بلا رو و رعایت اُن کے جھگڑوں کے فیصلے نپٹاتے ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر لوگ اُن کے فیصلے کو منظور کر لیتے اور عدالت میں جانے کی بجائے اپنے تمام جھگڑے مولانا مرحوم سے حل کرواتے۔

مولانا کے ایک بڑے بھائی مولوی اکبر علی مرحوم جو ضلع گجرات کے مختلف پرائمری مدرسوں میں بطور ٹیچر کام کرتے رہے تھے اور گاؤں کی مشترکہ جائیداد کے ساتھ زمین کی دیکھ بھال اور کڑی نگرانی کیا کرتے تھے اسلئے مولانا کو اس معاملے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ گاؤں میں اکیلے ہی رہتے تھے کیونکہ اُن کی بیوی بھی مدت ہوئی فوت ہو چکی تھی۔ اُن کی وفات مولانا مرحوم کی وفات سے کئی سال پہلے ہوئی تھی۔ اسی طرح مولانا کے ایک اور بھائی منشی محبوب علی بھی تھے۔ رہتے تو لاہور ہی میں تھے لیکن کبھی کبھی اپنے گاؤں جاتے اور لاہور میں مولانا مرحوم کی معرفت انجمن حمایت اسلام کے دفتر میں بطور منشی متعین ہو گئے تھے۔ انہوں نے کشمیری بازار میں کتب فروشی کی ایک دکان بھی جاری کی تھی مگر وہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ یہ دونوں بھائی ایک ہی سال میں فوت ہوئے اور مولانا نے اُن کی تاریخ وفات فارسی شعروں میں لکھی۔ جب تک مولانا تعطیلات کے موقع پر گاؤں میں رہتے جمعہ کی امامت و خطابت کا فریضہ بھی بجا لایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک لوگ اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

باب ششم

(شاعری)

فصلِ اوّل

(برصغیر پاک و ہند میں عربی شاعری)

باب ششم

برصغیر پاک و ہند میں عربی شاعری کا مختصر خاکہ

طلوعِ اسلام سے پہلے ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے اور جن چیزوں کی پیداوار ہند و سندھ کے ساتھ مخصوص تھی یا ایسی اشیاء جن میں اس ملک کو فوقیت حاصل تھی، عرب انہیں اپنے ملک میں لے جاتے اور اُن اشیاء کے ہندوستانی ناموں کو عربی زبان میں ڈھال لیتے۔ ایسے معرّب الفاظ زمانۂ جاہلیت میں ہی عربی زبان کا جزو بن چکے تھے۔ اس موضوع پر سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب عرب و ہند کے تعلقات میں مفصل بحث کی ہے[1]

ہندوستان میں اسلام کے آجانے کے بعد دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک باقاعدہ عربی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ البتہ قرآن مجید، احادیث اور تاریخی اخبار وغیرہ حفظ اور نقل کے ذریعے عام ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر علم و فن کا دائرہ پھیلتا رہا اور تبلیغِ دین کے جذبہ سے سرشار علمِ قرآن و سنت کے حاملین ہندوستان میں آتے رہے۔ مثلاً ابو بکر یا ابو حفص الربیع بن صبیح السعدی جو ابن سعد[2] کی روایت کے مطابق سمندر کے رستے ہندوستان میں آئے اور ایک جزیرہ میں ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ یہ امام حسن البصری کے شاگرد تھے اور تبع تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجر[3] نے لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص تھے جنہوں نے اہل بصرہ میں سے تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ سید عبدالحی الحسنی نے اپنی کتاب الثقافة الاسلامية في الهند میں لکھا ہے[4] کہ محمد بن قاسم الثقفی نے ولید بن عبدالملک الاموی کے زمانے میں سندھ کو فتح کیا اور باقی علاقوں کی طرح وہاں بھی عربوں کی حکومت قائم ہوئی تو تبع تابعین میں سے بہت سے لوگ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے کچھ لوگ جو خلفاء بنو امیہ کے ڈر سے بھاگ کر ہجرت کر گئے تھے، سندھ کے علاقے میں آئے۔ پھر بنی عباس کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان عرب لوگوں نے سندھ کے علاقے میں سکونت اختیار کر کے وہاں ازدواجی تعلقات بھی قائم کئے۔ انہوں نے علم حدیث کی روایت کو اس ملک میں رواج دیا۔ ایسے مشہور لوگوں

۱ صہ ۹۷

۲ الطبقات ۷ : ۲۷۷

۳ التہذیب ۳ : ۲۴۸

۴ صہ ۱۳۵

میں مندرجہ ذیل اسماء قابلِ ذکر ہیں۔

اسرائیل بن موسیٰ البصری، منصور بن حاتم النحوی، ابراہیم بن محمد الدیبلی، احمد بن عبد اللہ الدیبلی، خلف بن محمد الدیبلی، شعیب بن محمد الدیبلی، علی بن موسیٰ الدیبلی، محمد بن ابراہیم الدیبلی، فتح بن عبد اللہ السندی، ابو محمد عبد اللہ المنصوری، ابو العباس احمد بن محمد المنصوری جو منصورہ کے قاضی تھے اور انہوں نے امام داؤد بن علی الظاہری کے مذہب پر تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا۔

جب سندھ سے عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اور غزنوی اور غوری خاندانوں کی حکومت کا زمانہ آیا تو خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے علاقوں سے بہت سے لوگ ہجرت کرکے علاقۂ سندھ میں آگئے اور روایت حدیث کم ہوگئی اور اس کی جگہ دوسرے علوم و فنون مثلاً فقہ، نجوم، ریاضی اور شعر و شاعری کا غلبہ ہوگیا۔ جو کئی صدیوں تک جاری رہا۔ اس اثنا میں سندھ میں کئی مقامات درس و تدریس کا مرکز بن گئے۔ مثلاً الرور، منصورہ، دیبل، ملتان اور قصدار وغیرہ۔

سندھ خلافتِ اسلامیہ کا ایک دور افتادہ صوبہ تھا۔ اس غربت کی فضا میں علمی پودا لگایا جانا کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا اور طرہ یہ کہ علوم عقلیہ و نقلیہ کا یہ پودا ابد الآباد تک کے لئے اس سرزمین میں راسخ ہوگیا گو اس پودے کی پیداوار سندھ سے باہر سیاسی اور علمی مرکزوں میں توجہ کا باعث نہ بن سکی البتہ سندھ کی تاریخ کی طرف بالخصوص توجہ دی گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد یوسف مرحوم نے لکھا ہے[1] کہ ساتویں صدی ہجری میں تاریخ سندھ کے متعلق قاضی اسمٰعیل بن علی الثقفی (جو الرور کے قاضی تھے) کے پاس ایک مجموعہ تھا جو اُن کے آباؤ اجداد کی کاوش کا نتیجہ تھا اور قاضی اسمٰعیل کے پاس ورثہ میں پہنچا تھا۔ یہ مجموعہ عربی زبان میں تھا لیکن افسوس کہ اصل کتاب تو ناپید ہوگئی۔ البتہ علی بن حامد بن بکر الکوفی نے اُس اصل سے ترجمہ کرکے کتاب چچ نامہ مرتب کی۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں غزنویوں نے شمال مغرب سے خروج کیا اور اُس کے ساتھ فارسی زبان کی آمد اور ترویج کا راستہ کھلا جس کے ذریعے علم و ثقافت کی ایک نئی رو جس کا منبع خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ تھا، سندھ میں بہنے لگی۔ علوم عربیہ کے نصابِ تعلیم کو جو مقام حاصل ہوچکا تھا وہ بدستور جاری رہا۔ البتہ فارسی اور عربی کی آمیزش سے جو جدید زبان وجود میں آئی وہ شعر و نثر میں اپنی جگہ بنانے لگی۔ اس طرح خالص عربی اپنی جگہ چھوڑ گئی۔ تاہم

[1] تاریخ ادبیات ۲: ۲

عربی کی قوت و شوکت اور فصاحت و بلاغت کے بغیر فارسی زبان روکھی پھیکی معلوم ہوتی تھی اسلئے علمی تصانیف کے میدان میں عربی کی فوقیت بجائے خود مسلّم رہی۔ چنانچہ نظامی عروضی سمرقندی اپنے زمانے کے دبیر سلطنت کے لئے مندرجہ ذیل نصاب تجویز کرتا ہے۔

" پس عادت باید کرد خواندن کلام رب العزة و اخبار مصطفیٰ ؐ و آثار صحابہ رض و امثال عرب و کلمات عجم و مطالعہ کتب سلف و مناظرہ صحف خلف چون ترسل صاحب و صابی و قابوس و الفاظ و امامی و قدامہ بن جعفر و مقامات بدیع و حریری و حمید و توقیعات بلعمی و احمد حسن و ابونصر کندری و نامہای محمد عبدہ و عبدالحمید و سید الرؤساء و مجالس محمد منصور و ابن عبادی و ابن النسابة العلوی ، و از دواوین عرب ، دیوان متنبی و ابیوردی و غزی و از شعر عجم اشعار رودکی ، مثنوی فردوسی و مدائح عنصری "[1]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی آبیاری کے لئے عربی کے سرچشمہ سے سیراب ہونا نہایت ضروری تھا۔ پروفیسر براؤن نے اپنی مشہور کتاب A Literary History of Persia میں بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے[2] اور عربی کی کم از کم چار کتابوں کا مطالعہ ہر فارسی طالب علم کے لئے ضروری قرار دیا ہے وہ چار کتابیں یہ ہیں:

۱۔ رسائل اخوان الصفا ——— ۲۔ مفاتیح العلوم للخوارزمی

۳۔ کتاب الفہرست لابن ندیم ——— ۴۔ کتاب المعارف لابن قتیبہ

بہر صورت فارسی عربی کے دامن سے وابستہ ہو گئی اور عقلی علوم میں عربی کے ساتھ فارسی بھی استعمال ہونے لگی۔ ابتدا میں تو فارسی بول چال اور مجلسی ادب میں استعمال ہوتی تھی لیکن بعد میں حکومت کے کاروبار میں بھی استعمال ہونے لگی لیکن اس سے عربی کی علمی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مغل شاہزادوں کی تعلیم میں عربی کو پہلا اور فارسی کو دوسرا مقام حاصل رہا۔ اکبر کے عہد میں ھند و فلسفہ اور سنسکرت کا بھی رواج ہوا لیکن اس سرمایہ کو بازیاب لانے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے عربی کو پروان چڑھایا تھا۔ فیضی نے اُس دور میں قرآن مجید کی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" عربی زبان ہی میں لکھی لیکن کچھ عرصہ بعد سنسکرت میدان سے اوجھل ہو گئی اور عربی کو اپنی نمائش کا موقع برابر ملتا رہا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ عربی فصیح و بلیغ ہونے کے علاوہ نہایت جامع اور وسیع ہے کئی سلطنتیں آئیں اور ختم ہو گئیں لیکن سندھ و ھند میں عربی زبان کی مسلّم حیثیت میں کچھ فرق نہ آیا۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ بحث و تدقیق کے میدان میں عربی کی جو علمی تصانیف سامنے آئیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن افسوس

۱۔ چہار مقالہ ص ۱۳
۲۔ ۱: ۳۷۷ — ۳۹۰

کہ اُس زمانے میں طباعت کی سہولتیں میسّر نہ تھیں۔ جب طباعت کی سہولتیں پیدا ہوئیں تو حکومتِ برطانیہ کی حکمتِ عملی اور انگریزی نظامِ تعلیم کے رواج کی وجہ سے ھندستان میں عربی علوم کی قدر شناسی ختم ہوگئی اور وہ کسمپرسی کا شکار ہوگئے۔ ھندستان کے بعض علماء مثلاً صغانی اور زبیدی وغیرہ نے ھندستان سے باہر جاکر جو کارنامے سرانجام دیئے، اُن کے معیار کی بلندی اور شہرت کا باعث وہ سہولتیں ہیں جو اُنہیں اپنے ملک میں میسّر نہ آسکی تھیں۔ اپنے ملک میں رہ کر جن ھندستانی علماء نے سہولتیں میسّر نہ ہونے کے باوجود نام پیدا کیا۔ اُن میں علاؤ الدین بن احمد المہائمی، محمد بن طاہر پٹنی، شاہ ولی اللہ، شہاب الدین دولت آبادی، محی الدین بن عبد القادر عیدروس، مفتی سعد اللہ اور نواب صدیق حسن وغیرہ کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ ان اور ان جیسے اور لوگوں نے بے شمار موانع کے باوجود ادب عربی میں بڑا نام پیدا کیا۔

شعر و ادب یقیناً تفنّن اور جدّت طرازی کا میدان ہے، لیکن اس میں فارسی کا دور دورہ رہا۔ گو دربار اور مجلس میں عربی موجود تو رہی لیکن وہ زیادہ تر فارسی کی آرائش اور زیبائش کا کام دیتی۔ اس لئے عربی نثر کی نسبت عربی شعر کا سرمایہ زیادہ نظر آتا ہے۔ اس لئے ذیل میں صرف چند ایک اہم شعراء کے نام دیئے جاتے ہیں جنہوں نے عربی زبان میں شعر کہہ کر اس ملک میں بھی عربی زبان کی لاج رکھی لیکن افسوس یہ ہے کہ ایسے اہلِ علم کی کارکردگی باہر کی دنیا پر پوری طرح عیاں نہ ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خود جس طرح چاہیئے تھا اپنی قدر آپ نہ کی ورنہ ہمارے بعض شعراء کے کارنامے بھی کتنے روشن تھے کہ وہ چار دانگ عالم میں قابلِ ستائش قرار دیئے جاسکتے تھے۔ غلام علی آزاد نے سبحة المرجان اور مولانا عبد الحی لکھنوی نے نزھة الخواطر اور ثقافة الہند لکھ کر دنیا کو بتا دیا کہ ہندستان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں جو ایسے ایسے کام سرانجام دے سکتے ہیں جن کی طرف بیرونی علماء نے بھی توجہ نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ عربی کے اہلِ زبان انہیں خاطر میں نہ لائیں کیونکہ اہلِ عرب تو اپنے سوا سب کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے ہیں۔ عرب میں تقریباً ہر شخص شعر کہہ سکتا تھا اس لئے اُن کے ہاں کسی غیر عربی شخص کا عربی میں شعر کہنا سورج کو چراغ دکھانے والا معاملہ سمجھا جاتا ہے تاہم اس سے اصل حقیقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

فارسی شاعری کی طرح عربی شاعری بھی عموماً ملوک و امراء کی زیرِ سرپرستی فروغ حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن چونکہ اُس وقت ھندستان کے سلطان فرمانرواؤں کی زبان فارسی تھی اس لئے قدرتی طور پر وہ فارسی شاعری میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ شمالی ھند کے درباروں میں عربی شاعری کو ایسی سرپرستی اور حوصلہ افزائی حاصل نہ ہو سکی تاہم گجرات اور دکن کے درباروں میں عربی کے کئی شاعر اور عالم رونما ہوئے مگر اول تو اُن کی تعداد فارسی شعراء و علماء کے مقابلے میں بہت کم تھی

اور دوسرے اُن کی علمی سرگرمیاں بہت محدود تھیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس دور میں عربی شاعری سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے جنوبی ہند کے صرف چند ہی عربی شعراء کا کچھ کلام ہم تک پہنچا ہے۔ مؤرخین تاریخ ادب نے صرف یہی لکھا ہے کہ ان درباروں میں عربی کے کچھ شاعر اور عالم تھے مگر سوائے چند ایک کے اُن کے نام اور حالات تک نہیں لکھ گئے۔ کتاب "النور السافر" میں احمد آباد میں خاندان عیدروس کے اُس تعلق کو برقرار رکھنے کا ذکر ہے جو انہیں جنوبی عرب سے حاصل تھا۔ اس خاندان کے احمد آباد میں سکونت پذیر ہونے کے بعد عرب کے کئی عالم اور شاعر عرب ممالک سے ہندوستان میں آئے مگر ہندوستان میں اُن کا قیام عارضی ہوتا تھا اور پھر وہ واپس چلے جاتے تھے۔

اگر ان تمام شعراء کے کلام کے نمونے جمع کئے جائیں تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اسلئے میں نے صرف چیدہ چیدہ چند عربی میں شعر کہنے والے ایسے علماء کے نمونے جمع کئے ہیں جن کی پیدائش ہند و سندھ میں ہوئی اور جو عربی شاعر باہر سے آئے اُن تمام کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ مقالہ بہت طول نہ پکڑ جائے جن شعراء کے نمونہ ہائے کلام پیش کئے جا رہے ہیں اُن کا مختصر تعارف کرا دیا گیا ہے اور نمونے پیش کرنے میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

مسعود سعد سلمان

ر ۔ ۵۱۵ھ

عربی کے مشہور اور سب سے قدیم شخص مسعود بن سعد بن سلمان لاہوری[1] کا نام ملتا ہے جو اصل کے لحاظ سے علاقہ ھمذان سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا والد ہجرت کر کے لاہور میں آ گیا تھا۔ مسعود کی پیدائش اسی جگہ ہوئی اور نواب صدیق حسن خان نے اُس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بیس سال تک جیل میں رہا لیکن اُس کی قید کا سبب نہیں بتایا گیا[2]۔ یہ شخص فارسی شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے لیکن وہ ہندی اور عربی میں بھی شعر کہتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان تینوں زبانوں میں اُسکے دیوان موجود تھے لیکن افسوس کہ ہندی اور عربی دیوانوں کا کھوج نہیں مل سکا۔ البتہ فارسی دیوان متداول ہے۔ مسعود بن سعد نے نواب صدیق حسن کے بیان کے مطابق قلعہ نائی میں وفات پائی[3]۔ رجال السند والہند میں اُس کی وفات ۳۱۵ھ بتائی گئی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔

مسعود سعد سلمان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ عربی کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جو ھندستان میں ہوئے لیکن افسوس کہ اُس کے بہت کم شعر دستیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱)

وَثِقْ بِالْحُسَامِ فَعَهْدُہٗ مَیْمُوْنٌ — اَبَدًا وَّقُلْ لِلنَّصْرِ کُنْ فَیَکُوْنُ

(۲)

وَلَیْلٍ کَاَنَّ الشَّمْسَ ضَلَّتْ مَمَرَّھَا — وَلَیْسَ لَھَا نَحْوَ الْمَشَارِقِ مَرْجِعُ

۱؎ الثقافۃ صـ ۴۴ میں اسکا نام غلطی سے سعد بن مسعود بن سلمان طبع ہو گیا ہے لیکن نزہۃ الخواطر میں یہ نام صحیح طور پر درج ہے۔

۲؎ ڈاکٹر براؤن نے تاریخ ادب فارسی کی دوسری جلد صـ ۳۲۴ میں اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ مسعود کو غزنہ کے حکمران سلطان ابراہیم کے حکم سے جیل میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اُس کو شبہ تھا کہ وہ سلجوقی بادشاہ ملک شاہ کے ساتھ سازباز میں ملوث ہے۔

۳؎ پروفیسر براؤن نے (۳۲۶:۲) اس تاریخ کے ساتھ اس کا سال وفات ۱۱۳۱ء بھی لکھا ہے اور اسے ترجیح دی ہے۔

نَظَرْتُ اِلَیْهِ وَالظَّلَامُ کَاَنَّهٗ — عَلَی الْعَیْنِ غِرْبَانٌ مِنَ الْجَوِّ وُقَّعُ

فَقُلْتُ بِقَلْبِیْ طَالَ لَیْلِیْ وَلَیْسَ لِیْ — مِنَ الْهَمِّ مَنْجَاةٌ وَفِی الصُّبْحِ مَفْزَعُ

أَرٰی ذَنَبَ السِّرْحَانِ فِی الْجَوِّ سَاطِعًا — فَهَلْ مُمْکِنٌ اَنَّ الْغَزَالَةَ تَطْلُعُ

(۳)

یَا لَیْلَةً اَظْلَمَتْ عَلَیْنَا — لَیْلَاءَ قَارِبِیَّةَ الدُّجُنَّةْ

قَدْ رَکَضَتْ فِی الدُّجٰی عَلَیْنَا — دُهْمًا خُدَارِیَّةَ الْاَعِنَّةْ

قَبَّتْ اَقْبَاسُهَا فَکَانَتْ — حُبْلٰی نَهَارِیَّةَ الْاَجِنَّةْ

ان عربی اشعار کے علاوہ مسعود کے فارسی دیوان میں بعض عربی اشعار یا مصراع بھی موجود ہیں جنہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مسعود کے مندرجہ بالا عربی اشعار سے واضح ہے کہ وہ عربی زبان پر اچھی طرح قادر تھا اور نہایت سلیس اور آسان زبان میں عربی شعر کہہ لیتا تھا اور بعض اشعار میں وہ صنائع اور بدائع کا بھی خیال رکھتا تھا

مراجع

آزاد ص ۵-۷ ——— الابجد ص ۸۹۰ ——— الاعلام ۸: ۱۱۱

براؤن ۲: ۳۲۹-۳۳۶ ——— تاریخ ادبیات ۲: ۹۹-۱۰۱ ——— التذکرة ص ۲۲۶

الثقافة ص ۴۹ ——— الرجال ص ۲۴۰ ——— زبید ص ۲۳۶-۲۳۷، ۲۴۸، ۲۴۹

السبحة ص ۲۶-۲۸ ——— السحر ص ۶۵۰، ۶۶۱، ۶۷۷ ——— العارفین ۲: ۴۲۸

اللباب ۲: ۲۹۶ ——— المشاهیر ۲: ۲۱۴ ——— النزهة ۱: ۱۱۴-۱۱۶

حسن بن محمد صغانی

(۵۷۷ھ ــــ ۶۵۰ھ)

ابو الفضائل رضی الدین حسن بن محمد بن حسن بن حیدر صغانی کی پیدائش شہر لاہور میں ہوئی۔ یہ اپنے دور کے نامور عالم لغت، محدث اور فقیہ تھے۔ اُن کی تعلیم اپنے والد کی زیر نگرانی لاہور ہی میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر سلطان قطب الدین ایبک نے لاہور میں انہیں عہدہ قاضی پر متعین کرنا چاہا مگر انہوں نے معذرت کی اور غزنی کو چلے گئے وہاں درس و تدریس میں مشغول رہ کر عراق اور عرب کے علماء کی خدمت میں پہنچے۔ ۶۱۵ھ میں وہ خلیفہ ناصر عباسی کے زمانے میں بغداد کو چلے گئے ۶۱۷ھ میں وہ خلیفہ کی طرف سے ہندوستان کے حاکم شمس الدین التمش کے دربار میں سفیر بن کر آئے اور کچھ مدت وہاں قیام کے بعد ۶۲۴ھ میں واپس عراق چلے گئے اور دوبارہ سلطانہ رضیہ بنت التمش کے دربار میں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے اور پھر ۶۳۷ھ میں واپس بغداد کو چلے گئے جہاں انہوں نے اپنے گھر میں وفات پائی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں مکہ معظمہ میں دفن کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا[1]

امام صغانی نے عربی زبان میں کئی تصانیف بھی چھوڑی ہیں مثلاً "مشارق الانوار النبویۃ فی صحاح الاخبار المصطفویۃ"۔ یہ کتاب انہوں نے خلیفہ مستنصر باللہ کے کتب خانہ کے لئے جمع کی۔ اس کتاب کی کئی شرحیں اور خلاصے بھی لکھے گئے۔ علم حدیث میں اُن کی ایک اور کتاب "مصباح الدجا فی حدیث المصطفیٰ" بھی ہے جس میں اسناد حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اسی موضوع پر تیسری کتاب "الشمس المنیرۃ" ہے لیکن صغانی کی بیشتر شہرت اُن کے امام لغت ہونے میں ہے۔ لغت میں انہوں نے ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم کا نام "التکملۃ والذیل والصلۃ" ہے۔ یہ لغت کے عالم جوہری کی کتاب "الصحاح" کا تتمہ ہے۔ صغانی کی لغت میں ایک اور کتاب "العباب الزاخر" ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد کے قول کے مطابق اس کے کئی قلمی نسخے دریافت ہو چکے ہیں[1]۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے[2] کہ یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی بلکہ مادہ "ب ک م" تک پہنچی تھی کہ صغانی کی

[1] زبید صـ ۲۵۴

[2] الکشف صـ ۱۱۲۲

وفات ہوگئی جس پر کسی نے یہ شعر کہے ؎

إِنَّ الصَّغَانِيَّ الَّذِيْ ... حَازَ الْعُلُوْمَ وَالْحِكَمْ

كَانَ قُصَارَىٰ أَمْرِهِ ... أَنِ انْتَهَىٰ إِلَىٰ "بَكَمْ"

اس کتاب کی تکمیل بقول حاجی خلیفہ تاج الدین ابو محمد احمد بن عبد القادر قیسی (المتوفی ۷۴۹ھ) نے کی۔ تکمیل کے علاوہ ابن سیدہ کی کتاب المحکم کا مواد بھی اُس کے ساتھ ملا دیا۔[۲]

لغت میں صغانی کی ایک اور کتاب "مجمع البحرین" بتائی جاتی ہے۔ یہ تو بڑی بڑی کتابیں تھیں۔ کچھ مختصر کتب بھی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ گو امام صغانی باقاعدہ طور پر عربی شعر نہیں کہتے تھے مگر اُن کا یہ قطعہ اشعار "مطبوعات مجمع اللغۃ العربیۃ بدمشق" کے زیر اہتمام طبع ہو چکا ہے جس کا عنوان "تعزیز بیتی الحریری" ہے۔ دراصل حریری نے اپنے چھیالیسویں (۴۶) مقامہ "الحلبیۃ" میں دو شعر لکھ کر یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی شخص شعر کا پیوند نہیں لگا سکتا۔ وہ دو شعر یہ ہیں ؎

سِمْ سِمَةً تَحْسُنُ آثَارُهَا ... وَاشْكُرْ لِمَنْ أَعْطَىٰ وَلَوْ سِمْسِمَهْ

وَالْمَكْرَ مَهْمَا اسْطَعْتَ لَا تَأْتِهِ ... لِتَقْتَنِيَ السُّؤْدُدَ وَالْمَكْرُمَهْ

اس کے جواب میں امام صغانی نے تقریباً تیس (۳۰) اشعار پر مشتمل ایک قطعہ لکھ کر حریری کا خیال غلط ثابت کر دیا جس کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں ؎

وَالْأَمَةُ الزُّهْرِيُّ بِأَهْلِ الْحِجَىٰ ... تَعَافُهُ حُرَّتُنَا وَالْأَمَهْ

وَالْأَمَةُ الْحَسْنَاءُ لَا تَأْتِهَا ... وَاسْتَخْرِجِ الْفِئْرَانَ وَالْأَمَهْ

اسی طرح حافظ ابو الخطاب عمر بن حسن ابن دحیۃ المعروف بذی النسبین (المتوفی ۶۳۳ھ) نے

۱؎ اس کتاب کے بارے میں مولانا عبد العزیز میمن مرحوم نے اپنے دیار عرب کے ایک سفر کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس عظیم کتاب کو ایڈٹ کرنا کسی ایک عالم کے بس کا روگ نہیں بلکہ عالم اسلام کے منتخب عربی دانوں کا ایک بورڈ بنایا جائے جو اس ضخیم کتاب کی تحقیق و اشاعت کا فریضہ انجام دے۔ (تاریخ ادبیات ۲: ۱۵۲) لیکن معلوم ہوا ہے کہ صغانی کی کتاب "العباب الزاخر" کو پاکستان کے باہمت محقق ڈاکٹر پیر محمد حسن اپنی پیرانہ سالی کے باوجود مرتب کر رہے ہیں جس کی نو (۹) دس (۱۰) جلدیں مکمل ہو چکی ہیں اور غالباً دو، تین جلدیں مزید ہوں گی۔ ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔ یہ یقیناً علم لغت کی ایک گراں قدر خدمت ہے۔ والتوفیق من اللّٰہ تعالیٰ۔

اپنی کتاب "المطرب من اشعار اهل المغرب"[1] میں مشہور محدث ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد اللہ السہیلی (المتوفی ۵۸۱ھ) کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک دن امام سہیلی نے مجھ سے کہا کہ میں حریری کی اس بات پر حیران ہوں کہ ان دو[۲] شعروں کے ساتھ تیسرے شعر کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا لیکن اس کے بعد ایک ایسا شخص بھی آیا جس نے ان دو[۲] شعروں کے ساتھ دس[۱۰] شعر اور کہہ کر ان کی تعداد بارہ[۱۲] بنا دی۔ اس کے بعد ابن دحیہ نے حریری کے دو شعر لکھ کر اس پر زائد کہے گئے اشعار نقل کئے ہیں جنہیں بخوف طوالت نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب میں یہ دو شعر بھی حافظ دمیاطی کی سند سے نقل کئے ہیں کہ صغانی نے اپنے یہ شعر بغداد میں سنائے ؎

تَسَرْبَلْتُ سِرْبَالَ الْقَنَاعَةِ وَالرِّضَا ۔۔۔ صَبِياً وَكَانَا فِي الْكُهُولَةِ دَيْدَنِي

وَقَدْ كَانَ يَثْنِي الرِّجْفُ بِالرِّضَى ۔۔۔ وَبِالْعَفْوِ أَنْ أُولِي يَدًا مِنْ يَدِي دَنِي

تاریخ ثغر عدن[2] مصنف بامخرمہ میں بھی تقریباً "۶۰ اشعار کا ایک طویل قصیدہ صغانی کی طرف منسوب ملتا ہے جو اغلاط سے پُر ہے۔ ان اغلاط کی تصحیح ڈاکٹر پیر محمد حسن نے کر دی ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔

مراجع

آزاد ص ۷-۹ ــــ الابجد ص ۸۹۰-۸۹۱ ــــ الادباء ۹: ۱۸۹-۱۹۱

الاعلام ۲: ۲۳۲ ــــ البغیۃ ۱: ۵۱۹-۵۲۱ ــــ تاریخ ادبیات ۲: ۱۴۸-۱۵۳

التذکرۃ ص ۴۸ ــــ التراجم ص ۶۱ ــــ تعریزبیتی الحریری

الثغر ۲: ۵۵-۵۸ ــــ الثقافۃ ص ۳۰، ۳۱ ــــ جرجی زیدان ۳: ۵۲-۵۳

الحدائق ص ۲۸۱-۲۸۲ ــــ الحریری ۱: ۱۹۸ ــــ الحوادث ص ۲۶۳، ۲۸۲ ــــ الرجال ص ۹۸-۱۰۴

زبید ص ۲۹۱ ــــ السمۃ ص ۲۸-۲۹ ــــ الفوات ۱: ۲۶۱-۲۶۲ ــــ الکشف ۱۱۲۲

---

[1] ص ۲۳۸-۲۳۹

[2] ۲: ۵۵-۵۸

الاثر ص ۱۶۳-۱۶۴ — المشاہیر ۱: ۲۰۲ — المطرب ص ۲۳۸-۲۳۹ — المفتاح ۱: ۹۸ — النزہۃ ۱: ۱۳۰-۱۳۱

امیر خسرو دہلوی

(۶۵۱ھ — ۷۲۵ھ)

ابو الحسن بن امیر سیف الدین محمود ہندوستان کے مشہور فارسی شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی پیدائش دہلی کے مضافات پٹیالی میں ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان کے دار السلطنت دہلی میں پرورش پائی۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ موسیقی، شعر و شاعری اور فصاحت و بلاغت میں پوری مہارت بہم پہنچائی۔ اس کے بعد تصوف کی طرف مائل ہوئے اور دہلی کے مشہور صاحب طریقت بزرگ شیخ نظام الدین محمد بن احمد بدایونی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ حکام وقت کے ہاں بھی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ انہوں نے علم بلاغت میں مشہور کتاب 'اعجاز خسروی' تالیف کی اور اس میں صنائع لفظی کو بالخصوص وضاحت سے بیان کیا۔ اپنے پیر و مرشد شیخ نظام الدین کے اقوال کو جمع کر کے 'افضل الفوائد' کے نام سے مرتب کیا۔ فارسی زبان میں تو اُن کے پانچ دیوانوں کے علاوہ 'قران السعدین' کے نام سے ایک مثنوی بھی طبع شدہ دستیاب ہوتی ہے۔ فارسی زبان میں اُن کی متعدد تصانیف اور بھی ہیں۔

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ جب سلطان محمد بن غیاث الدین بلبن نے شیخ سعدی شیرازی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تو شیخ نے بڑھاپے کا عذر کرتے ہوئے سلطان کو یہ وصیت کی کہ وہ امیر خسرو کی تربیت اور نگہداشت کیا کرے۔ قاضی ضیاء الدین برنی کے قول کے مطابق وہ اپنے زمانے تک کے ملک الشعراء تھے۔ علم موسیقی میں وہ علمی اور عملی طور پر بے نظیر و یگانہ تھے اور لطف یہ ہے کہ وہ ایک سالک راست باز صوفی بھی تھے۔

عربی زبان میں اُن کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ صاحب قاموس المشاہیر نے کل اشعار کی تعداد قریباً چار پانچ لاکھ بیان کی ہے۔ ذیل کا قطعہ مختلف کتابوں میں دیا گیا ہے۔

ذَابَ الْفُؤَادُ وَ سَالَ مِنْ عَيْنِي الدَّمُ ... وَحَكَى الدَّوَامِعُ كُلَّ مَا أَنَا أَكْتُمُ
وَ إِذَا انْحَنَتْ لَدَى الْوَرٰى كَرْبَ النَّوٰى ... فَبَكَى الْأَحِبَّةُ وَالْأَعَادِي تَرْحَمُ
يَا عَاذِلَ الْعُشَّاقِ دَعْنِي بَاكِيًا ... إِنَّ السُّكُوْنَ عَلَى الْمُحِبِّ مُحَرَّمُ
مَنْ بَاتَ مِثْلِي فَهُوَ يَدْرِيْ حَالَتِيْ ... طُوْلَ اللَّيَالِيْ كَيْفَ بَاتَ مُتَيَّمُ

امیر خسرو کی وفات ۷۴ سال کی عمر میں ہوئی۔ اُن کا مزار اُن کے پیر و مرشد شیخ نظام الدین (اولیاء) کے مرقد کے قریب ہے۔ رحمہما اللہ تعالیٰ

مراجع

الاخبار ص ۹۹-۱۰۱ ــــ التذکرۃ ص ۵۷ ــــ الثقافۃ ص ۱۹۴
زبدہ ص ۲۳۸-۲۴۰ ــــ المشاہیر ۱: ۲۲۲-۲۲۳ ــــ النزھۃ ۲: ۳۸-۱۹

نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی

(ـــــ ۷۵۷ھ)

نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبد اللطیف الحسینی ، ان کی پیدائش علاقہ اودھ میں ہوئی۔ نو سال کی عمر میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے والدہ کی زیرِ تربیت نشو ونما اور تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد حضرت نظام الدین (اولیاء) دہلوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور انہوں نے نصیر الدین کو اپنا خلیفہ بنایا۔ نہایت عابد و زاہد و متوکل شخص تھے۔ انہوں نے دہلی میں وفات پائی۔ ان کا صرف ایک شعر جو انہوں نے اپنے استاد شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اَوَدھی کی مدح میں کہا تھا ، دستیاب ہے۔ جو یہ ہے ؎

سَاَلْتُ الْعِلْمَ مَنْ اَحْيَاكَ حَقًّا ــــ فَقَالَ الْعِلْمُ شَمْسُ الدِّيْنِ يَحْيٰى

مراجع

الابجد ص ۸۹۱ ــــ الاخبار ص ۸۰-۸۶ ــــ التذکرۃ ص ۲۳۸
السبحۃ ص ۲۹ ــــ المآثر ۳ ص ۱۶۵ ــــ النزھۃ ۲: ۱۴۷، ۱۵۸-۱۶۰

قاضی عبد المقتدر بن محمود کندی

(ـــــ ۷۹۱ھ)

قاضی منہاج الدین عبد المقتدر بن محمود کندی تھانیسری۔ ان کے دادا سلیمان سلطان قطب الدین خلجی کے دور میں ہندوستان میں آکر آباد ہوئے۔ وہ قاضی شریح کندی کی نسل میں سے تھے۔ وہ دہلی کے

نواح میں قاضی رہے اور پھر شہر تھانیسر میں سکونت اختیار کرلی۔ سلطان سلیمان کا بیٹا رکن الدین محمود حکام سلطنت
کے ہاں اثر و رسوخ رکھتا تھا اور اس نے تھانیسر کے شہر میں بہت سی جائیداد بھی بنالی تھی۔ رکن الدین محمود یہیں پیدا ہوئے
اور شہر دہلی میں نشوونما پائی۔ انہیں علم ادب، شعر و شاعری اور انشاپردازی سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ شمس الدین
محمد بن یحییٰ اودھی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے اور پھر شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی سے بھی استفادہ کرتے
رہے۔ اُن کے مشہور شاگردوں میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور اُن کا اپنا پوتا ابوالفتح بن عبدالحی بن
عبدالمقتدر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے نبی اکرمؐ کی مدح میں طویل لامیہ قصیدہ کہا۔ جس کے تقریباً پچاس شعر
نزہۃ الخواطر میں اور بعض سبحۃ المرجان میں دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ عبدالمقتدر
نے لامیۃ العجم کی تقلید کرتے ہوئے لکھا تھا۔ یہ قصیدہ ایک روایتی عرب شاعر کے انداز پر ہے، جس کی تشبیب،
گریز اور موزونیت دیکھ کر جاہلی عرب شعراء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ قصیدہ پر علم بلاغت اور علم بدیع کا رنگ
غالب ہے۔ اس میں بعض بہت نادر تشبیہیں بھی موجود ہیں۔ چونکہ یہ قصیدہ طویل ہے اسلئے ہم اسکی تشبیب
اور نعتِ رسولؐ کے بارے میں صرف چند ایک اشعار نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، جن میں ناظم نے ایک روایتی
عرب شاعر کی طرح محبوبہ کی منزل کو سلام کرکے آنسو بہائے ہیں۔ پھر شاعر اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کی
تعریف کرتا ہے جو اس کی رسائی سے باہر ہے۔ تاہم کسی نہ کسی طرح شاعر اپنی محبوبہ تک پہنچ جاتا ہے جو اُس کو دیکھ کر
حیران ہو جاتی اور پوچھتی ہے کہ وہ پہرہ داروں کی نظر سے بچ کر یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔ جواب میں وہ کہتا ہے کہ وہ
کوئی معمولی آدمی نہیں ہے بلکہ ایک بادشاہ ہے جو ہمیشہ شیر کا شکار کرتا ہے۔ یہ سُن کر محبوبہ سرِ تسلیم خم کر دیتی اور کہتی
ہے کہ وہ ایسے بہادر جنگجو کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن شاعر اُسے بتاتا ہے کہ اُس کا تعلق متقی اور پرہیزگار لوگوں سے
ہے پھر شاعر مومنوں کی تعریف کرتے ہوئے بارگاہ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

يَا سَائِقَ الظَّعْنِ فِي الْأَسْحَارِ وَالْأُصُلِ — سَلِّمْ عَلَى دَارِ سَلْمَى وَابْكِ ثُمَّ سَلِ
عَنِ الظِّبَاءِ الَّتِي مِنْ دَأْبِهَا أَبَدًا — صَيْدُ الْأُسُودِ بِحُسْنِ الدَّلِّ وَالْكَحَلِ
أَضْحَتْ إِذَا بَعُدَتْ عَنْهَا كَوَاعِبُهَا — أَطْلَالُهَا مِثْلُ أَجْفَانٍ بِلَا مُقَلِ
فَدَى فُؤَادِي أَعْرَابِيَّةٌ سَكَنَتْ — بَيْتًا مِنَ الْقَلْبِ مَعْمُورًا بِلَا أَجَلِ
كَأَنَّهَا ظَبْيَةٌ لَكِنَّ بَيْنَهُمَا — فَرْقًا جَلِيلًا بِعِظَمِ السَّاقِ وَالْكَفَلِ
طَرَقْتُهَا فَجْأَةً وَاللَّيْلُ فِي جَذَلٍ — وَالذِّئْبُ فِي كَسَلٍ وَالْقَوْمُ فِي شُغُلِ

قالت لك الويل هلا خفت من اسد — له براثن كالعسالة الذبل

فقلت إني مليك صيده اسد — وصيد غيري من ظبي ومن وعل

قالت فما تبتغي لا منع قلت لها — كلا فإني عفيف القول والعمل

وإنني رجل من معشر سحبوا — ذيل التبرر والتقوى على زحل

يا طالب الجاه في الدنيا تكون غدا — على شفا حفرة النيران والشعل

للمدحة فيها ما لكم ابدا — وذي خصاص بفضل الله مكتفل

ولم يكن فخرة الا بعزة من — اعيى الاعاجم والاعراب بالنوم

محمد خير خلق الله قاطبة — هو الذي جل عن مثل وعن مثل

له المزايا بلا نقص ولا شبه — له العطايا بلا من ولا بدل

له المكارم ابهى من نجوم دجى — له العزائم امضى من قنا البطل

له الفضائل اجدى من عصا كرمت — له الشمائل احلى من جنى النحل

ہندستانی شعراء صنعت لفظی کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خصوصیت اس قصیدہ میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً پہلے ہی شعر میں

۱۔ سلم، سلمیٰ اور سلی میں تجنیس زائد

۲۔ مراعاۃ النظیر از اول تا آخر

۳۔ سلم اور سلمیٰ میں صنعت اشتقاق

۴۔ "اسعاد اور اصل" میں صنعت تضاد

وغیرہ صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض تشبیہات بھی بہت نادر استعمال کی گئی ہیں۔

قاضی عبد المقتدر نے ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی

مراجع

آزاد ص ۱۱-۱۲ — الابجد ص ۸۹۲ — الاخبار ص ۱۵۰-۱۵۱

تاریخ ادبیات ۲: ۱۶۵ — التذکرۃ ص ۱۳۳-۱۳۴ — الثقافۃ ص ۴۴

الحدائق ص ۳۲۶-۳۲۷ — زبید ص ۲۴۰-۲۴۲ — السبحة ص ۳۰-۳۲

المآثر ص ۱۶۶-۱۶۷ — النزهة ۲: ۷۰-۷۶

شیخ احمد بن محمد تھانیسری

(۸۲۰ھ)

شیخ احمد بن محمد تھانیسری ایک ممتاز عالم اور اچھے شاعر تھے۔ علم فقہ، اصول اور عربی ادب میں کمال حاصل تھا۔ دہلی کے قریب شہر تھانیسر میں پیدا ہوئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی اور وہاں شیخ نصیر الدین محمود اودھی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ قاضی عبد المقتدر (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) کے شاگرد تھے۔ جب امیر تیمور نے ۸۰۱ھ میں دہلی کو فتح کیا اور اُسے اُن کی قابلیت اور فضیلت کا علم ہوا تو وہ اُن سے نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا اور اپنا مقرب بنا لیا اور چاہتا تھا کہ انہیں سمرقند اپنے ساتھ لے جائے لیکن شیخ احمد نے اس سے اتفاق نہ کیا اور کالپی میں سکونت اختیار کرلی جہاں انہوں نے باقی عمر اطمینان کے ساتھ درس و تدریس میں بسر کرنے کے بعد وفات پائی اور وہاں کے قلعہ میں دفن ہوئے۔

اُن کا نمونۂ کلام مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے جو ایک نعتیہ قصیدہ سے ماخوذ ہیں۔

أطار ليلي حنين الطائر الغرد — وهاج لوعة قلبي النائح الكمد

واذكرتني عهوداً بالحمى سلفت — حمامة صدحت من لاعج الكبد

والهم منصدع والكرب مندفع — والجد مرتفع كالأنجم السعد

والشعب ملتئم والعهد ملتزم — والشمل منتظم لم يرمهم بالبدد

خل الأحاديث عن ليلى وجارتها — وارحل إلى السيد المختار من أدد

وليس في الدين والدنيا وآخرتي — سوى جناب رسول الله معتمدي

يا أفضل الناس من ماض ومؤتنف — وأكرم الخلق من حر ومن عبد

أفديك بالروح والقلب المشوق معاً — والنفس والمال والأهلين والولد

يا رب صل وسلم دائماً أبداً — على النبي نبي الحق والرشد

محمد أحمد الهادي لأمته — إلى الصراط صراط غير ملتحد

مراجع: آزاد ص ۱۳ - ۱۴ — الابجد ص ۸۹۲ - ۸۹۳ — الاخبار ص ۱۲۲ - ۱۲۶

تاریخ ادبیات ص ۱۶۵ - ۱۶۶ — التذکرۃ ص ۱۸ — الحدائق ص ۳۳۹ - ۳۴۰

زبید ص ۲۱۶ — السبحۃ ص ۳۷ - ۳۹ — المآثر ص ۱۶۹ - ۱۷۰

النزہۃ ۳: ۸ - ۱۳

شیخ زین الدین علی معبری

۸۷۳ھ ـــ ۹۲۸ھ

شیخ زین الدین ابو یحییٰ بن علی بن احمد المعبری الملیباری کوچین کیشان (کوچین) علاقہ ملیبار میں ہوئے۔ اُن کے والد علی بن احمد المعبری، معبر کے باشندے تھے۔ زین الدین ایک جید عالم ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف اور شاعر بھی تھے۔ اُن کی مندرجہ ذیل تین کتابیں زیادہ اہم سمجھی جاتی ہیں:

۱۔ السراج الباہر بتکمیل النور السافر

۲۔ سراج القلوب

۳۔ مرشد الطلاب الی الکریم الوہاب

اُن کے اشعار اس لحاظ سے تو اہم ہیں کہ وہ برصغیر کے ایک عربی دان عالم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ لیکن یہ اشعار تصنع اور تکلف سے خالی نہیں اور بعض مقامات پر بے مزا اور خشک نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی ایک کتاب ھدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء (جو تصوف کے موضوع پر ہے) ایک ارجوزہ کی صورت میں ہے جس کا آغاز اس طرح ہوا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمُوَفِّقِ لِلْعُلَا — حَمْدًا یُوَافِیْ بِرَّہٗ الْمُتَکَامِلَا

ثُمَّ الصَّلٰوۃُ عَلَی الرَّسُوْلِ الْمُصْطَفٰی — وَالْآلِ مَعْ صَحْبٍ وَتَبَاعٍ وَلَا

تَقْوَی الْاِلٰہِ مَدَارُ کُلِّ سَعَادَۃٍ — وَتِبَاعُ اَھْوَا رَأْسُ شَرٍّ حَابِلَا

اِنَّ الطَّرِیْقَ شَرِیْعَۃٌ وَطَرِیْقَۃٌ — وَحَقِیْقَۃٌ فَاسْمَعْ لَہَا مَا مُثِّلَا

فَشَرِیْعَۃٌ اَخْذٌ بِدِیْنِ الْخَالِقِ — وَقِیَامُہٗ بِالْاَمْرِ وَالنَّھْیِ انْجَلَا

وَطَرِیْقَۃٌ اَخْذٌ بِاَحْوَطَ کَالْوَرَعْ — وَعَزِیْمَۃٌ کَرِیَاضَۃٍ مُتَبَتِّلَا

اشعار کی خشکی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ علوم وفنون کے اصول کو قلمبند کرنے میں خواہ مخواہ تکلف سے کام لینا پڑتا ہے اور شعر جیسی لطیف چیز اس قسم کے غیر دلچسپ موضوعات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

انہوں نے تحصیل علم شیخ زکریا انصاری اور شیخ کمال الدین محمد بن ابی شریف سے کی اور علم طریقت میں شیخ قطب الدین بن فرید الدین چشتی شکر گنج پتنی کے مرید ہوئے۔

مراجع

تاریخ ادبیات ٣: ١٩٧-١٩٨ زبید ص ٣٢٥-٣٢٦ النزهة ٤: ١١٨-١١٩

شاہ احمد شرعی چندیری

(— ٩٢٨ھ)

شیخ شاہ احمد شرعی چندیری ریاست مالوہ کے شہر چندیری کے رہنے والے تھے۔ صاحب نزھۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ وہ نہایت عبادت گزار اور زاہد بزرگ تھے وہ امراء و ملوک کے ہاں نہیں جایا کرتے تھے۔ بلکہ وہ خود ہر جمعہ کے روز اُن کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ مراجع میں اُن کی طرف یہ دو شعر منسوب کئے گئے ہیں۔

عَجَباً لِقَوْمٍ ظَالِمِيْنَ تَلَقَّبُوْا ... بِالْعَدْلِ مَا فِيْهِمْ لَعَمْرِیْ مَعْرِفَةْ

قَدْ جَاءَهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَدْرُوْنَهُ ... تَعْطِيْلُ ذَاتِ اللّٰهِ مَعْ نَفْيِ الصِّفَةْ

یہ شعر چندیری نے زمخشری کی تفسیر کشاف میں دیئے گئے مندرجہ ذیل دو شعروں کے جواب میں کہے تھے جو بظاہر اشاعرہ کی ہجو پر مشتمل ہیں۔

لِجَمَاعَةٍ سَمَّوْا هَوَاهُمْ سُنَّةً ... وَجَمَاعَةٍ حُمُرٍ لَعَمْرِیْ مُوْكَفَةْ

قَدْ شَبَّهُوْهُ بِخَلْقِهِ وَتَخَوَّفُوْا ... شُنَعَ الْوَرٰى فَتَسَتَّرُوْا بِالْبَلْكَفَةْ

مراجع

الاخبار ص ٢٣٠-٢٣١ تاریخ ادبیات ٢: ١٩٨-١٩٩ التذکرۃ ص ٨٤

زبید ص ٢٤٢-٢٤٣ الکشاف ١: ٥٠٨ النزهة ٤: ١٣٢-١٣٣

ابوالفیض فیضی

(۹۵۴ھ — ۱۰۰۴ھ)

ابوالفیض بن مبارک ناگوری المتخلص بفیضی شہر اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد زبان عربی میں شیخ حسین مروزی کی شاگردی اختیار کی۔ بالخصوص علم عروض کی طرف بہت توجہ دی۔ اُسکی تصانیف اُس کی علمیت پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً اخلاق کے موضوع پر اُس کی کتاب "موارد الکلم" جو غیر منقوط عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہ مغل شہنشاہ اکبر کا درباری شاعر تھا اور اُسکی مدح میں اُس نے بہت سے فارسی قصائد کہے اور اکبر کی طرف سے ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔ اُس کا فارسی دیوان بہت ضخیم ہے۔ عربی میں اُس کی سب سے مشہور کتاب "سواطع الالہام" ہے، جو قرآن مجید کی غیر منقوط تفسیر ہے۔ یہ اُس نے دو سال کے عرصہ میں تصنیف کی اس سے عربی زبان میں اُسکی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

فیضی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ملحد اور زندیق تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عبدالحق دہلوی کی کتاب اخبار الشعراء سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ فیضی فصاحت و بلاغت میں یگانۂ روزگار تھا۔ لیکن کفر و گمراہی کی وادی میں گر کر اُس نے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگالیا۔ اس لئے صحیح اہل ایمان اُس سے نفرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب المنتخب میں لکھا ہے کہ اُس میں بہت ناپسندیدہ خصلتیں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً نفاق، ریا، خود ستائی، جاہ و جلال کی محبت۔ وہ اصول دین اور اہل اسلام کا دشمن تھا اور صحابہ کرام اور اُن کے پیروؤں خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ کی سخت مذمت کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے قرآن مجید کی تفسیر ان تمام بدعادات کے کفارہ کے طور پر لکھی لیکن وہ یہ تفسیر شراب کی مستی اور حالت جنابت میں بھی لکھتا رہتا تھا اور اُس کے اوراق کتوں کے پاؤں میں بکھرے رہتے تھے۔ اُس کا انجام بہت بُرا ہوا اور آخر وقت میں اُس کا چہرہ متورم اور سیاہ ہو گیا اور وہ کتوں کی طرح بھونکا کرتا تھا۔ اُس کے مرنے پر بعض لوگوں نے اُس کی تاریخ وفات شعروں میں کہی جن میں اُسے بہت بُری طرح یاد کیا گیا۔ ایک صاحب نے اُس کی تاریخ "خالد فی النار" نکالی۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے "قاعدۂ الحاد شکست" سے تاریخ کا استخراج کیا۔ اُس کے عربی کلام کا کچھ نمونہ جو اُسکی کتاب "موارد الکلم" اور اُسکی تفسیر "سواطع الالہام" سے ماخوذ ہے۔ حسب ذیل ہے:

۱۔ موارد الکلم:

صَاحِ صَاحَ الْحَمَامُ حَوْلَ كَلَامِ — دوروه دار صواع مدام

لاح دار الحل و حال الحل — دار كاس المدام راس العامر

احمد الهوح اطلاح السدوح — روح الهوح احمار مدام

۲۔ سواطع الالہام :

العاح سمام طلسم مكهم — لاسرار روح للسواطع ملهم

لسم حلال والسطوع طلسمه — وما هو سحر او طلسم محرم

صاح لاصل الاصل طرس مطهر — سواد لكل الكل علس مطهم

مراجع

آزاد ص ۲۵-۲۶ — الابجد ص ۷۹۷-۷۹۸ — تاریخ ادبیات ۲: ۲۵۶-۲۵۸

التذکرۃ ص ۲ — الثقافۃ ص ۴۵ — زبید ص ۲۳-۳۱

السبعۃ ص ۴۵-۴۶ — الآثر ص ۱۸۳-۱۸۷ — المحبوب ص ۲۴۲-۲۴۳

الشاھیر ۲: ۱۳۳ — النزھۃ ۵: ۲۶-۳۱

شیخ احمد بن علی مالکی

(۔۔ ۱۰۰۹ھ)

شہاب الدین علی بن احمد مالکی ہندی گجراتی۔ انہوں نے اپنے والد اور شیخ عبد القادر عیدروس سے تحصیل علم کی۔ وہ ایک جامع صفات شخصیت تھے اور زیادہ تر اُن کی توجہ اصلاح معاد کی طرف لگی رہتی تھی۔ مصنف النور السافر لکھتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت کے پیرو اور سلف صالحین کی راہ پر چلنے والے قناعت پسند اور متقی شخص تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں صرف کرتے تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے اُن کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اُن کے ہم عصر شعراء میں سے بعض نے اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھے۔ وہ خود شاعر بھی تھے۔ چنانچہ شیخ احمد بن محمد حضرمی کی وفات پر انہوں نے ایک مرثیہ کہا۔ جس میں سے تین شعر یہ ہیں جن کی ابتداء یوں ہوتی ہے ؎

نِعمَ المُطِرُ بِخيلِه یَا سَارِی	عَن اَن یَسِیرَ بِاَسوءِ الاَخبَارِ
حَقُّ البُکَاءُ عَلَی الَّذِی حَازَ العُلیٰ	سَهَرَ اللَّیَالِی وَالنُّجُومُ سَوَارِی
اَعنِی الشِّهَابَ الجَاسِرِیَّ فَاِنَّهُ	قَد کَانَ خِلّاً خَالِصاً مُختَارِی

اُن کی وفات احمد آباد میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔

مراجع

النزهة ۵: ۵۸-۵۹ النور ص ۲۳۳

شیخ عبد القادر عیدروس

(۹۷۸ھ — ۱۰۳۸ھ)

شیخ محی الدین ابوبکر عبد القادر بن شیخ بن عبد اللہ بن شیخ بن عبد اللہ العیدروس۔ وہ ہندوستان کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے اور اُس زمانے کے علماء و فضلاء سے کسبِ علم کیا۔ یہ بیس[۳۰] کے قریب کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے النور السافر عن اخبار القرن العاشر بہت مشہور ہے۔ انہوں نے احمد آباد میں وفات پائی۔ نثر میں کتابیں لکھنے کے علاوہ اُن کے بعض اشعار بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ آلِ عیدروس میں بہت سے علماء و فضلاء ہو گزرے ہیں، جن کے ناموں اور علمی کارناموں کا ذکر صاحب تاج العروس نے کیا ہے۔

محی الدین عیدروس کا نمونہ کلام ان دو شعروں میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

اِذَا مَا اشتَدَّ لَیلُ الهُمُومِ وَدُجیٰ	جَعَلتُ اِلیٰ اَهلِ بَدرٍ الاِلتِجَا
وَمَا خَابَ عَبدٌ لَهُم قَد رَجَا	وَمَتیٰ تَوَسَّلَ بِهِم اِلَی اللّٰهِ فَنَجَا

مراجع

الاعلام ۴: ۱۶۴ تاریخ ادبیات ۲: ص ۲۹۵-۲۹۶ التذکرۃ ص ۱۲۹

جرجی زیدان ۳: ۳۳۷ الحدائق ص ۴۲۷-۴۲۸ زبید ص ۲۷۵،۲۷۶ الفوائد ص ۸۲-ج

المحبی ۲: ۴۴۰-۴۴۲ المعجم ص ۱۴۰ النزهة ۵: ۲۳۵-۲۳۶

شیخ غلام نقشبند لکھنوی

م — ۱۱۲۶ھ

الشیخ غلام نقشبند بن عطاء اللہ بن حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحییٰ بن شرف الدین بن نصیر الدین بن اُباذر بن عثمان۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان بن عفان تک پہنچ جاتا ہے جیسا کہ صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے۔ ان کے دادا حبیب اللہ گھوسی (علاقہ جونپور) کے قاضی تھے۔ ان کے والد شیخ عطاء اللہ کو ان کی پیدائش سے پہلے خواجہ بہاء الدین نقشبند کی طرف سے روحانی طور پر اشارہ ہوا کہ ان کا نام خواجہ کے اپنے نام پر رکھا جائے اسلئے انہیں غلام نقشبند کہا گیا۔ ۱۸ سال کی عمر میں انہوں نے تمام علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا۔ انہیں علم نحو، لغت، اشعار اور ایام العرب کا نہ صرف وسیع علم تھا بلکہ علوم حکمت بھی انہیں مکمل طور پر ازبر تھے۔ چنانچہ انہوں نے کئی ایک تصانیف بھی مرتب کیں اور عربی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی وفات شہر لکھنؤ میں ہوئی اور دریائے گومتی کے کنارے شیخ پیر محمد لکھنوی کے مزار سے متصل دفن ہوئے۔ ان کے عربی کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے

جو ان کے ایک استاذ میر محمد شفیع کی مدح میں ہے۔

خَلِیْلَیَّ هَلْ هَاتَانِ دَارَةُ جُلْجُلِ ۔۔۔ وَدَارَةُ سَلْمیٰ فِی تَعَانُقِ عَقَنْقَلِ

عَلَیْهَا سَوَارِی الْمُزْنِ سَحَّتْ مَطِیْرَةً ۔۔۔ فَحَیَّتْ مَبَانِیْهَا نُمُوحَ الْمُهَلْهِلِ

أَغَنِّیْهَا سَلْمیٰ هَلْ تُفَرِّجُ غُمَّةً ۔۔۔ وَتَکْشِفُ عَمَّا نَلْعَنُ ذَاتَ الذَّلَلِ

عَلیٰ اَیِّ اَرْضٍ خَیَّمَتْ ذَاتُ هَوْلَةٍ ۔۔۔ تَجُوْلُ بِوَجْهٍ کَالضُّحیٰ مُتَهَلِّلِ

وَهَلْ یَنْفَعُ الْمَبْکیٰ عُیُوْنًا ذَوَارِفًا ۔۔۔ اِذَا وَجَّهَتْ سَلْمیٰ رِکَابَ التَّبَتُّلِ

حَبِیْبٌ اِذَا مَا جَوَّدَ الْغَیْثُ عَیْنَهَا ۔۔۔ فَیَا لَلْهَمِیْنِ لَاتَ حِیْنَ تَحَوُّلِ

لَهٗ هِمَّةٌ عَلْیَا تَسْمُوْ عَلَی السَّمَا ۔۔۔ وَمَجْدٌ مَجِیْدٌ نَیْلُهٗ لَمْ یُسَهَّلِ

نَجِیْلٌ جَلِیْلٌ مِنْ شَفِیْعٍ کَاسْمِهٖ ۔۔۔ وَمِنْ جَدِّهٖ خَیْرِ الْوَریٰ خَیْرِ مُرْسَلِ

لَدَیْهِ عُلُوْمٌ لَا یُرَامُ فَنَاءُهَا ۔۔۔ وَاَسْرَارُ لَوْحٍ فِی الْاَسْرَارِ تَنْجَلِیْ

وَلَمْ یُؤْثِرِ الدُّنْیَا الدَّنِیَّ نَعِیْمُهَا ۔۔۔ وَنِعَمٌ عِنْدَ اللّٰهِ اَحْسَنُ مُفَضَّلِ

شَفِیعٌ لِیَوْمِ الْحَشْرِ جِرْیٌ وَمَوْئِلٌ ٭ وَوِجْہَةُ قَلْبٍ غَوْثُ کُلِّ مُؤَمِّلٖ

یَطُوْفُ حَوَالَیْہِ الْمَکَارِمُ وَالْعُلٰی ٭ طَوَافَ حَجِیْجٍ حَوْلَ بَیْتٍ مُحَجَّلٖ

مراجع

آزاد ص ۲۵-۲۶ — الابجد ص ۹۰۶ — التذکرة ص ۱۵۸-۱۵۹

الثقافة ص ۲۵ — الحدائق ص ۴۵۴ — زبید ص ۲۷۱، ۲۸۳

السبحة ص ۷۸-۷۹ — المآثر ص ۲۰۳-۲۰۶ — النزھة ۶: ۲۱۲-۲۱۴

مولانا سید عبد الجلیل بلگرامی

(۱۰۷۱ھ — ۱۱۳۸ھ)

السید عبد الجلیل بن میر احمد بن سید عبد اللہ[1] بن سید محمود اصغر الحسینی الواسطی البلگرامی۔

ان کا مولد و منشأ قصبہ بلگرام ہے جو قنوج کے قریب واقع ہے۔ میر عبد الجلیل نے ابتدائی تعلیم سید سعد اللہ بلگرامی سے حاصل کی اور پھر علاقہ اودھ کے مضافات کے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ اس کے بعد وہ خواجہ غلام نقشبند (جن کا مختصر ذکر پہلے ہو چکا ہے) کی خدمت میں مدت تک رہ کر تزکیۂ قلب اور تصفیۂ باطن کی نعمت حاصل کی۔ علم حدیث میں انہوں نے شیخ مبارک بن فخر الدین الحسینی بلگرامی سے تلمذ کیا اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ عربی ادب اور لغت پر کامل قدرت حاصل کی۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (صاحب سبحة المرجان) سید عبد الجلیل کے نواسے اور خاص تلامذہ میں سے تھے۔

---

[1] میر غلام علی آزاد، مآثر الکرام ص ۲۴۲ میں عبد الجلیل کے والد میر احمد کے حالات میں بیان کرتے ہیں کہ دراصل میر احمد کے والد سید عبد اللطیف تھے جو سید عبد اللہ کے حقیقی بھائی تھے لیکن چونکہ سید عبد اللہ کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اسلئے انہوں نے میر عبد الجلیل کے والد میر احمد کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور میر احمد نے اپنی انگشتری پر بھی احمد بن عبد اللہ کندہ کرا لیا تھا۔ چنانچہ جمہور کے نزدیک میر احمد کا والد سید عبد اللہ کو ہی شمار کیا جاتا ہے۔

سید عبدالجلیل مغل شہنشاہ عالمگیر کے دور میں گجرات (پنجاب) اور بھکر اور سیوستان (علاقۂ سندھ) کے وقائع نگاری پر مامور رہے اور سنہ ۱۱۳۰ھ میں اس منصب سے فارغ ہو کر بلگرام اور بعد میں دہلی میں درس و تدریس کرتے رہے۔ اُن کی کسی عربی نثر میں تصنیف کا ذکر نہیں ملتا لیکن اُن کے عربی اشعار کے نمونے اُن سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں، جو اُن کے شاعرانہ کمال پر شہادت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

یَاصَاحِ لَاتَلُمِ الْمُتَیَّمَ فِی الْهَوٰی ... هُوَ عَاشِقٌ لَایَنْثَنِیْ عَنْ خِلِّهٖ

یَأْبَی الدَّوَاءَ سِقَامُهٗ کَعُیُوْنِهٖ ... فَعَلَ الطَّبِیْعَةِ یَا مُعَالِجُ خَلِّهٖ

ایک اور نمونہ یہ ہے:

حَیْثُ قَوْسُ حَاجِبِهٖ کَنُوْنٍ ... وَصَادَ یَدِ ابْنِ مُقْلَةَ شَکْلُ عَیْنِهٖ

لَعَمْرِیْ إِنَّهٗ نَصٌّ جَلِیٌّ ... عَلٰی أَنَّ النِّهَایَةَ حَقُّ عَیْنِهٖ

صاحب سبحۃ المرجان نے لکھا ہے کہ ایک دن کسی صاحب نے میرے نانا (سید عبدالجلیل بلگرامی) کے سامنے بدیع الزمان ہمدانی کا یہ شعر پڑھا جسے رشید الدین وطواط نے اپنی کتاب "حدائق السحر" کے باب "تاکید المدح بما یشبہ الذم" میں پیش کیا ہے ؎

هُوَ الْبَدْرُ إِلَّا أَنَّهُ الْبَحْرُ زَاخِرًا ... سِوٰی أَنَّهُ الضِّرْغَامُ لٰکِنَّهُ الْوَبْلُ

صاحب سبحۃ المرجان نے اس شعر کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ شعر بلخ کے شہر میں ابراہیم الغزی کے سامنے پڑھا گیا جسے اُس نے حفظ کر لیا۔ ابراہیم ایک ہفتہ بلکہ اس سے زیادہ مدت تک اس جیسا شعر کہنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس سے ایسا شعر بن نہ آیا اور آخر نے اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ بدیع الزمان سے پہلے اس قسم کا شعر کسی نے نہیں کہا اور نہ آئندہ کوئی شخص کبھی کہہ سکے گا۔ پھر میرے نانا نے کہا: غزی کے بارے میں وطواط نے جو کچھ کہا ہے مجھے اس پر حیرانی ہے کہ گزشتہ اور آئندہ دونوں زمانوں میں اس قسم کا شعر نہ کہے جا سکنے کا جو ذکر کیا ہے وہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ میرے نانا نے اس بات پر تعجب کرنے کے بعد اپنا ایک شعر پیش کیا ہے جس میں "مراعات النظیر" صنعت کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

هُوَ الْقُطْبُ إِلَّا أَنَّهُ الْبَدْرُ طَالِعًا ... سِوٰی أَنَّهُ الْمِرِّیْخُ لٰکِنَّهُ السَّعْدُ

مراجع

آزاد ص ۵۳-۵۴ — الابجد ص ۹۰۷-۹۰۸ — تاریخ ادبیات ۲: ۳۲۶-۳۲۷

التذکرۃ ص ۱۰۸-۱۰۹ — الثقافۃ ص ۴۵ — الحدائق ص ۲۵۵-۲۵۶

زبید ص ۲۰۵،۲۴۵-۲۰۶ — السبحۃ ص ۷۹-۸۵ — السحر ص ۶۵۸

المآثر ص ۲۴۵-۲۶۷ — المشاہیر ۲: ۵۶ — النزہۃ ۶: ۱۳۹-۱۴۰

سید طفیل محمد بلگرامی اترولوی

(۱۰۷۳ھ — ۱۱۵۱ھ)

سید طفیل محمد بن شکر اللہ الحسینی الاترولوی قصبہ اترولی میں جو اکبر آباد (آگرہ) کے مضافات میں ایک بستی تھی، پیدا ہوئے۔ وہ بچپن ہی میں اپنے چچا احسن اللہ کے ساتھ دہلی کو چلے گئے اور وہاں شیخ حسن الحسینی النارنولی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور صرف و نحو اپنے مذکورہ بالا چچا سے پڑھنے کے بعد قصبۂ بلگرام کی طرف سفر کر گئے وہاں سید سعد اللہ اور قاضی علیم اللہ الکچندوی کی شاگردی اختیار کی۔ حدیث کے لئے انہوں نے شیخ مبارک بن فخر الدین الحسینی البلگرامی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سید غلام علی الحسینی البلگرامی اُن کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ مولانا طفیل محمد نے تمام عمر نہ تو سکونتی گھر بنایا اور نہ شادی کی اور دنیا کا مال و دولت اکٹھا کرنے کی انہیں کوئی ہوس نہ تھی۔ وہ کبھی کبھی شعر و شاعری کی طرف بھی مائل ہوتے تھے۔ چنانچہ اُن کا انداز کلام ان شعروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

تملّاہ عینُک النجلاءُ باخلۃٌ — فیہا الزکوۃُ الی العشّاق مفقودٌ
فقال العینُ معجاعۃٌ مؤنثۃٌ — وفی الاناث طریقُ البخل محمودٌ

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شعر بھی صاحب سبحۃ المرجان نے اُن کی طرف منسوب کئے ہیں۔ یہ دونوں شعر ابجد العلوم میں بھی ملتے ہیں۔ ؎

ومہجتی غادۃٌ قالت لجارتہا — شخصٌ اراہ خلیعاً فارغ البالِ
یحومُ کلَّ اوانٍ حولَ منزلنا — انّی لأمقتُہ فی اشنعِ الحالِ

مراجع

آزاد ص ۵۵-۵۶ الابجد ص ۹۱۰-۹۱۱ التذکرۃ ص ۹۸-۹۹
الحدائق ص ۲۶۰-۲۶۱ السبحۃ ص ۹۰-۹۲ المآثر ص ۱۳۳-۱۴۰
المشاہیر ۲: ۲۰۲ النزہۃ ۶: ۱۱۸-۱۱۹

شیخ سید محمد یوسف بلگرامی

۱۱۱۶ھ — ۱۱۸۲ھ

سید محمد یوسف بن سید محمد اشرف بلگرامی نے درسی کتب سید طفیل محمد اترولوی سے پڑھ کر، لغت اور سیرت نبوی کا علم سید عبدالجلیل بلگرامی سے اور عربی ادب سید محمد بلگرامی سے حاصل کیا۔ وہ سید غلام علی آزاد کے ہم عصر اور ہم سبق بھی تھے۔ چنانچہ آزاد نے انہیں " أخی و حبیبی " کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے سید لطف اللہ بلگرامی سے بیعت بھی کی اور فرقۂ قادریہ میں شامل ہو گئے اور نثر میں اُن کی طرف چند کتب منسوب کی جاتی ہیں۔ اُن میں سے " الفرع النابت من الأصل الثابت " کے نام سے ایک کتاب اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں بڑا اہم سمجھی جاتی ہے۔ اُن کا عربی نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ؎

لَاحَتْ لَنَا رَوْضَةٌ رَاقَتْ مَبَاسِمُهَا ... وَعَارَضَتْ فِي سَنَا بَرْقِ الْيَعَالِيلِ
فَلَا تَخَلْ تِلْكَ أَنْوَارًا بَسَمْنَ لَنَا ... هُنَّ الْمَصَابِيحُ فِي جُمْرِ الْقَنَادِيلِ

صاحب ترجمہ کا مولد اور مدفن شہر بلگرام ہے۔

مراجع

آزاد ص ۶۱-۶۲ الابجد ص ۹۱۸-۹۱۹ التذکرۃ ص ۲۱۹-۲۲۰
الحدائق ص ۲۶۵ زبید ص ۲۴۸ السبحۃ ص ۹۹-۱۰۱
المآثر ص ۲۸۴-۲۸۵ النزہۃ ۶: ۴۲۴

شیخ الاسلام ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی

(۱۱۱۴ھ — ۱۱۷۶ھ)

احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین المعروف شاہ ولی اللہ محدث، دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد شیخ عبدالرحیم دہلی میں مدرسہ رحیمیہ کے بانی تھے۔ شاہ ولی اللہ بچپن سے ہی نہایت شریف، ذہین اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور چودہ (۱۴) یا پندرہ (۱۵) سال کی عمر میں تمام ظاہری علوم میں ماہر ہو گئے۔ پھر آپ نے اپنے والد بزرگوار کے دست حق پرست پر سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کر لی۔

علم حدیث کی تکمیل کے لئے وہ شیخ محمد افضل سیالکوٹی کی مجلس میں حاضر ہوتے رہتے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد مدرسۂ رحیمیہ میں نقلی و عقلی علوم کا درس دیتے رہے۔ ۱۱۴۳ھ میں وہ فریضۂ حج کے لئے اپنے ماموں شیخ عبداللہ اور ماموں زاد بھائی شیخ محمد عاشق کے ہمراہ روانہ ہو گئے اور ۱۱۴۵ھ میں وہاں سے واپس آئے۔ ان دو سالوں میں علماء حرمین کے علاوہ کچھ اور بزرگوں سے بھی اکتساب فیض کیا۔

برصغیر پاک و ہند میں علوم اسلامیہ کی تاریخ میں آپ کا کوئی ثانی پیدا نہ ہو سکا۔ آپ کے علمی کارناموں کی اہمیت اور مقدار کا صحیح طور پر جائزہ لینا بہت مشکل کام ہے۔ صرف عربی میں ہی بیس سے اوپر کتابیں انہوں نے تصنیف کیں اور تقریباً اسی قدر فارسی زبان میں کتابیں لکھیں۔ آپ کی کتابیں تفسیر قرآن، علم حدیث، علم فقہ، اصول تفسیر، علم العقائد اور اصول دین پر مشتمل ہیں۔ آپ کی نہایت اہم تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ جس کے کئی ایڈیشن اور تراجم بھی طبع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں شریعت اسلامی کی حکمت و فلسفہ اور اسرار و رموز کو واضح کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ نبی ﷺ اپنی امت کے لئے اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ تھے اور آپ کی خلافت یا جانشینی علماء امت کی طرف منتقل ہو گئی۔ آپ کی خلافت کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو ظاہری اور دوسرے باطنی، سو ظاہری خلافت تو حکومت کرنے والوں کی طرف منتقل ہو گئی لیکن باطنی خلافت علماء کرام کی جماعت کو عطا کی گئی اور ان کا فرض ہے کہ اصلاح امت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شیوہ بنائیں۔ شاہ صاحب کا منصب چونکہ نبی ﷺ کی خلافت باطنی تھا اسلئے وہ عمر بھر اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے رہے اور اس طرح اہل حق علماء کی ایک جماعت تیار ہو گئی، جو آپ سے مستفید ہو کر ملت اسلامیہ کی خدمت انجام دیتی رہی۔ اس

جماعت میں کچھ افراد تو آپ کے خاندان ہی سے تھے۔ جیسے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل شہید اور کچھ لوگ اس جماعت میں ایسے بھی تھے جو آپ کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے مثلاً قاضی ثناء اللہ پانی پتی، خواجہ محمد امین، رفیع الدین مرادآبادی، شاہ محمد اسحٰق دہلوی، سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہ۔

نثر میں تصنیف و تالیف کے علاوہ آپ کے اشعار بھی کچھ کم اہم نہیں۔ آپ کے اشعار کے عربی دیوان کو آپ کے فرزند شیخ عبدالعزیز نے جمع کیا اور شیخ رفیع الدین نے اسے مرتب کیا۔ آپ کے عربی اشعار لفظی اور معنوی نقطۂ نظر سے نہایت فصیح و بلیغ ہیں۔ آپ کا ایک نعتیہ قصیدہ "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" مطبع صدیقی میں ملتا ہے۔ یہ ایک بائیہ قصیدہ ہے، جس کی شرح شاہ صاحب نے خود فارسی زبان میں لکھی ہے۔ نمونہ کے طور پر اس قصیدہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

كَأَنَّ نُجُوْمًا أَوْمَضَتْ فِي الْغَيَاهِبِ ... عُيُوْنُ الْأَفَاعِيْ أَوْ رُؤُوْسُ الْعَقَارِبِ

تَطَلَّبْتُ هَلْ مِنْ نَاصِرٍ أَوْ مُسَاعِدٍ ... أَلُوْذُ بِهٖ مِنْ خَوْفِ سُوْءِ الْعَوَاقِبِ

فَلَسْتُ أَرٰى إِلَّا الْحَبِيْبَ مُحَمَّدًا ... رَسُوْلَ إِلٰهِ الْخَلْقِ جَمَّ الْمَنَاقِبِ

مَلَاذُ عِبَادِ اللّٰهِ مَلْجَأُ خَوْفِهِمْ ... إِذَا جَاءَ يَوْمٌ فِيْهِ شَيْبُ الذَّوَائِبِ

سُلَالَةُ إِسْمٰعِيْلَ وَالْعِرْقُ نَازِعٌ ... وَأَشْرَفُ بَيْتٍ مِنْ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبِ

بِشَارَةُ عِيْسٰى وَالَّذِيْ عَنْهُ عَبَّرُوْا ... بِشِدَّةِ بَأْسٍ بِالضَّحُوْكِ الْمُحَارِبِ

وَدَعْوَةُ إِبْرَاهِيْمَ عِنْدَ بِنَائِهٖ ... بِمَكَّةَ بَيْتًا فِيْهِ نَيْلُ الرَّغَائِبِ

وَأَحْسَنُ خَلْقِ اللّٰهِ خَلْقًا وَخِلْقَةً ... وَأَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ عِنْدَ النَّوَائِبِ

تَرٰى أَشْجَعَ الْفُرْسَانِ لَاذَ بِظَهْرِهٖ ... إِذَا احْمَرَّ بَأْسٌ فِيْ بَئِيْسِ الْمَوَاجِبِ

وَمَا زَالَ طُوْلَ الْعُمْرِ لِلّٰهِ مُعْرِضًا ... عَنِ الْبَسْطِ فِي الدُّنْيَا وَعَيْشِ الْمَطَايِبِ

أَتَانَا مُقِيْمُ الدِّيْنِ مِنْ بَعْدِ فَتْرَةٍ ... وَتَحْرِيْفِ أَدْيَانٍ وَطُوْلِ مَشَاغِبِ

فَأَوْضَحَ مِنْهَاجَ الْهُدٰى لِمَنِ اهْتَدٰى ... وَمَنَّ بِتَعْلِيْمٍ عَلٰى كُلِّ رَاغِبِ

فَأَشْهَدُ أَنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَ عَبْدَهٗ ... بِحَقٍّ وَلَا شَيْءٌ هُنَالِكَ بِرَائِبِ

وَكَمْ مِنْ مَرِيْضٍ قَدْ شَفَاهُ دُعَاؤُهٗ ... وَإِنْ كَانَ قَدْ أَشْفٰى لِوَجْبَةِ وَاجِبِ

وَكَلَّمَهُ الْأَحْجَارُ وَالنَّجْمُ وَالْحَصَى ۔۔۔ وَتَكْلِيمُ هٰذَا النَّوْعِ لَيْسَ بِرَائِبِ

وَشَقَّ لَهُ جِبْرِيْلُ بَاطِنَ صَدْرِهٖ ۔۔۔ لِغَسْلِ سَوَادٍ بِالسُّوَيْدَاءِ لَازِبِ

رَؤُفٌ رَحِيْمٌ أَحْمَدُ ذُوْ مُحَمَّدٌ ۔۔۔ مُقَفًّى وَمِفْضَالٌ يُسَمّٰى بِعَاقِبِ

جَزَى اللّٰهُ أَصْحَابَ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ ۔۔۔ جَمِيْعًا كَمَا كَانُوْا لَهٗ خَيْرَ صَاحِبِ

وَآلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا زَالَ أَمْرُهُمْ ۔۔۔ قَوِيْمًا عَلٰى إِرْغَامِ أَنْفِ النَّوَاصِبِ

فَمَنْ شَاءَ فَلْيَذْكُرْ جَمَالَ بُثَيْنَةٍ ۔۔۔ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَغْزِلْ بِحُبِّ الرَّبَائِبِ

سَأَذْكُرُ حُبِّيْ لِلْحَبِيْبِ مُحَمَّدٍ ۔۔۔ إِذَا وَصَفَ الْعُشَّاقُ حُبَّ الْحَبَائِبِ

وَتُدْرِكُنِيْ فِيْ ذِكْرِهٖ قُشَعْرِيْرَةٌ ۔۔۔ مِنَ الْوَجْدِ لَا يَحْوِيْهِ عِلْمُ الْأَجَانِبِ

وَصَلّٰى عَلَيْكَ اللّٰهُ يَا خَيْرَ خَلْقِهٖ ۔۔۔ وَيَا خَيْرَ مَأْمُوْلٍ وَيَا خَيْرَ وَاهِبِ

فَأَشْهَدُ أَنَّ اللّٰهَ رَاحِمُ خَلْقِهٖ ۔۔۔ وَأَنَّكَ مِفْتَاحٌ لِكَنْزِ الْمَوَاهِبِ

وَأَنْتَ مُجِيْرِيْ مِنْ هُجُوْمِ مُلِمَّةٍ ۔۔۔ إِذَا أَنْشَبَتْ فِي الْقَلْبِ شَرَّ الْمَخَالِبِ

مراجع

الابجد ص ۹۱۳–۹۱۴	الاتحاف ص ۴۲۸–۴۳۲	تاریخ ادبیات ۲: ۳۴۱–۳۵۴
التذکرۃ ص ۲۵۰–۲۵۲	الثقافۃ ص ۴۶	الحدائق ص ۴۶۵–۴۶۷
شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	زبید ص ۳۲–۳۴، ۱۲۳–۱۲۵	المحبوب ص ۱۲–۱۳
المشاہیر ۱: ۲۷۹–۲۸۰	مقدمۃ الحجۃ	النزهۃ ۶: ۳۹۸–۴۱۵

اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم

شیخ محمد بن عبد الجلیل بلگرامی

(۱۱۰۱ھ — ۱۱۸۵ھ)

الشیخ محمد بن عبد الجلیل بلگرامی ۔ یہ اپنے والد شیخ عبد الجلیل بلگرامی کے صحیح معنی میں وارث تھے ۔ اُن کے اساتذہ میں اُنکے اپنے والد کے علاوہ شیخ طفیل محمد حسینی اترولوی کے نام اہم ہیں ۔ وہ فرخ سیر کے دور میں عسکر اور سیوستان کی بخشیگری اور وہاں کے سوانح قلمبند کرنے پر مامور تھے ۔ انہوں نے عربی نثر میں "المستطرف"

(تصنیف زین الدین محمد بن الحسن) کا ایک خلاصہ تیار کیا اور فارسی میں "تبصرۃ الناظرین" کے نام سے ایک تاریخ مرتب کی۔ نظم میں وہ الفاظ و محاورات کے ساتھ کھیلنے کا شوق رکھتے تھے۔ اُن کے عربی کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

قَالَتْ فَتَاۃٌ لِسَلْمَیٰ یَا صُوَیْحِبَتِیْ — ہَیِّیْ لِعَاشِقِکِ الْمِسْکِیْنِ تَسْکِیْنَا
قَالَتْ تُجِیْبُ لِأَنْ یُحْیِیْکَ مُکْتَئِبٌ — لَنَحْمِلَنَّ عَلَیٰ شَیْءٍ تَعَوَّدَ لِیْنَا

مراجع

آزاد ص ۵۳ — الابجد ص ۹۰۹-۹۱۰ — زبید ص ۲۴۸
السبحۃ ص ۸۸-۸۹ — الآثر ص ۲۸۱-۲۸۴ — النزھۃ ۶: ۲۶۱

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی

(۱۱۱۰ھ — ۱۲۰۰ھ)

الشیخ غلام علی بن نوح الحسینی الواسطی البلگرامی ہندستان کے عربی شاعروں میں سب سے زیادہ اہم اور مشہور سمجھے جاتے ہیں، جس طرح ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی شاعر امیر خسرو کو مانا گیا ہے۔

آزاد کے آباؤ اجداد کئی پشتوں سے ہندوستان ہی کے باشندے تھے۔ ان کی پیدائش بلگرام میں ہوئی اور ابتدائی درسی تعلیم انہوں نے شیخ طفیل محمد اترولوی سے اور حدیث اور لُغت کا فن اپنے نانا عبدالجلیل بن میر احمد بلگرامی سے پڑھا۔ علم عروض میں مولانا محمد بن عبدالجلیل اُن کے استاد تھے۔ طریقت میں وہ شیخ لطف اللہ الحسینی کے مرید تھے۔

انہوں نے ۱۱۵۱ھ میں حج کے ارادے سے حجاز کا سفر کیا اور مدینہ منورہ میں انہوں نے شیخ محمد حیات سندی سے صحیح بخاری پڑھ کر اس کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ ۱۱۵۲ھ میں حج سے واپس آکر انہوں نے اورنگ آباد میں قیام کیا۔

آزاد نے اپنے عربی کلام کے کئی دیوان اپنی یادگار چھوڑے اور اُن کا انتخاب "سبعہ سیارہ" کے نام سے شائع ہوا۔ نبی ؐ کی مدح میں انہوں نے کئی قصیدے لکھے۔ اس طرح انہوں نے بجا طور پر "حسان الہند" کا لقب حاصل کیا۔

مدینہ منورہ کے علماء نے جب آزاد کی کچھ نعتیں سُنیں تو اُن کی بہت تعریف کی اور اُن کو اپنا

کو حرم شریف میں آویزاں کر دیا گیا۔ عبد الوہاب طنطاوی جو مکہ کے ایک مشہور عالم تھے۔ علم حدیث میں آزاد کے استاد تھے۔ انھوں نے جب اپنے شاگرد کے قصائد سُنے تو اُن کی بہت تعریف کی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنا تخلص آزاد کرتے ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اُٹھے۔ " سیدی انت من عتقاء اللّٰہ " ۔

آزاد فطری شاعر تھے اور اُن کے اشعار ہر قسم کی فحش گوئی سے پاک تھے۔ انھوں نے ایک سو سے اوپر اشعار کی ایک نظم لکھی جس میں اپنے محبوب کا سراپا بیان کیا۔ اس نظم کو " مرآۃ الجمال " کا نام دیا۔ اپنے محبوب کے ہر عضو کی تعریف میں دو دو شعر کہے۔ ہندوستان کے مشہور عالم نواب صدیق حسن نے اُن کی اس نظم کو اپنی کتاب " نشوۃ السکران " میں شامل کیا اور کہا ہے کہ عربی میں یہ اس قسم کی پہلی نظم ہے۔

آزاد کی عربی شاعری بیرونِ ہند کیوں مقبول نہ ہوئی ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب اور ہند کے درمیان علمی و ادبی تحقیقات کے باہمی تبادلہ کی وہ سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اسکے علاوہ یہ ہر مُلک کا دستور ہے کہ وہ اپنی زبان کے غیر ملکی شعراء کے کلام کو اتنی اہمیت نہیں دیا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو اور فیضی کے کلام کی اتنی قدر و منزلت ایران میں نہیں ہوئی جو ہندوستان میں ہے۔

غلام علی آزاد کی شاعری میں تخیل اور تصوّر کی فراوانی ہے۔ چونکہ اُس دور میں فارسی شاعری کا بھی ہندوستان میں بہت چرچا تھا اسلئے آزاد کی عربی شاعری میں فارسی اثرات کا اثر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد کا خیال ہے کہ زبان کی خوبیوں اور معنوی صلاحیت کے اعتبار سے آزاد کی عربی شاعری متنبی کی عربی شاعری سے کم درجہ پر ہے۔ آزاد نے اظہارِ خیال کے لئے اشارہ و کنایہ اور لفظی صنائع و بدائع کا بہت استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت ہندوستان کے اُس دور کے ادیبوں اور شاعروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ چنانچہ امیر خسرو کی "اعجازِ خسروی" اور "قران السعدین" بھی لفظی صنائع و بدائع سے پُر ہے۔ آزاد نے عربی شاعری میں فارسی شاعری کی بہت سی اقسام کا تتبع کیا ہے۔ چنانچہ اُن کے عربی کلام میں قصائد کے علاوہ رباعی، مثنوی اور مستزاد کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اُن کی ایک نظم "مظہر البرکات" ایک عربی مثنوی ہے جو خالص فارسی بحر میں لکھی گئی ہے۔ نواب صدیق حسن نے "ابجد العلوم" میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔ آزاد نے نظم کے علاوہ نثر میں بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا مثلاً شرح صحیح بخاری، شفاء العلیل فی المؤاخذات علی المتنبی، سروِ آزاد، خزانۂ عامرہ، مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام اور سبحۃ المرجان وغیرہ

مؤخر الذکر دونوں کتابوں میں آزاد نے اپنے حالات بھی مختصراً درج کئے ہیں۔ انہوں نے اورنگ آباد میں انتقال کیا۔ اُن کی تاریخ وفات "آہ غلام علی آزاد" (۱۲۰۰ھ) سے نکلتی ہے۔ آزاد کے عربی کلام کا نمونہ مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:

أودت علیلا لقاء منک یکفیه — وطرفک الناعس المراض یشفیه
کتمت حالی عن العذال مجترها — ما کنت أدری نحول الجسم یفشیه
دعی الاله سقامی لو یعالجنی — أجبته بدواء الختم من فیه
شأن المحب عجیب فی صبابته — الهجر یقتله والوصل یحییه
لوائمی قطعت أکبادهن متی — رأینه فی کمال الحسن والتیه
یا صواحب أکباد مقطعة — فذلکن الذی لمتننی فیه

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

برق أضاء من الزوراء یشجینی — یا رب ما باله یبکی ویبکینی
أنی لسان یؤدی شکر أنعمه — بالماء والنار یهوینی ویؤوینی
لا أبتغی أن ترانی ملء مقلتها — لحظ قلیل من العینین یکفینی
ما لاح منی قصور فی محبتها — بأی ذنب وقاها الله تقلینی

مراجع

آزاد ص ۶۶–۶۸ — الابجد ص ۹۲۰–۹۲۲ — الاتحاف ص ۳۳۰–۳۳۵
الاعلام ۵: ۳۱۴ — تاریخ ادبیات ۲: ۳۵۸–۳۶۵ — التذکرہ ص ۱۵۴–۱۵۵
الثقافة ص ۴۵–۴۶ — الحدائق ص ۴۷۳–۴۷۴ — زبید ص ۱۸۹، ۲۱۱–۲۱۴
السبحة ص ۱۱۸–۱۲۳ — العارفین ۱: ۷۷۰ — الآثر ص ۱۴۲–۱۴۴
المحبوب ص ۸۵۷–۸۵۸ — الشامیم ۱: ۳ — المقالات ۵: ۱۱۹
المؤلفین ۷: ۳۲ — النزهة ۶: ۲۰۱–۲۰۵

قاضی عبد القادر اورنگ آبادی

(۱۱۴۳ھ — ۱۲۰۴ھ)

قاضی عبد القادر بن شرف الدین (بقول صاحب نزہۃ الخواطر شریف الدین) کے اسلاف نیشاپور سے ہجرت کرکے لکھنؤ کے مضافات کنتور میں آبسے تھے ۔ قاضی عبد القادر کے والد ماجد شرف الدین خان نے شہر اورنگ آباد میں سکونت اختیار کی اور یہیں اُن کے ہاں قاضی عبد القادر پیدا ہوئے ۔ انہوں نے قرآن مجید حفظ کرنے کے علاوہ مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ شیخ فخر الدین النائطی سے حاصل کئے اور علوم ادب میں سید غلام علی آزاد بلگرامی کا تلمذ اختیار کیا ۔ اُن کے والد اورنگ آباد کے قاضی تھے ۔ والد کی وفات کے بعد شیخ عبد القادر نے بھی تین سال تک وہاں کی قضا کا عہدہ سنبھالے رکھا ۔ پھر وہ مدراس کو چلے گئے اور اس کے مضافات میلاپور میں وفات پائی ۔ عربی میں کچھ تصانیف کے علاوہ وہ عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے ۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے اُن کی تصانیف پچاس سے زائد بتائی ہیں اور عربی کلام کا حسب ذیل نمونہ پیش کیا ہے ؎

لِلصَّبِّ مُهْجَةُ التَّجْدِ يَقْتُلُهُ — تُصْمِيهِ وَهُوَ بِطِيبِ الْقَلْبِ يَقْبَلُهُ

اَلْعِشْقُ مِنْ حَضْرَةِ الرَّحْمٰنِ مُوْهِبَةٌ — فَكَيْفَ صَاحِبُ نُوْرِ الْعَقْلِ يُهْمِلُهُ

حَلَّ الْهَوٰى بِفُؤَادِيْ يَوْمَ ذِيْ سَلَمٍ — مُبَارَكٌ مِنْ جَنَابِ الْحَقِّ مَنْزِلُهُ

لَمْ يَدْرِ لَذَّةَ هَمِّ الْعِشْقِ عَاذِلُنَا — لَوْ ذَاقَ مِنْهَا قَلِيْلًا لَيْسَ يُهْمِلُهُ

قَلْبِيْ يَذُوْبُ وَ اَجْفَانِيْ تَسِيْلُ غَدًا — مِنَ الْهَوٰى زَادَهُ الرَّحْمٰنُ اَوَّلُهُ

لَمْ يَسْتَطِعْ حَمْلَ اَثْقَالِ الْهَوٰى جَبَلٌ — فَكَيْفَ صَبٌّ ضَعِيْفُ الْجِسْمِ يَحْمِلُهُ

قَلْبِيْ يَحِنُّ اِلٰى غِزْلَانِ ذِيْ اِضَمٍ — حَمَامُ حَمَامُ يَا قَوْمِيْ اُعَلِّلُهُ

يَا اَيُّهَا الصَّبُّ طَوْرًا بِالظِّبَاءِ وَطَوْ — رًا بِالْمَهَا عَنْ خَيَالِ الْغِيْدِ اَشْغَلُهُ

مراجع

الابجد ص ۹۲۵ — التذکرۃ ص ۱۲۸ — الحدائق ص ۲۷۹

النزہۃ ۷: ۲۹۲-۲۹۳

سید مرتضیٰ حسینی زبیدی

(۱۱۴۵ھ ـــــ ۱۲۰۵ھ)

الشیخ مرتضیٰ ابن محمد بن قادری بن ضیاء اللہ الحسینی الواسطی البلگرامی مردم خیز شہر بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ پھر سندیلہ اور خیرآباد کے اساتذہ سے بھی علم حاصل کرکے دہلی کا سفر کیا۔ جہاں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ سے بھی استفادہ کیا۔ پھر بمبئی کے علاقہ سورت میں گئے اور شیخ خیرالدین بن زاہد کے پاس قریباً ایک سال قیام کیا۔ پھر حجاز ہوتے ہوئے یمن کے مشہور زبید میں وارد ہوئے اور وہاں کے علماء سے تکمیل علم کرکے مذاہب اربعہ کے مشائخ سے سند فراغت حاصل کی۔ اسی شہر کی طرف منسوب ہوکر وہ زبیدی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ مکہ معظمہ میں اُن کی ملاقات سید عبدالرحمٰن عیدروس سے بھی ہوئی اور انہوں نے انہیں مصر کی طرف سفر کرنے کا شوق دلایا۔ چنانچہ وہ وہاں بھی پہنچے اور وہاں کے مشہور شہروں میں مختلف علماء سے ملاقات کی۔ اُن کی قریباً سو (۱۰۰) سے اوپر تصانیف بتائی جاتی ہیں، جن میں سے کافی کتابوں کے نام نزھۃ الخواطر اور تذکرہ علمائے ہند از رحمٰن علی میں دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ لغت میں اُن کی تاج العروس کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ مجد الدین فیروزآبادی کی قاموس کی شرح ہے جو دس جلدوں میں ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ زبیدی نے ہر مادے کے آخر میں بعض مشہور اشخاص اور بلاد و امصار کا ایک جامع اور مختصر استدراک بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے قریباً پندرہ سال کے عرصہ میں مدوّن کی۔ نثر کے علاوہ اُن کے عربی کلام کے نمونے بھی ہمیں ملتے ہیں۔ انہوں نے مصر میں وفات پائی۔ نزھۃ الخواطر میں اُن کے دو نمونے دیئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

تَوَکَّلْ عَلیٰ مَوْلَاکَ وَاخْشَ عِقَابَہٗ — وَدَاوِمْ عَلیٰ التَّقْوٰی وَحِفْظِ الْجَوَارِحِ
وَقَدِّمْ مِنَ الْبِرِّ الَّذِیْ تَسْتَطِیْعُہٗ — وَمِنْ عَمَلٍ یَرْضَاہُ مَوْلَاکَ صَالِحِ
وَاَثْنِ عَلَی الْفَضْلِ الْجَمِیْلِ وَبَذْلِہٖ — اِلیٰ اَھْلِہٖ مَا اسْطَعْتَ غَیْرَ مُکَالِحِ
وَلَا تَسْمَعِ الْاَقْوَالَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ — فَلَا بُدَّ مِنْ مُثْنٍ عَلَیْکَ وَقَادِحِ

علاوہ اُن کے بے شمار تلامذہ کے سلطان عبدالحمید اول شاہ روم کا نام بھی اُن کے فیض یافتگان میں مذکور ہے، جنہوں نے زبیدی سے روایت حدیث کی اجازت لی۔ اس اجازت نامے کے ساتھ مرتضیٰ نے

سلطان کی خدمت میں حسب ذیل اشعار بھی لکھ بھیجے ؎

سَقَى اللّٰهُ رَبْعًا كَانَ لِيْ فِيْهِ مَرْبَعًا — وَمَغْنًى بِهِ غُصْنُ الشَّبِيْبَةِ أَيْنَعَا

وَحَيَّا مَقَامًا كَانَ لِيْ فِيْهِ جِيْرَةٌ — بِهِمْ كَانَ كَأْسِيْ بِالْفَضَائِلِ مُتْرَعَا

خَلِيْلَيَّ مَا لِيْ كُلَّمَا لَاحَ بَارِقٌ — تَكَادُ حَصَاةُ الْقَلْبِ أَنْ تَتَصَدَّعَا

وَإِنْ نَسَمَتْ رِيْحُ الصَّبَا مِنْ دِيَارِهِمْ — بَكَتْ أَعْيُنِيْ دَمْعًا يُسَاجِلُ أَدْمُعَا

مراجع

الابجد ص ۲۰۸–۲۲۲ — الاعلام ۷: ۲۹۷–۲۹۸ — تاریخ ادبیات ۲: ۳۶۵–۳۶۷

التذکرۃ ص ۲۲۴–۲۲۶ — الحدائق ص ۲۷۴–۲۷۹ — الخطط ۳: ۹۴

زبید ص ۱۰۲–۱۰۳، ۲۰۴ — العجائب ۲۰۸،۲ — النزھۃ ۷: ۴۰۴–۴۰۹

مولانا باقر بن مرتضیٰ مدراسی

(۱۱۵۸ھ — ۱۲۲۰ھ)

محمد باقر بن مرتضیٰ مدراس کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا اور پھر سید ابوالحسن سے حاصل کی۔ بعد ازاں ترچنا پلی چلے گئے اور شیخ ولی اللہ سے استفادہ کیا۔ انہوں نے مختلف علوم مثلاً فقہ، علم کلام، حدیث اور تفسیر وغیرہ کا وسیع مطالعہ کیا اور مناظرہ کی مجالس میں نمایاں کارنامے سر انجام دیئے۔ بیس سال کی عمر میں نواب محمد علی گوپاموی کے دربار میں انشاء پردازی پر مامور ہوئے۔ بعد ازاں وہ اُن کے مصاحب بن گئے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دینی علوم کو عربی سے ھندی (اردو) زبان میں ترجمہ کیا۔ اُن کی تصانیف عربی میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی جن کی فہرست صاحب نزھۃ الخواطر نے تفصیل سے دی ہے اور رحمٰن علی نے بھی چند کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ اُن کا ایک عربی دیوان بھی ہے لیکن مجھے کسی کتب خانے میں اس کا سراغ نہیں ملا۔ صاحب نزھۃ الخواطر نے ان کے کلام میں سے مختلف تین نمونے دیئے ہیں۔ مثلاً ؎

قَدْ صَيَّرَنِي الْهَوَى جُذَاذًا — يَا لَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا

أُرْبِيْتُ عَلَى الْحَدِيْدِ طبعًا ... بِالْقَطْعِ وَإِنْ حَكَيْتُ لاذا
إِنْ كُنْتَ رَضِيْتَ عَنْ صُدُوْدِيْ ... أَدْرَكْتُ مِنَ النَّوَى لَذَاذَا
أُلْفِيْتُ هَوَاكَ صَفْوَ عُمْرِيْ ... أَبْغِيْهِ وَإِنْ غَدَا وَآذٰى

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

فِيْ كَاظِمَةٍ أَوْ ذِيْ سَلَمٍ ... قَدْ ضَلَّ فُؤَادِيْ بِالسَّدَمِ
كَالرِّيْحِ تَجُوْلُ بِمُسْرَجِهٖ ... كَالنَّارِ يَلُوْحُ عَلٰى عَلَمِ
لَوْ شَاقَهٗ طُرَّتَهَا قَمَرٌ ... لَتَحَيَّرَ فِيْ جُنْحِ الظُّلَمِ
لَا أَدْرِيْ أَيْنَ مَحَلَّتُهَا ... فَبَقِيْتُ حَرِيْصًا كَالْوَجِمِ

انہوں نے شہر مدراس میں وفات پائی۔

مراجع

الأبجد ص ۹۲۴ - ۹۲۵ ... التذکرۃ ص ۱۸۸ ... الثقافۃ ص ۲۷
زبید ص ۲۴۸، ۲۷۷، ۲۸۳ ... النزھۃ ۷ : ۹۱ - ۹۵

شیخ قاضی احمد بن مصطفٰی گوپاموی

(— ۱۲۴۴ھ)

شیخ احمد بن مصطفٰی بن خیر الدین مختلف علوم مثلاً منطق، حکمت اور شاعری میں ممتاز تھے۔ ولادت اور تربیت گوپامو میں ہوئی۔ قرآن مجید کے حافظ بھی تھے۔ اپنے علاقہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس کا سفر کیا اور نواب والا جاہ سے ملے، جس نے انہیں گوپامو کے مدرسہ میں مدرس مقرر کر دیا اور وہ اس عہدہ پر مدت تک قائم رہے۔ بعد ازاں ترچناپلی کے شہر میں قاضی بنائے گئے۔ اُن کا فارسی دیوان اور کچھ عربی قصائد بھی موجود ہیں۔ صاحب نزھۃ الخواطر نے عربی کلام کے چار نمونے پیش کئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے ؎

تَغَيَّرَتِ الْمَوَدَّةُ فِي الرِّجَالِ ... وَشَاعَ الْحِقْدُ فِيْ أَهْلِ الْكَمَالِ
قَدِ انْهَدَمَتْ بِأَمْطَارِ الرَّزَايَا ... مَقَاصِيْرُ الْمُرُوْءَةِ وَالنَّوَالِ

وإن رقى الدهر ذو شرف ومجد — سوى محكوم ربات الحجال
فليس الآن يا نفس اكتساب — يعاون ما عدا اشد الرحال

اُن کی وفات مدراس میں ہوئی۔

مراجع

النزهة ۷ : ۳۵-۳۶

شیخ عبد العزیز دہلوی

(۱۱۵۹ھ — ۱۲۳۹ھ)

شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ بن عبد الرحیم۔ ان کی ولادت دہلی میں ہوئی اور انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ اُن کی وفات کے بعد شیخ نور اللہ بڈھانوی اور شیخ محمد امین کشمیری سے استفادہ کیا۔ علم حدیث میں انہوں نے امتیاز حاصل کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آخر عمر میں بہت سی بیماریاں لاحق ہو جانے کی وجہ سے تدریس کا کام انہوں نے اپنے دو بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے حوالے کر دیا۔ اُن کی مشہور کتابوں میں "بستان المحدثین" اور فارسی میں اصولِ حدیث کے موضوع پر ایک رسالہ "العجالة النافعة" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی علم حدیث، تفسیر، منطق اور حکمت پر اُن کی تصنیفات کا پتہ چلتا ہے۔ صاحب نزہة الخواطر نے لکھا ہے کہ علم تفسیر میں انہوں نے "فتح العزیز" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اُس کی صرف پہلی اور آخری دو جلدیں ملتی ہیں۔ باقی ہندوستان میں فتنہ و فساد کی نذر ہو گئیں۔ شعر گوئی میں بھی اُن کے نمونۂ کلام دستیاب ہوتے ہیں۔ صاحب نزہة الخواطر نے ایک نعتیہ قصیدہ کے علاوہ ایک اور قصیدہ کے بھی کچھ اشعار دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

يا سائرًا نحو بان الحي والأسل — سلم على ساكنة الأوطان ثم قل
ما زلت في بعدكم كالنار في شعل — والأرض في كسل والماء في ملل
أريد لمحة وصل أستضيء بها — في ظلمة الهجر ضاقت دونها حيلي
إني صليت على النبي وتذكرة — لأهل ودي وخلق الدهر لم يحل

نعتیہ قصیدہ کا ایک انتخاب بھی ملاحظہ ہو:

ألا يا عاذلي دم في ملامي — فإني لا أحول عن الغرام

فجفني ساهر ما دمت حيا — وقلبي هائم والدمع هامي

فيا ريح الصبا عطفا ورفقا — إلى ذاك الحمى بلغ سلامي

وقل يا أهل ودي في هواكم — مضى شهري وأيامي وعامي

أجرني سيدي من ضيم سقمي — أشد علي من وقع الحسام ا

فمدحك رقيتي وشفاء دائي — إذا ما خضت في لجج السقام ا

فمن لي بعد ما وهنت عظامي — إذا اشتد البلاء سواك حامي

وإن أك ظالما عظمت ذنوبي — فجودك سيدي ماحي الآثام ا

فقد أعطيت ما لم يعط خلق — عليك صلاة ربك بالسلام ا

اُن کا مزار شہر دہلی سے باہر اپنے آبائی مقبرہ میں ہے۔

مراجع

الابجد ص ٩١٢–٩١٨   الاتحاف ص ٢٩٦–٢٩٧   تاریخ ادبیات ٢ : ٣٧٨–٣٨٠

التذکرۃ ص ١٢٢   الثقافۃ ص ٤٦   الحدائق ص ٤٨٧–٤٨٨

زبید ص ٢٨٩   الصناديد ٤ : ٣٩–٤١   المحبوب ص ١٠٢–١٠٣، ٣٢٠

الشاهير ٢ : ٦٤–٦٥   النزهة ٧ : ٢٦٨–٢٧٦

شیخ رفیع الدین دہلوی

(ــــــ ١٢٣٩ھ)

شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی۔ ان کا نام عبدالوہاب تھا اور لقب رفیع الدین۔ ان کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی اور انہوں نے اپنے برادر بزرگ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ طریقت میں وہ شیخ محمد عاشق بن عبیداللہ کے مرید تھے۔ قریباً بیس سال کی عمر میں ہی وہ تدریس اور افتاء میں مشغول ہو گئے

اور اپنی قابلیت کا سکہ منوا لیا۔ وہ قرآن مجید کے اردو ترجمہ کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ گو انہوں نے اس کے علاوہ بھی مختلف علوم میں تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے اُن کے کلام کے دو نمونے دیئے ہیں۔ پہلا تو ایک نعتیہ قصیدہ ہے اور دوسرا نمونہ ایک نظم کا، صرف مطلع دیا ہے جو انہوں نے شیخ ابو علی ابن سینا فلاسفر کے قصیدۂ عینیہ کے جواب میں لکھا تھا۔ نعتیہ قصیدہ میں سے چند اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو

یَا اَحْمَدُ الْمُخْتَارُ یَا زَیْنَ الْوَرٰی   یَا خَاتِمًا لِلرُّسْلِ مَا اَعْلَاکَا

یَا کَاشِفَ الضَّرَّاءِ عَنْ مُسْتَنْجِدٍ   یَا مُنْجِیًا فِی الْحَشْرِ مَنْ وَالَاکَا

هَلْ کَانَ غَیْرُکَ فِی الْاَنَامِ مَنِ اسْرِیْ   فَوْقَ الْبُرَاقِ وَجَاوَزَ الْاَفْلَاکَا

وَاسْتَمْسَکَ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ رِکَابَهٗ   فِیْ سَیْرِهٖ وَاسْتَخْدَمَ الْاَمْلَاکَا

قصیدہ کے آخر میں یوں کہتے ہیں ؎

فَلَقَدْ اَتَیْتُکَ سَیِّدِیْ مُسْتَجْدِیًا   مِنْ سَیْبِکَ الْدَّارِ حُسْنَ وِلَاکَا

یَا لَیْتَنِیْ قَدْ فُزْتُ مِنْکَ بِنَظْرَةٍ   فِیْ بَدْرِ وَجْهٍ نَوَّرَ الْاَفْلَاکَا

صَلَّی عَلَیْکَ اللّٰهُ خَیْرَ صَلَاتِهٖ   وَالتَّابِعُوْنَ صُدُوْرُهُمْ بِهَوَاکَا

وَعَلٰی صَحَابَتِکَ الْکِرَامِ وَآلِکَ الْ   اَطْهَارِ مَا طَافَ السَّمَا بِحِمَاکَا

شاہ رفیع الدین کی تاریخ وفات اکثر مراجع میں یہی ہے لیکن صاحب حدائق الحنفیہ نے ۱۲۳۸ھ اور صاحب نزہۃ الخواطر نے ۱۲۳۳ھ بتائی ہے۔ اُن کا مزار شہر دہلی سے باہر اپنے والد اور دادا کے قریب ہے۔

مراجع

الابجد ص ۹۱۴-۹۱۵   تاریخ ادبیات ۲: ۳۸۳-۳۸۴   التذکرۃ ص ۶۶

الثقافۃ ص ۲۷۴   الحدائق ص ۴۸۷   زبید ص ۲۹۰

الصناوید ۴: ۵۲-۵۳   المحبوب ص ۳۴۰   المشاہیر ۱: ۲۶۴

النزهة ۷: ۱۸۲-۱۸۶

شیخ اوحد الدین بلگرامی

(ـــــــــ ۱۲۵۰ھ)

شیخ اوحد الدین بن علی احمد العثمانی نے شہر بلگرام میں پیدا ہو کر وہیں نشو و نما پائی۔ تحصیل علم کی خاطر ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً ٹونک، قنوج اور سہسوان وغیرہ کا سفر کیا۔ تکمیل علم کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا اور عربی زبان و ادب میں مختلف یادگاریں چھوڑیں۔ علم اللغت میں ان کی ایک کتاب "نفائس اللغات" ہے جس میں ہندوستانی الفاظ کے مقابلے میں فارسی اور عربی لغات دی گئی ہیں۔ عربی شعر گوئی میں ان کا نمونۂ کلام صاحب نزہۃ الخواطر کے ہاں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

طَالَتْ بِوَيْلَاتِ النَّوَىٰ	تَلَفُ الْمَشُوقِ بِذِي الْجَفَا
يَا قَاتِلِيْ بِلِحَاظِهِ	لَحْظِيْ لِبُعْدِكَ مَا عَفَا
جُدْ لِيْ بِحُسْنِكَ قُبْلَةً	إِنِّيْ أَرَىٰ فِيهَا الشِّفَا

ایک اور نمونہ حسب ذیل ہے ؎

مَيَّاسَةُ الْقَدِّ مَا مَاسَتْ وَمَا خَطَرَتْ	إِلَّا وَقَلْبِيْ بِحَبْلِ الْوُدِّ قَدْ أَسَرَتْ
نَشْوَانَةٌ مِنْ رَحِيقِ الْحُسْنِ قَدْ سَفَكَتْ	دَمِيْ بِمُقْلَتِهَا عَمْدًا وَمَا حَذَرَتْ
خَرِيدَةٌ مَا رَنَتْ إِلَّا وَمُقْلَتُهَا	حُسَامُ لَحْظٍ عَلَىٰ عُشَّاقِهَا شَهَرَتْ

ایک اور قطعہ کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

يَا سَائِقَ الظُّعْنِ قُلْ لِيْ أَنْتَ مَا الْخَبَرُ	أَأَنْزِلُ الرَّكْبَ حَيْثُ الرِّيمُ وَالْعَفَرُ
أَمَامَ مَهْتَرِجِيْ فِيهِ لِيْ رَشَأٌ	تُكَلِّفُ الشَّمْسُ أَنْ تَحْكِيهِ وَالْقَمَرُ
غُصْنٌ رَطِيبٌ رَشِيقٌ نَاعِمٌ هَيَفٌ	شَمْسٌ إِلَىٰ وَجْهِهَا لَمْ يُمْكِنِ النَّظَرُ

مراجع

التذکرۃ ص ۳۰ — الثقافۃ ص ۲۸ — المحبوب ص ۱۳۱

النزھۃ ۷: ۸۸-۸۹

سید احمد بن الحسن قنوجی

(۱۲۴۶ھ — ۱۲۷۷ھ)

شیخ احمد بن الحسن بن علی البخاری القنوجی، علم حدیث اور دیگر علوم میں ممتاز تھے۔ ھندستان کے مختلف شہروں کے علماء سے استفادہ کرتے رہے اور کچھ مدت بڑودہ (سرزمین گجرات) میں شیخ غلام حسین قنوجی کے ہاں مقیم رہے۔ وھیں بیمار ہو کر مرض اسہال سے وفات پائی۔ صاحب نزھۃ الخواطر کا بیان ہے کہ وہ عربی اور فارسی شاعری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ "مسئلہ اجتہاد اور تقلید" کے موضوع پر "الشہاب الثاقب" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

۱۔ نسيم الصبا وافى سحيرا مطيبا — فقلت له أهلا وسهلا ومرحبا
كأنك أنفاس المسيح بعينها — فأحييت صبا لم يزل قط مطلبا
فديتك يا نعم الصبا خير مقدم — بكل حمام حين أقبلت رحبا
وتنفخ في الأشجار روحا تميلها — فيالك ما أزهاك صنعا وأعجبا

۲۔ ألا يا نسيم الروض بلغ تحيتي — إلى من حياتي عنده أو منيتي
لقد عمت البلوى لي اليوم في النوى — أما طاب حالي من عموم البلية
تقول رجال للزمان تغير — وما في بليات النوى من تفاوت

۳۔ ألا إن خير الزاد ما سد فاقة — وخير بلادي الذي لا أجمه
وإن الطوى بالعز أحسن يا فتى — إذا كان من كسب المذلة طعمه
وأعرض عن نيل الثريا إذا بدت — وفي نيله سوء المقام وذمه

مراجع

الأبجد ص ۹۳۶-۹۳۹ التذکرۃ ص ۱۲ الثقافۃ ص ۴۹

النزھۃ ۷: ۲۲-۲۵

مولانا فضل حق خیر آبادی

(۱۲۱۲ھ — ۱۲۷۸ھ)

مولانا فضل حق بن فضل امام بن محمد ارشد خیر آبادی الحنفی الماتریدی، علوم حکمیہ اور عربیہ کے ماہر تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے شیخ عبد القادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی سے حدیث پڑھی اور قرآن مجید حفظ کیا۔ وہ علم حکمت، بحث ومناظرہ، لغت اور عروض میں ماہر تھے۔ نظم بھی بہت اچھی کہتے تھے لیکن اُن کے اشعار تجنیس اور دوسرے محسناتِ لفظی کی کثرت کی وجہ سے طبیعت پر ناگوار ہوتے ہیں۔ اُن کے بیشتر قصائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور اہلِ کفر کی ہجو میں ہیں۔ دُور دُور سے طالبانِ علم اُن سے استفادہ کی خاطر آتے تھے۔ وہ عام علماء کے خلاف اپنا ظاہری لباس اور وضع قطع امیرانہ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شطرنج بھی کھیلتے اور رقص وسرود کی محفلوں میں بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ دہلی میں حکومت کے انشا پرداز مقرر تھے۔ لیکن ۱۲۷۳ھ میں اُن کے خلاف برطانوی حکومت کے خلاف خروج کرنے کا الزام لگا کر انہیں قید میں رکھا گیا اور جزائر سیلون میں جلا وطن کر دیا گیا۔ صاحب ابجد العلوم لکھتے ہیں کہ وہ بے شک علوم حکمیہ وفلسفہ میں اپنے زمانے کے امام تھے، لیکن وہ اہل حق کی بدگوئی کرنے اور اُن کے خلاف تعصّب رکھنے سے متّصف تھے۔ صاحبِ نزھۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلاف کے علوم اور دین کے بارے میں اُن کے صحیح مسلک سے زیادہ واقف نہ تھے۔ وہ بعض ایسی بدعتوں کی طرف مائل تھے جنہیں اہلِ تقلید پسند کرتے ہیں۔

انہوں نے عربی نثر میں کئی ایک کتابیں لکھیں جو عموماً علومِ حکمیہ وطبیعیہ سے متعلق ہیں۔ مثلاً "شرح سُلّم"، "الہدیۃ السعدیۃ" اور حقیقتِ وحدۃ الوجود وغیرہ۔ صاحبِ نزھۃ نے اُن کے عربی کلام کے کئی نمونے دیئے ہیں، مثلاً ؎

۱۔ إنْ لمْ تُصِبْ نَظْرَةٌ مِنْ أعْيُنٍ نُعُسٍ — فَمَنْ نَفَى النَّوْمَ مِنْ عَيْنَيْكَ فِي الغَلَسِ

مِنِ اشْتَكَامَ إليْهَا سَهَّدَتْهُ وَكَمْ — مِمَّنْ أنَامَتْهُ مِنْ يَقْظَانَ مُحْتَرِسِ

سَكَبْنَ وَصَبَّةً مَا زِدْنَ فِي سِنَةٍ — وَغُصَّةً فَرْهَا مَا زَادَ فِي الهَوَسِ

قَدْ حَسَّنَ الحُسْنُ مِنْهَا كُلَّ سَيِّئَةٍ — حَتَّى الجَفَاءِ وَسُوءِ الخُلْقِ وَالشَّرَسِ

۲۔ فُؤَادِيْ هَائِمٌ وَالدَّمْعُ هَامِيْ — وَسُهْدِيْ دَائِمٌ وَالجَفْنُ دَامِيْ

وَقَلْبٌ مَا فَتِئَ يَجُوْيٌ وَ يَرُعٌ — وَلَوْعٌ فِي اضْطِرَابٍ وَاضْطِرَامٍ

وَدَمْعٌ بَلْ دَمٌ صِرْفٌ جَرِيٌّ مِنْ — يَنَابِيْعٍ سَاجِمَاتِ انْسِجَامٍ

انہوں نے جزائر سیلون میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

مراجع

الابجد ص ۹۱۵/۹۲۳-۹۲۴ تاریخ ادبیات ۲: ۳۹۷-۳۹۹ التذکرۃ ص ۱۶۴-۱۶۵

الثقافۃ ص ۴۸ الحدائق ص ۴۹۷-۴۹۸ زبید ص ۳۶۸

الصادیہ ۲: ۶۲-۶۹ المحبوب ص ۱۸۱ النزھۃ ۷: ۳۷۶-۳۷۷

مولانا علی عباس چریاکوٹی

(ـــــ ۱۳۰۲ھ)

ان کے والد کا نام امام علی بن غلام حسین عباس چریاکوٹی تھا۔ وہ اعظم گڑھ کے مضافات میں قصبۂ چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا احمد علی چریاکوٹی سے حاصل کی اور شرح ھدایۃ الحکمۃ اُس زمانے کے منطقی عالم ابوالحسن سے پڑھی۔ پھر اپنے طور پر کتب کے مطالعہ میں لگ گئے۔ اُن کا ذہن بہت تیز اور حافظہ اچھا تھا۔ بڑے بڑے علماء بھی اُن کے سامنے لاجواب ہو جاتے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد کے درباری امراء کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور حیدرآباد پہنچ لیکن انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ جس پر انہوں نے انہیں امراء کی ہجو لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حَيْدَرْ آبَادُ اَهْوَنٌ وَلَا تَقُمْ — فِيْهَا قُوَادُ اُولِى الْمَكَارِمِ يَصْدَأُ

اس کے بعد وہ بھوپال میں سکندر بیگم کے دور میں مدتوں مقیم رہے اور اُس سے انعام و اکرام حاصل کرتے رہے۔ پھر اپنے وطن کو واپس آگئے حتیٰ کہ ریاست حیدرآباد کے وزیر شجاع الدولہ نواب تراب علی خان نے اُن کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور کافی دیر تک ریاست کی ملازمت کرنے کے بعد پنشن حاصل کی۔ انہوں نے نثر میں صرف و نحو اور منطق، عروض اور مناظرہ وغیرہ پر کتابیں لکھیں۔ اُن کے اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ یہ اشعار سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کتاب پر تقریظ کرتے ہوئے کہے گئے ہیں ؎

يَا مَنْ لَقَدْ كَانَ يَشْكُو ضَيْعَةَ الْأَدَبِ	أَبْشِرْ فَقَدْ زَاحَ مَا بِالنَّفْسِ مِنْ وَصَبِ
أَشْكَالُكَ تَأْلِيفُ شَيْخٍ لَوْذَعٍ فَطِنٍ	مَنْ لَا ضَهِيَّ لَهُ فِي الْعُجْمِ وَالْعَرَبِ
أَعْطَاهُ فِي ذَا الزَّمَانِ اللّٰهُ جَلَّ وَعَلَا	مِنَ الْمَفَاخِرِ مَا الْإِنْسَانُ لَمْ يَهَبِ
إِنْ شِئْتَ حُبَّ رَسُولِ اللّٰهِ فَادْلُ بِهِ	لَا بُدَّ لِلصَّرْحِ وَالْأَفْلَاكِ مِنْ عُشُبِ
فَيَا لَهَا مِنْ كِتَابٍ جَامِعٍ سِيَرَ الـ	ـرَّسُولِ أَرْسَلَهُ بِالصَّارِمِ الذَّرِبِ
لَا تَعْجَبُوا إِنْ عَلَا كُتُبَ الَّذِينَ مَضَوْا	فَإِنَّ فِي الْخَمْرِ مَعْنًى لَيْسَ فِي الْعِنَبِ

انہوں نے جریا کوٹ میں وفات پائی۔

مراجع

التذکرۃ ص ۱۲۴–۱۲۵ الثقافۃ ص ۴۸ زبید ص ۱۸۳

النزہۃ ۸ : ۳۳۰–۳۳۱

مولانا یعقوب نانوتوی

(۱۲۴۹ھ ۱۳۰۲ھ)

مولانا یعقوب بن مملوک علی صدیقی حنفی ہندوستان کے مشہور اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ضلع سہارنپور کے مضافات نانوتہ میں پیدا ہوئے اور قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد فارسی میں چھوٹے چھوٹے کئی رسائل پڑھے۔ ۱۲۵۹ھ میں وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ دہلی گئے اور وہاں علوم عقلیہ و نقلیہ پڑھتے رہے۔ اجمیر میں بھی انہوں نے کچھ عرصہ قیام کر کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۲۷۷ھ میں حج کی سعادت نصیب ہوئی اور واپسی پر دیوبند کے مشہور مدرسہ میں صدر مدرس مقرر کئے گئے اور آخر دم تک وہیں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپنے استاد شیخ امداد اللہ تھانوی کے ساتھ دوبارہ حج کو گئے۔ وہ زیادہ تر فقہ، حدیث اور ادب کی طرف مائل تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے۔

الْوَعْظُ يَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِكَمِ	فَالسَّيْفُ أَبْلَغُ وَعَّاظٍ عَلَى الْقِمَمِ
لَوْلَا كَمَا بَلَغَ الدُّنْيَا لِآخِرِهَا	وَآضَ كُلُّ وُجُودِ الدَّهْرِ فِي الْعَدَمِ

وَالسَّیفُ لِلخَصمِ اِعدامٌ بِھَیبَتِہٖ ‏ کَالبَدرِ یَجلُو الدُّجٰی بِالنُّورِ فِی الظُّلَمِ
بِھِمَّۃِ المَلِکِ المَنصُورِ مُنتَصِرٌ ‏ سَیفٌ لِیَشرَبَ دَمَ الکُفَّارِ کُلَّ ظَمِی
اَکرِم بِہٖ مَلِکًا لِلمُسلِمِینَ غَدَا ‏ کَھفَ الاَنَامِ مُزِیلَ الفَقرِ وَالعَدَمِ
الخَاقَانِ سُلطَانِنَا عَبدِ الحَمِیدِ غَدَا ‏ ذِی الجُودِ وَالفَضلِ وَالاِحسَانِ وَالکَرَمِ

انہوں نے نانوتہ میں ہی وفات پائی۔

مراجع

تاریخ دار العلوم ۲: ۱۷۱-۱۷۸ ‏ النزہۃ ۸: ۵۲۷-۵۲۵

مولانا فیض الحسن سہارنپوری

(۱۸۱۶ء — ۱۸۸۷ء)

مولانا فیض الحسن بن علی بخش بن خدا بخش القرشی الحنفی السہارنپوری، اپنے دور کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ علم نحو، لغت، ایام العرب اور شعر وغیرہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد رامپور کا سفر کیا اور مفتی صدر الدین آزردہ اور علامہ فضل حق خیرآبادی، جیسے علماء سے تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی میں آئے اور وہاں کے محدث شیخ احمد سعید بن ابو سعید العمری سے علم حدیث پڑھا۔ حکیم امام الدین سے بھی علم طب میں استفادہ کیا۔ پھر درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اور عمر کے آخری حصہ میں پنجاب یونیورسٹی کے کلیہ شرقیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کے شاگردوں میں سر سید احمد خان، علامہ شبلی، مولانا وحید الدین سلیم، مفتی عبد اللہ ٹونکی، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا اصغر علی روحی جیسے بزرگوں کو گنا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بہت سی کتابوں پر حواشی اور شروح تالیف کیں مثلاً حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ تفسیر جلالین، حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح، شرح دیوان الحماسہ، شرح المعلقات السبع، شرح حدیث ام زرع وغیرہ۔ اس کے علاوہ عربی شاعری میں بھی اُن کا ایک طبع شدہ دیوان دستیاب ہے۔ گو اُن کی تصانیف میں طباعت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ تاہم اُن کا طبع شدہ صورت میں موجود ہونا کافی مفید ہے۔ نمونے کے کلام حسب ذیل ہے ؎

۱۔ مَا لِی بِذِی الاَرضِ مِن کَالٍ وَّلَا وَاقٍ ‏ وَلَا طَبِیبٍ وَّلَا آسٍ وَّلَا رَاقٍ
وَلَا حَمِیمٍ وَّلَا جَارٍ وَّلَا سَکَنٍ ‏ وَلَا نَدِیمٍ وَّلَا کَاسٍ وَّلَا سَاقٍ

أبكي على بكاءٍ غيرِ منقطعٍ — فلينظرِ الناسُ أجفاني وآماقي

٢- حيِّ دارَ سلمى، فاسألن ثمّةَ أسلمي — وإن لم تجبني وإن لم تكلمي

سقاكِ غمامٌ ما بقيتِ هو اطلٌ — وآخرُ دعوانا انعمي ثمّةَ انعمي

٣- هل آنَ أن يتوبَ قلبٌ طروبٌ — عن ملاهٍ يهيمُ فيها قلوبُ

عن حسانٍ نواعمٍ وقيانٍ — غانياتٍ وكلِّ ما فيه حوبُ

كلُّ ما فيه مطمعٌ لشبابٍ — أُشربوا في قلوبهم ما يطيبُ

مراجع

تاریخ ادبیات ۲: ۲۰۲-۲۰۷ — الثقافة ص ۴۹ — النزهة ۸: ۳۶۶-۳۶۹

مجلۃ نقوش، فروری و لاهور — فروری ۱۹۶۲

قاضی طلا محمد پشاوری

(— ۱۳۱۰ھ)

قاضی طلا محمد بن قاضی محمد حسن بن محمد اکبر افغانی پشاوری، ہندوستان کے مشہور علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ فنونِ ادب میں یگانۂ روزگار تھے۔ اُن کے دادا افغانستان میں قاضی اور اُن کے بھائی عبد الکریم اور اُن کا ایک بھتیجا عبد القادر سب کے سب قاضی تھے اور خود شیخ طلا محمد کلکتہ میں دربار کے ملازم تھے اور اُن کا صاحبزادہ محمد اسلم برطانوی حکومت کے ملازمین میں سے تھا۔ قاضی طلا محمد نے اپنے اہلِ خاندان سے علم ادب پڑھا، علم حدیث میں وہ زمانے کے مشہور محدث سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ اُن کی ایک کتاب "نشأ الطرب فی أشواق العرب" ایک پُرلطف مجموعہ شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے مذہبِ سنت اور اس کے پیروؤں کی تعریف میں نہایت عمدہ شعر بھی کہے ہیں۔ اُن کا ایک ضخیم دیوان طبع شدہ صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

راحت سليمى فقلبي اليوم في قلقٍ — ومهجتي من لهيب الهجر في حرقِ

علياءُ في نسبٍ غيداءُ في طربٍ — لمياءُ في شنبٍ كحلاءُ في الحدقِ

إذا بدت في أناس قال قائلهم — سبحان من خلق الإنسان من علق

تبارك الله في حسن إذا طرحت — على المناكب فوديها ذوي الحلق

اپنے استاد سید نذیر حسین کی مدح میں کہتے ہیں ؎

أئمة أيد الله الكريم بهم — دين النبي نبي الجن والبشر

لولاهم ما عرفنا الدين من سفه — ولا أصبنا الهدى صفوا بلا كدر

فرحمة الله والرضوان يتبعها — عليهم ما بكى ورق على شجر

قوم هم أيدوا الإسلام واتبعوا — وحي السماء عن الجبار فاذكر

قاضی طلا محمد کی وفات مکہ معظمہ میں ہوئی اور وہیں کے قبرستان المعلاۃ میں دفن ہوئے۔

مراجع

النزهة ۸: ۱۹۹-۲۰۲

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی

(— ۱۳۲۲ھ)

مولانا ذوالفقار علی بن فتح علی الحنفی الدیوبندی علوم ادب میں مشہور شخصیت تھے۔ اُن کی پیدائش اور نشوونما دیوبند ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علم کی خاطر دہلی کا سفر اختیار کیا اور مولانا مملوک علی نانوتوی اور مفتی صدر الدین دہلوی کی خدمت میں کافی دیر رہ کر علم معانی، بیان، نحو اور شعر گوئی میں مہارت حاصل کی۔ حکومت کی طرف سے انہیں ابتدائی مدارس کا انسپکٹر مقرر کیا گیا اور وہ کئی سال تک اس عہدہ پر رہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر کہتے ہیں کہ میری دیوبند میں اُن سے ملاقات ہوئی، وہ اس وقت عمر کے درمیانی حصہ میں تھے اور میں نے مختلف فنون ادب میں بہت بڑا عالم محسوس کیا۔

تاریخ دار العلوم دیوبند کے بیان کے مطابق سرکاری ملازمت سے پنشن پانے کے بعد وہ دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوگئے۔ وہ دار العلوم کے اولین بانیوں میں سے تھے۔ اُن کا مزار مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمد احسن نانوتوی کے مزارات سے متصل ہے۔ اسی نکتہ کو مولانا فضل الرحمن عثمانی نے

ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

اے! نخسپ آسودہ تر مابین دو یاران خویش
قاسم بزم مودت، احسن شائستہ خو

انہوں نے شرح دیوان الحماسہ، شرح دیوان المتنبی، شرح سبع معلقات کے علاوہ علم بلاغت پر ایک کتاب لکھی۔ یہ سب کی سب اردو زبان میں ہیں۔ اسکے علاوہ بھی اُن کی تصانیف پائی جاتی ہیں۔

صاحب نزھۃ الخواطر نے ان کا ایک لمبا قصیدہ جو تقریباً ۵۵ اشعار پر مشتمل ہے نقل کیا ہے، جو سلطنت آلِ عثمان کے حاکم سلطان عبدالحمید ثانی کی مدح میں کہا ہے، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

يَا قَاسِيَ الْقَلْبِ يَا مَنْ لَجَّ فِي عَذَلِي ... إِلَيْكَ عَنِّي فَإِنِّي عَنْكَ فِي شُغُلِ
نَامَ الْخَلِيُّونَ فِي خَفْضٍ وَفِي دَعَةٍ ... وَقَدْ أَرِقْتُ بِدَمْعٍ سَائِلٍ هَطِلِ
كَالشَّمْسِ تَبْدُو جِهَارًا غَيْرَ خَافِيَةٍ ... وَلَا تَسَتَّرُ بِالْأَسْتَارِ وَالْكِلَلِ
رَنَتْ إِلَيَّ بِعَيْنَيْ جُؤْذَرٍ فَغَدَا ... قَلْبِي جَرِيحًا بِجُرْحٍ غَيْرِ مُنْدَمِلِ
إِنْ لَمْ تَتُبْ مِنْ جَفَاهَا قَدْ عَزَمْتُ عَلَى ... أَنْ أَسْتَغِيثَ بِسُلْطَانِ الْوَرَى الْبَطَلِ
عَبْدِ الْحَمِيدِ أَمَانِ الْخَائِفِينَ مُبِيـ ... ـدِ الظَّالِمِينَ شَدِيدِ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ
كَهْفِ الْأَنَامِ مُغِيثِ الْمُسْتَضَامِ لَهُ ... إِلَى أَقَاصِي الْمَعَالِي أَقْرَبُ السُّبُلِ
الْعَادِلِ الْبَاذِلِ الْمَرْهُوبِ سَطْوَتُهُ ... فِي الْجُودِ كَالْبَحْرِ بَلْ كَالْعَارِضِ الْهَطِلِ

مولانا ذوالفقار علی کی وفات دیوبند ہی میں ہوئی۔

مراجع

تاریخ دارالعلوم ۱: ۱۲۳-۱۲۷، ۲۱۰ — الثقافۃ ص ۵۰ — النزھۃ ۸: ۱۴۰-۱۴۳

مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی

(— ۱۳۲۷ھ)

ان کے والد کا نام مولانا علی اکبر عباسی چڑیاکوٹی تھا۔ اُن کی ولادت اور نشو ونما چڑیاکوٹ ہی میں

ہوئی۔ انہوں نے منطق اور علم حکمت اپنے برادرِ بزرگ مولانا عنایت رسول اور علم ہیئت شیخ رحمت اللہ بن نور اللہ لکھنوی، علم فقہ اور اصول فقہ مفتی یوسف بن محمد اصغر لکھنوی سے جونپور کے مدرسۂ امامیہ حنفیہ سے پڑھے۔ حجاز مقدس کو زیارتِ حرمین کے لئے گئے۔ مختلف شہروں میں درس و تدریس کے بعد آخر عمر میں شہر لکھنؤ کے دار العلوم میں مدرّس مقرر ہوئے اور چند سال اس خدمت پر مامور رہے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عربی کلام کا نمونہ صاحب نزہۃ الخواطر نے دیا ہے اس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں؎

هَنِيئًا لِلَّذِي جَابَ الْمَوَامِي ... وَرَامَ رُقِيَّ أَعْلَامِ الْكَمَالِ

عَلَى ظَهْرِ الْخُيُولِ يُقِيمُ يَوْمًا ... وَأَيَّامًا عَلَى قَتَدِ الْجِمَالِ

وَكَمْ بَحْرٍ يَسِيحُ بِغَيْرِ زَادٍ ... وَكَمْ أَرْضٍ يَجُوبُ بِلَا انْتِعَالِ

تَجَافَى زَهْرَةَ الدُّنْيَا نُفُورًا ... وَأَنْكَرَ جَمْعَ مَالٍ وَالْجَوَالِي

رِجَالٌ عَارِجِينَ ذُرَى التَّسَامِي ... بِأَقْدَامٍ عَلَتْ قُلَلَ التَّعَالِي

فَنَالُوا مَنْزِلًا وَلَقَدْ تَرَقَّوْا ... إِلَى مَا لَا يُنَالُ مِنَ الْمَنَالِ

مراجع

النزھۃ ۸: ۵۱ھ-۵۲ھ

مولوی نذیر احمد دہلوی

(۱۲۴۷ھ — ۱۳۳۰ھ)

ڈپٹی نذیر احمد بن سعادت علی بن نجابت علی اعظم پوری بجنوری شہر بجنور میں پیدا ہوئے اور وہاں کے عالم مولانا نصر اللہ الخویشگی سے ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کے مدرسہ میں زیر تعلیم رہے۔

۱۲۷۱ھ میں وہ پنجاب کے مشہور قصبہ گنجاہ ضلع گجرات میں مدرس رہے۔ دو سال اس خدمت کے بجا لانے کے بعد کانپور کے شہر میں بطور انسپکٹر مدارس ملازم ہوگئے اور انگریزی زبان بھی پڑھی۔ انہوں نے تعزیراتِ ہند کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، جو بہت مقبول ہوا۔ حیدرآباد دکن میں سلطنت آصفیہ کے وزیر نواب مختار الملک نے اُن کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور انہیں بعض علاقوں کا متولی بنایا۔ دس سال اس عہدے پر قائم رہنے کے بعد

وہ دہلی واپس آکر خانہ نشین ہو گئے۔ انہیں علوم عربی اور دیگر ادبی فنون میں اچھی دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے بڑی عمر میں قرآن مجید بھی حفظ کیا اور قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ لیکن اسکی تفسیر میں مرجوح اقوال کو فضیلت دی۔ اسلئے بعض اکابر اہل علم نے اس تفسیر کو ناپسند کیا۔ اُن کی کتاب امہات الامۃ پر بھی لوگوں نے کئی اعتراضات کئے۔ وہ ایک ماہر خطیب بھی تھے۔ انہوں نے سر سید احمد خان کی تحریک، تعلیم علوم جدیدہ کی پُرزور حمایت کی۔

جب امیر حبیب اللہ خان والیٔ افغانستان، ہندوستان میں آئے تو اتفاق سے وہ عید اور جمعہ کا دن تھا ڈپٹی نذیر احمد جب امیر سے ملے تو اُن کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

عِیْدٌ وَعِیْدٌ وَعِیْدٌ — وَجْہُ الْحَبِیْبِ وَیَوْمُ الْعِیْدِ وَالْجُمُعَہ

اس پر امیر حبیب اللہ نے اُن سے معانقہ کرتے ہوئے اُن کا بوسہ لیا اور اُن کی بہت تعریف کی۔

انہوں نے متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل اردو زبان میں لکھنے کے علاوہ "حقوق و فرائض"، "مراۃ العروس"، "توبۃ النصوح"، "بنات النعش" وغیرہ اخلاقی کتابیں تصنیف کیں۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے سر ولیم میور کی مدح میں اُن کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں ؎

تَمَنَّیْتُ اَنَّ الْقَلْبَ کَانَ لِسَانِیْ — یَبُوْحُ بِسِرٍّ تَحْتَوِیْہِ جَنَانِیْ
فَاِنِّیْ اِذَا مَا رُمْتُ اِظْہَارَ شُکْرِہٖ — تَقَاصَرَ عَنْہُ مَنْطِقِیْ وَبَیَانِیْ
وَلَمْ اَدْرِ قَطُّ مَنْ نَالَ غَایَۃً — تَخَلَّفَ عَنْہَا اَہْلُ کُلِّ زَمَانِ
دَعَانِیْ فَاَدْنَانِیْ وَاَعْلٰی مَحَلَّتِیْ — وَاَجْلَسَنِیْ مِنْ قُرْبِہٖ بِمَکَانِ

اُن کے عربی اشعار کا ایک نمونہ اس قصیدہ میں سے ہے جو امیر حبیب اللہ خان کی تشریف آوری کے وقت انہوں نے کہے تھے ؎

جُمِعَتْ فِیْکَ التُّقٰی وَالْمُلْکُ وَالْاَدَبَا — وَاللّٰہِ اِنَّا نَرٰی فِیْ شَانِکَ الْعَجَبَا
ذَکَّرْتَنَا الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدِیْنَ قَدَمْ — عَلَی الْہُدٰی وَاتَّبِعْ مِنْہَاجَہُمْ رَغَبَا
اِنَّا لَفِیْ زَمَنٍ فِیْ اَہْلِہٖ خَبَلٌ — لَا یَحْسَبُوْنَ اکْتِسَابَ الْعِلْمِ وَالطَّلَبَا
لَاسِیَّمَا الْمُسْلِمُوْنَ الْغَافِلُوْنَ وَہُمْ — یَہْجُوْنَ اَجْرًا وَلَا یَقْضُوْنَ مَا وَجَبَا
بِالْعَقْلِ وَالنَّقْلِ دُنْیَانَا مُکَدَّرَۃٌ — وَالدِّیْنُ فِیْنَا یُنَادِی الْوَیْلَ وَالْحَرَبَا

اُن کی وفات بعارضہ فالج دہلی میں ہوئی۔

مراجع

الثقافۃ ص ۵۲ النزھۃ ۸: ۲۹۳ء - ۲۹۷ء

مفتی عبداللہ ٹونکی

(— ۱۳۳۹ھ)

مفتی عبداللہ بن صابر علی مشہور قصبہ ٹونک میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پانے کے بعد تحصیل علم کے لئے مختلف علاقوں میں پھرتے رہے۔ چنانچہ مفتی لطف اللہ بن اسد اللہ سے استفادہ کرنے کے بعد سہارنپور کے محدث شیخ احمد علی بن لطف اللہ سے تلمذ کیا اور کچھ مدت کے لئے دہلی میں مولانا عبد الرب کے مدرسہ میں تدریس کا کام کرتے رہے۔ بعد ازاں لاہور میں یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں سالہا سال تک مدرس رہے۔ لاہور کے اہل علم اُن کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ کے دار العلوم میں مدرس رہنے کے بعد کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں تدریس کے فرائض بجا لاتے رہے لیکن جلد ہی انہیں مرض فالج کی وجہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔ جس پر وہ بھوپال میں اپنے صاحبزادے انوار الحق کے پاس چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

کتاب سلم العلوم کی شرح جو حمد اللہ کے نام سے مشہور ہے پر مفتی عبداللہ نے حواشی لکھے اور عربی میں ایک کتاب بنام "عجالۃ الراکب فی امتناع کذب الواجب" لکھی۔

صاحب نزھۃ الخواطر نے وزیر عبید اللہ خان ٹونکی کی مدح میں اُن کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ جس میں سے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

طَابَ الْأَصِيْلُ وَطَابَتِ الْأَسْحَارُ ... وَاخْضَرَّتِ الْأَنْجَادُ وَالْأَغْوَارُ

فِيْ كُلِّ نَحْوٍ رَوْضَةٌ وَقَرَارَةٌ ... جَادَتْ عَلَيْهَا دِيْمَةٌ مِدْرَارُ

فَشَقَائِقُ النُّعْمَانِ تَحْسَبُ أَنَّهَا ... قَبَسَاتُ نَارٍ تُوقَدُتْ أُوَارُ

وَالنَّاسُ فِيْ دَعَةٍ وَعَيْشٍ مُخْضَلٍ ... وَرَفَاهَةٍ لَا تَحْتَوِي الْأَقْدَارُ

فَسَأَلْتُهُمْ مَا بَالُ ذَا الْعَيْشِ الْهَنِيْ ... وَمَنِ الَّذِيْ انْقَادَتْ لَهُ الْأَقْدَارُ

قَالُوا أَلَمْ تَشْعُرْ بِقَتْلِهِمُ الَّذِي نَضَرَتْ بِحُسْنِ نِظَامِهِ الْأَمْصَارُ

كُهُفُ الْوَرَىٰ هٰذَا عُبَيْدُ الرَّحْمٰنِ خَشَعَتْ لَهُ الْأَصْوَاتُ وَالْأَبْصَارُ

مفتی عبداللہ مرحوم کے کچھ مزید حالات مولانا روحی کے اساتذہ کے بیان میں دیئے گئے ہیں۔

مراجع

النزهة ۸ : ۲۸۶ — ۲۸۷

مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(۱۲۷۲ھ — ۱۳۴۰ھ)

مفتی احمد رضا بن نقی علی بن رضا علی الافغانی البریلوی کا لقب عبدالمصطفیٰ تھا۔ شہر بریلی میں پیدا ہو کر ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی کہ بہت سے علوم بالخصوص علم فقہ اور علم اصول میں اپنے ہم عصروں سے فوقیت لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴ سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو گئے۔ ۱۲۸۶ھ میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سعادتِ حج حاصل کی اور علمِ حدیث کی سند سید احمد زینی دحلان شافعی مکی اور شیخ عبدالرحمٰن سراج مکی سے حاصل کی۔ پھر ہندستان میں واپس آکر تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد کئی بار حج کو جاتے رہے اور حرمین شریفین میں اقامت کے دوران بعض رسائل لکھے اور وہاں کے علماء سے مذاکرات کرتے رہے۔ وہ آپ کی وسعتِ معلومات اور کثرتِ علم سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ فقہی اور علم کلام کے مسائل میں نہایت مستحکم عقائد کے مالک تھے۔

محمد احمد قادری علی گڑھی نے فاضل بریلوی کے بارے میں نیاز فتحپوری کے تاثرات کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"نیاز فتح پوری صاحب نے کہا: ابتدائی زمانے میں مجھے عربی شاعری سے بھی ذوق تھا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے دور میں دار العلوم کے کتب خانہ میں مولانا احمد رضا خاں

صاحب کا ایک طویل عربی قصیدہ پڑا تھا جو " آمال الابرار " کے نام سے کتابی شکل میں مطبوع ہے۔ یہ قصیدہ مشہور ناقد پروفیسر کلیم احمد کے دادا حکیم عبدالحمید پریشان عظیم آبادی کے قصیدہ کے جواب میں مولانا بریلوی نے لکھا تھا۔ "

نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل گیارہ اشعار اس کتابچہ (پمفلٹ) میں دیئے گئے ہیں۔ یہ اشعار ریاست حیدرآباد دکن کے مشہور واعظ اور فقیہ مولانا سید محمد عمر حنبلی قادری کی وفات پر کہے گئے تھے۔ جن کی وفات ۱۳۳۰ھ میں ہوئی ہے۔

أَلَاسَقَى الْأَرْضَ أَبَدًا صَوْبُ غَادِيَةٍ	وَجَادَ بِالْجُودِ جُودًا وَهُوَ هَمَّارُ
قَبْرًا ثَوَى بِثَوَابِ اللّٰهِ مَضْجَعُهُ	مُحَمَّدٌ نُورُ الْهُدَى لِلدِّينِ عَمَّارُ
عَبْدٌ بِغَوْثِ الْبَرَايَا سَيِّدٌ سَنَدٌ	بِالْغَوْثِ مُعْتَرِفٌ بِالْغَيْبِ مِدْرَارُ
بِاللُّطْفِ مُعْتَصِمٌ بِالرَّأْفِ مُبْتَسِمٌ	بِالْعُرْفِ مُنْتَسِمٌ بِالْعُرْفِ مِعْطَارُ
سِرٌّ أَسَرَّ لَهُ فِي السِّرِّ أَسْرَارُ	بِرٌّ أَبَرَّ لَهُ فِي الْبِرِّ أَبْرَارُ
رِبْحٌ لِآلِ هُدًى حَرْبٌ لِأَهْلِ رَدًى	بَحْرٌ لِسَيْلِ نَدًى حَبْرٌ لِأَحْبَارِ
عِلْمٌ وَحِلْمٌ وَسِلْمٌ فِي تُقًى وَنُقًى	سِيَادَةٌ سُؤْدَدٌ وَفَضْلٌ وَإِيثَارُ
بِقُدْرَةِ اللّٰهِ تَمَّتْ تَامَدِيَتُهُ	فَزَادَهَا الْقَدْرُ وَالْمِقْدَارُ أَقْدَارُ
وَعَادَ حُبُّهُ حُبَّ الْحِبِّ فِي خَلَدِهِ	لِجَنَّةِ الْخُلْدِ أَنْهَارٌ وَأَنْوَارُ
حَمَاهُ عَنْ كُلِّ ضَيْرٍ مَنْ يُقَالُ لَهُ	حَامِي الْحَقِيقَةِ نَفَّاعٌ وَضَرَّارُ
قَالَ الرِّضَا أَسَفًا فِي عَامِ فُرْقَتِهِ	مُحَمَّدٌ عُمَرُ الْفَارُوقُ شَطَّارُ

مراجع

امام بریلوی   تاریخ ادبیات ۲ : ۲۰۷م   التذکرۃ ص ۱۵–۱۸

النزہۃ ۸ : ۳۸–۴۱

حکیم اجمل خاں دہلوی

(۱۲۸۴ھ — ۱۳۴۶ھ)

حکیم اجمل بن محمود بن صادق بن شریف الحنفی الدھلوی، علم طب میں ہندستان کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد شیخ عبدالحق مفسر، مولانا صدیق احمد دہلوی، مولوی عبدالرشید رام پوری وغیرہ سے تعلیم پائی۔ علم طب پر ابتدائی کتابیں اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی عبدالمجید خاں سے پڑھیں اور مدتوں تک بھائی کے جاری کردہ مدرسہ میں درس دیتے رہے۔ رام پور کے نواب حامد علی خان نے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور انہیں دربار میں رئیس الاطباء کا عہدہ پیش کیا۔ ایک مدت تک وطن قیام کرنے کے بعد وہ اپنے وطن میں واپس آ گئے اور امراضِ مستورات سے متعلق ایک ہسپتال کی بنیاد ڈالی۔ جہاں دایہ گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر وہ ہندستان سے باہر عراق اور بغداد وغیرہ کے مدارس اور شفاخانوں کی سیاحت کو چلے گئے۔ ہندستان میں طب کی وجہ سے اُن کا نام بہت مشہور ہوا۔ حتیٰ کہ برطانوی حکومت نے انہیں ۱۳۲۵ھ میں "حاذق الملک" کا خطاب عطا کیا۔ وہ یورپ کی سیاحت کو بھی گئے اور وہاں کے ہسپتالوں اور طریقِ علاج کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ علم طب میں اُن کی بے شمار تصانیف کا ذکر کتابوں میں موجود ہے۔ بعض طبی مسائل میں انہوں نے جمہور اطباء سے اختلاف بھی کیا ہے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے اُن کے عربی اشعار کا حسب ذیل نمونہ دیا ہے ؎

سُعَادُ سَافَرَتْ وَبَقِيتُ وَحْدِي — أُقَاسِي نَارَ هَجْرٍ وَابْتِعَادِ
وَكُنَّا فِي الْحَدِيقَةِ فِي اجْتِمَاعٍ — قَضَيْنَا بَعْدَ ذٰلِكَ بِانْفِرَادِ
فَغَابَتْ شَمْسُهَا فِي الْغَرْبِ حَتّٰى — بُهِتُّ وَعَيْنُهَا صَادَتْ فُؤَادِي
كَأَنِّي ذَاتَ لَيْلٍ فِي مَنَامِي — طَوِيلُ الْفَرْعِ مُجْتَمِعُ الْوِدَادِ

انہوں نے رام پور میں وفات پائی لیکن اُن کی نعش دہلی میں لا کر دفن کی گئی۔

مراجع

النزہۃ ۸: ۱۱-۱۲

مولانا سید انور شاہ کشمیری

(١٢٩٢ھ — ١٣٥٢ھ)

مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحؒ کے والد کا نام معظم شاہ الحسینی تھا وہ کشمیر کے ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا انور شاہ ایک پکے حنفی، فقیہ اور عالم حدیث تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور ١٣١٠ھ میں مدرسہ عالیہ دیوبند میں داخل ہو کر علامہ محمود الحسن دیوبندی اور مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ سے علوم متعارفہ کی تکمیل کی اور بعد کچھ مدت دہلی کے مدرسہ امینیہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ١٣٢٣ھ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور شیخ حسین بن محمد الجسر طرابلسی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ دیوبند واپس آ کر محض فی سبیل اللہ تدریس کا کام بجا لاتے رہے۔ ١٣٣٣ھ میں جب اُن کے استاد علامہ محمود الحسن حجاز مقدس کو گئے تو مولانا انور شاہ کو اپنا جانشین مقرر فرما گئے۔ اُس دور میں تدریسِ حدیث میں انہوں نے انتہائی کمال حاصل کیا اور ١٣ سال تک یہ خدمت بجا لاتے رہے۔ ١٣٤٦ھ میں مدرسہ عالیہ دیوبند کے حالات نا موافق ہونے لگے تو انہوں نے مدرسہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور سورت شہر کے مضافات قصبہ ڈابھیل میں آ گئے اور جامعہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی لیکن عارضۂ بواسیر کی وجہ سے یہ خدمت چھوڑنی پڑی اور آخر دیوبند واپس آ گئے جہاں انہوں نے وفات پائی۔

مولانا انور شاہ نے نثر میں کئی ایک کتابیں تصنیف فرمائیں اور بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے۔ عربی شعر بھی نہایت عمدہ کہتے تھے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے اُن کا وہ قصیدہ نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے استاد مولانا رشید احمد کی مدح میں کہا تھا۔ اس میں سے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

إمامٌ قدوةٌ عدلٌ أمينٌ	ونورٌ مستبينٌ كالنهارِ
فقيهٌ حافظٌ علمٌ شهيرٌ	كصبحٍ مستنيرٍ هديٌ سارِ
إليه المنتهى حفظاً وفقهاً	وأضحى في الرواية كالمدارِ
ففي التحديث رحلةُ كلِّ راوٍ	وفي الأخبار عمدةُ كلِّ قاري

آپ نے ستر اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ متنبئ قادیان کی نبوت کو باطل ثابت کرنے کے لیے کہا تھا۔ جیسا کہ آپ کی سوانح حیات مسمی بنقشِ دوام میں مذکور ہے۔ اس میں سے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

ألا یا عباد اللہ قوموا وقوموا — خطوبا ألمت ما لهن یدان

وقد کاد ینقض الهدی ومنارہ — وزعزع خیر ما لذاک تدان

یسب رسول من أولی العزم فیکم — تکاد السماء والأرض ینفطران

وحارب قوم ربهم ونبیهم — فقوموا لنصر اللہ إذ هو دان

لعمری لقد نبهت من کان نائما — وأسمعت من کانت له أذنان

علامہ انور شاہ کشمیری نے ردِّ مرزائیت پر نثر میں بھی دو کتابیں لکھی تھیں جن کا ذکر نقشِ دوام میں کیا گیا ہے۔ اُن میں سے ایک کتاب بنام "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام" کا ایک نسخہ مولانا روحی کے کتب خانہ میں موجود ہے جو شاہ صاحب نے انہیں ھدیۃً عطا فرمایا تھا۔

اُن کی وفات حسبِ بیان صاحبِ نزھۃ الخواطر اور صاحبِ نقشِ دوام و صاحبِ تاریخ دارالعلوم دیوبند بعارضۂ بواسیر دیوبند میں ہوئی۔ لیکن تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (دوسری جلد) میں لکھا ہے کہ اُن کی وفات ڈابھیل میں ہوئی۔

مراجع

تاریخ ادبیات ۲ : ۴۰۸ - ۴۰۹ تاریخ دارالعلوم ۲ : ۲۰۱ - ۲۰۷ النزھۃ ۸ : ۸۰ - ۸۴

نقشِ دوام ۲۵۲ - ۲۵۳

مولانا کفایت اللہ دہلوی

(۱۲۹۲ھ — ۱۳۷۲ھ)

مولانا کفایۃ اللہ بن عنایۃ اللہ بن فیض اللہ شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسۂ اعزازیہ میں حاصل کی۔ پھر مراد آباد کے مدرسۂ شاہی میں مولانا عبد العلی میرٹھی اور مولوی محمود حسن سہسوانی سے درس لیتے رہے۔ ۱۳۱۲ھ میں مدرسہ عالیہ دیوبند میں مولانا منفعت علی اور شیخ خلیل احمد انبیٹھوی اور علامہ محمود حسن دیوبندی وغیرہ سے تلمذ اختیار کیا۔ فراغت کے بعد شاہجہانپور واپس آگئے اور مدرسہ عین العلم

میں پانچ سال تک تدریس کرتے رہے۔ پھر دہلی کے مدرسہ امینیہ سے وابستہ ہوگئے اور مدرسہ کے بانی شیخ امین الدین کی وفات (۱۳۳۸ھ) کے بعد مدرسہ کے ناظم مقرر ہوئے۔

مولانا کفایۃ اللہ آزادئ وطن کی تحریک کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ اس سلسلے میں وہ دو بار جیل میں بھی مقید رکھے گئے۔ وہ جمعیۃ العلماء ھند کی طرف سے ایک وفد لے کر سلطان عبدالعزیز بن سعود کی دعوت پر ۱۳۴۴ھ میں مؤتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لئے چلے گئے اور پھر ۱۳۵۷ھ میں قاہرہ میں مؤتمر فلسطین میں شریک ہونے کے لئے تشریف لے گئے۔

مولانا کفایۃ اللہ نے تصنیف و تالیف کی طرف بہت کم توجہ کی۔ البتہ اُن کی اردو میں ایک کتاب سلسلہ تعلیم الاسلام (سوالاً جواباً) چار حصوں میں بار بار طبع ہوئی ہے جو نہایت مقبول ہے۔ اُن کا زیادہ تر شغل تدریس اور افتا تھا۔ اسلئے وہ عموماً مفتی کفایۃ اللہ کے نام سے پہچانے جاتے ھیں۔ صاحب نزھۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ اگر اُن کے تمام فتاویٰ جمع کئے جائیں تو کئی ہزار صفحات کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ اُن کا عربی نمونہ شعر گوئی وہ قصیدہ ہے جو انہوں نے اپنے استاد مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں کہا تھا جب وہ مالٹا میں اسیر تھے۔ اسکے چند شعر یہ ہیں ؎

أَلَا یَا مَالِطَةُ طُوبیٰ وَ بُشْریٰ — ثَوىٰ بِكِ مَنْ مَحَا آثَارَ كُفْرٍ

وَلَمْ تَكُ قَبْلَهُ إِلَّا خَرَابًا — خُمُولاً غَيْرَ مَعْرُوفٍ بِخَيْرٍ

فَلَمَّا حَلَّهَا عَادَتْ رِيَاضًا — مُنَضَّرَةً مِنَ التَّقْوىٰ وَذِكْرٍ

مُكَلَّلَةً بِأَزْهَارِ الْمَزَايَا — وَأَزْهَارُ الْمَزَايَا خَيْرُ زَهْرٍ

أَلَا يَا مَالِطَةُ كُونِي سَلَامًا — عَلىٰ مَحْمُودِنَا الرَّاضِي بِقَدْرٍ

مراجع

تاریخ ادبیات ۲: ۲۲۲ تاریخ دار العلوم ۲: ۷۹-۸۱ النزھۃ ۸: ۳۷۴-۳۷۷

سید سلیمان ندوی

(۱۳۰۲ھ — ۱۳۷۳ھ)

سید سلیمان بن ابی الحسن حسینی البہاری صوبہ بہار کے گاؤں دسنہ میں پیدا ہو کر وہیں نشوونما پاتے رہے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائی شیخ ابو حبیب سے حاصل کی اور ۱۳۱۶ھ میں قصبہ پھلواری میں بعض درسی کتابیں شیخ محی الدین المجیبی پھلواری سے پڑھیں ۔ پھر دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں زیر تعلیم رہے ۔ اسکے بعد لکھنؤ کا سفر کیا اور وہاں کے مدرسہ ندوۃ العلماء میں پانچ سال تک زیر تعلیم رہے ۔ ۱۳۲۶ھ میں فراغت کی سند حاصل کی ۔ اس کے بعد وہ ندوہ کے دارالعلوم میں استاد متعین ہوئے ۔ پھر مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے رسالہ الہلال کی شرکت کے لئے انہیں کلکتہ آنے کی دعوت دی ۔ جہاں وہ ایک سال تک رہے ۔ پھر شہر پونا (علاقہ بمبئی) کے کالج میں مشرقی علوم کے پڑھانے پر متعین ہوئے ۔ علامہ شبلی نعمانی جو اُن کے استاد بھی تھے نے اپنی وفات کے وقت کتاب سیرۃ النبی کی تکمیل کا کام اُن کے ذمے لگا دیا اور دارالمصنفین کے ناظر کا عہدہ بھی اُن کے حوالے کر دیا ۔ سید سلیمان نے کما حقہ اپنے استاد کی وصیت پر عمل کیا ۔ سیرت کی کتاب کے علاوہ سید سلیمان کی اور بھی بہت سی کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں ۔ رسالہ المعارف بھی کافی مدت تک اُن کی زیرِ ادارت طبع ہوتا رہا ۔

عربی شعر کی طرف بھی اُن کی طبیعت مائل تھی ۔ چنانچہ نزھۃ الخواطر میں اُن کا ایک قطعہ دیا گیا ہے جس میں غروب آفتاب کی نقشہ کشی کی گئی ہے ۔ اس کے چند شعر بطور نمونہ حسب ذیل ہیں ؎

كَأَنَّمَا الشَّفَقُ الْمُمْتَدُّ فِي الْأُفُقِ — خَمْرٌ مُعَتَّقَةٌ مُجَّتْ لِمُغْتَبِقِ

خَمْرٌ لِعَتِيقِهَا أَعْلَى هَالِيَةً — شُجَّتْ بِمَاءِ غَمَامٍ هَامِرٍ غَدِقِ

كَفُّ الطَّبِيعَةِ تَسْقِي النَّاسَ أَكْؤُسَهَا — هَلْ لِمَنْ هٰذِهِ الصَّهْبَاءُ لَمْ يَذُقِ

تَحْنُو الْقُلُوبُ حَيَاهَا إِذَا نَظَرَتْ — إِلَى السَّمَاءِ بِأَقْدَاحٍ مِنَ الْحَدَقِ

وَالطَّيْرُ تَشْرَبُهَا حِينًا تَرُوحُ إِلَى — أَوْكَارِهَا صَافِرَاتُ الشَّجْوِ فِي حَلَقِ

راضی بقضا رہنے کے بارے میں اُن کے دو شعر حسب ذیل ہیں ؎

يَا أَيُّهَا النَّاسُ مَا دُمْتُمْ عَلَى الْأَرْضِ — لَا تَخْلُصُوا مِنَ الْإِبْرَامِ وَالنَّقْضِ

فإنّ ما قدّر الرحمن ماضيكم   من شدّة ورخاء كلّه يمضي

مراجع

النزهة ۸: ۱۶۳ – ۱۶۸

متفرق

ان کے علاوہ ذیل میں چند ایسے اہلِ علم کے نام ترتیب زمانی کے لحاظ سے دیئے جاتے ہیں۔ جن کے اشعار کے نمونے مختلف کتب میں ملتے ہیں لیکن اُن کی شہرت شعروشاعری کی بنا پر نہیں بلکہ کسی اور پہلو سے ہے۔

ان میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں جو پاک و ہند میں باہر سے آکر آباد ہوئے۔

نام	سنہ
الشیخ محمد بن ابی بکر الدمامینی	۸۲۷ ھ
الشیخ جمال الدین محمد بن عمر بحرق الحضرمی	۹۳۰ ھ
الشیخ عبد المعطی باکثیر المکی	۹۸۹ ھ
الشیخ محمد بن عمر الآصفی الگجراتی	۱۰۲۹ ھ
السید حسن بن شذقم المدینی	۱۰۴۶ ھ
الحکیم محمد بن احمد الگیلانی	۱۰۵۰ ھ
الشیخ احمد بن محمد الجوہری	۱۰۶۹ ھ
الشیخ احمد بن محمد المعصوم الشیرازی	۱۰۸۶ ھ
الشیخ محمد بن علی الحشری	۱۰۹۰ ھ

السید یحییٰ بن احمد المعصوم الدستکی	۱۰۹۲ ھ
الشیخ جلال الدین الحیدر آبادی	۱۰۹۸ ھ
الشیخ ابراہیم بن صالح الہندی	۱۱۰۰ ھ
السید علی معصوم الدستکی	۱۱۱۷ ھ
امیر الأمراء حسین علی خان البارہوی	۱۱۳۲ ھ
السید الشریف احمد بن ابراہیم الگیلانی	۱۱۳۴ ھ
الشیخ محمد علی الأصفہانی	۱۱۸۰ ھ
الشیخ محمد عاشق البہلتی	۱۱۸۷ ھ
مولانا عبد القادر الجونپوری	۱۲۰۲ ھ
السید انشاء اللہ اللکھنوی	۱۲۳۵ ھ
العلامۃ محمد عابد السندی	۱۲۵۷ ھ
الشیخ فیض احمد البدایونی	۱۲۷۴ ھ
الشیخ عبد الحق البنارسی	۱۲۷۶ ھ
المفتی صدر الدین الدہلوی	۱۲۸۵ ھ
السید محمد حسین الجزائری	۱۲۸۷ ھ
الشیخ عبد الرشید الکشمیری	۱۲۹۸ ھ
السید حیدر علی الرضوی	۱۳۰۲ ھ
مولانا عبید اللہ المیدنی پوری	۱۳۰۳ ھ
السید ناصر حسین اللکھنوی	۱۳۰۶ ھ
الشیخ محمد بن احمد الطوکی	۱۳۱۴ ھ
الشیخ محمد بن ہاشم السویرتی	۱۳۱۵ ھ
السید محمد مہدی المصطفیٰ آبادی	۱۳۱۷ ھ
الشیخ أحمد بن عبد القادر الکوکنی	۱۳۲۰ ھ

مولانا عبد الحمید الصادقپوری	۱۳۲۳ ھ
السید علی التستری	۱۳۲۴ ھ
الشیخ عبد اللہ الجیکر الکوکنی	۱۳۲۵ ھ
مولانا عبد الحی السورتی	۱۳۳۱ ھ
مولانا علی نعمۃ البھلواری	۱۳۳۱ ھ
السید کلب باقر النصیر آبادی	۱۳۳۱ ھ
السید محمد عرفان الطوکی	۱۳۳۲ ھ
مولانا عبد المنعم الچاٹگامی	۱۳۳۳ ھ
الشیخ محمد طیب المکی	۱۳۳۴ ھ
مولانا محمد جان البحوی آبادی	۱۳۳۸ ھ
الشیخ عبد الأول الجونپوری	۱۳۳۹ ھ
مولانا ذو الفقار أحمد المالوی	۱۳۴۰ ھ
الشیخ محمد بن حسین الأنصاری	۱۳۴۴ ھ
السید محمد باقر اللکھنوی	۱۳۴۶ ھ
مولانا سلیمان بن داؤد البھلواروی	۱۳۵۴ ھ
مرزا غلام أحمد القادیانی	۱۳۵۶ ھ
الشیخ محمد بن یوسف السورتی	۱۳۶۱ ھ

فصلِ دوم

(مولانا رومیؒ کے دیوان پر تنقید)

مولانا روحی کی شعر گوئی

مولانا روحی زیادہ تر فارسی میں اور کبھی کبھی عربی زبان میں شعر گوئی فرمایا کرتے تھے اسلئے اُن کا فارسی دیوان کافی ضخیم ہے جس میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔ عربی دیوان نسبتاً مختصر ہے جس میں تقریباً آٹھ سو اشعار ہیں۔ آپ نے اردو زبان میں طبع آزمائی نہیں کی۔ ہاں کبھی مزاح کے موقع پر کسی کا دل خوش کرنے کے لئے ایسا ضرور کیا جس کا ایک آدھ نمونہ اوپر گزر چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے میں عربی یا فارسی شعر کہنے کا رواج مفقود ہو چکا ہے اس لئے ان دونوں دیوانوں کی طباعت بظاہر بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ مولانا کے کلام میں اہل دیوان کے اشعار کا رنگ صاف نظر آتا ہے اس لئے چاہیئے تو یہ تھا کہ آپ کے دونوں دیوان چھپ جاتے۔ اس کی ابھی تک کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اُن کے فارسی دیوان میں تقریباً ہر صنفِ شاعری مثلاً غزل، قصیدہ، رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس اور فرح میں اشعار موجود ہیں۔ اس میں بعض طویل قصائد جو زیادہ تر حمد باری تعالیٰ، نعت اور اکابر قوم کے مرثیے یا تاریخ ہائے وفات سے متعلق قطعات پائے جاتے ہیں۔

عربی دیوان میں بعض قصائد نعتیہ ہیں۔ ایک قصیدہ مرزا غلام احمد قادیانی کے قصیدہ اعجاز احمدی کے جواب میں ہے۔ ایک میں سلطنت عثمانیہ کے سفیر کو خوش آمدید کے موقع پر استقبالیہ دیا گیا ہے۔ کچھ مرثیے ہیں۔ جن کے بعض مصرعوں سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ کچھ قطعات ہیں جن میں اخلاقی باتیں کہی گئی ہیں۔ کچھ نظمیں منکرینِ حدیث کی سرزنش سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک اور نظم میں عیسائی مشنریوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس نظم کا اردو نظم میں ترجمہ مولانا مرحوم کے شاگرد مولانا غلام دستگیر نامی نے کیا تھا جو مولانا کے پرچے الہدیٰ میں طبع ہو گیا تھا[1] کچھ قطعات مختلف کتابوں پر تقریظ کے طور پر کہے گئے ہیں اور کچھ اشعار متفرق ہنگامی حالات کے پیش نظر کہے گئے ہیں۔

عربی اشعار کے علاوہ موصوف عربی نثر کے شاہکار بھی دستیاب ہوئے ہیں اور اس

[1] ج ۱ شمارہ ۳۰ صفحہ ۳۸-۳۹

مقالہ میں شامل کرلئے گئے ہیں۔ ایک خطبہ ندوۃ العلماء کے جلسہ منعقدہ عظیم آباد (پٹنہ) سے متعلق ہے جو ماہ نومبر ۱۹۰۰ میں آپ نے وہاں پڑھا تھا۔

سب کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں نثر ہو یا نظم کچھ لکھنا آسان کام نہیں۔ عربی زبان کا دامن بہت وسیع ہے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک زبان کے قدیم و جدید ادب پر عبور حاصل نہ ہو۔ یہی بات عربی بول چال کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اہل زبان کے ساتھ بے تکلف گفتگو کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہ چیز ماحول اور ایسے مواقع عام ہونے پر منحصر ہے۔ عربی زبان میں بات چیت کرنا اور عربی زبان میں تصنیف و تالیف کرنا بالکل دو الگ چیزیں ہیں۔ چونکہ موجودہ عربی بول چال میں بعض الفاظ کچھ سے کچھ بن گئے ہیں۔ یہ قابلیت کی بات نہیں بلکہ محاورے اور ماحول سے اس امر کا تعلق ہے کیونکہ ادبی زبان بول چال کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔

اس سلسلے میں مولانا علم الدین سالک مرحوم کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ انہوں نے رانا بہاء الحق صاحب کو بتایا کہ ایک دفعہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے مشہور مستشرق مرجلیوث (MR. MARGOLIOUTH) کو دعوت دی گئی کہ وہ عرب مؤرخین (ARABIC HISTORIANS) کے موضوع پر یونیورسٹی ہال میں لیکچر دے۔ اس اجتماع میں شرکت کے لئے متعدد علماء اور عربی دان حضرات دور دراز علاقوں سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا روحی مرحوم بھی موجود تھے۔ لیکچروں کے سلسلے کے اختتام پر سب حضرات کو مسٹر مرجلیوث سے متعارف کرایا گیا۔ جب مولانا کی باری آئی تو انہوں نے اس سے کلاسیکی عربی میں گفتگو شروع کی جو مسٹر مرجلیوث کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے مولانا کی ادبی زبان پر کچھ طنز کی جسے آپ برداشت نہ کرسکے۔ فوراً دیوان الحماسہ منگوا کر چار شعروں پر نشان لگایا اور مسٹر مرجلیوث سے ان اشعار کی تشریح کرنے کے لئے کہا جو وہ نہ کرسکا۔ اس پر مولانا جوش میں آگئے اور فرمانے لگے

" میں چیلنج کرتا ہوں کہ چار سو سال تک غور و فکر کرنے کے بعد بھی تم ان اشعار کا مطلب بیان نہ کرسکو گے۔ پھر آپ نے مترجم کے ذریعہ خود ان اشعار کے معانی مسٹر مرجلیوث کے ذہن نشین کرائے۔ آخر اسے مولانا مرحوم کی عربی دانی کا قائل ہونا پڑا۔

آپ کے فرزند ڈاکٹر بہاء الحق صاحب راوی ہیں کہ ۱۹۳۲ء میں، میں مڈل میں

پڑھا تھا۔ میں نے سکول میں عربی کا مضمون لے رکھا تھا۔ اس نو عمری میں ایک طفلِ مکتب کی علمی استعداد کا
اندازہ آپ خوب لگا سکتے ہیں۔ اُن دنوں عرب کے متعدد باشندے لاہور کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے
نظر آیا کرتے تھے۔ وہ حاجی کے گھروں میں بالخصوص اور دینی رجحان رکھنے والے طبقہ کے گھرانوں میں
بالعموم جاتے اور فی سبیل اللہ مالی امداد طلب کرتے۔ ہمارے ہاں بھی ایسے لوگوں کی کثرت سے آمد و رفت رہا
کرتی تھی۔ غالباً اُس وقت تک تیل کی دولت عربوں کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ سخت گرمی کا موسم
تھا۔ کوئی صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے۔ وہ عربی لباس میں بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ شخصیت بھی
انتہائی جاذبِ نظر تھی۔ چہرے بشرے سے خاصے تعلیم یافتہ اور کسی معزز گھرانے کے چشم و چراغ
دکھائی دیتے تھے۔ کوئی ۳۵/۴۰ کے پیٹے میں ہوں گے۔ میں اُس وقت اپنے مکان کے صدر دروازے میں
کھڑا تھا۔ سلام کے بعد وہ مجھ سے عربی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ اگرچہ میں اُن کی اکثر باتیں سمجھ رہا
تھا مگر نعم (ہاں) اور لا (نہیں) کے سوا کوئی جواب مجھ سے نہ بن پڑتا تھا۔ میری بے بسی دیکھ کر پوچھنے
لگے۔ ھل تعلم العربیۃ۔ میں نے بلا تامل جواب دیا۔ نعم۔ انہوں نے فوراً نعم کے ساتھ الا القلیل کی
گرہ لگا دی۔ اس پر میں بہت کھسیانا ہوا۔

پھر وہ مجھ سے والد مرحوم کے متعلق دریافت کرنے لگے کہ وہ اس وقت کہاں
ہیں۔ میں نے جواب میں مکان کی بالائی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اُن سے ملنا
چاہتے ہیں اس لئے انہیں نیچے تشریف لانے کی زحمت دی جائے۔ میں نے اوپر جا کر والد ماجد کو اُن
کی آمد کی اطلاع دی۔ فرمانے لگے کوئی سائل ہو گا۔ والدہ سے دو روپے لے کر اُسے دے آؤ۔
جب میں نے دو روپے لے کر انہیں دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ سخت جز بز ہوئے اور مجھے
ڈانٹنے کو دوڑے۔ میں سہم کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ انہوں نے موقع شناسی سے
کام لیتے ہوئے فوراً اپنا لہجہ تبدیل کر لیا اور نہایت ہی مشفقانہ انداز میں بولے: "بھئی
میں کوئی گداگر نہیں ہوں۔ اُن کی شہرت سن کر محض زیارت کے لئے بہت دور سے چل کر
آیا ہوں۔" میں پھر اوپر گیا اور اسی نئی صورتِ حال سے والد بزرگوار کو آگاہ کیا۔ انہوں
نے فرمایا۔ شاید وہ زیادہ امداد کی توقع لے کر آیا ہے اس لئے دو روپے کی بجائے پانچ روپے
لے جاؤ۔ میں جب دوبارہ اُن کے پاس پہنچا تو میرے ہاتھوں میں پانچ روپے کا نوٹ دیکھ

کر مسکرائے اور ہمارے اشارے سے انکار کرتے ہوئے پھر والد مرحوم سے ملاقات پر اصرار کرنے لگے۔
یہ اطلاع پا کر کہ ملاقاتی نے پانچ روپے لینے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ والد
مرحوم کو یقین ہو گیا کہ واقعی وہ ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ سائل نہیں کیونکہ اُن دنوں
پانچ روپے ایک معقول رقم تصور کئے جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہدایت فرمائی کہ دروازہ کھول
کر ملاقاتی کو مردانے میں بٹھایا جائے۔ وہ ابھی نیچے آیا چاہتے ہیں۔ میں نے حسب ہدایت
عمل کیا کہ اتنی دیر میں والد مرحوم بھی وہاں تشریف لے آئے۔ ملاقاتی نے جھک کر نہایت
ادب و احترام سے مصافحہ کیا اور پھر مصروف گفتگو ہو گیا۔ بات چیت کے دوران جب یہ منکشف
ہوا کہ وہ مصر کے باشندے ہیں اور جامعہ ازہر میں عربی ادب اور دینیات کے صدر شعبہ
ہیں تو والد صاحب کو سخت تاسف ہوا اور اُن سے کئے گئے سلوک پر اظہار معذرت کرنے
لگے۔ تھوڑی دیر بعد معزز مہمان نے از خود قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی پیشکش کی جو والد صاحب
نے بخوشی قبول کر لی۔ اس پر انہوں نے سورۃ یوسف کی چند آیات جو کم از کم ایک رکوع پر مشتمل
ہوں گی ایسے دل آویز اور موثر انداز میں پڑھیں کہ والد صاحب بے خودی کے عالم میں جھومنے لگے۔ اُن
کی آواز میں ایسی کشش تھی کہ گلی سے گزرنے والا ہر چھوٹا بڑا شخص مجبوراً ہمارے مکان کی دیوار کے ساتھ
لگ کر کھڑا ہو جاتا اور بڑے سکون سے انہیں سننے لگتا۔ تلاوت کے اختتام پر والد صاحب نے اُن
کی آواز کو ایک خداداد عطیہ قرار دیا اور انہیں پُر جوش خراج تحسین ادا کیا۔

اسکے بعد دوبارہ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ گفتگو عالمانہ تھی جو میری سمجھ سے
بالاتر تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ والد صاحب اُن سے اُن کے ملک اور سیاسی مسائل کے بارے میں تبادلہ
خیالات کر رہے تھے۔ بہر صورت میں نے پہلی مرتبہ انہیں ایک غیر ملکی زبان میں باتیں کرتے سنا تھا
میں نے دیکھا کہ وہ عربی میں بلا تکلف و بلا تامل اس طرح باتیں کئے جا رہے ہیں جس طرح ہم
روز مرہ اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ظاہری لباس کا امتیاز نہ ہوتا
تو ایک ناواقف شخص کے لئے یہ اندازہ مشکل تھا کہ اُن میں سے عربی کون ہے اور غیر عربی کون؟
اُن سے رخصت ہونے سے پیشتر والد بزرگوار نے انہیں اپنا عربی کلام سنایا جس سے وہ بہت
محظوظ ہوئے اور دل کھول کر داد دی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کمسنی اور بے بضاعتی کے باعث

اُس پُر لطف علمی مجلس سے چنداں مستفید نہ ہو سکا۔

مولانا کی شعر گوئی اور اس پر تنقید کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا خود فرمایا کرتے تھے کہ شعر و شاعری کے تین مرحلے ہیں

(۱) شعر گوئی (۲) شعر فہمی (۳) شعر خوانی

سو جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مرحوم ایک مطبوع شاعر تھے اور فی البدیہہ شعر کہنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ تھوڑے سے وقت میں بیسیوں اشعار کہہ لینا اُن کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی اور شعر بھی ایسے جنہیں اہل زبان کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ اسی سلسلے میں ایک واقعہ کا بیان مناسب ہے جو ہمارے اس قول کے لئے ایک دلیل ہے:

ڈاکٹر رانا سجاد الحق بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۳۷ء میں جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتا تھا۔ اُن دنوں علامہ عبداللہ یوسف علی کالج کے پرنسپل اور ڈاکٹر برکت علی قریشی مرحوم ہمارے عربی کے استاد تھے۔ پرنسپل صاحب کا دستور تھا کہ جب کبھی بیرونِ ملک سے کوئی اہم علمی یا ادبی شخصیت لاہور میں آتی تو وہ اُسے اپنے کالج میں مدعو کیا کرتے تھے۔ اس سال مصر سے ایک وفد آیا جو جامعہ ازہر کے تین اساتذہ پر مشتمل تھا۔ پرنسپل صاحب نے معزز مہمانوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں کالج میں تشریف آوری کی دعوت دی جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی۔ اس علمی اور ادبی اجتماع کے لئے تاریخ اور وقت کا تعین کرنے کے بعد مختلف کالجوں کے اساتذہ، انجمن حمایت اسلام کے عہدہ داروں اور دیگر اہل علم حضرات کو دعوت نامے ارسال کر دیئے گئے اور کالج کے سینئر طلبہ کی حاضری بھی لازمی قرار دے دی گئی۔

ہمارے عربی کے استاد ڈاکٹر قریشی مرحوم جو والد صاحب کے رفیقِ کار رہ چکے تھے اور مجھ سے ذاتی طور پر متعارف تھے۔ انہوں نے مجھے سٹاف روم میں بلایا اور فرمائش کی کہ میں اس اجتماع میں پڑھنے کے لئے والد بزرگوار سے ایک منظوم سپاسنامہ عربی زبان میں لکھوا کر لاؤں اور میں خود اُسے معزز مہمانوں کی خدمت میں پیش کروں۔ میرے لئے یہ کام بہت کٹھن تھا کیونکہ ایک تو میری عربی زبان سے واقفیت واجبی سی تھی اور دوسرے مجھ آج تک

سٹیج پر آنے کا موقع کبھی نہ ملا تھا۔ تاہم میں استاد گرامی کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ لہٰذا طوعاً و کرہاً
میں نے منظور کر لیا لیکن گھر آ کر والد بزرگوار کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جلسہ کے انعقاد میں صرف
دو دن باقی تھے۔ والد مرحوم فرمانے لگے کہ آج نمازِ عصر کے بعد کاغذ اور قلم دوات لے کر مسجد
میں آ جانا۔ میں تمھیں کچھ اشعار لکھوا دوں گا۔ مسجد ہمارے مکان کے بالکل قریب تھی چنانچہ
نمازِ عصر سے فراغت پانے کے بعد میں کاغذ اور پنسل لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ اُس
وقت اپنے اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُن کی بینائی کمزور ہو چکی تھی
اور خود لکھنے پڑھنے سے معذور تھے۔ فرمانے لگے: یہاں بیٹھ جاؤ اور جو کچھ میں لکھواتا جاؤں لکھتے
رہو۔ اس کے بعد وہ منہ میں کچھ گنگناتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک مصرع لکھوا دیا۔ پھر
کچھ توقف کے بعد ایک اور مصرع لکھنے کے لئے فرمایا۔ اسی طرح مغرب کی اذان تک یہ سلسلہ
جاری رہا۔ اب چونکہ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ فرمانے لگے اب نمازِ عشاء کے بعد جو کچھ تم نے
لکھا ہے گھر چل کر مجھے سنانا تاکہ مناسب کانٹ چھانٹ اور ضروری ردّ و بدل کیا جا سکے۔

نمازِ عشاء سے فارغ ہونے کے بعد گھر آ کر حسبِ عادت نوافل ادا کرتے اور کھانا
تناول فرما کر مجھے یاد کیا اور میں وہ لکھے ہوئے اشعار لے کر حاضر ہوا اور پڑھ کر سنانے لگا۔ وہ
ساتھ ساتھ ہدایات دیتے جاتے کہ فلاں مصرع کو پہلے کر دو اور فلاں کو پیچھے اور فلاں لفظ کو کاٹ
کر اس کی بجائے یہ لکھ دو۔ میں بعض الفاظ کے تلفظ اور صحیح اعراب میں غلطی کرتا تھا اور وہ
ناراض ہوتے اور سخت سست کہتے۔ اسی طرح قریباً گھنٹہ ڈیڑھ یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر آخر
میں مجھ سے شعروں کی تعداد پوچھی تو وہ تیس (۳۰) تھے اور نہایت مربوط قسم کا سپاسنامہ مکمل ہو
گیا جو اُن کے عربی دیوان میں موجود ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ اس سپاسنامے کو معزز مہمانوں کی خدمت میں پیش کون کرے
استاد گرامی ڈاکٹر برکت علی مرحوم چاہتے تھے کہ میں خود اُن کے سامنے وہ پڑھوں۔ مگر والد صاحب
فرمانے لگے کہ تم میں یہ اہلیت نہیں ہے۔ جب تم میرے سامنے ان اشعار کو روانی کے ساتھ نہیں
پڑھ سکتے تو ایک مجمع عام میں اہلِ زبان حضرات کی موجودگی میں خدا جانے تم کیا گل کھلاؤ۔ والد صاحب
مرحوم کی یہ دلیل بہت وزنی تھی۔ سوچ بچار کے بعد آخر یہ طے پایا کہ کسی مقامی کالج کے عربی کے کسی استاد کو

یہ تکلیف دی جائے۔ چنانچہ والد صاحب نے اس سلسلے میں دو تین مقامی پروفیسروں کے نام لئے اور انہیں
بلانے کے بارے میں کہا۔ میں اُن سب کی خدمت میں یکے بعد دیگرے حاضر ہوا۔ وہ میرے ساتھ چلنے کو پہلے
تو تیار ہو جاتے اور جونہی انہیں کام کی نوعیت کا علم ہوتا تو اپنی ناسازیٔ طبع یا گھر میں مہمانوں کی
متوقع آمد اور کوئی کسی ضروری کام میں مصروفیت جیسے عُذر تراش کر معذرت کا اظہار کر دیتے۔
اسی طرح مایوس ہو کر میں بے نیل مرام گھر آ رہا تھا تو حسنِ اتفاق سے اورینٹل
کالج کی مولوی فاضل کلاس کے ایک طالب علم سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ میری پہلے سے تھوڑی
بہت آشنائی تھی۔ جب میں نے اُس سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو اُس نے بلا تامّل اس کام کے لئے
اپنی خدمات پیش کر دیں اور کہا کہ مجھے اپنے والد ماجد کے پاس لے چلو۔ میں بہت خوش ہوا اور اُسے
اپنے ہمراہ گھر لے آیا۔ اُس طالب علم کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ علاقہ یو پی کا
رہنے والا تھا۔ وہ نہایت عمدہ تلفّظ کے ساتھ بلند آواز کا مالک بھی تھا۔ گھر آ کر جب اُس کو وہ اشعار
دکھائے گئے تو اُس نے پہلے زیر لب پڑھا پھر جوش و خروش کے ساتھ باآوازِ بلند پڑھنے لگا۔ والد
صاحب مرحوم نے مطمئن ہو کر بطیبِ خاطر انہیں جلسہ گاہ میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ
اشعار کا مسودہ لے کر مقررہ وقت پر اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں پہنچ جانے کا وعدہ کر کے
رخصت ہو گیا۔

یہ صورت حال میرے لئے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ کالج میں پروگرام کی تشہیر ہو چکی
تھی۔ تمام اساتذہ اور میرے ہم سبق ساتھیوں کو علم تھا کہ میں اس جلسہ میں منظوم سپاسنامہ
پیش کرنے والا ہوں لیکن جو موجودہ صورت حال تھی اُس کے بدلتے ہوئے میرے سٹیج پر نہ آنے سے مجھے اپنے
وقار کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں نے والد بزرگوار سے تقاضا کیا کہ موقع کی مناسبت سے
چند اشعار مجھے بھی لکھوا دیں تاکہ میں انہیں جلسہ گاہ میں اساتذہ اور اپنے ابنائے جنس کے سامنے
پڑھ کر اپنے لئے سرمایۂ افتخار بنا سکوں۔ والد صاحب نے پہلے تو میری اس درخواست کو کوئی
اہمیت نہ دی اور میری نالائقی کا شکوہ کرتے رہے لیکن آخر کار میرے پیہم اصرار پر نیم رضامندی کی
حالت میں فرمانے لگے کہ اچھا اب تو کافی رات ہو چکی ہے ان شاء اللہ کل صبح دیکھا جائے گا
خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اسی روز مغرب کی نماز کے بعد جلسہ منعقد ہونے والا تھا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی بڑھنے لگی۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ شعر لکھوں گا کب اور انہیں یاد کب کروں گا؟ اسی اثنا میں والد بزرگوار نے مجھے مسجد میں بلا بھیجا۔ میں لکھنے کے لئے سامان لے کر پہنچ گیا اور پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اُسی انداز سے جس کا میں پہلے بیان کر چکا ہوں مجھے شعر لکھوانا شروع کئے اور مختصر نظم جو پانچ اشعار پر مشتمل تھی اور جس میں معزز مہمانوں کی تشریف آوری کو اہل کے لئے ایک نیک فال قرار دیا گیا تھا، مجھے لکھوا دی۔ اس نظم کی تیاری میں قریباً نصف گھنٹہ صرف ہوا۔ والد صاحب نے مشورہ دیا کہ اشعار پر اعراب و حرکات لگا کر کاغذ سامنے رکھ کر پڑھنے کی بجائے انہیں حفظ کر کے زبانی پڑھا جائے۔ میں نے اُن اشعار کو طوطے کی طرح رٹ کر والد صاحب کو زبانی سنائے جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے روانی کے ساتھ کسی غلطی کا ارتکاب کئے بغیر اُن اشعار کو پڑھا اس سے مجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ بہت بڑھ گیا۔

اشعار سے پہلے دو تین تمہیدی جملے تھے جو کچھ اسی طرح پر تھے:

ایها السادة الكرام! السلام عليكم. إنّي قد جئت اليكم أن انشدكم شيئاً من الابيات فاسمعوا منّي اصلحكم الله تعالى!۔

یہ اشعار ردیف را میں تھے جو آپ کے عربی دیوان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

جلسہ میں جانے کے لئے سورج کے غروب ہونے سے پہلے میں اللہ کا نام لے کر گھر سے نکلا جب میں کالج میں پہنچا تو استاد گرامی قریشی مرحوم بڑی بے چینی کی حالت میں میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ میرے سلام کا جواب دیئے بغیر ہی وہ بول اٹھے کہو کچھ لے کر بھی آئے ہو یا نہیں۔ میں نے عرض کیا۔ جناب ایک نہیں بلکہ دو نظمیں لکھوا کر لایا ہوں۔ ایک تو فلاں صاحب نے لکھی ہے اور دوسری میرے خود۔ یہ سُن کر فرطِ مسرت سے اُن کا چہرہ کھل گیا اور ہم دونوں کالج ہال کی طرف چل پڑے۔ اِکّا دُکّا لوگ آ رہے تھے حتیٰ کہ سامعین سے ہال بھر گیا۔ معزز مہمان ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ وہ صاحب بھی ہال میں موجود تھے جو اشعار پڑھنے کا وعدہ فرما چکے تھے۔ میں انہیں استاد محترم قریشی صاحب کے پاس لے گیا اور اُن کا تعارف کرایا۔

کچھ دیر بعد معزز مہمانوں کی آمد کا شور اُٹھا اور وفد کے تینوں ارکان سٹیج

پر نمودار ہوئے اور صدرِ جلسہ ڈاکٹر قریشی مرحوم کے دائیں بائیں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہال میں بالکل پُر سکون اور خاموشی طاری تھی۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی اور صاحبِ صدر نے سب سے پہلے سال چہارم کے اُس طالب علم کو قرأت کی دعوت دی جو ایسے مواقع پر قرآن پاک کی تلاوت کر کے حاضرین کو محظوظ کیا کرتا تھا۔ آج جب وہ سٹیج پر آیا تو حسبِ معمول قرأت کرنے لگا تو معزز مہمانوں نے اُسے دو تین بار ٹوک کر بعض حروف کے مخارج کی اصلاح کی جس سے وہ بیچارہ بہت کھسیانا ہوا اور چار پانچ آیات کی تلاوت کرنے کے بعد سٹیج سے نیچے اتر آیا۔ تلاوت کے بعد اُن صاحب کو بلایا گیا جو والد ماجد کا لکھا ہوا سپاسنامہ پیش کرنے والے تھے۔ وہ نہایت متانت اور وقار سے سٹیج پر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس قسم کے کئی اجتماعات میں شرکت کی ہے۔ سپاسنامہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے فی البدیہہ چند تمہیدی جملے اپنی طرف سے اضافہ کر دیئے جن کا لب لباب یہ تھا کہ میں جو قصیدہ آپ کے سامنے پڑھنے والا ہوں وہ اس کالج کے ایک سابق استاد گرامی کا کلام ہے جو بذاتِ خود علالتِ طبع کے باعث تشریف نہیں لا سکے۔ میں اُن کی فرمائش پر ان اشعار کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر انہوں نے اشعار کو اپنے مخصوص انداز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک تو اشعار کی عمدگی، دوسرے پڑھنے والے کی مترنم آواز، دونوں چیزوں نے مل کر جادو کا سا اثر کیا۔ اس موقع پر عجیب کیفیت دیکھنے میں آئی۔ ایک طرف تو عربی زبان سے ناواقف سامعین بُت بنے خاموشی سے نظم سن رہے تھے۔ دوسری طرف عربی دان حضرات بالعموم اور معزز مہمان بالخصوص اچھل اچھل کر داد دے رہے تھے اور ہال احسنتَ، سبحان اللہ، مرحبا وغیرہ فلک شگاف نعروں سے گونج اُٹھا۔ ہر شعر کو دوبارہ اور بعض اشعار کو تو کئی کئی مرتبہ سنانے کی فرمائش ہو رہی تھی۔ الغرض ایک عجیب سماں تھا۔ اس میں تقریباً ایک گھنٹے کا وقت صرف ہو گیا۔

اب میری باری تھی۔ استاد گرامی نے جو اُس وقت صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے، میرا نام پکار کر مجھے سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ میرے نظم پڑھنے سے پہلے صدر جلسہ نے انگریزی زبان میں حاضرین سے میرا تعارف کرایا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اس کالج میں سال سوم کے طالب علم ہیں۔ مجھ سے عربی پڑھتے ہیں۔ ان کا شمار کالج کے انتہائی ذہین اور قابل

طالب علموں میں ہوتا ہے۔ میرے متعلق والد محترم اور استاد گرامی دونوں کی رائے میں بعد المشرقین تھا۔ اس تفاوت کو دیکھ کر بے اختیار مجھے علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کا یہ شعر یاد آگیا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا   اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

بہر حال میں نے توکلت علی اللہ پڑھ کر شعر پڑھنے شروع کئے۔ جب میں نے مہمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ابتدائی کلمات پڑھے تو انہوں نے بڑی گرم جوشی میں جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا۔

اس پر میری رہی سہی جھجک اور جھکی ہٹ بھی جاتی رہی۔ پھر کیا تھا۔ میدان میرے ہاتھ میں تھا۔ مختصر عرصہ میں بچوں سمیت مجھے خلاف توقع اپنے پیش رو سے بھی زیادہ داد ملی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میں اُن کے مقابلہ میں بہت کم سن تھا اور سامعین نے محض میری حوصلہ افزائی کے لئے میرے ساتھ امتیازی سلوک کیا ورنہ در حقیقت میں قطعاً اس کا مستحق نہیں تھا۔

میرے بعد معزز مہمانوں میں سے ایک صاحب اُٹھے اور مائک پر تشریف لائے اور انہوں نے لگاتار دو گھنٹے تک سیرتِ نبوی کے موضوع پر عربی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک تو وہ اہل زبان تھے دوسرے دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ ازہر میں عربی ادب کے استاد بھی تھے۔ اس لئے میری کیا بساط کہ اُن کے بارے میں کچھ رائے زنی کر سکوں۔ آخر میں اُن کی اس معلومات افزا تقریر کا ترجمہ اُسی وفد کے ایک رکن نے انگریزی زبان میں کیا جسے بعد میں شیخ عظیم اللہ مرحوم ایڈوکیٹ نے اردو زبان کا جامہ پہنایا۔ شیخ صاحب غالباً ان دنوں انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکرٹری تھے۔ آخر رات گیارہ بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہو گئی۔

مولانا کی شعر فہمی

تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ شعر گوئی کی نسبت شعر فہمی زیادہ مشکل کام ہے۔ مولانا مرحوم کی اس صلاحیت کا اگر صحیح اندازہ کرنا ہو تو اُن کے مختصر رسالہ "تحفۂ شروان" سے کیا جا سکتا ہے جو خاقانی شروانی مشہور فارسی شاعر کے ایک قصیدہ کی شرح ہے جو کسی زمانہ میں بی۔ اے فارسی کا نصاب تھا اور جس کے بارے میں اُن کے علمی کارناموں اور تصانیف کے سلسلے میں ذکر ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ فارسی علم و بلاغت پر اُن کی کتاب دبیر عجم کے پانچویں باب کی طرف جس کا عنوان " موازنہ و تنقید " ہے رجوع کرنا چاہئیے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک بے نظیر چیز ہے جس میں آپ نے عملی طور پر اساتذہ فن کے کلام پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے تنقید کے اصول و قوانین کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ آپ نے فارسی کے مشہور شعراء مثلاً نظیری اور قاآنی وغیرہ پر بڑی کڑی تنقید کی ہے جس پر ان شعراء کے مداحوں نے خفگی اور برہمی کا اظہار کیا اور مولانا نے اسی کتاب میں انہیں دندان شکن جواب دیا یہ باب لکھ کر مولانا نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جو اس سے پہلے فارسی کی کسی کتاب میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ عام لوگ تنقید کرتے وقت مشہور اور اہم شعراء کے بارے میں کورانہ تقلید کرتے ہوئے اُن کے خلاف کچھ لکھنے سے پہلو تہی کیا کرتے ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم کو کون نہیں جانتا۔ انہوں نے فارسی شاعری کے بارے میں شعر العجم کے نام سے ایک نہایت گراں قدر کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے لیکن مولانا نے اُن کے انداز بیان کو سراہنے کی بجائے یہ لکھا ہے کہ

" مولانا شبلی کی عادت ہے کہ چند تعریفی کلمات اور خاص خاص جملے ذہن نشین کر رکھے ہیں اور تقریباً ہر شاعر کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے وہ پھیر پھیر کر وہی جملے اور فرسودہ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔"

الغرض مولانا کا تبصرہ اور تنقید کسی کی پیروی میں نہیں بلکہ اُن کی اپنی دانش کا نتیجہ ہے۔ صرف اسلئے کہ کوئی شخص زیادہ مشہور ہے وہ اسکی تعریف نہیں کرتے اور نہ کسی کے کلام پر کڑی تنقید اس لئے کرتے ہیں کہ وہ عوام الناس کو اچھا نہیں لگتا۔ بلکہ وہ اس مقولے پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

" مارا بحق کار است ، گو خواجہ راضی مباش "

اُن کے فرزند ڈاکٹر رانا ضیاء الحق صاحب بیان کرتے ہیں کہ جون ۱۹۴۴ء میں، میں نے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے عربی میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر شریک ہونے کا ارادہ کیا جو اپریل ۱۹۴۵ میں منعقد ہونے والا تھا۔ سات آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں دو سالہ نصاب پر عبور حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن میں نے اللہ کا نام لے کر والد صاحب مرحوم کی نگرانی میں امتحان کی تیاری کا شروع کر دی۔ اُن دنوں ایم۔ اے عربی کا پہلا پرچہ نظم قدیم سے متعلق تھا اور اس میں دو

مشہور عربی شعراء یعنی طفیل الغنوی اور الطرماح بن حکیم کے مکمل دیوان نصاب میں شامل تھے۔ مقدم الذکر زمانہ جاہلیت سے تعلق رکھتا ہے اور موخر الذکر شاعر اسلامی زمانے کا ایک خارجی شاعر ہے جس کا شمار اموی دور کے فحول شعراء میں ہوتا ہے۔ ان دونوں شاعروں کے نمونۂ کلام ابوتمام کے دیوان حماسہ میں موجود ہیں۔ غالباً یہ دونوں دیوان اسلئے نصاب میں داخل کر لئے گئے تھے کہ وہ دونوں یورپ میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ اکٹھے طبع شدہ صورت میں موجود تھے۔

میں نے ان دیوانوں کی تلاش شروع کی اور لاہور کے تمام عربی کتب فروشوں سے پتہ کیا مگر بے سود۔ والد ماجد کے اُن تلامذہ اور احباب کے ساتھ بھی رابطہ قائم کیا گیا جو کراچی، پشاور، دہلی اور حیدرآباد دکن وغیرہ میں موجود تھے۔ مگر سب کی طرف سے نفی میں جواب ملا۔ سخت مایوسی کا سامنا کرنے کے بعد آخر والد ماجد مرحوم نے مشورہ دیا کہ اورینٹل کالج لاہور کے ایم۔ اے (عربی) کے طالب علموں سے دریافت کرنا چاہئیے کہ وہ اس پرچے کی تیاری کیسے کرتے ہیں۔ چونکہ موسم گرما کی تعطیلات کے باعث کالج بند ہو چکا تھا اس لئے کالج کے دفتر کے ذریعے ایک دو طالب علموں کے گھر کا پتہ کر کے بڑی مشکل کے ساتھ اُن سے رابطہ قائم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں دیوان یکجا کسی مستشرق نے اپنی زیرِ نگرانی جمع کر کے چھپوائے ہیں اور انگریزی ترجمہ بھی اُن کے ساتھ ہے اور اس کتاب کا لاہور میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے۔ کالج میں اس پرچے کی تیاری مولانا نور الحق صاحب مرحوم دیوبندی کے ذمہ ہے اسلئے یہ کتاب انہیں کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ اس کا مطالعہ کر کے طالب علموں کو پڑھا سکیں۔

میں نے والد ماجد کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا نور الحق صاحب لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب تاجپورہ میں سکونت پذیر ہیں۔ آج کل کالج میں تعطیلات کے باعث انہیں اس کتاب کی ضرورت نہیں ہو گی تم اُن کے ہاں جا کر میرا نام لو اور ایک ماہ کے لئے وہ کتاب عاریتاً لے آؤ۔ میں اس حکم کی تعمیل میں مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن کے پوچھنے پر میں نے اپنی حاضری کی غرض بتائی۔ کہنے لگے: بھئی کتاب تو تم بڑے شوق سے لے جا سکتے ہو لیکن میں تمھیں بتا دیتا ہوں کہ اس کو سمجھنا اور سمجھانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ اُن کی زبان عام عربی نہیں ہے بلکہ بیابانی بدوؤں کی زبان ہے جو انتہائی ادق اور

عسیر الفہم ہے۔ جا بجا نادر، غریب اور نامانوس الفاظ ٹھونس دیئے گئے ہیں جو بڑی بڑی جامع اور
مستند لغات مثلاً لسان العرب، تاج العروس اور قاموس وغیرہ میں بھی نہیں ملتے۔ چونکہ یہ کتاب
حال ہی میں شامل نصاب کی گئی ہے اور اس کا پڑھانا میرا ذمہ ہے اس لئے مجھے خود اس کی تیاری میں
سخت دقت پیش آتی ہے۔ روزانہ چند اشعار، مشکل تیار کرتے اور کچھ انگریزی کا ترجمہ سے مدد لے کر
طالب علموں کو پڑھاتا ہوں۔ ان حالات میں تم کتاب لے جا کر کیا کرو گے؟

مولانا نور الحق کی ان باتوں سے میری کمر ہمت ٹوٹ گئی کیونکہ انہوں نے حوصلہ شکن الفاظ
میں مجھے ڈرا دیا۔ میں نے سوچا کہ کتاب لئے بغیر ہی واپس چلا جاؤں لیکن والد ماجد کے ناراض ہونے کے
خدشہ کی بنا پر انتہائی یاس کی حالت میں مولانا نور الحق کو رسید لکھ دی اور اُن سے کتاب لے کر گھر
آ گیا۔

میرے گھر واپس آنے تک والد مرحوم مسجد میں اپنے اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر گھر
تشریف لا چکے تھے اور نچلی منزل کے مردانے میں چارپائی پر لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ میں نے تمام ماجرا
اُن کے گوش گزار کیا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ضعفِ بصارت کے باعث وہ خود مطالعہ کرنے
سے معذور تھے۔ فرمانے لگے مجھے ذرا یہ کتاب دکھاؤ۔ جب میں نے کتاب اُن کے ہاتھ میں دی تو انہوں نے
چاروں طرف سے اچھی طرح ٹٹول کر اس کے حجم اور ضخامت کا جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگے کہ کتاب الحماسہ
میں ان دونوں شاعروں کے کچھ اشعار میری نظر سے گزرے ہیں لیکن ان کے مکمل دیوان دیکھنے کا کبھی
اتفاق نہیں ہوا۔ یہ کہہ کر کتاب مجھے واپس کر دی اور فرمایا کہ تم مجھے ہر نظم کے چار چار پانچ پانچ
ابتدائی اشعار پڑھ کر سناؤ تاکہ میں اُن کے خیالات اور اسلوب بیان سے واقف ہو سکوں۔

کتاب کا آغاز طفیل غنوی کے کلام سے ہوتا تھا جو طویل نظموں پر مشتمل تھا۔ میں
نے اُس کی پہلی نظم کے چند اشعار پڑھ کر سنائے تو فرمانے لگے۔ اب اسے چھوڑ دو اور اس سے اگلی
نظم پڑھو۔ اس کے بھی چند اشعار سُن چکے تو پھر اگلی نظم پڑھنے کا ارشاد فرمایا۔ علیٰ ھذا القیاس
دوپہر کے کھانے تک جب دونوں دیوانوں کی تمام نظموں کے چند ایک ابتدائی اشعار سُنا کر
ایک لحاظ سے کتاب کو ختم کر دیا تو انہوں نے اپنا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے فرمایا: "ایہہ
وچ کھوتی دا سر پیا ہویا اے۔" پھر فرمایا۔ میں نے دونوں شاعروں کے خیالات اور طرزِ ادا

سے آگاہی حاصل کرلی ہے۔ تم ایک رجسٹر بنالو۔ اُس میں عصر کی نماز کے بعد رات گئے تک اشعار نقل کرلیا کرو۔ اشعار کے درمیان چار چار پانچ پانچ سطروں کی جگہ چھوڑتے جاؤ۔ جب صبح کی نماز سے فارغ ہو کر میرے گھر آؤ تو اپنے نقل کردہ اشعار کا ترجمہ اور تشریح مجھ سے سُن کر اُن خالی سطروں میں لکھ لیا کرو۔ گویا صبح سے لے کر عصر تک کا وقت تمہارے لئے مخصوص ہے۔

میں نے بسم اللہ پڑھ کر والدِ بزرگوار کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مجوزہ پروگرام کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔ صبح اور عصر کے درمیان صرف گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ ہوتا جس میں وہ دوپہر کا کھانا کھاتے اور نمازِ ظہر ادا فرماتے۔ باقی تمام وقت درس و تدریس میں گزر جاتا۔ وہ چارپائی پر لیٹے ہوئے حقّے سے دل بہلاتے رہتے۔ میں اُن کے سرہانے کرسی پر بیٹھا اشعار پڑھتا جاتا۔ پہلے وہ مفردات کا معنی بیان فرماتے۔ پھر شعر کی ترکیب پر روشنی ڈالتے اور بعض اوقات مجھ سے کوئی ضمنی سوال بھی پوچھ لیتے۔ اس کے بعد ہر شعر کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ مجھے لکھوا دیتے۔ ہر شعر کی تشریح و توضیح ایسے دل نشین پیرایہ میں کرتے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی اور شعر کا مفہوم اُسی وقت ذہن نشین ہو جاتا۔ آخر خدا خدا کر کے قریباً ڈیڑھ دو ماہ کی مدت میں یہ صبر آزما کام بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس دوران میں شاید آٹھ یا دس مقامات پر لغت کی کتاب دیکھنے کی ضرورت پیش آئی ہو گی۔

جب میں اپنا کام ختم کر چکا اور کتاب کی مزید ضرورت باقی نہ رہی تو میں اُسے واپس کرنے کے ارادے سے دوبارہ مولانا فیض الحق مرحوم کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور کتاب کی واپسی میں چند روز کی تاخیر کے لئے معذرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا: "سناؤ تمہارا کیا حال رہا۔" میں نے عرض کیا۔ "قبلہ میں نے دونوں دیوان نہ صرف نقل کر لئے ہیں بلکہ والد ماجد سے انہیں سبقاً سبقاً پڑھ بھی لیا ہے۔" اس کے بعد ڈرتے ڈرتے میں نے دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ مناسب خیال کریں تو اس کتاب سے آپ میرا امتحان بھی لے سکتے ہیں۔ ایک مستند، جیّد، تجربہ کار اور عمر رسیدہ عالم کے سامنے میرے جیسے طفلِ مکتب کی یہ تعلّی چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق تھی۔

مولانا مرحوم میرے ان الفاظ پر چونک پڑے اور حیرت و استعجاب سے میری طرف تکنے

لگے۔ انہوں نے کتاب الجامع طفیل الغنوی کا ایک شعر پڑھا اور اس کا مفہوم بیان کرنے کے لئے مجھ سے کہا۔ میں نے بلا تامل پہلے اس کا لفظی ترجمہ اور پھر اس کی تشریح کر دی۔ پھر طفیل ہی کے چند مزید اشعار کے متعلق انہوں نے مجھ سے کچھ سوالات کئے جن کے میں نے تسلی بخش جواب دیئے۔ پھر انہوں نے طرماح کے چار پانچ شعروں کی تشریح کرنے کے لئے کہا۔ میں نے ایک آدھ شعر کے سوا تمام اشعار کی بڑی خوش اسلوبی سے وضاحت کر کے مولانا مرحوم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ الغرض مجھے خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تو فرمانے لگے کہ سچی بات تو یہ ہے کہ زمانہ سخت قدر ناشناس ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا روحی ہمارے پاس علماء سلف کی یادگار ہیں۔ عربی ادبیات بالخصوص زمانۂ جاہلیت اور صدر اسلام کی شاعری پر جس قدر عبور اُن کو حاصل ہے اس کی مثال اس دور میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔ مختصر یہ کہ وہ کافی دیر تک والد بزرگوار مرحوم کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے گن گاتے رہے۔ آخر میں اجازت لے کر اُن سے رخصت ہو گیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب ہمارا یونیورسٹی امتحان ہوا تو اس پرچے میں، میں نے پچاسی فیصد نمبر حاصل کئے جو باقی سب پرچوں کی نسبت زیادہ تھے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اُن دنوں ایم۔ اے کے امتحان میں تمام جوابات اردو کی بجائے انگریزی میں دیئے جاتے تھے۔ لیکن والد مرحوم انگریزی سے ناآشنا ہونے کے باعث اردو میں پڑھاتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پندرہ نمبر بھی محض اسی وجہ سے کٹے کہ میں انگریزی میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار اچھی طرح سے نہ کر سکا۔

رانا بہادالحق صاحب کی بیان کردہ روایات کے پیش نظر مولانا روحی مرحوم کی عربی دانی، شعر گوئی اور شعر فہمی کے متعلق جو مجموعی تاثرات ذہن میں جاگزیں ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کسی زبان کی اہم اور بنیادی کتب ادب کے مطالعہ سے کوئی شخص اعلیٰ درجے کا ادیب یا انشاء پرداز تو بن سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی زبان میں بلا تکلف بول چال یا تقریر کرنے پر بھی قادر ہو سکے بلکہ یہ ملکہ صرف اہل زبان میں رہ کر اور اُن کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے اور ہم کلام ہونے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن مولانا روحی مرحوم نے تمام عمر

اپنے ملک سے باہر کبھی ایک قدم بھی نہ رکھا بلکہ ساری عمر اسی ملک میں گزاری اور اس کے باوجود وہ اہلِ زبان کے سامنے بلاتکلف عربی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے۔ سچ ہے

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص محنت سے اور اپنی طبیعت پر دباؤ ڈال کر شعر گوئی پر قدرت حاصل کر لے مگر بدیہہ گوئی ایک نعمت خداوندی ہے جو صرف مطبوع شاعر کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ مرحوم مولانا روحی کو اس نعمت سے بھی وافر حصہ ملا تھا۔ چنانچہ وہ عین موقع پر تھوڑے تھوڑے سے وقفہ میں اپنے خیالات کو شعری جامہ پہنا سکتے تھے۔

۳۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، شعر فہمی، شعر گوئی کی نسبت زیادہ مشکل ہے بالخصوص ایسے شاعر کے کلام کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جس سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا ہو۔ طفیل الغنوی اور الطرماح دونوں دیوان مولانا روحی کے لئے نادیدہ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے بغیر کسی دقت کے اس طرح اپنے شاگرد کو ذہن نشین کرا دئیے کہ اُس نے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر اسی پرچے میں حاصل کئے۔ اس سے اُن کی شعر فہمی کی استعداد کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ کتاب پڑھانے والے کی نظروں کے سامنے اگر کتاب موجود نہ ہو تو اس کا سمجھنا اور سمجھانا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ نثر کی بجائے نظم میں تو اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ شعر کا مفہوم سمجھنے کے لئے اُس کے ہر دو مصراع کے باہمی ربط کو ملحوظ خاطر رکھنا بنیادی شرط ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جب دونوں مصراع بیک وقت ذہن میں حاضر رہیں۔ لیکن دوسرے شخص سے سننے کی صورت میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادھر ایک مصراع دماغ سے نکل گیا۔ بعید ذھول اور بڑھاپا تو آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

جن دنوں مولانا مرحوم کو یہ دیوان پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۸۰/۷۰ سال کے درمیان تھی۔ اُن کی قوت حافظہ، ذہنی پختگی اور بیدار مغزی کے غیر معمولی ہونے کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

۵ ـ مولانا نورالحق علوی مرحوم ایک منجھے ہوئے عالم اور صاحب تصنیف و تالیف استاد تھے ۔ وہ مولانا مرحوم کے ہم عصر ہونے کے علاوہ اُن کے ہم پیشہ بھی تھے ۔ اگرچہ یہ جملہ مشہور ہے " المعاصرة وجه المنافرة " دونوں بزرگوں میں باہمی چشمک کا پایا جانا ضروری تھا لیکن اس کے باوجود مولانا نورالحق نے مولانا راوی کے بارے میں جو کلمات خیر کہے اور جن الفاظ میں اُن کے علمی کمالات کا اعتراف کیا ۔ وہ اُن کے علم و فضل کا ایک بیّن ثبوت ہیں ۔

۶ ـ الطرمّاح وہ شاعر ہے جس کی غرابت پسندی کی شکایت صرف مرحوم مولانا نورالحق کو ہی نہیں تھی بلکہ اکثر تذکرہ نویس اُسکے شاکی نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ ثبوت کے طور پر تاریخ الادب العربی[۱] کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں اُسکے غریب ، نادر اور نامانوس الفاظ کے استعمال کا رونا رویا گیا ہے :

" نشأ الطرماح نشأة حضرية ، فما عرف البادية ولا لابس البدو ، ولكنه عاش في الكوفة وألمّ بالبصرة ، فسمع الرواة والنحاة فيهما يؤثرون الأدب الجاهلي ، ويقدمون الشعر البدوي ، لأنه موضع الشاهد وموطن الغريب . فولّد ذلك فيه وفي الكميت حب الغريب وتكلف الحوشي ؛ فكان يتسقطه من الأعراب ، ويتلقطه من الرجّاز ، ويستعمله فلا يقع به في مكانه . قال العجاج : كان الطرماح والكميت يسألانني عن الغريب فأخبرهما به ثم أراه في شعرهما وقد وضعاه في غير موضعه . فقيل له : ولم ذلك ؟ فقال : لأنهما قرويان يصفان ما لم يريا . ومن ثمّ كان الاصمعي وأبوعبيدة يعيبان شعرهما في الاسلاميين ، كما عابا شعر عدي بن زيد وأمية بن أبي الصلت في الجاهليين . وانك لترى أثر هذا الميل ظاهرًا في شعره ، فبينا يأتيك بالأبيات الرقيقة الأنيقة العذبة ، اذا به يرميك بالأبيات الغريبة البعيدة الفجّة ، فيشوه شعره ويكدر بحره . وقد سئل ابن الأعرابي عن ثماني عشرة مسألة من شعر الطرماح فلم يعرف منها واحدة ! "

---

[۱] الزيات ؛ ص ۱۷۰

سو اس قسم کے شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لئے جس بالغ نظری اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ اُس کا فیصلہ قارئین کرام خود کر سکتے ہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے عربی دیوان کا جو تجزیہ اوپر کیا گیا ہے۔ اُس کے مطابق ہر صنف شاعری پر کچھ اظہارِ خیال کیا جائے۔

نعتیہ قصائد

نعتیہ قصائد میں مولانا کا طرزِ بیان عربی کے فحول شعراء کے عین مطابق نظر آتا ہے اور اُس میں قصیدہ کے بیشتر لوازم موجود ہیں۔ مثلاً تشبیب، تخلّص (گریز)، نفسِ مضمون وغیرہ۔ چنانچہ آپ کے ہمزیہ قصیدہ نعت میں تشبیب پر قریباً ۱۵ - اشعار موجود ہیں اور اس حصہ میں اہلِ زبان کے مسلّمہ اصولوں کی پیروی کی گئی ہے۔ تشبیب کے تیرے شعر میں محبوب کے وعدۂ وصل کو "برقِ خلّب" اور اُس کے حسن و جمال کو "رنجِ قلب" کہنا کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ اس سے شاعر کے حقیقی جذبہ کا انعکاس ہوتا ہے۔ چوتھے شعر میں محبوب کے وعدہ کا بے اصل ہونا بالکل اُسی طرح واضح کیا گیا ہے جیسے ایک حماسی شاعر نے کہا ہے ؎

وَإِنْ حَلَفَتْ لَا يَنْقُضُ النَّأْيُ عَهْدَهَا
فَلَيْسَ لِمَخْضُوبِ الْبَنَانِ يَمِيْنُ

اس قصیدہ کے پانچویں شعر میں محبوب سے جدائی کے موقع پر ایک عاشق کے دل کی کیفیت کا اظہار اس خوبی سے کیا گیا ہے جس سے بہتر شاید ممکن نہ ہو۔ یعنی دل کے اُڑ جانے اور پریشانی کی حالت کو کسی پرندے کے اُن پروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہوا کے زور سے خلا میں اُڑتے پھرتے ہوں۔ اس قصیدہ میں تخلّص یعنی گریز کا بیان جس خوبی سے کیا گیا ہے اُس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

اس قصیدہ کے نفسِ مضمون میں وہی طریق اختیار کیا گیا ہے جو حضرت حسّان رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی مدح میں اختیار کیا کرتے تھے یعنی آپ کی روحانی تعلیم اور اخلاقِ فاضلہ پر زور دیا گیا ہے اور آپ کی محبت کو آخرت میں باعثِ نجات ثابت کیا گیا ہے۔

قصیدہ کے شعر ۳۳ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ناظم علیہ الرحمۃ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ کی زیارت کا شرف اس لئے حاصل نہ ہو سکا کہ اُسکی نظر آخر عمر میں بند ہو گئی تھی۔ اس خیال کے اظہار کے لئے جو پیرایہ کلام اختیار کیا گیا ہے۔ غالباً اس سے بہتر ممکن نہیں۔

ایک اور نعتیہ حائیہ قصیدہ میں بھی تشبیب کے اشعار تقریباً پندرہ ہیں لیکن اُن میں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ وہ مذکورہ بالا قصیدہ سے قدرے مختلف ہے۔ اس قصیدہ کے نفسِ مضمون میں نبی ص کے کارناموں اور کفار و مشرکین کے ساتھ آپ ص کے تعلق کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آپ کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف کی بجائے آپ کے فیوض و برکات کے بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو ایک مومن کا اصل مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔

مرزائے قادیانی کے جواب میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے۔ اُس کی تشبیب پڑھ کر قاری کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی عربی گو شاعر کا کلام ہے کیونکہ اس میں عربی شعراء کی تشبیب کے بیشتر لوازم اور کوائف کا بیان مناسب الفاظ میں دکھائی دیتا ہے۔ پھر چونکہ یہ قصیدہ ایک جھوٹے نبی کے قصیدہ کے جواب میں لکھا گیا ہے اس لئے اس کے مقامِ تخلّص میں دین کی بگڑی ہوئی حالت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور پیغمبر علیہ السلام کے اس قول کو پیرایہ تائید کی گئی ہے:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (المنادی ۲: ۱۷)

پھر اس قصیدہ میں بھی کچھ نعتیہ اشعار آ گئے ہیں کیونکہ ایک سچے رسول کے جو اوصاف ہونے چاہییں وہ آپ ص میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ پھر اُس قصیدہ کی قلعی کھولی گئی ہے جس کے جواب میں ناظم نے یہ قصیدہ کہا بلکہ اور بھی کئی ایک صحیح العقیدہ علماء نے مدعی کے چیلنج کا عملی طور پر جواب دیا تھا۔ مثلاً قاضی ظفر الدین مرحوم (سابق پروفیسر اورینٹل کالج) مولانا غنیمت صاحب مونگیری اور مولوی محمد حسن صاحب فیضی مرحوم جو ضلع جہلم کے باشندہ تھے چونکہ مدعی کے قصیدہ میں بہت سے اغلاط واضح طور پر پائے جاتے تھے اسلئے ناظم علیہ الرحمۃ نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اس بات کا ذکر کر دیا ہے اور شدت کے ساتھ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ آج تک کوئی نبی شاعر نہیں ہوا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ (۳۶ : ۶۹) سے واضح ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے نعتیہ قصائد کا انداز ایک مخلص مؤمن کے کلام کی طرح پیغمبرِ عا کے اخلاقی و روحانی فیوض و برکات کے اندر محدود ہے۔ گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال بھی قابلِ توجہ پہلو ہے لیکن آپ کے اخلاقِ کریمانہ اور آپ کی صحبت کا شرف یقیناً حسن و جمال کے پہلو سے زیادہ اہم ہے۔ کعب بن زہیر کے قصیدہ بانت سعاد میں آپ کے دینی اور روحانی اوصاف کا بالکل ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے قصیدہ کا اسلوب خالص زمانۂ جاہلیت کا اسلوب ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک کعب بن زہیر حقیقتِ اسلام سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ تو محض خوف اور ڈر کی وجہ سے اسلام لایا تھا۔ کعب نے آپ کی دلیری اور بہادری کا نقشہ کھینچنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہیبت ناک شیر سے تشبیہ دی ہے۔ اس قسم کی مدح کعب کے والد زہیر بن ابی سُلمیٰ کی شاعری کا رنگ ہے جس سے قارئین کو زمانۂ جاہلیت کی مدح کا گمان ہوتا ہے کیونکہ اس میں مادی تصاویر کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ آپ کی ہیبت اور رعب کا اظہار کرتے ہوئے ایک ہاتھی کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ڈیل ڈول آنکھوں کے سامنے لانے سے خواہ مخواہ خوف کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یہ سب چیزیں زمانۂ جاہلیت کی سادہ مگر محسوس تمثیل کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اسلئے یہ کہنا بجا ہے کہ مولانا کا نعت کے موضوع پر انداز حضرت حسان کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔

بہرحال قصیدہ کے آخر میں مولانا نے اپنے معاصر لوگوں کی کچھ ہجوِ ملیح پر بھی شعر کہے ہیں لیکن یہ ہجو ملیح فحش اور سب و شتم سے بالکل پاک ہے۔

مرثیہ نگاری

مرثیہ میں مرنے والے شخص کی مدح پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کے اوصاف اور کمالات کا بیان کرنا اور اسکی وفات سے قوم کو جو نقصان پہنچا اسکی طرف توجہ دلانا، ہر مرثیہ کا خاصہ ہے اور سچ پوچھو تو مرثیہ میں مرنے والے شخص کی صحیح تعریف اور مدح بیان کی جاتی ہے۔ زندگی میں کسی کی مدح کرنا کسی مصلحت کے زیرِ اثر بھی ہو سکتا ہے لیکن مرنے والے کے اوصاف کا بیان ایک حقیقت کا اظہار ہے کیونکہ مرنے کے بعد کسی کے صحیح اوصاف کا بیان

کرنا کسی مفاد کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ عربی یا فارسی میں مولانا کے جتنے مرثیے ہیں اُن میں کسی مبالغہ یا جھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ چنانچہ قاضی حمید الدین کے مرثیہ میں مرحوم کے صرف انہی اوصاف کا بیان کیا گیا ہے جو واقعی اُن میں موجود تھے کیونکہ قاضی حمید الدین اپنی زندگی میں بڑے بڑے علماء اور اصحابِ فتویٰ میں شمار ہوتے تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام سے آپ کے کئی سال تک مخلصانہ تعلقات رہے اور اُن کی وفات سے اس انجمن کو سخت نقصان پہنچا۔

اسی طرح خواجہ محمد غوث چشتی کے مرثیہ میں مرحوم کے صرف انہی اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جو اُن میں واقعی پائے جاتے تھے۔ یہ مرثیہ گو بہت مختصر ہے لیکن حقیقت پر مبنی اور پُرزور اشعار کا مرقع ہے۔ عموماً شاعر لوگ کسی کی مدح یا مرثیہ لکھتے وقت مبالغہ آرائی سے بہت زیادہ کام لیا کرتے ہیں لیکن مولانا کے مدحیہ قصائد یا مراثی میں یہ چیز نظر نہیں آتی۔

فارسی میں بھی بعض اصحاب کے مرثیے مولانا نے لکھے ہیں۔ اُن میں ایک مرثیہ سر سید احمد مرحوم کا ہے گو مذہبی نقطۂ نظر سے سر سید احمد خان کے خیالات اور مولانا کے عقائد میں واضح فرق تھا اور آپ ہمیشہ اپنے رسالہ الہدیٰ میں سر سید احمد خان کے خیالات پر تنقید کرتے رہے اور اُن کا رد لکھتے رہے لیکن سر سید کے مرثیہ میں صرف اُن اوصاف کا ذکر کیا گیا جو درحقیقت مرحوم میں موجود تھے۔ عدل و انصاف پر قائم رہنا اور دشمن کی جو خوبی اُس میں موجود ہو اُسے سچے دل سے ماننا ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ یہی حال سر سید کے مرثیہ کا ہے۔

متفرق نظمیں

مولانا کے عربی دیوان میں بعض ہنگامی چیزیں، بعض استقبالیے اور کتب پر تقاریظ پائی جاتی ہیں۔ اُن میں بھی افراط و تفریط سے کام نہیں لیا گیا اور مولانا نے کسی صورت میں بھی حق گوئی سے پہلو تہی نہیں کی۔ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں ملٹن کی قائم کردہ تین شرطیں شعر گوئی کے لئے ضروری قرار دی ہیں جو

۱۔ مبنی بر حقیقت

۲۔ سادگی

اور ۳۔ جوش ہیں

اس معیار پر مولانا کے کلام کو اگر پرکھا جائے تو وہ ان شرطوں پر پورا اترتا ہے۔

مولانا کا فارسی دیوان

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے مولانا کا فارسی دیوان، عربی دیوان
کے مقابلے میں بہت ضخیم ہے لیکن چونکہ اُن کی فارسی شاعری اس مقالہ کا موضوع نہیں ہے اس لیے
اُس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی لیکن اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اپنے
فارسی میں بعض مستند شعرائے فارسی کے قصیدوں اور غزلوں پر غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں مثلاً
حافظ شیرازی، مرزا محمد علی صائب تبریزی، مرزا جلال اسیر، قدسی مشہدی، خاقانی شروانی
منوچہری دامغانی، عرفی، انوری

اُن کے دو فارسی قصیدوں "ارمغان احباب" اور "ملت آشوب" کے بارے
میں ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی استاد زبان و ادبیات فارسی تہران یونیورسٹی اور ڈاکٹر سید
جعفر شہیدی ایضاً استاد تہران یونیورسٹی نے الگ الگ فارسی تقریظیں لکھ کر بھیجی تھیں جن میں
نہایت اعلیٰ رائے اور تنقید کی گئی تھی۔ اُن دونوں بزرگوں کے خطوط مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں
محفوظ ہیں لیکن چونکہ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں اس لیے اُن کا صرف ذکر کرنے پر اکتفا کیا
جاتا ہے۔ اسی طرح وزارت فرہنگ ایران کے ساتھ مولانا روحی مرحوم کی جو خط و کتابت اُن
کی کتاب دبیر عجم کے بارے میں ہوئی وہ خطوط بھی اُن کے نجی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ خود
ہندوستان میں نظامت تعلیمات دولت عثمانیہ حیدر آباد دکن اور مولانا مرحوم میں جو
خط و کتابت دبیر عجم کے بارے میں ہوتی رہی وہ خطوط بھی محفوظ ہیں۔ ان سب مراسلوں
میں دبیر عجم کے متعلق اعلیٰ درجے کی تنقید اور تقریظ کی گئی ہے اور حیدر آباد والوں نے تو کتاب
دبیر عجم کو اپنے فارسی کے اعلیٰ امتحانات میں بطور نصاب بھی شامل کر لیا تھا۔ دبیر عجم پر فارسی
میں ایک تقریظ اُس دور کے خطیب شاہی مسجد لاہور یعنی مفتی سید محمد اعظم شاہ مرحوم
شاہجہان پوری نے بھی نہایت عمدہ تقریظ لکھ کر مولانا کو بھیجی تھی جس کی اصل اُن کے خاندان

کتب خانہ میں موجود ہے۔

فارسی شاعری کے نمونے اس مقالہ میں جا بجا مناسب جگہ پر گزر چکے ہیں اسلئے مزید نمونے دینے کی ضرورت نہیں۔

البتہ یہ بات ضرور قابل ذکر ہے کہ تاریخ گوئی کا ملکہ قدرت نے اُن کی طبیعت میں اسقدر ودیعت کیا تھا جس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ انہوں نے اپنے بے شمار احباب اور بزرگان دین یا اپنے اسلاف کی بے شمار تاریخیں فارسی شعروں میں کہیں۔ اپنی والدہ مرحومہ کی تاریخ وفات انہوں نے قرآن مجید کی ایک آیت میں معمولی سے تصرف کے بعد یوں کہی تھی:

" اِنَّ اُمَّكَ لفی ظلالٍ وعیون "

١٣ ھجری ٣٢

اپنے فرزند اکبر یعنی مولوی فضل حق مرحوم کی تاریخ پیدائش اس آیت سے نکالی تھی۔

" اِجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیّا "

١٣ ھ ٣٢

فن تاریخ گوئی کا چونکہ ذکر درمیان میں آگیا ہے اسلئے مناسب ہوگا اگر اس بات کا ذکر کر دیا جائے کہ پیر غلام دستگیر نامی مرحوم (جو مولانا مرحوم کے عزیز شاگردوں میں شامل تھے) نے یوں لکھا ہے:

میں جناب مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی ایم او ایل، مولوی فاضل، منشی فاضل، ہیڈ منشی اسلامیہ کالج لاہور کا نہایت ممنون ہوں کہ انہوں نے میری اکثر نظموں کو جو دینی خدمت کے لئے لکھی گئیں، شوق و قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اُن کی اصلاح و اشاعت میں بڑی مدد دی۔ پیشتر ازیں میں نے بہت نظمیں لکھیں مگر اُن میں کسی کو بموجب ارشاد قبلہ پیر برادر شاہ صاحب کہ

نرسد تا بسمع استادان . نتوان کرد اعتماد سخن

پبلک کے سامنے پیش نہ کر سکا۔ چونکہ آئندہ طبع شدہ نظم ایک فاضل اجل و استاد محقق کی نظر سے گزر چکی تھیں اسلئے میں نے بلا دھڑک اُن کو ہدیۂ ناظرین کر دیا۔ خدا مولوی صاحب

موصوف کو جو باوجود دولتِ علم سے اس قدر مالا مال ہونے کے ایک درویشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔
عمرِ نوح عطا فرمائے تاکہ مجھ جیسے تشنہ کام اُن کے دریائے فیض سے سیراب ہوتے رہیں۔ آمین یا ربنا

اس کے بعد نامی صاحب نے قادیانی کی تاریخ کے عنوان سے مرزا غلام احمد کی تاریخ
ہائے وفات جو مختلف اصحاب نے نکالی تھیں۔ نقل کی ہیں۔ اُن میں سب سے پہلے اُن کی اپنی نکالی
ہوئی تاریخ ہے جو یہ ہے ؎

هُوَ فِی النّار ایک مردِ شریر — کیوں نہ شیطان آج ہو دلگیر
فتنے اور تفرقے مٹے سارے — پائے مفسد میں پڑ گئی زنجیر
بدلم گشت خواہشے پیدا — کہ کنم سالِ فوتِ اُو تحریر
گفت نامی ز روئے الہامے
مر گیا قادیان کا خنزیر

۱۳۲۵ + ۱ = ۱۳۲۶ھ

اس کے بعد پیر جماعت علی شاہ صاحب رحمہ اللہ کی نکالی ہوئی تاریخ یہ لکھی ہے۔

"لقد دخل فی قعرِ جہنّم"

۱۳ ھ ۲۶

قاضی فضل حق (پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور) کی نکالی ہوئی تاریخ:

"میرزا بھیضہ بمرد"

۱۳ ھ ۲۶

غلام حیدر صاحب کی کہی ہوئی تاریخ

"چشمِ ما روشن و دلِ ما شاد"

۱۳ ھ ۲۶

اور سب سے آخر مولانا اصغر علی روحیؔ کی نکالی ہوئی دو تاریخیں لکھی گئی ہیں۔

(۱) "دجالِ قادیان کا اب خاتمہ ہو گیا" (۲) "رُوحِ خبیث" از سبب ۱۳۲۶ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔

۱۳ ھ ۲۶ — ۱۳ ھ ۲۶

فصل سوم

دیوان الرّوحی علیہ الرحمۃ

دیوان الرؤف

مولانا مرحوم کا دیوان شعر قریباً تمام اُن نظموں پر مشتمل تھا جو آپ نے وقتاً فوقتاً لکھی تھیں۔ آپ کا خود نوشتہ نسخہ آپ کے ہاتھ کے علاوہ بعض تلامذہ کے ہاتھوں سے لکھا گیا تھا۔ لیکن آپ کے آخر زمانہ کی بعض نظمیں اس میں موجود نہیں تھیں کیونکہ آپ صاحب فراش ہو جانے کی وجہ سے اپنی بیاض میں اُن کا اندراج نہ کرا سکے البتہ متفرق کاغذات پر چند ایک نظمیں دیکھنے میں آئیں جو اس دیوان میں شامل کر لی گئی ہیں جیسا کہ اسی مقالہ کے مقدمہ میں لکھا جا چکا ہے کہ آپ کے تمام صاحبزادے ملازمت کے سلسلہ میں لاہور سے باہر متعین تھے اس لئے بعض وقت کسی معمولی لکھے پڑھے آدمی سے آپ شعر کاغذ پر لکھوا لیتے تھے اور اگر کوئی معمولی پڑھا لکھا شخص بھی پاس نہ ہوتا تو خود ہی کاغذ پر درج فرما لیتے لیکن بینائی نہ ہونے کی وجہ سے بعض وقت شعر کے الفاظ اوپر نیچے لکھے جاتے جن کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آئی۔ ایسی نظموں کے کچھ عکس حسب موقع اسی دیوان میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

آپ کی لکھی ہوئی بیاض میں عربی اور فارسی تمام نظمیں ملی جلی ہیں۔ لیکن چونکہ میرا تعلق صرف عربی اشعار سے تھا اس لئے مجھے دوسرا ایسا نسخہ ملا جس میں ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق صاحب نے عربی اشعار کو علیحدہ جمع کر رکھا تھا اور فارسی منظومات کو علیحدہ۔ کیونکہ اُن کا ارادہ تھا کہ دونوں دیوان الگ الگ طبع کرا دیئے جائیں۔

صوفی صاحب نے اپنے ایک شاگرد سے اس کی ایک نقل تیار کروا رکھی تھی۔ میں نے ان تینوں نقول سے آپ کے عربی دیوان کو جمع کیا ہے۔

سب سے پہلے نسخہ میں بعض جگہ لفظوں کی تبدیلی بھی حاشیے پر دیکھنے میں آئی جیسا کہ موقع بموقع اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس نسخہ کا نام "نسخہ و" رکھا گیا ہے۔

دوسرے نسخہ کو امتیاز کی خاطر "نسخہ ب" کہا گیا ہے اور
تیسرے کو "نسخہ ج"

جو نظمیں ان تین نسخوں کے علاوہ کسی کتاب یا رسالہ میں مولانا کی زندگی ہی میں طبع ہو گئی
تھیں اُن میں سے بعض کی روایت دیوان سے مختلف دیکھی گئی ہے۔ اسی اختلاف کا ذکر حواشی میں
کر دیا گیا ہے۔

اصل دیوان یعنی "نسخۂ الف" میں بعض نظموں کے آخر میں اُن کے لکھنے کی تاریخ بھی
موجود ہے لیکن کچھ نظمیں بغیر تاریخ کے چھوڑ دی گئی ہیں۔ اسلئے جس نظم کی تاریخ "نسخۂ ج"
میں درج ہے وہ ہر نظم کے آخر میں نقل کر دی گئی ہے۔

حامداً و مصلياً

فی نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم *

بِنَفْسِیْ اَنْتِ لَیْسَ لَکِ الْوَفَاءُ — اِلٰی مَا ذَا التَّجَافِیْ وَ الْجَفَاءُ ؟ [1]

رَحَلْتِ وَ مَا رَحِیْلُکِ عَنْ تَرَاضٍ — وَلٰکِنْ مَلَّنَا مِنْکِ الثَّوَاءُ [2]

کَبَرْقٍ خُلَّبٍ وَعْدٌ وَ وَصْلٌ — کَرِیْحٍ قُلَّبٍ حُسْنٌ وَ مَاءٌ [3]

یَئِسْنَا مِنْ لِقَائِکِ فَاَنْجَیْنَا — مَوَاعِدُکِ الَّتِیْ تَعِدُ النِّسَاءُ

لَقَدْ نَادٰی بِفُرْقَتِنَا غُرَابٌ — فَرَاعَ الْقَلْبَ بِالْبَیْنِ النَّجَاءُ [4]

کَاَنَّ الْقَلْبَ مِنِّیْ یَوْمَ بَانَتْ — کَرِیْشَاتٍ تُطِیْرُ بِهَا الْخَلَاءُ

---

* طبعت هذه القصيدة فی کتاب 'ما فی الاسلام' للناظم (ص ی-ل) و مجلّة 'البیّنات' (کراتشی) شهر صفر ١٣٩٧ (ص ٤٩-٥٠) و مقالة بروفسور احمد حسین القریشی القلعداری فی مجلّة کلیّة زمیندار گجرات (ص ٤٧-٤٨) والقصیدة فی بحر الوافر، والقافیة من المتواتر .

١ الباء فی "بنفسی" إما للفدیة أو للقسم ، و التجافی : التباعد

٢ مَلّنا : یقال مللت الشئ ملّة و ملالاً ؛ برمت به ، و الثواء : طول المُقام .

٣ برق خلّب : الذی لا غیث فیه ، کانّه خادع یومض ، حتی تطمع بمطره ثم یخلفك ، و ریح قلّب : الریح التی تتحول من جهة الی جهة بالسرعة .

٤ غراب : المراد منه غراب البین ؛ قال النویری فی نهایة الارب (١٠: ٢١١) انما لزمه هذا الاسم لأن الغراب اذا بان اهل الدار للنجعة وقع فی مواضع بیوتهم یتلمس و یتقمم ، فتشاءموا به و تطیّروا منه ، اذ کان لا یلم بمنازلهم إلا اذا بانوا منها ؛ فسمّوه غراب البین . ، والنجاء : السرعة .

دَعَا ذِكْرُ الشَّبَابِ إِلَى التَّصَابِي	وَهَلْ عِنْدَ الصَّبَاحِ لِيَ الْمَسَاءُ [1]
يَبَابٌ هَالَ نَفْسِي ذُو شُجُوْنٍ	وَكَلَّتْ نَاقَتِيْ وَ وَهِيَ السِّقَاءُ [2]
وَمَا فِي الدَّهْرِ أَشْقَى مِنْ كَئِيْبٍ	إِذَا الضَّحَّاكُ حُمَّ لَهُ الْبُكَاءُ [3]
وَمَا فِي الْعَيْشِ خَيْرٌ تَرْتَجِيْهِ	وَلَا فِيْمَا اكْتَسَبْتَ لَكَ الْبَقَاءُ
سَأَلْتُ الدَّهْرَ عَمَّا أَرْتَجِيْهِ	فَقَالَ: إِلَيْكَ، مَا هٰذَا الْهُرَاءُ [4]
تُرِيْدُ الْخَفْضَ فِيْ عَيْشٍ هَنِيْءٍ	فَكَمْ فِي النَّاسِ مَنْ يُعْيِيْهِ دَاءُ
طَوَيْتُ الْكَشْحَ عَنْ خِلٍّ مُدَاجٍ	يُدَارِيْ حِيْنَ يُحْوِجُهُ اللِّقَاءُ [5]
وَيُفْنِيْ كُلَّ حُبٍّ فِيْهِ غِشٌّ	وَيَبْقَى مَا يُخَامِرُهُ الصَّفَاءُ [6]
فَدَعْ حُبَّ الْغَوَانِيْ وَهُوَ غَيٌّ	وَدَاءُ الْغَيِّ يَخْذَعُهُ الدَّوَاءُ
وَلٰكِنْ حُبُّ نَجْلٍ هَاشِمِيٍّ	أُتِيْحَ لَهُ مِنَ الرَّبِّ الثَّنَاءُ [7]
عَطَايَا لَا يَمُنُّ بِهَا عَلَيْنَا	فَنَشْكُرُ مَنْ لَهُ عَنْهُ الْغَنَاءُ [8]

---

[1] التصابي: الميل إلى الجهل والفتوة

[2] يباب: ارض يباب اى خراب و اليباب الخالى لا شئ به، و ذو شجون: شجون الأودية هى طرقها واحدها الشجن، و وهى السقاء: اذا تخرق وانشق۔

[3] اشقى: هكذا فى 'ب' و في 'ج'، و المطبوعة: "اشكى" وليس هذا البيت فى مجلة "البينات"۔

[4] اليك: معناه تنح و ابعد

[5] طوى الكشح: يقال فلان طوى كشحه، اذا أعرض بودّه، و مداج: داجى الرجل: ساتره بالعداوة واخفاها عنه فكانه اتاه فى الظلمة والمداجاة: المداراة۔

[6] خامره: خامر الشئ: قاربه وخالطه۔

[7] نجل: النسل والولد۔

[8] يمن: المن هٰهنا: أن تمن بما اعطيت وتعتد به كانك انما تقصد به الاعتداد۔

أَتَيْتَ بِمَا يَحَارُ الْفِكْرُ فِيْهِ ... لَهُ فِي الْإِبْتِدَاءِ لَهُ انْتِهَاءُ[1]

كِتَابٌ نَاطِقٌ بِالْوَحْيِ حَقًّا ... بِآيَاتٍ فَهُنَّ لَنَا الشِّفَاءُ[2]

بِأَلْفَاظٍ تَنَاوَبُهَا الْمَعَانِي ... عَجَائِبُهَا فَلَيْسَ لَهَا انْقِضَاءُ[3]

كِتَابٌ لَا يُدَاخِلُهُ ارْتِيَابٌ ... وَلَا فِي جِذْمِ مَعْنَاهُ ارْتِيَاءُ[4]

كِتَابٌ قَدْ بَدَا شَمْسًا وَبَدْرًا ... تَجَلَّى مِنْهُ نُوْرٌ أَوْ ضِيَاءُ[5]

تَأَمَّلْ فِي الْغَوَامِضِ وَالْمَزَايَا ... تَجِدْهَا فَوْقَ مَا بَلَغَ الْعَلَاءُ[6]

سَمَوْتَ إِلَى الْمَكَارِمِ وَالْمَعَالِي ... سَبَقْتَ وَقَدْ تَلَاكَ الْأَنْبِيَاءُ[7]

وَقَدْ كُنْتَ اقْتَدَيْتَ بِهِمْ جَمِيْعًا ... فَتَسْبِقُهُمْ جَمِيْعًا لَا مِرَاءُ[8]

وَعَيْنِي مَاءُهَا رَنْقٌ وَطِيْنٌ ... وَعَيْنُكَ لَا تُرَنِّقُهَا الدِّلَاءُ

بَلَغْتَ مَكَانَةً مَا لَمْ تَرُمْهَا ... مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ الْأَصْفِيَاءُ

وَمَنْ فِي النَّاسِ أَفْصَحُ مِنْكَ نُطْقًا ... وَأَبْلَغُ مِنْكَ مَعْنًى يُسْتَضَاءُ

---

١ أتيت: في هذا البيت التفات من الغيبة الى الخطاب.

٢ الشفاء: كما قال تعالى: وننزّل من القرآن ما هو شفاء و رحمة للمؤمنين ولا يزيد الظلمين الّا خسارا. (١٧: ٨٢)

٣ تناوب: ناوب يناوب، ناوبه اى عاقبه و التناوب أن يأتي كلّ لنوبته.

٤ الارتياء: الافتعال من الرأي و التدبير.

٥ نور وضياء: قال القاضي البيضاوي في تفسيره تحت اٰية " هو الذي جعل الشمس ضياء والقمر نورًا (١٠: ٥) " قيل ما بالذات ضوء (ضياء) وما بالعرض نور وقد نبّه سبحانه و تعالى بذلك على أنّه خلق الشمس نيّرة في ذاتها والقمر نيّرا بالعرض بمقابلة الشمس والاكتساب منها.

٦ المزايا: المزيّة: الفضيلة.

٧ تلا: يقال تلوت الرجل اذا تبعته.

٨ اقتديت: اشارة الى الآية: اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده (٩١:٨) ومراء: يقال ماريتُ الرجل مراءً اذا جادلته.

شَمَائِلُ تَسْتَمِيلُ بِهَا قُلُوبًا	فَتَأْنَسُ بِالْخِطَابِ فَمَا تُفَاءُ [1]
فَيَا كَهْفَ الْوَرٰى يَا مُرْتَجَانَا	لَدَى الْعَرَصَاتِ إِذْ عَظُمَ الْبَلَاءُ
وَأَثْبَتْنَا الذُّنُوبَ فَلَا نُبَالِي	فَإِنَّ اللّٰهَ يَمْحُو مَا يَشَاءُ [2]
قَضَيْنَا مَا نَوَيْنَا مِنْ مُنَانَا	فَجُلُّ حُظُوظِنَا مِنْهَا الشَّقَاءُ
أَلَوْتُ وَلَوْ عَلٰى كُرْهٍ فَإِنِّي	أَحَاطَ بِيَ الظَّلَامُ فَلَا الضِّيَاءُ [3]
أُحِبِّي الطَّوَارِقُ لَوْ أَلَحَّتْ	بِصَمَّاءٍ لَعَادَ لَهَا الْهَبَاءُ [4]
وَنَائِبَةٍ رَجَوْتُ النَّاسَ فِيهَا	بَلَوْتُهُمُ فَخَابَ بِيَ الرَّجَاءُ
تَفَسَّدَتِ النُّفُوسُ فَلَا تُبَالِي	كِتَابُ اللّٰهِ نَحْلٌ أَمْ أَلَاءُ [5]
تَفَرَّدَ كُلُّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيٍ	وَإِنَّ الرَّأْيَ فِي الدِّينِ الْغُثَاءُ
وَلَا يَأْتُونَ خَيْرًا مَا اسْتَطَاعُوا	وَلَا يَأْلُونَ شَرًّا مَا أَسَاءُوا
قُلُوبٌ صَخْرَةٌ أَوْ مِنْ حَدِيدٍ	وَأَلْسِنَةٌ حَصَائِدُهَا رُغَاءُ [6]
أُهَيْلُ الْعَصْرِ اتَّبَعُوا هَوَاهُمْ	وَإِنَّ الدِّينَ عِنْدَهُمُ رِيَاءُ [7]

---

١ التفاء: من افأت فلانا على الامر إفاءة إذا اراد امرا، فعدلته الى امر غيره.

٢ فان الله يمحو ما يشاء: اشارة الى الآية الكريمة: يمحو الله ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتاب (١٣: ٣٩)

٣ ألوت: ألا يألو ألوًا وألوًّا، قصّر وأبطأ. وفي نسخة "ب" "اتيح لي" مكان "احاطني"

٤ صمّاء: المراد منه الصخرة الصمّاء التي ليس فيها خرق ولا صدع.

٥ الألاء: بالفتح: شجر حسن المنظر مرّ الطعم.

٦ الرغاء: في الاصل صوت الابل والمراد منه كثرة الكلام ورفع الصوت حتى يضجر السامعون.

٧ أهيل: تصغير اهل للتحقير.

جُلُّ القَوْمِ أَجْلَافٌ طَغَامٌ — فَخَيْرُ النَّاسِ فِيهِمْ خُنْفَسَاءُ [1]

إِذَا مَا النَّاسُ لَمْ يَأْتُوا صَلَاحًا — فَعَالِمُهُمْ وَ جَاهِلُهُمْ سَوَاءُ

أَلَا مَا ذَا اكْتَسَبْتَ فَقُلْ وَرَبِّي — لَسَوْفَ تَرَى إِذَا انْكَشَفَ الغِطَاءُ [2]

وَ أَدْهَى مَا دَهَانَا مِنْ دَوَاهٍ — كَمَالُ المَرْءِ يَسْتُرُهُ الخَفَاءُ

مَضَغْتُ الشِّيحَ وَ القَيْصُومَ لٰكِنْ — بِعَيْنِي حَاسِدِي شِعْرِي قَذَاءُ [3]

---

١ طغام: ارزال الطير والسباع وهو ايضا ارزال الناس وأوغادهم. وخنفساء: الخنفساء بفتح الفاء ممدود، دويبّة سوداء اصغر من الجعل منتنة الريح ويقال الخنفساء دويبّة تكون في اصول الحيطان.

٢ اذا انكشف الغطاء: اشارة الى الآية الكريمة؛ فكشفنا عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد (٥٠:٢٢)

٣ الشيح: الشيح نبات سُهلي وهو من الامرار له رائحة طيبة وطعم مرّ وهو مرعًى للخيل والنعم. والقيصوم: القيصوم من نبات السهل ومن الامرار وهو طيب الرائحة.

ومما قال مقرظاً *

يَا قَوْمِ مَالِي قَدْ أَرَى أَهْلَ الْهُدَى ... سَكَتُوا وَيَهْذِيْ كُلُّ بَطَّالٍ عَوَى [۱]

مَا زَالَ جُهَّالُ الزَّمَانِ طِبَاعُهُمْ ... يَبْرِيْ سِهَامَ الطَّعْنِ فِي أَهْلِ النُّهَى [۲]

وَلَنَا سِهَامٌ صَائِبَاتٌ فُوِّقَتْ ... نَرْمِيْ بِهَا عَنْ قَوْسِنَا أَهْلَ الْهَوَى [۳]

حَتّٰى إِذَا رَجَعُوْا بِأَفْوَقِ نَاصِلٍ ... لَمْ يَبْقَ فِيْهَا مَنْزَعٌ فِي الْمُلْتَقَى [٤]

أَتَعِيْبُ مَنْ قَدْ فَازَ بِالْعُلْيَا وَلَا ... فَضْلُ الْغَزِيْرِ وَلِلْعُلَى أَهْلُ التُّقَى

أَقْسَمْتُ لَوْ خَلَقَ الْإِلٰهُ نَظِيْرَهُ ... لَطَوَيْتُ مَسْلَكَ رَأْيِهِ بَيْنَ الْوَرَى [۵]

---

* الابيات فی تقریظ کتاب "نصر المقلدین" لمولانا الحافظ احمد علی البٹالوی رحمہ الله وقد سماه باسمه التاریخی "نسخۃ نصر المقلدین" وقد طبع الکتاب فی سنۃ ۱۳۲۰ھ وطبعت هذه الابیات مع عبارة فی اللغۃ الاردویۃ (ص: ۲۹۰-۲۹۳) وقد جئنا بالعبارة الاردویۃ فی جملۃ التقاریظ. والنظم فی بحر الکامل والقافیۃ من المتدارک.

۱ یهذی: هذی یهذی هذیاً وهَذَیاناً: تکلّم بکلام غیر معقول. وعوی: قال الجوهری: عوی الکلب والذئب وابن آوی یعوی عُواءً: صاح، وفی نسخۃ کتاب نصر المقلدین المطبوعۃ (ص: ۲۹۰) "غوی".

۲ سهام: فی النسخۃ المطبوعۃ "قسیّ" وهو جمع القوس.

۳ فوق: یقال فوّقت السهم تفویقاً ای عملت له فُوقاً، والفوق من السهم: موضع الوَتر.

٤ ناصل: فی المثل رجع فلان بافوق ناصل اذا خسّ حظّه او خاب.

۵ مسلک: فی النسخۃ المطبوعۃ "منهج".

و مما قلت مقرظا

یا قوم نالی قد اری اهل الهدیٰ ۔ سکتوا فی یحذی کل بطال غویٰ

ما زال جهال الزمان لطباعهم ۔ یبری سهام الطعن فی اهل النهیٰ

و لنا سهام صائبات فوقت ۔ نرمی بها عن قوسنا اهل الهویٰ

حتیٰ اذا رجعوا بافوق ناصل ۔ لم یبق فیها منزع فی الملتقیٰ

العیب من قد فاز بالعلیاء و الفضل العزیز و للعلیٰ اهل التقیٰ

اسمعت لو خلق الالہ نظیرہ ۔ لطویت مسلک رایہ بین الوریٰ

اذ لیس فی امم خلت کابی حنیفۃ صاحب الرای السدید فیقتدیٰ

من کان مثل ابی حنیفۃ حاویا ۔ سنن الرسول ففیہ ما قد یکتفیٰ

او لیس فیمن قد مضیٰ من قبلکم ۔ لک عبرۃ یا من بھلکتہ نویٰ

فاسلک طریق الحق تبلغ منزلا ۔ و دع الخصومۃ عنک تنج من الردیٰ

تمت نقشہ و لقد کتبت بیدی یوم الخمیس
الرابع خلت من شہر ربیع الثانی

بیت
تستشرق الی صاحب الطیبۃ علیہ الصلوٰۃ

تاریخ اشراق اکابرها سنۃ ۔ فها انا من ... لست بائس

ری

بناج فرق
... خوش

... بہ خورشید درخشاں
... بیمن بید الشان ...

إِذْ لَيْسَ فِيْ أُمَمٍ خَلَتْ كَأَبِيْ حَنِيْـــفَةَ صَاحِبِ الرَّأْيِ السَّدِيْدِ فَيُقْتَدَى

مَنْ كَانَ مِثْلَ أَبِيْ حَنِيْفَةَ حَاوِيًا ‏ سُنَنَ الرَّسُوْلِ فَفِيْهِ مَا قَدْ يُقْتَفَى [1]

أَوَلَيْسَ فِيْمَنْ قَدْ مَضٰى مِنْ قَبْلِكُمْ ‏ لَكَ عِبْرَةٌ يَا مَنْ بِهُلْكَتِهِ ثَوٰى [2]

فَاسْلُكْ طَرِيْقَ الْحَقِّ تَبْلُغْ مَنْزِلًا ‏ وَدَعِ الْخُصُوْمَةَ عَنْكَ تَنْجُ مِنَ الرَّدٰى [3]

٢ ر اغستس ١٩٠٠ء

---

١ يقتفى : فى النسخة المطبوعة ؛ "يكتفى"

٢ الفلّ : المنهزمون .

٣ توجد العبارة الأتية بنسخ المصنف فى آخر الابيات ؛ فقط ولقد كتبت بيدى يوم الخميس لاربع خلت من شهر ربيع الثانى (لعله يريد ١٣١٨ هـ) ٢/ اغستس ١٩٠٠م .

قال مرتجلاً بمناسبة رجوع ابنه الاكبر بعد زيارة
خاله الاكبر ببلدة سدنی فی استریلیا *

ثَلَاثَةُ أَعْيَادٍ لَقَدْ جُمِعَتْ لَنَا　　　لِقَاءُ حَبِيبٍ وَالْعَرُوبَةُ وَالْأَضْحٰى [1]

* من بحر الطویل والقافیة متواتر

[1] فی هذا البیت توارد ببیت الحافظ المولوی نذیر احمد الدهلوی وقد مرّ فی ترجمته .

الشمال أو الجنوب -
فهل تحزن على ما فات يوماً
فان الحزن يتبعه النحيب

في النصيحة والموعظة *

أَيا نَوْمانُ ما لَكَ لا تَتُوبُ ... وَقَدْ أَبْلَتْ مَحاسِنَكَ الخُطُوبُ [1]

أَتَطْمَعُ فِي رَغِيدِ العَيْشِ شَيْخاً ... جُنُونُ النّاسِ فِي الدُّنْيا ضُرُوبُ

شَبابُكَ قَدْ مَضَى وَالشَّيْبُ يَبْكِي ... بُكاءَ شَجٍ عَلَى ما لا يَؤُوبُ

وَرَبُّكَ لا تَرَى رَبّاً سِواهُ ... فَكَيْفَ تُراكَ وَهْوَ لَكَ الوَهُوبُ

إِذا لَمْ تَنْهَ نَفْسَكَ عَنْ ذُنُوبٍ ... تُحاوِلُها فَما تُجْدِيكَ تُوبُوا [2]

وَإِنَّ حَياتَنا الدُّنْيا كَغُولٍ ... تُخادِعُنا بِأَشْكالٍ تَنُوبُ [3]

فَتُرْضِينا بِحالٍ ثُمَّ تُحْيِيهِ ... وَتُسْخِطُنا بِما لا يَسْتَطِيبُ

تَمَرَّدَتِ النُّفُوسُ فَلا تَراها ... تَخافُ اللهَ وَهْوَ لَها رَقِيبُ

يَعِيشُ المَرْءُ حَوْلاً بَعْدَ حَوْلٍ ... وَفِيما يَنْقَضِي هَمٌّ وَدُوبُ

إِذا غَلَبَتْ عَلَى نَفْسٍ هَواها ... فَلَيْسَ لَها مِنَ التَّقْوَى نَصِيبُ

مَضَى زَمَنُ الصِّبا يا لَيْتَ شِعْرِي ... مَتَى هَبَّ الشَّمالُ أَوِ الجَنُوبُ

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ الأَبْصارُ فِيهِ ... يُحاسِبُنا مُهَيْمِنُنا الحَسِيبُ [4]

---

* من بحر الوافر والقافية متواتر

1 نومان: هو كثير النوم وهذه الكلمة أكثر ما يستعمل في النداء. قال ابن منظور: يا نومان اي يا كثير النوم قال: ولا تقل: رجل نومان لأنه يختص بالنداء.

2 اشارة بآية كريمة: " توبوا الى الله توبة نصوحا " (٦٦ : ٨)

3 قال ابن الاثير: قوله صلى الله عليه وسلم " لا غول ولا صفر " الغول احد الغيلان وهي جنس من الشياطين والجن، كانت العرب تزعم أن الغول في الفلاة تتراءى للناس فتتغول تغولا اي تتلون تلونا في صور شتى وتغولهم اي تضلهم عن الطريق وتهلكم، فنفاه النبي صلى الله عليه وسلم وابطله.

4 اشارة الى الآية الشريفة. " انما يؤخرهم ليوم تشخص فيه الابصار. (١٤ : ٤٢)

دَوَاعِي النَّفْسِ لَيْسَ لَهَا ارْتِدَاعٌ ... وَلٰكِنَّ التُّقَى نِعْمَ الرَّقِيبُ

فَيَا عَجَبًا لِنَفْسٍ لَا تُبَالِي ... بِمَا تَأْتِي أَتَخْبُثُ أَمْ تَطِيبُ

وَأَيَّامُ الْحَيٰوةِ فَلَا تُضِعْهَا ... فَإِنَّكَ إِنْ أَضَعْتَ إِذًا خَرِيبُ

وَمَا قَدْ فَاتَ أَمْسِ مَا بَعِيدٌ ... وَمَا لَمْ يَأْتِ أَمْسِ مَا قَرِيبُ

صُرُوفُ الدَّهْرِ حَالٌ ثُمَّ حَالٌ ... فَمَرْتَعُهَا خَصِيبٌ أَمْ جَدِيبُ

فَلَا تَحْزَنْ عَلَى مَا فَاتَ يَوْمًا ... فَإِنَّ الْحُزْنَ يُشْبِعُهُ النَّحِيبُ

فَصِرْتُ الْيَوْمَ حِلْسَ الْبَيْتِ وَحْدِي ... فَأَدْعُو مَنْ إِذَا يُدْعَى يُجِيبُ [1]

وَلَوْلَا أَنْ تَدَارَكَنِي رَجَائِي ... لَكُنْتُ الْيَوْمَ أَخْيَبَ مَنْ يَخِيبُ

هُوَ الْبَرُّ الرَّؤُوفُ فَلَا تَرَاهَا ... أَيُّهُمْ حَاضِرًا أَمْ مَنْ يَغِيبُ

---

[1] حلس البيت: يقال فلان حلس بيته اذا لم يبرحه على المثل. وفي حديث أبي موسى: "قالوا يا رسول فما تأمرنا قال: كونوا أحلاس بيوتكم أي الزموها"

في الغزل *

مَرَرْتُ بِرَبْعِ سَلْمٰى مُسْتَجِيْبًا	لِشَوْقٍ هَاجَ فِيْ قَلْبِيْ نَحِيْبًا
وَيَوْمِيْ لَا أَرَى سَلْمَايَ فِيْهِ	لَيَوْمٌ يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا [1]
أُعَالِجُ مَا بِقَلْبِيْ وَهْوَ دَاءٌ	عُضَالٌ لَا يُكَلِّفُنِيْ طَبِيْبًا
لَقَدْ سَهِرَتْ طِوَالَ اللَّيْلِ عَيْنِيْ	تَجُوْدُ بِدَمْعِهَا بِدَمٍ مَشُوْبًا [2]

* من بحر الوافر والقافية متواتر

1. اشارة الى الآية الكريمة : "يومًا يجعل الولدان شيبًا" (٧٣ : ١٧)

2. كأنّه أراد ما قال البوصيري ؎

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمٍ	مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

تاریخ تعمیر مدرسۃ قاسمۃ العلوم لاہور *

هذه المدرسة بناها المولوی احمد علی اللاهوری (بانی لجنة خدام الدین)

إذا كان ذكر المرء في مكسب العلى — فنشر علوم الدين خير المكاسب
بنى مكتباً خير المكاتب كلها — من اشتأثرت عقباه اسنى المآرب
ترى كل فياض اليدين مسابقاً — الى بذل ما في وسعه من الحائب
فانفق في احداث دار اقامة — لطلاب علم وهي جل المطالب
له باقيات صالحات وانه — لعمري أتى في صنعه بالعجائب
وخدام دين الله قاموا بنصره — فلله قوم قد مضوا كالقواضب[1]
يدرس في ذا المكتب الذكر والهدى — فيشفي صدور الناس في كل جانب
ومن علينا ربنا وهو قاسم — علوم ديانات بخير المواهب
فلما رأيت الناس يبغون عامه — حسبت الرجال الا دام خير المكاتب

۱۳ ھ ۴۹

۵ ...۲... ۱۳۴۹ھ

* من بحر الطويل و القافية متدارك

۱ اشارة الى لجنة "خدام الدين" التى اقيمت المدرسة تحت اشرافها .

۲ بياض فى الاصل

وله فی تاریخ وفات خواجہ محمد غوث الچشتی انار اللہ برهانہ *

أَلَا يَا عَيْنِ بَكِّي كَالسَّحَابِ ... أَذَاكِ النَّوْمُ مِلْأَكِ فِي الْمُصَابِ [1]
فَبَكِّي مَا اسْتَطَعْتِ الْيَوْمَ حُزْنًا ... عَلَى الْحَبْرِ الْعَرِيقِ الْمُسْتَطَابِ
لَقَدْ عَزَّ الْعَزَاءُ فَلَسْتُ أَشْكُو ... إِلَى مَنْ مَا تَمَسَّكَ بِالْإِيَابِ
مُحَمَّدْ غَوْثُ سُلْطَانُ الْمَعَالِي ... إِمَامُ الْأَصْفِيَاءِ بِلَا ارْتِيَابِ
فَأَظْلَمَتِ الشَّرَائِعُ يَا لَبُؤْسٍ ... وَلَاحَتْ قَبْلُ ذَا مِثْلَ الشِّهَابِ [2]
لَقَدْ نَضَبَتْ عُيُونُ الْعِلْمِ تَجْرِي ... فَتَبًّا يَا لَلْجَهْلِ فِي التَّبَابِ [3]
أَمَا وَاللهِ إِنَّ الْعَيْشَ عَارٌ ... وَأَرْغَدُ عَيْشِنَا تَحْتَ التُّرَابِ
فَصَبْرًا يَا أُولِي الْإِيقَانِ صَبْرًا ... عَلَى مَا قَدْ دَهَاكُمْ مِنْ عِقَابِ
صُرُوفُ الدَّهْرِ لَيْسَ لَهَا انْجِزَامٌ ... فَخُذْ عَنْهَا إِلَى حُسْنِ الْخِطَابِ
مَضَى وَالنَّارُ تَقْدَحُ فِي حَشَانَا ... سَقَتْ أَوْصَالَهُ دِيَمُ الرَّبَابِ
تَرَحَّلَ عَنْ مَكَانٍ لَيْسَ فِيهِ ... قِيَامٌ لِلْأَجَانِبِ وَالصِّحَابِ
عَدَى ذُو الْقَعْدَةِ اثْنَيْنِ اعْتِدَادًا ... فَكَانَ خَمِيسُهُ يَوْمَ الذَّهَابِ
فَقُلْتُ مُؤَرِّخًا فِيهِ اكْتِئَابًا ... عَلَيْكَ سَلَامُ ذِي الْكَرَمِ الْحُبَابِ [4]

١٣ هـ ٠٦

۱۳ر مارچ ۹۷ء یوم الجمعہ

* من بحر الوافر والقافیة متواتر .

[1] الهمزة فی "أذاكِ" للاستفهام .

[2] اللام فی "لبؤس" للاستغاثة .

[3] اللام فی "لجهل" للاستغاثة .

[4] ماخوذ من حباب الماء ای مُعْظَمُهُ .

في نعت الرسول صلى الله عليه وسلم *

وداعك سام قلبي مستريحا	ففاض الدمع من جفني قريحا
لقد جرحتني يا ليت شعري	متى تبرئين لي سهما جريحا
عثرت على خبايا ما بقلبي	فكيف ولم أبح بكذا صريحا
نعم والحب لا يخفى علينا	وإن كان الفؤاد له ضريحا
فلو أن الهوى هبت رياحا	لهبت في دجى ليل كلوحا[1]
ولو أسمعت ما بي من هواها	إذا لغدت جبال الأرض فيحا
كذا العشاق في الدنيا قديما	لقد مرضوا ولم يجدوا مسيحا
وظنوا أنهم لا دين فيهم	وهم قد أخلصوا دينا نصوحا
رأيت القوم ذلوا للمخازي	وهم فاقوا الورى شرفا جموحا
دنت مني فقلت لها أبيني	متى أرجو لقاءك مستبيحا
إذا ما الناس يلتمسون هزلا	فإني أطلب الرأي النجيحا
فإن الرأي أكثر ما تراه	يكون إذا ارتئيت هوى طريحا
فإن الحب فاعلم خير رأي	فرأيي في ابن آمنة صبيحا
محمد أنت خير الناس طرا	ومن ذا يكره القول الفصيحا

* من بحر الوافر والقافية متواتر .

[1] الكلوح : بدو الأسنان عند العبوس .

وَانْطِقْ وَحْيُ رَبِّكَ بِالْبُشْرَى ... مَسِيْحَ ابْنِ الْبَتُوْلِ بَلِ السَّطِيْحَا[1]

فَتَهْدِيْنَا صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا ... وَتَأْمُرُنَا وَتَنْهَانَا فَصِيْحَا

وَتَكْشِفُ عَنْ خَبِيْئَاتِ الْمَعَانِيْ ... كَنَافِقَةٍ أَبَتْ أَنْ لَا يَفُوْحَا

وَعَهْدُكَ بِالْأَرَامِلِ وَالْيَتَامَى ... لِمُصْبِحِهِمْ وَمُمْسَاهُمْ مَرُوْحَا[2]

لَقَدْ عَرَجَ الْإِلٰهُ بِكَ اصْطِفَاءً ... إِلَى الْعَرْشِ اسْتَوَيْتَ عَلَيْهِ رُوْحَا

فَهٰذَا الْحَقُّ لَا يَخْفٰى وَلٰكِنْ ... تَعَمَّدَتِ النُّفُوْسُ بِهِ جُنُوْحَا

صَدَعْتَ بِمَا أُمِرْتَ بِهِ وَلٰكِنْ ... تَجَاوَزُ عَنْ سَفَاهَتِهِمْ صَفُوْحَا[3]

إِذَا الْتَقَتِ الطَّوَائِفُ يَوْمَ بَدْرٍ ... أَتَاكَ النَّصْرُ يَخْذُلُهُمْ فَضُوْحَا[4]

"أَيَا قَتْلَى قُرَيْشٍ يَوْمَ بَدْرٍ ... وَأَلْبَسَتِ الْوُجُوْهُ دَمًا سَفُوْحَا

---

[1] السطیح: کاھن بنی ذئب کان یتکھن فی الجاھلیة واسمه ربیعة بن عدی بن مسعود بن مازن بن ذئب، کان یخبر بمبعث نبینا صلی الله علیه وسلم عاش ثلاثمائة سنة و مات فی ایام انوشروان بعد مولده صلی الله علیه وسلم قیل سمی بذلك (سطیح) لأنه لم یکن له بین مفاصله قصب فکان ابداً منبسطاً مسطحاً علی الارض لا یقدر علی قیام ولا قعود (تاج العروس ۲: ۱۶۳) قال الآلوسی: قال سطیح قبل ظهور رسول الله صلی الله علیه وسلم: "اذا ظهرت التلاوة وفاض وادی السماوة، وظهر صاحب الهراوة، فلیست الشام لسطیح بشام، یملك منهم ملوك أو ملکات عدد سقوط الشرفات، وکل ما هو آتٍ آت۔" (بلوغ الارب ۳: ۲۸۲)

[2] مروح: یقال فرس مروح (من المرح) ای نشیط۔

[3] مأخوذ من قوله تعالی: فاصدع بما تؤمر (۱۵: ۹۴) والصفوح: الکریم، لأنه یصفح عمن جنی علیه۔

[4] اشارة الی ما قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم بدر یخاطب المقتولین من قریش وکان القاهم فی القلیب انه عدد من کان منهم فی القلیب وهو یقول یا اهل القلیب یا عتبة بن ربیعة ویا شیبة بن ربیعة ویا امیة بن خلف ویا اباجهل بن هشام هل وجدتم ما وعد ربکم حقا فانی قد وجدت ما وعدنی ربی حقا۔ والفضوح: اسم کالفضیحة من افتضح الشیء اذا انکشفت مساویه۔

تَرَكْتَ الْقَوْمَ فِي الْهَيْجَاءِ صَرْعَى ... كَأَنَّ مِنَ الدِّمَاءِ لَهُمْ مُسُوحَا [١]

دَلَلْتَ عَلَى مَصَارِعِهِمْ فُرَادَى ... قُبَيْلَ الْحَرْبِ فَانْتَظَرُوا وُضُوحَا

وَأَنَّ الْقَوْمَ لَمْ يَأْلُوا خَبَالًا ... وَقَدْ فَتَحَ الْإِلٰهُ لَكَ الْفُتُوحَا [٢]

وَكُنْتَ عَلَى تَمَرُّدِهِمْ رَؤُوفًا ... دَعَوْتَ لَهُمْ وَلَمْ تَحْدُوكَ نُوحَا [٣]

تَقَلَّدُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَوْمًا ... فَتَخْرُجُ رَاكِبًا فَرَسًا سَبُوحَا [٤]

إِذَا مَا الْقَوْمُ يَجْتَنِبُونَ زَحْفًا ... فَتَغْدُو وَاثِقًا بِاللّٰهِ رِيحَا

وَتَدْعُوهُمْ وَلَمْ يَلْوُوا وَفَرُّوا ... فَكُنْتَ هُنَاكَ بِالْحُسْنَى شَحِيحَا [٥]

وَسَلَّاكَ الْإِلٰهُ عَلَى أَذَاهُمْ ... فَلَمْ يُحْزِنْكَ مَا قَالُوا قَبِيحَا [٦]

أَتَى أَمْرُ الْإِلٰهِ فَلَا تَعَجَّلْ ... سَيَلْقَى الْمُشْرِكُونَ كَمَا أُتِيحَا [٧]

وَأَنْتَ رَسُولُنَا لَا رَيْبَ فِيهِ ... مُبَشِّرُنَا وَمُنْذِرُنَا نَصِيحَا [٨]

---

١ المسوح : جمع المسح وهو البلاس او الكساء من الشعر .

٢ اشارة الى الآية الشريفة : قال الله تعالىٰ فی حق الكفرين : لا يألونكم خبالاً (٣ : ١١٨)

٣ قال القاضی عياض فی كتابه الشفاء بتعريف حقوق المصطفیٰ (ص ٤٩) أنّه صلی الله عليه وسلم قال يوم فتح مكة : ما تقولون انی فاعل بكم قالوا : خيرًا أخ كريم وابن اخ كريم فقال اقول كما قال أخی يوسف : لا تثريب عليكم اليوم يغفر الله لكم وهو ارحم الراحمين . (القرآن : ١٢ : ٩٢) اذهبوا وانتم الطلقاء .

وكان نوح عليه السلام دعا على قومه وقال : ربّ لا تذر على الارض من الكفرين ديّارا (القرآن ٧١ : ٢٦)

٤ تقلّد ای تتقلّد فحذفت التاء الاولیٰ ، وتقلّد الامر : احتمله ، وكذلك تقلّد السيف وهو المراد فی هذا البيت . والسبوح : صفة الفرس وهو سريع الجری .

٥ كما قال تعالیٰ : اذ تصعدون ولا تلوٗن علی احد والرسول يدعوكم فی اخراكم . (٣ : ١٥٣)

٦ كما قال تعالیٰ : فلا يحزنك قولهم . (٣٦ : ٧٦)

٧ اشارة الی قوله تعالیٰ : اتی امر الله فلا تستعجلوه (١٦ : ١)

٨ اشارة الی الآية : انّا ارسلناك شاهدًا ومبشرًا ونذيرًا . (٣٣ : ٤٥)

وَعَلَّمْتَ الْحَوَاضِرَ وَالْبَوَادِيْ — كِتَابَ اللّٰهِ لِلتَّهْذِيْبِ الْمُنْجِيَا [1]
أَلَا يَا ابْنَ الذَّبِيْحَيْنِ الْمُرَجَّىٰ — حُقُوْقَ الْحُبِّ كُنْتَ لَنَا مُبِيْحَا [2]
فَكَيْفَ إِذَا حَضَرْتُ وَأَنْتَ سَاعٍ — لِمَغْفِرَتِيْ وَكُنْتُ إِذًا رَزِيْحَا [3]
وَشِعْرِيْ رِقْيَةٌ مِنْ غَيْرِ رَامٍ — فَأَعْطِ الْقَوْسَ بَارِيَهَا مَدِيْحَا [4]
مَحَاسِنُكَ الْمَلِيْحَةُ أَنْطَقَتْنِيْ — فَشِعْرِيْ لَا تَرَىٰ إِلَّا مَلِيْحَا

---

١ يعلّمهم الكتاب والحكمة (القرآن، ٢: ١٢٩)

٢ قال صلى الله عليه وسلم: أنا ابن الذبيحين يعني اسمعيل عليه السلام الذي كان رسول الله صلى الله عليه وسلم من نسله ووالده صلى الله عليه وسلم عبد الله بن عبد المطلب كما هو مذكور مفصّلا في كتب السيرة.

٣ الرزيح: من رزاح الإبل اذا ضَعُفَتْ وَلَصِقَتْ بالارض فلم يكن بها نهوض.

٤ قال الميداني اي استعن على عملك بأهل المعرفة والحذق فيه.

وقال حين ورود وفد المصريين ببلدة لاهور صانها الله عن الحور بعد الكور *

ألا يا قوم عاد اليوم عيد	فهل لكم طريف أو تليد
نعم ونفوسنا علق نفيس	ألا يا مسلمي لاهور جودوا
لسادتنا الكرام فيا لبشرى	برؤيتهم تهللت الخدود
هم سبقوا الورى حسبا ودينا	فحسبك أن خالقنا شهيد
وكانوا عروة وثقى هداها	مهيمننا فأعجبنا الورود
فإن البحر لا يأتي عطاشا	فروانا وللعطش جمود
صروف الدهر قد بلغت مداها	فلا والله ليس لها مزيد
وقد وردت مياه القوم قدما	غرائب نام عنها من يذود [1]
وكنا قبل نسقي كل ظام	فلا غيض يخاف ولا نفود
يخوفنا مغاربة النصارى	ثعالب في دوائرهم أسود
وكنا أمس نحمي كل روع	فعدنا اليوم راعتنا اليهود [2]
وقد قطع الإله بأن ذلا	ومسكنة لهم أبدا عتيد [3]

* من بحر الوافر والقافية متواتر

[1] غرائب الابل، هي التي ليست من القوم.

[2] اشارة الى يهود فلسطين الذين يحاربون المسلمين.

[3] كما قال الله تعالى: وضربت عليهم الذلة والمسكنة. (القرآن ۲:۶۱)

وحرّضها اللئام على عتوّ ... كلاب أو ذئاب أو قرود [1]

ألا يا قوم لا تخشوا عدوًّا ... يمدّهم سلاح أو جنود

سيلقى المشركون وعيد عاد ... فإنّ الشرك ليس له خلود [2]

فيا ربّ الورى دمّر عليهم ... وأبعدهم كما بعدت ثمود [3]

فيا ربّ العباد امنن علينا ... فإنّك ربّنا ربّ ودود

ألا يا عصبة الأخيار قوموا ... لملّتنا وليس لها عمود

رويدك أيها الدهر الغشوم ... إلى كم نجتديك ولا تجود

ضننت بذاك قرنًا بعد قرن ... إلى ما ليت شعري ولا تعود

وتطعم غيرنا لحمًا طريًّا ... ويأبى قدر سادتنا قديد

يسيئنا من عطاياك اللواتي ... سمحت بها وجدت بما تريد

وكنّا أسوة الأقوام طرًّا ... فها الآن نستفيد ولا نفيد

أعد أيامنا أيام خفض ... ليجمع شملنا عيش رغيد

لنا النيران أوقدها ضرام ... قرونًا ثم أطفأها الخمود

لبثت بأهله زمنًا طويلًا ... فصرت وليس لي للعجم عود [4]

فيا أسفًا على ما فات قومًا ... من العلياء ليس لها نديد

وأمر هاجه سفهاء قوم ... فيعجز عن تداركها وفود

وإن يبعثنا يا قوم خزي ... حللناها كأنّا لا نعود

إلى كم ذا التخلّف والتواني ... وأين من الحفيظة ذا القعود

---

1. اشارة الى بعض دول النصارى الذين حموهم
2. فان تولوا فقد ابلغتكم ما ارسلت به اليكم ويستخلف ربي قومًا غيركم ولا تضرونه شيئًا انّ ربي على كل شيء حفيظ (١١ : ٥٧)
3. فبعدًا لمدين كما بعدت ثمود (القرآن، ١١: ٩٥)
4. يقال عجمت العود اذا عضضته للخبرة

قال في خيانة الدنيا متضمناً *

وبرق يطمع العيس الصوادي ... فتخدعها العشايا والغوادي

كذا الدنيا يزخرفها خلوب ... فيعشقها الحواضر والبوادي

إذا ما أذنت بالوصل يوما ... فسوف ترى بفرقتها تنادي

فلا يغررك ما منها يداري ... ولا يؤنسك ما منها يعادي

وجربت الأحبة طول عمري ... فلم أر غير مغشوش الوداد

فقلت لهؤلاء ارموا عدوي ... فلما أن رموا جرحوا فؤادي

ابيات التضمين [1]

وإخوان حسبتهم دروعا ... فكانوها ولكن للأعادي

وخلتهم سهاما صائبات ... فكانوها ولكن في فؤادي

وقالوا قد صفت منا قلوب ... لقد صدقوا ولكن من ودادي

وقالوا قد سعينا كل سعي ... لقد صدقوا ولكن في فسادي

---

* من بحر الوافر والقافية متواتر

[1] الابيات الاربعة لعلي بن فضالة أو ابن الرومي (معاهد التنصيص ٢:٦١)

اهدیٰ لہ السید عبد الحق حقی الاعظمی البغدادی الازھری
(نزیل بلدۃ لاہور) کتاب مقامات الزمخشری فقال مرتجلاً

قَبِلْتُ قَبُوْلَ الْاَرْضِ غَیْثاً تَتَابَعَتْ   شَآبِیْبُہٗ مِنْ بَعْدِ مَا انْقَطَعَ الْمَطَرْ

* من بحر الطویل و القافیۃ متدارک

بلبيت ربوع الدين *

ألا يا قوم دهري كم يجور ... إلامَ رحى زلازله تدور

دموع لا تكفّ عن انهمار ... ونار سعّرت منها السعير

أقامتني الهموم وأقعدتني ... فهل إني لصبّار شكور

وإن يومًا وقيت الشرّ منه ... صباحًا فالمساء بي الجفير

فإن تكن المصائب طاردتني ... فعزمي ما تضعّفه الدهور

فعيشي جلّه زند شحاح ... وهمّي كلّه كلب ومور [1]

تعوّدت السفار على ركاب ... بها ضجر وملّني البكور

ركبت متون فيفاء المنايا ... فلي فيها الصبا ومنها الدبور [2]

تديّرت المهامه والبراري ... وجيراني وحوش أو طيور

أقاسي ما أراعي النجم ليلا ... فكم تحمى من الشمس الذرور

أهرول من خليل السوء حتى ... أفارقه فلي منه العذير

أعذّبه عذاب الهون يومًا ... وأهجره بهجر لا يبور

فآمن من مكارهه تبيعًا ... وأكبر خشيتي منه الغرور

فأشرب من نمير الماء صفوًا ... وتطعمني من اللحم الصقور

---

* من بحر الوافر والقافية متواتر.

1 زند شحاح: لا يوري كأنه يشحّ بالنار.

2 قال صلى الله عليه وسلم يوم الأحزاب وكانوا اثني عشر ألفا حين حاصروا المدينة. "نُصرتُ بالصبا وأُهلكت عاد بالدبور". (مختصر شرح الجامع الصغير للمناوي ٢: ٣٢٩)

وَأَوْرَاقُ الْبَوَاسِقِ مُهَدَّدَاتٌ ... بِهَا دَاءُ الْيَبَسِ يَطِمُّهُ الدُّثُوْرُ

تُجِدُّ نَاقَتِيْ عِنْدَ التَّغَالِيْ ... أَرَاكُ الرَّمْلِ قُرْبِيْ بِهَا دُرُوْرُ

وَأَمْضِيْ فِيْ خُطُوْبِيْ مَا رَسَتْنِيْ ... مَضَاءَ السَّيْفِ جَرَّدَهُ الْغَيُوْرُ

وَحِيْدًا فِيْ صَفَاصِفَ هَوَّلَتْنِيْ ... مِنَ الْإِيْغَالِ لَا يُثْنِيْهِ نُوْرُ

فَمَنْ يَشْرِيْ بِغَيْدٍ نَاعِمَاتٍ ... فَمَا إِنِّيْ أُحِيْدُ وَلَا أَثُوْرُ

إِذَا دَنَّسْتَ نَفْسَكَ لَمْ تَصُنْهَا ... عَنِ الْفَحْشَاءِ بِئْسَ لَكَ الْمَصِيْرُ

إِذَا مَا كُنْتَ مُصْطَفِيًا نَصِيْحًا ... نَقِيًّا فَالْهُدٰى ظَبْيٌ نَفُوْرُ

وَمَنْ بَاعَ الْحَيٰوةَ بِجَمْعِ مَالٍ ... كَمَنْ دَارَتْ بِهَا مِنْهُ الْخُمُوْرُ

شَبَابُ الْمَرْءِ حُلْمٌ لَا تَرَاهُ ... لَهُ الرُّجْعٰى إِلَيْهِ بِهَا يَحُوْرُ

حَلَبْتُ الدَّهْرَ أَشْطُرَهُ قَدِيْمًا ... فَجَدْوٰى دَرِّهٖ فَاعْلَمْ يَسِيْرُ [1]

مَلِلْتُ الصَّحْبَ حَتّٰى لَا أَرَاهُمْ ... فَصِرْتُ الْيَوْمَ لِيْ مِنْهُمْ هَرِيْرُ

وَأَخْرُجُ فِيْ سَوَادِ اللَّيْلِ فَذًّا ... فَأُصْبِحُ وَالطُّيُوْرُ لَهَا طُمُوْرُ [2]

إِلَى الْمُتَعَبِّدِيْنَ بِلَا رِيَاءٍ ... بَلِ الْغَازِيْنَ صِدْقًا لَا يَخُوْرُ [3]

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ دِيْنًا ... حُمَاةُ الرَّوْعِ لِلْإِسْلَامِ سُوْرُ [4]

ذُعَاقُ الْمَاءِ يَسْقِيْهِمْ زُلَالًا ... وَيُطْعِمُهُمْ مِنَ الْخُبْزِ الشَّعِيْرُ [5]

---

١ يقال حَلَبَ فلان الدهر اشطره اى خَبَرَ ضروبَهٗ ۔

٢ الفذّ : الفرد ، يريد وحيدًا ۔ والطمور : شبه الوثوب فى السماء اى النهوض للطيران ۔

٣ خار يخور اى ضَعُفَ وانكسر ۔

٤ المبتدأ "هم" محذوف ، وكذالك فى المصراع الثانى و" اشدّاء على الكفار" ماخوذ من الآية الكريمة : اشدّاء على الكفار رحماء بينهم (٤٨ : ٢٩) فى مدح صحابة رضى الله عنهم ۔

٥ ماءٌ ذعاقٌ أو زعاقٌ : مُرٌّ غليظ لا يطاق شربه من أجوجته ۔

مَلَاعِبُهُمْ سُرُوجُ الدُّهْمِ شُعْثًا ... شَقَائِقُهُمْ دَمُ الْعَادِي يَفُورُ [1]

لَهُمْ شَرَفٌ مُعَلًّى فِي الْبَرَايَا ... وَعِزٌّ لَيْسَ يَعْرُوهُ الضُّمُورُ [2]

هُمُ خَاضُوا بِحَارَ دَمِ الْأَعَادِي ... كَأَنَّهُمُ أُسُودٌ أَوْ نُمُورُ

صَوَارِمُ وَالسُّيُوفُ لَهَا فُلُولٌ ... سِنَانٌ وَالرِّمَاحُ لَهَا قُصُورُ [3]

مَقَادِيمُ الْوَرَى ضَرْبًا وَطَعْنًا ... لَهُمْ فِي الْحَرْبِ كَالْأَسَدِ الزَّئِيرُ

أَصَاغِرُهُمْ نُجُومٌ بَازِغَاتٌ ... أَكَابِرُهُمْ شُمُوسٌ أَوْ بُدُورُ

صِعَادٌ فِي عِرَاصِ الْمَوْتِ زُرْقٌ ... غَدَاةَ الشَّرِّ وَالْأَعْدَاءُ بُورُ [4]

رَوَاجِحُ وَعْظِهِمْ سَيْفٌ صَقِيلٌ ... رَوَادِعُ نُصْحِهِمْ جَمٌّ غَفِيرُ

وَأَدْنَى هَمِّهِمْ أَنْ لَا يُضَامُوا ... وَأَسْفَلُ جُودِهِمْ كَرَمٌ وَخِيرُ [5]

فَيُبْهِجُ خِصْبُهُمْ فِي كُلِّ مَحْلٍ ... وَيُخْشَى مِنْ شَرَاسَتِهِمْ سَعِيرُ

أَلَا يَا جَابِرِي عَظْمٍ كَسِيرٍ ... جَنَاحُ الدِّينِ كَسَّرَهُ الْكَفُورُ

لَقَدْ بَلِيَتْ رُبُوعُ الدِّينِ طُرًّا ... فَمَا مِنْ أَهْلِهَا إِلَّا الْبَقِيرُ [6]

تَشَاءَمَتِ الدِّيَارُ كَجَوْفِ عَيْرٍ ... تَهَدَّمَتِ الْمَصَانِعُ وَالْقُصُورُ [7]

---

١ الشقائق: نَوْرٌ أحمر يسمّى شقائق النعمان، واحده وجمعه سواءٌ.

٢ ضمر يضمر ضُموراً اى هزل ولحق بطنُهٗ.

٣ المبتدأ "هم" محذوف فى كلا المصراعين.

٤ الصعاد جمع صعدة وهى القناة. وقال الله عز وجل "وكنتم قوماً بوراً" (٤٨: ١٢) اى هالكين الواحد والجمع والمذكر والمؤنث فيه سواءٌ.

٥ الخير: بالكسر، الكرم او الشرف.

٦ البقير: اسم جمع البقر.

٧ العير: اسم رجل كان له وادٍ مخصبٌ وقيل: هو اسم موضع خصيب غيّره الدهر فاقفر. فكانت العرب تستوحشه و تضرب به المثل فى البلد الوحش وكل واد عند العرب جوفٌ.

تَثَلَّمَتِ الحِيَاضُ فَلَا تَرَاهَا ... سَتَرْوِى العِيرُ مِنْهَا وَالنَّفِيرُ [1]

وَقَفْتُ بِهَا أُسَائِلُ عَنْ ذَوِيهَا ... دَعَوْتُهُمُ فَلَبَّتْنِي القُبُورُ

سَحَابُ الكُفْرِ قَدْ كَدَرَتْ نُجُومًا ... فَمَهْلًا أَيُّهَا الرِّيحُ الدَّبِيرُ

أُصِبْنَا بِالفُتُوَّةِ لَيْتَ شِعْرِي ... إِلَى أَيِّ البِلَادِ لَنَا المَسِيرُ

سَأَبْكِي مَا حَيِيتُ عَلَى كِرَامٍ ... مَضَوْا سَلَفًا بِدَمْعٍ لَا يَغُورُ

فَلَوْ أَنِّي رُزِئْتُ بِغَيْرِ دِينٍ ... لَعَادَ إِلَى المَكَارِمِ مُسْتَجِيرُ

وَأَهْلُ العَصْرِ أَكْثَرُهُمْ لِئَامٌ ... فَأَكْرَمُ مَنْ تَرَى كَلْبٌ عَقُورُ

ذِئَابٌ غَيْرَ أَنَّهُمُ قُرُودٌ ... كِلَابٌ بَيْدَ أَنَّهُمُ حَمِيرُ

أَشِرَّاءُ صَعَالِيكٌ دُهَاةٌ ... عِدَاءٌ رَعَادِيدٌ سَحُورُ

أَسَافِلُ مُعْرِضُونَ عَنِ المَعَالِي ... أَرَاذِلُ وَالشُّرُورُ لَهُمْ سُرُورُ

هَجَوْتُهُمُ وَمَا هَجْوِي لِحَظٍّ ... وَلَكِنْ قَدْ تَفَصَّمَتِ الأُمُورُ

فَقَدْنَا كُلَّ مَنْ يَحْمِي حِمَاهُ ... فَلَاقَتْنَا المَخَازِي وَهْيَ دُورُ

تُوُعِّرَتِ المَسَالِكُ بِالبُؤْسِ ... دِمَاثُ الأَرْضِ لَيْسَ لَهَا مُرُورُ

لَقَدْ بَلَغَ الزُّبَى سَيْلُ الرَّزَايَا ... تَعَدَّى مَا تَعَدَّاهُ الوُفُورُ [2]

---

1. النفير: يقال فلان لا في العير ولا في النفير؛ قيل هذا المثل لقريش من بين العرب، و ذلك أن النبي صلى الله عليه وسلّم، لما هاجر الى المدينة ونهض منها لتلقى عير قريش سمع مشركو قريش بذلك، فنهضوا ولقوه ببدر ليأمن عيرهم المقبل من الشام مع أبي سفيان، فكان من أمرهم ما كان، ولم يكن تخلّف عن العير والقتال الّا زمِنٌ أو من لا خير فيه، فكانوا يقولون لمن لا يستصلحونه لمهمٍّ: فلان لا في العير ولا في النفير، فالعير ما كان منهم مع ابي سفيان، والنفير ما كان منهم مع عتبة بن ربيعة قائدهم يوم بدر.

2. الزبى: يقال في المثل قد بلغ السيل الزبى، يضرب مثلاً للأمر يتفاقم أو يتجاوز الحدّ حتى لا يتلافى والزبى، جمع زُبْيَة وهي الرابية لا يعلوها الماء.

فهل يا أيها الأبرار فيكم ... أبي النفس معتمد وقور

كريم باذل حر غريق ... رحيم ماجد خرق صبور

ليقرع بالعصا رجلا لئيما ... ويكفي أن يجيئا ما يشير [1]

شريعتكم صراط مستقيم ... كتابكم لكم نور فنور

هداتكم مصابيح الدواجي ... أئمتكم لهم فضل غزير

نبيكم زعيمكم جميعا ... شفيعكم ويومكم عسير

فيوما يجعل الولدان شيبا ... ويوما تقرأ الصحف النشور

يقدم بين أيديكم كتاب ... فيفشي كل ما تخفي الصدور

فمنكم من له الفردوس حقا ... ومنكم من له شر يطير

ألا يا أبلغا عني كريما ... وقولا أيها السمح الشكور

لحزم منك أن تسعى لخير ... بعزم لا تفارقه النذور

فأنجد من رأى حضنا بسعي ... وغار ببغية بطل جسور [2]

إذا لم تكتسب بالمال خيرا ... فرب الناس بالباغي البصير

وكم من مكثر لا خير فيه ... ومربضه ومبركه نحور

لحا الله الضنين ببذل مال ... سيسلب حين خانته الشهور

قليل القل عز من كريم ... كماء سال يحمد بها الغدير

كثير الكثر ذل من لئيم ... كلحم خاصمت فيه النسور

تعالوا نعتصم بالله نبكي ... لتكشف عن مآربنا الستور

نقد جهد السوابق يوم بدر ... نعيد الشمس منه لها بدور

---

1. قال الميداني تحت المثل: "إن العصا قرعت لذي الحلم" يضرب لمن اذا نبه انتبه.
2. حضن: اسم جبل في أعالي نجد وفي المثل السائر: "أنجد من رأى حضنا" اى من عاين هذا الجبل فقد دخل في ناحية نجد.

تَقُدُّ الْبِيضُ بِيضَ سَرَاةِ قَوْمٍ ‏ ‏ ‏ تَشُقُّ جَمَاجِمًا بِدَمٍ يَمُوْرُ

فَنَشْكُوْ كُلَّ قَوْمٍ قَدْ أَضَاعُوْا ‏ ‏ ‏ حَفِيْظَتَنَا تَشُدُّهُمُ السُّيُوْرُ

لَعَلَّ اللّٰهَ يَنْصُرُنَا عَلَيْهِمْ ‏ ‏ ‏ وَيَخْذُلُهُمْ وَمَا لَهُمُ ظَهِيْرُ

وَإِنْ كُنَّا عَصَيْنَاهُ بِجَهْلٍ ‏ ‏ ‏ بِعَقْلٍ قَدْ دَعَوْنَا يَا غَفُوْرُ

فَيَا رَبَّ الْعِبَادِ ارْحَمْ إِذَا مَا ‏ ‏ ‏ غَضِبْتَ عَلَيْهِمُ فَمَنِ الْمُجِيْرُ

۲۲ رمضان ۱۳۱۳ھ — ۸ مارچ سنہ ۹۶ء —

۲۷ پھاگن ۱۹۵۲ یوم یک شنبہ

وقال عند خطب جليل *

أُصِبتُ بِما قد كان ما شئتي	فما لستُ أشكو ما رُزِئتُ به صبرا

۳۰ ر يناير ۹۸ء

* من بحر الطويل والقافية متواتر ـ

قال فی صباه ٭

إِذَا ابْيَضَّ فَرْعُ الْمَرْءِ لَمْ يَبْقَ زَيْنُهُ	فَلَمْ تَرَ فِي صُدْغَيْهِ مَا رَاقَ أَكْثَرَا
وَمَا أَعْجَبَ التَّدْهِينَ شَعْرًا مُجَعَّدًا	وَمَا أَخْلَبَ التَّرْجِيلَ فَوْدًا مُضَفَّرَا
وَمَا زَيَّنَ الْغِيدَ الْحِسَانَ كَلِمَّةٍ	غُرَابِيَّةٍ بِالْفَرْقِ حِيْنَ تَعَطَّرَا
وَحُسْنُ شَبَابٍ بِالسَّوَادِ مُصَدَّقًا	وَحُسْنُ مَشِيبٍ بِالْخِضَابِ مُزَوَّرَا

٭ من بحر الطویل والقافیة متدارک .

ومما قال مرتجلا في السفير العثماني *

نسيم الصبا فاحت مطيبة النشر	كأنك كالمسك الفتيت أو العطر
أتيت كغيث المحل قوما أبت لهم	حميتهم أن لا يميلوا إلى الشكر
على خصب وادينا بهديتك التي	تداوي مريض الحب تقلق بالهجر
سنشكر شكر الليس عنا بمعزل	وندعو الك الخيم اشتياقا إلى البر
سلام على ملك المكارم والعلى	من الرب ما قام الأحباء بالنصر
خليفة رب العالمين برحمة	لكي يغلب الكفار بالجبر والقهر
فها نحن ندعو دعوة مستجابة	أتاه الهدى حتى القيمة والحشر

٧/مایو ۹۷ء

* من بحر الطويل والقافية متواتر .

وقال في وفد المصريين *

نُهَنِّيكِ يا لاهُورُ يا بَلْدَةَ الْعُلى — بِمَا بَارَكَتْ أَيْدِي الْإِلٰهِ مِنَ النِّعَمْ

لَقَدْ كُنْتِ قَبْلَ الْيَوْمِ فِي الْعُسْرِ بُرْهَةً — فَهَا قَدْ أَتَاكِ الْفَوْزُ بِالنُّجْحِ وَالْيُسْرِ

فَنُوهِي بِحَمْدِ اللهِ لَا زِلْتِ فِي الْغِنَى — وَقُومِي بِطِيبِ الْعَيْشِ فِي الْخِصْبِ وَالنِّعَمْ

سَقَتْنَا صُرُوفُ الدَّهْرِ كَأْسًا مِنَ النَّوَى — شَهِيًّا وَإِنْ كَانَتْ أَمَرَّ مِنَ الْعَلْقَمْ

فَذَاكَ أَوَانُ الْوَصْلِ وَصْلِ أَحِبَّةٍ — بِرُؤْيَتِهِمْ قَدْ نِلْتِ مَا نِلْتِ مِنْ قِدَمْ

* من بحر الطويل والقافية متواتر .

وقال يرثي القاضي حميد الدين اللاهوري *

لدمعي جريانٌ إلى منتهى النحرِ	لذكرِ الذي قد بان حتّى انقضى عمري
خبيئةُ سرّي ترجمتها سواجمي	فظاهرُها في الجسم دلّ على سرّي
سقى اللهُ أيّامًا مضت في جوارهم	وهل يستطيعُ الصبُّ صدًّا عن الهجرِ [1]
إذا ما أراد المرءُ فوزًا ببغيةٍ	فليس له بدٌّ من المسلك الوعرِ
خليليّ ما ذا النومُ عن سوء النهى	لقد عيل صبري في المهامهِ والقفرِ [2]
أعاذلتي ما عشتي في ملامتي	بأنكد من أن أعرف النوم بالغدرِ
دعي كلّما أبكي على من فقدته	بكا قصرت خنساءُ عنه على صخرِ
وكيف التذاذي بالصباح تنسّمًا	إذا غاب عن عيني بدرُ الدجى بشري [3]

* كان القاضي حميد الدين جدّ الخليفة شجاع الدين (المحامي) بن الخليفة عماد الدين. وكان القاضي بلاهور ورئيس لجنة "انجمن حمایت اسلام" وكان يُعَدّ في العلماء وأصحاب الفتوى وقد ترقّت اللجنة في عهده كثيراً. فانتقل الى رحمة الله تعالى في ١٠ رمايو ١٨٩٦ء وكانت وفاته موجب خُسرانٍ عظيم للجنة. فرثاه مولانا الروحي بهذه القصيدة وكان نقلها عند السيد نور محمد القادري في قرية من مقاطعة گجرات. فارسل الىّ عكسه. والمرثية من بحر الطويل والقافية متواتر.

١ في نسخة "و" ونسخة العكس: 'ردًّا على هجرٍ'

٢ في "و" ونسخة العكس: 'خليلاي' والأولة: الحالة والجمع الآل. وعيل صبري: مجهول من عال يعول عولاً اي غُلِبَ. وفي نسخة "و" ونسخة العكس: "بالمهامه" مكان "في المهامه".

٣ التنسّم: طلب النسيم واستنشاقه وفي نسخة 'و' ونسخة العكس: "وكيف عنائي ليلة مدلهمّة" وفي "و" ونسخة العكس: "وقد غاب" مكان "إذا غاب"

فَقَدْتُ امْرَءًا لَوْلَا حِذَارُ مَلَامَةٍ   لَقُلْتُ أَرَى كُلَّ الْخَلَائِقِ فِي الْقَبْرِ

فَمَوْتُ حَمِيدِ الدِّيْنِ إِحْدَى مَصَائِبَ   دَهَتْ دِيْنَ أَحْمَدَ النَّبِيِّ عَلَى ذُعْرِ

تَصَامَمْتُ لَمَّا أَنْ سَمِعْتُ بِمَوْتِهِ   فَضَحْوِي عَلَيْهِ الْبَاجِهَاتُ مِنَ السُّكْرِ ١

فَيَا لَيْتَ شِعْرِي مَا الَّذِي قَدْ أَمَاتَهُ   وَقَدْ كَانَ يُحْيِي الْحُكْمَ مَا امْتَدَّ مَدَى الدَّهْرِ

فَتَى الْجُوْدِ وَالْمَجْدِ الْأَثِيْلِ فَلَا تَرَى   مَوَالِيَهُ أَنْ يَشْتَكُوا الْخَيْرَ مِنْ فَقْرِ ٢

فَتًى عَاشَ فِي اسْتِرْضَاءِ مَوْلَاهُ بِالتُّقَى   فَلَمْ يَكُ عَنْ ذِكْرِ الْإِلٰهِ عَلَى صَبْرِ ٣

لَقَدْ أَجْدَبَتْ أَرْضُ الْعُلُوْمِ فَمَا تَرَى   بِهَا قُضُبًا تَخْضَرُّ عَلَى جَدْوَلٍ يَجْرِي ٤

فَمَنْ لِي بِالْقَاضِي الْحَمِيْدِ الَّذِي لَهُ   خَلَائِقُ فِي الْآفَاقِ طَيِّبَةُ النَّشْرِ

نُكَابِدُ حُزْنًا مُتْلِفًا جِذْمَ عَيْشِنَا   وَيَا رُبَّ عَيْشِ الْقَوْمِ أَعْسَرُ مِنْ خُسْرِ

فَتَعْسًا لِهٰذَا الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ مُوْجِعٌ   وَبُعْدًا لِهٰذَا الْعَيْشِ وَالْعَيْشُ بِالْمُرِّ

أَلَا أَيُّهَا الْمَوْتُ الْوَلُوْعُ بِمُهْجَتِي   إِلَى مَا تَجَنَّبُكَ الْمُجِيْدُ عَلَى شُكْرِ

هَوَتْ أُمَّةٌ مَا ذَا يُرِيْدُ مِنَ الْأَذَى   بِتَفْرِقَةٍ جَمْعَ الْكِرَامِ ذَوِي قَدْرِ ٥

لِيَبْكِ حَمِيْدَ الدِّيْنِ مَنْ كَانَ بَاكِيًا   فَقَدْ عَادَ بَاعُ الدِّيْنِ قَصْرًا عَلَى قَصْرِ ٦

وَلَا ضَيْرَ إِنْ أَخْنَتْ عَلَيْهِ طَوَائِحُ   فَمَا زَالَ صَنَامِيْنُ حَمِيْدٍ عَلَى ذِكْرِ ٧

---

١ في "ل" ونسخة العكس "السابقات"

٢ الأثيل: مجدٌ أثيل أي قديم. والمصراع الثاني لهذا البيت في نسخة "ل" وعكس هكذا:
"خلائقه قد اشرأبّت الى فقر"

٣ في نسخة العكس "الإلٰه".

٤ في نسخة ل ونسخة العكس "أقفرت روض العلوم".

٥ هوت أمّة: أي هلكت أمّه.

٦ في نسخة "ل" ونسخة العكس "فقد صار" وباع: قد قصر باعه عن ذلك: لم يسَعْه.

٧ أخنى عليهم الدهر: أهلكهم وأتى عليهم. والطوائح: المهالك.

فواللهِ ما تنساهُ لا هوتُ بلدةٌ ... إذا ما وفى عن نصرها الأمرُ بالبِرِّ

لهُ باقياتٌ صالحاتٌ ، فما لنا ... نعدُّ جناحَ الدِّينِ كسرًا بلا جبرِ [1]

فما ماتَ من يستخلفُ السبطَ بعدَهُ ... كريمًا إذا استنجدتَهُ قامَ بالنصرِ

فسلْ عمادَ الدينِ واسبقْ إلى العُلى ... رشيدًا سعيدًا أبلَ مجيدًا بلا نكرِ [2]

تحمَّلْ على ريبِ المنونِ فإنَّهُ ... وإن كانَ مرًّا سوفَ يحلو على الصبرِ

فكمْ من صحيحٍ ماتَ غيرَ مُحذَّرٍ ... وكم من عليلٍ عاشَ دهرًا ولا يدري

عليهِ سلامُ اللهِ في كلِّ ليلةٍ ... ورحمتُهُ دامتْ إلى مطلعِ الفجرِ [3]

٣ر اغسطس ١٩٦٤ء

[1] في نسخة "و" ونسخة العكس : "نعدّ انهضاض الخير"

[2] في نسخة "و" "واسعد" مكان "واسبق" ، في المصراع الثاني اسماء بعض اخوة عماد الدين وهو اكبر بني المرتضى .

[3] في "و" "كانت" مكان "دامت" .

وقال حین ورود لبعض رؤساالترک وہو یصافحہ *

اَلتُّرْکُ قَوْمٌ لَہُمْ فَضْلٌ عَلَی النَّاسِ کَالذَّاکِرِیْنَ لَہُمْ فَضْلٌ عَلَی النَّاسِیْ

* من بحر البسیط والقافیۃ متواتر .

وقال يتشوق الى صاحب الطيبة عليه افضل الصلوٰت *

تَبَارِيحُ أَشْوَاقٍ أُكَابِدُهَا أَسًى　　فَمَا أَنَا مِنْ لُقْيَاكَ لَسْتُ بِآيِسِ

* من بحر الطويل و القافية متدارك .

حفظ اللسان *

هَذِّبْ لِسَانَكَ مَا اسْتَطَعْتَ فَإِنَّهُ　　　لَا يَنْطِقُ الْمَرْءُ الْحَلِيمُ بِفَاحِشِ

* من بحر الكامل والقافية متدارك ۔

* سماط اللّٰه واسعٌ

رَكِبْنَا وَلَمْ نَرْكَبْ جَوَادًا جَرٰى بِنَا ... إِلَيْهِ وَلٰكِنَّ الرُّكُوْبَ لَنَا شَوْقُ
فَهَلْ يُبَلِّغَنِّيْ مِنْهَا لَا قَدْ سَمَا بِهٖ ... بُيُوْتٌ لَهٗ تَحْتٌ وَبَيْتٌ لَهٗ فَوْقُ
هُنَالِكَ سِمَاطٌ مَدَّهُ اللّٰهُ وَاسِعٌ ... يَلَذُّ بِهٖ قَلْبٌ أُتِيْحَ لَهٗ ذَوْقُ

* من بحر الطويل والقافية متواتر

العرف یسترق *

وَرَدْنَا مَاءَكُمْ حَتّٰى رَوِيْنَا	وَمَاءٌ سِوَاكُمْ فَابْتُهُ رَنِقٌ
وَقُلْنَا لَيْسَ مَشْرَبُنَا سِوَاهُ	فَإِنَّ الْعُرْفَ نَاسًا يَسْتَرِقُّ
حُقُوقٌ بَيْنَنَا لٰكِنْ قَلِيْلٌ	مُؤَدِّيْهَا إِلٰى مَنْ يَسْتَحِقُّ

* من بحر الوافر والقافیة متواتر ۔

وممّا ترجم مرتجلاً

يَقُولُوْنَ لِيْ مِنْ وَصْلِ حِبِّيَ عَاجِلًا ۔۔۔ وَإِلَّا فَقُلْ مَنْ يَسْتَطِيْعُ فِرَاقَهُ

فَيَا عَجَبًا لِلْحُبِّ فِيْ كُلِّ سَاعَةٍ ۔۔۔ يُكَلِّفُنِيْ نَفْسًا تُبَارِيْ اشْتِيَاقَهُ

※ من بحر الطويل والقافية متدارک ۔

طوبىٰ لقومٍ جاهدوا *

أَلا إِنَّ خَيْرَ الْقَوْلِ قَوْلُ مُصَادِقٍ ... يُحِبُّكَ فِي دِيْنِ الْإِلٰهِ مُرَافِقٍ

أَحَقُّ حَيٰوةِ الْمَرْءِ بِالذِّكْرِ لِلْوَرٰى ... لَمَا يَتَجَارٰى فِيْ سَبِيْلِ الْخَلَائِقِ [1]

وَمَا نَحْنُ فِي الدُّنْيَا تَصِيْدُ نُفُوْسَنَا ... بِفَخِّ الْهَوٰى إِلَّا كَبُلْهِ النَّقَانِقِ [2]

وَمَا نَالَ عَهْدِيْ قَطُّ مَنْ يَسْتَحِقُّنِيْ ... كَمَا لَمْ يَنَلْ عَهْدِيْ خُدُوْدُ الْعَوَاتِقِ [3]

وَمَا أَنَا إِلَّا كَالْفُرَاتِ لِشَارِبٍ ... عَلٰى أَنَّنِيْ مِلْحٌ أُجَاجٌ لِبَاصِقِ

فَتَعْسًا لِعَيْشِيْ مَا أَمَرَّ لَذِيْذَهُ ... إِذَا مَا جَنَيْتُ الشَّوْكَ جَنْيَ الشَّقَائِقِ

أُتِيْتُ رَغِيْدَ الْعَيْشِ فَالنَّكَدُ رَابَنِيْ ... فَرَرْتُ مِنَ الْبَلْوٰى فَعَادَتْ مَضَائِقِيْ

إِذَا الْمَرْءُ لَمْ يَسْلُكْ مَسَالِكَ رُشْدِهٖ ... فَسَوْفَ يُرٰى يَبْلِيْ بِشَرِّ الْمَزَالِقِ [4]

فَطُوْبٰى لِقَوْمٍ جَاهَدُوْا فِيْ صَلَاحِهٖ ... هَنِيْئًا لَهُمْ رَوْحَاتُ رَيَّا الْحَدَائِقِ

وَلَاسِيَّمَا قَوْمٌ أُحِبُّ النَّقْضَ هَمَّهُمْ ... فَهُمْ عَاقِلُوْ رَأْسِ الْجِبَالِ الشَّوَاهِقِ [5]

---

* من بحر الطويل والقافية متدارك .

[1] فی نسخة 'د' "شبابُ" مكان "حيٰوة" والمصراع الثانی فی 'د' هكذا "يشاوره فی اختيار الخلائق" والقراءة الثانی فی 'د' "يُحَاوِرُهٗ فی اختيار الحقائق"

[2] النقانق: جمع النِّقْنِقِ وَ النِّقْنَقُ : الظّليمُ

[3] العواتق : جمع عَاتِقٍ ، وهی جارية شابّة أو التی لم تَبِنْ عن اهلها .

[4] المصراع الاول فی 'د' هكذا : "إِذَا الْقَوْمُ لَمْ يَحْفَظْ حِمَى الدِّيْنِ بِالْقَنَا" .

[5] عاقلو : من عقل الظبْيُ عقلًا وعقولًا : صَعِدَ وامتنع .

وَهُمْ مُخْلِصُو دِيْنِ الرَّسُوْلِ لِرَبِّهِمْ ... وَهُمْ مُبْرِمُوْ اَثْنَاءِ حَبْلِ الْعَلَائِقِ ١

اَقَامُوا عَمُوْدَ الدِّيْنِ بِالْبَذْلِ جُهْدَهُمْ ... فَهُمْ طُنُبٌ وَالدِّيْنُ مِثْلُ السُّرَادِقِ ٢

هُمْ سَبَقُوْا اَجْرَ السَّلَاهِبِ كُلَّهَا ... لِفِسْكِلِهِمْ جَرْيٌ كَجَرْيِ السَّوَابِقِ ٣

اَلَا اِنَّ دِيْنَ الْحَقِّ دِيْنُ مُحَمَّدٍ ... اَتَانَا بِهِ رُشْدًا عَلٰى حُكْمِ خَالِقِ

حَبَانَا اِلٰهُ الْعَرْشِ مِنْهُ بِغَيْثِهِ ... بِتَهْطَالِهِ جِيْدَتْ قِفَارُ السَّمَالِقِ ٤

فَتُبْ اَيُّهَا النَّاسِيْ اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً ... وَقُمْ لِاقْتِنَاءِ الْخَيْرِ لَا كَالْمُنَافِقِ ٥

اَقُوْلُ بِلَاءِ الْفِيْ لَكَ الْخَيْرُ دَائِمًا ... اَلَا اَدْرِكِ الْيَوْمَ اجْتِنَابَ الْوَدَائِقِ ٦

---

١ اَثناء: اثناء الشيئ ومثانيه؛ قواه و طاقاته.

٢ فى نسخة "ل" "من مصحفٍ لنا" مكان "بالبذل جهدهم"

٣ السلاهب: فى نسخة "ل" "السوابح". والفِسْكِلُ والفُسْكُلُ: الذى يجيئ فى آخر الحلبة آخر الخيل.

٤ فى "ل" "بالاحمد الحيا" مكان "منه بغيثه". والسمالق: السملق؛ القفر الذى لا نبات فيه.

٥ فى "ل" "قبل التفارق" مكان "لا كالمنافق"

٦ الودائق: جمع وديقة وهى شدة الحر وحر نصف النهار.

وقال مرتجلاً يمدح ابا بكر محمد بن يحيى الصولي ؒ *

(مؤلف ادب الكاتب)

بِنَفْسِيْ يَا أَبَا بَكْرٍ كِتَابُكْ	أَمَا وَاللّٰهِ مَأْوَى الْعِلْمِ بَابُكْ
وَلَوْ لَا خَشْيَةُ الْإِطْرَاءِ يَوْمًا	لَقُلْنَا فَاقَ شُهْدَ الْقَوْمِ صَابُكْ
إِذَا مَا النَّاسُ لَا يَأْلُوْنَ سَعْيًا	فَمَبْلَغُ سَعْيِهِمْ أَبَدًا جَنَابُكْ

* من بحر الوافر والقافية متواتر .

جاء هذه الابيات فی قصیدته النعتیة فی اللغة الفارسیة
وهی مطبوعة

خَلِيْلَيَّ ارْجِعَا يَوْمًا فَقُوْلَا ... إِلَىٰ مَا يَنْتَهِیْ سَيْرُ الرَّوَاحِلْ

سَقَانَا الدَّهْرُ كَأْسًا مِنْ أُجَاجٍ ... فَهَلْ يَا قَوْمِ مِنْ عَذْبِ الْمَنَاهِلْ

فَشِمْنَا بَرْقَ طَيْبَةَ مِنْ بَعِيْدٍ ... نَمَا عَجِلْنَا عَنِ الْمَرْعَى الرَّوَاحِلْ

فَلَمَّا أَنْ وَرَدْنَاهَا عِطَاشًا ... سَقَانَا مِنْ نَدَىٰ كَفَّيْهِ وَابِلْ

* من بحر الوافر والقافية متواتر

وقال فی بعض المتنبئین *

تَسِيرُ إِلَى رَبْعِ الْحَبِيبِ الرَّوَاحِلُ ... فَيَا لَكَ شَوْقًا هَيَّجَتْهُ الْمَنَازِلُ [1]

مَنَازِلُ سَلْمَى لَا تَكَادُ تَرَى بِهَا ... أَنِيسًا يُرَاعِيهَا فَمَاذَا تُحَاوِلُ

مَنَازِلُ مَنْ لَوْ كَانَ حَيًّا يَزُورُهُ ... إِلَيَّ لَكَانَ الطَّيْفُ مِنْهُ يُوَاصِلُ

يُفَرِّقُنَا نَادِي الْغُرَابِ فَبَيْنَمَا ... نَرُوحُ وَنَغْدُو وَالدِّيَارُ أَوَاهِلُ

إِذَا بِصُرُوفِ الدَّهْرِ هَبَّتْ رِيَاحُهَا ... فَأَيْدِي السَّبَا كَانَتْ أَقَلَّ تَمَاثُلُ [2]

فَدَعْ ذِكْرَ سَلْمَى إِنَّ سَلْمَى لَخُدْعَةٌ ... إِذَا هِيَ قَدْ بَانَتْ وَشَطَّتْ مَرَاحِلُ

يُذَكِّرُنِي خَيْرَ الْقُرُونِ خِصَالُهُمْ ... كَرِيحِ الْخُزَامَى طَيَّبَتْهَا الْأَصَائِلُ

وَكَانَتْ فُرُوعُ الدِّينِ مُخْضَلَّةَ الثَّرَى ... فَهَذِي مَغَانِيهِ وَهَذِي الْمَوَاحِلُ

تَعَاقَبَنَا الْأَحْدَاثُ تَبْرِي عِظَامَنَا ... فَلَا نَسْتَطِيعُ الذَّبَّ عَنَّا نُقَاتِلُ

لَحَا اللهُ حِدْثَانَ الزَّمَانِ وَرَيْبَهُ ... نَخَافُ الرَّدَى مِنْ كُلِّ خَطْبٍ يُنَازِلُ

هَبَطْنَا وَرَبِّ الْبَيْتِ حَتَّى انْتَهَى بِنَا ... صَغَارٌ إِلَى مَا لَا يُجَاوِزُ سَافِلُ

لَقَدْ سَاءَنِي مَا قَدْ تَضَعْضَعَ مِنْ عُلًا ... وَنَحْنُ كَمَوْتَى غَيَّبَتْهُمْ جَنَادِلُ

تَرَى خَيْلَ أَقْوَامٍ تُسَابِقُ غَايَةً ... وَلَكِنْ جِيَادُ الْمُسْلِمِينَ جَوَافِلُ

---

* من بحر الطويل والقافية متدارك .

1 الزواحل : جمع الزاملة ، بعير يستظهر به الرجل يحمل عليه متاعه و طعامه .

2 السَّبأ : اسم رجل يجمع عامّة قبائل اليمن و هو سبأ بن يشجب بن قحطان و قالوا : تفرّقوا ايدی سبأ وايادی سبأ وضربت العرب بهم المثل فی الفرقة لأنّه لمّا أذهب الله عنهم جنّتهم و غرّق مكانهم تبدّدوا فی البلاد .

يُبَاهُونَ فِي النَّادِي إِذَا مَا تَأَلَّقُوا ... أَلَا ثَكِلَتْهُمْ بِالْبُغَاءِ الثَّوَاكِلُ ١

عُوَاةٌ قُصَارَى هَمِّهِمْ فِي حَيَاتِهِمْ ... قَنَاطِيرُ تِبْرٍ أَوْ حِسَانٌ شَوَاغِلُ

أَحَابِيشُ دَانَتْ بَيْنَهُمْ كَأْسُ قَرْقَفٍ ... تَدُورُ عَلَى الْأَوْشَابِ غِيدٌ حَمَائِلُ ٢

كُسَالَى إِذَا مَا جَاهَدَ الْقَوْمُ فِي الْعُلَى ... تَوَانَوْا فَحَظُّ الْقَوْمِ مِنْهُمْ رَذَائِلُ

نُفُوسٌ إِذَا مَا بِالْخَبِيثِ تَضَلَّعَتْ ... قَضَتْ مَا اسْتَطَاعَتْ فِي الْفِرَاشِ تُشَاغِلُ

وَتَلْبَسُ مِنْ خَزٍّ خِلَاعًا سَنِيَّةً ... وَتَهْجَعُ لَيْلًا فِي الْحَشَايَا تَثَاقُلُ

قَوَارِعُ دَهْرٍ قَدْ قَصَدْنَ عَدُوَّهُمْ ... فَعَادَتْ كَوَشْلٍ رَنَّقَتْهُ الْمَزَابِلُ

إِذَا اجْتَمَعَتْ أَخْيَارُهُمْ فِي مَقَامَةٍ ... تَرَاهُمْ تَلَقَّاهُمْ لِئَامٌ تُفَاضِلُ

إِذَا مَا رَأَوْا أَدْنَى الْمَخَافَةِ دُونَهَا ... عَلَتْهُمْ بِأَيَّامِ الْمَصِيفِ الْأَفَاكِلُ

ذَوَاعِفُ مَا يَأْتُونَهُ مِنْ مَحَارِمٍ ... أَلَا قَدْ سَقَوْا وَهْيَ السُّمُومُ الْقَوَاتِلُ ٣

إِذَا فِي عُلَا يَوْمًا تَقَاعَسَ هَمُّهُمْ ... وَإِنْ فَرَّقُوا يَوْمًا عَلَتْهُمْ غَوَائِلُ ٤

تَعَدَّوْا حُدُودًا لَا تَكَادُ تَعُدُّهَا ... فَلَيْسَتْ لَهُمْ عَمَّا أَتَوْهُ مَرَاحِلُ

دَنَتْ مِنْ أُولَى مُسْتَوْقِدِ النَّاسِ وَالْحَصَى ... جَهَنَّمُ لَا تُبْقِي عَلَيْهِمْ تُصَاوِلُ ٥

---

١ الثُّكْلُ والثَّكَلُ: فقدان الحبيب وأكثر ما يُستعمل في فقدان الرجل والمرأة ولدهما. والبغاء هو من بغى يبغي بغاءً اذا طلب.

٢ احابيش: جمع أُحْبُوشٍ: جماعة. والقرقف: الخمر وسُمّيت به لأنها تقرقف شاربها اى ترعده. والاوشاب: جمع الوِشْبِ بالكسر أى الأوباش وهم الضروب المتفرقة من الناس.

٣ الذعاف: سمّ ساعةٍ.

٤ تقاعس: يقال تقاعس الرجل عن الامر اذا تأخّر ولم يتقدّم فيه. والغوائل: جمع الغائلة و هى الداهية.

٥ أُولى: كهُدى. اسم يشار به الى الجمع. و تبقى: ابقى على فلانٍ اى رأى عليه ورحمه.

والتصاول: يقال صاوله اذا ساوره و واثبه.

ألا لا تغرّنّ الحياة أولئكم … فإنّ المنايا جندهنّ مخاتل

فيا ويلتي ماذا تريد من الهوى … وقد أهلك الأقوام قدمًا دخائل [1]

تعود ولا تخشى بوادر نقمة … تصول كطاوي الذئب والمرء غافل [2]

معاذيرها لا تحتظي بغنائها … إذا حجّها يوم الحساب المسائل

فهلّا تلا في القوم ذلًّا يسدّهم … وهلّا تجافى عن مخازٍ تشاكل

فلولا ذوو الأحلام قاموا بنصره … إذا ما رأوا أنّ الهدى متضائل

لقد نام أهل العلم طرًّا عن التقى … فها قد نسوا بطش الغيور يعاجل

ألا ليت شعري ما تلمّ بسافل … إذا ما توانى عن معالي الأفاضل

ولو لم يكن رأب النفاق مساورًا … لقام برأب الثأي منّا حلاحل [3]

إذا ما رأى الإيغال في القول غمّة … تظلّ مشراه الرماح العواسل [4]

وما زال منّا قائد بعد قائد … صبور كريم هبرزيّ مجامل [5]

ينادي بأعلى الصوت في حومة الوغى … وللبيض في فضل الضحى في مداخل

ثقيل على الأعداء والحرب خلسة … خفيف على الأحباب والفخر هائل

---

[1] الدخائل : جمع دخيلة وهي باطنة الرجل وبطانته .

[2] الطاوي : هو الذي يكون خالي البطن جائعًا لم يأكل .

[3] مساور : ساوره اي اخذ برأسه وغلبه . والثأيُ والثأي جميعًا الافساد كلّه يقال رأب الصّدع والاناء يرأبه رأبًا ، اصلحه وفي الحديث عائشة تصف أباها رضي الله عنهما ورأب الثأي اي اصلح الفاسد . والحلاحل : السيد في عشيرته ، الشجاع الرّكين في مجلسه ، ولا يقال ذلك للنساء .

[4] الايغال : السير السريع . والغمّة : الكرب ويقال ، امرٌ غمّةٌ اي مبهم ملتبسٌ .

[5] هبرزيٌ : رجل هبرزيٌ ، جميلٌ وسيمٌ أو هو الحسن الثبات على ظهر الفرس . والمجاملة : المعاملة بالجميل وقيل المجامل الذي يقدر على جوابك فيتركه إبقاءً على مودّتك .

كريم المحيا يبتغي حمد حامد ... إذا ما تعيا بالمواعيد نائل

ويغضي حياء والغني متواضع ... ويفرح جوداً والندى متجاهل

شديد القوى لا تزدهيه مطامع ... كثير التقى لا تزدهيه الحلائل ۱

الى كل ذي مجد يروح ويغتدي ... بفضل الهدى تأوي اليه القبائل

ألا حبذا أيامنا قبل ما سطا ... على القوم ريب الدهر والدهر سائل

أبت غيرة الإسلام إلا تساميا ... لمجد تحامت عن تقاه المعاقل ۲

إذا ما نقضنا ما النبي أمره ... نصرهم من لطف الإله حبائل ۳

فتى أروع تراك عرنيق سميدع ... أخو ثقة حامي الذمار مباسل ۴

حبانا بما لم يسمح الدهر باذلا ... فشكراً على المعروف والشكر نائل

كريم له في كل شرق ومغرب ... عطايا كأمطار الربيع شوامل

يناجيه جبريل الأمين كرامة ... فمصيره خاشٍ ومساه آمل ۵

يلوذ به الأبرار من كل بلدة ... ومن لم يلذ فالدهر بالسوء عاجل

وأطول خلق في السماحة والندى ... وأمثل ناس حين عد الأماثل ۶

وقد علقت آمالنا بلقائه ... تشد من الأقصى إليه الرواحل

---

۱ الحلائل: جمع حليلة ، وهي زوج الرجل أو الجارة -

۲ تحامى: يقال تحاماه الناس اى توقوه واجتنبوه - وفى رواية 'ق' : "عن ذراه المعاقل" - والمعاقل: الحصون، واحدها معقل -

۳ الحبائل: جمع الحبالة وهي ما يصاد بها من اي شيئ كان والمراد من الحبائل الأسباب -

۴ السميدع: السيد الكريم الشريف السخي وهو ايضاً الشجاع - والذمار: كل ما يلزمك حمايته والذود عنه

۵ في رواية نسخة 'ق' : "يناجي بجبريل" -

۶ اطول: هو من الطول والطول الغنى والفضل والقدرة - وفى رواية 'ق' : "وامثلهم من حيث عد الأماثل" والاماثل: اماثل الناس ، خيارهم -

إِلَى طَيْبَةَ الْغَرَّاءِ مَثْوَى نَبِيِّنَا	هُنَاكَ مَزَايَا جَمَّةٌ وَ فَوَاضِلُ
سَقَى اللّٰهُ رَبُّكَ الْأَرْضِ (أرض) كَرَامَةً	غُيُوثُ الْغَوَادِي الْمُدْجِنَاتُ الْهَوَاطِلُ [1]
أَتَانَا بِإِذْنِ اللّٰهِ حِيْنَ تَرَافَعَتْ	مِنَ الْقَوْمِ أَخْلَاقُ الرِّجَالِ الْجَهَائِلُ
فَلِلّٰهِ قَلْبٌ لَا يَزَالُ بِنَارِهِ	مِنَ الشَّوْقِ يَغْلِيْ حَيْثُ تَغْلِيْ مَرَاجِلُ
وَلِلْعَيْنِ فِيْ هَوَاهُ تَتَابَعَتْ	بِمُنْهَلِ دَمْعٍ وَالشُّؤُوْنُ تُسَاجِلُ [2]
مَنَنْتَ عَلَى الْأَقْوَامِ طُرًّا بِحَانِهَا	أَيَادِيْكَ تَكْفِيْهَا الْعِيَالُ الْجَهَائِلُ [3]
فَأَصْبَحْتَ فِي الْمَجْدِ الْأَثِيْلِ أَرُوْمَةً	تَقَاصَرَتِ الْأَكْبَاشُ عَنْهُ تُطَاوِلُ [4]
وَشَقَقْتَ كُلَّ الْأَشْرَارِ مِنْكَ مُجَاهِدًا	إِذَا مَا تَلَاقَوْا مُرْهَفَاتٌ مَعَاجِلُ [5]
قَدِ اخْضَرَّ وَجْهُ الْأَرْضِ حَتّٰى كَأَنَّهَا	رِيَاضٌ لَهَا مِنْ مَاءِ عِلْمٍ جَدَاوِلُ
أَيَا نُصْرَةَ الرَّحْمٰنِ أَبْطَأْتِ وَالتُّقَى	تَدِيْنُ لِغَيِّ الْقَوْمِ وَالْقَوْمُ غَافِلُ
لَقَدْ سَفِهَتْ أَحْلَامُ مَعْشَرِ فِتْنَةٍ	مَسَاعِيْرُ نِيْرَانِ الضَّلَالِ تَشَاعَلُ [6]
صَبَرْنَا وَكَانَ الصَّبْرُ مِنَّا سَجِيَّةً	عَلٰى مَا دَهَانَا مِنْ لِئَامٍ تَحَامُلُ [7]

---

١ المدجنة : السحابة الكثيرة المطر . وفى رواية نسخة "ا" : "السوابل" مكان "الهواطل" .

٢ فى نسخة "ا" : "بالبكاء" مكان "فى هواه" وفى نسخة "و" : "كتشكاب ممْيَثٍ" مكان "بمنهل دمع"

٣ العيال : جمع عيّل وهو الفقير وكذلك العائل .

٤ الارومة : الأصل . والاكباش : جمع الكبش وهو استعارة عن رئيس القوم وسيدهم . وتطاول : المطاولة فى الامر : هو التطويل والاستطالة على الناس اذا هو رفع رأسه ورأى أنّ له عليهم فضلاً فى القدر .

٥ معاجل ومعاجيل : جمع معجال مثل مفاتح ومفاتيح جمع مفتاح وهى فى الاصل الناقة التى تضع ولدها قبل حينه وفى البيت معاجل صفة مرهفات ومعناه مسرعة .

٦ المساعير : جمع مسعار ، وهو ما سُعِرَتْ به النار . وتشاعل : اصله تتشاعل حذفتْ احدى التائين .

٧ تحامل عليه : كلّفه مالا يُطيق .

أَتَانَا كَلَامٌ مِنْ غَبِيٍّ مُخَاطِرٍ	هُرَاءٌ فَمَنْ لِيْ بِالْعَدُوْلِ يُعَادِلُ ¹
كَلَامٌ لَهُ فِيْ كُلِّ لَفْظٍ فَوَاحِشٌ	كَمَا قَدْ هَذٰى فِي السُّوْقِ قَوْمٌ أَرَاذِلُ ²
مَعَاذَ اِخْنَاهُ لَا يَلِيْقُ بِمَا ادَّعٰى	مِنَ الْوَحْيِ وَالْإِلْهَامِ وَالدَّهْرُ دَائِلُ ³
أَلْهَفِيْ عَلٰى لَفْظٍ كَرِيْهٍ سَمَاعُهُ	وَ أُفٍّ لِمَعْنًى تَزْدَرِيْهِ الْبَوَاطِلُ ⁴
تَشَاعَرَ فِيْ أَرْضِ الْجَهَالَةِ مُفْسِدٌ	يَسُبُّ كِرَامَ الْمُسْلِمِيْنَ مُخَاتِلُ ⁵
وَكَيْفَ يَجُوْزُ اللَّغْوُ مِمَّنْ هَدَى الْوَرٰى	وَكَيْفَ يَرٰى فِي السُّوْءِ بِالْفُحْشِ قَائِلُ
يُبَارِيْ فُحُوْلَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاخِرًا	بِمَسْرُوْقَةِ السَّفْسَافِ وَالْأَمْرُ هَائِلُ ⁶

١ المخاطر: اسم الفاعل من خاطر بنفسه ، اذا اشفى بها على خطر هلك أو نيل مُلك أو هو الذى يجعل نفسه خطرًا لقرنه فيبارزه و يقاتله - والهراء : بالضم المنطق الفاسد لا نظام له و قيل المنطق الكثير. و يعادل : عادل الشئ معناه وازنه وعادلت بين الشيئين : اذا سوّيت بينهما -

٢ الفواحش: جمع فاحشة وهو صُرف لضرورة الشعر - وَ هذٰى : هذى الانسان يهذى هذيًا وهذيانًا معناه تكلّم بغير معقول لمرض أو غيره -

٣ الخنا : بالتحريك الفحش فى الكلام ، والدّائل واسم الفاعل من دال يدول يقال دالت الايام اى دارت -

٤ البواطل: جمع الباطل -

٥ تشاعر: اى تكلّف بقول الشعر والمخاتل: الخادع واصل المخاتلة مشىُ الصياد قليلًا قليلًا فى خفية لئلّا يسمع الصّيد حِسَّهُ -

٦ فى نسخة 'ؤ' : " الالفاظ " مكانَ السفساف "

تَهَايَا بَنِي الْمُفْلِقِينَ سَفَاهَةً ‏ فَيَا عَجَبًا مَاذَا تَمَنَّاهُ بَاقِلُ [١]

لَقَدْ خَاطَبَ الْأَعْلَامَ مَنْ لَيْسَ عِنْدَهُ ‏ مِنَ الْعِلْمِ وَالْآدَابِ مَا هُوَ كَامِلُ

يُفَاخِرُهُمْ فِي الشِّعْرِ جَهْلًا وَشِعْرُهُ ‏ عَلَى كُلِّ طَبْعٍ مُسْتَنِيرٍ يُثَاقِلُ

وَمُسْتَبْضِعٍ تَمْرًا إِلَى أَهْلِ خَيْبَرٍ ‏ يُلَامُ عَلَى مَا يَجْتَنِيهِ وَهُوَ غَافِلُ [٢]

فَوَاهًا بُغَاثُ الطَّيْرِ تَصْطَادُ بَازِيًا ‏ يُغَامِضُ تَحْقِيرًا لَهَا وَيُغَافِلُ [٣]

وَكَمْ شَاعِرٍ يُدْعَى وَلَيْسَ بِشَاعِرٍ ‏ وَلٰكِنَّمَا الدَّاعُونَ قَوْمٌ أَبَاطِلُ

تَفَاخَرَ بِالسَّفْسَافِ شِعْرًا وَإِنَّمَا ‏ يُفَاخِرُ بِالسَّفْسَافِ مَنْ هُوَ جَاهِلُ [٤]

وَمَا الْفَخْرُ بِالشِّعْرِ الرَّدِيءِ عَلَى الْوَرَى ‏ وَلٰكِنْ بِشِعْرٍ يَصْطَفِيهِ الْأَفَاضِلُ

يُصَبِّحُ أَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ غَانِمًا ‏ فَيُوقِعُ مِغْوَارًا عَلَى مَنْ يُقَابِلُ

لَوِ اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ شِعْرًا بِحُجَّةٍ ‏ عَلَى الْخَلْقِ مَا فَاتَ النَّبِيَّ يُفَاصِلُ

---

١ الباقل: اسم رجل يضرب به المثل في العيّ ومن امثالهم في باب التشبيه انّه لأعيا من باقل وهو اسم رجل من ربيعة وكان عييًّا فدمًا. ومن عيّ باقل انّه كان اشترى ظبيًا باحد عشر درهمًا. فقيل له: بكم اشتريت الظبي؟ ففتح كفيه وفرّق اصابعه واخرج لسانه يشير بذلك الى احد عشر فانفلت الظبي وذهب، فضربوا به المثل في العيّ.

٢ مستبضع: البضع الشيء واستبضعه، جعله بضاعته. قال الميداني: تحت عنوان "كمستبضع التمر الى هجر". قال ابو عبيد: هذا من الامثال المبتذلة ومن قديمها. وذلك ان هجر معدن التمر، والمستبضع اليه مخطئ. ويقال ايضًا: كمستبضع التمر الى خيبر.

٣ واهًا: يقال واهَ و واهًا لفلان للتعجّب و الاستطابة وقال ابن برّي: وتقول في التعجيب واهًا و واه ايضًا. والبغاث: من الطير ما لا يَصيد.

٤ السفساف: الردئ من كلّ شئ و الامر الحقير وكلّ عمل دون الإحكام سفساف. و سفساف الشعر رديه.

فسبحانه قد قال ما ينبغي له — فهل حجة يبغي له متغافل [1]

ولا خير في دعوى إذا لم يكن لها — على الصدق من رب السماء دلائل

إذا افتخر الكندي يوما بما الغنى — فهاد قطوف من عراب يهازل [2]

ونحن أناس لا نجرد بيضنا — إذا ما أمنا الحيف ممن يعادل [3]

ولكننا أشد اللقاء لدى الوغى — إذ أنطق العوراء خصم محاول [4]

ولولا ضياع العمر فيما يعيبنا — لساءت مطايا الشعر منا تجاول [5]

ونحن نجيب الشعر يوما إذا دعا — فنمضي كسيف والغبي يثاقل

وليس القطا مثل القطي إذا هما — تطايرا في جو السماء تعاجل [6]

فهل يدعي الآداب من ليس عنده — من العلم ما إلا بالهباء تحايل

ومبلغه أغلوطة في بيانه — ومجهوده فيما أتاه الغوائل [7]

فما يستوي عذب المياه وملحها — ولا ما ادعى خصمان حق وباطل

تسترت كالمختال بالوحي كاذبا — وأعرضت عن بحث دعته المحافل

نعم هكذا من ليس يأمن جأشه — تخاذل رجلاه لهول ينازل

---

١ كما قال تعالى: "وما علمناه الشعر وما ينبغي له" (٣٦:٦٩)

٢ القطوف من الدواب: البطيء، وقطفت الدابة: أساءت السير وأبطأت.

٣ الحيف: الميل في الحكم، والجور، والظلم.

٤ العوراء: الكلمة القبيحة أو الفعلة القبيحة - ومحاول: الإحتيال والمحاولة: مطالبتك الشيء بالحيل، وكل من رام أمرا بالحيل فقد حاوله.

٥ يقال تجاول في الحرب أي جال بعضهم على بعض، وكانت بينهم مجاولات.

٦ تقول العرب في مثل: ليس قطا مثل قطي أي ليس النبيل كالدني، وقال الميداني عن الأصمعي يضرب في خطأ القياس.

٧ المغلطة والأغلوطة: ما يغالط به من المسائل.

وَمَنْ لَيْسَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْحَرْبِ يَتَّقِي	كَمَا تَتَّقِي الْفَحْلَ الْفَنِيقَ الْحَوَامِلُ [1]
تَنَبَّأْتَ يَا مَغْرُورُ بَعْدَ مُحَمَّدٍ	فَهٰ يَا مُسَيْلِمَةَ الْكَذُوبُ الْمُحَاوِلُ [2]
عَجَزْتَ عَنِ الْإِعْجَازِ مِثْلَ مَسِيحِنَا	فَقُلْتَ هَلِ الْإِعْجَازُ إِلَّا الْمَشَاغِلُ
فَلَا قَبْلَ ذَا مَنْ يَفْتَرِي الْكِذْبَ هَائِمًا	كَذَاكَ فَلَا يَغْتَرُّ بِالْكِذْبِ جَاهِلُ
وَتُذْكَرُ آثَارُ الْفَتَى بَعْدَ مَا مَضَى	فَتُمْدَحُ مِنْهُ أَوْ تُذَمُّ الشَّمَائِلُ
أَأَنْتَ لَنَا الْمَهْدِيُّ مِنْ صُلْبِ جَنْكَزٍ	وَمَهْدِيُّنَا فِي آلِ زَهْرَاءَ آجِلُ [3]
فَأَوَّلْتَ مَا قَالَ النَّبِيُّ بِضِدِّهِ	فَشَقَّقْتَ عَصَا الْإِجْمَاعِ مِنْكَ الطَّوَائِلُ [4]
تَحَيَّرْتُ فِيمَا قَدْ أَتَيْتَ فَلَا أَرَى	لِقَوْلِكَ وَجْهًا ثَابِتًا لَا يُزَايِلُ
فَلَوْ كُنْتَ فِي أَيَّامِ دَوْلَةِ مُسْلِمٍ	لَأُنْسِيتَ كَالْمَاضِي وَذِكْرُكَ خَامِلُ
وَلٰكِنَّهُ قَدْ خُلِّيَتْ لَكَ حِيلَةٌ	تَحَيَّلْتَهَا وَالْكُفْرُ فِي الْقَوْمِ ذَائِلُ
إِذَا اسْتَنْسَرَتْ فِي أَرْضِ جَهْلٍ بُغَاثُهَا	فَلَا غَرْوَ مِمَّا يَدَّعِيهِ الْأَسَافِلُ [5]
نَرَى كُلَّ مَا تَبْنِي بِنَاءً عَلَى شَفَا	أَخَادِيدَ هَدَّتْهَا السُّيُولُ السَّوَائِلُ

---

[1] الفحل الفنيق والفحل المكرم من الإبل الذى لا يركب ولا يهان لكرامته عليهم

[2] يقال له مسيلمة الكذاب ايضاً وهو ابو ثمامة مسيلمة بن ثمامة بن كبير من بنى حنيفة كان تنبأ فى عهد النبى صلى الله عليه وسلم وله حديث طويل فى كتب السير .

[3] المراد من جنكز "چنگیز" خان جد هولاكو خان بن تولى خان بن جنكز خان الذى اخذ بغداد من الخليفة العباسى المعتصم بالله فى سنة ٦٥٦. كان هولاكو سلطان التتار ويقال لهم المغول وادعى المرزا غلام احمد القاديانى انه كان من المغول ولكن النبى صلى الله عليه وسلم اخبر بان المهدى يكون من اهل بيته ويواطئ اسمه اسم النبى صلى الله عليه وسلم واسم ابيه يواطئ اسم ابى النبى صلى الله عليه وسلم كما هو مذكور فى سنن ابى داؤد (باب فى ذكر المهدى) وجامع ترمذى (باب ماجاء فى المهدى) وغيرهما .

[4] العصا تضرب مثلا للاجتماع ويضرب انشقاقها مثلاً للافتراق الذى لا يكون بعده اجتماع . والطوائل واحدتها طائلة ، يقال: بينهم طائلة اى عداوة وترة .

[5] فى المثل: إن البغاث بأرضنا يستنسر اى إن الضعيف يصير قوياً .

تاریخ عمارۃ المسجد الذی بناہ القوم *

بَنَفْسِیْ مَسْجِدٌ مَالَ احْتِسَابًا — مَلَائِکَۃُ السَّمَاءِ اِلَیْہِ مَیْلًا

فَلَمَّا اَنْ رَاٰی اِبْلِیْسُ فِیْہِ — سُجُوْدَھُمْ دَعَا وَیْلًا فَوَیْلًا

فَقُلْتُ مُؤَرِّخًا فِیْہِ ارْتِجَالًا — بَنٰی خَیْرَ الْبِقَاعِ الْقَوْمُ نَیْلًا

۱۳۴۴ ھ

* من بحر الوافر والقافیۃ متواتر

ارسل اليه بعض الادباء قصيدته النعتية (من بلدة بمبائی بشمال الهند فطرب بها و
كتب اليه مرتجلاً ※

تَفَضَّلَ بِالْأَيَادِيْ ذُوْ فِعَالٍ	لَهٗ هِمَمٌ تَسَامیٰ لِلْكَمَالِ
مَكَارِمُ لَا تَخُوْرُ وَلَا تَوَانیٰ	تُبَادِرُ لِلْوَرٰی قَبْلَ السُّؤَالِ
رَحِيْبُ الْبَاعِ مُنْبَثُّ الْعَطَايَا	كَرِيْمُ الْخِيْمِ مَطْبُوْعُ الْخِلَالِ
اَبُوْ الْهَيْجَاءِ يَتْرُكُ كُلَّ قِرْنٍ	لَقًى فِيْ حَوْمَةِ الْحَرْبِ السِّجَالِ ١
وَيَسْبِقُ كُلَّ مَنْ يَسْعٰى دِرَاكًا	إِذَا مَاجَدَّ فِيْ رَبْحِ النَّوَالِ ٢
حَبَانَا بِالَّذِيْ ضَاقَتْ ذُيُوْلُهٗ	مِنَ الدُّرَرِ الْبَهِيَّةِ وَاللَّآلِیْ ٣
كَأَنَّ الشِّعْرَ مَرْكُوْبٌ ذَلُوْلٌ	يَسِيْرُ مِنَ الْبِحَارِ إِلَى الْجِبَالِ ٤
أَتَانَا مِنْهُ مَا يَأْتِيْ عِطَاشًا	مِنَ الْأَنْوَاءِ مِلْمَاءِ الزُّلَالِ ٥
أَتٰى فِيْمَا أَتَاهُ بِكُلِّ فَنٍّ	بَدِيْعِ النَّظْمِ مَفْقُوْدِ الْمِثَالِ

※ من بحر الوافر والقافية متواتر .

١ قالوا: الحروب سجال اى سجل منها على هؤلاء و آخر على هؤلاء معناه ، أنّ فريقا يُدال عليهم مرّةً و يدال على الآخر مرة اخرى .

٢ دراكًا: يقال سَيْرٌ دراكٌ اى متّصل .

٣ المراد من الدرر و اللآلی اشعار القصيدة .

٤ اشارة الى أن المرسل ارسلها من بلدة بومبائی (الواقعة على ضفّة المحيط الهندی) الى المجيب بهذه الابيات الساكن بارض الجبال الشمالية .

٥ الأنواء: النوء طلوع نجم من الشرق وغروب قرينه فی المغرب ويكون فی هذه الهيئة المطر فالمراد من الأنواء الامطار . و ملماء : اصله من الماء .

بِلَفْظٍ أَعْجَبَ الشُّعَرَاءَ طُرًّا ... بِمَعْنًى رَاقَ فُرْسَانَ الْمَقَالِ

وَحَسَّانٌ رَأَيْنَاهُ اغْتِبَاطًا ... يُبَارِي قَوْمَ سُوْءٍ بِارْتِجَالِ [1]

وَكَعْبٌ لَا يُبَارِيهِ فُحُولٌ ... عَلَى كَتِفَيْهِ بُرْدٌ مِنْ جَلَالِ [2]

فَيَا لَكَ مِنْ فَصِيحِ الْعُرْبِ أَرْثٌ ... بَلَاغَتُهُ بِآدَابِ الْأَوَالِي [3]

رُوَيْدَكَ لَا تُكَلِّفْنَا صَوَابًا ... يَجُرُّ إِلَى دِفَاعِ الِارْتِجَالِ

أَمَا وَاللّٰهِ لَوْ لَا مَا رَأَيْنَا ... لَأَحْصَيْنَاكَ فِي الْأُمَمِ الْخَوَالِي

نَعَتَّ الْمُصْطَفَى مَحْبُوبَ رَبٍّ ... عَلَيْهِ صَلَوَاتُهُ عَدَدَ الرِّمَالِ

سَتُجْزَى مَا تُسَرُّ بِهِ وَلٰكِنْ ... نُقَاسِمُكَ الْمَفَاخِرَ وَالْمَعَالِي

فَكَيْفَ أُطِيقُ رِثَاءَكَ يَا كَرِيمًا ... إِذَا مَا لَمْ تُطِقْ صُمُّ الْجِبَالِ

بَقَاؤُكَ جِذْمُ عَيْشِ الْخَلْقِ حَقًّا ... فَدُمْ بِالْخَيْرِ مَا كَرَّ اللَّيَالِي

وَلَا نَضَبَتْ عُيُونُكَ جَارِيَاتٍ ... وَلَا زَالَتْ مُجَلَّلَةَ الظِّلَالِ

٣١ ر يناير ١٩٠٢ء

---

1. كما أنّ حسان بن ثابت رضي الله عنه كان يجيب مشركي قريش بأبياته .

2. اراد به كعب بن زهير رضي الله عنه . وكان رسول الله صلى الله عليه وسلّم ألبس كعبًا بردته حين انشد بحضرته قصيدته المشهورة ببانت سعاد .

3. الأوالي : اصله الاوائل وهو جمع "الأوّل" ذكر في اللغة في مادة "وأل" .

تب قبل المَمات *

دَوَامُ الْعَيْشِ فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۔۔۔ وَفِي الدُّنْيَا فَلَيْسَ لَهٗ دَوَامُ
إِذَا وَلَّى الشَّبَابُ وَأَنْتَ شَيْخٌ ۔۔۔ قُعُوْدُكَ فِي الصَّلٰوةِ لَكَ الْقِيَامُ
فَأَدْرِكْ مَا اسْتَطَعْتَ مِنَ الْأَمَانِيْ ۔۔۔ وَتُبْ قَبْلَ الْمَمَاتِ وَقُلْ سَلَامٌ
وَكَمْ مِنْ عَالِمٍ يُدْعٰى تَقِيًّا ۔۔۔ وَمَطْعَمُهٗ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ

* من بحر الوافر والقافیۃ متواتر

وله يناجي ربّه *

إلٰهي أنْتَ مَوْلَايَ القَدِيْمُ	فَإنّيْ عَبْدُكَ العَاصِي الأثِيْمُ
عَصَيْتُكَ وَاثِقاً بِالعَفْوِ عَنّيْ	كَذَاكَ العَفْوُ يَفْعَلُهُ الكَرِيْمُ
بِحَقّكَ لَا تُوَاخِذْنِيْ بِذَنْبِيْ	فَإنَّكَ أنْتَ تَوّابٌ رَحِيْمُ

* قال بعض آل بيته أُنّه كان يُنشد هذه الابيات كلّ يوم وقت التهجّد - وهي من بحر الوافر و القافية متواتر -

وقال يرثي *

ألا يا لائمي كف الملاما — فإن اللوم هيج لي غراما

سمعت الركب قد زموا المطايا — ألا يا ليت شعري ما أرى ما

فقلت لصاحبي والليل داج — أرى ما قد فرشت لي الحراما

فدعني أركب الظلماء وحدي — أعد لها من الحزم الزماما

إذا استشأت صبا مستهاما — فقد والله أكبرت الحماما

وأطول ما يكون المرء هجرا — أبى فيه اللقاء المستهاما

أبت دنياك يا من يبتغيها — ذماما أو وصالا أو دواما

فدعني أبك محمود السجايا — فحسن الصبر لا يأتي انسجاما

فقدنا خير من يسعى لحول — ويتلو في لياليه الإماما [1]

سيذكره الورى ذكرا جميلا — ويحييه الذي يحيي العظاما [2]

كريم باذل نفسا ومالا — أشد بما قضى الله اعتصاما

ومقتحم المهالك لا يبالي — بما يأتي ولا يخشى انهزاما

ولم أر مثله في الناس طهرا — تنوعنا زاهدا اسما هماما

طوى كشحا عن الدنيا علوا — وإن جاءت تخادعه حطاما

---

* من بحر الوافر والقافية متواتر .

[1] قال التهانوي في كتابه كشاف اصطلاحات الفنون (١/٩٢٤) الإمام : عند القراء والمفسرين وغيرهم مصحف من المصاحف التي نسخوها الصحابة رضي الله عنهم بأمر عثمان رضي الله عنه ثم ارسل منها الى كل مصر مصحفا -

[2] المراد منه الله تعالى، كما في القرآن : " قال من يحيي العظام وهي رميم " (٣٦ : ٧٨)

إذا ازدحمت خطوب مفظعات … تلقاها ولم يخش الزحاما

فتى ذو همة تعلو الثريا … ويأبى أن يبوء بما يُراما

له نفس تكلفها المزايا … فما خابت وقد خابت عصاما [1]

ولو خلنا القلب المرء وجها … نراه يكاد للبدر التماما

وعلم يرضع الطلاب طرا … فلا يرضى لهم يوما فطاما

ولم تلن القنا منه لخطب … دهاه ولم تطع يوما لئاما

بلاد الدين دوحها طغام … أذلاء الورى ساما وحاما

فيا لهفي على العلياء تبكي … أجب الظهر فاقدة السناما

سبوا نفسا ترى شرفا منيعا … نوائب لا تلم بها لماما

تعالوا نبك ما انهلت دموع … على من قال: ربي فاستقاما [2]

ويبكي العلم منك على هتون … إذا استسقى ولم يلق الغماما

إذا شمنا بروقك لامعات … نرجيها فلم نعد الجهاما [3]

فظنوا أن ما كادوك ذل … وليس الذل فيما ليس ذاما

علوت وقد علاك كل مجد … ضربت له على القمم الخياما

ولا ننسى عزائمك اللواتي … يدعن القلب يأبى أن يضاما

ولو عدت محامدك البرايا … لعدت نقص ما عدت تماما

فليت لنا مكانك من يحامي … وليت لهم بما اجترحوا أثاما

حميت المسلمين وقد توالت … مصائب يستبحن لهم كراما

ستبكيك المكارم والمعالي … إذا ما لم يجدن لها مراما

---

[1] عصام: اسم حاجب النعمان بن المنذر، ويضرب به المثل في حسن الرأي والشجاعة ۱۲۰ منه۔

[2] مأخوذ من قوله تعالى: قالوا ربنا الله ثم استقاموا ۔ (٤١ : ۳۰)

[3] الجهام: بالفتح السحاب الذي لا ماء فيه ۔

فَلَوْلَا لِلْخَلَائِقِ مِنْ سَبِيْلٍ ... سَلَكْتَ بِهِمْ لِمَا اغْتَمُوْا اغْتِمَامَا

وَلَوْ أَنَّ الْكَمَالَ دَنَا لِمَيْتٍ ... لَكَانَ حَوَالَ قَبْرِكَ مُسْتَضَامَا

فَلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَ قَوْمًا ... فَإِنَّ الْمَوْتَ يَغْتَامُ الْعِظَامَا

تُهَدِّدُنَا الْمَنَايَا كُلَّ يَوْمٍ ... وَتُفْجِعُنَا بِأَعْلَانَا مَقَامَا

أَعِيْشُ وَلَا لَذَاذَةَ فِيْ مَعَاشٍ ... إِذَا غُصَصٌ تُهَيِّئُ لِيْ طَعَامَا

لَحَا اللّٰهُ النَّصَارٰى قَوْمَ سُوْءٍ ... إِذَا كَادُوْا لِذِي الْفَضْلِ انْتِقَامَا

لَقَدْ لَعَنَ الْمَلَائِكَةُ النَّصَارٰى ... الشَّيَاطِيْنَ الطَّوَاغِيْتَ الطَّغَامَا

وَأَحْمَدُ بِالرِّضٰى حَيًّا وَمَيْتًا ... فَتًى لَا يَشْتَكِيْ يَوْمًا سَقَامَا

فَنَسْئَلُ رَبَّنَا لَكَ خَيْرَ سُؤْلٍ ... وَنَرْجُوْ أَنْ يُبِيْحَ لَكَ السَّلَامَا

قال مرتجلاً في وصف الكتاب العزيز *

رُوَيْدَ عَوَاذِلِي بَعْضَ الْمَلَامِ — فَإِنِّي لَيْسَ يَبْرَحُ بِالْجِمَامِ ¹

أَطَعْتُ هَوَى لَذِيذِ الْعَيْشِ دَهْرًا — فَمَا عَاشَرْتُ إِلَّا لِلسَّآمِ

وَكَيْفَ يَطِيبُ عَيْشُ الْمَرْءِ يَوْمًا — إِذَا مَا لَمْ يَكُنْ غَيْظَ اللِّئَامِ

وَذُقْتُ حَلَاوَةَ الْأَشْيَاءِ طُرًّا — فَأَحْلَى حُلْوِهَا مُرُّ الْفِطَامِ

فَمَا اسْتَحْلَيْتُ مِنْ دُنْيَايَ شَيْئًا — سِوَى تَرْتِيلِ آيَاتِ الْإِمَامِ

أَلَذُّ لِكُلِّ مَنْ يَبْغِي فَلَاحًا — وَيَرْجُو الْخَيْرَ فِي دَارِ السَّلَامِ

هُدًى لِلنَّاسِ لَيْسَ بِهِ خَفَاءٌ — وَنُورٌ قَدْ جَلَا سَجْفَ الظَّلَامِ

لَهُ مَعْنًى يَحَارُ الْفِكْرُ فِيهِ — وَلَفْظٌ فَاقَ حُسْنَ الْإِلْتِيَامِ

إِذَا مَا لَمْ يُطِقْ أَحَدٌ يُبَارِي — فَذَلِكَ صَاحِ إِعْجَازُ الْكَلَامِ ²

كَلَامُ الرَّبِّ أَنْزَلَهُ بِحَقٍّ — عَلَى خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لِلْأَنَامِ

إِمَامُ الْأَنْبِيَاءِ بِلَا امْتِرَاءٍ — إِلَى مَا يَبْتَغُونَ مِنَ الْمَقَامِ

وَلَوْ لَمْ يَهْدِنَا مَا قَدْ هَدَانَا — لَكُنَّا فِي الْبَرَارِي كَالنَّعَامِ

يُرَوِّحُ بَلْدَةً ضَمَّتْهُ نَشْرًا — يَفُوحُ شَذَاهُ كَالْمِسْكِ الْخِتَامِ

---

* طُبعت هذه القصيدة في آخر شرح اسماء الله الحسنى للمؤلف (ص ۲۴۸) و ايضاً في مجلته الشهرية "الهدى" (ج ۹ ن ۹ – ۱۰) والنظم من بحر الوافر والقافية متواتر ۔

¹ رويد : تصغير الرَّوْدِ وَالرَّوْد معناه الْمُهْلَةُ فِي الشئ ۔ وقال سيبويه هو اسمٌ للفعل و قالوا رويداً اى أَمْهِلْهُ ۔

² هو المنادى المرخم اصله "يا صاحب" ۔

في ردّ منكري الحديث ٭

ألا يا من تصدّى للخصام ... تنحّ فلا تبالغ في الكلام

فكم من عابث بالحق غرورا ... وباطله على أدهى مرام

تكذّب عصبة الأخيار طرّا ... وهم خير الورى أعلى المقام

فكيف تطيق أمرا لم يرمه ... أولو الألباب قبلك في المنام

تكذّب بالحديث تقول فيه ... بما ينهى بقاطبة الكرام

أتنكر قول من يهدي لخير ... بنور الوحي ضلّال الظلام

فهذا ليس من عادات قوم ... مضوا سلفا براء عن ملام

وسوء الظنّ لا يجديك شيئا ... فتب قبل الممات إلى السلام

فربّ العرش ذو بطش شديد ... ستبلى كلّ نفس بالأثام

صلوة الله قرنا بعد قرن ... على جرثومة المجد الهمام

نبيّ الله من عاداه جهلا ... فقد عادى مليكا ذا انتقام

٭ طبعت هذه القصيدة في مجلّة "الهدى" للناظم تتعلق بشهر ذي القعدة من سنة ١٣٢٤ بصفحة ٢٨ - وهي من بحر الوافر والقافية متواتر -

ومما قال مرتجلاً في الحسين البلجرامي *

تباهج ربعنا شهر الصيام ... لسيدنا الحسين البلجرامي

فتى ذي شارة يسمو فيسمو ... كما لا مثل آباء كرام

هو البحر الخضم وكل بحر ... يرى في جنبه وشل الموامي

فيالله كم سحرت قلوبًا ... بلاغته بإعجاز الكلام

لقينا منه ما يلقى السكارى ... صباح العيد من كأس المدام

وكنا أمس نطوي أرض نقص ... فمسنا اليوم في روض التمام [1]

حدى بك شوق رؤيتنا إلينا ... فنحن اليوم في أعلى المقام

وطئت بلادنا ولأنت غيث ... سقى أرضًا فيشفي كل ظام

نرى في وجهك الوضاء بدرًا ... يضيء بنوره وجه الظلام

فيا ابن القائمين بكل خطب ... إلى ما ذا التقاعد عن قيام

فإن الجهل عم القوم طرًا ... وإن الخزي خصمهم بذام

أهفي قد تهاجمت المخازي ... فصرنا ضحكة الناس الطغام

فقم لله ثم اغلظ عليها ... كجدك يوم خيبر أرض شام [2]

عليك حفيظة المجد اعتصامًا ... بحبل الله كالسيف الحسام

لقد ساق الإله لنا جوادًا ... أبي النفس مجتنب الذمام

يفوق لمولد قوم طاب عرقهم ... بذ الأنام من قبل الفطام

* السيد حسين البلجرامي كان سكرتيرًا خصوصيًا لصاحب الدكن. زار لاهور واستقبله الناظم بهذه القصيدة. مات البلجرامي في سنة ١٣٢٢هـ (النهضة ٨: ١٠٩-١١١) والنظم من بحر الوافر والقافية متواتر.

[1] مسنا: من ماس يميس أي تبختر واختال.

[2] جدك: يعني به سيدنا علي بن أبي طالب رضي الله عنه.

أُتُوْا وَالدَّهْرُ لَمْ يَهْجُمْ عَلَيْهِمْ ... وَأَغْوَرَهُمْ إِلٰى تَذْيِ الْعُقَامِ

فَتِلْكَ الدَّارُ دَارٌ قَدْ حَوَتْهُمْ ... بِأَمْنِ اللّٰهِ كَالْبَيْتِ الْحَرَامِ

صُرُوْفُ الدَّهْرِ لَيْسَ لَهَا انْفِصَامٌ ... فَكَفِّلْ مَا تَرٰى جُوْدَ النِّظَامِ

هُوَ الْمَلِكُ الْمُرَجّٰى بَعْدَ يَاسٍ ... كَغَيْثٍ غِبَّ مَحْلٍ أَوْ أُوَامِ

مِنَ الْبِيْضِ الْوُجُوْهِ أُوْلِي الْمَزَايَا ... مِنَ الشُّمِّ الْأُنُوْفِ ذَوِي الْحُسَامِ

إِلٰهَ الْعَالَمِيْنَ ارْحَمْ عَلَيْنَا ... وَعَافِ قُلُوْبَ قَوْمٍ مِنْ سَقَامِ

وَلَا تُشْمِتْ بِنَا الْأَعْدَاءَ يَوْمًا ... فَإِنَّا فِيْ ذَرَاكَ عَلَى الدَّوَامِ

۱۰؍ ینایر ۱۹۰۱ء

قال فی وفد المصریین *

نفدی الکرام بانفس وبما حوت — أیدی الدعاة لهم بفوز مرام

القائلین لکل قول فیصل — والفاعلین فعالهم لمقام

الباذلین نفوسهم فیما نری — من ذلة وشناعة الاحجام

قوم اذا علموا بنقض عهودنا — غاروا فصالوا صولة الضرغام

ولقد اتانا من کرامة ربنا — ما لا نراه بیقظة ومنام

انتم ذوو القربی لدین محمد — والآخرون لکم اولو الارحام

السابقون الاولون الی الهدی — مستمسکین بعروة الاسلام

وبدا صباح الخیر من افق العلی — فتنورت ارض ووجه ظلام

یا رب ابناء العلوم قد انمحت — بصراصر الغفلات عن اقدام

من للعلوم ومن لدولة قومنا — طارت بها العنقاء بعد تمام

فتبینوا ما بیننا یا سادتی — هم اخوتنا من الاهرام

القوم اعداء لما جهلوا به — فتجاهدوا بالنقض والابرام

ماذا نهاکم عن حماکم بعدما — بلغ الحجازی مبلغ ابن حذام [1]

فاستیقظوا فاستسعدوا فاستبشروا — فالعزم قائمة لذی الصمصام

---

* من بحر الکامل والقافیة متواتر

[1] قال ابن الاثیر فی کتابه المرصع (ص ۷۹) ابن حذام : اول مَن بکی من الشعراء فی الدیار وهو الذی سماه امرؤ القیس فی قوله : عوجا علی الطلل المحیل لأننا — نبکی الدیار کما بکی ابن حذام ،
اراد الناظم أنّ الحجازی قد تجاوزت الحدّ وبلغت اقصی مقامها حتی ینبغی لنا أن نبکی علیها کما بکی ابن حذام علی الاطلال والدیار

هن الريح نفوسنا بنسيمه

فتشعل من الاعصاب تحت شميمه

عالما بحكايا كي حتى الرياض كونها

خلد صفحة سا ها تم لقيه

وتحف [illegible] الكت في لبيت ناه

فتحلو بها آفاقها بنسيمه

فی وصف الربیع

هَزَّ الرَّبِيْعُ نُفُوْسَنَا بِنَسِيْمِهٖ ‏ ‏ ‏ ‏ فَشَفَا مِنَ الْاَوْصَابِ قَلْبَ سَقِيْمِهٖ

وَالْمَاءُ يَجْرِيْ فِي الرِّيَاضِ كَاَنَّهَا ‏ ‏ ‏ ‏ خُلْدٌ صَفَتْ سَاحَاتُهٗ لِمُقِيْمِهٖ

وَتَهُبُّ رِيْحُ الْمِسْكِ فِيْ بُسْتَانِهٖ ‏ ‏ ‏ ‏ فَتَعَطَّرَتْ اٰفَاقُهَا بِشَمِيْمِهٖ

---

* من بحر الكامل والقافية متدارك .

ومما قال فی بعض احواله

قَضَى اللّٰهُ الْحَكِيْمُ بِمَا سَيَأْتِيْ	فَمَا تِلْكَ الْوَسَاوِسُ وَالظُّنُوْنُ
إِذِ الْأَقْلَامُ جَفَّتْ فِيْمَ تَجْرِيْ	فَسِيَّانِ التَّحَرُّكُ وَالسُّكُوْنُ
فَمَغْرُوْزُ الْمَسَاعِيْ لَيْسَ يَنْجُوْ	مِنَ الْأَحْدَاثِ لَيْسَ لَهَا هُدُوْنُ
فَدَعْ عَنْكَ اشْتِغَالَكَ الْبَرَايَا	وَثِقْ بِاللّٰهِ وَانْظُرْ مَا يَكُوْنُ
فَنَعْمَاءُ الْكَرِيْمِ لَهَا خُطُوْبٌ	وَأَلْطَافُ الْإِلٰهِ لَهَا شُؤُوْنُ
وَلَا تَشْتَكِ فِيْمِ كَهَالِكَ إِلَّا	بِلُطْفٍ لَا يَزَالُ وَلَا يَخُوْنُ
وَقُمْ وَادْعُ الْمُهَيْمِنَ جَوْفَ لَيْلٍ	فَأَيُّ الْخَطْبِ إِلَّا مَا يَهُوْنُ
وَصَلِّ عَلَى الَّذِيْ أَتَاهُ رَبِّيْ	مَزَايَا لَا تَجُوْدُ بِهَا الْقُرُوْنُ

★ من بحر الوافر والقافية متواتر

یوجد ہذا البیت فی نظم بالفارسیۃ

وہو معنون ؏ "بنالہ چند" وہو مطبوع ؏

صَعِدْنَا الْمُرْتَقیٰ حَتّٰی هَوَیْنَا　　　كَأَنَّ الصَّعْبَ لَمْ يَسْهُلْ عَلَيْنَا

* من بحر الهزج والقافية متواتر

المعاصی والمغفرة

عَصَيْتَ الْإِلٰهَ وَلَمْ تَلْتَفِتْ	إِلٰى نِعَمٍ قَدْ أَبَاحَ لَنَا
هُوَ الْبَرُّ ذُوْ كَرَمٍ سَابِغٍ	فَمَنْ أَنْتَ تَعْصِيْ وَمَاذَا أَنَا
وَهَذِّبْ لِسَانَكَ فِيْمَا جَرٰى	وَإِيَّاكَ وَالشَّرَّ شَرَّ الْخَنَا
إِذَا جِئْتَ مُسْتَغْفِرًا فَاعْتَصِمْ	بِعُذْرِكَ وَالْعُذْرُ نِعْمَ الْغِنَا
بَلَغْنَا الْمَعَاصِيْ أَوَاخِرَهَا	فَلَمْ نَسْتَزِدْهَا فَيَا وَيْلَنَا

※ من بحر المتقارب والقافية متراكب

قال بمناسبة الحفلة السنوية للمدرسة النعمانية بلاهور*

وَأهًا لِطِيبِ زَمَانِكُمْ خُلَّانِي   عَجَبًا لِأرْغَدِ عَيْشِكُمْ إِخْوَانِي

وَكَفَتْ سَحَابُ الْخَيْرِ مِنْ فَلَكِ الْعُلَى   فَتَبَسَّمَتْ رَوْضُ الْمُنَى كَجُمَانِ

مَالِي أَرَى الدَّهْرَ الْغَشُومَ مُرَاعِيًا   حَقَّ الْوَفَاءِ وَكَانَ أَظْلَمَ جَانِ

فَلَعَلَّ قَوْمِي لَيْسَ فِيهِمْ قَاعِدٌ   عَنْ هِمَّةٍ تَسْمُو لِكُلِّ مَكَانِ

قَوْمٌ إِذَا جَهِلُوا بِحَقٍّ نَازِلٍ   صَدَفَتْ عَطَايَاهُمْ عَنِ الْمِيزَانِ

قَوْمٌ إِذَا جَادُوا عَلَى مَنْ نَالَهُمْ   هَطَلَتْ سَحَائِبُهُمْ مِنَ الْهَتَّانِ

بُورِكْتُمُ فِي لَجْنَةٍ قَدْ زُيِّنَتْ   بِالْعِزَّةِ الْقَعْسَاءِ وَالسُّلْطَانِ

فَاضَتْ يَنَابِيعُ الْكَمَالِ مِنَ الْهُدَى   فَسَقَتْ رِيَاضَ الْفِقْهِ وَالْعِرْفَانِ ١

فَتَهَلَّلَتْ رَوْضُ الْعُلُومِ كَمَا تَرَى   تَخْضَرُّ فِي الْأَوْرَاقِ وَالْأَغْصَانِ ٢

يَجْرِي فُرَاتُ الْمَاءِ فِي أَنْهَارِهَا   مَنْ لِي هُنَاكَ الْيَوْمَ بِالظَّمْآنِ

يَسْعَى إِلَيْهَا كُلُّ مَنْ هُوَ يَشْتَفِي   عُلَمَاءَ يَهْجُرُ رُفْقَةَ الْأَوْطَانِ ٣

وَالنُّورُ يَسْطَعُ مِنْ شُمُوسِ سَمَائِهَا   بَزَغَتْ لِعَيْنَيْ طَالِبِ الْبُرْهَانِ ٤

تُحْيِي عِظَامَ الْفِقْهِ قَدْ بَلِيَتْ لَنَا   نِعَمًا عَلَى رَأْيٍ مِنَ النُّعْمَانِ ٥

---

* من بحر الكامل و القافية متواتر

١ في نسخة و: "سالت" في مكان "فاضت".

٢ في و: "الأطراف" في مكان "الأوراق".

٣ في و: البيت هكذا: "يسعى إليها كل من هو طالب الـــــــ فضال يهجر صحبة الأخدان"

٤ في و: "كمالها" في مكان "سمائها" و في أيضًا "لعين الطالب"

٥ في و: "عظام العلم"

البارع الحبر الخطيب الهبرز والهاطل الهذار في القيعان [1]
متبحر متورع متعبد متيقظ متعمق الإمعان [2]
متسابق متواصل متواضع متصاعد متبادر الإحسان
لولا اجتهادك في المسائل صادقا لم نعرف الفتيا من الهذيان
لا بحر إلا من بحورك زاخر لا غيث إلا في غيوثك هان [3]
ولقد سبقت الى المعالي بارعا كتسابق اليعبوب يوم رهان
ولو ان نطقك كان عيا كله لكشفت سترها عن وجوه بيان
زخرت بحور العلم منك وقذفت منثورة اللؤلؤ والمرجان
ما نال أهل الفضل فضلك كلهم فالشأن شأنك ما له من شان
من لي بنعمان تشمر ذيله متقلدا بالسيف للإيمان
نصل لسيف العزم في ذب العدى بل لا يهي عضدا بيوم طعان [4]
من لي بمن قاد الجيوش الى الوغا والسيف خاضبه النجيع القاني [5]
الكاشف الغمرات عند ملمة والقامع الأبطال للأذقان
الغيث غيث دائم التهطال والسيل سيل عارم الإتيان [6]
سهل الخليقة للعفاة مرتبا صعب الشكيمة عند حرب عوان
للمجد واسع بفنائه إذ عد رب المجد بالحسان

---

١ في و : "المصقع" في مكان "الهبرز" و في ايضا : "المتفقه" في مكان "والهاطل" .

٢ في نسخة و : "متوقد الدوران" .

٣ في و : "في بحورك داخل" .

٤ في و : "للاحداث" في مكان "في ذب العدى" .

٥ في و : "بحيدر المخامس في الوغا" و في المصراع الثاني "خاضبها النجيع" .

٦ في و : "التهتان" في مكان "التهطال" .

يا خيرَ مَن وارَتْهُ أرضٌ سماؤنا ... في بلدةٍ عبقت كروضِ جنانِ

جمدت مياهُ القومِ في ينبوعِهم ... قم فاسقنا من بحرك العمّانِ [١]

ضاقت بنا الأيامُ يا كهفَ الورى ... والفضلُ عندك منبعُ الإحسانِ [٢]

برهانُ نبيٍّ مرسلٍ ذو قوّةٍ ... عظمت ودينُك ناسخُ الأديانِ

إن كان ذا التوحيدُ قصرًا عاليًا ... فلأنت فيه صاحبُ الإيوانِ

بنى لك الرحمنُ حصنَ رسالةٍ ... عالي البروجِ مشيّدَ الأركانِ

أنتَ العريقُ الماجدُ المقبولُ الـ ... ـمبعوثُ للثقلين من رحمانِ [٣]

أنتَ الحديثُ بكلِّ ما أوليتَهُ ... يا صاحبَ الفرقانِ واللقيانِ [٤]

لقد انمحت آثارُ دينٍ قيّمٍ ... والدهرُ دارَ عليه بالحدثانِ

قف بالديارِ فهذه آثارُها ... تبكي على الحادثين بالبحرانِ

يا ليت قومي ما ونوا عن نصرِهِ ... بالجودِ والإخلاصِ والإيقانِ [٥]

فلّت سيوفُ القومِ فلا ما لها ... ظُبةٌ تريقُ دمًا بكلِّ مكانِ

قد أمحلت أرضُ الكمالِ وأقفرت ... يا للغيوثِ لمرتعِ النقصانِ

بعُدَ الحلمُ فيه ذلٌّ واضحٌ ... تعسًا لصبرٍ شدّ أزرَ هوانِ

ماذا التخلّفُ عن طلابِ علومكم ... قد آذنتنا اليومَ بالحرمانِ

كيف التغافلُ والصروفُ لواعبٌ ... كيف التواني والحتوفُ أماني

---

١ في نسخة ل: "جودِكَ العمّان".

٢ في و: "الخيرُ" في مكان "الفضل".

٣ في و: "للاحسان من رحمان".

٤ اللقيان: المراد منه معراجه صلى الله عليه وسلم.

٥ في و: "ماونت".

كَيْفَ السُّلُوُّ عَنِ الْعُلَى قَدْ أَشْرَقَتْ — شَمْسُ الْمَكَارِمِ فِي سَمَاءِ الشَّانِ [1]

سُبِقَتْ سَوَابِقُنَا فَإِنْ لَمْ تَجْهَدُوا — يَا سَادَتِي فَالدَّهْرُ أَجْفَى شَانِ

هَا ادْخُلُوا بَابَ الْمَحَبَّةِ كُلُّكُمْ — وَحِذَاءِ ثُمَّ حِذَاءِ مِنْ شَنَآنِ

شُدُّوا التَّرْبِيَةَ الْعُلُومِ تَكَرُّمًا — كَيْ لَا تَبُوءَ مَحَامِدُ الْعَدْنَانِ [2]

فَلَئِنْ شَكَرْتُمْ نِعْمَةً أُعْطِيتُمُو — هَانَ يَدٌ فِي الْإِنْعَامِ وَالرُّجْحَانِ [3]

يَا ذَا رَغِيدِ الْعَيْشِ وَهُوَ الطَّيِّبَا — شَيْئًا لَنَا مِنْ كِيسِكَ الْمَلْآنِ

مَا فِي الدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيرِ الَّتِي — لَمْ تُعْطِهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَنَّانِ

أَدْعُو لَهَا بِالْخَيْرِ خَيْرِ كَرَامَةٍ — مِنْ وَاهِبٍ مُتَتَابِعِ الشُّكْرَانِ [4]

فَاحَتْ رِيَاحُ الْعِلْمِ مِنْهَا بِالشَّذَا — مَا غَنَّتِ الْوَرْقَاءُ فِي الْبُسْتَانِ

---

١ في "و": "العلوّ واشرقت".

٢ عدنان بن أُدّ، ابو معدّ والمراد منه اسلاف القوم.

٣ اشارة الى الآية المباركة: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" (١٤ : ٧).

٤ في و: "متفرد الاتقان" في مكان "متتابع الشكران".

ومما قال مقرظاً*

(عذب المناہل لعطاشں الکامل (للمبرد) للمولوی نور الحق العلوی)

وَشَكْوَى لَا أَبُوحُ بِهَا جَلِيَّهْ ... فَمَاذَا بِي وَلِي نَفْسٌ أَبِيَّهْ
وَلَكِنْ كَيْفَ أَصْبِرُ عَنْ دَوَاءٍ ... هُوَ الْإِبْكَارُ سِمْنًا عَشِيَّهْ
أُهَيْلُ الدَّهْرِ لَا يَأْلُونَ بُغْضًا ... وَبُغْضُ الْفَضْلِ مِنْ دَهْرِي سَجِيَّهْ
وَلَوْ لَا الْفَضْلُ بِالْجُهَّالِ يَشْقَى ... لَكَانَتْ أَرْضُهُمْ أَرْضًا جَوِيَّهْ [1]
هَوَتْ أُمُّ الزَّمَانِ بَرَى سِهَامًا ... سُوَيْدَاءُ الْقُلُوبِ لَهَا دَرِيَّهْ
لِئَامُ النَّاسِ قَدْ رَاجَتْ مُنَاهُمْ ... وَتِلْكَ بَلِيَّةٌ فَوْقَ الرَّزِيَّهْ
كَذَاكَ الدَّهْرُ يَرْكَبُ كُلَّ يَوْمٍ ... كَأَنَّ الْجَهْلَ قَادَ لَهُ الْمَطِيَّهْ
أَلَا يَا دَهْرُ كُنْ مَا شِئْتَ وَابْعَثْ ... مَكَارِهَ مِنْ سَمُومٍ أَوْ عَرِيَّهْ [2]
فَمَنْ يَصْبِرْ عَلَى مَا نَابَ صَبْرِي ... يُسَامِحُ مَا دَهَاهُ مِنَ الْبَلِيَّهْ
مَزَايَا الْعِلْمِ لَا تُحْصَى وَلَكِنْ ... تَخَيَّرْ مَا اسْتَطَعْتَ مِنَ الْمَزِيَّهْ
لَنِعْمَ الْقَلْبُ قَلْبُ الْمَرْءِ يَوْمًا ... سَعَى فِي نَيْلِهَا قَبْلَ الْمَنِيَّهْ
كَمِثْلِ حَبِيبِنَا أَهْدَى إِلَيْنَا ... كِتَابًا شَانُهُ زَانَ الْبَرِيَّهْ
تَبَسَّمَ فِيهِ أَنْوَارُ الْمَعَانِي ... كَأَنِّي مِنْهُ فِي رَوْضٍ نَدِيَّهْ
وَفَصَّلَ فِيهِ مَا قَدْ كَانَ يَأْبَى ... عَلَى الْأُدَبَاءِ مِنْ مُلَحٍ خَفِيَّهْ
فَتًى ذُو هِمَّةٍ تَسْمُو فَتَعْلُو ... غَرَائِبُ دُونَهَا حِكَمٌ سَنِيَّهْ

---

* من بحر الوافر والقافية متواتر

[1] فإنّ الاشياء تتبيّن بالاضداد و أرضٌ ضاجويّه : اى غير موافقه

[2] العريّة : الرّيحُ الباردة

أَتُنْكِرُ فَضْلَهُ وَلَهُ مَعَانٍ ... تَلَألأُ مِثْلَ لُؤْلُؤَةٍ بَهِيَّهْ

فَزِدْنَا يَا ابْنَ نَجْدَةَ كُلَّ مَنٍّ ... وَلَا تَنْسَ النَّصِيبَ مِنَ الْبَقِيَّهْ [1]

أَبَا الْعَبَّاسِ قُمْ فَاشْكُرْ أَدِيبًا ... قَضَى لَكَ بَعْدَ مَوْتِكَ بِالْهَدِيَّهْ [2]

---

[1] كان المولوى نور الحق شرح نصيبًا ابتدائيا" من كامل المبرد، فالناظم اراد منه أن يكمل شرح باقى الكتاب ايضا" .

[2] ابو العباس : كنية محمد بن يزيد المعروف بالمبرد صاحب الكامل .

وله في تاريخ طبع الوشاح على عروض المفتاح

لقد زان الكمال بما اتاه — اديب لا يباريه سواه

له في الفكر سابقة علمنا — فما احد انبرى الا تلاه

تحاماه الفحول اذا اراه — مخافة ان يدوسهم وغاه

فيقتل كل ما يأتيه خبرا — كان الفكر شامتة يداه

اروى ادب اليه اليوم حقا — فزباه لكي يدعى اباه

اتنكر فضله وله وشاح — كسمط الدر للعقد اجتباه

تنوّرت الجواهر فيه معنى — وان نظامها لفظ حواه

حدائق دوحها التشعبت غصونا — موائل ظلها بردٍ سناه

١٣١٦

فقلت مؤرخا فيه ارتجالا — الدر انتظم لمن وعاه

مورخه ٢٦ جمادى

وله فی تاریخ طبع الوشاح علی عروض المفتاح*

تالیف القاضی ظفر الدین احمد استاذ دار العلوم الشرقیة لاہور

لَقَدْ زَانَ الْكَمَالَ بِمَا أَتَاهُ — أَدِيبٌ لَا يُبَارِيهِ سِوَاهُ

لَهُ فِي الْفِكْرِ سَابِقَةٌ عَلَيْنَا — فَمَا أَحَدًا تَرَى إِلَّا تَلَاهُ

تَحَامَاهُ الْفُحُولُ إِذَا رَأَوْهُ — مَخَافَةَ أَنْ يَدُوسَهُمُ وَغَاهُ

فَيَقْبَلُ كُلَّ مَا يَأْتِيهِ خَيْرًا — كَأَنَّ الْفِكْرَ شَامِتَةٌ يَدَاهُ [1]

أُولِي أَدَبٍ إِلَيْهِ الْيَوْمَ حَقًّا — فَهَنَّاهُ لِكَيْ يُدْعَى أَبَاهُ

أَتَتْكُمْ فَضْلَهُ وَلَهُ وِشَاحٌ — كَسِمْطِ الدُّرِّ لِلْغِيدِ اجْتَبَاهُ

تَلَأْلَأَتِ الْجَوَاهِرُ فِيهِ مَعْنًى — وَإِنَّ نِظَامَهَا لَفْظًا حَوَاهُ

حَدَائِقُ دَوْحُهَا انْشَعَبَتْ غُصُونًا — مَوَائِلُ ظِلُّهَا بَرْدٌ سَبَاهُ

فَقُلْتُ مُؤَرِّخًا فِيهِ ارْتِجَالًا — "لَكَ الدُّرُّ النَّظِيمُ" لِمَنْ وَعَاهُ

١٦ ھ ١٣

٢٨/ یولیو ٩٨ء

---

* طبعت الاشعار فی خاتمة الکتاب المذکور وهی من بحر الوافر والقافیة متواتر.

1 فی نسخة و: "العقل" فی مکان "الفکر"

قال یخاطب مبشری النصاریٰ *

أَعُبَّادَ الْمَسِيحِ لَنَا سُؤَالٌ	نُرِيدُ جَوَابَهُ مِمَّنْ وَعَاهُ
إِذَا مَاتَ الْإِلٰهُ بِصُنْعِ قَوْمٍ	أَمَاتُوهُ فَمَا هٰذَا الْإِلٰهُ ؟
وَهَلْ أَرْضَاهُ مَا نَالُوهُ مِنْهُ	فَبُشْرَاهُمْ إِذَا نَالُوا رِضَاهُ
وَإِنْ سَخِطَ الَّذِي فَعَلُوهُ فِيهِ	فَقُوَّتُهُمْ إِذًا أَوْهَتْ قُوَاهُ
وَهَلْ بَقِيَ الْوُجُودُ بِلَا إِلٰهٍ	سَمِيعٍ يَسْتَجِيبُ لِمَنْ دَعَاهُ
وَهَلْ خَلَتِ الطِّبَاقُ السَّبْعُ لَمَّا	ثَوَىٰ تَحْتَ التُّرَابِ وَقَدْ عَلَاهُ
وَهَلْ خَلَتِ الْعَوَالِمُ مِنْ إِلٰهٍ	يُدَبِّرُهَا وَقَدْ سُمِرَتْ يَدَاهُ
وَكَيْفَ تَخَلَّتِ الْأَمْلَاكُ عَنْهُ	بِنَصْرِهِمْ وَقَدْ سَمِعُوا بُكَاهُ
وَكَيْفَ أَطَاقَتِ الْخَشَبَاتُ حَمْلَ الْـ	ـإِلٰهِ الْحَقِّ شُدَّ عَلَىٰ قَفَاهُ
وَكَيْفَ دَنَا الْحَدِيدُ إِلَيْهِ حَتَّىٰ	يُخَالِطَهُ وَيَلْحَقَهُ أَذَاهُ
وَكَيْفَ تَمَكَّنَتْ أَيْدِي عِدَاهُ	وَطَالَتْ حَيْثُ قَدْ صَفَعُوا قَفَاهُ
وَهَلْ عَادَ الْمَسِيحُ إِلَىٰ حَيَاةٍ	أَمِ الْمُحْيِي لَهُ رَبٌّ سِوَاهُ
وَيَا عَجَبًا لِقَبْرٍ ضَمَّ رَبًّا	وَأَعْجَبُ مِنْهُ بَطْنٌ قَدْ حَوَاهُ
أَقَامَ هُنَاكَ تِسْعًا مِنْ شُهُورٍ	لَدَى الظُّلُمَاتِ مِنْ حَيْضٍ غِذَاهُ
وَشَقَّ الْفَرْجَ مَوْلُودًا صَغِيرًا	ضَعِيفًا فَاتِحًا لِلثَّدْيِ فَاهُ

* طبع هذا النظم فی مجلة "الهدیٰ" رقم ١٠ من السنة ١٣٢٤ الهجرية ص ٢٤-٢٥ مع الترجمة فی اللغة الاردوية، وترجمه نظماً مولانا غلام دستگیر النامی وطبع فی مجلة "الهدیٰ" رقم ٣ من السنة ١٣٢٥ ص ٣٨ وهو من بحر الوافر والقافية متواتر

ويأكل ثم يشرب ثم يأتي ... بلازم ذاك هل هذا إله

تعالى الله عن إفك النصارى ... سيسأل كلهم عما افتراه

أعباد الصليب لأي معنى ... يعظم أو يقبح من رماه

وهل تقضي العقول بغير كسر ... وإحراق له ولمن نعاه

إذا ركب الإله عليه كرها ... وقد شدت لتسمير يداه

فذاك المركب الملعون حقا ... فدسه لا تبسه إذ تراه

يهان عليه رب الخلق طرا ... وتعبده فإنك من عداه

فإن عظمته من أجل أن قد ... حوى رب العباد وقد علاه

وقد فقد الصليب فإن رأينا ... له شكلا تذكرنا سناه

فهلا للقبور سجدت طرا ... لضم القبر ربك في حشاه

فيا عبد المسيح أفق فهذا ... بدايته وهذا منتهاه

فی ردّ منکری الحدیث *

أَلَا يَا مَنْ تَمَسَّكَ بِاللَّجَاجِ ... تَمَسَّكْ بِالَّذِيْ أَتَى النَّبِيُّ

نَبِيٌّ كَانَ يَجْلُو الرَّيْبَ عَنَّا ... فَيَتَّضِحُ الصِّرَاطُ لَنَا السَّوِيُّ

بِوَحْيِ اللّٰهِ لَيْلًا أَوْ نَهَارًا ... فَلَيْسَ يَكَادُ يُنْكِرُهَا الذَّكِيُّ

لَهُ سُنَنٌ أَبَيْتَ اللَّعْنَ حَقًّا ... يَحُوْطُ مَخَابِرَهَا الرَّجُلُ الصَّفِيُّ [1]

مَشٰى سَلَفٌ عَلَى الْآثَارِ قِدْمًا ... فَأَنْتَ بِمَا مَشَوْا فَخْرًا حَرِيٌّ

أَيَمْدَحُهُمْ إِلٰهُ الْعَرْشِ شُكْرًا ... وَيَهْجُوْ مَا أَتَوْا نِكْسٌ دَنِيٌّ

أَلَا يَا لَيْتَ شِعْرِيْ كَيْفَ تَنْجُوْ ... وَلَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ الْخَفِيُّ

فَدَعْ عَنْكَ اللَّجَاجَ وَلَا تُجَاوِزْ ... حُدُوْدًا لَا يُجَاوِزُهَا التَّقِيُّ [2]

وَأَعْجَبُ مِنْكَ يَا ذَا الْجَهْلِ أَنّٰى ... تَسُوْدُ وَأَنْتَ كَذَّابٌ غَوِيُّ

---

* قد انطبع هذا النظم فی مجلة "الهدی" رقم ٦ من السنة ١٣٢٢ ھ ص ٣١-٣٢، مع الترجمة فی اللغة الأردویة وهو من بحر الوافر والقافیة متواتر.

1. أبیت اللعن: کلمة کانت العرب تحیّی بها ملوکها فی الجاهلیة، تقول للملك: أبیت اللعن؛ معناه أبیتَ أیّها الملك أن تأتیَ ما تُلعن علیه.

2. فی مجلة "الهدیٰ": "الوفیّ".

وممّا كتب الى بعض الفضلاء

أيا لائمي في حبّ سلمى ساليا ... رويدك يوما فالهوى خير ماليا [1]

فناهيك عذرا أنك اليوم جاهل ... بسرّ بكائي في الصبابة غاليا

فحسبك دمعي باح بالسرّ كاتما ... وحسبي ما لي من ملامك باديا

فكيف اصطباري والدموع سواجم ... وكيف ارتداعي والهوى سار حاديا

تنكّبت عن ذكر الحبيب تجاهلا ... لكي يحسب اللوّام قلبي خاليا

جوى الحبّ نار سعّرت في جوانحي ... فصار بها قلبي على الدهر صاليا

أيا راكبا إمّا هبطت ديارهم ... فبلّغ سلام الشوق منّي الغواديا

وقل زدت أشواقا أكابدها أسى ... ركائب صبّ مستهام صواديا [2]

وكلّ نزيل راحل يوم ظعنه ... نذيرا بأحزان الفراق بواديا

ولكنّ من يشتغل الذكر بعده ... يروح ويغدو بالعوارف جاريا

كمصقع في القوم يخطب قائما ... فيخلب ألباب الفحول مناديا

فما أفصح الألفاظ إذ رام خطبة ... وما أبلغ المحض إذا قام شاديا

له سابقات ما يشقّ غبارها ... تسابق غرّا في الرهان تواليا

له في رياض العلم نور تبسّمت ... كسمط بجيد الغيد راق لآليا

أدار كؤوس الراح صرفا على الورى ... فما أحد إلّا وأعطاه ماليا [3]

---

* من بحر الطويل والقافية متدارك

1 في نسخة "و": إليك فما لي خير ما قد بدا ليا

2 صواديا: يعني عطاشا

3 ماليا: من ملأ يملأ

تَقَادَمَ عَهْدُ الْقَوْمِ حَتّٰى حَسِبْتُهُمْ — نِيَامًا عَنِ الْخَطْبِ الَّذِيْ كَانَ عَادِيًا [1]

فَقَامَ بِتَجْدِيْدِ الرُّسُوْمِ الَّتِيْ عَفَتْ — فَأَحْيَا بِأَنْفَاسٍ عِظَامًا بَوَالِيَا

لَعَمْرِيْ أَتَانَا بِالْعَجَائِبِ كُلِّهَا — فَمِنْهَا يَقُلْ يَشْهَدْ بِهِ الدَّهْرُ قَالِيَا [2]

أَلَا أَيُّهَا الْبَحْرُ الْخِضَمُّ بِنُطْقِهِ — لَهٗ دُرَرٌ فَاقَتْ نُجُوْمًا دَرَارِيَا

قَضَيْتَ بِمَا يَرْضَى اللَّبِيْبُ بِمِثْلِهٖ — فَيَا لَكَ مِنْ خَيْرِ الْأَبَاعِدِ قَاضِيَا

تَوَعَّرَتِ الْأَرْضُ الَّتِيْ قَدْ سَلَكْتَهَا — فَهَا قَدْ شَأَوْتَ الْيَوْمَ سَحْبَانَ قَالِيَا

دُعِيْتَ أَبَا الرَّأْيِ الَّذِيْ لَا يُحِيْلُهٗ — بَصِيْرٌ بِأَحْدَاثِ الزَّمَانِ كَمَا هِيَا

فَلَا غَرْوَ إِنْ أُعْجِبْتَ رَأْيًا وَحِكْمَةً — فَمِثْلُكَ لَا يَأْتِيْ بِهِ الدَّهْرُ كَافِيَا

فَإِنَّكَ مِنْ قَوْمٍ سُيُوْفُهُمُ النُّهٰى — إِذَا مَا انْتَضَوْا يَوْمًا أَبَاحَتْ مَخَازِيَا

كُسِيْتَ خِلَاعَ الْمَجْدِ مُفْتَخِرًا بِهَا — تَفُوْحُ بِرِيَاحِ الْمِسْكِ مِنْهَا مَعَالِيَا

طُوِيْتَ عَلٰى غُرِّ صَحِيْفَةِ سُمْعَتِيْ — فَمَا كُنْتُ عَنْ نَفْسِيْ لَهَا الْهَمَّ جَالِيَا

بِنَفْسِيْ تَحَامَيْتُ اللِّقَاءَ تَعَمُّدًا — مَخَافَةَ أَنْ أَلْقٰى بِفَضْلِكَ زَارِيَا

مَدَحْتُكَ لِلّٰهِ اغْتِنَاءً بِفَضْلِهٖ — فَلَمْ أَبْغِ شَيْئًا غَيْرَهٗ مِنْكَ رَاجِيَا

فَهَا أَنَا أَدْعُوْ مَا اسْتَطَعْتُ فَإِنَّهٗ — سَيَأْتِيْ مِنَ الْأَقْدَارِ مَا كَانَ آتِيَا

بِرُوْحِيْ مَنْ قَدْ يُرْتَجٰى يَوْمَ وَصْلِهٖ — عَذِيْرِيْ مِنْهُ الشَّوْقُ بِالذِّكْرِ رَاضِيَا

۱۴ / ربیع ۹۹ء

---

[1] عاديا: منسوبا إلى عاد

[2] كأنه نظر إلى ما قيل ع م والفضل ما شهدت به الأعداء ۔ ۱۲ - منه

فهرس القوافي

القافية	البحر	الصفحة
الجفاءُ	الوافر	٣٠٩
عوىٰ	الكامل	٣١٤
الاضحىٰ	الطويل	٣١٦
الخطوبُ	الوافر	٣١٧
نجيبا	الوافر	٣١٩
المكاسبِ	الطويل	٣٢٠
المصائبِ	الوافر	٣٢١
قريحا	الوافر	٣٢٢
تليدُ	الوافر	٣٢٦
الغوادي	الوافر	٣٢٨
المطرُ	الطويل	٣٢٩
تدورُ	الوافر	٣٣٠
صبرا	الطويل	٣٣٦
اكثرا	الطويل	٣٣٧
العطرِ	الطويل	٣٣٨
النصرِ	الطويل	٣٣٩
عمري	الطويل	٣٤٠
التآسي	البسيط	٣٤٣
يائسِ	الطويل	٣٤٤
بواحشِ	الكامل	٣٤٥
شوقُ	الطويل	٣٤٦
غرقُ	الوافر	٣٤٧
فراقهُ	الطويل	٣٤٨

مرافقِ	الطویل	۳۴۹
بابُکْ	الوافر	۳۵۱
الرواحِلُ	الوافر	۳۵۲
المنازلُ	الطویل	۳۵۳
مَیْلا	الوافر	۳۶۲
للکمالِ دَوَامُ	الوافر	۳۶۳ ۳۶۵
الاثیمُ	الوافر	۳۶۶
غراما	الوافر	۳۶۷
بالحمامِ	الوافر	۳۷۰
الکلامِ	الوافر	۳۷۱
البلجرامی	الوافر	۳۷۲
مرامِ	الکامل	۳۷۴
سقیمِ	الکامل	۳۷۵
الظنونُ	الوافر	۳۷۶
علینا	الهزج	۳۷۷
لنا	المتقارب	۳۷۸
إخوانِی	الکامل	۳۷۹
أبیّہْ	الوافر	۳۸۳
سواءُ	الوافر	۳۸۵
وَعَاءُ	الوافر	۳۸۶
النبیُّ	الوافر	۳۸۸
مَالِیَا	الطویل	۳۸۹

فصلِ چہارم

(نثر)

خطبة ألقاها في بعض نوادي القوم

بسم الله الرحمٰن الرحيم

حمدًا يسترضع أفاويق الشوق، ويستدرّ أخلاف الذوق، لمن أوغلت في مهامه طلبه رواحل الأفكار فأبدعت بذويها، واستقصت خيول العقول فنزلت على حدّ لا يقصيه البصر ورجعت على حوافر هاتيها۔ له الجلال والجبروت فلا ينازع، له الملك والملكوت فلا يمانع۔ أنزل من السماء أنواء اللقاء تستجلب الدموع من العيون، وأجرى في بحار الغرام من الشوق الفلك المشحون، تهاجمت أعلام قدرته الباهرة على معاطن الأعيان، وتفاقمت آثار حكمته الظاهرة في مواطن الجنان۔ يصوّر النطف في الأرحام كيف يشاء، كما أنه يربّي ولدان الجواهر الزواهر في أجواف الأصداف وهي لها وعاء۔ لا تتقشّع مزن فضله إلا وسباخ الآمال تأخذ زخارفها، ولا تهبّ نسائم لطفه إلا وأغصان الأماني تملأ مصافها، وهو الذي أحلّ بأيدي فضله في ربوة إحسانه الرحيب، وأنزل طالبي كرمه في منزل جوده الخصيب۔ تعالى ذاته عن الشبه والندّ، وتنزّه وجهه عن المثل والضدّ۔ ذو البطش الشديد، والكرم الحميد، والفعل المجيد۔

وصلوة لا توازنه الجبال، ولا تفي بعددها حبّات الرمال على من أحرز قصبات السبق في مضمار الشرف الباذخ، وضربت عليه خيام المجد الأثيل والفضل الشامخ۔ اقتعد غارب العلياء، واجتنى العزّة القعساء۔ كلّمه مولاه فتكلّم في أندية الأسماع المصغية، وتعلّم من ربّه فعلّم ذوي القلوب الواعية۔ حاز ما حاز فبالله

كَمْ سُرَّ بِهِ الأُمَمُ، وَفَازَ بِمَا فَازَ فَبِاللهِ كَمْ فَرَّقَ بَيْنَ العُصَاةِ وَاللَّمَمِ. بُعِثَ وَأَنْوَارُ التَّوْحِيْدِ
كَانَتْ أَضْعَفَ مِنْ نَارِ الحُبَاحِبِ، وَأُرْسِلَ وَغَيَاهِبُ الضَّلَالَةِ كَانَتْ مُسْتَرْسِلَاتِ
الذَّوَائِبِ. فَأَوْقَدَ فِي مَجَالِسِهَا الشُّمُوْعَ، وَجَزَّ الفُرُوْعَ حَتَّى نَكَّسَهَا القُبُوْعَ. شُدَّتْ إِلَيْهِ
الرِّحَالُ مِنْ صَقَبَاتِ نَابِلِهَا وَبَابِلِهَا، فَاخْتَلَطَ لَدَيْهِ حَابِلُهَا بِنَابِلِهَا. فَمَا دَرَى أَحَدٌ أَيًّا مِنْ
أَيٍّ، وَلَمْ يَتَمَيَّزْ فَصِيْحٌ مِنْ عَيِيٍّ.

وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ الَّذِيْنَ صَعِدُوْا قُلَلَ العُلَى الشَّاهِقَةِ فَسَعِدُوْا وَسَادُوْا،
وَنَزَلُوْا عَلَى الأَعْدَاءِ كَالنَّازِلَةِ فَبَعِدُوْا وَبَادُوْا. وَاعْتَقَلُوا السَّمْهَرِيَّاتِ وَالرُّدَيْنِيَّاتِ فَقَصَفُوْهَا
فِي شَرَاسِيْفِ ذَوِي السَّابِرِيَّاتِ وَالعَبْقَرِيَّاتِ. القَاذِفِيْنَ بِمُهَجِهِمُ الغَالِيَةِ بَيْنَ الرِّمَاحِ وَ
السُّيُوْفِ، وَالخَائِضِيْنَ فِي المَوْتِ وَالحُتُوْفِ، تَلْمَعُ بَيْنَ الصُّفُوْفِ. وَاعْتَرَنُوْا وَهُمْ أَحْلَاسُ
المَطَايَا فَأَنَاخُوْا عَلَى الرَّدْهَةِ كَلَاكِلَ نُوْقِهِ، وَقَالُوْا: لَنْ نَرْجِعَ حَتَّى يَرْجِعَ السَّهْمُ إِلَى فُوْقِهِ.
وَخَرَجُوْا عَلَى الكَفَرَةِ وَكَانَتْ سَوَاسِيَةً كَأَسْنَانِ الحِمَارِ، فَهَزَمُوْهُمْ فَصَارُوْا كَمَنْ سَلَكَ
الجَدَدَ فَأَمِنَ العِثَارَ. وَمَشَوْا حَتَّى اشْتَكَتْ إِلَيْهِمْ بُطُوْنُ الأَوْدِيَةِ وَظُهُوْرُ القِفَارِ، وَ
صَالُوْا وَاشْرَأَبَّتْ إِلَيْهِمْ أَعْنَاقُ الفُتُوْحِ وَطَمَحَتْ عُيُوْنُ الإِعْتِبَارِ، فَكَانَ الكُفَّارُ مِنْهُمْ فِي
هِيَاطٍ وَمِيَاطٍ، وَشِدَّةٍ وَاخْتِلَاطٍ. فَمَا يُشَقُّ غُبَارُهُمْ، وَلَا يُطْوَى دُغْثُهُمْ وَخَبَارُهُمْ.
رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ مَا لَأْلَأَتِ اليَعَافِيْرُ فِي البَرَارِيْ وَبَصْبَصَتِ الفُوْرُ بِأَذْنَابِهَا فِي
الصَّحَارِيْ. آمِيْنَ، يَا رَبَّ العَالَمِيْنَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سبحان من یلقی الروح علی من یشاء + وتبارک الذی خلق الانسان وعلمہ البیان والانشاء + ارسل الینا من انمحت بنورہ اثار الظلام و الظلمت وعفت ببأسہ اطلال الشرک واندرست + الذی اقام منار الشریعۃ البیضا بالکتاب والسنۃ + واوضح منہج الملۃ الغراء بالاحکام السنیۃ وسنۃ فعلیہ وعلی آلہ الکرام والذین اتبعوہ من الانام ؛ ازکی التحیات واسنی الطیبات مالالات الیعافیر باذنابھا فی الفلوات ؛ وبعد لاریب فی ان ابھی ما تباھی بہ الطروس + واحلی ما تشتاق الیہ النفوس ؛ ما انطوت علیہ صحائف الاوراق من لطائف الحقائق واعلاق الدقائق + فان الجد والسعی فی سد ثلمۃ الدین ھما اصل کبیر فی الفوز والنجاح + والکد والعناء فی اعلاء کلمۃ اللہ ھما سر عظیم فی الخیر والصلاح + کیف تداعت حیطان منازل العلوم والشرائع + وتھادمت جدران قصور الفنون والبدائع + ولا یخفی ان ترقیۃ شئون المسلمین تنحصر فی نظام الحدود الشرعیۃ وانتساف اصول المبتدعین لا یتعدی ابطال المفاسد البدعیۃ فبذلک ما زال النفاق واھلہ فی ذل وخزی ولقمۃ + والایمان واھلہ فی عز ونصر ولغمۃ + ولکن ما رنا ما نری ان نیران الکمال قد خبت انوارھا فامسینا فی حنادس اللیالی الملد و غیاھبھا + وریاض الفنون قد یبست ازھارھا فسرنا فی سباخ السمائم الوعرۃ وسبسبھا +

خطبة القاها فی ندوة العلماء فی شهر رجب ١٣١٨ھ

بعظیم آباد پٹنہ وقد طُبعت فی مجلة ہذا المجلس (ص: ٩٣-٩٦)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

سبحان من یلقی الروح علی من یشاء، و تبارک الذی خلق الانسان وعلّمه البیان و الانشاء - ارسل الینا من انمحت بنوره آثار الظلام و انطمست، وعفت بیأسه اطلال الشرک و اندرست، الذی اقام منار الشریعة البیضاء بالکتاب والسنة، واوضح منهج الملّة الغرّاء بالاحکام السنیة و سنّة - فعلیه وعلی آله الکرام، والذین اتّبعوه من الانام، ازکی التحیّات واسنی الطیّبات، ما الألأت الیعافیر باذنابها فی الفلوات.

وبعده لا ریب فی أنّ ابهی ما تباهی به الطروس، واحلی ماتشتاق الیه النفوس، ما انطوت علیه صحائف الاوراق من لطائف الحقائق و اعلاق الدقائق - فانّ الجدّ والسعی فی سدّ ثلمة الدین هما اصل کبیر فی الفوز والنجاح والکد و العنا فی اعلاء کلمة اللّٰہ هما سرّ عظیم فی الخیر والصلاح - کیف وقد تداعت حیطان منازل العلوم و الشرائع، و تهادمت جدران قصور الفنون والبدائع، ولا یخفی أنّ ترقیة شؤون المسلمین تنحصر فی نظام الحدود الشرعیة و انتساف اصول المبتدعین لا یتعدّی ابطال المفاسد البدعیة - فبذلک منازل النفاق واهله فی ذلّ وخزی و نقمة، والایمان واهله فی عزّ و نصر ونعمة - ولکن ساءنا ما نری من أنّ نیران الکمال قد خبت انوارها، فامسینا فی حنادس اللیالی المدلهمة وغیاهبها، وریاض الفنون قد یبست ازهارها، فسرنا فی سباخ السمالق الوعرة وسباسبها - رحل ذوو الفضل فارتحلوا، وظعن اولو العلم فانتقلوا - طحنهم الرّدی، فتبوّاحت الطباق الثّری - وتوفّتهم

الفنون، فكل شوك لنا جفون ـ فوا أسفي من فراق قوم هم مصابيح الدجیٰ، و يا لهفي على الذين مضوا وقد كانوا شموس الهدى :

الا يا حماما بات يدعو اليفه   لقد زدتني شوقا واصبحتني حزنا

تركت جفوني لا تمل من البكا   على سادة غابوا برؤيتهم عنّا

أحنّ اليهم كل وقت وساعة   واشتاق في الليل البهيم اذا جنّا

فمجالس العلوم اقوت، ومشاهد الفنون اقفرت ـ تأوي اليها الثعالب والذياب، وتنعق بها البوم والغراب :

قف بالديار فهذه آثارهم   تبكي الاحبة حسرة وتشوقا

عادت كاعبة التحقيق عاطلا من قلائد غرائب نكت القرآن ومستودعات اسراره، وآل امر الدين من واج الى لاحب لا يهتدى بمناره ـ فالكمال في تلك الايام ضالة كثير ناشدها، قليل واجدها ـ وهب انك ظفرت بمن يروق العين بهاءً، ولكن اين هذا ممن تنبو عنه ازدراء ـ وذلك بما نرى من استهواء شياطين الانس واغوالهم، في غيا في معتقدات المؤمنين واحوالهم ـ بحيث لم يبق لأهل الحق في القوس منزع، ولا في تشاغل اهل الباطل عن الغيّ مطمع ـ فمن لي بمن يستعطف القلوب النافرة بمعجز البيان، و يجمع الاهواء المتنافرة بسحر البيان ـ ينهض بقلب هائم، ولا يخاف لومة لائم ـ يحمل فيحتمل، ويشمل فيشتمل ـ يصول ولا يرعوي، ويرد ولا يرتوي ـ يطفي لهبات نار الفتن، التي هي خدعة الصبيّ عن اللبن ـ يبسط لسانه، ويجود بيانه ـ ويطيل امتاعه، ويشحذ طباعه ـ يفيد علم الاوّلين رواية، ويصحّح آراء الأخرين دراية ـ لا يطوي سبيل قال وقيل، ولا يرتدع عن قبول الحق بالدليل ـ يطرد اعداء الدين بطرود مخلج، ويجري في مضمار الاخلاص كذي ميعة مسرج ـ يفحم بلغاء الخطباء من الجهلاء، يبكم عقلاء الفصحاء من السفهاء ـ يفتح مقاصير الحقائق بمقاليد البيان، ويسدّ ابواب نزغ الشيطان بمساعي البنان ـ يستخلص له سواد اكليل الصدود على الكئيب الولهان، وبياض الكراريس كهلال عيد رمضان ـ بالفاظ رقيقة رائقة كشقائق النعمان، وبمعان دقيقة كغصن البان،

لابل كقلائد العقيان، او وشاح الجمان، فى البريق و اللمعان ـ فتعود حديقة كماله
يانعة الاثمار، ضاحكة الازهار ـ غانية الغنادل، جارية الجداول مخضرة الروابي و
البطاح، مبتهجة المساء والصباح ـ يتلطّف في نادية البراعة فيتذاكر، و يتزيّن بخلاء
السبق فيتشاكر ـ ينفخ فى عظائم القوم بالية، و يجدّد رسوم الديانات خالية ـ يخشى
وصوله يرجى قفوله و تنقر طبوله و تجول خيوله ـ و تضرب خيامه، و تخفق اعلامه ـ
فيأسر الاعداء، و ينقذ الاحبّاء ـ بكتائب خضراء من غرائب مخترعاته، و عساكر ملحاء من
نفائس مبتدعاته ـ مرشدا إلى مصالح المعاش والمعاد، مسبغا نعم المعارف على العباد ـ
متعبا قريحته فى استخراج المعانى اللائقة، مريحا نفوس الخلائق من خلاج الاوهام
الفاهقة، خائضا بحار اسرار التنزيل، فيطلع سالما منغمسا فى غمار رموز التأويل ـ فيرجع
غانما متطلّعا إلى الايناس، مشغوفا بالاقتباس، اللهمّ يا مفيض الخير والاحسان
ارزقناه حريّا، و ابعثه لنا سويّا ـ بحرمة النبيّ و آله الاطهار و اصحابه الاخيار ـ آمين
يا رب العالمين آمين آمين آمين ـ

مقدمہ کتاب الآیۃ الکبریٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ

الحمد للّٰہ المتوقی بحقائق اسمائہ الحسنیٰ قلوب العاشقین و المتجلّی بانوار صفاتہ العظمیٰ لارواح
العارفین المستتر بسُرادقات جلالہ الباطن علی المظاہر بکمالہ المتفرد بالخلق و التدبیر الواحد فی
الامر والتقدیر، الداعی الی دار السلام ارباب الحجج والبراھین، والھادی الی القول الثابت
اصحاب العلم و الیقین، المنعم علی طوائف الخلائق انواع النعیم، الواھب لاصناف الامم عطایا جودہ
العمیم، فقال فی کتابہ المجید: کلاً نمدّ ھٰؤلاء و ھٰؤلاء من عطآء ربک، وما کان عطاء
ربک محظورا۔ القاضی بالحکمۃ البالغۃ فی الاشیاء وکان ذالک فی الکتٰب مسطورا۔ وھو
الذی انتھت الیہ غایاتُ الاکوان ومبادیھا، واستغرقت شیون صفاتہ حواضر الاعیان
وبوادیھا۔ فاشھد أن لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ شھادۃ من شرّط بہ التصدیق عن
الارتیاب، وفتح اللّٰہ علیہ من نصتہ کل باب ۔

وفی کل شئیٍ لہ آیۃ　　　تدلّ علی انہ واحدٌ

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی المظھر الاتمّ الاکمل الامجد الامثل الاعلیٰ، سیّدنا ومولانا محمدن
المصطفیٰ احمد المجتبیٰ الخاطب من حضرۃ الربوبیّۃ بخطاب وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین
المعنون منشور عزہ بعنوان انک لمن المرسلین، الذی بعثہ بین یدی الساعۃ بالحق بشیراً و
نذیرا، وارسلہ بالھدیٰ حین تراکمت الظلمات سراجا منیرا ۔

فقل ماشئت فیہ من مدیحٍ　　　تجدہ فوق مانطق المدیحٗ

وعلیٰ آلہ العظام، واصحابہ الکرام، الذین ھم مصابیح الظلام بین الانام، و ھا انا
اجری فی میدان المقصود متوکلا علی اللّٰہ الودود ۔ والسلام

تقریظ علی کتاب حسن الجریدہ فی شرح قصیدۃ البردہ

للمولوی عبدالمالک ناظم الادارۃ المالیۃ بہاولپور، صفحہ ۱۸۱-۱۸۲

حمداً لک یا من منّ علینا بنبی الرحمۃ، فازاح بہ العلّۃ والزحمۃ، بعثہ الی الاحمر والاسود، فاز الاشقی من الاسعد، حجۃ اللّٰہ علی العالمین سند الانبیاء والمرسلین، الذی کان نبیّا وآدم بین الماء والطین، ثم جاء فقام یدعو کافّۃ البرایا الی مناھج الدین، فھو الذی اُرسل الی الخلق مبشّرا ونذیرا، فھداھم الی سبل السلام داعیا وسراجا منیرا ؎

محمد کازل تا ابد ہر چہ ہست　　　بآرایش نام او نقش بست

علیہ وعلی آلہ واصحابہ اطیب الصلوات وازکاھا، واسنی التحیات واعلاھا،

اما بعد، فقد طالعت ھذہ الصحیفۃ الشریفۃ من اولھا الی آخرھا، فوجدتُھا بحورا تزلّ اقدام الراسخین بزاخرھا، ولعمری انھا درّ مکنون او فلک مشحون، فللّٰہ درّ الشارح النبیل صدیقنا الفاضل الجلیل المولوی محمد عبدالمالک ناظم ادارۃ المالیۃ بعاصمۃ دولۃ بہاولپور، صانھا اللّٰہ تعالیٰ عن آفات الدھور، حیث اتی بما یعجب فحول الفصحاء وقروم البلغاء، بالفاظ رائقۃ ومعانٍ فائقۃ، طاویا کشحہ عن الایجاز المخل والاطناب الممل، فجاء بحمد اللّٰہ علی ما تشتھیہ الانفس الرقاق الحواشی، بریّا من النقائص والغواشی، اللّٰھم تقبّلہ منہ ثوابا من عندک فی الدنیا والآخرۃ، انک انت السمیع العلیم، فانّہ ابتغی بذلک رضاک وارضاء حبیب رسولک الکریم صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین الی یوم الدین

والسلام

نمقہ احقر عباد اللّٰہ الولی اصغر علی　　　عفا اللّٰہ عنہ کل ذنب خفیّ وجلیّ

۳ رجادی الثانیۃ ۱۳۲۶ ہجریہ

تقریظ علی الرسالۃ الموسومۃ

باحسن المقال فی عدم اعتبار الخط فی رویۃ الہلال

مؤلفہ

مولانا مولوی عبدالرزاق مہتمم مدرسۃ احمدیہ

واقع مسجد قصاب محلہ بمبائی

مطبوعہ مطبع مصطفائی واقع نل بازار بمبائی ۹ صفر ۴۴

اما بعد فقد طالعت ہذہ الرسالۃ العجیبۃ والصحیفۃ الغریبۃ فوجدتہا تغنی عن المسلمین فی موضوع رویۃ الہلال وما یتعلق بہا من شہادۃ الکاتب والتلغراف بدلائلہا القاطعۃ وبراہینہا الساطعۃ ولعمری ان المؤلف الفاضل قد جاء بما یتلقاہ الفحول بالقبول ولیس لاحد ان یتکلم فی ہذا البحث بالفضول ؎

فہذا الحق لیس بہ خفاء　　　فدعنی عن بنیات الطریق

انا العبد المدعو باصغر علی الروحی

مدرس العربیۃ بلدۃ لاہور

ملحقات

باب اوّل

تقاریظ

تقاریظ

عموماً تقریظ لکھتے وقت لکھنے والا کتاب یا رسالہ کی تعریف ہی کرتا ہے اور اُس کتاب یا رسالہ کے نقائص کے پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن مولانا مرحوم کی تقاریظ تعریفی پہلو کے علاوہ کتاب یا رسالہ کے نقائص کا بھی ذکر فرما دیتے تھے جیسا کہ

رسالہ عصر جدید، پنجابی، بشارتِ محمدیہ، رسالہ توحید مقبول وغیرہ پر لکھی گئی تقاریظ سے واضح ہے۔

ان تمام تقاریظ کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے تاکہ تلاش میں آسانی ہو دراصل ان میں سے بیشتر تقاریظ وہ ہیں جو مولانا مرحوم اپنے ماہوار رسالہ "الہدیٰ" میں لکھتے رہے لیکن کچھ تقاریظ ایسی ہیں جو مختلف کتب اور رسائل سے جمع کی گئی ہیں ہر صورت میں جہاں سے وہ تقریظ اخذ کی گئی ہے اُس کا حوالہ دے دیا گیا ہے

تقریظوں کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے مصنفین مولانا مرحوم کی تقریظ حاصل کرنا اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے تھے جن کتب پر یہ تقاریظ لکھی گئی ہیں وہ مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں جس سے مولانا کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

رسالہ " احکام شبِ برات " [1]

مرتّبہ

مولانا احمد علی

الجواب صحیح۔ اسراف اور تبذیر میں نمایاں فرق ہے کیونکہ اسراف مقولہ کم سے ہے اور تبذیر مقولہ کیف سے یعنی حدِّ اعتدال سے زیادہ صرف کرنا اسراف کہلاتا ہے اور بے محل صرف کرنا تبذیر ہے جیسے ڈوم، قوال، آتشبازی وغیرہ ممنوع کاموں میں بیباک لوگ صرف کیا کرتے ہیں۔ اسراف اور تبذیر دونوں کی نسبت آیاتِ قرآن مجید میں وعیدیں آئی ہیں اور صورت مستفسرہ کے درمیان میں تبذیر بھی ہے اور اسراف بھی۔ اسلئے مسلمانوں کو قطعاً ایسے ممنوع اور منہی عنہ فعل سے باز رہنا چاہیئے اسلام صرف نماز، روزہ ہی کا نام نہیں بلکہ منہیات سے بچنا اور اوامر کی بجا آوری پر مقدم ہے۔

(حضرت مولانا مولوی) اصغر علی (صاحب) روحی عفی عنہ

---

[1] مطبوعہ جولائی ۱۹۶۱ء، ص ۱۳

ریویو

ارکان خمسہ [1]

سید نذیر علی صاحب وکیل صدت گڑھ ریاست بیکانیر نے مسطورہ بالا کتاب ارکان خمسہ اسلام کے متعلق تصنیف کرکے عام مسلمانوں کو اپنا مرہونِ احسان کیا ہے۔ اس کتاب میں نہایت سادہ اور صاف طور پر انہوں نے ان موٹے موٹے احکام شرعیہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کا جاننا ایک مسلمان کو مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے۔ کتاب کا طرزِ بیان اور ضروری مسائل کی وضاحت قابلِ تعریف ہے اور اس پر کتاب کی چھپائی اور لکھائی سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہیں۔ لائق مؤلف نے کچھ کتابیں مفت فی سبیل اللہ بھی تقسیم کی ہیں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

تعداد صفحات ۱۸۰۔ قیمت ۱۰/ جناب مؤلف سے مذکورہ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

---

[1] الہدیٰ؛ ج ۳ ع ۱۳ ص ۳۹

ریویو

اسرار التنزیل [1]

یہ وہی کتاب ہے جس کے چند نمبر الہدیٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔ دلائل عقلیہ کے طالبین کو اس کتاب سے بڑھ کر تحقیق توحید کے لئے کوئی کتاب میسر نہیں آسکے گی۔ یہ کتاب امام المتکلمین فخر الدین رازی صاحب تفسیر کبیر کی تصنیف ہے اور یہی تعریف کافی ہے۔ اب مکمل ہو کر چھپ گئی ہے

قیمت فی جلد ۹ / ۔ مولوی کرم بخش صاحب مطبع اسلامیہ لاہور سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے

1 الہدیٰ ؛ ج ۷ ع ۹ ص ۲۰

ریویو

اسلام کی پہلی و دوسری کتاب [1]

زمانہ کی ضرورتوں نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ مسائلِ دینیہ کو حسب مذاق زمانہ نئی نئی صورتوں میں لکھیں۔ بات تو ایک ہی ہوتی ہے مگر طرزِ تالیف جداگانہ ہوا کرتا ہے۔ گو قبل ازیں اسلامی کتابوں کے سلسلے ملک میں رائج ہو چکے ہیں۔ مگر یہ سلسلہ بھی بجائے خود قابلِ قدر ہے۔ اس سلسلہ کے مؤلف مولوی نور الدین صاحب اجمیری مدرس مدرسہ معین الاسلام اجمیر ہیں۔ فی الحقیقت پہلی اور دوسری کتاب ہم نے دیکھی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس سلسلہ میں ایسی ہی مفید کتابیں نکلیں گی۔ ان ہر دو کتابوں میں سلسلہ وار اسلامی مسائلِ اعتقاد اور مسائلِ فقہ کو عمدہ طرز میں جمع کیا گیا ہے۔ امید کہ ناظرین اس سلسلہ کی قدر کریں گے۔

قیمت ہر دو کی چند پیسے ہیں۔

ملنے کا پتہ: منشی غلام مصطفیٰ صاحب کوچہ کندیگراں اسلامیہ بک ڈپو لاہور

[1] الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۲ ص ۱۱

تقریظ [1]

اسلام کی حسنات ـ اسلام کی حمایت ـ اسلام کا اتالیق ـ علاج مصیبت ـ قال الرسول

جناب نواب میر نصیر الدین حسین خان صاحب رئیس بڑودہ نے جنکی علمی خدمات دور و نزدیک مشہور ہو چکی ہیں ۔ دفتر الھدیٰ میں مذکورہ بالا پانچ رسائل ارسال فرما کر خاکسار ایڈیٹر کو اپنی شکر گزاری کا موقع دیا ہے ۔ چونکہ نواب صاحب ممدوح قوم کے ایک معزز اور مقتدر رکن ہیں ۔ اسلئے ان کی طرف سے ایسی علمی اور دینی خدمات کی سر انجام دہی واقعی قابلِ حیرت ہے کیونکہ طبقہ امراء میں علم دوست اور خود عالم با عمل اصحاب بہت ہی کم بلکہ بمنزلہ کبریت احمر کے ہیں لہذا نواب صاحب کا وجود علاقہ گجرات دکن کے مسلمانوں میں نہایت ہی غنیمت ہے اللہ تبارک و تعالیٰ نواب صاحب کو ایمان صحیح اور اخلاص کامل نصیب کرے بجز دعا ایک دور افتادہ مخلص سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے ۔ ان رسائل کا موضوع علیٰحدہ علیٰحدہ حسب ذیل ہے ۔

علوم دین کی مختصر کیفیت ـ پیشوایان قوم کے فرائض ـ ناجائز رسم و رواج کی مذمت ـ ترک گناہ و معصیت کا طریق ـ بعض نہایت ضروری اور اہم احادیث نبویہ کے وہ معارف و اسرار جو انسان کے ظاہر و باطن کو پاک و صاف کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتے ہیں اور جنہیں عوام الناس کتب احادیث سے خود نہیں نکال سکتے ـ ان رسائل کے مطالعہ سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر ـ قومی اور دینی بہبودی کے اصول اور ضرورت زمانہ کی مقتضیات کی نبض شناسی کا پورا پورا پتہ لگتا ہے ۔ ہر ایک مسلمان کے گھر میں ان رسائل کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسی ہی تصانیف کی ضرورت ہے ۔ یہ رسالے نہایت عمدہ چھپے ہوئے ہیں ہر ایک کی قیمت ۱ اور بلا محصول ڈاک ہے ۔ ملنے کا پتہ : دفتر الھدیٰ لاہور ؎

---

[1] الھدیٰ ؛ ج ۷ ع ۳ ص ۳۹ ـ ۴۰

ریویو[1]

اسلام کے عقائد - اسلام کی خوبیاں - اسلام کی ترقی

مذکورہ بالا تین رسالے جن کے مضامین علیحدہ علیحدہ ان کے ناموں سے واضح ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہ رسالے قوم کے ایک معزز رکن جناب نواب صدر الدین حسین خان صاحب رئیس بڑودہ ملک گجرات کی تصنیف ہیں۔ رسالوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصنف کو قومی صلاح و فلاح کا ایک خاص مذاق ہے۔ یہ رسالے سلیس اردو میں قلمبند کئے گئے ہیں اور ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ بتلایا ہے کہ مقدس اسلام کے اصلی عقائد کیا ہیں اور مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے کونسے اسباب ہیں۔ بدعاتِ منکرہ اور دیگر خلاف مشروع رسوم و رواج کو دلیرانہ طور پر خوب رد کیا ہے۔ گو ایسے مضامین کی موجودہ زمانہ میں سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر امراء کے طبقۂ عالیہ سے اگر کوئی صاحب توفیق ایسا نکل آئے تو بسا غنیمت ہے کیونکہ اسی طبقے کے لوگ عوام الناس پر اپنے نیک و بد اخلاق کا پورا پورا اثر ڈال سکتے ہیں۔ رسالۂ اسلام کی ترقی کی فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔ امید کہ ناظرین خود اندازہ لگالیں گے کہ لائق مؤلف نے وجوہات ترقی کو نہایت گہری نظر سے جانچا ہے۔

اسلامی انجمنیں - اسلامی مدرسے - اسلامی کتب خانے - اسلامی یتیم خانے - اسلامی اخبارات - اسلامی پریس - اسلامی بک ڈپو - مذہبی کتابوں کے ترجمے - اسلامی خیرات - اسلامی مذاہب کا باہمی اتفاق - علمائے اسلام کا بندوبست - مذہبی تحقیقات - اسلام پیارا ہے یا دولت۔

رسائل مذکورہ بالا اس قابل ہیں کہ مختلف اطراف ممالک میں انکی اشاعت کی جائے کیونکہ مختلف صوبوں کے مسلمانوں کا اپنے قومی مفاد میں متحد الخیال ہونا ازبس ضروری ہے۔ خدا حضرت مصنف کو جزائے خیر دے جنہوں نے اسلامی خدمت میں ایک معتدبہ حصہ لیا ہے۔ یہ رسالے انہی سے مذکورہ بالا پتہ پر نہایت ہی ارزاں قیمت پر مل سکتے ہیں۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۹ - ۴۰

رسالہ " اسلام میں نکاح بیوگان [1] "

مرتبہ

مولانا احمد علی مرحوم بانی انجمن خدام الدین لاہور

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی رسولہ الامین اقول و باللہ التوفیق ۔

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے: " ان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول " (الآیۃ) یعنی اگر تمہیں کسی امر میں نزاع پیدا ہو جائے تو تم کتاب اللہ و سنت نبویہ پر پیش کرو کیونکہ کوئی صحیح الایمان مسلمان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے آگاہ ہو کر کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فی ما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما " (یعنی تیرے رب کی قسم ہے کہ یہ لوگ تب تک ایماندار نہ ہونگے جب تک اپنے تنازعات میں تجھے اپنا حاکم (فیصلہ کنندہ) نہ بنائیں اور جو آپ جو فیصلہ دیں اس سے دل میں کسی قسم کی کدورت نہ لائیں (خواہ ان کے مخالف ہی ہو) اور پورے طور پر تسلیم کرلیں) ایسے صحیح احکام قرآنیہ کے ہوتے ہوئے کسی ایماندار کو ان کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوسکتی ۔ رسوم و رواج کی پابندی صرف اس حد تک جائز خیال کی گئی ہے جس حد تک وہ صریح احکام قرآن و سنت کے مخالف نہ ہوں ۔ اور اگر کسی حکم شریعت کے مخالف ہوں تو یقیناً ان کی پابندی حرام قرار دی گئی ہے ۔ شریعت حقہ نے جس حکم کو امت مرحومہ پر عائد کیا ہے ۔ اسکی پابندی بلا استثناء ہر ایک فرد بشر پر جس پر وہ حکم عائد ہو سکتا ہے ۔ فرض ہے ۔ اور اسکی مخالفت کرنے والا فاسق و فاجر ہے ۔ حدود اللہ سے تجاوز کرنا کسی صحیح العقیدہ مسلمان کا کام نہیں ۔ بلکہ ایسے اشخاص پر قرآن و سنت میں سخت وعیدیں آچکی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ مسئلہ مندرجہ سوال کے متعلق حکم خداوندی کیا ہے ۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ ارشاد

[1] مطبوعہ اپریل سنہ ١٩٦١ صہ ١٣ - ١٤

فرماتا ہے۔ "وانکحوا الایامیٰ منکم" لفظ ایامیٰ جمع ہے جس کا مفرد ایّم ہے۔ جس کے معنی ہیں ایسی عورت جو خاوند نہ رکھتی ہو اور ایسا مرد جو عورت نہ رکھتا ہو۔ چونکہ یہ آیت شریف مرد اور عورت ہر دو پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے "انکحوا" جو صیغۂ امر ہے بطریق وجوب مرد اور عورت کے نکاح کر دینے پر دلالت کرتا ہے اور اس میں خطاب اولیا یعنی ایسے شخص کو کیا گیا ہے جو عقدۃ النکاح کا اختیار رکھتے ہیں۔ پس جب صریح نص قرآنی سے غیر منکوح مرد اور عورت کے نکاح کر دینے کا حکم ثابت ہے تو اسکے مقابل میں کسی خاندانی یا قومی رسم و رواج کو مقدم رکھ کر اس حکم کی خلاف ورزی کرنا عذاب الٰہی کا مورد بننا ہے۔ واضح ہو کہ شریعت کا ہر ایک حکم عقل سلیم اور طبع مستقیم کے ہرگز مخالف نہیں ہو سکتا بلکہ اسکی مخالفت میں بہت سی قباحتیں متصور ہیں جو اخلاقی طور پر بھی نہایت بری خیال کی گئی ہیں اور ہمیشہ آئے دن اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو شرفاء کی عزت اور ننگ و ناموس کے برباد کرنے اور اسلامی جماعت میں بہت سی بد اعمالیوں کی اشاعت کرنے میں پورا دخل رکھتے ہیں۔ بیوگان کے نکاح ثانی کی مخالفت کفار کی رسوم کا بقیہ ہے۔ جو مسلمانوں کے بعض قابل خاندانوں میں اب تک چلا آتا ہے اور اس کا حصر کرنا شرعاً و عقلاً ہر مسلمان کا فرض ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

(کتبہ حضرت مولانا مولوی) اصغر علی روحی عفی عنہٗ (پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

ریویو

اصول علاج المائیہ [1]

جناب حافظ حکیم محمد الدین صاحب مرحوم سکنہ ننگر متصل لاہور نے جن کے طبی تجربات اور معالجات سے اہل پنجاب بخوبی واقف ہیں۔ ایک رسالہ موسوم بہ **اصول علاج المائیہ** تصنیف فرمایا تھا۔ جو اپنی نوعیت میں بالکل ایک نئی تصنیف ہے۔ فاضل مؤلف نے اپنے وسیع تجربات کو ایک نہایت ہی مفید اور آسان صورت میں جمع کیا ہے۔ تمام امراض کا علاج صرف پانی کو مختلف طریق پر استعمال کرنا تجویز کیا ہے۔ چنانچہ ہر ایک عضو کے متعلق علیحدہ علیحدہ باب اور فصلیں مقرر کر کے اس عضو کے متعلق بیماریوں کی تعداد اور ان کے نام اور اسباب اور علاج کو مختصر مگر جامع طریق سے بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب علم طب میں ایک نہایت ہی مفید اضافہ ہے اور اطباء کو بالخصوص اور عامۂ اہل علم کو بالعموم اس کتاب سے مستفید ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس بیش بہا تحفہ کا معاوضہ بمقابلہ مؤلف مرحوم کی محنت اور جانفشانی کے بہت ہی کم رکھا گیا ہے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ صفحہ ۷۶ قیمت ۶/ یہ کتاب درخواست کرنے پر حکیم غلام علی صاحب حویلی کابلی مل لاہور سے مل سکتی ہے۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۴ عــ ۸ صــ ۴۳

ریویو

انطباق الشہدہ فی حلّ ابیات البردہ [1]

یہ کتاب امام بوصیری کے قصیدہ نعتیہ مشہور بقصیدہ بردہ کی شرح ہے۔ جو ہمارے فاضل اور مکرم دوست مولوی محمد عبدالمالک صاحب ناظم صیغۂ مال ریاست بہاولپور نے لکھی ہے۔ قصیدہ شریف دنیا بھر کے قصائد نعتیہ میں بلحاظ فصاحت و بلاغت اور خوبی مضامین اور بیان کمالات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثل و بے نظیر تسلیم کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے اکابر مشائخ سلاسل اربعہ نے اسکو نہایت عقیدت کے اور ارادت کے ساتھ اپنے اوراد وظائف میں داخل سمجھ رکھا ہے اور فی الحقیقت جو انوار اور برکات اس کے التزاماً پڑھنے سے عاشقان جناب محمدی کو حاصل ہوتے ہیں ان کا شمار کرنا ناممکن ہے۔ قصیدہ چونکہ اکثر تلمیحات اور تشبیہات و استعارات پر مشتمل ہے جن کا عربی نہ جاننے والوں کے لئے سمجھنا خالی از دقت نہ تھا۔ اس لئے فاضل شارح نے نہایت خوش اسلوبی اور متانت کے ساتھ ان تمام امور کو شرح اور بسط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ پہلے مفردات الفاظ کی لغوی تحقیق کی ہے۔ بعد ازاں ترجمہ لکھا ہے اور پھر ہر ایک شعر کا خلاصہ مطلب بھی لکھ دیا ہے۔ جس سے پڑھنے والوں کو شعر کا ماحصل سمجھنے میں پورا پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ گو بعض اصحاب نے اس کی شرحیں لکھی ہیں مگر عربی و فارسی میں ہونے کی وجہ سے لوگ اُن سے چنداں مستفید نہیں ہو سکتے۔ ہمارے خیال میں ایسی جامع اور مکمل شرح اردو زبان میں تاحال شائع نہیں ہوئی۔ شارح ممدوح نے ایسی شرح لکھ کر اہل ایمان پر ایک بھاری احسان کا بوجھ ڈالا ہے جس کا شکریہ اس بے بہا شرح کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس شرح کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اہل مذاق بہت جلد اس کے مطالعہ سے مسرور و محظوظ ہوں۔

یہ کتاب عمدہ کاغذ پر تقریباً دوصد [۲۰۰] صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ اور ستھری ہے۔ ہر ایک شعر اعلیٰ عربی خط میں علاحدہ جدول دے کر لکھا گیا ہے۔ قیمت فی جلد علاوہ محصول ڈاک ۱۲ /ر۔ درخواستیں بنام مینیجر الہدیٰ کا دہلی کابلی مل لاہور آنی چاہئیں۔

---

[1] الہدیٰ؛ ج ۵ ع ۹ ص ۲۴

الامامۃ بالعمامۃ والصلوٰۃ بالمصاحۃ [1]

مؤلفہ

قاضی ابو محمد فضل حق حنفی نقشبندی

(تقریظ من جانب فاضل اکمل جامع علوم معقول و منقول حضرت مولوی اصغر علی روحی
پروفیسر عربی و دینیات اسلامیہ کالج لاہور)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی رسولہ الامین والسلام علی آلہ واصحابہ
ھداۃ الدین اما بعد میں نے اس رسالہ کو من اولہ الی آخرہ مطالعہ کیا اور اس کو سراسر نمونہ ہدایت پایا
سلف صالحین حضور علیہ السلام کی سنت کے ایسے دلدادہ تھے ان کی عملی حالت میں حتی الامکان کوئی امر
مخالف سنت نہیں پایا جاتا تھا اور انہیں حضور علیہ السلام کی ادنیٰ سے ادنیٰ سنت کی عزت بھی اس قدر ملحوظ
رہتی تھی کہ کبھی اسکی مخالفت کو جائز نہیں رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ دیانت و تقویٰ میں بے مثل و بے نظیر تھے ۔
امتداد زمانہ پر آہستہ آہستہ لوگوں نے عمل بالسنت کی طرف سے توجہ ہٹالی اور رسوم و عادات کی پابندی
اپنا شیوہ بنالیا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت پھیل گئی اور نور سنت کہیں کہیں کرمک شب تاب
کی طرح جھلک دیتا نظر آتا ہے ۔ خداوند تبارک و تعالیٰ حضرت مؤلف کو جزائے خیر دے جس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ
امام کو بلا عمامہ جماعت نہیں کرانا چاہیے کیونکہ اس طرح نماز مکروہ ہو جاتی ہے اور بلا عذر ایسا کرنے سے اسکی
فضیلت میں نقصان عائد ہوتا ہے ۔ عقلاً بھی غور کر کے دیکھ لو کہ جو مہارت و وقار عمامہ میں موجود ہے وہ خالی
ٹوپی میں ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ اسلئے امام کو حتی الوسع باوقار اور متقیانہ وضع میں ہونا ضروری ہے تاکہ

---

[1] مطبوعہ لاہور ، شوال ۱۳۳۰ھ

مقتدیوں کے دلوں میں نماز کی عزت اور ہیبت ذکرالٰہی کا اثر محسوس ہو کیونکہ یہ ثابت ہے کہ باہر کے اعمال کا دلوں پر پورا پورا اثر پڑا کرتا ہے اور حضور علیہ السلام ہمیشہ موقرانہ لباس میں جماعت کرایا کرتے اور یہی شیوہ قرونِ ثلاثہ میں تمام علمائے مرحوم کا رہا چنانچہ سیر و تواریخ کے واقف پر یہ امر مخفی نہیں۔ میرے خیال میں یہ رسالہ بہت مفید ہے، جسکی کافۂ اہلِ ایمان کو ضرورتِ شدید ہے۔ اس کا طرزِ بیان نہایت صاف اور واضح ہے اور عمیق تعارضات اور باریک تناقضات سے جن کا احتمال عموماً سلسلہ روایت میں ممکن ہوا کرتا ہے بالکل مبرا اور منزہ ہے کیونکہ ان کا مقام دیگر صحائف ہیں۔ افادہ عام کے لئے یہی طرز ممدوح سمجھا گیا ہے۔ سو قاضی صاحب نے پوری طرح ادا کر دیا۔

والسلام خیر الختام

فقط

خاکسار

اصغر علی روحی

پروفیسر عربی و دینیات اسلامیہ کالج لاہور

انوار آفتاب صداقت [1]

مؤلفہ و مصنفہ

مولانا حاجی فضل احمد

تقریظ

مولانا الاجل و فاضل ادیب بے بدل حضرت مولوی اصغر علی صاحب روحی مدظلہ العالی

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خذ ما تراہ ودع شیئًا سمعت بہ — فی طلعۃ الشمس ما یغنیک عن زحل

عقائد کا معاملہ جس قدر اہم ہے اسی قدر ہمارے زمانہ میں اسکی طرف سے عامہ تعلیم یافتگان کو ذہول ہو رہا ہے۔ تقلید کی ضرورت پر بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ اسلامی دنیا میں شروع سے گیارہویں صدی ہجری تک کتب تاریخ سے کسی ایسے محدث و مفسر و فقیہ کا پتہ نہیں ملتا جو غیر مقلد ہو۔ اگرچہ غیر مقلدین حضرات نے کھینچ تان کر بعض اکابر سلف کو غیر مقلد ثابت کرنا چاہا ہے، مگر یہ سب باتیں منہ سے کہہ دینے کی ہیں۔ عدم تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں اتباع ہوائے نفس کا دروازہ کھل گیا اور جس نے جو چاہا کہہ دیا چنانچہ اسی بے لگامی اور نااہلی کا نتیجہ ہے کہ عقائد صحیحہ اسلامیہ کا جو حضرات اکابر ائمہ قرون ثلاثہ کا شعار تھا تار پود منتشر ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ جب عقائد باطلہ بدعات سیئہ دل میں جاگزیں ہو جائیں، اس کا نتیجہ ضروری یہ ہوا کرتا ہے کہ بزرگان کی نسبت سوء ظن پیدا ہو کر دریدہ دھنی تک نوبت پہنچ جاتی ہے جس سے انواع و اقسام کی بے اعتدالیاں پھیل جاتی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں تو ادب کا کس قدر فقدان ہو گیا ہے جس سے اولیائے کرام اور آئمہ عظام کی نسبت مختلف قسم کی فلکتہ چینیاں تجویز کی جاتی ہیں۔ نیتجہ

[1] مطبوعہ سنہ (٢٩ ربیع الثانی) ١٣٣٨ھ / (٢٢ جنوری) ١٩٢٠م ص ٩

بر کر روحانی فیضان کا بالکل سدِّ باب ہو چکا ہے اسی عدم تقلید پر آئے دن نئے نئے فرقے اسلام میں پیدا ہو رہے ہیں اور بدعقیدگی کی حد ہو چکی ہے۔ ایسے وقت میں علمائے اسلام کا فرض ہے کہ وہ بمقتضائے حدیث شریف "لا یزال طائفة من امتی.................." الحدیث۔ مفاسد مذکورہ بالا کا قلع قمع کر کے عوام الناس کو غیر مقلدوں اور وہابیوں کے دام سے بچائیں۔ ہمارے مکرم و معظم اور غیرت مند فاضل قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی (جو ہمیشہ اسلامی خدمات کے لئے کمربستہ رہے ہیں) نے اس ضرورت کو بوجہ اتم پورا کر کے تمام اہل السنت والجماعت کو اپنا ممنون بنایا ہے۔ انہوں نے نہایت شرح اور بسط کے ساتھ مخالفین کے دعاوی باطلہ کا رد اور عقائد حقّہ کا اثبات پوری محنت اور عرق ریزی سے کیا ہے۔ اگرچہ متفرق طور پر بہت سے اصحاب نے ان مسائل پر قبل ازیں بحث کی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس قدر مسائل مجموعی طور پر شاید ہی کسی کتاب میں مندرج ہوں، غیر مقلدین اور وہابیوں کو چاہئے کہ انصاف سے پڑھیں اور حق کو قبول کریں اور شکریہ حضرت مؤلف کا بجالائیں۔

واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم

حررہ خاکسار

اصغر علی روحی

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔

انوار الصوفیہ[1]

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے اور اس کے نام سے اس کے مقاصد کا پتہ چل سکتا ہے۔ یہ رسالہ بسرپرستیٔ حضرت صوفی حافظ مولوی حاجی سید جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نقشبندی و جناب حافظ انور علی صاحب نقشبندی رہتکی پنشنر ڈسٹرکٹ جج شائع ہوتا ہے۔ ہمیں تین نمبر اس کے مل چکے ہیں۔ مضامین کی خوبی اور متانت بیان کے رو سے اس قابل ہے کہ عامۂ اہل اسلام اس سے مستفید ہوں۔ ہم امید ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحب دام مجدہم اور حافظ صاحب ممدوح کی پوری توجہ اس کی اشاعت کی طرف مبذول رہی تو بہت سی مذہبی بد اعتقادیوں کی اصلاح کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔

سوا دو روپے سالانہ قیمت پر دفتر انوار الصوفیہ واقعہ لوہاری منڈی لاہور میں درخواست پر جاری ہو سکتا ہے۔

---

۱ الہدیٰ ج ۲ ع ۱ ص ۴۱-۴۲

ریویو [1]

انوار القدسیہ ۔ یہ کتاب امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے علم تصوف میں تصنیف کی ہے ۔ کتاب نہایت ہی قابل قدر ہے بلکہ اہل سلوک کے لئے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے ۔ اس کتاب کو شیخ عبدالرحمٰن صاحب مالک کتب خانہ اسلامیہ امرتسر نے اردو زبان میں ترجمہ کرکے اردو خواں اصحاب پر ایک بھاری احسان کیا ہے اور عمدہ خوشخط چھپی ہے ۔ اور دس آنے قیمت پر لائق مترجم سے پتہ مذکورہ بالا سے مل سکتی ہے ۔ بدیں غرض کہ ناظرین اس کتاب کی خوبی کا خود اندازہ لگا سکیں ۔ ہم ذیل میں کسی قدر اسکا انتخاب شائع کرتے ہیں جو آداب عبدیت کے بیان کا ایک حصہ ہے ۔ [2] فقط

---

1. الہدیٰ : ج ۳ ع ۲ ص ۳۶ ــ ۳۷
2. اس تقریظ کے بعد کتاب کا انتخاب ص ۳۷ تا ۴۲ تک ہے ۔

ریویو

انیس الطالبین [1]

یہ کتاب حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ بہاء الحق والدین نقشبندؒ کے ارشادات و کرامات وغیرہ نکات تصوف پر مشتمل ہے جسکو خواجہ صالح بن مبارک بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب دیا تھا۔ یہ کتاب آج تک معرض طبع میں نہیں آئی تھی۔ انجمن انوار الصوفیہ لاہور کے اہتمام سے اسکا ایک نسخہ علاقۂ کشمیر سے بہم پہنچا کر ۱۸۰ صفحہ میں طبع کرایا گیا ہے۔ کتاب واقعی قابلِ دید ہے اور اہلِ سلسلہ کے لئے از بس مفید۔

قیمت عصر / ملنے کا پتہ: حافظ ظفر علی صاحب۔ ایڈیٹر انوار الصوفیہ لوہاری منڈی لاہور

[1] الهدیٰ ؛ ج ۲ ع ۱۱ ص ۴۱ - ۴۲

New China Stationers, Lahore

برق اسلام بر ترک اسلام [1]

منشی کریم بخش صاحب ایڈیٹر انوار الاسلام سیالکوٹ نے یہ کتاب ترک اسلام کے جواب میں لکھی ہے۔ میں نے مختلف مواقع سے اس کو پڑھا ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب دیگر کتب کی نسبت جو ترک اسلام کے جواب میں لکھی گئی ہیں زیادہ مضبوط و متین ہے کیونکہ اس میں تحقیق اور الزامی اور عقلی و نقلی جوابات سے کام لیا گیا ہے اور جا بجا آریہ مت کی خوب قلعی کھولی گئی ہے۔ بہر صورت اس کتاب کا مطالعہ کرنا ہر ایک مسلمان کو ضروری ہے باوجود ضخیم ہے بلحاظ ازاں قیمت یعنی صرف لعہ ر ہر مؤلف سے مل سکتی ہے۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۱ ع ۷ ص ۲

ریویو

بشارت محمدیہ [1]

اس کتاب میں حافظ مولوی محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت بنیت دیگر مذاہب کی معتبر کتابوں سے ظاہر کی ہے۔ بہت اچھی کتاب اور قابل دید ہے۔ البتہ مولوی صاحب نے مجوس کی کتب کا حوالہ نہیں دیا حالانکہ کتب مجوس میں صریح طور پر آنجناب کی نسبت پیشگوئی موجود ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہت عمدہ ہے۔ ۵۸ صفحہ حجم، قیمت کتاب اڑھائی آنہ ہے جو مؤلف کے پتہ پر درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔

1 الہدیٰ؛ ج ۱، ع ۸ ص ۱۱

البلاغۃ [١]

ہمارے دوست قاضی حبیب اللہ صاحب منشی فاضل تاجر کتب مصری بازار کشمیری لاہور نے کتاب "حدائق البلاغۃ" کا اردو خلاصہ امتحان منشی فاضل کے امیدواروں کے لئے شائع کیا ہے۔ باوجود اختصار کے کوئی ضروری مسئلہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے میں عمدہ کاغذ پر خوشخط شائع ہوا ہے۔
قیمت چند پیسے ہوگی۔ مذکورہ بالا تاجر پر مؤلف سے مل سکتا ہے۔

[١] الہدیٰ ! ج ۹ ع ۵ ص ۳۹

پندِ جامی[1]

مولانا مولوی عبدالرحمٰن جامی قدس سرہ السامی نے اپنی مشہور مثنوی یوسف و زلیخا کے اخیر پر اپنے فرزند ارجمند کے لیے چند قیمتی نصائح لکھے ہیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ مولانا چونکہ اہلِ تصوف سے وابستہ تھے اور نہ صرف صاحب قال بلکہ اعلیٰ درجے کے صاحب حال بھی تھے اسلئے انکے کلام میں ایک خاص روحانی ذوق مضمر ہے جس کو بجز اہل مذاق کے کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا اور کیوں نہ ہو وہ خود اپنی نسبت فرماتے ہیں ؎

چو دایہ نافہ من بے مشک دیدہ   بہ تیغ عاشقی نافم بریدہ

مذکورہ بالا منظوم نصائح کا ہمارے مکرم اور لائق دوست مولوی محی الدین صاحب بی۔ اے ممبر کونسل ریاست بہاولپور صانہا اللہ عن الشرور نے اسلامی مصنفین علم و تصوف و اخلاق کے اعلیٰ کارناموں کا نمونہ پیش کرنے کے لیے نہایت شستہ اردو میں ترجمہ شائع کیا ہے اور جابجا اہلِ تصوف کے مذاق کے مطابق عمدہ عمدہ نوٹ بھی دئیے ہیں۔ مولوی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسے بزرگ مصنفین کے کلام کا انتخاب مذکورہ بالا صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انگریزی اعلیٰ تعلیم یافتگانِ ملک میں سے ایسے لائق اور متشرع اصحاب کو دیکھ کر ہمیں یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ لوگوں میں جہاں چند ایک نیچریہ اور ملحدانہ خیالات کے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ انکے بالمقابل کئی ایک شیفتگانِ اسلام اور دلدادگانِ شریعت شارع علیہ السلام بھی موجود ہیں۔ گو یہ رسالہ کوئی اعلیٰ خدمت اسلام نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب نے ایک ایسا اثر کیا

[1] الھدیٰ؛ ج ۳ ع ۱ ص ۲۴

کام کیا ہے جسکی امید نہیں انکے بعض دیگر ہم جنسوں سے نہیں ہو سکتی ۔ رسالہ کی خوبی اسکے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے
ہاں یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ دیباچہ میں جہاں فاضل شارح نے مولوی رومی ۔ سعدی شیرازی ۔ خواجہ حافظ
مولوی نظامی ۔ مولوی جامی جیسے اخلاق و تصوف لکھنے والے مصنفین کا ذکر کیا ہے ۔ وہاں خواجہ فرید الدین عطار
اور حکیم سنائی ۔ غزنوی کے ناموں کو کیوں یاد نہیں کیا ؟ حالانکہ یہ ہر دو بزرگ بھی اس میدان میں مذکورہ بالا بزرگوں
سے ہرگز پیچھے نہیں رہے اور صفحہ ۳۱ پر تحصیل ہنر کے عنوان میں افتخار نسب کی مذمت کو ذرہ زیادہ وضاحت سے بیان
کرنا چاہیئے تھا ۔ اگرچہ الفاظ کی مناسب توجیہ ہو سکتی ہے مگر زیادہ اجمال کیا گیا ہے ۔ اس رسالہ کی چھپائی اور لکھائی
اعلیٰ قیمت صرف ۲/ ہے اور مولوی صاحب موصوف سے درخواست کرنے پر مل سکتا ہے ۔ طلباء سے نصف قیمت لی جائیگی

تاریخ سلاطین ہند [۱]

مسلمانوں کو علم تاریخ کے ساتھ ایک قدرتی تعلق ہے۔ ہر ایک زمانہ میں کوئی نہ کوئی عالی ہمت کسی نہ کسی پہلو میں قومی سلسلۂ تاریخ کو برابر جاری رکھتا رہا ہے اور غالباً اس کثیر العوائد و وسیع الفوائد فن میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ علم تاریخ مسلمانوں کے مذہب کا ایک معتد بہ جزو ہے جس کو علم اسماء الرجال بولتے ہیں مگر مسلمانوں نے اس فن کو صرف یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ سیاسی پہلو میں بھی اس کو اس قدر وسعت دی کہ آج سے پہلے تیرہ سو سال تک کے واقعات کو ہم مکمل طور پر منضبط و مدون پاتے ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے لکھنے میں یورپین مصنفین نے نہایت بے اعتدالیاں کی ہیں اس کی وجہ خواہ ان کی کم علمی ہو، خواہ تعصب قومی، مگر انہوں نے کج روی سے ضرور کام لیا ہے۔ ہمارے لائق اور معزز دوست مولوی کرم الٰہی صاحب صوفی ڈنگہ ضلع گجرات نے سرزمین پنجاب میں اس فن پر چند ایک قابل قدر تصانیف شائع کی ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے سلاطین ہند کی تاریخ کو نہایت عمدگی کے ساتھ لکھ کر شائع کیا ہے۔ جس میں بعض ایسے اہم اور ضروری امور مذہبی، سیاسی پر بحث کی گئی ہے۔ جو ہر ایک شخص کو مبسوط و نایاب کتب سے بآسانی دستیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے خیال میں علم تاریخ کی ایسی عمدہ کتاب جو موجودہ مذاق کے رو سے نہایت دلچسپ واقع ہوئی ہو کوئی نہیں لکھی گئی۔ اسکی تعریف ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتے کہ ہر ایک تعلیم یافتہ کو اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

تعداد صفحات ۳۷۲ قیمت عہ/ ۸ لکھائی چھپائی عمدہ [۲]

---

۱ الہدیٰ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۳۳

۲ اس سے آگے نمونہ کے طور پر ایک اقتباس دیا گیا ہے جو ص ۳۳ تا ۳۶ پر ہے

تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان [1]

مولوی نبی بخش صاحب حلوائی نقشبندی مجددی نے مذکورہ بالا رسالہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اصحاب سلسلہ کے لئے یہ رسالہ نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر آداب شیخ و مرید سے لوگ بے خبر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف نے ان کو مختلف کتابوں سے یکجا جمع کر دیا ہے۔ اصل میں یہ رسالہ تحفہ اہل فتوحات عربی کا ترجمہ ہے جو شیخ ابوبکر بنّانی رحمۃ اللہ کی تصنیف ہے۔

اخیر میں شجرہ نقشبندیہ منظوم بھی چسپاں کر دیا ہے۔ ۳۲ صفحہ کا رسالہ ہے۔ مؤلف موصوف سے بازار لنڈا لاہور کے پتہ پر درخواست کرنے سے مل سکتا ہے۔

1. الہدیٰ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۳۹

التسہیل فی حلّ انوار التنزیل [1]

مصنف

محمد عبد العزیز

(تقریظ جناب مستطاب علّامہ اصغر علی صاحب روحی (ایم۔ او۔ ایل) پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

میں نے تفسیر بیضاوی سورۂ آل عمران کے حل کو مختلف مواقع سے سنا۔ یہ حل طلباء کے لئے مفید ہے۔ بالخصوص اُن طلباء کے لئے جو امتحان مولوی فاضل میں شامل ہونا چاہتے ہوں۔ بیضاوی شریف کی عبارت کے مشکلات حل کرنے میں اس حل کا مطالعہ طلباء کے لئے نہ صرف مفید بلکہ از حد ضروری ہے ۔

---

[1] مطبوعہ لاہور سنۃ ۱۹۲۷ء/ ۱۳۴۶ھ

نوٹ تعزیرات ہند و نوٹ ضابطہ فوجداری[1]

صاحبان قانون پیشہ اور ملازمان عدالت اور امیدواران امتحان قانون و گرداور قانونگوئی و نائب تحصیلداری و تحصیلداری و اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری وغیرہ کے لئے مذکورہ بالا ہر دو کتابوں کا بغرض استحضار مضامین یا تیاری امتحان بروقت موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ تو وہ اختصار ہیں مگر مؤلف کی قابلیت کا پتہ صرف کتابوں کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی گئی۔ الغرض یہ ایک نیا کام ہے۔ جس کی ضرورت صرف وہی اصحاب محسوس کر سکتے ہیں جنہیں شب و روز قانونی دفعات اور ان کے احکام کے استعمال کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ان کے مؤلف سید نذیر علی صاحب وکیل صوبت گڈھ واقعہ ریاست بیکانیر ہیں جو قانونی اصحاب میں اور امیدواران امتحان قانونی کی طرف سے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہر ایک کتاب علیحدہ علیحدہ چھ آنہ قیمت پر مؤلف سے مذکورہ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

---

[1] الهدیٰ: ج ٣ ع ١ ص ٤٢

ریویو

تفسیر نبوی [1]

مولوی نبی بخش صاحب حلوائی نے پنجابی نظم میں اہلِ اسلام کے لئے اس کو حال ہی میں تألیف کیا ہے اور بہت سے ضروری مسائل کو نہایت آسان طریق پر بیان کیا ہے۔ پنجابی مسلمانوں کے لئے جو قرآن مجید کی تعلیم سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ اس تفسیر کو ضرور پڑھیں۔ مفصّل حالات مولوی صاحب سے خط و کتابت کرنے پر معلوم ہو سکتے ہیں۔

پتہ: مولوی نبی بخش صاحب حلوائی مؤلف تفسیر نبوی بیرون دہلی دروازہ ۔ لاہور

[1] الہدیٰ؛ ج ۱، ع ۶ ص ۱۰، و مطبوعہ مطبع کریمی لاہور

تمرینات النحو[1]

مصنفہ

مولوی غلام سرور

میں نے کتاب تمرینات النحو مؤلفہ جناب مولوی غلام سرور صاحب پرسنل اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن صوبہ سرحد کے متعدد حصص کا مطالعہ کیا۔ نحو کے مختلف مسائل ملک کے دیگر اہلِ علم نے بھی قبل ازیں شائع کیے ہیں مگر ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا مقولہ تو مشہور ہی تھا مگر مولوی صاحب موصوف نے تو اس کتاب کی تالیف میں اعجازی طاقت سے کام لیا ہے اور سچ پوچھو تو میری توقع سے بڑھ کر وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کی طرزِ تالیف سے ایک عالم نحو بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ بڑے بڑے مبسوطات و فتاوی علم نحو کی دشوار گزار گھاٹیوں کے طے کرنے سے متعلمین کو بچا لیا ہے۔ طرزِ بیان سلیس عام فہم اور نتیجہ خیز ہے۔

میرے خیال میں یہ کتاب کتاب ہے اور بس۔

اصغر علی روحی

[1] مطبوعہ سنہ (۱۴ر جولائی) ۱۹۳۶ء

رسالہ "توحید مقبول"[1]

مرتبہ

مولانا احمد علی

میں نے اس رسالہ کو بتمامہا سنا ۔ مجھے اس کے موضوع سے اتفاق ہے ۔ حقیقتِ توحید کے سمجھنے میں لوگوں نے بہت کچھ افراط و تفریط سے کام لیا ہے ۔ قرآن مجید نے جس صورت میں اس دقیق مسئلہ کو صاف کیا ہے اور وہ افراط و تفریط سے بکلیت پاک و صاف ہے ۔ صفاتِ ذات کا مسئلہ حقیقتِ توحید کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے اور بجز اسکے حقیقت توحید کا سمجھنا محال ہے ۔ حضرتِ مؤلف نے مسئلہ صفات پر نہایت سادہ اور قابلِ فہم طریق پر بحث کی ہے ۔ جس سے کسی صحیح العقیدہ کو اختلاف نہیں ہو سکتا ۔ ہاں اگر وہ مسئلہ توسل کو جو احادیث و آثار صحیحہ کی رُو سے ثابت ہے ۔ مسئلہ توحید کے ضمن میں صحیح طور پر واضح فرما دیتے تو بعض اصحاب کے لئے مظنہ سوء وہم نہ ہوتا

فقط ۔ والسلام

(حضرت مولانا مولوی) اصغر علی (صاحب) روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

1 مطبوعہ سنہ ۱۳۸۰ھ صـ۲۱

جدید صرف بہائی [1]

جناب مولوی الوحی صاحب چکوالی مالک و مہتمم مطبع نظامی لاہور امام مسجد صوفی بازار کشمیری نے حال ہی میں یہ کتاب نہایت اہتمام و تصحیح کے ساتھ چھاپ کر شائع کی ہے۔ اس سے پہلے جس قدر نسخے اس کتاب کے مختلف مطابع میں چھپے تھے وہ اغلاط اور اسقام و بدخطی وغیرہ قباحتوں سے خالی نہیں تھے۔ اور نوآموز طلبا کو سخت دقت اٹھانا پڑتی تھی۔ ہم فاضل مولوی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے عربی خواں طلباء کے لئے خاص محنت اور جانفشانی سے اس دُرِ بے بہا کو از سر نو آب و تاب بخشی ہے۔ مولوی صاحب ممدوح نے حواشی مفیدہ اور آسانی کا اضافہ کر کے کتاب مذکور کی اور بھی رونق بڑھا دی ہے۔ عربی آموز طلباء کے لئے ایسی کتاب کا مطبوع ہونا ان کی خوش قسمتی ہے۔ قیمت لعہ پتہ مذکورہ بالا پر مصنف سے مل سکتی ہے۔

[1] الہدیٰ ؛ ج ۵ ع ۳ ص ۳۵ ـ ۳۶

جلوۂ حق[1]

یہ ایک بیس صفحہ کا نہایت دلچسپ اور معنیٰ خیز رسالہ میرزا قادیانی کے متعلق اردو نظم میں منشی غلام دستگیر صاحب قریشی ملازم سررشتہ تعلیم پنجاب نے لکھا ہے۔ چھپکر تیار ہے ۱/ کے ٹکٹ آنے پر ارسال خدمت ہوگا۔ مینجر الہدیٰ[1] حویلی کابل مل لاہور۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۲، ع ۲، ص ۱۲

حکمت [1]

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو حکیم فیروز الدین صاحب خلف حکیم الٰہ دین صاحب مرحوم - دروازہ موچی، کوچہ لوہاراں کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے - رسالہ کا مقصد علم طب یونانی کو فروغ اور رواج دینا ہے - کچھ شک نہیں کہ یونانی طب گنجینۂ اسرار ہے - مگر افسوس کہ نااہلِ زمانہ کے انقلاب کی وجہ سے تختۂ مشق ادبار ہے - کہیں کہیں کوئی صاحب اس کی قانون پرستی کر رہے ہیں اور ہر طرح اس کی حمایت پر کمربستہ ہیں - حکیم صاحب موصوف بھی منجملہ انہیں حضرات کے ہیں - رسالہ کی نوعیت دیکھنے پر موقوف ہے - مگر اس کے دو نمبروں کے مطالعہ سے ہمیں یہ یقین ہو گیا ہے کہ علم طب کے قدر دان اگر اس کو مطالعہ فرماویں تو ان کو ایک بے بہا معلومات کا ذخیرہ سمجھ کر دل و جان سے اس کی قدر کریں - ملک کے بڑے بڑے حُذّاق اپنی تحقیقات اور تجربات سے اس رسالہ کی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں - گویا طب یونانی کو ازسرِ نو زندہ کر رہے ہیں - ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ رسالہ اہلِ ملک کی قدر دانی کی وجہ سے جاری رہا تو بہت کچھ کرنے والا نظر آتا ہے - ہمیں تعجب ہے کہ باوجود اس قدر ضخامت کے کہ ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع ہوتا ہے - اسکی قیمت محض بنظرِ افادہ عام صرف عہ سالانہ معہ محصول ڈاک ہے - ہم اس رسالہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہلِ ملک سے اس کی قدردانی کی سفارش کرتے ہیں - عنوانِ بالا پتہ پر درخواست کرنے سے جاری ہو سکتا ہے -

[1] الہدیٰ؛ ج ۵ ع ۳ ص ۳۶

چہل حدیث [1]

جس کا عربی ترجمہ اربعین ہے۔ اکثر علمائے مذہب نے لکھی ہیں۔ مولوی صاحب ممدوح نے ایک ایسی اربعین شائع کی ہے۔ جس کا ترجمہ منظوم نہایت عمدہ اردو زبان میں ایک لائق مولوی صاحب نے کیا ہے۔ اس اربعین کی تمام احادیث بروایت ثقات ائمہ اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مروی ہیں۔ اسلئے اس کی یہ خوبی تمام دیگر اربعین سے اس کو ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ بچوں کو اس کتاب کا پڑھانا موجب ثواب عظیم ہے۔ تعلیم یافتہ مستورات کے لئے بھی یہ کتاب نعمت مترقبہ ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ اہل ایمان اس کو ضرور منگائیں۔ خوشخط اور واضح چھپی ہے۔ قیمت ۲ر مولوی ابو محمد احمد چکوالی امام مسجد صوفی کشمیری بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

[1] الہدیٰ ؛ ج ۵ ع ۳ ص ۳۶

"خزینۃ المیراث"[1]

مصنفہ

مولوی محمد فتح الدین ادیب

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین اما بعد خاکسار نے رسالۃ خزینۃ المیراث مؤلفہ مولوی فتح دین خوشابی کا مطالعہ کیا جس قدر علم فرائض کے متعلق مختلف رسائل میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں سے یہ رسالہ اپنی نوعیت میں بالکل نرالا ہے۔ فاضل مؤلف نے مختلف جدول میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے ایسی صورتیں مندرج کردی ہیں جو عام طور پر ممکن الوقوع ہو سکتی ہیں کسی صورت مسئلہ کا تلاش کرنا بالکل آسان کردیا ہے جس شخص کو علم فرائض کے ساتھ کچھ بھی مناسبت ہو وہ بھی اس رسالہ سے پوری طرح مستفیض ہو سکتا ہے میرے خیال میں یہ رسالہ ہر طبقہ کے تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے از بس ضروری ہے۔ قانون پیشہ اصحاب کو بھی حضرت مؤلف کا ممنون احسان ہونا چاہیئے، کیونکہ انہوں نے ایک آسانی کی صورت پیدا کردی ہے۔

(خاکسار اصغر علی روحی عفا اللہ عنہ)

[1] مطبوعۃ سنہ ١٣٦٨ھ/١٩٤٩ء، ص ١٨

خطبات الاسلام للجمعۃ و الایام العظام [1]

اس رسالہ کا موضوع اس کے نام ہی سے ظاہر ہے ۔ جمعہ اور عیدین میں اکثر ناخواندہ پیشی امام خطبات غیر مسنون پڑھا کرتے ہیں ۔ حالانکہ سلف صالحین سنت مطہرہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف کبھی خطبہ نہیں کیا کرتے تھے ۔ مسنون خطبہ میں قرآن و احادیث اور مواعظ ہوا کرتے تھے ۔ مگر آج کل اکثر خطبہ مواعظ کا ہندی زبان میں تو ہوتا ہے مگر قرآن و حدیث بہت کم خطبہ چونکہ جزو عبادت ہے ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ طریق مسنون سے باہر قدم نہ رکھا جائے ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اثنائے خطبہ میں وعظ غیر عربی زبان میں کیا جائے یا نہ ، خاکسار اس کا مخالف نہیں ، مگر خطبہ عربیہ طریق مسنون سے علیحدہ نہیں ہونا چاہئے ۔ پابندی سنت کی جس قدر تاکید اکید وارد ہوئی ہے اسی قدر عوام الناس نے اس کی طرف سے غفلت اختیار کر لی ہے ۔ خطبات کے الفاظ ماثورہ میں جو حقیقت توحید و وعظ جلوہ گر ہوتی ہے ۔ وہ کسی صورت میں دوسرے موضوع الفاظ میں نہیں ہو سکتی لہٰذا مسلمانوں میں عام طور پر خطبات مسنونہ کا رواج دینا سنت مطہرہ کو زندہ کرنا ہے ۔ جس کی نسبت حدیث مَن احیا سنتی .... الخ ۔

اجر آخرت کا وعدہ دلاتی ہے ۔ گزشتہ ایام میں بمبئی سے مطبوعہ خطبات عربیہ میری نظر سے گزرے تھے ۔ جن میں موجودہ زمانہ کی روش کو مدنظر مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب پر بحث کی گئی تھی ۔ ہر چند کہ خطبات مذکورہ عمدگی زبان کی رو سے دلچسپ تھے مگر حق یہ ہے کہ ان میں ایک ایسی قدرتی ملبوست و بہودت بھر رکھی تھی کہ میری نظر میں ان کی کچھ وقعت نہ ہوئی اور میں نے خیال کیا کہ کسی بے درد یورپی کی تحریک پر یہ خطبات تالیف کئے گئے ہیں ۔ بھلا کہاں کلام الٰہی اور مواعظ نبویہ جو سراسر انوار توحید و

---

[1] الہدیٰ ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۳۶ - ۳۸

اسرار و معارف اور خشیت و رحمت پر مشتمل ہیں اور کہاں دنیا جمع آوری کے بے مغز تدابیر اور مادہ پرستی کے لوازم یعنی افکار تقدیر ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

قوم کے سر برآوردہ اور سنت مطہرہ نبویہ کے دلدادہ جناب حاجی محمد یونس خاں صاحب رئیس دتاولی (علیگڑھ) نے ایک سلسلہ خطبات مسنونہ کی تالیف کا شروع کیا ہے ۔ جس کا پہلا نمبر خاکسار کو موصول ہوا ہے ۔ یہ رسالہ ۳۲ صفحہ کا ہے اس میں تمہید کے بعد چند خطبات قلمبند کئے ہیں جن کے ضمن میں جمعہ کے فضائل و ضروری احکام اور عمدہ عمدہ مواعظ کو بطور تشریح کے منضبط کیا ہے اور آئندہ اس سلسلہ میں اسی روش پر دیگر خطبات کو بھی ترتیب دینے کا وعدہ فرماتے ہیں ۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا اہم سلسلہ ہے جس کی تکمیل کے لئے ہر ایک مسلمان کو اخلاص سے دعا کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ رؤساء کی جماعت میں جب پابندی سنت کا خیال پیدا ہو تو اس کو فال نیک سمجھنا چاہیئے ۔ بالخصوص ہمارے موجودہ ہنر زور اور سرکشی زمانہ میں جبکہ سنت نبویہ کی طرف سے سخت غفلت کی جا رہی ہے اور کسی شخص کو دینی خدمت کا شوق دامن گیر نہیں ۔

رسالہ کی لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کے ہیں ۔ قیمت ......

ریویو

خوارق البوارق [1]

یہ فارسی زبان کا ایک رسالہ ہے جو ہمارے فاضل دوست مولوی سید علی صاحب حائری اثناعشری لاہوری نے اثبات اعجاز قرآن میں لکھا ہے۔ اس رسالہ کا طرز تصنیف عالمانہ ہے۔ جس میں دلائل عقل و نقل سے بخوبی ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید ہر ایک پہلو سے معجزہ ہے جو اس کے منجانب اللہ ہونے کا پورا ثبوت ہے۔ فاضل مصنف نے اخیر رسالہ پر جملہ حسبنا کتاب اللہ کو اپنے اصول مذہب کے مطابق بخوبی واضح کیا ہے۔ الغرض رسالہ قابل دید ہے۔ مصنف علام سے مل سکتا ہے۔

فقط

1 الہدیٰ؛ ج ۱ ع ۷ ص ۳۹-۴۰

ریویو

دانائی کا سبق ‧ نالۂ صدر

یہ ہر دو رسالہ جناب میر صدر الدین حسین خان صاحب رئیس بڑودہ کی تالیفات سے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا رسالہ نثر ہے جس میں نہایت قیمتی اخلاقی اور معاشرتی مضامین سلیس اردو میں قلمبند کئے ہیں اور دوسرا منظوم ہے جس میں اخلاقی اور مذہبی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ہر دو رسالہ قابلِ قدر ہیں اور نوجوان طلباء کے لئے بالخصوص مفید ہیں۔ فی الحقیقت ایسے ہی مضامین سے قوم کی مذہبی اور اخلاقی حالت کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ چند پیسوں میں مصنف ممدوح سے مل سکتے ہیں۔

فقط

ایڈیٹر

1 الہدیٰ ج۱ع۲ ص۴۲

ریویو [1]

"دیوان طرزی"

فارسی شاعری ہندوستان سے دیر ہوئی کہ رخصت ہو چکی ہے مگر جن طبائع میں خدا نے فطری مادہ شاعری کا ودیعت رکھا ہے وہ شاعری کو ذریعہ حصول معاش نہیں سمجھا کرتیں۔ حال ہی میں سید محمد قطب الدین والد ولی علی صاحب متخلص بہ طرزی سابق فوجدار ریاست الور نے اپنا فارسی کلام موسوم بہ دیوان طرزی شائع کیا ہے جس کے مطالعہ سے وہ اشخاص جنہیں فارسی زبان میں کامل دستگاہ حاصل ہے وہی لطف حاصل کر سکتے ہیں جو اساتذہ سلف کے کلام سے۔ ایسے گئے گزرے زمانہ میں ایسے شخص کا وجود واقعی منجملہ نوادر روزگار سمجھنا چاہیے۔ متانت کلام۔ لطافت تشبیہ و استعارات۔ دلنشینیٔ معانی۔ سادگیٔ الفاظ میں یہ دیوان ہرگز کسی ایرانی استاد سخن کے مقابلہ کرنے سے کم نہیں اور بعض حصص تو بالخصوص فصاحت و بلاغت کا گنجینہ ہیں اور اسرار و معارف کا خزینہ۔ توحید و نعت کو اکثر مقامات میں کما حقہ ادا کیا ہے جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ قریباً دو سو صفحہ حجم کا کتاب ہے جو مختصر قیمت پر حضرت مؤلف سے ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

---

[1] الھدیٰ ج ۲ ع ۶ ص ۴۲

تقریظ

"الذکر الحکیم" [1]

ڈاکٹر عبدالحکیم خان صاحب۔ ایم۔ بی۔ اسسٹنٹ سرجن فرسٹ گریڈ ریاست پٹیالہ نے مرزا قادیانی کے مقابلہ میں **الذکر الحکیم** کے نام سے ایک رسالہ نمبر ۶ شائع کیا ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے نہایت صحت کے ساتھ مرزا قادیانی کی عیاریوں کا تار و پود کھول کر دکھایا ہے۔ چونکہ واقعات مندرجہ بربنائے عینی شہادت کے قلمبند ہوئے ہیں۔ اس لئے ان میں عدم صحت کا گمان نہیں چل سکتا۔ یہ رسالہ بالخصوص اُن کم استعداد لوگوں کے لئے جو اس شخص کے دعاوی پر پھسل جایا کرتے ہیں اور اس کے مریدوں کو جواب دینے پر معذور ہو جاتے ہیں۔ ایک نہایت مفید آلہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مرزا کے مرید یا تو سرے سے پڑھنے کی تکلیف ہی نہ اٹھائیں گے۔ یا پڑھ کر دیوار پر دے ماریں گے اور دو چار صلواتیں سنا دیں گے۔ جواب لوگوں کا شیوۂ قدیم ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہی امر اس رسالہ کی صداقت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے کہ اس کے جواب کی امید نہ رکھیں۔ قل موتوا بغیظکم پر عمل کریں۔ مرزا اور مرزائیوں نے آج تک نہ تو کسی کا جواب دیا ہے نہ دے سکتے ہیں۔ مگر یقین سمجھ لیں کہ ایسے رسالہ کا اثر عام طبائع پر نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ رسالہ مذکور بقیمت چار آنے علاوہ محصول ڈاک مینجر صاحب مطبع عزیزی تراوڑی ضلع کرنال سے مل سکتا ہے۔

[1] الہدیٰ: ج ۵ ع ۲ ص ۵

رسوم جاہلیت [1]

اس نام کی ایک کتاب جو شستہ اردو زبان میں پہلی مثال ہے۔ ہمارے فاضل دوست مولوی نجم الدین صاحب سیوہاری نے حال میں شائع کی ہے۔ کتاب مذکور بلحاظ اپنے موضوع کے موجودہ زمانہ کی تحقیقات میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید کی اکثر آیات اور احکام کا تفصیلی علم قدیم اہل عرب کے رسوم و رواج اور ان کے مختلف مذاہب کی واقفیت کے بغیر بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ فاضل مترجم نے اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ زمانۂ جاہلیت کے رسوم و رواج اور دیگر ضروری اور کارآمد مضامین کو عربی زبان کی مختلف کتابوں سے منتخب کر کے ایک ایسا نادر مجموعہ تیار کیا ہے جس کے مطالعہ سے اسلامی شرائع و دیانات کے اکثر مسائل کی اصلیت مفصل طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس موضوع میں مدین جامعیت اردو زبان میں پہلے کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی اور واقعی اسکی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جسے کو مولوی صاحب موصوف نے پورا کر دکھایا ہے۔ ہم نہایت زور کے ساتھ ان اصحاب کی خدمت میں سفارش کرتے ہیں۔ جنہیں مذہبی تحقیقات کے ساتھ خاص دلچسپی ہے۔ کتاب فی حد ذاتہ خود اپنی تعریف اور توصیف کے لئے کافی دوافی ہے۔ ایک سو ستر (۱۷۰) صفحے میں خوشخط عمدہ کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت عہ/ ۔ حضرت مؤلف سے مطبع رفاہ عام لاہور کے پتے پر مل سکتی ہے۔ ہم کتاب مذکور کا کچھ حصہ بطور نمونہ کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ بطور مشتے نمونہ خروارے خود اندازہ لگالیں گے۔ [2]

---

[1] الهدیٰ؛ ج ۱ ع ۱ ص ۲۹-۳۰

[2] اس تقریظ کے بعد کتاب مذکور کا کچھ حصہ بطور نمونہ دیا گیا ہے جو ص ۳۰ تا ۳۷ تک ہے۔

ایضاً [1]

ریاض الاخبار نام ایک اخبار عربی و اردو ریاست بھوپال سے باہتمام حاجی ریاض الدین احمد صاحب دو بار مہینے میں شائع ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں عربی کا ترجمہ اردو بھی دوسرے کالم میں رکھا گیا ہے۔ جس سے عربی کی استعداد بڑھانے والوں کو خاصہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ دوسرے حصے میں خالص اردو مضامین مختلف ہوتے ہیں مگر عمدہ۔ نئی بول چال عربی کے لئے بھی اسی میں اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت سالانہ سے ؍

---

1. الہدیٰ؛ ج ۱ ع ۳ ص

الزهر الجني من رياض الميمني [1]

مرتبه

مولانا عبد العزيز الميمني الراجكوتي

(صورة ما كتبه الفاضل المولى اصغر علی الروحی پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاہور)

میں نے اس ترجمہ کے مختلف مقامات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی خوبی کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مکرم و فاضل دوست مولوی عبد العزیز صاحب میمن، پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور کے نام نامی سے علمی دنیا پہلے ہی سے باخبر ہے۔ ان کی ادبی قابلیت پر ان کے ابنائے جنس جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ اگرچہ علم پروری و مردم شناسی کے آثار قریباً مٹ چکے ہیں، مگر با ایں ہمہ اہل علم کی نظروں میں ایسے قابل اصحاب اعلیٰ عزت و تعریف کے مستحق ہیں۔ میں ان کی اس تحقیق کی داد دیتا ہوں اور ان کی کوشش بلیغ کا ممنون ہوں۔

فقط

خاکسار

اصغر علی روحی عفا اللہ عنہ

[1] مطبوعہ سنہ (شوال ۱۳۴۲ھ / اوائل جون) ۱۹۲۴ء ص ۲۱۴

ستۂ ضروریہ [1]

اس کتاب کے نام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی علم طب کی کتاب ہوگی مگر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مذہبی کتاب ہے جو حسب ذیل چھ رسالوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ تہذیب الاسلام فی جواب تبصرۃ الانام۔

۲۔ الفوز المبین بالاخفاء بالتامین یعنی مسئلہ امین بالجہر و بالاخفاء کی تحقیق۔

۳۔ عیون القریرۃ فی وضع الیدین تحت السرۃ یعنی نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنے کا مسئلہ۔

۴۔ تحفۃ الاخوان فی صلوٰۃ رمضان جس میں رکعات تراویح کی تحقیق کی ہے۔

۵۔ احسن الذکر فی مسئلۃ الوتر یعنی نماز وتر کی تحقیق۔

۶۔ تنبیہ اہل العصر فی اداء رکعتی الفجر یعنی سنۃ الفجر کی تحقیق۔

ان رسائل مذکورہ بالا پر اصول علم حدیث کے رو سے کافی بحث کی گئی ہے اور موافق و مخالف احادیث کو زیر بحث لا کر مذہب حنفی کو ثابت کیا گیا ہے اور مخالفین کے تسلی بخش جواب دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ان مسائل میں زیادہ غور و خوض کیا جائے مگر چونکہ اصحاب کو ایسے اختلافی مسائل سے طبعاً دلچسپی ہوتی ہے اور بسا اوقات مخالف کے برخلاف کسی مضبوط دلیل کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ مقلدین اور غیر مقلدین ہر دو گروہ کے اصحاب بغرض مزید تحقیق اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ مؤلف نے اپنا پورا زور لگایا ہے اور اپنی وسعت نظر اور جودت طبع کا ثبوت دیا ہے۔

کتاب مذکور کے مؤلف مولوی محمد حسن صاحب فیضی پوری ہیں جو فن جرح و تعدیل میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ کتاب کی خوبی اسکے مطالعہ سے معلوم ہوگی۔ قیمت عصہ۔ حجم ۲۳۰ صفحہ عربی معہ ترجمہ اردو۔ ملنے کا پتہ سید عبدالرحمن ہزاروی مقیم امام بازار سربازار مسجد میاں اخوند۔

---

[1] الہدیٰ: ج ۳ ع ۸ ص ۴

ریویو [۱]

حافظ عبدالرحمٰن صاحب سیاح امرتسری نے جن کی بعض کتب پر گزشتہ نمبر میں ریویو شائع ہو چکا ہے حال ہی میں بلادِ اسلامیہ کے دو سالہ سفر کی مفصل کیفیت کو قلمبند کر کے بنام سفرنامہ شائع کیا ہے۔ اس سفرنامہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ قریباً قریباً ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ جمیع صیغوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ مگر نہ تو ایسی تفصیل ہے جو موجب ملالِ طبع ہوا کرتی ہے اور نہ ایسی اجمال جس سے کچھ استفادہ نہ ہو سکے۔ اس سفرنامہ میں جس کو معلومات کا تازہ ذخیرہ کہنا زیبا ہے۔ مجھ کو بعض ایسی نئی باتیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جن سے باآنکہ مجھ کو عربی اخبارات کے مطالعہ کا شغل رہتا ہے۔ مجھ کو مطلقاً آگہی نہ تھی۔ یہ سفرنامہ ان لوگوں کے لئے حرزِ جان ہونا چاہیے جو بلادِ اسلامیہ کا سفر کرنا چاہتے ہیں یا وہاں کے متبرک قدیم مقامات اور موجودہ طریق انتظام سلطنت کے متعلق یا اپنی قوم کی حالت ترقی و تنزل کا مقابلہ دیگر اقوام کے ساتھ کرنے کے لئے معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ میرے خیال میں اس سے پہلے بلادِ اسلامیہ کے حالات اس جامعیت سے کسی صاحب نے قلمبند نہیں کئے۔ حافظ صاحب کا بہر حال قوم کو ممنون ہونا چاہیے جو ہمیشہ سلسلۂ تصنیف میں کچھ نہ کچھ عمدہ اضافہ کر دکھاتے ہیں۔ کاش ہمارے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب بھی تصنیف و تالیف میں کچھ حصہ لیں۔

یہ سفرنامہ ۲۴۰ صفحہ پر دو قسم کے کاغذ پر چھپا ہے۔ قیمت عہ/ و عمہ/ حافظ صاحب سے کشمیری بازار لاہور کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

۱ الہدیٰ: ج ۲ ش ۳ ص ۴۵

شرح آئینۂ عجم [1]

مصنفہ

مولوی محمد چراغ جلالپوری

(تقریظ از جناب فضیلت مآب مولوی اصغر علی صاحب روحی ایم ۔ او ۔ ایل پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

میں نے اس شرحِ کورس فارسی مدخل نصاب انٹرینس کے بعض مقامات کا مطالعہ کیا ۔ میرے خیال میں مولوی محمد چراغ صاحب جلالپوری نے شرح نویسی کا حق ادا کر دیا ہے ۔ تشریح الفاظ اور ترجمۂ بامحاورہ ایسے طریقے پر لکھے گئے ہیں جو امیدوارانِ امتحان کے لئے استادِ کامل کا کام دیتے ہیں ۔ اگرچہ پہلے بھی بعض اصحاب نے اس کورس کے نوٹس شائع کئے ہیں مگر بعض وجوہ سے جن سے صاحبانِ نظر مطالعہ کر کے آگاہ ہو سکتے ہیں ۔ یہ شرح ایک مہتم بالشان خصوصیت رکھتی ہے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حضراتِ اساتذہ کے لئے بھی یہ شرح مفید ثابت ہوگی ۔

دستخط
(مولانا) اصغر علی روحی

[1] مطبوعہ سنہ ۱۹۲۷ء ۔ کتاب کے آغاز میں چند تقاریظ ہیں جن میں دوسری تقریظ مولانا روحی کی ہے ۔

ریویو

شرف المحترفین

یہ رسالہ اردو زبان میں جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب صوفی کرنالی نے شائع کیا ہے۔ قوم کے سربرآوردہ اور معاملہ فہم اصحاب نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جب تک صنعت و حرفت و تجارت کی طرف رجوع نہ کریں ان کی مالی کمزوری کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ پچھلے چند سال سے اس امر پر بالخصوص زور دیا جا رہا ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس کا بہترین نتیجہ بہت جلد ظہور پذیر ہونے لگے۔ مولوی صاحب ممدوح نے جن کے علم و فضل کی وقعت مسلم ہو چکی ہے۔ صنعت و حرفت کی ضرورت کو مذہبی طور پر نہایت بسیط بحث میں ثابت کیا ہے اور دلائل بینہ سے دکھلا دیا ہے کہ بزرگانِ دین یعنی انبیاء ؑ اور ائمہ و اولیاء رضی سب کے سب کسی نہ کسی جائز پیشہ سے روزی طیب کماتے اور دوسروں پر ایثار کرتے تھے اور مسلمانوں کی نکبت و زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے محنت سے کما کر کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اصول تمدن پر ایسی ضرورتوں کو تو عام اصحاب ثابت کیا کرتے ہیں۔ مگر کتاب اللہ اور سنت صحیحہ اور آثار سے اس مدعا کا اثبات صرف مولوی صاحب یا اُن جیسے کسی اور فاضل کا حصہ تھا جو بحمد اللہ پورا ہو گیا میرے خیال میں یہ کتاب ہر مسلمان کے مطالعہ میں آنی چاہیے کیونکہ یہ ایک مختلف مفید مسائل پر مشتمل ہے۔ خداوند کریم مولوی صاحب کو جزائے خیر دے جنہوں نے گروہ علمائے باعمل میں ایک نیا امتیاز حاصل کیا ہے۔ قیمت رسالہ ۱۰ر

ملنے کا پتہ۔ مولوی صاحب ممدوح محلہ اراٹیاں۔ شہر کرنال۔

---

۱ الھدیٰ؛ ج ۲ ع ۱۳ ص ۱۴

رسالہ صابون سازی [1]

نو تعلیم یافتگان ملک کا صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہونا مدبران ملک نے تسلیم کر لیا ہے کیونکہ محض ملازمت پیشہ ہونا ملکی یا قومی ترقی کا کافی معیار نہیں۔ منشی قائم الدین صاحب شرقپوری نے اس رسالہ کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں شائع کیا ہے۔ رسالہ کا موضوع اس کے نام سے کھل جاتا ہے۔ مترجم نے نہایت عمدہ سلیس اردو زبان میں صابون سازی کے تمام اصول پر بحث کی ہے۔ منشی قائم الدین کابل میں ایک عرصہ تک ترجمانی کا کام کرتے رہے ہیں اور اس لئے وہ فن ترجمہ کے ماہر ہیں۔ رسالہ مذکور دس آنہ قیمت پر مولوی علی محمد صاحب تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے ::

[1] الھدیٰ؛ ج ۲ ع ۱ ص ۱۲

صحیفۂ ادب [1]

مصنفہ

شیخ عبدالرحمٰن طارق

(از حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

" میں نے صحیفۂ ادب مؤلفہ منشی عبدالرحمٰن صاحب کا مطالعہ کیا۔ اس میں شعر کی تحقیق ایک نئے پیرایہ میں قلمبند کی گئی ہے، جس کا ہمیں فراخ حوصلگی کے ساتھ خیر مقدم بجا لانا ضروری ہے۔ لائق مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے، اردو زبان کے دلدادگان کے لئے زبان اردو میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب اس قابل ہے، کہ پنجاب یونیورسٹی کے صیغہ امتحانات اردو میں اس کو بطور نصاب لیا جاوے۔ "

---

[1] مطبوعہ سنہ ۱۹۳۵ء ص ابتدائی صفحات میں آخری تقریظ

رسالہ الصنعت [۱]

یہ ماہوار رسالہ انجمن موئد الصنعت لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے جس کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ صنعت و حرفت کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس رسالہ نے اپنی عمدگی مضامین اور کاغذ و چھپائی کی صفائی سے ہمیں امید دلا دی ہے کہ اسلامی پبلک میں ایک معزز پرچہ ثابت ہو گا۔ مضامین مختلف اصحاب قلم کے اذہان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف دو روپے (عہ) مینیجر سے درخواست کرنے پر مل سکتا ہے۔

۱ الہدیٰ؛ ج ۷ ع ۱۱ ص ۳۹

عذب المناهل لعطاش الکامل [1]

مصنفہ

محمد نور الحق علوی

(صورۃ ما جہرہ الشیخ الناطق بالصدق و الصواب و المؤئل الیہ فی کل فن بلا ارتیاب ۔ قدوۃ الاکابر الاعلام و عمدۃ الافاضل الکرام النقی التقی مولانا الشیخ اصغر علی روحی استاذ الآداب العربیۃ بالکلیۃ الاسلامیۃ بلاھور)

مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم سہارنپوری کا زمانہ تدریس اورینٹل کالج لاہور کی علمی تحقیقات کے لئے کمال عروج کا زمانہ تھا چنانچہ مولانا کی ادبی قابلیت مشتاقان علم ادب کو حدود وسط ایشیاء و بنگال سے کھینچ کر لایا کرتی اور وہ آپ کی بے نظیر علمی تحقیق کے جواہر و زواہر سے بہرہ اندوز ہوا کرتے ۔ آپ کی متعدد تالیفات آپ کی زندگی ہی میں طبع ہو کر شائع ہو چکی تھیں اور چند ایک مسودات غیر مطبوع حالت میں پڑے رہے ۔ معلوم نہیں کہ ان کا کیا حشر ہوا ۔ فالی اللہ المشتکی ۔

الغرض یہ مسلم ہے کہ اورینٹل کالج لاہور کو پھر وہ زمانہ نصیب نہیں ہوا مگر سرزمین ہندوستان میں آج وہ اصحاب جو عربی علم و ادب سے کم و بیش مذاق رکھتے ہیں ، سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ مولانا ممدوح کے خوان نوال کے ریزہ چین ہیں ۔

زمانہ کے ہیر پھیر کے بعد یوں کہیے کہ " باسی کڑہی میں ابال آیا " عربی علم ادب کے متعلق پھر ایک کتاب مسمی بہ عذب المناهل شائع ہوئی ہے ۔ یہ مشہور کتاب ادیب لبیب ابوالعباس مبرد کی کتاب الکامل کی عربی شرح اور اردو

---

[1] مطبوعہ سنہ ۱۳۲۷ھ ص ۲۰۷ - ۲۰۸

ترجمہ پر مشتمل ہے۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ کامل مبرّد اس کا زمانہ بلحاظ علم ادب میں رکن رابع ہے اور اس میں ادبی تحقیقات کے وہ خزائن نفیسہ مضمر ہیں جن کا کسی دوسری کتاب میں دستیاب ہونا محال ہے۔

ہمارے کرم اور فاضل دوست مولوی محمد نور الحق صاحب پروفیسر کالج مذکور نے طلبہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے تمام مقامات مشکلہ اور مسائل مغلقہ کی ایسی جامع شرح لکھ دی ہے جس کی خوبی کا اندازہ بجز کسی ادیب ماہر کے کوئی دوسرا شخص نہیں لگا سکتا۔

الحمد للہ کہ حضرت مؤلف کو کتاب مذکور کے حل کرنے میں اگرچہ بہت جانکاہی اور عرق ریزی سے کام لینا پڑا مگر پنجاب یونیورسٹی کے عظیم الشان کتب خانہ نے انہیں کتب متعلقہ کا کافی سرمایہ بہم پہنچایا۔ اور بڑی خوشی کا مقام ہے کہ وہ اس میں پورے طور پر کامیاب ہوئے۔ جس پر خاکسار انہیں ھدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے۔

اور آخر میں حضرت مؤلف سے مستدعی ہوں کہ وہ باقی حصہ کی شرح کا کام بھی پورا کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ شرح کامل ناقص رہ جائے۔

(اصغر علی روحی)

اس مندرجہ بالا تقریظ کے بعد ایک مدحیہ قصیدہ بھی طبع ہوا ہے جس کا ذکر عربی دیوان کی ترتیب کے سلسلے میں صفحہ ۳۸۳ – ۳۸۴ پر کر دیا گیا ہے۔

ریویو [1]

حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری سیاح مصر و قسطنطنیہ جن کے نام نامی سے مسلمانان ہندوستان ناواقف نہیں۔ بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے بعد آج کل دارالخلافہ لاہور میں علمی تحقیقات کی جو انہوں نے مدت سیاحت میں حاصل کی، اشاعت کر رہے ہیں۔ حافظ صاحب سفر مصر سے پہلے صرف و نحو عربی کے متعلق دو رسالے شائع کر کے طلباء عربی کو مستفید کر چکے ہیں۔ چونکہ انہیں عربی زبان سے بہت دلچسپی ہے اسلئے ان کی بیشتر تالیفات عربی علم ادب کی تحقیق پر مشتمل ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے 'عربی بول چال' کے متعلق دو رسالے شائع کئے ہیں جو ابتدائی طلباء اور نئے عربی زبان سے واقفیت پیدا کرنے والوں کو استاد کامل کا کام دیتے ہیں۔ ان رسالوں میں نہایت ہی عمدگی سے مفید فقرات کا انتخاب اور بالمقابل ان کا ترجمہ دیا گیا ہے جس سے طالب علم بہت جلد ترجمہ کرنے میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ حصہ اول کے اخیر میں ان الفاظ کی فہرست دی گئی ہے جو عربی زبان میں اس صدی کے اندر اضافہ ہوئے ہیں۔ یہ رسالے نہایت صحت کے ساتھ چھپکر تیار ہو گئے ہیں اور اول ۸ دوم ۸ آنہ قیمت پر حافظ صاحب ممدوح سے کشمیری بازار لاہور کے پتہ پر مل سکتے ہیں۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۲ ع ۳ ص ۱۱

عربی بول چال[۱] (حصہ دوم)

جناب حافظ عبدالرحمن صاحب سیاح بلاد اسلامیہ نے بترمیم جدید اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا ہے۔ حافظ صاحب کے عربی رسائل نے ملک میں خاصہ شہرت پائی ہے اور مفید ثابت ہوئے ہیں۔ یہ حصہ جواب شائع ہوا ہے بہت سے مفید اضافہ پر مشتمل ہے۔ ضرب الامثال کا حصہ نکال دیا گیا ہے، کیونکہ مبتدیوں کے لئے وہ مفید نہیں تھا۔ مڈل۔ انٹرنس۔ کالج کے طلباء کے لئے واقعی اس کتاب کا وجود نہایت ضروری تھا۔

قیمت ۸ / ملنے کا پتہ: حافظ عبدالرحمن سیاح بلاد اسلامیہ بیرون موچی دروازہ احاطہ حاجی قادر بخش لاہور۔

۱ الہدیٰ؛ ج ۴ ع ۶ ص ۴۰

عزیز القلوب [1]

یہ کتاب حضرت امام غزالیؒ کی کتاب مکاشفۃ القلوب کا اردو ترجمہ ہے اس میں مقامات تصوف پر کتاب وسنت کے مطابق نہایت ضروری مباحث مندرج ہیں۔ اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن کو کس طرح ایک خالص مسلمان صحیح کر سکتا ہے۔ ملاحدہ اور منکرین افراط و تفریط سے کبھی محفوظ نہیں ہیں اور کتاب و سنت کو اصل عظیم خیال قرار دے کر مقامات سلوک کی حقیقت کا کھولنا صرف حضرات مشائخ کا کام ہے اور انہیں کی تعلیمات حقہ سالک طریق حق کو منزل مقصود کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کتاب میں امام صاحب ممدوح نے عقلیات سے کام نہیں لیا کیونکہ عقلیات فی الحقیقت رہزن دین و ایمان ہیں۔ مگر جن لوگوں کا مذاق فاسد ہو چکا ہے انہیں عقلیات کے بدون ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے دل کو اطمینان اور رغبت عبادت اور رجوع الی اللہ کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور یہی کسی تصنیف کی مقبولیت کا نشان ہے۔ ہم نہایت زور سے سفارش کرتے ہیں کہ ہر ایک صاحب ایمان اس کتاب کا مطالعہ کر کے سعادت دارین حاصل کرے۔ تعداد صفحات پانچ سو زیادہ ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے اور قیمت صرف دو روپیہ (عم)

ملنے کا پتہ: مولوی عبدالرحیم صاحب خلف مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم متصل مسجد چینیاں والی لاہور

1 الهدیٰ؛ ج ۷ ع ۷ ص ۳۹

عصرِ جدید[۱]

یہ ایک ماہوار رسالہ ریاست مالیر کوٹلہ سے بادارت خواجہ غلام الثقلین صاحب بی۔اے شائع ہوا کرتا ہے۔ اصلاح رسوم و رواج اس کا اہم مقصد ہے۔ اور گاہے گاہے بعض دیگر مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اصلاح رسوم و رواج کی مسلمانوں کو ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور بتدریج ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر لائق ایڈیٹر نے جس روش کو اختیار کر رکھا ہے وہ زیادہ تر ملاحدۂ یورپ کی تتبع کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ شریعت اسلامی میں اصلاح رسوم و رواج کے لئے اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ کوئی دوسری قوم اس کا کچھ بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر یوں کہا جائے کہ اہل زمانہ کا مذاق ہی ایسا ہے کیونکہ مذہبی روش اختیار کرنے سے رسالہ قومی رسالہ نہ رہے گا بلکہ ایک مذہبی رسالہ ہو جائے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی ایسی اصلاح کی ضرورت نہیں جس کی بنا کتاب الٰہیہ پر مبنی نہیں اور اگر اصلاحات مجوّزہ شریعت اسلامی سے مخالف نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو ایسے طور پر پیش نہیں کیا جاتا جس سے ناظرین کو جواز وعدم جواز شرعی کا خیال بھی مدنظر رہے۔ کیونکہ وعدہ وعید آسمانی طبائع میں بہ نسبت کسی دوسرے طریق کے زیادہ مؤثر ہوا کرتا ہے۔ ہاں اگر غیر اقوام کے حالات کو ضمناً بطور نظیر پیش کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ہم اس رسالہ کے مقاصد سے متفق ہیں۔ مگر مذکورہ بالا ترمیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ امید کہ خواجہ صاحب اس کو ایک مشفقانہ مشورہ پر محمول کریں گے۔ اس رسالہ کی قیمت صرف عہ ۸/ سالانہ ہے اور کاغذ اور چھپائی قابل تعریف۔

۱ الھدیٰ ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۹

ریویو

رسالہ عقد انامل [1]

یہ ایک چھوٹا سا چار ورق کا رسالہ ہے۔ جس میں انگلیوں پر دس ہزار تک گنتی کی ترکیب نہایت آسان اور عام فہم لکھی گئی ہے۔ یہ کوئی نئی ایجاد نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ گنتی کا طریق مشہور اور مروج تھا کتب احادیث سے اسکے عام رواج ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مروجہ دانوں کی تسبیح سے اس میں یہ فوائد زائد ہیں۔

(۱) اس طریق کا مسنون ہونا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسبیح تہلیل کا ارشاد کرکے فرمایا: و أن یُعقد بالانامل (ابوداؤد ترمذی)

(۲) مروجہ تسبیح پر دام خرچ کرکے جیب وغیرہ میں رکھ کر حفاظت کرنی پڑتی ہے اور اس کے گم ہو جانے اور زیادہ قیمتی ہے تو چوری ہو جانے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ عقد انامل کی ترکیب ایک مرتبہ یاد کر لینی مدت العمر کو کافی ہے۔

(۳) مروجہ تسبیح میں جب تک پوری تسبیح نہ پڑھی جائے معلوم نہیں ہوتا کہ کس قدر پڑھا گیا ہے اور کتنا پڑھنا باقی ہے بخلاف عقد انامل کے کہ اس میں نمبروار ہندسے بنتے جاتے ہیں اور ہر جگہ معلوم رہتا ہے کہ اس قدر وظیفہ پڑھا گیا ہے اور اس قدر باقی ہے۔

(۴) عقد انامل میں ہاتھوں کے اشاروں سے ناظرین واقفین کو دس ہزار تک جو عدد چاہیں بنا سکتے ہیں۔ مروجہ تسبیح میں یہ بات نہیں ہے۔

(۵) عقد انامل میں بحساب ابجد ان ہندسوں کے حروف بھی بن سکتے ہیں۔

ف آج کل جو ریلوے گارڈ اور انجن ڈرائیور چلتی گاڑی میں ہاتھوں کے اشاروں سے بات چیت کر لیتے ہیں اور فوجوں میں اور اگنبوٹوں اور جہازوں میں شیشے اور جھنڈیوں کے اشاروں سے جو کلام کرتے ہیں اس کی اصل زمانہ قدیم میں موجود تھی۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۸ ص ۳۹

ہر کہ آمد براں مزید کرد ۔

اور ہم آج کل مسنون طریقہ کو بھی بھلائے جاتے ہیں ۔ مؤلف کی دلی آرزو ہے کہ مسلمان بچوں کو ہندسوں کے ساتھ یہ ترکیب بھی سکھلائی جائے ۔ قیمت صرف ایک پیسہ ۔ بیرو نجات کے حضرات بنظر ثواب و اشاعت سو پچاس منگوائیں تو بہتر ہے ۔

نور پورہ ڈاکخانہ خاص تحصیل سمندری ضلع لائل پور میں مولوی نور محمد سے بترسیل قیمت مل سکتا ہے ۔

"غایۃ المراد فی احتفال المیلاد"[1]

مترجم

مفتی سید محمد اعظم شاہ شاہجہانپوریؒ

از کتاب "نہایۃ الارشاد" مصنفہ مولانا سید عین القضاۃ لکھنوی

تقریظ محقق

(از جناب الفاضل الکامل ذو المجد الخفی والجلی، جامع العلوم مولانا مولوی سید اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور ادام اللہ برکاتہ)

ھاتوا برھانکم إن کنتم صٰدقین

اپنے عمر بھر کے مسلمات کی بنا پر حجت خصم کو خواہی نخواہی مجروح و مخدوش کرنا بھی محقق کا شیوہ نہیں، کوئی دعوی بلا دلیل مسموع نہیں، ہاں دلیل کی نوعیت کا موازنہ کرنا محقق کا پہلا فرض ہے اور ایسے ہی منکرین کی طرف ہمارا روئے سخن بھی ہے۔ ورنہ وہ اصحاب جو صرف جواز محفل میلاد کے الفاظ سُن کر آگ بگولا ہونے کو پا برکاب بیٹھے ہیں 'مرفوع القلم' ہیں۔ میرے خیال میں حضرت مؤلف علامہ نے مسئلہ متنازع فیہا پر کافی روشنی ڈال کر ناقد البصیرت کو مطمئن کر دیا ہے۔ ورنہ رد و انکار کا میدان بہت وسیع ہے۔ وہ کون سی اور کس شخص کی تحقیق ہے جس پر منع، نقض معارضہ کا باب مسدود ہو چکا ہے۔ بہر صورت اگر کوئی صاحب جواب لکھنے کی کوشش بھی کریں گے تو کوئی نئی بات متصور نہ ہوگی 'لا یزالون مختلفین' کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے

---

[1] مطبوعہ سنہ جمادی الاولی ۱۳۴۵ھ ص اندرونی و ا

اور رہے گا مگر میں دلائل و براہین قطعیہ یا اقناعیہ سے قطع نظر کرکے حضرات منکرین سے مستلفت ہوں گا وہ اس محفل مبارک کی غرض وغایت پر غور فرمائیں۔ اگر بعض جہال جو محض بہ نظر ہواے نفس شریک محفل ہوتے ہیں، کچھ ایسی حرکات کر گزریں جو دائرۂ جواز شرعی سے خارج ہیں تو اس سے مطلقاً ایسی محفل کے انعقاد کا عدم جواز لازم نہیں آتا۔ محفل میلاد کا نتیجہ وثمرہ مخلصین وعشاق جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھو۔ افسوس کہ یہ مقام اس شرح کا متحمل نہیں بلکہ اس کا موقع کوئی دوسری مجلس ہے، جو مناظرہ و مجادلہ کی غرض سے منعقد نہ کی گئی ہو ؎

دریں مشہد کہ انوار تجلی ست ۔۔۔ سخن دارم ولے ناگفتن اولیٰ ست

اللھم ارزقنا لذۃ الایمان ولا تحرمنا درجۃ الایقان

خاکسار

اصغر علی روحی عفا اللہ عنہ

تقریظ

القاسم [1]

مدرسہ عالیہ عربیہ دیوبند اپنی عظمت و ہر دلعزیزی کے رو سے اسلامی دنیا میں مسلم ہو چکا ہے مسلمانوں کے ایسے عظیم الشان درسگاہ سے ایک مذہبی جریدہ کا اجراء نہایت ضروری تھا سو الحمد للہ کہ مولوی سید اصغر حسین صاحب نے یادگار حضرت مولوی محمد قاسم صاحب قدس سرہ ایک ماہوار رسالہ بنام القاسم جاری کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ بطور نمونہ ایک رسالہ شائع کر کے انہوں نے اہل اسلام سے استدعاء کی ہے کہ اگر اس کا اجراء مفید ہو تو اس کو مستقل طور پر جاری کیا جائے۔ رسالہ اعلیٰ درجہ کا خوشخط اور صحیح اور عمدہ کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ اس کے مضمون نگار حضرات علماء دیوبند ہیں۔ جن کی نسبت علمائے اسلام کو پورا اطمینان ہے اور یہی کافی ہے۔ جناب مولوی محمود الحسن صاحب اول مدرس مدرسہ عالیہ کا مضمون بطور نمونہ ناظرین کی خدمت میں ہدیہ ہے۔ ہر ایک غیرت مند مسلمان کو اس رسالہ کا مطالعہ اپنا فرض سمجھنا چاہئے کیونکہ ایسے ہی رسالوں کی اہل اسلام کو آج کل زیادہ ضرورت ہے۔

ایڈیٹر

[1] الھدیٰ؛ ج ۷ ع ۷ ص ۳۳

ریویو

قاعدہ عربی و سیپارہ الم [1]

مولوی محمد ابراہیم صاحب بانی انجمن مجاہدین نے قاعدہ عربی اور قرآن مجید کا پہلا سیپارہ نہایت خوش
اسلوبی اور طرز جدید پر شائع کئے ہیں۔ قاعدہ عربی کا ڈھنگ بالکل نرالا ہے، جس سے مبتدی طالب علم کو چند ہی روز
میں حروف مفردہ و مرکبہ کی پوری واقفیت ہو جاتی ہے اور پارہ اول نہایت خوشخط اور بصحت تام قریباً بیس
علماء کی تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جس کے دیکھنے سے طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اعراب برمحل قائم کرنے میں
بڑی کوشش کی گئی ہے۔ مع ہدایت صرف دو پیسہ۔

مولوی محمد معظم صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور سے مل سکتا ہے۔

[1] الہدیٰ ؛ ج ۷ ع ۱۱ ص ۳۹

قبسة الخاطی الشادی الیمن من جنفة شاطی الوادی الامین[1]

(شرح بی۔اے کورس عربی، پنجاب یونیورسٹی برائے امتحان ۱۹۲۰ء)

مرتبہ

المیمن عبدالعزیز الراجکوتی

(صورة ما کتبه المولیٰ العالم والقرم الهمام جذل الادب المحکک والمجرب المحنک الفاضل المحترم المولیٰ اصغر علی الروحی دام مجدہ السامی)

جدید بی۔اے کورس عربی مجوزہ پنجاب یونیورسٹی کے بعض حصص نظم و نثر فی الواقع ایسے ہیں کہ سوا ایک لائق وسیع نظر ادیب کے کوئی دوسرا شخص کماحقہ نہیں پڑھا سکتا۔ بالخصوص وہ اصحاب جنہوں نے باضابطہ علم ادب عربی کی تعلیم حاصل نہیں کی اور مطالعہ اور لغت کی مدد سے پڑھایا کرتے ہیں، بسا اوقات اکثر مقامات کے حل کرنے میں عاجز آجایا کرتے ہیں اور طلبہ بھی کامل طور پر مطمئن نہیں ہوتے۔ ان مشکلات کو مدنظر رکھ کر ہمارے معزز دوست مولوی عبدالعزیز صاحب پروفیسر مشن کالج پشاور نے (جنہیں ادبیات سے ایک خاص طبعی مذاق ہے اور بلغاء زمانہ جاہلیت اور فصحاء اسلام کے نظم و نثر لکھنے والوں کے مختلف نمونے ان کی نظر سے گزر چکے ہیں اسلئے ان کی تحقیق و تدقیق اکثر ابنائے جنس سے نمایاں امتیاز رکھتی ہے) مذکورہ بالا کورس کی شرح کی تکلیف گوارا فرما کر اہل ملک کو ممنون احسان فرمایا ہے۔ میں نے حصۂ نثر کے چند مواقع کو مطالعہ کیا اور مشتے نمونۂ خروارے تصور کرکے یقین کرلیا کہ ہمارے فاضل دوست کی محنت اہلِ

---

[1] مطبوعہ سنہ (۲۹/اگست) ۱۹۱۹ء صـ ۴

انصاف کی نظروں میں خاص وقعت حاصل کر سکے گی۔ خیال کرنا چاہیے کہ مقامات مشکلہ کے حل کرنے میں کس قدر کتب متعلق تاریخ، اسماء الرجال، لغت، ضرب الامثال وغیرہ کی طرف رجوع کرنا پڑا ہوگا۔ یوں تو ملک میں مدعی بہت ہیں مگر حق یہ ہے کہ نکتہ چینی آسان اور نکتہ آوری مشکل کام ہے۔ مجھے مختصراً جو کہنا تھا کہہ دیا۔ کتاب دیکھ کر اہلِ علم میرے ان فقرات کی صداقت کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حضرات اساتذہ اور طلبہ سے استدعا ہے کہ اس قیمتی کتاب سے جسکی قیمت بمقابلہ اسکی حقیقی قیمت کے بہت ہی قلیل رکھی گئی ہے۔ مستفید ہوں۔

والسلام خیر الختام

کتبہ

اصغر علی روحی

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

۲۹ / اگست ۱۹۱۹ء

ریویو بر قرآن مجید (مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور)

باہتمام

مولوی ظفر اقبال

(حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی، ایم۔ او۔ ایل، لاہور)

فن طباعت کی ایجاد سے پہلے خطاطین نے فن کتابت میں کئی ایک قسم کی رنگ آمیزیوں کا جوہر دکھلایا۔ جس کی نظیر کسی قوم کے علمی کارناموں میں نہیں مل سکتی۔ مگر فن طباعت کی ایجاد پر فن کتابت کا سلسلہ بتدریج منقطع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کریم کی کتابت، طباعت کی صورت میں منتقل ہو گئی اور مختلف ممالک میں کتاب اللہ منطبع ہو کر تمام اطراف عالم میں پھیل گئی چنانچہ ہندوستان میں بھی مالکان مطابع نے مختلف صورتوں میں اس کتاب مقدس کو شائع کیا جن میں سے بعض دیگر بعض کی نسبت مزید اہتمام صحت کے ساتھ شائع کی گئیں۔ مگر آہستہ آہستہ اہل مطابع نے اکثر کم توجہی سے کام لے کر صحت اعراب کو ملحوظ نہ رکھا اور مصارف میں بچت کا خیال کر کے ناقص خط، ناقص کاغذ اعراب کے ساتھ شائع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی بے پروائی سے غیر مذاہب کے لوگوں نے بھی تاجرانہ حیثیت میں اس کتاب پاک کی طباعت اپنے ذمے لی اور بہت سا مالی نفع حاصل کیا اور سچ پوچھو تو یہ مسلمانوں کی بے حمیتی اور کتاب اللہ کی بے حرمتی کو سہل جاننے کا نتیجہ ہے۔ اکابر قوم کو کبھی بھولے سے بھی کتاب اللہ کی اس مبتذل حالت کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ملک میں جابجا غلط مطبوعہ نسخے کتاب اللہ کے شائع ہو چکے ہیں جنہیں ان پڑھ لوگ اعراب کے ساتھ پڑھتے اور بجائے ثواب تلاوت بار گناہ اپنے سر لیتے ہیں۔

اس خرابی کو مدنظر رکھ کر انجمن حمایت اسلام لاہور نے کتاب اللہ کی کامل تصحیح کا انتظام کر کے ایک قابل تحسین

---

۱ مطبوعہ شعبان ۲ ۱۳۵ھ

و آفرین کارنامہ جو خدمت اسلام کا ایک بہترین نمونہ ہے، قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس نسخہ میں ہر ایک مشکل کو آسان کرنے کے لئے نہایت محنت اور کوشش سے کام لیا گیا ہے۔ اوقاف کے نشانات نہایت تحقیق کے ساتھ قائم کئے گئے ہیں۔ شروع میں ایسی فہرستیں دی گئی ہیں جن سے تعداد منازل، سورتوں کی ترتیب تلاوت و نزول، تعداد رکوع، متقدمین اور متاخرین کے معانقات، سجدہ ہائے تلاوت، حرف الف زائدہ، آیات و رکوعاتِ شمس وغیرہ کا باسانی پتہ لگ سکتا ہے۔ مع ہذا صفائی خط، عمدگی کاغذ اور وضاحت اوراق ایسے امور ہیں جن کو دیکھ کر محبانِ کتاب اللہ کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس میں غلطی اعراب کا احتمال نہیں۔ الغرض ہندوستان میں اس جامعیت اوصاف کے ساتھ کبھی آج تک کتاب اللہ طبع نہیں ہوئی۔ انجمن نے تقریباً ۱۰ ہزار روپیہ کی لاگت سے باہتمام بلیغ اس کتاب پاک کو شائع کیا ہے۔ خاکسار کے خیال میں انجمن کا یہ کارنامہ جمیع مسلمانانِ عالم کے لئے موجبِ فخر و مباہات ہے۔ اہل اسلام کا فرض ہے کہ انجمن کی اس دینی خدمت کو اپنے حق میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ خیال کر کے کارپردازانِ انجمن کا تہ دل سے شکریہ ادا کریں۔ ہر ایک مسلمان کے گھر میں اس کتاب پاک کا نسخہ بطور تحفہ نادرہ موجود ہونا چاہیئے۔ بایں ہمہ جامعیت، خصوصیات، اس پاک کتاب کا ہدیہ مبلغ ۳ روپے و ۵ روپے و ۲۵ روپے علی حسبِ مراتب تجویز کیا گیا ہے۔ جو اس کتاب پاک کی عزت و وقعت کے مقابلے میں ہیچ کے برابر ہے۔ ان سطور کو لکھتے وقت خاکسار کی زبان پر یہ شعر الہاماً جاری ہوا۔

زحسنِ یوسفِ قرآں بپا غوغا ست غوغائے
زلیخائے ارادت کو کہ تا زد بہر خریدنہا

والسلام خیر الختام

اصغر علی روحی

کاشف الرموز شرح موجز [1]

موجز علم طب یونانی میں اطباء کے نزدیک نہایت مستند اور مشہور کتاب ہے جس کی کئی ایک شرحیں پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ طب یونانی کی قدر دانی کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔ کہیں کہیں پرانے زمانہ کے بقایا کچھ نہ کچھ اپنے انفاس عیسوی سے اس مریض جان بلب کو کچھ نہ کچھ امید دلاتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ شہر لاہور کے لائق اور مستند طبیب حکیم احمد دین صاحب خلف حکیم اللہ دین صاحب مرحوم نے کتاب مذکور کی شرح فارسی زبان میں نہایت عمدگی اور وضاحت کے ساتھ بالکل ایک نئے طریق پر لکھی ہے اور کئی ایک ایسے امور ضروریہ کا ذکر کیا ہے، جنکا پہلی شروح میں یا تو بالکل ذکر نہیں تھا یا صرف بطور اجمال تھا۔ حکیم صاحب موصوف کے والد اپنے زمانہ کے بے نظیر طبیب مانے گئے تھے اور دور و نزدیک انکے تلامذہ ابھی تک زندہ ہیں اس لئے حکیم صاحب نے بعض ایسے مجربات صدریہ کا بھی ذکر کیا ہے جو طب یونانی کا جزو اعظم ہیں۔ اس شرح کو ایک گونہ بڑی بڑی معتبر کتب طب کا ایک نسخہ جامع تصور کرنا چاہیے۔ کیونکہ شارح نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ طب کی اکثر مستند کتابیں لکھتے وقت ان کے زیر نظر تھیں۔ یہ کتاب نہ تو اس قدر طویل ہے کہ موجب ملال ہو اور نہ اس قدر مختصر کہ اصل مقصود ہی فوت ہو جائے۔ شارح نے ہر ایک مقام کی تشریح حسب ضرورت کافی طور پر کر دی ہے۔ میرے خیال میں ہر ایک طبیب کا فرض ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرے اور اپنی معلومات کو ترقی دے۔ حجم کتاب قریباً ۲۰۰ صفحہ اور قیمت صرف ایک روپیہ (عہ ر)

(مؤلف سے گمٹی بازار لاہور کے پتہ پر مل سکتی ہے)

[1] الھدیٰ؛ ج ۳ ع ۵ ص ۴۷

ریویو [1]

کاشف العلوم نام ایک رسالہ باہتمام میرزا محمد یعقوب بیگ صاحب محلہ پہاڑی اڈن
کی گلی، شہر دہلی سے ماہوار شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں صرف مذہبی مضامین ہوتے ہیں جو سب کے
سب قابلِ قدر اور نہایت محنت سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ کا ایک نمبر میرے پاس بھی آیا ہے۔ مجھے
خیال تھا کہ ملک میں قابل قدر مذہبی رسالہ جات شائع نہیں ہوتے مگر اس رسالہ نے میرے اس خیال پر ایک
خاص اثر پیدا کیا ہے۔ اس کے چھ حصے حسب ذیل ہیں

۱۔ قاضی ثناء اللہ صاحب مرحوم پانی پتی کی تفسیر مظہری کا بامحاورہ ترجمہ
۲۔ حافظ عبد العظیم منذری کی کتاب ترغیب و ترہیب متعلق علم حدیث کا ترجمہ
۳۔ مسائلِ ضروریہ علم فقہ
۴۔ امام حجۃ الاسلام محمد غزالی کی کتاب اربعین کا ترجمہ۔
۵۔ مثنوی روم کی شرح
۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات

مع ھذا اور بھی مضامین بشرط ضرورت وامکان مندرج ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ عہ
رسالہ بہت مفید ہے۔ مگر اس میں کسی قدر موجودہ تعلیم یافتگان ملک کے مذاق کو ملحوظ رکھا جائے تو اور بھی اچھا ہے۔

فقط

[1] الھدیٰ بج ا عـ ۳ صـ

تقریظ

الکتاب المجید فی وجوب التقلید[1]

یہ کتاب جس کی ضخامت قریباً ۱۲۰ صفحہ کی ہے۔ ہمارے لائق اور فاضل دوست مولوی محبوب احمد صاحب حنفی المعروف خیر شاہ صاحب امرتسری نے حقیقت تقلید پر لکھی ہے۔ گو اس موضوع پر طرفین کے علمائے کرام اس قدر لکھ چکے ہیں کہ اب کوئی نئی بات اس کے متعلق باقی نہیں رہ گئی مگر ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

فاضل مصنف نے دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے اپنے دعویٰ کو مبرهن اور مدلل کیا ہے اور واقعی ایک معتدبہ کام کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے بہت سے شکوک و اوہام کا رفع ہو جاتا ہے۔ ہم اس قیمتی اور گراں بہا کتاب کے مطالعہ کی حضرات اہل اسلام سے سفارش کرتے ہیں اور ہر دو گروہ کے اصحاب سے کیونکہ علم الشیٔ خیر من جہلہ بہت صحیح مقولہ ہے۔ کتاب کی قیمت صرف ساڑھے پانچ آنہ علاوہ محصول ڈاک ہے جو بمقابلہ ضخامت اور مضمون اور صفائی طبع بہت کم ہے۔ حضرت مؤلف سے مذکورہ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔ فقط

[1] الہدیٰ؛ ج ٦ ع ۳ ص ۱۲

ریویو

گنجینہ حقیقت اسلام [1]

اس نام کی ایک کتاب ہمارے لائق اور نامی دوست ماسٹر غلام حیدر خان صاحب گورنمنٹ پنشنر نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس کتاب کی فہرست عنوانات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف نے نو تعلیم یافتہ گروہ اہل اسلام کی مذہبی ضرورتوں کو نہایت عقلمندی اور دور بینی سے موازنہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی وضع میں نہایت قابل قدر اور نو تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے بغایت مفید ہے۔ ہر ایک مضمون کو نہایت سادہ پیرایۂ استدلال میں لکھا ہے اور باایں ہمہ نہایت متین اور مضبوط واقع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہو سکتا ہے کہ لائق مؤلف نے مذہب اسلام کے ذاتی محاسن کو تقلیداً نہیں لکھا بلکہ تحقیقاً۔ میں اس ضروری تالیف کی طرف ناظرین الہدیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کر کے اپنی مذہبی معلومات کے دائرہ کو وسیع کریں گے۔ درحقیقت موجودہ زمانہ میں ایسی ہی تحریرات کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے۔ اس کتاب کا حجم ۲۶۴ صفحہ ۲۰×۳۶ ہے قیمت ۱۲/۸۔ میری رائے میں قیمت میں اگر نسبتاً کچھ کمی ہو جائے تو کم بضاعت لوگ بھی مستفید ہو سکنے کی خواہش کریں گے۔

ملنے کا پتہ:۔ ماسٹر غلام حیدر خان صاحب۔ گورنمنٹ پنشنر محلہ مفتی، لاڑکانہ۔ ذیل میں اس کتاب کا ایک عنوان "اسلامی توبہ اور معافی کا فلسفہ"، بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کتاب کی وقعت کا خود اندازہ لگالیں۔ [2]

---

1 الہدیٰ! ج ۶ ع ۹ ص ۳۴-۳۵

2 اسلامی توبہ اور معافی کا فلسفہ، ص ۳۵ تا ص ۳۹

تقریظ

مجمل [1]

یہ کتاب ہمارے لائق دوست مولوی میرزا محمد نذیر صاحب مولوی فاضل نے سلسلہ تعلیم نسواں میں لکھی ہے۔ گو قبل ازیں اس مضمون پر مختلف رسائل لکھے جا چکے ہیں مگر یہ کتاب کئی وجوہ سے امتیاز خاص رکھتی ہے۔ اس میں اخلاق، معاشرت، دینیات کو نہایت عمدہ طریق پر باہم ملایا گیا ہے۔ اس کا انداز بیان مستورات کے عین مذاق کے مطابق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جو لوگ تعلیم مستورات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اس کی قدر کریں گے۔

قیمت ۱۲ مر چھپائی کا کام صاف ستھرا ہے۔

ملنے کا پتہ: مولوی عبد العزیز صاحب امام مسجد بازار سریا، لاہور۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۶ ع ۶ ص ۴۱-۴۲

مجموعہ خطب الاسلام [1]

قوم کے مشہور باحمیت متبع سنت جناب حاجی محمد یونس خان صاحب رئیس دتاولی (علیگڑھ) نے گزشتہ سال خطبات جمعہ و عیدین وغیرھا کے متعلق پہلا نمبر شائع کیا تھا جس پر الہدیٰ میں ریویو کیا گیا تھا اور قوم کے اہل علم نے اسے پسند فرمایا۔ اب آپ نے اس ضمن میں دوسرا نمبر شائع کیا ہے جو نہایت مفید خطبات و عظامع ترجمہ پر مشتمل ہے اور مذکورہ بالا پتہ پر درخواست کرنے والے کو مفت ارسال فرماتے ہیں۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ درحقیقت یہ کام باقیات صالحات کا ایک مفید طریق ہے۔ بایں ہمہ نہایت نفیس اور دلکش خط اور کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ ائمہ مساجد کو ضرور ان خطبات کی قدر کرنا چاہیئے۔

فقط

خاکسار

ایڈیٹر

---

[1] الہدیٰ؛ ج ١٠ ع ١١ ص آخری

محرم کی بدعتیں ۔ اسلام کے نواہی [1]

یہ دو رسالے جناب نواب میر صدر الدین حسین خان صاحب رئیس اعظم بڑودہ کی تصنیف ہیں جن کے بعض دیگر مفیدہ رسائل پر الھدیٰ ع ۵ میں ریویو کیا گیا تھا۔ محرم کے دنوں میں جاہل مسلمان جن بدعاتِ شرعیہ میں مبتلا ہوتے ہیں ان کا بیان غیر ضروری ہے۔ مگر قوم کے سربرآوردہ اصحاب کی طرف سے ایسے اہم شرعی معاملہ میں آج تک کسی نے توجہ نہیں کی اور سخت افسوس ہے کہ سال بسال یہ بدعات ترقی پذیر ہیں۔ نواب صاحب بہادر نے نہایت ہی مدلل اور باایں ہمہ عام فہم طور پر ان بدعات کا رد کیا ہے۔ اس رسالہ کا عام طور پر شہر بشہر اور دہ بدہ اشاعت کرنا شرعی خدمت ہے کیونکہ بدعات کا مٹانا موجبِ ثوابِ عظیم ہے۔ دوسرے رسالہ میں نواب صاحب بہادر نے حقیقت کفر و گناہ و شرک و توبہ پر نہایت فاضلانہ بحث کی ہے جس کا جاننا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ کس قدر رنج افزا ہے مسلمانوں کی غفلت کہ عموماً خرافات تحریروں کا مطالعہ کرنے لگ گئے ہیں اور محققانہ تحریروں سے جی چراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کاملانِ فن روز بروز کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مستورات اور مڈل و انٹرنس تک کے مسلمان بچوں کے لئے ان رسالوں کا ہر ایک شریف تعلیم یافتہ گھر میں موجود ہونا ضروری ہے۔ قیمت صرف ایک ایک آنہ۔ ملنے کا پتہ: شہر دہلی، حویلی اعظم خاں۔ دفتر افضل الاخبار میرزا محمد عبد الغفار بیگ مالک مطبع۔

[1] الھدیٰ ج ۲ ع ۷ صـ ۴۱-۴۲

ریویو

مخشہستانِ خیال [1]

جناب منشی غلام دستگیر خاں صاحب بیخود کی کتاب مخشہستانِ خیال جس میں نہایت محققانہ پہلو میں انسانی زندگی کے مختلف کوائف کی تصویر کھینچی گئی ہے، میں نے مطالعہ کی۔ میں ہر ایک بالغ نظر آدمی سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرما کر بہرہ کافی اور حظ وافی حاصل کرے۔ کتاب کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نمونہ کے لئے ذیل کا مضمون [2] قابلِ غور ہے۔ مؤلف سے بھاٹی دروازہ لاہور کے پتہ پر طلب فرماویں۔ قیمت ۶ر۔

---

[1] الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۸ ص ۸

[2] یہ مضمون اسی صفحے پر ۲۶ سطروں پر مشتمل "خلق الانسان ضعیفا" کے عنوان سے ہے۔

تقریظ

مراد العاشقین [1]

یہ ایک مثنوی ہے جو علم تصوف کے بعض اسرار پر مشتمل ہے۔ حضرت مراد شاہ صاحب مرحوم ہاشمی قریشی ساکن کوٹلی پیراں کی تصنیف ہے۔ آپ کی ولادت ۱۱۸۴ھ ہجری میں واقع ہوئی اور تعلیم علوم کے بعد زہد و ریاضت میں عمر بسر کی اور بڑے بڑے بزرگانِ دین کی صحبت میں رہے۔ آپ کا کلام سادہ اور معرفت خیز ہے اور اہلِ دل پر وہی کیفیت طاری کرتا ہے جو اہلِ درد کے کلام کا خاصہ ہے۔ یہ مثنوی حال ہی میں ملک فضل الدین صاحب مالک قومی دکان بازار کشمیری لاہور نے عمدہ چھاپ کر شائع کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک دیباچہ مصنف کے حالات پر لکھا گیا ہے جو منشی غلام دستگیر صاحب کلارک نے لکھا ہے۔ منشی صاحب آپ کے خاندان میں سے ہیں۔ لہٰذا نہایت صحت کا التزام کیا گیا ہے۔

حجم ۶۰ صفحے سے زائد

---

[1] الھدیٰ ؛ ج ۷ ع ۲ ص ۳۹

ریویو

مژدہ ہدیہ پیغمبری یعنی تفسیر مظہری [1]

مصنفہ

قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتی

یہ امر تو مسلم ہے کہ بہترین مفسر معانی اسرار قرآنی نبی صلعم ہیں جبکہ اس تفسیر میں ہر آیت کی تفسیر آیات واحادیث و آثار سے ہی کی گئی ہے تو یہی تفسیر بہترین تفسیر ہے۔ قاضی صاحب کو بوجہ ان کے کمال تجربہ کے ان کے پیر صاحب علیہ الرحمۃ بلقب علم الھدے اور عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی بلقب بیہقی ثانی فرماتے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں مولوی رکن الدین صاحب حصاری نے ابتدائی چار سورتیں چھپائیں اس لئے اب پانچویں سورۃ مائدہ سے چھپوائی جارہی ہے اور سورۃ والناس تک مسلسل چھپ کر ان شاء اللہ ابتدائی چار سورتیں بھی چھپوائی جائیں گی۔ یہ تفسیر بے نظیر اب تک اس لئے طبع نہ ہوئی کہ اس کے صرف پانچ ہی نسخہ جات قلمی ہند و بیرون ہند میں ہیں۔ مختصر مضامین تفسیر یہ ہیں شان نزول آیات، تفسیر مطابق باحادیث مع تنقید مدارت تطبیق آیات بآیات مذاہب قراء سبعہ بیان مقطعات و محکمات بیان ناسخ و منسوخ تفقہ صحابہ کرام سرایا و غزوات و قصص احسن نکات تصوف تردید مذاہب معتزلہ وغیرہ معجزات انبیاء کرام مذاہب ائمہ حنفی شافعی حنبلی مالکی فقہی مسائل عبادات و معاملات و وظائف بادعیہ آیات واحادیث بیان کہانت و نجوم و فلسفہ وغیرہ فضائل علوم ظاہری و باطنی مع ترجیح علوم باطنی و ذکر خفی منصب منافقت و بدعت ثبوت خلافت بآیات واحادیث واسماء الٰہی و انبیاء سورہ فضائل اشارات و حقیقات قرآنی ابحاث صرفی و نحوی و لغوی تصنیف روایات رطب و یابس فہرست مضامین جداگانہ۔ مطبع کانتی پرکاش میرٹھ میں بلونت سنگھ پرنٹر کے اہتمام سے چھپا۔

[1] الھدیٰ؛ ج ۹ عـ ۱۳ صـ ۲۲

مسلمان [1]

یہ رسالہ دفتر اہلِ حدیث امرتسر سے شائع ہوتا ہے مگر جس نمبر پر ہم ریویو کرتے ہیں۔ وہ ایک خاص موضوع پر لکھا گیا ہے۔ جس کا مطالعہ ہر ایک طالبِ تحقیق کا فرض ہے۔

چند سال کا عرصہ ہوا کہ عبدالغفور نامی ایک شخص نے اسلام چھوڑ کر آریہ دھرم اختیار کر لیا تو اچانک اس نے لکھا ایک رسالے مقدس اسلام، حضرت بانیٔ اسلام، قرآن مجید پر طعن و تشنیع کے متعلق لکھ ہر چند کہ ایسے دریدہ دہن اور مجہول مطلق کی تحریریں اس قابل نہیں کہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش ان کو کچھ وقعت دے سکے۔ بعض ناواقف اور سادہ طبیعتیں بے لگام ہونے پر جھٹ تیار ہو جایا کرتی ہیں۔ اس لئے حضرات علمائے اسلام کا فرض ہے کہ ان کی روک تھام کرتے رہیں۔ "مسلمان" میں جس کا ریویو کیا جاتا ہے نہایت عمدہ طور پر تحقیق اور الزامی جوابات کا ذخیرہ ہے۔ جس سے مؤلف کے غیر مذاہب سے واقف ہونے کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ مع ہذا جس شخص کو بعض اوقات ایسے اعتراضی مسائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لئے ایک مفید اور کارآمد مجموعہ ہے۔ ہم زور سے سفارش کرتے ہیں کہ ہر ایک شخص اس کو خرید کر مطالعہ کرے۔ عمدہ چھپا ہے۔

قیمت ۵ر ہے۔ مگر مناسب تعداد کم رہتی۔

دفتر اہلِ حدیث امرتسر سے درخواست کرنے پر مل سکتا ہے

فقط

۱ الہدیٰ؛ ج ٦ ع ٦ ص ۴۲۔

مصابیح الظلام [1]

اس نام کی ایک کتاب جناب مولوی نور بخش صاحب ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول گجرات پنجاب نے فارسی زبان میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب ینابیع الاسلام کا رد ہے۔ جو ایک یورپین مشنری نے فارسی زبان میں لکھی تھی۔ اور ہندی مشنری پادریوں نے اس کا ترجمہ مع اضافہ خرافات اردو زبان میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کی نسبت پادریوں کا خیال تھا کہ اہل اسلام اس کے جواب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔ عیسائی مذکور نے اپنا تمام زور اس امر کے ثبوت میں رکھا ہے کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ وہ پہلے مختلف ادیان کے احکام منتخبہ کا مجموعہ ہے اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض عبارات اور جملے جو زمانہ جاہلیت کے کلام میں موجود تھے وہ بعینہٖ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ منجملہ ان کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ جن کو وہ امرؤ القیس مشہور شاعر جاہلیت کی طرف منسوب کرتا ہے اور جن میں بعض جملے آیات قرآنیہ کے ساتھ مطابق [2] واقع ہوئے ہیں۔ جناب مولوی صاحب نے اپنی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کو کام میں لا کر دندان شکن جوابات قلم بند کئے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ بعض احکام شریعت اسلامیہ کے دوسری شریعت کے احکام کے ساتھ متشابہ ہونے سے مقدس اسلام میں کوئی نقص عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ اسلام خود مدعی ہے کہ وہ تمام ادیان کا جامع اور مذاہب مختلفہ کی افراط و تفریط کے دور کر لینے کے لئے جناب امی عرب علیہ السلام کو بارگاہ رب العزت سے عطا ہوا تھا۔ جس کی قطعیت اور جامعیت پر مخالفین امت کی طرف سے اس فرض کفایہ کو ادا کر کے امت مرحومہ کے سر پر ایک احسان عظیم کا بوجھ رکھ دیا۔ جس کا شکریہ قوم کی طرف سے بجز اسکے اور کسی صورت میں ثابت نہیں ہو سکتا کہ کتاب مذکور کی اشاعت میں دل و جان سے سعی کر کے انہیں دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ بہتر تھا کہ کتاب مذکور اردو زبان میں شائع ہوتی تاکہ عام لوگوں کو اس کے مطالعہ کا موقع ملتا۔ مگر فارسی نہایت سلیس اور واضح ہے۔ معمولی استعداد والے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ اچھے ہیں۔ قیمت (١٠/) معہ محصول ڈاک۔

---

[1] الہدیٰ؛ ج ۵ ع ۵ ص ۳۸

[2] الہدیٰ سال اول کے چھ نمبروں (۷ تا ۱۲) میں ینابیع الاسلام کا رد شائع ہوا تھا مگر بوجوہ چند وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ہم نے مذکورہ بالا اشعار کی نسبت ثابت کر دکھایا ہے کہ ان اشعار کو امرؤ القیس جیسے ملک الکلام کی طرف منسوب کرنا فن شعر و ادب پر ہنسی اڑانا ہے۔ علم ادب عربی کا ماہر ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اشعار مذکورہ کسی عجمی نژاد کا کلام ہے کیونکہ رکاکت الفاظ و معانی خود شاہد ہے کہ جاہلیت کے کلام سے انہیں کوئی نسبت نہیں ہم نے وجوہ اغلاط و اسقام پر اپنے رسالہ میں مفصل بحث کی ہے جو ایک انصاف پرست کے لئے کافی حجت ہے۔

"مفصّل" [1]

مفصّل ہمارے لائق اور فاضل دوست میرزا محمد نذیر صاحب منشی فاضل و مولوی فاضل نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں یہ دوسری کتاب شائع کی ہے ان کی پہلی کتاب مجمل مقبول عام ہوئی ہے اور دوسری کتاب ہمیں امید ہے کہ پہلی سے بھی زیادہ قابل قدر ثابت ہونے کے قابل ہے۔ خاکسار نے پہلی کتاب پر اپنی رائے ظاہر کرتے وقت لکھ دیا تھا کہ تعلیم نسواں کے متعلق کچھ کچھ بعض اصحاب نے لکھا ہے مگر اس میں اکثر نئی روشنی کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ میرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں دینی پہلو کے ساتھ مستورات کی تمدنی و معاشرتی ضروریات کی اصلاح کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو ایسی قابل قدر تصانیف کی قدر و منزلت کا اندازہ لگائیں۔ سلاست زبان اور متانت بیان ہر دو قابل تحسین ہیں۔ جزاء اللہ خیر الجزاء۔

قیمت ۸ر ملنے کا پتہ: میرزا محمد نذیر صاحب مترجم دفتر پیسہ اخبار لاہور

[1] الہدیٰ ؛ ج ۷ ع ۳ ص ۳۹

النحو الجدید

مؤلفہ

محمد عالم آسی

(جناب مولانا مولوی علامہ اصغر علی صاحب روحی مدظلہ العالی سابق پروفیسر عربی و دینیات اسلامیہ کالج لاہور)

میں نے ادیب اریب مولوی محمد عالم صاحب مدرس عربیہ اسلامیہ ہائی سکول امرتسر کی کتاب عربی گرامر کے مختلف مقامات کا مطالعہ کیا۔ میرے خیال میں یہ کتاب اکثر کتب مؤلفہ کی نسبت جو اس موضوع میں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ایک نمایاں امتیاز رکھتی ہے۔ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کی محنت سے طلباء کو مستغنی کر دیا ہے۔ زبان عربی کے سیکھنے والوں کے لئے مفید ہے۔ امید ہے کہ طباعت ثانیہ میں اس کی چھپائی میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری کر دی جائے گی۔

فقط

والسلام

خاکسار
اصغر علی روحی

نسخۂ نصر المقلدین [1]

مؤلفہ

مولانا حافظ احمد علی بٹالوی

تقریظ [2]

(فاضل جلیل عالم بے بدل ادیب اریب لبیب نجیب مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی ایم-او-ایل - پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔ زاد افضالھم وعم مجدھم)

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی محمد خیر الوری وعلی آلہ مصابیح الدجی واصحابہ مفاتیح الھدی اما بعد یہ ظاہر ہے کہ بموجب حدیث مشہور خیر القرون قرنی معتقدات حقہ کی بنا روز بروز کھوکھلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ انواع واقسام کی بدعتیں دین احمدی میں داخل ہو کر عامۂ ناس کو ورطۂ ضلالت میں ڈال رہی ہیں۔ کہنے کو تو سب اہل اسلام بجائے خود متبع سنت خیر الانام اور مقلد طریقۂ صحابۂ کرام ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ اگر ایک ایک شخص کے معتقدات اور اعمال کو معیار سنت پر پرکھا جائے تو بے ساختہ یہ کہنا پڑے گا کہ خالص الایمان والاحسان مسلمان صرف انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں۔ پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک اسلام کی آج یہ حالت ہے کہ اگر اس کا مقابلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسلام سے کیا جائے تو بلا تکلف زبان پر جاری ہو گا

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مگر اے حضرات ناظرین آخر اس خرابی کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بجز اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ

---

1. مطبوعہ سنہ ۱۳۲۰ھ ص ۲۹۰ — ۲۹۳ - یہ کتاب حافظ احمد علی صاحب بٹالوی اسسٹنٹ پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاہور نے کتاب الظفر المبین کی رد مغالطات المقلدین مؤلفہ محی الدین لاہوری نو مسلم کتاب فروش کے جواب میں لکھی تھی۔

2. اس تقریظ سے پہلے چند عربی اشعار ہیں جن کا ذکر دیوان کو مرتب کرتے وقت کر دیا گیا ہے۔

مختلف فرق اسلام کا باہمی تعصب و عناد، میں اس وقت بحیثیت ایک حکم کے کسی مسائل مختلف فیہا کا
فیصلہ نہیں دینا چاہتا صرف اپنے بعض مسلمان بھائیوں کو اس ضروری اور اہم امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں
کہ وہ خدا کے لئے بزرگان دین اور ائمۂ مجتہدین کے حق میں زبان طعن و تشنیع دراز نہ کریں اور اسلاف رضی اللہ عنہم
کے حق میں اتہام و بہتان سے باز رہیں کیونکہ یہی لوگ جناب ختمی مآب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت
کے صاف کرنے والے اور اسکو مخالفین کے حملوں سے بچانے والے تھے۔ اگر ان حضرات کی مساعی جمیلہ سے اسلام
قرون اولیٰ میں دور و نزدیک اپنا سکہ و خطبہ نہ جمالیتا تو آج ہم

بدنام کنندۂ نکونامے چند

تک خدا کی یہ بیش بہا نعمت نہ پہنچتی۔ یاد رکھو کہ تمہاری اس بیہودہ سرائی اور افترا پردازی سے جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک روح کو اذیت پہنچتی ہے جو موجب سخط الٰہی ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ ؎

بزرگش نخوانند اہل خرد　　　　کہ نام بزرگان بزشتی برد

یہ لوگ جو چند احادیث کو یاد فرما کر کے تمام اصول و فروع کو بھلائے ؎

چو آن کرمے کہ در گندم نہان ست　　　　زمین و آسمان او ہمان ست

اسی میں محصور جانتے ہیں اور بلا رعایت سنت نبویہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام حیث قال المسلم من سلم المسلمون
من یدہ ولسانہ۔ ائمۂ دین یعنی مجتہدین خصوصاً جناب قدوۃ التابعین اسوۃ المحدثین امام الائمۃ المجتہدین
حجۃ المتفقہین والمحدثین الامام الاعظم ابوحنیفہ النعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شان مبارک میں زبان طعن
دراز کرکے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کرتے ہیں۔ گو بجائے خود توحید خالص کا دم مارتے ہیں۔ مگر در حقیقت صراط
مستقیم شریعت احمدی سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ جن معنوں میں وہ تقلید کو ہم
گروہ احناف کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ سراسر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف ہیں۔ ہم تو بمضمون "علیکم
بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین" انوار توحید کو مصابیح آیات قرآنیہ و سنن نبویہ سے اقتباس کرتے ہیں۔ البتہ
احکام جزئیہ متعلقہ عبادات و معاملات میں قیاس صحیح کو حجت شرعی باور کرتے ہیں اور یہ یاد رہے کہ ہر ایک نبی
اپنی اپنی شریعت کا پہلا مجتہد ہوتا ہے خود خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم حجیت قیاس پر پابند رہے پھر کسی مجہول ناتراشیدہ
کا جناب امام بزرگوار کی نسبت دربارۂ اجتہاد یاوہ گوئی کرنا بمقتضائے قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ الآیۃ۔ محض اس
کی اپنی فطرت بد کا نتیجہ ہوگا ؎

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند
از سگ بپرس خصم تو با ماہتاب چیست

مخالفین ذرا غور سے آپ کے اسی اجتہاد کو بطور نمونہ دیکھ لیں کہ "الایمان لا یزید ولا ینقص" گو بعض ائمہ مجتہدین زیادت و نقصان ایمان کے قائل ہوئے ہیں مگر ایک حقیقت بین اس امر کا بخوبی موازنہ کر سکتا ہے کہ حق بجانب کون ہے؟ آپ کی توجہ بطون و ولایت کی طرف زیادہ مبذول تھی اسلئے آپ کی نظر جہت قلب یعنی حقیقت تصدیق پر پڑی جو ہر حالت میں غیر متبدل ہے اور دوسروں نے ظاہر اعمال پر انحصار رکھا۔ جنمیں زیادت و نقصان عائد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح حدیث مشہور "من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر" میں برخلاف دوسروں کے آپ کا یہ اجتہاد ہے کہ کفر سوائے استحلال ترک لازم نہیں آتا۔ نصوص آیات واحادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہی رائے صحیح و درست ہے۔ الغرض آپ کے اجتہادات کی بنیاد عین سنت نبوی اور سنت خلفاء رضی اللہ عنہم پر ہے جس کا منبع قرآن پاک ہے۔

تعصب کا خدا ستیاناس کرے کہ باوجود دندان شکن جوابات ملنے کے پھر بھی مخالفین اپنی بیہودہ سرائی اور ژاژ خائی سے باز نہیں آتے۔ کیا دربارۂ اثبات وجوب تقلید اور حجیت قیاس یہ کتاب جو میرے لائق اور فاضل دوست مولوی حافظ احمد علی صاحب اسسٹنٹ پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاہور نے تالیف کی ہے، مخالفین کے افحام و تبکیت کے لئے کافی نہیں؟ میرا خیال ہے کہ جس شرح و بسط کے ساتھ فاضل مؤلف نے ضروری مقامات کو قلمبند کیا ہے اگر مخالف اپنے حسد و تعصب سے کنارہ کش ہو کر اس کا مطالعہ کرے تو ضرور اسے بغلیں جھانکنی پڑے گا۔ الحق اس قسم کی نادر تحقیق موضوع تقلید کے بارے میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو بڑے زور کے ساتھ یہ جملہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ خدا ایسے بزرگوار علمائے احناف کو خلقت مزید توفیق سے امتیاز بخشے تاکہ ان کی ضروری تحقیقات مسائل شرعیہ سے عام و خاص مستفید ہو کر ثواب دارین حاصل کریں۔ اخیر پر میں اپنے اور تمام اہل اسلام بالخصوص فرقۂ ناجیہ اہل سنت و جماعت کی طرف سے اپنے لائق اور یگانہ مؤلف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرکے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

بقیت بقاء الدهر یا زین اهله
وهذا دعاء للبریة شامل

الٰہی تو اپنے فضل و کرم سے اس متبرک کتاب کو جو محض تیرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سنت کی ترویج و ترغیب کے لئے لکھی گئی ہے۔ پیرایۂ قبول ارباب دین سے محروم نہ رکھیو۔ آمین بحق طٰہٰ و آل یٰسین

فقط

خاکسار اصغر علی روحی عفی عنہ

مہر

الجواب الصحیح
سنة ١٣٠٢ھ

نعم التعویذ [1]

ترجمۃ نصیحۃ التلمیذ للغزالی

مسلمانوں کے علمی خزانے بہت کچھ تو حوادثِ زمانہ کے دستبرد سے غارت ہوگئے اور قدرے قلیل بچ رہے ان میں سے اکثر تا حال خاص خاص اشخاص کی اولاد و احفاد کے تصرف میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ کسی طالبِ تحقیق کو اگر ان سے استفادہ کا شوق ہو بھی تو اس کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں محفوظ و مکنون خزائن میں سے ہمارے مکرم و معزز دوست جناب مولوی محمد دین صاحب بی۔ اے جج عدالت عالیہ چیف کورٹ بہاولپور نے حضرت امام حجۃ الاسلام ابو حامد محمد غزالی قدس سرہ العزیز کی مذکورہ بالا کتاب کو کسی پرانے کتب خانہ سے بہم پہنچا کر اردو خوان احباب کے لئے عربی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ امام عالی مقام کا نام ہی اسلامی دنیا میں حجت اور اس کتاب کی عظمت و وقعت بتلانے کے لئے کافی ہے۔ زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہ کتاب ایک مختصر سا رسالہ ہے مگر یوں سمجھئے کہ ان کی تمام تصانیف کا ماحصل ہے۔ کتاب کا موضوع یہ ہے کہ آپ کے ایک طالب تحقیق شاگرد نے آپ سے استصواب کیا ہے کہ مجھے کیونکر اپنی غایت کو سمجھنا چاہیے اور کس طرح مجھے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ امام موصوف نے اس سوال کے جواب میں ان امور کو بیان کیا ہے جن کے بدون کوئی انسان ہستی کی دشوار گزار گھاٹی کو کبھی طے نہیں کر سکتا۔ اس میں بتلایا ہے کہ کیونکر ایک حقیقت شناس کو رسمیات اہل مذہب سے منہ موڑ کر حقیقی صراط مستقیم پر چلنا چاہیے اور یہ کہ جب تک کوئی شخص رسوم ظاہری کے ان قیود سے رہائی نہ پائے جن میں اکثر جاہل لیکن طبیعتیں مقید ہیں علوم

[1] الہدیٰ؛ ج ۷ ع ۳ ص ۳۸-۳۹

قرآن و حدیث اس کے حق میں کچھ مفید نہیں ہو سکتے۔ خاکسار اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اس
رسالہ کا مطالعہ ہر ایک مسلمان کے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ میں اس رسالہ کو اپنے ایک معزز اور علم دوست
مشفق کے اس قول کا صحیح مصداق سمجھتا ہوں کہ میں اس رسالہ کو حرز جاں سمجھوں گا اور اسے ہر روز مطالعہ کیا
کروں گا کیونکہ اصلاح نفس کے لئے بمنزلہ اکسیر کے ہے۔ نہایت عمدہ خوشخط اور نفیس کاغذ پر طبع ہوا ہے اور اس کی قیمت
۳ر بلا محصول ڈاک ہے۔ آدھ آنہ کا ٹکٹ ۳ر قیمت کے ساتھ زائد آنا چاہیئے۔ وی پی کی ضرورت نہیں۔ مینیجر الہدیٰ
لاہور سے مل سکتا ہے۔

ریویو

نماز مترجم [1]

یہ مختصر سا رسالہ جناب مولوی فیروز الدین صاحب ڈسکوی مدرّس گورنمنٹ سکول سیالکوٹ نے تیار کیا ہے۔ نثر ترجمہ کے علاوہ نظم بھی ساتھ شامل ہے۔ تمام ناواقفان عربیت کو اس رسالہ کی ضرورت ہے بلکہ گھروں میں مستورات اور بچوں کے پاس اس کی ایک کاپی ضرور موجود ہونی چاہیے۔

قیمت صرف ۱ر ۔ ملنے کا پتہ : مہتمم مدرسۃ القرآن سیالکوٹ۔

[1] الھدیٰ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۸

نموذج الخطب [1]

عربی زبان کی روز بروز کساد بازاری کا سماں دیکھ کر غالباً ہر ایک ایماندار مسلمان کا دل جلتا ہو گا۔ گو اس کساد بازاری کے وجوہ کچھ ہی ہوں مگر اہلِ اسلام کا جو تعلق اس مقدس زبان سے قائم ہو چکا ہے اس کا قطع ہونا محال ہے۔ عربی فصاحت و بلاغت میں کسی کو شک ہے؟ مگر زمانۂ حال کی عربیت نے ایک نیا جامہ پہن لیا ہے جس سے ہمارے اکثر اہل اسلام ناواقف ہیں۔ حال ہی میں سید عبدالحق اعظمی بغدادی خطیب مسجد منارہ والی محلہ بلالی واقعہ بمبئی نے جو بیت العلوم ازہریہ مصر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس کتاب میں ایسے خطبات جمع کئے ہیں، جو اپنی فصاحت و بلاغت کی آپ ہی نظیر ہو سکتے ہیں۔ خطبات کا مضمون توحید اور احکام دین کی ترغیب ہے مگر فاضل مؤلف نے انہیں بالکل زمانہ حال کی ضرورت کے سانچے میں ڈھال دکھایا ہے۔ الغرض ان خطبات کی قدر و منزلت کا اندازہ صرف اصحاب عربیت ہی لگا سکتے ہیں۔ یہ کتاب دس آنہ قیمت پر حضرت مؤلف سے مل سکتی ہے۔

[1] الهدیٰ؛ ج ۲ ع ۱ ص ۲۳

واہ فیضِ ہدایت [1]

جناب حاجی محمد الدین صاحب قادری نے جن کا گرامی وجود گجرات پنجاب مقام گڑھی شاہ دولہ میں عامۂ اہلِ اسلام کے لئے بہت سے خیرات و حسنات کا باعث ہے۔ عنوانِ بالا کے نام سے ایک کتاب مضامین عالیہ تصوف پر لکھی ہے۔ جس میں آپ نے نہایت عمدگی کے ساتھ حقیقتِ بیعت اور معرفت شیخ کامل اور آدابِ مرید پر بحث کر کے اکثر جہال صوفیہ کی غلط فہمیوں کو رفع کیا ہے۔ اس کتاب میں بہت سی نئی باتیں حضرت مؤلف نے قلمبند کی ہیں۔ ہمارے خیال میں ہر ایک ایماندار کا فرض ہے کہ نسخہ مذکورہ بالا کو طلب فرما کر مطالعہ فرمائے۔ قیمت ۸/ - اور اکثر مفت بھی ارسال کرتے ہیں غرباء ٹکٹ ڈاک بھیج کر طلب کریں۔ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب ممدوح کو جزائے خیر دے۔ آمین

فقط

[1] الہدیٰ ؛ ج ۵ ع ۶ ص ۳۹

الہادی

اس نام کا ایک رسالہ عرصہ سے زیرِ ادارت مولوی حافظ ابراہیم صاحب شہر سیالکوٹ سے شائع ہوتا ہے۔ رسالہ ملحاظ اپنے مضامین کے نہایت محققانہ اور مدلّلانہ پہلو میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اثبات مسائل میں قرآن وسنت کو نہایت مضبوط طور پر پیش کیا جاتا ہے اور مخالفین کو جو آج کل مذہب میں اندرونی رخنہ اندازیاں کر رہے ہیں نہایت متانت کے ساتھ دندان شکن جواب دیئے جاتے ہیں۔ زبان صاف طرز بیان دلچسپ اور استدلال محکم۔ ہمارے خیال میں اس رسالہ کا مطالعہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کو مذہبی مضامین سے بہت کم دلچسپی ہے۔ علماء سناتے ہیں مگر لوگ نہیں سنتے۔

قیمت سالانہ ۱۲/ع

ا الہدی؛ ج ۴ ع ا ص ۳۸

New China Stationers, Lahore

تقریظ

ہدایت الانسان الیٰ سبیل العرفان [1]

یہ کتاب مسائل معرفت و اخلاق حسنہ پر مشتمل ہے۔ حاجی حافظ عبدالکریم صاحب نقشبندی راولپنڈی نے لکھی ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق نہایت ضروری اور اہم مسائل تصوف و اخلاق کو قلمبند کیا ہے پڑھنے والے کو ضرورتاً اپنی اصلاح نفس کی ضرورت کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے اور ایسی کتابوں کی آج کل ضرورت بھی ہے۔ الغرض بڑی مفید کتاب ہے۔ حجم ۱۲۴ صفحہ۔ قیمت ٦/ ملنے کا پتہ : مولوی عالم الدین صاحب موضع بہلدروالی ڈاکخانہ سکھیکی ضلع گوجرانوالہ۔

---

[1] الہدیٰ ؛ ج ۸ ع ۲ ص ۳۹

هدایة الفریقین فی بیان ذکر شہادۃ الحسین[1]

یہ رسالہ مولوی غلام محمد حسین ہاشمی نُور پوری نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ایک نہایت مفید اور ضروری رسالہ ہے۔ اس میں ان بدعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کا بتقریب عشرۂ محرّم جاہل لوگ بوجہ جہالت کے ارتکاب کیا کرتے ہیں۔ فاضل مؤلف نے نہایت مدلّل اور واضح طور پر امور ممنوعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس رسالہ کی عام طور پر اشاعت کرنا سنت نبویہ کی خدمت کرنا ہے۔

تعداد صفحات ۱۸ ۔ قیمت ار ۔ ملنے کا پتہ : مولوی سید عبدالرحمٰن صاحب ہزاروی بازار سریاں مسجد میاں اخوند لاہور

[1] الھدیٰ؛ ج ۳ ع ۱۳ ص ۳۹

باب دوم

فتاوی

فتاویٰ

کسی مسئلہ پر فتویٰ دینا ہر عالم دین کا منصب نہیں کیونکہ فتویٰ دینے والے شخص کے لئے لازم ہے کہ قرآن و حدیث اور فقہائے کرام کے حل کردہ مسائل کے علاوہ اُس کا مطالعہ نہایت وسیع ہونا چاہئیے۔ انسانی زندگی میں روز بروز نئے سے نئے مسائل پیش آتے رہتے ہیں۔ اُن کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرنا نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ مولانا روحی مرحوم کا اپنے معاصر علماء میں نہایت بلند مقام تھا۔ وہ کسی مصلحت کی بنا پر فتویٰ نہیں دیتے تھے بلکہ جو کچھ اُن کی رائے میں صحیح صورت حال ہوتی اُسے صاف طور پر اپنے فتاویٰ میں واضح کر دیتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران جب لاہور کے دوسرے علماء نے انگریزی فوج میں بھرتی ہونے کے جواز کا فتویٰ دیا تھا تو مولانا مرحوم نے باوجود حکومت کے بار بار اصرار کرنے پر فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا جیسا کہ میاں امیر الدین اور علم الدین سالک مرحوم نے بیان کیا ہے۔

اسی طرح مولوی حاکم علی (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) نے جب مولانا احمد رضا خاں مرحوم سے ترکِ موالات کے سلسلے میں فتویٰ حاصل کر لیا تو انہوں نے مولانا روحی سے استدعا کی کہ وہ بھی اُس پر دستخط کر دیں لیکن چونکہ مولانا مرحوم بے لوث عالم تھے تو انہوں نے اس بنا پر اُس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ مولانا بریلوی مرحوم کے فتویٰ میں مولانا اشرف علی تھانوی اور دیوبند کے بعض دوسرے علماء کو سب وشتم کیا گیا تھا۔ وہ آخر تک اپنے انکار پر قائم رہے اور انہوں نے دستخط نہ کئے۔

مولانا علم الدین سالک کے عطا کردہ تاثرات میں ان شاء اللہ آگے چل کر ایک دفعہ اراکینِ انجمن نے سالانہ جلسہ کے موقع پر حسبِ دستور جلوس نکالنے کا ارادہ کیا لیکن مولانا مرحوم نے میز پر چند الٹا

مار کر فرمایا کہ میں بحیثیت مفتیٔ دین متین کے فتویٰ دیتا ہوں کہ ایسا جلوس نکالنا اسلام میں جائز نہیں
چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس واقعہ کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی

رسالہ الہدیٰ میں بھی ہر ماہ لوگوں کے پوچھے ہوئے مسائل کا جواب دیا جاتا تھا۔ جب رسالہ کی
اشاعت بند ہو گئی تو حضرت مند اصحاب اپنے مسائل اُن کو لکھ بھیجتے اور مولانا بغیر کسی معاونت کے فقہی
کتابوں کی مدد سے اُن مسائل کا جواب لکھ دیتے تھے۔ بعض دفعہ مولانا یہ کہہ دیتے تو کہ کسی اور مولوی صاحب
سے تم ان کا جواب لکھوا لاؤ میں اُس پر دستخط کر دوں گا۔ لیکن سائل حضرات یہ کہتے کہ ہم فلاں
مولوی صاحب کے پاس گئے تھے لیکن انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر مولانا روحی کا جواب ہمارے فتویٰ کے
خلاف ہوا تو یہ بات ہماری بدنامی کا موجب ہو گی اسلئے پہلے مولانا روحی کا فتویٰ لے آؤ میں بعد
میں اُس پر دستخط کر دوں گا۔

ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق کا بیان ہے کہ ہمارے زمانۂ تعلیم میں کالج گرمیوں کی رخصتوں کے لئے
سکولوں سے چند روز پہلے بند ہو جایا کرتے تھے اور پندرہ بیس روز کے بعد سکول بھی بند ہو جاتے
والد صاحب اور والدہ ماجدہ رخصتوں میں اسلامیہ کالج بند ہوتے ہی گاؤں تشریف لے جایا کرتے
تھے اور ہم سکول بند ہونے پر اُن کے پاس گاؤں چلے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک
دفعہ جب ہمارے سکول بند ہوئے تو میں گاؤں جانے کے لئے ڈاک گاڑی کے ذریعے وزیر آباد
پہنچا جہاں سے ہمارا گاؤں چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے یہ پروگرام بنایا کہ وزیر آباد
اتر کر بذریعہ تانگہ گاؤں چلا جاؤں گا۔ کیونکہ ڈاک گاڑی ہمارے گاؤں کے سٹیشن پر کھڑی
نہیں ہوتی۔ اس روز اتفاق سے جمعہ تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ وزیر آباد نماز جمعہ ادا کرنے کے
بعد بذریعہ تانگہ گاؤں جاؤں گا۔ چنانچہ بارہ بجے کے قریب جب میں وزیر آباد پہنچا تو ریلوے
سٹیشن کے قریب مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے چلا گیا۔ وہاں دو آدمی آپس میں عید کے
بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

ایک نے کہا: لاہور کے علماء کرام نے اعلان کر دیا ہے کہ عید کل ہفتہ کے روز ہو گی
دوسرے نے کہا: لاہور کے کس عالم نے یہ فتویٰ دیا ہے۔ اُس نے کہا کہ فلاں فلاں
علماء کرام نے یہ فتویٰ دیا ہے۔ دوسرے شخص نے کہا کہ مولانا روحی نے بھی فتویٰ دیا ہے کہ نہیں

اُس شخص نے جواب دیا مجھے علم نہیں۔ وہ شخص بولا اگر مولانا روحی نے فتویٰ نہیں دیا تو ہم دوسرے کسی عالم کا فتویٰ ماننے کے لئے تیار نہیں ۔ میں وضو کر رہا تھا اور اُن دونوں کی باتیں سُن رہا تھا اور دل ہی دل میں میں سوچ رہا تھا کہ اُس شخص کو مولانا روحی مرحوم کی ایمانداری اور راست بازی پر کتنا یقین ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔

اس واقعہ سے مولانا مرحوم کے فتویٰ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ افسوس کہ جو فتاویٰ مجلہ الہدیٰ میں چھپتے رہے اُن کا ریکارڈ تو موجود ہے لیکن مولانا کے باقی فتاویٰ کا ریکارڈ اُن کے خاندانی مستورات میں موجود نہیں۔ بہر صورت اپنے دور کے علماء میں فتویٰ نویسی کے بارے میں مولانا کا مقام نہایت بلند ہے اُن کے جتنے فتاویٰ بھی میسر آ سکے اُن کو میں نے یکجا کر دیا ہے۔

ایک سوال

س۔ جناب پیغمبر علیہ السلام پر صدقہ کیوں حرام تھا؟[1]

ج۔ ممکن ہے کہ کوئی خاص وجہ اور بھی ہو، مگر سردست جو وجوہ معلوم ہیں۔ حسب ذیل ہیں:

(۱) کتب انبیاء علیہم السلام میں نبی آخر الزماں کے جہاں بہت سے علامات لکھے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ علامت بھی ہے کہ اس پر صدقہ حرام ہوگا۔

(۲) صدقہ ایک قسم کی میل کچیل ہے جو جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاک ذات کے شایان شان نہیں تھا، کیونکہ صدقہ کا اثر طہارت قلب کے منافی ہے۔

(۳) صدقہ، صدقہ دینے والے کی رحمت اور رقت قلبی کا نتیجہ ہے۔ مگر حضور[4] تو رحمۃ للعالمین تھے۔ پھر سوا خدا کے کون ہے جس کی رحمت کے حضور امیدوار ہوتے؟

(۴) قرآنی تعلیم میں جابجا صدقہ کا حکم آیا ہے اور حضور علیہ السلام اسکی بار بار امت کو ہدایت کرتے اگر خود بذات مبارک اس کو لوگوں سے قبول کر لیا کرتے تو ممکن تھا کہ مخالفین یوں متہم کرتے کہ دنیا کمانے کے لئے لوگوں کو ایسا حکم دیتے ہیں۔

(۵) اس میں اشارہ تھا کہ آئندہ بھی امت کے کاملین اس سنت کو لازم پکڑ لیں اور تزکیہ و تصفیہ باطن کے لئے اسے ضروری شرط سمجھیں۔ نیز اہل طمع فقیروں کو گداگری سے روکنا مقصود تھا کیونکہ یہ عادت علو ہمت کو کھو دیتی ہے۔

آپ کی طفیل تمام بنی ہاشم پر بھی صدقہ حرام تھا۔ ایک دفعہ صدقہ کے خرما آئے پڑے تھے۔ جناب امام حسینؓ نے ایک خرما اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیا۔ آپ نے فی الفور منہ سے باہر نکلوا دیا۔ سچ ہے کہ آپ کی ذات والاصفات تمام کمالات ظاہری و باطنی کی جامع تھی۔ کما قیل ؎

خُلِقْتَ مُبَرَّءً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ ۔۔۔ كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ[2]

(ایڈیٹر)

---

[1] الھدایہ، ج ۱ ع ۲ ص ۴۰

[2] آپ ہر ایک عیب سے پاک پیدا کئے گئے ہیں گویا آپ ایسے پیدا ہوئے ہیں جیسے آپ چاہتے تھے یعنی نہایت ہی کامل و اکمل۔

سوال و جواب

س ۔ انگریزی شفاخانوں میں جن ادویہ کا استعمال ہوتا ہے ان میں عموماً کچھ نہ کچھ شراب کی آمیزش ہوتی ہے ۔ نیز ولایت سے جو مختلف قسم کی مرہمیں تیار ہو کر آتی ہیں ۔ ان میں اکثر خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے ۔ کیا مسلمانوں کو ایسی ادویہ یا مرہموں کا استعمال شرعیتاً جائز ہے ؟ [1]

ج ۔ حرمت خمر تواتر سے نص قرآنی و احادیث صحیحہ و اجماع ائمہ ثابت ہے ۔ چنانچہ اس عنوان پر الہدایہ ع [م] میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی تھی اور نیز یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام [2]

اس لئے شراب کم از کم مقدار میں بھی خواہ ایک قطرہ ہی ہو قطعی حرام ہے ۔ اب گفتگو یہ ہے کہ بطور تقویت اعضاء یا بطور علاج مرض بھی شراب کا استعمال جائز ہے یا نہیں ؟ کیونکہ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ حالات اضطراری ہیں اس لئے ان حالات میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہونی چاہیئے ؟

سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن محرمات کا بحالت اضطرار استعمال جائز ہے ۔ ان کا قرآن مجید نے خود فیصلہ کر دیا ہے ۔ پس شرعیتاً کسی صورت میں شراب جو بموجب نصوص قطعیہ حرام ہے حلال قرار نہیں پاسکتی کیونکہ عموم الفاظ سے کسی قسم کی تخصیص کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا ۔ اس لئے بطور دوا بھی شراب کا استعمال حرام ہے اور جو شخص ایسی حالت میں اس کی حلت کا مدعی ہے اس پر دلیل کا پیش کرنا فرض ہے ۔

باایں ہمہ حرام چیز کو بطور دوائی کے استعمال کرنے کی ممانعت میں ابو داؤد میں حدیث ذیل آچکی ہے ۔

---

[1] الہدایہ ؛ ج ۱ ع ۷ ص ۳۶

[2] جو چیز زیادہ مقدار میں سکر اور نشہ لاتی ہے وہ کم مقدار میں بھی حرام ہے ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ انزل الداء والدواء وجعل لکل داءٍ دواءً فتداووا ولا تداووا بحرام۔ [1]

نیز مسلم اور ترمذی میں یہ حدیث بھی ہے:

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الدواء الخبیث [2]

اور شراب کا پلید اور نجس ہونا بروئے قرآن مجید ثابت ہے کیونکہ رجس کے معنی پلید کے ہیں اور نیز مسلم اور ترمذی اور ابوداؤد میں یہ حدیث صحیح موجود ہے:

انّ طارق بن سوید سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الخمر فنہاہ عنہا فقال انما اصنعہا للدواء فقال انہ لیس بدواءٍ ولکنہ داءٌ۔ [3]

حکم مذکورہ بالا ہر ایک حالت میں صحیح اور قطعی ہے جس میں کوئی استثنائی صورت قائم نہیں کی گئی۔

ھدایہ جلد چہارم کتاب الاشربۃ میں لکھا ہے:

ولہذا لا یجوز ان یداوی بہ جرحا او دبرۃ دابۃ ولا ان یسقی ذمیا ولا ان یسقی صبیا والوبال علی من سقاہ وکذا لا یسقیہا الدواب۔ [4]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ذمی (کافر جو مسلمان بادشاہ کے ملک میں پناہ گزین ہو) اور چھوٹے بچے کے لئے بطور دوائی استعمال خمر جائز نہیں تو ایک مسلمان عاقل بالغ کے لئے کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ حجت نہیں اٹھائی جا سکتی کہ خالص اور مخلوط طور پر استعمال کرنے میں فرق ہے کیونکہ حرام ہر ایک

---

[1] خدا نے بیماری کا اور دوا ہر دو کو پیدا کیا ہے اور ہر ایک بیماری کے لئے دوا مقرر کی ہے۔ دوائی کا استعمال کرو مگر حرام دوائی سے بچو۔

[2] جناب پیغمبر علیہ السلام نے پلید دوائی کے استعمال سے منع فرمایا ہے

[3] طارق بن سوید نے جناب پیغمبر ؐ سے خمر کی بابت سوال کیا تو آپ نے اسے منع فرمایا۔ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ میں بطور دوائی استعمال کرتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ شراب کوئی دوائی نہیں بلکہ بیماری ہے۔

[4] چونکہ حرام چیز سے انتفاع جائز نہیں اسلئے کوئی شخص شراب کو زخم یا کسی جانور کے زخم پشت میں استعمال نہیں کر سکتا اور نہ کسی ذمی کو اور نہ کسی بچے کو پلا سکتا ہے اور گناہ پلانے والے پر ہوگا اور اپنے مویشیوں کو بھی نہیں پلا سکتا۔

حالت میں حرام ہے۔

سوال کی شق ثانی کا جواب بھی یہی ہے یعنی کہ مرہم مذکورہ بالا کا استعمال جائز نہیں کیونکہ حرام ہے اور انتفاع بالحرام حرام ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں حدیث ذیل مروی ہے:

إن الله حرّم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام. قيل يا رسول الله أرأيت شحوم الميتة فانّه تطلى بها السّفن وتدّهن بها الجلود ويستصبح بها الناس فقال لا هو حرام ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلّم قاتل الله اليهود انّ الله لما حرّم عليهم شحومها اجملوه ثم باعوه فاكلوا ثمنه.[1]

اس حدیث سے حلال و حرام حیوانات مردہ کی چربی سے انتفاع کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ پھر خنزیر کی چربی کے انتفاع کی حرمت میں کیا شک ہے؟

(خاکسار ایڈیٹر)

---

[1] خدا نے خمر، مردار، خنزیر اور بتوں کی بیع حرام کی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا، یا رسول اللہ لوگ مردہ جانوروں کی چربی کو کشتیوں اور چمڑوں اور چراغ جلانے میں استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: ایسا نہ کرو کیونکہ وہ حرام ہے۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ خدا یہود کا برا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کو حرام کیا تھا انہوں نے پگھلا کر اسے بیچا اور اسکی قیمت سے فائدہ اٹھایا۔

ایک اعتراض اور اُس کا جواب [1]

(حکم پردہ کے متعلق)

یأبی الفتی الا اتّباع الھویٰ   و منہج الحقّ لہ واضحٌ

آج کل ایک مردِ خدا نے لاہور میں بڑا فتور برپا کر رکھا ہے۔ جس سے چند بازاری ان پڑھ لوگ صحابہ و تابعین و تبع تابعین رضی اللہ عنہم پر زبان طعن دراز کر کے بڑے زور سے سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اہانت کرتے ہیں۔ ان کی کوششوں کا اہم مقصد یہ ہے کہ فقہاء و محدثین قرون ثلاثہ کی ہتک کر کے احادیث کو ناقابل عمل ثابت کیا جائے۔ چنانچہ بجائے نماز معہودہ کے انہوں نے چند آیات قرآن مجید کو تجویز کر لیا ہے جنہیں وہ برخلاف ارکان و آداب شرعیہ اپنی مرضی پر کسی طرح پڑھ لیتے ہیں اور یہی ان کے ہاں نماز ہے۔

گو ایسے اور بھی کئی ایک گمراہ لوگ ملک میں بے دینی پھیلا رہے ہیں اور بجز ذلت انہیں آج تک کچھ نصیب نہیں ہوا مگر پھر بھی ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جہاں تک ہو سکے کوتاہی نہ کرے۔ اسی خیال نے مجھے مجبور کیا کہ ایسے موقع پر خاموشی صحیح نہیں۔

اس مرد خدا نے ذیل کی حدیث صحیح پر ایک اعتراض کیا ہے جس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ احادیث صرف اِدھر اُدھر کے لغویات کا مجموعہ ہے اور ان میں کوئی دین کی بات نہیں بلکہ احادیث منافقین کا کلام ہے۔ نعوذ باللہ منہا۔ وہ حدیث یہ ہے۔

[1] الھدیٰ ! ج ۱ ع ۸ ص ۳۷

قالت رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسترنی بردائہ وأنا انظر الی الحبشۃ وھم یلعبون وأنا جاریۃ فاقدروا قدر الجاریۃ الحدیثۃ السن۔ (رواہ مسلم)

اس حدیث کو راویان حدیث نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے اور چونکہ اصول حدیث کے مطابق یہ بات مسلّم ہے کہ احادیث کی اکثر روایت بالمعنی ہے اسلئے نفس مضمون میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا کیونکہ حکم معمول بہ ہر حالت میں ایک ہی رہتا ہے۔ اس شخص مذکورہ کا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے امر کے مرتکب ہوئے جو خلاف قرآن مجید ہے کیونکہ ازواج مطہرات کے حق میں حکم " وقرن فی بیوتکن " ثابت ہے اور نیز یہ حدیث "یغضضن من ابصارھن" یعنی حکم پردہ کے برخلاف ہے اسلئے صحیح نہیں۔ واضح ہو کہ جب ہوائے نفس کسی شخص پر غالب آجاتی ہے تو اسے ہمیشہ سیدھی بات الٹی نظر آتی ہے۔ اس حدیث میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ بشرطیکہ انصاف کے ساتھ الفاظ کو زیر بحث لایا جائے یوں کہنے کو تو حدیث کیا معترضین آیات قرآن مجید پر بھی اعتراضات کرتے ہیں۔ کیا عبدالغفور بی اے جو حال ہی میں کمبخت مشرک بن گیا ہے اس نے اپنے رسالہ ترک اسلام میں تعلیم قرآن پر اعتراضات نہیں کئے گو کہ وہ اعتراضات محض اس کی جہالت اور سراسر کم مائیگی کا نتیجہ ہیں۔

معترض .... پر یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ آیا علماء اسلام کو آیات حکم پردہ کا علم نہیں تھا کہ انہوں نے باوجود ایسی صریح مخالفت قرآن کے حدیث مذکورہ بالا کو صحیح قرار دیا اور وہ کونسا تناقض آیات و حدیث میں تم ثابت کرنے بیٹھے ہو جو سلف سے مخفی رہا اور تمہیں سوجھا؟ ابلہ فریبی سے بلا

---

۱ حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلعم مجھے اپنی چادر مبارک سے پردہ کئے ہوئے تھے اور میں حبشی لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھی بحالیکہ وہ (اصول فن حرب کے موافق) ہتھیاروں سے کھیل رہے تھے اور میں اُس وقت نوجوان تھی پس تم قیاس کرو کہ ایک نوجوان لڑکی کہاں تک ایسے کھیل کو دیکھ سکتی ہے یعنی بہت دیر تک۔ مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام دیر تک پردہ کئے کھڑے رہے۔

۲ اے ازواج نبی تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔

۳ آپ پیغمبر ایماندار عورتوں سے کہدو کہ اجنبی مردوں سے اپنی نگاہیں پست کر لیا کریں۔

کوئی بات بنتی ہے؟ سنت رسولؐ کوئی ایسا ناپائدار سلسلہ نہیں کہ تمہاری ایسی بے مغز باتوں سے ناقابل عمل قرار پائے جب تک قرآن مجید کا حکم خذوا ما آتاکم الرسول موجود ہے۔ یاد رکھو کہ تمہاری کوئی نہیں سنے گا مرد خدا! اگر تجھ سنت رسول پر ایمان نہیں تو نہ ہو عوام کالانعام کو کیوں خواہ مخواہ گمراہ کر رہے ہو۔ آخر دنیا روزے چند است عاقبت کار با خداوند است۔

سنو! حدیث مذکورہ بالا میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں۔ صرف فن حرب کے کرتب دیکھنے سے مخالفت حکم پردہ لازم نہیں آتی ہر ایک امر اپنے موقع شرعی پر جائز اور موقع غیر شرعی پر ناجائز ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حبشیوں کی طرف دیکھنا مقصود اصلی نہ تھا بلکہ استعمال آلات حرب دیکھنا منظور تھا جس پر جہاد جیسے ضروری فرض شرعی کا مدار ہے اور یہ بات تو حدیث ہی سے ثابت ہو رہی ہے کہ آپ در پردہ دیکھ رہی تھیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی اجنبی آدمی کی نگاہ نہیں پڑتی تھی ہاں آپ کا ان لوگوں کی طرف دیکھنا تمہیں خواہ مخواہ قابل اعتراض معلوم ہوا ہے حالانکہ فعل بالذات اور فعل بالعرض میں نمایاں فرق ہے۔ یہاں بھی ان لوگوں کی طرف آپ کا دیکھنا فعل بالعرض تھا جو کسی صورت میں آیہ یغضضن من ابصارھن کے برخلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن مجید کے تمام اوامر و نواہی اسی اصل کے تابع ہیں۔ دیکھو کذب کی برائی عام شرائع میں مسلم ہے مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے بوجھ میں اپنا پیالہ چھپا دیا اور انہیں چور قرار دیا۔ ایسا ہی ابراہیمؑ نے کفار کے اس سوال پر کہ بتوں کو کس نے توڑا، یہ کہا: کہ بڑے بت نے۔ کیا تم ان جوابوں کو کذب کہو گے؟ ہرگز نہیں۔ گو مذکورہ بالا دو مثالیں ہمارے مسئلہ زیر بحث کی مثال نہیں ہو سکتیں مگر مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک ہی امر مختلف اعتبارات سے مختلف حکم حاصل کر لیتا ہے۔ اہل معقول کے جملہ مشہورہ "لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ"[1] کو کیا تم نے کبھی نہیں سنا؟

اسی اصل پر حضرت عائشہؓ کا استعمال آلات حرب کو دیکھنا قیاس کر لو۔ تم نے خواہ مخواہ ایک جانی

---

[1] اگر امور میں مختلف اعتبارات کا لحاظ نہ ہوتا تو تمام مسائل حکمیہ باطل ہو جاتے۔

لگادی کہ وہ اجنبی آدمیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس حدیث سے یہ ہرگز مستنبط نہیں ہوتا کہ وہ حکم حجاب کے خلاف عمل کر رہی تھیں۔ نووی شارح مسلم اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں

لیس فیہ أنہا نظرت الی وجوھھم و ابدانھم و انما نظرت لعبھم و حرابھم ولا یلزم من ذالک تعمد النظر الی البدن۔ [1]

شارح مسلم کے قول کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جسکو صاحب فتح الباری شارح بخاری نے بحوالہ نسائی روایت ابی سلمہ سے بیان کیا ہے۔

قالت وما بی حب النظر الیہم ولکن احببت أن یبلغ النساء مقامہ لی و مکانی منہ۔ [2]

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ان لوگوں کے کرتب کو دیکھنا بالکل ایک ایسی وجہ پر مبنی تھا جو شرعاً اور عقلاً جائز بلکہ واجب ہے کیونکہ قرآن مجید کا حکم ہے۔

وعاشروھن بالمعروف یعنی تم اپنی بیویوں سے محبت واحسان برتو۔ پھر کیا آپ کا پردہ میں ہو کر استعمال آلات حرب کو بحضور جناب رسول علیہ الصلوۃ والسلام دیکھنا موجب اعتراض ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں چنانچہ نووی شارح مسلم لکھتے ہیں کہ

وفی ھذا الحدیث بیان ما کان علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الرافۃ والرحمۃ و حسن الخلق والمعاشرۃ بالمعروف بالاھل والازواج وغیرھم۔ [3]

اور بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ آیت پردہ سے پہلے کا ہے۔

---

[1] اس حدیث سے ہرگز یہ بات نہیں نکلتی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان لوگوں کے چہروں اور بدنوں کی طرف دیکھ رہی تھیں وہ تو صرف انکی کرتب بازی کو دیکھتی تھیں جس سے عمداً اُن کے بدنوں کا دیکھنا لازم نہیں آتا۔

[2] یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے دیکھنا تو کیا منظور تھا غرض صرف یہ تھی کہ دوسری ازواج مطہرات کو اس بات کی خبر ہو جائے کہ جناب پیغمبر ﷺ مجھ سے کہاں تک اور میں آپ سے کہاں تک محبت رکھتی ہوں۔

[3] اس حدیث شریف میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اپنے اہل و عیال وغیرھم کے ساتھ مہربانی اور اخلاق اور حسن معاشرت سے پیش آنے کا بیان ہے کیونکہ بالمؤمنین رؤف رحیم آپ کی وصف ہے۔

سوالات

جناب پیغمبر علیہ السلام خطبۂ جمعہ میں کیا پڑھا کرتے تھے؟ اور کس قدر؟ [1]

جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر دو خطبۂ جمعہ میں قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کانت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبتان یجلس بینھما یقرأ القرآن و یذکر الناس......الخ

یعنی جناب پیغمبر علیہ السلام دو خطبہ پڑھا کرتے اور ہر دو کے درمیان بیٹھ جایا کرتے اور خطبہ میں قرآن شریف پڑھتے اور لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ابو عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں۔

وقد اختار قوم من اھل العلم ان یقرأ الامام فی الخطبۃ آیاً من القرآن

یعنی اہل علم کی ایک جماعت نے مختار سمجھا ہے کہ امام خطبہ میں قرآن مجید کے آیات پڑھا کرے اور برہان شرح مواہب الرحمٰن میں ہے۔

وتلاوۃ آیۃ من کتاب اللہ و ذکر موعظۃ تحذیر و تبشیر۔

یعنی خطبہ جمعہ میں آیت قرآن شریف کا پڑھنا اور وعظ و نصیحت اور وعدہ وعید ہونا چاہئیے۔ حدیث مذکورہ بالا میں لفظ یذکر الناس سے آیات قرآنیہ کے علاوہ دیگر کلمات وعظ و تقویٰ وغیرہ کا سنانا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے اور امام نووی بذیل حدیث مذکورہ بالا لکھتے ہیں۔

---

[1] الھدیٰ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۰

فیه دلیل الشافعی فی انه یشترط فی الخطبة الوعظ والقرآءة قال الشافعی لا تصح
الخطبتان الا بحمد الله تعالیٰ والصلوٰة علی رسول الله صلی الله علیه وسلم فیهما والوعظ و
هذه الثلاثة واجبات فی الخطبتین وتجب قرآءة آیة من القرآن فی احدهما علی الاصح و
یجب الدعاء للمؤمنین فی الثانیة علی الاصح وقال مالک رض و ابو حنیفة رض والجمهور یکفی
من الخطبة ما یقع علیه الاسم۔

یعنی اس حدیث میں امام شافعی کے لئے دلیل ہے اس امر کی کہ خطبہ میں وعظ اور قرآن مجید کا پڑھنا
شرط ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہر دو خطبے بجز حمد الٰہی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود
بھیجنے اور وعظ کہنے کے درست نہیں اور یہ تینوں امور ہر دو خطبے میں واجب ہیں اور صحیح مذہب میں ایک
خطبہ میں قرآن شریف کا پڑھنا واجب ہے اور دوسرے میں عامۂ اہل ایمان کے حق میں دعا کہنا اور امام مالک
اور ابو حنیفہ اور جمہور آئمہ دین فرماتے ہیں کہ کم ازکم خطبہ کی مقدار ایسی ہونی چاہئے جس پر لفظ خطبہ
اطلاق کیا جاسکے اور دوسری حدیث میں جو صحیح مسلم میں ہے - عمرہ بنت عبد الرحمن سے روایت ہے وہ فرماتے
ہیں: "اخذت ق والقرآن المجید من فی رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم الجمعة وهو یقرأ بها
علی المنبر فی کل جمعة."

یعنی میں نے سورہ ق جناب پیغمبر علیہ السلام سے سیکھی اور آپ ہر جمعہ منبر پر پڑھا کرتے تھے
اسکی شرح میں علامہ نووی لکھتے ہیں:

فیه القرآءة فی الخطبة وهی مشروعة بلا خلاف واختلفوا فی وجوبها والصحیح عندنا وجوبها
واقلها آیة

یعنی اس حدیث میں قرآن مجید کا خطبہ میں پڑھنا مذکور ہے اور وہ امر مشروع ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف
نہیں۔ البتہ اس کے وجوب میں اختلاف ہے۔ شافعیہ کے نزدیک واجب ہے اور کم ازکم اسکی مقدار ایک آیت کے برابر ہے۔
الغرض خطبہ میں قرآن مجید اور وعظ اور درود شریف اور دعا کا پڑھنا ہے اور قرآن مجید کے علاوہ دوسرے الفاظ بھی جو
وعظ و دعا پر مشتمل ہوں جائز ہیں مگر حتی الوسع سلف صالحین کی پیروی اولیٰ ہے - اسلئے انہیں الفاظ
کا تتبع کرنا چاہئے جو متوارث چلے آتے ہیں۔

کیا مقلّد حنفی مقلّد شافعی کی نماز میں اقتدا کر سکتا ہے اور مقلّد کا غیر مقلد کے پیچھے اور بالعکس نماز پڑھنا صحیح ہے؟ [1]

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور ائمہ فقہا نے کم و بیش اس پر بحث کی ہے۔ عامۂ مشائخ حنفیہ مثلاً شمس الائمہ حلوانی و شمس الاسلام و فقیہ ابو اللیث اور صاحب ہدایہ و قاضی خاں وغیرہم کا مذہب یہ ہے کہ اقتداء مخالف کی جائز ہے جبکہ وہ وضو اور ارکان نماز کے مختلف فیہ مواقع[2] کو ملحوظ رکھے اور اگر ایسی احتیاط نہ کرے تو نہیں۔ بلکہ بعض نے اس پر دعویٰ اجماع کا کیا ہے۔ حاصل یہ کہ اقتداء مخالف کی جبکہ وہ احتیاط مواقع اختلاف کی کرے صحیح ہے اور غیر محتاط کی اقتداء مکروہ تنزیہی ہے۔ ملا علی قاری بھی اس طرف گئے ہیں مکروہ کہتے ہیں کہ ایسے امام کا جو مواقع اختلاف کو ملحوظ رکھے پایا جانا قریباً قریباً ناممکن ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ صاحب مبسوط نے کہا ہے کہ نماز پیچھے شافعی المذہب کے جائز ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی شارح مُنیہ نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ ایسے مخالف کی اقتداء جو فروعات میں مخالف ہو جائز ہے جب تک کہ کوئی شئے مفسد صلوٰۃ نہ پائی جائے اور بعض فقہا نے لکھا ہے کہ ایسے امام کی اقتداء سے نماز فاسد ہو جاتی ہے جو رفع یدین کرے۔ مگر ذخیرہ میں لکھا ہے کہ رفع یدین مفسد نماز نہیں اور جامع الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ مفسد نماز وہ چیز ہوتی ہے جس کا قربت (عبادت مسنونہ) ہونا معلوم نہ ہو حالانکہ رفع یدین باتفاق جمہور علماء نماز وتر و عیدین میں سنت ہے اور یہی صحیح مذہب

---

[1] الھدیٰ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۱ - ۳۳

[2] مواقع مختلف فیہ کو ملحوظ رکھنے کی مثال یہ ہے کہ فصد اور پچھنے لگوانے اور قے اور نکسیر پھوٹنے اور قہقہہ فی الصلوٰۃ سے اگر امام شافعی ہو تو وضو کرے یا منی کو دھو ڈالے یا چھیل ڈالے جبکہ بقدر مانع ہو اور مسح سر میں ربع رأس سے کم پر اقتصار نہ کرے یا مثلاً بوقت انتقال رفع یدین اور جہر اور اخفا بسملہ اور قنوت میں ہاتھوں کا پھیلانا وغیرہ نہ کرے وغیر ذالک۔

ہے چنانچہ بعض حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ اقتداء مطلقاً جائز ہے۔ انہوں نے قول ابوبکر رازی پر قیاس کیا ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ اقتداء حنفی کی ایسے شخص کے ساتھ جو دو رکعت پورا کرنے پر نماز وتر میں سلام پھیرتا ہے، جائز ہے یہ اپنی بقیہ نماز اسکے ساتھ پڑھ لے اسلئے اس کا امام اس سلام سے اس کے مذہب کے رو سے نماز سے باہر نہیں ہوا کیونکہ مجتہد فیہ ہے۔ چنانچہ شیخ کمال الدین شارح ہدایہ بھی برخلاف بعض دیگر فقہاء کے کہتے ہیں کہ رازی کا قول صحیح ہے اور ہمارے شیخ سراج الدین ایسے شخص کے پیچھے نماز کے فاسد ہونے کا انکار کرتے تھے بحسب روایت متقدمین۔ انتہی

جس طرح بعض حنفیہ اقتداء شافعی المذہب کو مکروہ جانتے ہیں اسی طرح بعض شافعیہ نے بھی اقتداء حنفی المذہب کو جائز نہیں سمجھا اگرچہ جمیع واجبات پر محافظت کرے اس لئے کہ اس نے اس نماز کو اعتقاد واجبات پر ادا نہیں کیا مگر ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ یہ قول ساقط الاعتبار ہے کیونکہ حضرت نے صحابہ کرام کو افعال نماز کے قولاً و عملاً بطور ابہام تعلیم کئے تھے۔ فرض۔ واجب۔ شرط۔ سنت۔ رکن وغیرہ کی تفصیل نہیں کی تھی اور اگر علم تفصیل افعال کا واجب ہوتا تو حضرت امت کے لئے بیان فرما دیتے۔ خلاصہ کلام اس مقام میں یہ ہے کہ حضرت اور کسی صحابی اور امام سے یہ نہیں آیا ہے کہ اقتداء بالمخالف ناجائز یا مکروہ ہے بلکہ جو آیا ہے وہ یہ ہے: صلّوا خلف کلّ برّ و فاجر (ہر ایک نیکوکار گنہگار کے پیچھے نماز پڑھ لو) اور ظاہر اس حدیث کا تعمیم ہے مع ہذا ائمہ اربعہ سے پہلے کوئی کسی قسم کا تفرقہ جواز و عدم جواز کے بارے میں نہیں تھا اور خانہ کعبہ میں چار مصلوں کا قائم ہونا ائمہ اربعہ سے کئی سو سال بعد میں فرج ابن برقوق مصری سے وقوع میں آیا گویا ائمہ اربعہ کے بعد بھی کئی سو سال تک کسی ایک امام کی اقتداء کر لینا جائز سمجھا گیا تھا اور امام کے حنفی یا شافعی وغیرہ ہونے کی کچھ تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ متأخرین فقہاء نے البتہ جواز و عدم جواز میں گفتگو شروع کی مگر اس تفرقہ روایات کو بحسب اختلاف حالات جمع کرنا کچھ بعید نہیں اور غالباً جس نے مکروہ کہا ہے اس نے کراہت سے کراہت تنزیہہ مراد لی ہے جس کو خلاف اولیٰ کہتے ہیں۔ بہرصورت ائمہ اربعہ سے اس مسئلہ

میں کوئی قول مروی نہیں۔ یہی حکم مقلد و غیر مقلد میں قیاس کرنا چاہئیے۔ کیونکہ عمل بالسنۃ سے کوئی شخص ائمہ ما بعد کی تقلید سے کبھی خارج نہیں ہو سکتا۔

کما ھو مبرھن فی موضعہ گو ایسا شخص کسی امام کی تقلید نہ کرتا ہو۔ البتہ اہل ایمان کو اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ گو اہل بدعت کے پیچھے اصل نماز کے جواز میں کچھ شک نہیں مگر اسکی فضیلت میں ضرور فرق آجاتا ہے۔ مثلاً فرقۂ نیچریہ یا قدریہ وغیرہ کی اقتداء نہ صرف مکروہ تنزیہی ہے بلکہ قریب بحرمت ہے۔

ھذا واللہ اعلم بالصواب ؛

س۔ دو شخص پہلے اور بعد دو شخص دوسرے باری باری سے جنازہ کے آگے لا الٰہ الا اللہ نہایت بلند آواز سے کہتے چلتے ہیں جنکی آواز دو دو میل تک سنائی دیتی ہے۔ کیا یہ عمل شرعاً جائز ہے؟ [1]

ج۔ یہ عمل بدعت ہے جسکا کوئی ثبوت سنت صحیحہ میں نہیں۔ ایسا کرنے والے کو حکماً روکنا چاہئیے۔

[1] الھدیٰ : ج ۲ ع ۵ ص ۳۳۔

س۔ عورت کو جنازہ کے ساتھ قبرستان میں جانا چاہیئے یا نہیں؟ [1]

ج۔ عورت اگر جنازہ کے ساتھ نوحہ کرتی ہو تو منع ہے۔ ایک حدیث میں یوں وارد ہے۔
نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن تتبع جنازۃ معھا رانّۃ" رواہ احمد وابن ماجہ۔
یعنی اس جنازہ کے ساتھ جناب پیغمبر علیہ السلام نے جانے سے منع فرمایا جسکے ساتھ ساتھ کوئی عورت نوحہ کرتی ہو۔ مگر ذیل کی حدیث میں مطلقاً عورتوں کو زیارت قبور سے منع کیا گیا ہے۔
عن أبی ھریرۃ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن زوّارات القبور
یعنی جناب پیغمبر نے ایسی عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کریں لعنت بھیجی ہے لیکن ابو عیسی ترمذی اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت سے پہلے تھی جب اجازت ہوگئی تو اس اجازت میں عورتوں کو بھی مردوں کے ساتھ اجازت مل گئی۔ فقہا نے بھی اسی مذہب کی پیروی کی ہے
فی الدر المختار ولا بأس بزیارۃ القبور ولو للنساء لحدیث کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا
یعنی زیارت قبور میں کوئی ڈر نہیں گو عورتیں ہی ہوں۔ کیونکہ حدیث میں اجازت زیارت آچکی ہے جو تمام مرد وزن کو شامل ہے۔ مگر حتی الوسع جنازہ کے ساتھ عورت کو قبرستان میں جانے سے روکنا چاہیئے کیونکہ تدفین وغیرہ کے وقت ان سے نوحہ اور دیگر حرکات ممنوعہ ضرور سرزد ہونگے جو حرام ہیں۔

---

[1] الهدیٰ ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۳-۳۴

س۔ خاوند کو عورت کے مرنے پر اسکی میت کو ہاتھ لگانا درست ہے یا نہیں؟[1]

ج۔ درست نہیں کیونکہ مرنے پر علاقۂ زوجیت منقطع ہو جاتا ہے۔ در مختار میں ہے۔

ویمنع زوجھا من غسلھا ومسّھا لا من النظر الیھا علی الاصح (منیہ)

یعنی خاوند کو عورت کو غسل دینے اور چھونے سے روکا گیا ہے نہ نظر کرنے سے۔ اس کی شرح میں شارح لکھتے ہیں:

وقالت الائمۃ یجوز لان علیاً رض غسل فاطمۃ رضی اللہ عنھا قلنا ھذا محمول علی بقاء الزوجیۃ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کل سبب ونسب ینقطع الا سببی ونسبی مع ان بعض الصحابۃ رضی اللہ عنہم انکر علیہ شرح المجمع للعینی۔

یعنی امام مالک وشافعی واحمد رضی اللہ عنہم جائز رکھتے ہیں کیونکہ جناب امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت سیدۃ النساء کو خود غسل دیا تھا۔ سو ہم اس جواز کو اس امر پر محمول کرتے ہیں کہ اس خاص مثال میں تعلق زوجیت باقی رہا تھا کیونکہ حدیث صحیح میں آچکا ہے کہ میرے تعلق اور نسب کے سوا باقی تعلقات اور نسبیں مرنے پر منقطع ہو جاتی ہیں۔ باایں ہمہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جناب امیر المؤمنین کے اس عمل کو ناپسند بھی رکھا تھا۔

[1] الھدایہ؛ ج ۳ ــ ع ۵ ــ ص ۳۴

س۔ ایک شخص جو پیری و مریدی کرتا ہے اور اپنے مریدوں کی حرام یا مشتبہ کمائی کو حلال سمجھ کر ان کے ہاں ضیافتیں کھاتا اور نذر و نیاز لیتا ہے۔ شرعاً کس امر کا مستوجب ہے؟ نیز وہ شخص نامحرم عورتوں سے بھی نشست و برخاست کرتا ہے۔ [1]

ج۔ ایسا شخص تقویٰ اور ورع سے جو رہبر دین ہونے کے لئے ضروری ہیں کوسوں بعید ہے۔ اس کا اتباع جائز نہیں۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

تقویٰ ہر ایماندار کے لئے ضروری ہے اور یہ امر کتاب و سنت سے پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ غیر متقی آدمی نور معرفت سے محروم رہتا ہے۔ یہ کہنا کہ کمانے والا شخص ناجائز کمائی کا جواب دہ ہے۔ کھانے والے کو کسی قسم کی ممانعت نہیں، درست نہیں۔ الاشباہ والنظائر میں ہے۔

الحرمة تتعدی فی الاموال مع العلم بہا

یعنی اگر علم ہو کہ فلاں مال حرام ہے تو یہ حرمت دوسرے شخص کے حق میں بھی ثابت ہو گی۔ ہاں فقہا نے اس قدر جواز کو تسلیم کیا ہے کہ اگر کسی شخص کی کمائی کا اکثر حصہ جائز طور کا ہو اور اس میں کچھ مشتبہ مال مل جائے تو بطور حسن ظن قبول ضیافت سے انکار نہیں چاہیئے مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ مسند ارشاد پر متمکن ہوں انہیں اس قسم کی ضیافتوں سے بھی محترز رہنا چاہیئے۔ جناب صدیق اکبر نے ایک دفعہ کچھ ایسے خرما کھا لئے تھے جو ایک مسلمان نے سود میں کسی مدیون سے لئے تھے اور وہ سود حرمت سود کے حکم سے پہلے کا تھا۔ آپ کو جب معلوم ہوا تو جھٹ انگلی حلق میں ڈال کر باہر نکال دی اور فرمایا کہ جس پیٹ میں کبھی خبیث چیز داخل نہیں ہوئی میں اس کو حرام سے خبیث نہیں بنانا چاہتا۔ حدیث میں آیا ہے۔

[1] الہدیٰ : ج ۲ ع ۵ ص ۳۴-۳۵

المؤمنون وقافون عند المشتبہات

یعنی ایماندار آدمی مشتبہ کے موقع پر باز رہتے ہیں۔ امام حجۃ الاسلام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالے میں روزی حلال اور وجوہ مناسب کا ذکر کرتے وقت یہ ثابت کیا ہے کہ علماء و مشائخ کو کسی مسلمان بادشاہ یا حاکم کے ایسے قبول ہدیہ سے باز رہنا چاہیئے جسکے وجوہ حصول خلاف شرع ہوں یا ان میں کسی قسم کا اشتباہ و اختلاط ہو یعنی وجوہ جائز یا ناجائز مل گئے ہوں۔ اسی ایک شرط ضروری کو نہ ملحوظ رکھنے سے آج باوجود صوم و صلوٰۃ کے لوگ صفائی قلب سے محروم رہتے ہیں۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ تم لوگ عبادات میں تو زور دیتے ہو مگر جو امر نور ایمان کا جزو اعظم ہے۔ اس سے غافل رہتے ہو۔ یعنی ورع سے جس کے معنی حرام او مشتبہ بلکہ ایسے مباح سے بھی بچنے کے ہیں جس کا نتیجہ کوئی گناہ ہو۔ اجنبی عورتوں سے اختلاط کرنا بالخصوص خلوت میں ہر دو کا اکٹھا ہونا حرام مطلق ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے

اتقوا مواضع التہم

یعنی ایسے مواقع سے اپنے تئیں بچاؤ جہاں کسی تہمت سے متہم ہونا متصور ہو

س۔ ایک شخص اپنی آمدنی کو شریعت کے حصص معیّنہ کے مطابق اپنے اہل و عیال اور
دیگر اقارب میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے اس کے والدین اور بیوی اور
بال بچوں وغیرہ کو کیا ملنا چاہیئے؟ [1]

ج۔ اس شخص کے حین حیات اسکی آمدنی یا دیگر جائداد میں کسی رشتہ دار کا کوئی حق شرعی
نہیں۔ شریعت کے حصص معینہ کسی شخص کے مرنے پر متشخص ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بطور تبرع و احسان
کے بمقتضائے حالات اپنے اقارب سے مروّت کرسکتا ہے کیونکہ والدین سے احسان کرنا اور اپنے کنبہ کے
محتاجوں کی دستگیری کرنا قرآن مجید کا حکم صریح ہے۔ جس پر ہر ایک مسلمان کا عامل ہونا فرض ہے۔
مگر اس طریقِ احسان کے لئے کوئی حد مقرر نہیں بلکہ شریعت نے اس کو ہر ایک شخص کے حالات پر موقوف رکھا
ہے۔ بیوی کا حق شرعی صرف نان و نفقہ اور مکان کا ہے اور خاوند اپنی مرضی سے اس کو کسی خاص مقدار
معینہ کے فی سبیل اللہ صرف کرنے کی اجازت دے سکتا ہے اور بس، اور اگر عورت بلا اجازت شوہر ایسا
کرے گی تو اس کا ثواب شوہر کو پہنچے گا نہ اس کو ۔ یہی حال دیگر رشتہ داروں کا ہے۔ حدیث شریف
میں آیا ہے کہ جب تم میں سے خدا کسی شخص کو مالدار کرے تو چاہیئے کہ وہ اس مال کو پہلے اپنے اقارب میں
صرف کرنا شروع کرے۔ مگر اس میں بھی الاقرب فالاقرب یعنی درجۂ قرابت اور استحقاق کو ملحوظ
رکھنا ضروری ہے ؞

[1] الہدایہ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۵-۳۶

س۔ ایک شخص نے ایک مطلقہ عورت کی طلاق سے دو تین دن بعد ہی نکاح کرلیا۔ آیا کہ یہ نکاح شرعًا درست ہے؟۔ یہ عورت حاملہ بھی ہے جو نکاح سے پہلے ایک عرصہ سے اپنے خاوند سے علیحدہ رہتی تھی۔ [1]

ج۔ حرام ہے۔ بنص قرآن

ولا تعزموا عقدة النكاح حتى يبلغ الكتاب اجله

یعنی عدت کی میعاد گزرنے سے پہلے معتدہ سے نکاح کا قصد بھی نہ کرو۔ اسکی وجہ کتب فقہ میں یہ لکھی ہے کہ ایام عدت تک عورت سے اپنے پہلے شوہر کا پورا تعلق قطع نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا عورت کی عدت وضع حمل تک ہے اور جو بچہ پیدا ہوگا وہ پہلے شوہر کی طرف منسوب ہوگا۔ بحدیث الولد للفراش۔

---

[1] الھدیٰ ج ۲ ع ۵ ص ۳۶

س۔ کسی مرہونہ چیز مثلاً مکان یا زمین قابلِ کاشت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا ناجائز؟[1]

ج۔ اس سوال کا جواب بہت سے علماء نے دیا ہے اس لئے اب بھی وہی جواب صحیح سمجھنا چاہئیے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مرہون شئے سے فائدہ اٹھانا درست نہیں بلکہ مکروہ تحریمی ہے جو حرام کا حکم رکھتا ہے اور جسکا مرتکب گنہگار سمجھا جاتا ہے۔

و فی الاشباہ أنّہ یکرہ للمرتھن الانتفاع بذلک. ثم نقل عن التھذیب أنّہ یکرہ للمرتھن أن ینتفع بالرھن وان أذِنَ لہ الراھن.

یعنی مرتہن کو مرہون شئے سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے اور پھر مصنف نے کتاب تہذیب سے نقل کیا ہے کہ مرتہن کو فائدہ اٹھانا مکروہ ہے اگرچہ راہن اجازت بھی دے دے۔ صاحب در مختار نے محمد بن اسلم کا یہ قول نقل کیا ہے.

لا یحل للمرتھن ذلک ولو بالاذن لانہ ربوا.

یعنی مرتہن کو مرہون سے منتفع ہونا اگرچہ راہن اجازت بھی دے دے حلال نہیں کیونکہ یہ سُود ہے۔ بعض علماء نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ مگر کمزور ہے۔ احتیاط یہی ہے کہ اجتناب کیا جاوے۔ احادیث سے بھی ممانعت مستفاد ہے۔ واللہ اعلم

[1] الھدایہ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۶-۳۷

New China Stationers, Lahore

س۔ وحدت وجود کے بڑے بڑے ماننے والوں کے نام تحریر فرمائیے اور اس مسئلہ میں حق کیا ہے؟ [1]

ج۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے علماء کو نہیں چاہئیے کہ اس میں کسی قسم کی گفتگو کریں۔ اس کا سمجھنا صرف علمائے ربانی کا کام ہے۔ جو لوگ صرف ظواہر عبارات کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں اور منازل سلوک سے محض بے خبر ہیں ان کے سامنے اس مسئلہ کا بیان کرنا عبث ہے۔ بہرصورت اس مسئلہ کا معرض استدلال میں لانا نہایت کم عقلی ہے جس سے عوام الناس بجز ضلالت کے کچھ حاصل نہیں کر سکتے بلکہ وہ علماء بھی جو چاشنیٔ روحانیت سے ناآشنا ہیں اور صرف ظواہر شریعت کی پابندی کو مقصود حقیقی سمجھے بیٹھے ہیں، اس کی اصلیت کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے ہم اس کو مصلحتاً زیر بحث نہیں لاتے اور غالباً ہم ان بزرگان سلف کے دلائل سے علاوہ کچھ بیان نہیں کر سکتے جنہوں نے اپنی اپنی تصانیف میں اسکی حقیقت پر بحث کی ہے اسلئے جس صاحب کو تحقیق مطلوب ہو انہیں تصانیف کی طرف رجوع کرے البتہ مختصراً اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وجود حقیقی ایک ہی ہے۔ مظاہر میں تفاوت مراتب کو ملحوظ رکھنا ایمان ہے کیونکہ حفظ مراتب ضروری امر ہے جس پر حلال و حرام اور عبودیت و الوہیت کے تفاوت کا مدار ہے

گر حفظ مراتب نکنی زندیقی

یہی اعتقاد صحیح ہے، جو کسی طرح بھی مخالف قرآن و سنت نہیں بلکہ اس اعتقاد کا ثبوت آیات و احادیث میں موجود ہے۔ انسان کو بیجا متعصب نہیں ہونا چاہئیے، کیونکہ تعصب صداقت کے لئے سنگ راہ ہے بلکہ کوشش کرنا چاہیئے کہ کسی امر کی حقیقت اصلیہ کو سمجھا جاوے اور سرِ دست انکار کر دینا بالخصوص ایسے مسائل میں جن کی حقیقت کا سمجھنا خواص ہی کا حصہ ہے کسی ثقہ اور محقق کا کام نہیں ہوتا۔

---

[1] الهدى؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۷-۳۸

وحدۃ الوجود کے ماننے والے حضرات صوفیہ کرام ہیں اور ان میں بڑے بڑے اکابر جنکے نام محدث دہلوی نے بھی قلمبند کئے ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔

سید جعفر مکی۔ شیخ عبدالکریم جیلی۔ شیخ محی الدین ابن عربی۔ ملا مغربی۔ شیخ عبدالوھاب۔ شیخ ابراھیم مدنی۔ شیخ حسام الدین علی متقی مکی۔ شیخ ابراھیم عراقی۔ شیخ صدر الدین قونوی۔ شیخ عبدالرزاق کاشی۔ شیخ عبدالغفور لاری مولوی معنوی۔ شیخ سید گیسو دراز۔ خواجہ عبید اللہ احرار۔ خواجہ باقی باللہ۔ شیخ عبدالرحمن جامی۔ شیخ عبدالرزاق۔ شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ بعض دیگر اکابر اولیاء مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی۔ خواجہ قطب الدین۔ خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمہم اللہ کے کلام میں بھی کہیں کہیں اشارۃً پتہ لگتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بہرصورت عامۂ علماء کو اس بارے میں سکوت کرنا اولیٰ ہے کیونکہ معارف وحقائق معیار استدلال پر موازنہ نہیں کئے جاسکتے۔

بمستوراں مگو اسرار مستی — حدیث جاں مپرس از نقش دیوار

اسی مصلحت پر خاکسار نے اس بحث میں کچھ حصہ نہیں لیا۔

س ۔ شریعت میں زلزلہ کی کیا حقیقت بتلائی گئی ہے ؟ [1]

ج ۔ عالم کائنات میں جس قدر حوادث ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ ان کے لئے سلسلۂ اسباب مقرر ہے جسکو خداوندکریم نے اپنی حکمت کاملہ سے قائم کیا ہے ۔ قرآن مجید نے ہر ایک امر کی نسبت بالواسطہ یا بلاواسطہ ذات باری کی طرف کی ہے جو علۃ العلل ہے ۔ پس جو کچھ کہ وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم وارادہ و حکمت و قدرت سے واقع ہوتا ہے ۔ گو کسی حادثہ کے متعلق بظاہر کچھ اسباب نظر آتے ہوں ۔ جن سے طبیعیات و فلسفہ والے لوگ بحث کیا کرتے ہیں مگر وہ اسباب بجائے خود معلول ہیں ، ارادہ ذات باری کے ۔ اس لئے اگر طبیعیات والے زلزلہ کی یہ حقیقت بیان کریں کہ کسی حصہ زمین کے اندرونی جانب میں اجزاء کبریتیہ یعنی گندھک کا مادہ یا دیگر کسی قسم کے بخارات جمع ہو جاتے ہیں اور زمین کی اندرونی حرارت انہیں باہر کی طرف میلان دیتی ہے تو یہ خیال ہمارے مذکورہ بالا خیال کا ہرگز منافی نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ دنیا میں مختلف قسم کے حوادث کے لئے اسی قسم کے اسباب مقرر ہیں جو محض بطور عادۃ اللہ کے عمل کرتے ہیں ۔ مگر وہ در حقیقت حوادث کے لئے حقیقی علت نہیں ہو سکتے ۔ شریعت سے ثابت ہے کہ خداوندکریم نے ملائکہ کو مختلف حوادث کے اجراء پر متعین فرمایا ہے ۔ سو اسی اصل کے رو سے بعض محققین نے لکھا ہے کہ ملائکہ بحکم خدا زمین کو حرکت دیتے ہیں ۔ جس سے بندگان غافل کے دلوں پر ایک گونہ خدائی جلال وجبروت کا خیال پیدا ہوتا ہے ۔ جو ان کے لئے رجوع الی اللہ کا موجب ہوتا ہے ۔ ممکن ہے کہ اس کے ضمن میں اور بھی دیگر فوائد لازم آتے ہوں مگر اسکا فائدہ تنبیہ پر مشتمل ہونا کسی دوسری مصلحت کا منافی نہیں ہوسکتا ۔

فقط

والسلام ۔

[1] الہدیٰ ؛ ج ۲ ع ۵ ص ۳۸

س ۔ تصویر کے استعمال کا شرعاً کیا حکم ہے ؟ [1]

ج ۔ تصاویر کا استعمال شریعت اسلامی میں حرام ہے گو براہ تعظیم یا بقصد عبادت اس کو نہ رکھا جائے ۔ حدیث ابو طلحہ میں فرمایا ہے :

لا تدخل الملائکة بیتاً فیه کلب ولا تصاویر

یعنی جس گھر میں کتا یا تصویر ہوتی ہے اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے ۔ شارح نووی کہتے ہیں کہ اظہر یہ ہے کہ یہ حدیث عام ہے ہر کلب و ہر صورت کو ۔ عام سے مراد یہ ہے کہ خواہ دشمن کی تصویر مثلاً کسی بت کی یا کسی دوست خدا کی ۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ تصویر ایک معصیت فاحشہ ہے ۔ اس میں مشابہت ہوتی ہے ساتھ خلق خدا کے ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت گھر میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑتے کہ جس میں تصویر ہوتی مگر اس کو توڑ ڈالتے (بخاری) ابن مسعود رفعاً راوی ہے کہ سب سے زیادہ عذاب انہیں تصویر بنانے والوں کو ہوگا ۔ آجکل بعض ملحدین نے اپنے مریدوں کو اپنی تصویر کے استعمال کی عام اجازت دے دی ہے اور وجہ یہ بتلاتی ہے کہ مصلحتاً [2] جواز کا فتویٰ دے دینا حرام ہے اور تعجب ہے کہ استعمال تصویر میں کونسی مصلحت ہے ۔ یوں تو سینکڑوں باتیں ایسی ہیں کہ جن میں کچھ نہ کچھ مصلحت ضرور ہوتی ہے مگر شریعت نے ان کو جائز نہیں رکھا ۔ تصویر خواہ کسی بزرگ کی ہو حرام ہے ۔ حضرت نے کعبہ میں داخل ہوتے ہی تصویر ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کو توڑ ڈالا تھا ۔ یہی کافی حجت ہے ؛

---

[1] الہدایہ ؛ ج ۲ ع ۶ ص ۴۱

[2] یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب بت پرستی کا ڈر مسلمانوں میں نہیں رہا اور چونکہ ممانعت اسی ڈر سے تھی اسلئے اب کوئی وجہ عدم جواز کی نظر نہیں آتی ۔ مگر یہ ناعاقبت اندیش لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہر ایک ظلم کی بنا ابتداء میں خفیف طور پر پڑا کرتی ہے ۔ عرصے کے بعد وہ درجہ غائت کو پہنچ جاتی ہے ۔ چنانچہ یہ لوگ اس ملحد کی تصویر کی پرستش کرنے لگ گئے ہیں ۔

ایک اجازت کے لئے ۔ مگر حق یہ ہے کہ جاہلانہ حُسن اعتقاد سے انسان دھوکہ کھا جاتا ہے ۔ آجکل مسلمانوں نے
بغرض آرائش تصویر کا استعمال خود ہی جائز قرار دے لیا ہے ۔ چنانچہ بہت ہی کم گھر خالی ہونگے ۔ نیچریوں کو
تو شریعت سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ وہ ایسا حکم سنانے والے کو مردہ دل اور لکیر کا فقیر کہتے ہیں ۔ مگر
افسوس کہ بعض شریعت کے احکام کو جاننے والے بھی اس مرض میں مبتلا ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ قیامت
کے دن جناب رسول اللہ کو منہ نہیں دکھا سکیں گے ۔ یہ گستاخی ہے شریعت کی اور خباثت ہے نفس
امارہ کی کہ کوئی شخص حرام شرعی کو بلا حجت شرعی حلال کہتا ہے ۔ نعوذ باللہ من ذالک ۔ غیرت
مند ایماندار کو نہیں چاہئے کہ ایسے مکان میں جائے جہاں تصاویر آویزاں ہوں گو دعوت کے لئے مدعو
ہوا ہو یہی ایمان ہے اور اسی پر مستقل رہنا چاہئے ؎

بتخانہ جیسے ہے گو ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئینگے ہم

(خاکسار ایڈیٹر)

س۔ ایک نومسلم کو یہ دھوکا دیا گیا کہ کفر کی حالت کا تمہارا نکاح صحیح نہیں از سرنو نکاح پڑھواؤ۔ چنانچہ اس کو الفاظ "امرأتی طالق" تلقین کئے گئے۔ اس بے چارہ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس نے اس خیال پر کہ شاید اسلام لانے پر ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حسب تلقین وہ الفاظ کہہ دیئے۔ کیا ازروئے شریعت ایسی طلاق واقع ہوگی اور اب اس کو کیا کرنا چاہئیے؟ بینوا توجروا۔ [1]

ج۔ اگر نومسلم مذکور کو یہ الفاظ کہنے سے پہلے معلوم تھا کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اور یہ الفاظ بولتے وقت اس نے لفظ طلاق سے قطع زوجیت کا ارادہ کیا ہے تو کچھ شک نہیں کہ ازروئے فقہ حنفی تین دفعہ ایسا کہنے سے وہ عورت اس پر بحرمت غلیظ حرام ہو گئی اور اب بدون حلالہ کے اس پر وہ عورت حلال نہیں ہو سکتی۔

وان کان الطلاق ثلاثاً فی الحرة وثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجاً غیره نکاحاً صحیحاً ویدخل بها ثم یطلقها او یموت عنها کذا فی الهدایة۔

اور اگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ لفظ طلاق قطع زوجیت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قوله اولم ینو شیئاً لما مر ان الصریح لا یحتاج الی النیة ولکن لا بد فی وقوعه قضاءً ودیانةً من قصد اضافة لفظ الطلاق الیها عالماً بمعناه ولم یصرفه الی ما یحتمله کما افاده فی الفتح وحققه فی النهر احترازاً عما لو کرر مسائل الطلاق بحضرتها او کتب ناقلاً من کتاب امرأتی طالق مع التلفظ او حکی یمین غیره فانه لا یقع اصلا ما لم یقصد زوجته وعما لو لقنته لفظ الطلاق فتلفظ به غیر عالم بمعناه فلا یقع اصلاً علی ما افتی به مشائخ

[1] الهدایہ: ج ۲ ص ۷ ص ۲۱

او ىنجنر صيانة عن التلبيس ۔

رد المحتار شامی جلد ۲ صفہ ۴۳۱ ۔ اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ شخص امرأتی طالق کا مفہوم نہ جانتا ہو یعنی اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے تو طلاق نہیں پڑے گی ۔

فقط

والسلام

س:- ہندو یا غیر مسلم دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑوں سے نماز جائز ہے یا نہیں ؟ [1]

ج:- ہندو مشرک ہیں اور اس لئے وہ نجس بھی ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ :

" انّما المشرکون نجسٌ "

اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول بعض مفسرین نے نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین بذواتہم نجس ہیں جس طرح کتّا۔ گو بعض آئمہ مجتہدین نے مشرکین کو بذاتہم نجس نہیں ٹھہرایا مگر پھر بھی ایسی مختلف فیہ صورت میں احتیاط واجب ہے اور ایمانی طاقت کا اقتضا یہ ہے کہ مشرک کے ہاتھ کی کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی جائے جو کھانے یا پہننے کی قسم سے ہو کیونکہ غالب یہی ہے کہ ان کی نجاست عام اور لازم ہے اور اگر کہیں دھوبی بجز ہندو کے نہ مل سکے تو اس کے دھوئے ہوئے کپڑوں کو دوبارہ خود پانی میں صاف کرلے اور اگر خیال ہو کہ کپڑوں کی آب و تاب جاتی رہے گی تو ایسی صورت میں نماز کا لباس صاف ستھرا علیحدہ رکھے جو ہندو کا دھویا ہوا نہ ہو۔ مذکورہ بالا عبارت سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ ہندو کے دھوئے ہوئے کپڑوں سے نماز فاسد ہوجاتی ہے نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ کمال آداب و شرائط میں ضرور فرق آجاتا ہے اور اسی لئے اس کے نتیجہ میں بھی فرق آجائے گا۔ اس فرق کا محسوس کرنا کمال طہارتِ باطنی پر موقوف ہے۔ بعض بزرگان کے حالات میں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ بجز مسلمان نمازی کے کسی غیر سے کھانا نہیں پکواتے تھے اور اس کو بھی حکم تھا کہ باوضو تیار کیا کرے چنانچہ ایک دن بلاوضو تیار کرنے پر کھاتے وقت احساس کرکے خادم کو تنبیہ کی۔ بعض سلف صالحین کی نسبت لکھا ہے کہ مشرک کے ساتھ چھو جانے سے غسل کرلیا کرتے تھے۔ مگر یہ باتیں غایت اتقاء کی ہیں۔ فقہی فتویٰ کی صورت سہولت پر مبنی ہوتی ہے اس لئے اس امر میں جہاں تک ہو سکے احتیاط اولیٰ ہے اور اگر مجبوری ہو تو خیر حسب ضرورت عمل کرلے۔

[1] الہدیٰ ؟ ج ۲ ع ۸ ص ۴۱ - ۴۲

غیر مسلم اگر اہل کتاب عیسائی یا یہودی ہو تو اس کے ہاتھ کے دھوئے ہوئے کپڑوں سے نماز جائز ہے۔ قرآن مجید ان کے تیار کئے ہوئے کھانے کی اجازت دیتا ہے تو دھوئے ہوئے کپڑوں میں بدرجہ اولیٰ جواز ثابت ہے۔

س۔ ولایت سے جو صابن آتا ہے اس کے استعمال کا شرعاً کیا حکم ہے؟ [1]

ج۔ چونکہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ تیار کرنے والے نے کن اجزاء سے صابن تیار کیا ہے اسلئے احتیاط اولیٰ ہے بلکہ واجب۔ کیونکہ صابن کے اجزاء میں چربی ہی ایک جزو ہے اور عام طور پر مشہور ہے کہ خنزیر کی چربی اس کام کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک شخص نے اس موضوع پر ایک رسالہ صابون سازی لکھا ہے جس میں صابون کی مختلف چربیوں کا ذکر آیا ہے۔

س۔ کوئی شخص روپیہ امانت چھوڑ گیا۔ کیا امین کو اس امانتی روپیہ سے تجارت کرنا جائز ہے؟ [2]

ج۔ امانت کے روپیہ سے بلا اجازت رب المال (مالک) تجارت جائز ہے۔

الدراهم اذا كانت وديعة او غصبا جازت المضاربة بها (الاشباه والنظائر)

یعنی ودیعت یا غصب کے روپیہ سے مضاربت جائز ہے۔ مضاربت کہتے ہیں کہ ایک شخص کا روپیہ ہو اور دوسرا تجارت کا کام کرے اور نفع میں ہر دو شریک ہوں۔

---

۱ الہدایہ؛ ج ۳ ع ۸ ص ۴۳

۲ الہدایہ؛ ج ۲ ع ۸ ص ۴۲

س ۔ خطبہ جمعہ میں بادشاہ اسلام کے لئے دعا کا کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ [۱]

ج ۔ فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے مگر اس شرط سے کہ لغو مبالغہ اور دور از قیاس مدح سرائی سے خالی ہو ۔

حملۃ الدین

س ۔ ایک صاحب بصورت سوال تحریر فرماتے ہیں کہ حاملانِ دین کے مفہوم میں کون کون لوگ شامل ہیں ؟ [۲]

ج ۔ سوال درحقیقت قابل غور ہے اور کارآمد بھی ۔ اور غالباً انہیں یہ خیال اس لئے سوجھا ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام نئے نئے فرقے باوجود متضاد و متخالف ہونے کے باہم طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں ۔ اس لئے صحیح معنی میں حاملانِ دین کا مفہوم کن لوگوں پر صادق آتا ہے ؟ سو ہم سائل کو یقین دلاتے ہیں کہ اس بارے میں ہماری رائے کوئی حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر ایک شخص اپنے اپنے مذہب کا پابند ہے اور لامحالہ وہ اسی کو حق سمجھتا ہے ۔

" کلّ حزب بما لدیھم فرحون "

ایک نیچری اہل حق کو کیوں اچھا سمجھنے لگا ۔ علیٰ ہذا القیاس مقلّد ، غیر مقلّد کو اور غیر مقلّد ، مقلّد کو ۔ اسلئے بطورِ اجمال سوال کا جواب حسب ذیل ہے اور خاکسار کا عین مذہب ہے اور میرے خیال میں

۱ الهدیٰ ؛ ج ۲ ع ۸ ص ۱۲

۲ الهدیٰ ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۶ – ۳۷

ہر ایک انصاف پسند جو افراط و تفریط کو چھوڑ دے اسی مسلک کو اختیار کرے گا۔ جب کوئی قوم ترقی کیا کرتی ہے تو ترقی کے مختلف شعبوں کو مختلف لوگ پورا کیا کرتے ہیں۔ جس طرح کہ لڑائی کے میدان میں مختلف لوگ مختلف کاموں پر لگائے جاتے ہیں اور درحقیقت وہ سب ایک غرض مشترک کے قائم کرنے کے لئے زور لگا رہے ہوتے ہیں۔ شاید یہ بات صرف اسلام ہی سے مخصوص ہے کہ اسکی حفاظت کے لئے علمائے اسلام نے مختلف قسم کی مساعی جمیلہ سے کام لینا شروع کیا اور غور کرو تو جناب باری عز اسمہ کے فرمان " انّا نحن نزلنا الذکر وانّا لہ لحافظون [1] " کے پورا ہونے کے لئے حضرات علمائے امت کی کوششیں بمنزلہ از اسباب ظاہری کی تھیں جو عادتاً خداوند کریم کی طرف سے مسببات کے لئے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ جونہی قرآن مجید کی تعلیم پاک علمائے امت مرحومہ تک پہنچی۔ بخیال اعلائے کلمۃ اللہ اور بغرض حفاظت ملت حقہ مختلف اطراف سے مختلف آلات کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے جن کی تفصیل یوں ہے۔

محدثین

یہ وہ مبارک فرقہ ہے جس نے جناب رسالتمآب کے اقوال و افعال کی نگہداشت کا ذمہ لے لیا تا کہ حضور والا کی سنت مطہرہ کی حفاظت کی جائے اور بدعات کو کسی طرح دین میں دخل نہ ہو۔ چنانچہ ان حضرات کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج ہم لوگ نہایت آسانی سے اس امر کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ فلاں امر سنت مطہرہ میں داخل ہے اور فلاں امر بدعت ہے۔ اگر علم حدیث ہمارے پاس نہ ہوتا تو یقیناً نیچریہ [2] اور دہریہ قرآن مجید کی آیات کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ::

---

[1] ہم ہی نے قرآن شریف کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکے نگہبان ہیں۔

۲ مرزائیہ۔ چکڑالویہ، یہ سب نیچریہ کی فروعات ہیں۔

متفقہین

یہ اولوالعزم علمائے ملت کا گروہ ہے جنہوں نے قرآن و حدیث میں بذریعہ اصول عربیت
تدبر و تفکر کر کے فروعی مسائل شرعیہ کا استنباط کیا اور احکام کی باضابطہ جماعت بندی کر کے فرض،
واجب، سنت، مستحب، مندوب نوافل کی تحقیق کی اور جائز و ناجائز حلال و حرام، مکروہ و مشتبہ
کا پتہ لگایا۔ جس سے کافۂ اہل اسلام کے لئے روزمرہ عبادات و معاملات میں سہولتیں پیدا ہو گئیں۔
درحقیقت اس گروہ کا کام "انّ ذالک لمن عزم الامور" کا مصداق تھا۔

متکلمین

یہ وہ عالی ہمت گروہ ہے جس نے اہل بدعت و ہوا کے گلے کاٹ دیئے، اور اُن کو بذریعہ دلائل عقلیہ جنکی
تائید دلائل سمعیہ سے کی جاتی ہے ساکت کر دیا۔ یہ لوگ مخالفین مذہب کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر نکلے اور
اسلام کو ان کے زور اور حملوں سے بچا لیا۔ نیز جو لوگ نظر و استدلال کو بمقابلہ کتاب اللہ و سنت صحیحہ
حجت سمجھتے تھے ان کی سرکوبی ان کا فرض اہم تھا۔ اس زمانہ میں نیچریہ اور دہریہ نئے فلسفہ کے رو سے نظر و
استدلال سے کام لیتے ہیں۔ جنکی تردید اس وقت کے فرقۂ علما کا فرض ہے۔

متصوفین

یہ وہ مقدس فرقہ ہے جس نے "قد افلح من زکّاھا" کا مفہوم عملی طور پر پورا کر دکھایا اور سچ
پوچھو تو مذکورہ بالا ہر دو گروہ صرف ظواہر شریعت کے محافظ ہیں اور یہ پاک گروہ نفس کی اندرونی
خباثتوں اور برائیوں سے محفوظ رہنے کا ایسا طریق بتلاتا ہے جس کو وہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ
سے اخذ کرتے ہیں کیونکہ بدوں اسکے شریعت حقہ کی غرض و غایت کی تکمیل ناممکن ہے۔ تصفیہ و تزکیہ

باطن کے لئے دیگر مذاہب میں بھی کچھ نہ کچھ آثار موجود ہیں مگر حضرات متصوفہ کرام نے اپنے طریق کو شریعت اسلامی سے مستنبط کیا ہے اس لئے وہ افراط و تفریط کے عین بیچوں بیچ واقع ہوا ہے جس کو صراط مستقیم کہا جا سکتا ہے۔

اسلامی شریعت کے بیرونی و اندرونی تکمیل کے لئے مذکورہ بالا چار فرقوں کا وجود ایسا ہی ضروری سمجھنا چاہئے۔ جیسے اربعہ عناصر کا وجود انسانی ترکیب جسم کے لئے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اگر ازراہ ناواقفیت کسی ایک فرقہ کی تکذیب کرے تو اس کی سخت نادانی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا وہ کام ہے جس کو دوسرا پورا نہیں کر سکتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر ایک فرقہ کے متاخرین میں متقدمین کی نسبت کسی قدر افراط و تفریط ہو گیا ہے اور ایسا ہونا قرین قیاس بھی ہے مگر جب ہم ان کی اصلیت پر غور کرتے ہیں اور فالتو و حشو کو جو محض باہمی کشمکش سے پیدا ہو گئے ہیں نظر انداز کر کے دیکھتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی ضرورت تسلیم کر لینے میں کچھ بھی تردّد نہیں رہتا۔ میرے خیال میں انہیں چار گروہ میں تعلیم اسلام محدود ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا دستور العمل قرآن مجید اور احادیث نبویہ ہے۔ مگر کس قدر افسوس ہے کہ بعض خود غرض لوگ بلا سوچے سمجھے بعض اوقات دیگر فرقوں کی تردید کر دیا کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ایک عالیشان عمارت کی تعمیر میں بعض اشخاص انجینئری کا کام کیا کرتے ہیں اور بعض معماری کا اور بعض نجاری کا اور بعض آرائش کا۔ ایسا کون عقل کا اندھا ہو گا جو یہ کہے کہ صرف انجینئر ہی عمارت کو کھڑا کر دکھائے گا۔

بچشم مصلحت بنگر مصاف نظم قرآں را   کہ ہر خارے دریں وادی در فشِ کاویاں بینی

(خاکسار ایڈیٹر)

س۔ سجدہ تلاوت قرآن کس طرح ادا کیا جائے۔ آیا یہ سجدہ واجب ہے یا سنت؟ [1]

ج۔ اس کے واجب و سنت ہونے میں اختلاف ہے اور اسکی صورت یہ ہے کہ ابتداء اور انتہا میں اس طرح تکبیر کہے جس طرح سجدۂ نماز میں اور وہی تسبیح پڑھے جو سجدۂ نماز میں پڑھی جاتی ہے اور اس میں سلام نہیں ہوتا (شرح اشباہ و نظائر)

س۔ بہشت موعود آسمان پر ہو گا یا اسی زمین پر؟ [2]

ج۔ بہشت آسمان پر ہے آیہ عندھا جنۃ الماویٰ اور آیۂ وفی السماء رزقکم وما توعدون اس بارہ میں نصوص قاطعہ ہیں۔ قاضی بیضاوی بذیل وما توعدون لکھتے ہیں۔ لأنّ الجنّۃ فوق السماء السّابعۃ۔ یعنی بہشت ساتویں آسمان پر ہے۔

س۔ نماز میں جو تشہد پڑھا جاتا ہے وہ شب معراج میں متعین ہوا تھا پہلے اس سے لوگ کیا پڑھا کرتے تھے۔ [3]

1 الھدایٰ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۷

2 الھدایٰ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۷-۳۸

3 الھدایٰ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۸

ج۔ اس بارے میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ ہم تقریر تشہد سے پہلے قعود میں پڑھا کرتے تھے " السلام علی اللہ السلام علی جبرئیل السلام علی میکائیل "۔ پھر جناب رسول علیہ السلام نے حکم دیا کہ پڑھا کرو " التحیات للہ............ الخ "

س۔ امام جماعت میں ہو اور باہر سے کسی شخص کے آنے کی آہٹ معلوم کر کے رکوع میں انتظار کر سکتا ہے اس خیال پر کہ وہ آنے والا رکعت میں شامل ہو جائے۔ [1]

ج۔ نہیں۔ بلکہ بعض نے اس انتظار کو مفسد نماز لکھا ہے ؎

[1] الہدیٰ ؛ ج ۲ ع ۹ ص ۳۸

س۔ نماز ظہر کے وقت کا اندازہ لگانے میں سایہ کا مثل واحد تک اعتبار کرنا چاہیے یا دو مثل تک۔ قول مفتیٰ بہ سے آگاہ فرماویں۔ [1]

ج۔ نماز ظہر کے وقت کا اندازہ لگانے میں امام محمدؒ و قاضی ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ یعنی مالک و شافعی و احمد رحمہم اللہ اجمعین متفق ہیں یعنی ان سب حضرات کے نزدیک مثل واحد کا اعتبار ہے۔ صرف امام ابو حنیفہ رح کا مذہب دو مثل کا ہے مگر امام صاحب کا اس قول سے رجوع ثابت ہے۔ چنانچہ اسی پر علمائے حنفیہ کا آج تک فتویٰ ہے اور عملدرآمد بھی اسی پر ہوتا ہے۔ گو متون فقہ میں دو مثل لکھا ہے مگر مذہب مفتیٰ بہ یہی ہے۔

قال الامام الطحاوی الحنفی وبہ نأخذ یعنی ہم اسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔ وفی البرھان وھو الاظہر لبیان جبرئیل علیہ السلام وھو نص فی الباب۔ یعنی یہ مذہب بر ظاہر ہے۔ کیونکہ حدیث امامت جبرئیل میں صاف وارد ہے۔ وفی الفیض وعلیہ عمل الناس الیوم وبہ یفتیٰ۔ یعنی عملدرآمد اسی پر ہے اور فتویٰ بھی اسی پر دیا جاتا ہے (در مختار مع عینیہ)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی حنفی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں:

وھذا الاستدلال ضعیف جداً ودلالۃ حدیث الابراد علی بقاء وقت الظہر بعد المثل ممنوع بل الابراد امر اضافی وشدۃ الحر انما یکون عند الزوال وبعض الابراد یحصل قبل بلوغ الظل مثل الشیٔ۔ یعنی صاحب ہدایہ وغیرہ فقہا کا حدیث ابردوا بالظہر (ٹھنڈا کرو ظہر کو گرمیوں میں) سے یہ استدلال کرنا کہ دیار عرب میں گرمی عین ایک مثل سایہ کے وقت ہوتی ہے اس لئے ٹھنڈک ایک مثل سے گذرنے پر ہوگی نہایت کمزور ہے کیونکہ اس حدیث سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ایک مثل سایہ ہو جانے کے بعد

---

[1] الھدیٰ؛ ج ۲ ع ۱۱ ص ۳۸ - ۳۹

بھی ظہر کا وقت باقی رہتا ہے بلکہ ٹھنڈک کا ہو جانا ایک امر اضافی ہے جسکی کوئی خاص مقدار معین نہیں ہو سکتی۔ زوال کے وقت گرمی کا زور ہوتا ہے اور ایک مثل سایہ کے ہونے سے پہلے کسی قدر ٹھنڈک ہو جاتی ہے اسلئے ایک مثل کے ہونے سے پہلے پہلے بھی اس حدیث پر عمل ممکن ہے۔

اور علمائے حنفیہ کے سر گروہ شیخ ابن الھمام رحمہ اللہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

إنّ غاية ما لزم من استدلال الهداية أنّ وقت الظهر يبقى بعد بلوغ الظل مثله ولا يلزم منه الانتهاء الى بلوغ الظل مثلين فالدليل قاصر عن المدّعىٰ ۔ انتهىٰ یعنی ہدایہ کے استدلال سے جو زیادہ سے زیادہ بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سایہ کے ایک مثل تک پہنچ جانیکے بعد ظہر کا وقت باقی رہتا ہے اور یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ دو مثل تک وقت باقی رہتا ہے سو دلیل اثبات مدعا سے قاصر ہے۔

س ۔ نکاح متعہ کا کیا حکم ہے ؟ [1]

ج ۔ متعہ زمانہ جاہلیت کی رسم کا بقیہ تھا ، جس سے اسلام نے شروع ہی میں روک دیا کیونکہ
اس میں بہت سے مفاسد مضمر تھے اور نکاح مشروع ایک نعمت الٰہی ہے جس پر بیشمار تمدنی ۔ اخلاقی محاسن
کا انحصار ہے ۔ بخاری میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث میں یوں وارد ہے :
فلمّا بعث محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم بالحق هدم نكاح الجاهلية كلّه الّا نكاح الناس اليوم ۔
یعنی جناب پیغمبر علیہ السلام شریعت حقہ لیکر مبعوث ہوئے تو آپ نے زمانہ جاہلیت کے
نکاح کی مختلف صورتوں کو بجز آجکل کے مروجہ نکاح کے بالکلیت گرادیا ۔ مگر باوجود اس ممانعت کے
ایک موقع پر جب کہ بعض لوگوں نے بالفاظ "اشدّ علینا العزوبۃ" تجرد سے تنگ آکر شکایت کی تو
صرف تین دن تک متعہ کی اجازت دی گئی مگر چونکہ یہ حکم محض عارضی تھا اسلئے بروایت صحیح مسلم فتح مکہ
کے دن اس کی حرمت کا حکم دیا گیا اور بعض علماء نے بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہ اسکی حرمت غزوۂ
خیبر پر ثابت کی ہے مگر یہ خیال صحیح نہیں ۔ مذکورہ بالا اجازت سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے
کہ متعہ کی صورت بعینہ اسی طرح اسلام میں جائز سمجھی جاتی ہے جس طرح مردار ۔ خون وغیرہ ۔
اشیاء کا استعمال بصورت اضطرار جائز ہے ۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہی خاص صورت
جواز کی مروی ہے ۔

روی الخطابی عن سعید بن جبیر قال قلت لابن عباس لقد سارت بفتیاك الرکبان
وقال فیها الشعراء یعنی فی المتعۃ فقال واللہ ما بهذا قلتُ وانّما هی المیتۃ لا تحلّ الّا للمضطر
یعنی خطابی سعید بن جبیر سے راوی ہیں کہ انھوں نے کہا کہ میں نے ابن عباس سے کہا کہ آپ کے فتوی

---

[1] الهدى ؛ ج ۲ ع ۱۱ ص ۳۹ — ۱۹۴۱ء

متعہ کو ملکوں میں شہرت ہو گئی اور شعراء نے اسکی بابت اشعار لکھے آپ نے جواب دیا کہ بخدا میں نے ایسا نہیں کہا اسکا حکم تو بعینہ مردار کا سا ہے جو نہایت ناچاری کی صورت میں جواز کا حکم رکھتا ہے اور بجز ایسے شخص کے کسی دوسرے کے لئے ہرگز جائز نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابن عباس رضؓ بھی صرف اس خاص صورت میں جواز کے قائل ہیں۔

چونکہ اس خیال کی قوی توقع تھی کہ لوگ اسکو بالکل جائز سمجھ کر عام رواج دے دیں گے اسلئے سورۂ نساء میں بصراحت نازل ہوا۔

فمن لم یستطع منکم طولاً ان ینکح المحصنات المؤمنات فمما ملکت ایمانکم من فتیاتکم المومنات ذلک لمن خشی العنت منکم و ان تصبروا خیر لکم۔

یعنی تم میں سے جس شخص کو یہ استطاعت نہیں کہ حرہ محصنہ مؤمنہ سے نکاح کر سکے تو ایماندار لونڈیوں [1] سے نکاح کرے اور اخیر پر فرمایا کہ یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جس کو ڈر ہو کہ اگر وہ کسی لونڈی سے بصورت ضرورت نکاح نہیں کرے گا تو زنا کا مرتکب ہو گا اور اگر تم صبر کر سکو تو یہ تمہارے لئے بھلی بات ہے۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بصورت اضطرار بھی متعہ کا جواز نہیں ہوا بلکہ لونڈیوں کے نکاح کا حکم دیا۔ اگر متعہ جائز ہوتا تو ظاہر ہے کہ لونڈیوں سے نکاح کی تکلیف گوارا کرنے کی کیا ضرورت تھی جن کے حقوق زوجیت حرہ عورت کے حقوق زوجیت سے دوسرے درجہ پر رکھے گئے ہیں اور متعہ میں کوئی بھی نہیں اور بعض لوگ جو آیہ "فما استمتعتم بہ منہن" سے جواز متعہ کا حکم نکالا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لفظ اجر بمعنی عوض سے اس حکم کی تقویت ہوتی ہے۔ ان کی سراسر جہالت ہے کیونکہ استمتاع سے نکاح شرعی سے متمتع ہونا مراد ہے نہ متعہ اور لفظ اجر سے مہر مراد ہے چنانچہ دوسری جگہ "آتوھن اجورھن" سے ثابت ہو رہا ہے اور حرف فاء حجت قاطعہ ہے اس امر پر کہ نکاح محصنات کے ذکر کے بعد حکم مہر کا بیان کرنا مقصود ہے گویا یہ جملہ نکاح محصنات کے حکم کا تکملہ ہے نہ کوئی علیحدہ جملہ جس سے جواز متعہ کا حکم مستنبط ہوتا ہے دیکھو ایک دوسری

---

[1] اپنی لونڈی سے نکاح کا حکم نہیں کیونکہ اپنی لونڈی سے آقا نکاح نہیں کر سکتا بلکہ دوسرے مسلمانوں کی لونڈیوں کے متعلق جو ایماندار ہوں۔

آیت میں خداوند کریم حکم فرماتا ہے ۔ ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحًا حتی یغنیهم اللّٰہ من فضلہ ۔ یعنی جن لوگوں کو نکاح میسّر نہیں انہیں چاہئیے کہ عفت و پرہیزگاری کو لازم پکڑیں حتیٰ کہ خدا انہیں اپنے فضل سے غنی کردے ۔ اگر متعہ کوئی حکم شرعی ہوتا تو نکاح کے میسّر نہ آسکنے کی صورت میں عفت پر کیوں مجبور کیا جاتا بلکہ متعہ کا حکم ہونا چاہئیے تھا ۔ جس میں کسی قسم کی تکلیف اور ذمہ داری عائد نہیں ہوتی

واضح ہو کہ ابن عباس رضؓ بھی اخیر عمر میں بارشاد حضرت علی کرم اللّٰہ وجہ حرمت متعہ کے قائل ہو گئے تھے ۔ اور آپ نے دعا کی کہ خدایا میں متعہ اور بیع صرف کے بارے میں جو غلط فتویٰ دیتا رہا ہوں مجھے معاف کیجیو ۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا " ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نہی عن متعۃ النساء ۔ اس حکم کے سننے پر آپ نے آئندہ جواز متعہ کا کبھی فتویٰ نہیں دیا ۔ اور حضرت عمر رضؓ تو ایسے شخص کے لئے زنا کی حد یعنی رجم کا فتویٰ دیا کرتے تھے ۔ الغرض متعہ اہل السنت والجماعت کے نزدیک مطلقاً حرام ہو چکا ہے پس کسی مخالف اسلام کا کوئی اعتراض قابل سماعت نہ رہا ۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ مخالف یہ کہ سکتا ہے کہ شروع اسلام میں متعہ جاری رہا ۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں اور کئی ایک حکم بھی تو بتدریج حلت یا حرمت کے درجہ تک پہنچے تھے مثلاً حرمت خمر اور ایسا ہونا عین تعلیم و حق کا مقتضا تھا کیونکہ طبائع انسانی آہستہ آہستہ اصلاح قبول کیا کرتی ہیں نہ یکدفعہ ۔ مگر حق یہ ہے کہ مخالف کو حق بینی سے غرض نہیں بلکہ صرف اعتراض کر دینے سے گو بے محل ہی کیوں نہ ہو ۔

س ۔ زید عشر ادا کرتا ہے کیا اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہے اور نیز بالعکس ؟ کیا مقروض پر بھی عشر واجب ہے ؟ کوئی شخص اگر عشر ادا کرے اور غلہ کو بیچ کر روپیہ بنالے تو اس روپیہ پر پورا سال گزر جانے سے زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب ہو گا ۔ [1]

ج ۔ زید اگرچہ مقروض ہو تاہم ایسی زمین کی پیداوار کا جس پر عشر لگایا جا سکتا ہے ادا کرنا واجب ہے ۔ قرضہ سے فارغ ہونا زکوٰۃ کے لئے شرط ہے نہ عشر کے لئے ۔ کیونکہ یہ دو علیٰحدہ علیٰحدہ حکم ہیں ۔
ویجب مع الدین (در مختار)

جس غلہ سے عشر ادا کیا جائے اگر وہ بجنسہٖ باقی رہے تو کوئی وجوب اس پر عائد نہیں ہے تا اگر روپیہ بنالے تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی ۔

قال فی رد المختار قولہ فتجب الزکوٰۃ ای اذا حال الحول علی البدل قال فی النھر و یلحق بالارث ما دخل من حبوب ارضہ ۔

یعنی اگر غلہ بیچ کر روپیہ بنالیا تو سال کے گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی اور جو غلہ وراثتاً ملا ہو اس پر زکوٰۃ نہیں الا اس صورت میں کہ اسکو بیچ کر روپیہ بنالے ۔

س ۔ بلی جو انڈے بچے چٹ کر جائے اور اذیت پہنچائے اس کا قتل جائز ہے یا نہیں ؟ [2]

ج ۔ ہر ایک موذی کو قتل کرنا مباح ہے بلکہ بعض مواقع پر مستحب ۔ غنیۃ الطالبین میں

[1] الہدایہ ؛ ج ۲ ع ۱۱ ص ۴۱
[2] الہدایہ ؛ ج ۲ ع ۱۱ ص ۴۱

لکھا ہے کہ ہر ایک جانور جو فطرتاً موذی پیدا ہوا ہو بلا اذیت بھی قتل کیا جا سکتا ہے کچھ شک نہیں کہ بلی موذی ہے اور جب اذیت پہنچائے تو بالخصوص واجب القتل ہے۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے جس میں بلی کے قتل کی وجہ سے ایک بڑھیا کے داخل جہنم ہونے کا ذکر ہے جس نے بلی کو بھوک پیاس کے عذاب سے بند جگہ میں مار ڈالا تھا۔ مگر وہ حکم عام نہیں اگرچہ نووی نے لکھا ہے

فیہ دلیل تحریم قتل الھرۃ ۔

س۔ کیا آیہ ولقد ھمت بہ وھم بھا۔۔۔ الخ سے یوسف علیہ السلام کا کسی قسم کے گناہ کا مرتکب ہونا پایا جاتا ہے۔ مدلل بیان فرمائیے۔ کیونکہ خاکسار کو ایک صاحب بار بار ملزم قرار دیتے ہیں۔ میں نے حتی الوسع جواب دیا ہے۔ مگر وہ نہیں مانتے۔ جواب قرآن شریف میں سے ہونا چاہئے۔ [1]

ج۔ اس آیت سے مطلقاً یوسف علیہ السلام کا کسی قسم کے گناہ سے ملوث ہونا نہیں پایا جاتا گو بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام سے بعض حرکات ابتدائی ارتکاب کے پائے گئے۔ مگر یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ اول تو محض لفظ قیل سے اس کا ضعف معلوم ہو جاتا ہے۔ دوم الفاظ قرآن مجید سے ہرگز اس خیال کی تائید نہیں ہوتی بلکہ آپ کی عصمت کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ مع ھذا کسی حدیث میں اسکا کوئی ذکر نہیں۔ یہ اہل کتاب کے روایات کا ذبہ پر مبنی ہے اور ہم الھدیٰ کے گزشتہ نمبر میں لکھ چکے ہیں کہ اہل کتاب کی صرف انہیں روایات کو اسلام میں مسلم رکھا گیا ہے جن کی تائید حدیث صحیح سے ہو سکتی ہے۔ پوری آیت یہ ہے :۔

ولقد ھمت بہ وھم بھا لولا ان رای برھان ربہ

[1] الھدیٰ ؛ ج ۲ ع ۱۲ ص ۳۸ ۔ ۴۰

یعنی زلیخا نے آپ کی طرف قصد کیا اور آپ بھی قصد کر ہی ڈالتے ۔ "اگر اپنے رب العلمین کی برھان یقینی کو نہ دیکھ پاتے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ سے قصد فعل بھی سرزد نہیں ہوا ورنہ معاذ اللہ ایک نبی اللہ کیونکر ایک عام آدمی کی طرح ایک فعل شنیع کا ارادہ کر سکتا ہے ۔ دیکھو علامہ ابو سعود کس زور سے اس خیال کی تائید کرتے ہیں

وفیہ آیۃ و حجۃ قاطعۃ علی انّہٗ علیہ الصلوٰۃ والسلام لم یقع منہ ھمّ بالمعصیۃ ولا توجّہ الیھا قط والّا لقیل لنصرفہ عن السوء والفحشاء وانّما توجّہ الیہ ذلک من خارج فصرفہ اللہ تعالیٰ عنہ .... الخ

یعنی اس آیت میں اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یوسف علیہ السلام سے گناہ کا قصد اور ارادہ بھی سرزد نہیں ہوا ورنہ آیت کے الفاظ یوں ہوتے کہ ہم اس کو سوء اور فحشاء سے ہٹا دیں نہ یہ کہ سوء اور فحشاء کو اس سے ہٹا دیں اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سوء و فحشاء بیرونی امور تھے جن سے آپ کی ذات بری تھی اور جن کو خدا نے آپ سے دور رکھا ۔

اب سیاق و سباق آیت پر نظر کریں کیونکہ اس سے آگے خداوند کریم فرماتا ہے :

" کذالک لنصرف عنہ السوء والفحشاء . "

سوء اور فحشاء دو لفظ ہیں لامحالہ ان کا مفہوم ایک نہیں اس لئے سوء سے ابتدائی حرکات جس میں ارادہ وغیرہ شامل ہیں مراد ہیں اور فحشاء سے ارتکاب عین فعل شنیع ۔ گویا آیت بآواز بلند مطلق گناہ کی نفی کر رہی ہے ۔ اگر صرف فحشاء کا لفظ ہوتا تو بے شک احتمال ارادہ گناہ کا پیدا ہو سکتا تھا مگر ہر دو لفظ نے ہر دو قسم کے گناہ کی نفی کر دی ۔ نیز اگر آپ سے ابتدائی حرکات سرزد ہوئے ہوتے تو لامحالہ بعد میں آپ کی توبہ کا ذکر قرآن مجید میں ہوتا جیسا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی بعض لغزشوں پر توبہ کا ذکر موجود ہے ۔ کیونکہ ایک نبی اللہ کا صغیرہ گناہ بھی کبیرہ کا حکم رکھتا ہے اور بلا توبہ و استغفار ساقط نہیں ہو سکتا

" حسنات الابرار سیئات المقربین "

نیز اگر ابتدائی حرکات سرزد ہوئے ہوتے تو خداوند کریم کا یہ فرمانا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام سے سوء اور فحشاء کو روک دیا ، کس طرح مربوط سمجھا جائے گا کیونکہ بصورت ارتکاب بعض گناہ کے یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے

کہ ان سے گناہ کو ہٹا لیا گیا۔

مع ہذا اگر معترض کا خیال صحیح ہو تو زنان مصر کا جن میں زلیخا بھی شامل تھی۔ آخر کار بریت یوسف ؑ کی بابت بالفاظ "ما علمنا علیه من سوء" شہادت دینا بالکل غلط قرار پائے گا۔ کیونکہ لفظ سوء اس آیت میں بالفظ من جنس نفی میں واقع ہوا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ زلیخا نے آپ کو ہر قسم کی صغیرہ وکبیرہ آلائش سے بری ظاہر کیا جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ زلیخا نے کوئی امر منافی اتقا آپ سے مشاہدہ نہیں کیا تھا کیونکہ محض ارادہ کا وجود ایک باطنی امر ہے جس پر سوائے عالم الغیب کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ ارادہ کا استعمال آیت میں نہیں ہوا بلکہ لفظ ہمّ کا استعمال ہوا جو بعض خارجی حرکات کے ظہور کو مستلزم ہے اسلئے اگر آپ سے کوئی ابتدائی حرکات سرزد ہوتے تو زلیخا ہرگز آپ کی کلّی بریت کی شہادت نہ دیتی چنانچہ آیہ ولقد راودته عن نفسه فاستعصم سے بالکل صاف طور پر واضح ہو رہا ہے۔ پھر زیادہ صراحت کے ساتھ یوں کہا: "أنا راودته عن نفسه وانّه لمن الصادقين"

اس میں ضمیر متکلّم انا کی تقدیم سے اس امر کا حصر پایا جاتا ہے کہ معاملہ صرف زلیخا کے اغوا تک محدود تھا اور بس اور آپ کی بریت کو قطعی ظاہر کرنے کے لئے ابتداء میں لام موکّدہ اور جملہ اسمیہ کا لانا یقینی شہادت ہے کہ آپ ظاہر و باطن میں معصوم رہے۔ اس مقام کو یوں ہی سمجھنا چاہیئے۔

س۔ کیا کسی قرآنی آیت یا حدیثِ صحیح سے اس امر کا پتہ لگ سکتا ہے کہ دنیا کی مدت عمر کس قدر ہے؟ حالانکہ مرزا قادیانی کے مرید اس امر کے مدعی ہیں کہ دنیا کی مدت عمر سات ہزار سال ہے۔ چنانچہ میرزا مذکور نے اپنے مسیح ہونے کی دلیل اسی خیال پر قائم کی ہے۔ بینوا توجروا۔ [1]

ج۔ الہدیٰ میں بار بار اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن و سنت کو چھوڑ کر اپنی و آنکی رائے کے پیچھے دوڑے پھرتے ہیں وہ کبھی حق کو نہیں پا سکتے۔ شریعتِ اسلامی میں کوئی امر جو انسان کو بحیثیت انسان کے دینی و دنیوی طور پر مفید ہو سکتا ہو مہمل نہیں چھوڑا گیا۔ شریعت کے بعض احکام اوامر ہیں اور بعض نواہی اور ایک حصہ معتقدات کا ہے سو ہر ایک پہلو میں شریعت اسلامی بزمانۂ نبوت مفصل اور مبین ہو چکی تھی۔ جزئیات اجتہادیہ کا چونکہ انحصار ناممکن تھا اسلئے ائمہ مجتہدین کے لئے استنباط کا دروازہ کھلا ہے۔ جن امور کو شریعت اسلامی نے بیان نہیں کیا اسکے بیان کرنے کی در حقیقت انسانی ترقیات کے لئے کوئی ضرورت نہ تھی۔ وقوعِ قیامت کی بابت لوگ بار بار تعیینِ وقت کا سوال کرتے مگر از بسکہ اس امر کا اظہار منافیٔ حکمتِ الٰہی تھا۔ اس لئے انہیں ہمیشہ یہی جواب ملتا رہا کہ تعیینِ زمانۂ وقوع کے متعلق تمہاری کوئی غرض وابستہ نہیں۔ تمہیں ایمان و اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ بہم پہنچانا چاہیئے جن پر مدارِ نجات ہے اور وقوعِ قیامت اپنے وقت پر ہی رہے گا اور ایک آیت میں یوں بھی ارشاد ہوا کہ انہیں کہہ دو کہ مجھے اسکے قرب و بُعد کا علم نہیں۔ ہاں خدا نے اسکے وقوع کی یقینی خبر دی ہے البتہ شریعتِ اسلامی نے چند اشراط (علامات) کا پتہ دیا ہے جن کو بعض نئے نئے فرقے مختلف تاویلات میں ظاہر کرتے ہیں جو ہرگز قابلِ اعتبار نہیں مگر کہیں کسی آیت یا حدیث سے تعیینِ مدت دنیا کا پتہ نہیں لگتا۔ چونکہ رسول ؐ نے اس امر میں سکوت کیا ہے اس لئے کسی دوسرے شخص کا بلا حجت قطعی تعیینِ مدت کا مدعی ہونا عین

[1] الہدیٰ؛ ج ۳ ع ۳ ص ۳۹ ۔ ۴۰

ضلالت ہے کیونکہ یہ امر اجتہادی تو ہو نہیں سکتا اور قرآن و حدیث اس بارے میں ساکت ہیں تو لامحالہ
کسی کا کشف و الہام ہوگا اور یہ مسلم ہے کہ کشف و الہام بجز نبی اللہ کے کوئی حجت نہیں ہوتا اسلئے
دنیا کی مدت العمر کا دعویٰ محض ظن فاسد کی پیروی ہے جس پر کسی نتیجہ کو مترتب کرنا از قبیل بناء الفاسد
علی الفاسد ہے اور تعجب ہے کہ جس عقیدہ کی بابت جناب پیغمبر کو وحی یا الہام نہیں ہوا کسی دوسرے کو کیونکر
ہو سکتا ہے اور اگر ہوگا تو اس کو کہاں تک منجانب اللہ کہا جائے گا کیونکہ جب شریعت نے اس کے بیان
سے سکوت کیا ہے تو کسی شخص کا مدعی ہونا مخالف شریعت ہوگا نہ موافق شریعت اسلئے کوئی الہام
مخالف شریعت دوبارہ معتقدات یا احکام منصوصہ ہرگز قابل سماعت نہیں۔ ایسے مدعی سے دلیل
شرعی کا مطالبہ کرنا چاہئے ورنہ بلا حجت غل غپاڑہ ہے۔

اس قدر لکھ چکنے کے بعد علامہ ابن حزم ظاہری کی کتاب ملل و نحل میں ہمیں اس مسئلہ کے متعلق چند
فقرات پڑھنے کا موقع ملا وہ لکھتے ہیں کہ "لوگ اسکے متعلق اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ یہود کہتے ہیں کہ
دنیا کی عمر چار ہزار کچھ زائد سال ہے اور نصاریٰ کا خیال ہے کہ پانچ ہزار۔ مگر ہم اہل اسلام کسی خاص مقدار
مدت کے لئے ہرگز تعیین نہیں کرتے اور جو شخص سات ہزار یا کم و بیش کا مدعی ہے وہ جھوٹا ہے کیونکہ
جناب پیغمبر علیہ السلام سے اس بارے میں کوئی حدیث مروی نہیں بلکہ جو کچھ پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے وہ صرف
یہ ہے کہ دنیا کی مدت عمر کو بجز عالم الغیب کے کوئی شخص نہیں جانتا۔ آیۂ کریمہ:

"ما اشہدتہم خلق السموٰت والارض ولا خلق انفسہم"

(میں نے انکو یعنی مارنے والوں) کو زمین و آسمان اور خود ان کو پیدا کرتے وقت حاضر نہیں کر لیا تھا)
سے ایسے ایسے دعووں کی پوری پوری تکذیب ہو جاتی۔ اور ایک حدیث میں یوں وارد ہے
"بعثت انا والساعۃ کھاتین" یعنی میں ایسے وقت میں مبعوث ہوا ہوں کہ میرے
زمانہ اور قیامت سبابہ اور وسطیٰ ہر دو انگلیوں کی سی نسبت ہے۔ حضور کی مراد ان الفاظ
سے صرف شدت قرب زمانہ ہے اور بس۔ سو ایک صحیح الاعتقاد مسلمان کے لئے وہی مذہب اسلم
ہے جو قرآن و سنت سے مستنبط ہے اور ادھر ادھر کی باتیں ہرگز قابل اعتبار نہیں (ملل و نحل
ابن حزم ۲: ۱۰۵)

س ۔ ایک شخص کہتا ہے کہ اجنبی عورتوں میں نشست و برخاست کرنے اور علیحدہ خلوت میں
انکے ساتھ موجود ہونے سے اسکو شیطانی وساوس اور دیگر امور ممنوعہ کی بابت اطمینان ہے اسلئے وہ
مطلقاً اجتناب نہیں کرتا۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے ؟ [1]

ج ۔ ایسا شخص فاسق و فاجر ہے کیونکہ حدود شرعیہ کو توڑتا ہے ۔ شیطان کو انسان سے
ایسا قریبی تعلق ہے جیسا خون کو اسکی رگوں سے جن میں خون دوران کرتا ہے اور کوئی شخص اسکی
زد سے محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ بے شک قرآن مجید میں یوں وارد ہے :

" اِنَّ عِبَادِی لَیسَ لَکَ عَلَیہِم سُلطَان "

(میرے برگزیدہ بندوں پر تجھے غلبہ نہیں ہوگا) مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ وہ ابتلاء
خداوندی سے محفوظ رہ سکے اور نہ اس سے حدود کا توڑنا جائز ثابت ہوتا ہے انسان جب تک اس
ھیکل عنصری کی شکل میں موجود ہے وہ ہمیشہ یکساں طور پر امر و نہی کا مخاطب ہے خواہ وہ کسی
مقام تک ترقی کر جائے ایسا خیال نفس امارہ کا دھوکا ہے اور اسے روکنا چاہیئے ۔

[1] الھدیٰ ؛ ج ۳ ع ۳ ص ۷

س ۔ تاریخ اسلامی شہادت دیتی ہے کہ زمانۂ معراج نبی صلعم میں مسجد اقصیٰ ویران پڑی تھی ۔ پھر قرآن مجید کی آیت " سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ " .... الخ کی صحیح توجیہ کیا ہو گی؟ یہ اعتراض درحقیقت ایک غیر مذہب کے مخالف کا ہے ۔ مگر عوام الناس کے اطمینان کے لئے جواب کی ضرورت ہے ۔ [1]

ج ۔ یہ اعتراض بالکل بے معنی ہے اور اسکی کچھ وقعت نہیں کیونکہ وہ مقام جو مسجد اقصیٰ کے نام سے مشہور ہے کئی دفعہ منہدم ہوا اور کئی دفعہ از سر نو تعمیر ہوا مگر ہر حالت میں اس کا نام متغیر نہیں ہوا کیونکہ وہ مقام ہمیشہ (ہیکل سلیمانی ؑ) کے نام سے مشہور رہا ہے اور ہیکل کے بار بار ویران ہونے اور تعمیر ہونے کا ذکر کتب تواریخ میں آچکا ہے بہر صورت وہ مقام مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں موجود رہا ہے مگر اس کا نام نہیں بدلا ۔ چنانچہ یہود نے ایک بار مشتری ستارہ کا ہیکل کھڑا کر دیا مگر اس کا اصلی نام پھر بھی متغیر نہ ہوا ۔ البتہ اگر معترض یہ اعتراض کرتا کہ اس مقام کو مسجد کیوں کہا گیا تو ایک بات تھی سو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ مسجد کا اطلاق ایسا ہی ہے جیسے حرم مکہ پر قبل از فتح مسجد کا لفظ بولا گیا حالانکہ فتح تک خانہ کعبہ میں بت چنے پڑے تھے اور یہ استعمال باعتبار حالت ماضیہ کے بالکل صحیح تھا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی بنا اور سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی بنا محض عبادت کے لئے قائم کی تھی اور بعد میں بھی یہ ہر دو مقامات مسجد ہی تھے اور اگر زمانہ معراج نبوی میں وہ عمارت منہدم ہو گئی تھی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بالکل جنگل اجاڑ پڑی تھی ۔ پس حضور علیہ السلام کا حلقہ در سے براق کا باندھنا جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہے (خواہ معراج جسمانی ہو یا روحانی) کسی صورت میں منافی نہیں ہو سکتا ۔ کچھ ہو اعتراض مذکورہ بالا کوئی وزنی بات نہیں ۔

[1] الہدیٰ ؛ ج ۳ ع ۱۱ ص ۳۰ - ۳۱

س۔ مستورات کے لئے لکھنا سیکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ [1]

ج۔ بظاہر کوئی ممانعت اس امر میں وارد نہیں ہوئی۔ ہاں ایک حدیث میں جس کو حاکم نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بدیں الفاظ ممانعت آئی ہے: لا تعلّموا النساء الکتابة ولا تنزلوهنّ الغرف مگر ائمہ حدیث نے لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے کیونکہ اس کے اسناد میں عبدالوہاب بن ضحاک حمصی ہے۔ جس کی بابت ابو حاتم رازی لکھتے ہیں کان یکذب اور عقیلی اور نسائی لکھتے ہیں متروک الحدیث ابن حبان تو صاف لکھتے ہیں کان یسرق الحدیث لا یحل الاحتجاج بہ اور دارقطنی لکھتے ہیں منکر الحدیث۔ ابوداؤد لکھتے ہیں یضع الحدیث۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: متروک کذّبہ ابوحاتم۔ الغرض حدیث مذکورہ بالا کا صرف معرض روایت میں آنا اسکی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا بلکہ اسکے برخلاف حدیث ذیل سے مستورات کے لئے کتابت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ قال علیہ السلام للشفاء بنت عبداللہ وھی حفصة الا تعلّمین ھذہ رقیة النملة کما علمتها الکتابة۔ اس حدیث سے صاف طور پر جواز کتابت ثابت ہو رہا ہے عقلی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک کام میں فوائد بھی ہیں اور نقصان بھی۔ اگر کوئی شخص اس کتابت کے متعلق چند نقصانات کا ذکر کرے گا تو اس کے فوائد بھی ضرور اسے تسلیم کرنے پڑیں گے اور موجودہ زمانہ میں تو کسی قدر خصوصیت کے ساتھ کتابت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ بے شک ہم مستورات کے لئے تعلیم مروجہ کے سخت مخالف ہیں اور نہ صرف مخالف بلکہ اسکو شرعاً حرام مطلق کہتے ہیں، مگر نہ عام طور پر کیونکہ تعلیم کی ضرورت مرد اور عورت ہر دو کے لئے یکساں ہے بلکہ ہم اسکی اس نوعیت کو جسکو بعض مغربی تہذیب کے معاون اصحاب بلا سوچے سمجھے پیش کیا کرتے ہیں، تسلیم نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۳ ع ۱۱ ص ۳۱-۳۲

س۔ آیۂ فلمّا آتاھما صالحاً کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے بعض توجیہات قلمبند کی ہیں جو معترض کے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔ اس آیۂ شریفہ کی تفسیر بوجہ تفصیل لکھیں تاکہ تسلی ہو کیونکہ اس آیت کے رو سے آدم اور حوا علیہما السلام کا مشرک ہونا لازم آتا ہے۔ معاذ اللہ [1]

ج۔ سیاق و سباق آیت مسطورہ بالا حسب ذیل ہے:۔

" ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ و جعل منھا زوجھا لیسکن الیھا فلمّا تغشّاھا حملت حملاً خفیفاً فمرّت بہ فلمّا اثقلت دعوا اللّٰہ ربّھما لئن اٰتیتنا صالحاً لنکونن من الشّٰکرین فلمّا اٰتٰھما صالحاً جعلا لہٗ شرکاء فیما اٰتٰھما۔ فتعٰلی اللّٰہ عمّا یشرکون۔ "

مفسرین نے اس آیت میں نفس واحدہ اور زوجہا سے آدم و حوا علیہما السلام مراد لئے ہیں اور یہی منشاء اعتراض بھی ہے۔ ورنہ آیت اپنے معنی کے رو سے بالکل صاف ہے۔ اگر ہم نفس واحدہ سے روح انسانی مراد لیں جس طرح کہ بعض دیگر آیات میں یہی مضمون وارد ہو چکا ہے۔ مثلاً ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ اور دوسری جگہ یوں آیا ہے۔ خلقکم من نفس واحدۃ ثم جعل منھا زوجھا۔ تو کچھ شک نہیں کہ آیۂ مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی ایک عام حالت کا اظہار کیا ہے جو ہر ایک ایسے زن و شوہر پر صادق آسکتی ہے جو ایسا کریں اس لئے آیہ شریفہ کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی نوع کی روح انسانی سے انسان کو پیدا کیا اور اسی روح سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ دونو باہم مانوس ہوں۔ پھر عورت کے حاملہ ہونے پر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں التجا کرتے ہیں کہ اگر انہیں اللہ تعالیٰ اولاد صالح عطا فرمائے گا تو وہ اس کا شکر ادا کریں گے۔ آخر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے نام رکھتے [2] میں خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں یا بتوں کے نام پر ان کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اس صورت میں آیۂ مسطورہ بالا صحیح طور پر آیت ذیل کی نظیر ہوگی۔

[1] الھدایہ؛ ج ۳ ع ۱۱ ص ۳۲ — ۳۴

[2] عربوں کا قاعدہ تھا کہ بجائے عبد اللہ کے عبد العزیٰ۔ عبد مناف۔ عبد اللات وغیرہ بچوں کے نام رکھا کرتے تھے۔

فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین فلمّا نجّاھم الی البرّ اذا ھم یشرکون ۔

یعنی جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو نہایت اخلاص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں دعائیں کرتے ہیں پس جب نجات پا کر خشکی پر آجاتے ہیں تو وہی مشرک کے مشرک یعنی اپنی نجات کو اسباب عادیہ کا نتیجہ سمجھنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا خیال ہی نہیں لاتے ۔ مذکورہ بالا تفسیر قرآن مجید کے اس اسلوب بدیع پر مبنی ہے جس کی رو سے وہ امور کلیہ کا ذکر کرتے کرتے واقعات جزئیہ کو بیان کرنے لگ جاتا ہے کیونکہ قواعد و احکام کے اس طور پر پیش کرنے کو طبائع بہت جلد قبول کرتی ہیں اور کہیں کہیں اسلوب مذکورہ کا عکس بھی دیکھا گیا ہے ۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے زوجین کے پیدا کرنے کی حکمت کے بعد ان کی اور ان کی نسلوں کی کفران نعمت کا ذکر فرمایا ہے ۔ گویا نوج اور زوجہ کا آیت مذکورہ بالا میں کوئی مفہوم معین ہے ۔ یعنی بالخصوص آدم و حوا یا زید و ہندہ ہی مراد نہیں بلکہ غیر معین زوجہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس قسم کا شرک کریں ۔ امام رازی نے اس آیت میں نفس واحدہ اور زوج کے لفظ سے آدم و حوا علیہما السلام مراد نہ ہونے پر بڑا زور دیا ہے اور یہی آیۂ مذکورہ بالا کی صحیح توجیہ ہے ۔ بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا اور حارث گروہ ملائکہ میں شیطان کا نام تھا ۔ وجہ اسکی یہ ہوئی کہ حوا علیہ السلام کے ہاں جو بچہ پیدا ہوتا وہ مر جایا کرتا تھا ۔ شیطان نے آکر کہا : کہ اس کا نام عبدالحارث ہونا چاہیے ۔ چنانچہ یہی نام رکھا گیا ۔ وہ بچہ زندہ رہا ۔ اس روایت کے رو سے آیت کے معنی نفس واحدہ اور زوج سے آدم و حوا علیہما السلام مراد لینے سے صحیح ہو جاتے ہیں اور کوئی اشکال باقی نہیں رہتا ۔ مگر محدثین نے اس حدیث میں گفتگو کی ہے ۔ البتہ ترمذی اور حاکم نے اس کو حسن اور صحیح لکھا ہے ۔ واللہ اعلم

س ۔ حدیث لو علم العباد ما فی رمضان لتمنّت اُمّتی ان یکون رمضان السنۃ کلّھا کی بابت محدثین نے کیا لکھا ہے ؟ بعض واعظین اسکو وعظ میں سنایا کرتے ہیں ۔ کیا بصورت اس کے موضوع یا ضعیف ہونے کے ایسا جائز ہے ؟ [1]

ج ۔ اس حدیث کو محدثین نے موضوع قرار دیا ہے ۔ جریر بن ایوب اسکے اسناد میں پڑتا ہے قاضی شوکانی لکھتے ہیں :

وسیاقہ وسیاق الذی قبلہ ما یشہد العقل بانّہما موضوعان فلا معنی لاستدراک السیوطی لہما علی ابن الجوزی بانہ قد رواھا غیر من رواھا عنہ ابن الجوزی فان الموضوع لا یخرج عن کونہ موضوعاً بروایۃ الرواۃ ۔

وعظ میں کسی حدیث ضعیف کو بطور ترغیب پیش کرنا منع نہیں احکام میں سخت احتیاط درکار ہے ۔ موضوع کا ذکر کسی صورت میں صحیح نہیں ۔

س ۔ فرقہ باطنیہ (جسکا ذکر کبھی کبھی الہدیٰ میں ضمناً آیا ہے) کے عقائد کیا تھے اور کیا اب بھی اس فرقہ کے لوگ پائے جاتے ہیں ۔ [2]

ج ۔ فرقہ باطنیہ کے معتقدات میں امام ابن حزم ظاہری اور علامہ عبدالکریم شہرستانی اور محدث ابن جوزی وغیرہ کے تصانیف بھری پڑی ہیں ۔ ہم بطور مشتے نمونہ از خروارے ذیل میں انہیں کی کتابوں سے کچھ ترجمہ لکھتے ہیں ۔ میرزا قادیانی کے اکثر عقائد کا منبع یہی فرقہ باطنیہ کے عقائد ہیں

---

[1] الہدیٰ ؛ ج ۳ ع ۱۱ ص ۳۶

[2] الہدیٰ ؛ ج ۳ ع ۱۱ ص ۳۶ — ۴۰

شیخ ابو حامد الطوسی نے کہا کہ باطنیہ ایک قوم ہے جو منہ سے تو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کے عقائد و اعمال بالکل اسلام سے مخالف و مباین ہیں اور ظاہر میں رفض کی طرف مائل ہیں۔ ان کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ خدائے قدیم دو ہیں اور زمانے کے لحاظ سے ان کے وجود کی ابتداء نہیں ہے ولیکن باوجود اس کے ایک علت ہے دوسرے کے واسطے اور کہتے ہیں جو سابق ہے اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وجود ہے یا عدم ہے نہ موجود ہے نہ معدوم ہے اور نہ مجہول ہے نہ معلوم ہے اور نہ موصوف ہے نہ غیر موصوف ہے اور اسی سابق سے دوسرا پیدا ہوا اور یہ اول موجد ہے۔ پھر نفس کلیہ کا وجود ہوا۔ ان کے نزدیک نبی ایک ایسا شخص ہے جس پر خدائے اول سے بواسطہ خدائے دوم کے قوت قدسیہ صافیہ فائض ہوتی اور کہتے ہیں کہ جبرائیل اس عقل کو کہتے ہیں جو نبی پر فائض ہوتی۔ وہ کوئی ذات نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اسی نبی کے مثل امام معصوم ضرور ہونا چاہئیے جو حق کے ساتھ قائم ہو اور وہی ظاہر کی تاویل بتلایا کرے اور کہتے ہیں کہ آخرت و قیامت کوئی چیز نہیں ہے بلکہ کہتے ہیں کہ معاد کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز اپنی اصل کی طرف عود کرے اور نفس بھی اپنے اصل کی طرف لوٹا کرتا ہے اور رہا شرع سے مکلف ہونا تو کہتے ہیں کہ ہر چیز مطلقاً مباح ہے اور جو چیزیں حرام کہی جاتی ہیں سب مباحات ہیں ولیکن جب موقع پاتے ہیں اس سے انکار کرتے کہتے ہیں کہ ہمارا قول یہ ہے کہ انسان کے واسطے مکلف ہونا ضرور ہے۔ مگر جب وہ حقائق اشیاء سے ماہر ہوا اور ان ظاہری نصوص کے معنی باطنی ہے تب اس پر کوئی تکلیف نہیں رہتی ہے اور چونکہ وہ لوگوں کو قرآن و حدیث سے منحرف کرتے ہیں عاجز تھے اس لئے یہ مکر گانٹھا کر اپنی ملمع کی ہوئی باتوں میں پھنسا کر انہیں قرآن و حدیث سے بعید دیں کیونکہ اگر پہلے ہی سے قرآن و حدیث سے انکار کی تصریح کرتے تو عوام الناس قبول نہ کرتے اور کہتے ہیں کہ جنابت جس سے غسل لازم آتا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ علم باطن کا نطفہ ایسے شخص کے پیٹ میں ڈالے جس سے سابق میں عہد لیا گیا ہے اور صوم (روزہ) کے یہ معنی ہیں بھید کو لینے سے جی روک رکھے۔ کعبہ نبی ہیں اور باب علی رض ہیں۔ طوفان سے مراد طوفان علم ہے۔ جس میں مشتبہ کے ساتھ تمسک کرنے والے غرق کئے گئے۔ سفینہ وہ جزیرہ ہے جس میں نوح کی دعوت قبول کرنے والے محصور ہوئے تھے۔ نار ابراہیم سے مراد نمرود کے غصہ کی آگ تھی وہی یہ حقیقی آگ مراد نہیں ہے۔ اسحاق کو ذبح کرنے سے یہ مراد ہے کہ اس سے عہد جدید لیا گیا۔ عصائے موسیٰ سے مراد انکی دلیل و حجت ہے۔ یاجوج ماجوج سے مراد علمائے ظواہر ہیں۔ واضح ہو کہ سوائے ابو حامد رح کے دوسروں نے ذکر کیا کہ باطنیہ کہتے ہیں کہ خدا نے جب ارواح کو پیدا کیا تو خود بھی ان میں ظاہر ہوا اور انہیں کی صورت میں ظاہر ہوا تو کسی نے شک نہ کیا کہ یہ بھی ان میں ایک ہے۔ اور سب

سے پہلے سلمان الفارسی اور مقداد اور ابوذر نے پہچانا اور سب سے پہلے اس سے عمر نے انکار کیا اس سے باطنی ملحد کا نام ابلیس ہوا۔ اسی قسم کے خرافات اس ناپاک فرقہ میں بہت ہیں جنکی مثال میں کہاں تک تضییع اوقات کی جاوے اور ان جیسے لوگوں نے دلیل چھوڑ کر کسی شبہ پر بھی تمسک نہیں کیا تاکہ حق بات ظاہر کرنے کے لئے اُن سے گفتگو ہو بلکہ اُن لوگوں نے تو اپنے ذہن میں ایک مضمون باندھ کر اُسکے موافق سب واقعات گھڑ کے بنالئے ہیں (یعنی شریعت کے اصول قرآن و حدیث اصل ہیں تو ان کے سمجھنے میں جس فرقہ کو غلطی ہوئی اُس کے ساتھ مناظرہ ہوسکتا ہے اور اس فرقہ نے خود روایتیں بنائیں کہ مثلاً خدا نے ایک قرآن فاطمی بھیجا تھا اُس میں یہ صاف لکھا تھا اور اس قرآن میں موجود ہے۔ الم ذالك الكتاب اس سے وہ عہدنامہ مراد ہے جو الف اللہ نے ل جبرائیل و م محمد کی گواہی سے علی رض پر عہد لیا تھا کہ آئندہ تلوار نہ کھینچیں اور ظلم و ذلت برداشت کریں الغرض اسی قسم کے واہیات بنالئے تو ان کو قرآن و حدیث سے کچھ مطلب نہیں بلکہ جو باتیں علم باطنی میں بیان کرتے ہیں تو اس فرقہ سے کیا مناظرہ ہوسکتا ہے) اور اگر اتفاقاً کبھی اس فرقہ سے بحث ہو تو کہے کہ تم نے یہ چیزیں کہاں سے پائیں۔ کیا تم کو بدیہی مل گئیں یا نظر کرنے سے یا کسی امام معصوم سے اگر کہیں کہ بدیہی ہیں تو باطل ہے کیونکہ عقل سلیم والے اُن کے معتقدات کے مخالف ہیں اور بدیہی میں کوئی عقل والا خلاف نہیں کرتا جیسے آفتاب اور اگر خالی دعوے سے کچھ ثبوت ہو تو تمہارا مقابل تمہارے برعکس جو بھی دعوے کرے جائز ہو جائے اور اگر تم نے نظری دلیل سے ثابت کیا تو اس کو تم باطل کہتے ہو کیونکہ وہ عقلی تصرف ہے اور عقلی قضایا تمہارے اصول میں وثوق کے قابل نہیں ہوتے اور اگر کہیں کہ ہم نے امام معصوم سے حاصل کئے تو کہو کہ کیوں تم نے محمد صلعم کا قول شریف جو معجزات متواتر کے ساتھ تھا چھوڑا۔ اور اپنے اس امام معصوم کا قول لے لیا جو بغیر معجزہ ہے اور باوجود اسکے جو کچھ امام معصوم نے بیان کیا شاید اُس کے باطنی معنی ظاہر کے خلاف ہوں۔ پھر ان سے کہا جائے کہ یہ باطن و اسرار جو تم کہتے ہو ان کا چھپانا لازم ہے کہ ظاہر کرنا۔ اگر کہیں کہ ظاہر کرنا واجب ہے تو کہنا چاہئیے کہ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیوں چھپایا اور اگر کہیں کہ چھپانا واجب ہے تو کہنا چاہئیے کہ فرقہ باطنیہ نے اسلام کا نام رکھ کر شرع کو متروک کیا اور اپنی باطنی باطل تفسیریں (خبط بے ربط) کے مدعی ہوئے جن پر کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان دشمنوں نے شرع کی کوئی چیز باقی نہیں رکھی جسکے مقابلہ میں باطنی معنی نہ بنائے ہوں یہاں تک کہ واجب کا ایجاب و ممنوع کی ممانعت بھی ساقط کر دی۔

رہا فرقہ ظاہریہ تو انہوں نے ہر جگہ ظاہر کو لے لیا حالانکہ اسکی تاویل واجب ہے۔ چنانچہ ظاہریہ نے اسماء و صفات میں بھی وہ معنی لئے جو حواس سے اُن کی سمجھ میں آئے اور حق مذہب دونوں مرتبوں میں

دائر ہے یعنی ظاہر کو لے جب تک کوئی دلیل اس سے پھیرنے والی نہ ہو اور رہا باطن جس پر کوئی دلیل شرعی نہ ہو اس کو پھینک دے اور اگر مجھ سے اس فرقہ باطنیہ کے پیشوا سے ملاقات ہوتی تو میں اُس کے ساتھ علمی طریقہ کی گفتگو نہ کرتا بلکہ اس کی سمجھ پر اور اسکی تابعین کی سمجھ پر لعنت ملامت کرتا (یعنی اس حیلہ سے بادشاہ بن جانے کا خیال تمہاری حماقت ہے) مثلاً اس طرح کہتا کہ بادشاہوں کے واسطے خاص خاص طریقے اور تدبیریں ہیں جن سے وہ مقصود پر پہنچتے ہیں اور تم جو ان چند آدمیوں پر امید سلطنت لگائے بیٹھے ہو یہ تمہاری حماقت ہے اور تم جان لو کہ یہ ملتیں جنہوں نے زمین کو بھر لیا ہے ان میں سب سے زیادہ قریب اور مناسب شریعت اسلام ہے جس کے نام سے تم قوت پاتے ہو اور اپنی حماقت سے اس کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہو اس کو اللہ تعالیٰ نے کامل غلبہ دیا ہے اس کے بگاڑنے کی طمع بھی حماقت ہے بھلا زائل کرنا تو دور رہا چنانچہ ہر سال اُس کا ایک مجمع عظیم عرفات میں ہوتا ہے اور ہر جمعہ کے روز مساجد جامع میں اور ہر روز پانچوں وقت مساجد عام میں ہوتا ہے تو تم اپنی نفوس خبیث میں یہ منصوبے کہاں سے باندھتے ہو کہ اس معتمد عظیم کو گڑبڑ کر دو گے اور کیسے اس امر ظاہر کا نور دھندلا کر دو گے جو جہان میں ظاہر ہے ہر روز ہزاروں مناروں پر یہ اذان دی جاتی ہے کہ اشہد ان محمدًا رسول اللہ اور رہا تمہارا حال تو تمہاری انتہا یہ ہے کہ کسی خلوت خاصہ میں اپنا کچھ منصوبہ بیان کر دیا کسی قلعہ میں چند لوگوں کے پیشوا بن جاؤ۔ اگر تمہارے مردہ دلوں سے کوئی کلمہ باہر نکلے تو تمہارا سر اڑا دیا جاوے اور کتوں کی طرح مار ڈالے جاؤ تو کب کسی عاقل کو یہ خیال ہوگا کہ جو منصوبہ تم نے باندھا ہے وہ اس امر کلی پر جسنے آفاق کو گھیر لیا ہے غالب آوے گا۔ پس مجھ کو تم سے کوئی زیادہ احمق نہیں معلوم ہوا بالجملہ میں پہلے امر میں سے ایسے کلمات کہوں یہاں تک کہ براہین عقلیہ سے مناظرہ کی نوبت آوے۔ **فصل** مصنف نے کہا کہ پچھلے باطنیہ کی فساد کی چنگاری ۴۹۴ھ ہجری میں بھڑکی تو سلطان برکیارق نے ان میں سے بہت لوگوں کو قتل کیا جن میں باطنیہ کا مذہب ظاہر ہوتا تھا پس مقتولوں کی تعداد تین سو سے اوپر تک پہنچی اور ان کے اموال لوٹ لئے گئے تو ان میں بعض کے پاس بندھے ہوئے موتیوں کے ستر خانے ظاہر ہوئے اور اس بارہ میں خلیفہ کو ایک عرضی لکھی گئی۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ جن میں اس مذہب کا گمان بھی کیا جائے ان کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ لوگ گرفتار ہوئے اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ کسی کے واسطے سفارش کرے اس خوف سے کہ سفارشی پر یہ شبہ نہ ہو کہ ان کے مذہب کی طرف مائل ہے اور عوام نے جس کو چاہا اور جس سے جس کے دل میں کچھ رنجش تھی اسکی مخبری کر دی کہ اسی مذہب میں ہے تو وہ فوراً قتل کر دیا جاتا اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جاتا اور سب سے پہلے سلطان

جلال الدولہ ملک شاہ کے زمانے میں باطنیہ کا حال کھلا کہ انہوں نے مجتمع ہو کر ساوہ میں عید کی نماز پڑھی اور
شہر کے کوتوال کو اس سے آگاہی ہوئی اُس نے اُن کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈالا پھر اس کے بعد ان کو رہا کر
دیا انہوں نے ساوہ کے ایک موذن کو دھوکا دیا اور اسے اپنے مذہب میں شامل کرنے کی بے حد کوشش کی
اُس نے انکار کیا تو ڈرے کہ شاید وہ اُن کی چغلی کھائے۔ لہذا اُس کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ یہ خبر نظام
الملک وزیر کو پہنچی تو اس نے ان لوگوں کے قتل کرنے میں پیش قدمی کی جو اس مذہب کے ساتھ متہم تھے
چنانچہ متہم لوگ قتل کئے گئے پھر ایک بڑھئی متہم تھا وہ مارا گیا پھر انہوں نے ایک مدت بعد نظام الملک کو
دھوکے سے مارا اور بعد اسکے کہنے لگے کہ تم نے ہم میں سے بڑھئی مارا ہم نے اُس کے عوض میں نظام الملک مارا اور
جب ملک شاہ نے انتقال کیا تو اصفہان میں اس فرقہ کا زور بڑھ گیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ آدمی کو چرا
کر قتل کر ڈالتے اور کھتے میں ڈال دیتے پھر تو یہ تہلکہ پڑا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی آدمی عصر کے قریب
تک نہ آگیا تو اس سے مایوس ہو جاتے اور لوگوں نے وہ مقامات تلاش کئے جہاں اس قسم کی کارروائیاں
ہوا کرتی تھیں تو انہوں نے ایک مکان میں ایک عورت کو پایا جو ہمیشہ ایک بوریئے پر بیٹھی رہتی تھی وہاں
سے نہیں ٹلتی تھی لوگوں نے اس کو گھسیٹ کر الگ کیا اور بوریا اُٹھایا تو اسکے نیچے کھتے میں چالیس مقتول
پائے اور اس عورت کو مار کر گھر اور محلہ جلا دیا اور اس احاطہ کے کوچہ کے دروازہ پر ایک اندھا بیٹھا
بھیک مانگا کرتا۔ جب اُدھر کوئی مسلمان شخص گزرتا تو اُس سے درخواست کرتا کہ للہ مجھے چند قدم ہاتھ
پکڑ کر اس احاطے تک پہنچا دے وہ مسلمان اُس اندھے بے ایمان کو لے جاتا جیسے ہی احاطہ تک پہنچا کر
احاطہ میں کھینچ لیا گیا اور احاطہ والے اُس پر غالب آگئے۔ آخر مسلمانوں نے بڑی کوشش سے ان لوگوں
کو تلاش کیا اور اصفہان میں ایک بڑا ہنگامہ اور قتل عام ہوا۔ پہلا قلعہ جو باطنیہ کے قبضہ میں آیا وہ
قلعہ رودبار تھا جو نواح دیلم میں ہے اور یہ قلعہ ملک شاہ کے مصاحب قماج کے قبضہ میں تھا وہ اس
کو اس قوم کے مذہب کی حفاظت و اہتمام کے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ آخر اُس نے ایک ہزار دو سو اشرفیاں
لے کر ۴۸۳ھ میں زمانہ ملک شاہ میں قلعہ اس قوم کو سپرد کر دیا اور ان کا سردار حسن بن الصباح
تھا جو اصل میں مرو کا رہنے والا تھا اور ابتداء میں جب وہ لڑکا تھا تو رئیس عبدالرزاق بن بہرام کا منشی
تھا۔ پھر مصر گیا اور وہاں داعی اسمعیلیہ سے یہ مذہب سیکھ کے واپس آیا اور اس قوم کا سردار بن گیا
اور آخر یہ قلعہ حاصل کیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر ایک احمق جاہل کو جس کو دائیں بائیں کا شعور نہیں ہوتا

اور امور دنیا سے بالکل بے خبر ہوتا اُس کو اپنے دام فریب میں لیتا اور بادام اور شہد اور کلونجی کھلاتا جب اس
کا دماغ گرم ہو جاتا اُس سے بیان کرتا کہ حضرت مصطفےٰ کے اہل بیت پر ایسا ظلم و عدوان ہوا ہے اور بہت سی
اس قسم کا جھوٹ اور سچ بیان کرتا حتی کہ اُس کے ذہن میں جم جاتا پھر کہتا کہ ازارقہ و خوارج نے بنی امیہ کے قتال
میں اپنی جانیں فدا کیں تو کیا سبب ہے کہ تم حق پر ہو کر اپنی جان دینے میں بخل کرتے اور امام کی مدد نہیں کرتے ہو
غرضیکہ اس حیلہ سے اُس کو درندوں کا لقمہ بناتا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی نے اس شخص حسن بن الصباح کے
پاس ایلچی بھیجا تھا کہ اطاعت اختیار کرے اور سرکشی کے بد انجام سے ڈرایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اپنے لوگوں کو
امراء و علماء کے قتل کے واسطے ملک میں پراگندہ نہ کرے۔ جب ایلچی پہنچا تو اُس نے کہا کہ اس کا جواب یہ ہے
جو تم آنکھوں سے دیکھو پھر اُس نے ایک جماعت سے جو اُس کے سامنے کھڑی تھی کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم
کو تمہارے مولا کے پاس روانہ کروں تو تم میں سے کون شخص اس کام کے لئے اٹھتا ہے پس ان لوگوں میں
سے ہر ایک جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سلطانی ایلچی سمجھا تھا کہ وہ انکے ہاتھ پیغام بھیجنا چاہتا ہے پھر
اُس نے اُن میں سے ایک جوان سے کہا کہ اپنے آپ کو قتل کر۔ اُس جوان نے فوراً چھری نکال کر اپنے دل پر
ماری اور مردہ ہو کر گر پڑا۔ پھر اُس نے دوسرے سے کہا کہ اپنے آپ کو قلعہ سے نیچے گرا دے وہ فوراً ایوان قلعہ
سے نیچے کود پڑا اور پاش پاش ہو گیا۔ پھر اُس نے سلطانی ایلچی سے کہا کہ اس قسم کے لوگ میرے پاس بیس
ہزار ہیں اور ان کی فرمانبرداری میرے حق میں ایسی ہے اور تیرے پیغام کا یہی جواب ہے پس ایلچی نے آکر سلطان
سے یہ حال بیان کیا تو بادشاہ متعجب ہوا اور اُن لوگوں سے تعرض نہ کیا اور رفتہ رفتہ اس قوم کے ہاتھ میں
بہت سے قلعے ہو گئے پھر انہوں نے بہت سے امراء اور وزراء کو قتل کیا۔

س ۔ اراضی وقف میں بیپل کا درخت ہے متولی کو اسکا خرید کر کے اپنے مصرف میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ [1]

ج ۔ بیپل پھل دار درخت نہیں ۔ اس لئے وہ زراعت کا حکم رکھتا ہے اور اکھیڑنے سے پہلے یا پیچھے اس کی بیع جائز ہے خریدار متولی ہو یا کوئی غیر ۔ غرض صرف جواز اصل بیع سے ہے وفی البزازیہ عن الفضلی ان لم تکن مثمرۃ یجوز بیعها قبل القلع لانه غلتها والمثمرۃ لا تباع الا بعد القلع الوقف الخ (رد المحتار شامی ۳: ۳۹۴)

س ۔ مال زکوٰۃ سے آلات طبابت خرید کر کے کسی طبیب کے تصرف میں دے دینا تاکہ عوام کو فائدہ پہنچے اور خود زکوٰۃ دینے والا بھی گاہے گاہے منتفع ہو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ [2]

ج ۔ اگر طبیب مذکور فقیر مسلم ہو یعنی مصارف زکوٰۃ میں شرعاً داخل ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ کا دینے والا اگر بقصد تملیک دیتا ہے جس سے وہ آلات طبیب کا ملک ہو جائیں اور وہ اپنی مرضی سے ان آلات کو بیع و ہبہ کر سکے تو کچھ شک نہیں کہ بقدر اس مال کے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی ۔ بعد میں خواہ کوئی شخص اس سے منتفع ہو جائز ہے ۔ اگر مذکورہ بالا طریق پر تملیک متحقق نہیں تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی ۔

هی تملیك خرج الاباحة فلو اطعم يتيما ناويا الزكوٰة لا يجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم كما لو كساه بشرط ان يعقل القبض (در مختار مختصراً)

---

[1] الهدى ؛ ج ۴ ع ۴ ص ۳۵ - ۳۶

[2] الهدى ؛ ج ۴ ع ۴ ص ۳۶

س۔ زید اپنے پدر بکر کی وصیت کے مطابق خالد کو حج بدل کرنے کے لئے بیت اللہ شریف کو روانہ کرتا ہے۔ تب اخراجات ضروریہ کے علاوہ خالد کو اس سفر پر اجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟ [1]

خالد حج کے اخراجات ضروریہ کے علاوہ اجرت لینے کا مستحق نہیں اور اگر انہوں نے ناواقفیت کی وجہ سے باہم عقد اجارہ کر لیا تھا تو پھر بھی خالد اخراجات سے زیادہ نہیں لے سکتے۔ ومثله ما فی البحر عن الاسبیجابی لا یجوز الاستیجار علی الحج فلو دفع الیه الاجر فحج یجوز عن المیت وله من الاجر مقدار نفقة الطریق ویرد الفضل علی الورثة الا اذا تبرع به الورثة (رد المحتار شامی ۲: ۲۴۶)

س۔ ملک ہندستان (جس میں اسلامی ریاستیں بھی داخل ہیں) کی اراضیات عُشری ہیں یا خراجی اور ان میں کیا امتیاز ہے؟ [2]

ج۔ عُشری اور خراجی کی تفصیل تو کتب فقہ میں ہے۔ ہندستان کی زمین جس میں ریاست ہائے اسلامیہ وغیرہ بھی شامل ہیں خراجی ہے عشری نہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث اور ملا جلال تھانیسری وغیرہ نے اس کی تصریح کر دی ہے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی مالا بد منہ کی کتاب الزکوۃ میں لکھتے ہیں:

وہمچنیں احکام عشر زمین عشری کہ دریں دیار نیست۔ ومسائل عاشر کہ بر طرق وشوارع باشد مذکور نہ کردہ شد۔

اگر سائل کا منشا صرف اسی قدر دریافت کرنا تھا تو جواب ہو چکا اور اگر کچھ اور ہے تو دوبارہ استفسار کرے

[1] الہدیٰ، ج ۱، ع ۴، ص ۳۶

[2] الہدیٰ، ج ۱، ع ۴، ص ۳۶

س۔ ہندستان دار الحرب ہے یا نہیں؟ اور بینک سود کا حکم شرعی کیا ہے؟ [1]

ج۔ الہدٰی میں پہلے دو تین مضامین اس مسئلہ کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔ فقہاء رحمہم اللہ اجمعین نے جو شرائط دار الحرب کے لئے قرار دئیے ہیں۔ انکے رُو سے ہندستان دار الحرب نہیں ہو سکتا اور اس لئے بینک سود قطعاً حرام ہے۔ جمہور علماء امت کا یہی مذہب ہے۔ اس موضوع کے متعلق ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب ایک مفصل تحریر شائع ہوگی۔

س۔ کیا آیہ یا معشر الجنّ والانس الم یأتکم رسل منکم............ الخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوع جن میں جن انبیاء مبعوث ہوئے ہیں؟ [2]

ج۔ بیشک ظاہر آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن بھی انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ چنانچہ ظاہر آیت پر بعض نے بعثت جن کا حکم لگا دیا ہے۔ مگر جمہور مفسرین کا مذہب اس کے برخلاف ہے اور نوع جن میں انبیاء مبعوث ہونے کے متعلق کوئی دلیل نہیں۔ رہا یہ امر کہ آیت میں خطاب ہر دو نوع انس و جن کو یکساں کیا گیا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی نظیر آیت یخرج منہما اللؤلؤ والمرجان ہے۔ کیونکہ لولو صرف بحر شور سے برامد ہوتے ہیں نہ بحر شیریں سے۔ مگر ظاہر آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو سے لولو برآمد ہوتے ہیں۔

[1] الہدٰی؛ ج ۷ ع ۲ ص ۳۶-۳۷

[2] الہدٰی؛ ج ۷ ع ۲ ص ۳۷

س۔ زکوٰۃ کا روپیہ ان لڑکوں کو جو مدرسہ میں پڑھتے ہیں یا مہتمم مدرسہ کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ [1]

ج۔ اس طالب علم کو جو علم دینیات پڑھتا ہو زکوٰۃ کا روپیہ دینا جائز ہے۔ در مختار میں ہے "اولی طالب علم" اور ایسا ہی عالم فقیر کو جو محتاج ہو۔ نابالغ بچوں کی طرف سے وہ شخص جو ان کا ولی ہو قبول کر سکتا ہے جس سے تملیک ثابت ہو جاتی ہے لیکن اگر بچہ بذاتہ قبض کر سکتا ہو تو حتی الوسع بچہ ہی کو دینا چاہیئے مہتمان مدرسہ موجودہ حالت میں یتیموں اور مفلس بچوں کے ولی ہو سکتے ہیں۔

س۔ کیا قرآن مجید کی تفسیر جو بعض اخبارات لکھتے ہیں پڑھنی چاہیئے یا نہیں؟ [2]

ج۔ موجودہ زمانہ کی تفاسیر اکثر افراط و تفریط سے خالی نہیں ہوتیں۔ احتیاط اسی میں ہے کہ نہ پڑھی جائیں۔ ہاں اگر لکھنے والے کا تقویٰ اور علم قابل اعتماد ہوں تو ڈر نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مفسرین میں اکثر نیچریت آ گئی ہے۔ لہذا میرا اپنا خیال ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

سن کی پیداوار سے ہندوستان کے لوگوں پر عشر کا ادا کرنا واجب ہے اور کس کس چیز پر عشر ادا کرنا چاہیئے۔

---

١ الہدیٰ؛ ج ۴ ع ۵ ص ۳۹ ۔ ۴۰

٢ الہدیٰ؛ ج ۴ ع ۵ ص ۴۰

٣ الہدیٰ؛ ج ۴ ع ۵ ص ۴۰

ج ۔ امام صاحب کے نزدیک ہر ایک قسم کی پیداوار پر عشر کا ادا کرنا واجب ہے ۔ پیداوار ہو یا نہ ہو، کم ہو یا زیادہ ۔ عشری زمین پر کوئی خراج نہیں اور نہ خراجی پر عُشر ۔ مطلب یہ کہ عشر اور خراج ہر دو جمع نہیں ہو سکتے ۔ عالمگیریہ میں ہے:

مگر ہم نے گزشتہ نمبر میں لکھ دیا تھا کہ ہندوستان کی اراضیات عشری قرار نہیں دی گئیں

س ۔ جب اسماء الرجال کی مختلف کتابوں میں ایک راوی کو قابل اعتبار لکھا ہے اور اسی کو دوسری کتاب میں دروغ گو لکھا ہے تو کیونکر صحیح اور غلط کی تمیز ہو سکتی ہے اور اسی بنیاد پر سید صاحب نے حدیث پر چنداں اعتبار نہیں کیا ۔ [1]

ج ۔ بے شک اسماء الرجال کی باقی کتابوں میں بعض راویان کی نسبت ایسا اختلاف مروی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ علمائے محدثین کے پاس صحت احادیث کا کوئی معیار نہیں ۔ یہ بات اصول علم حدیث سے تعلق رکھتی ہے جس میں اس قسم کے احادیث کو راجح و مرجوح کرنے کے قواعد بتلائے گئے ہیں ۔ چنانچہ راوی کے ضبط عدل ۔ دیانت ۔ علم ۔ سماع وغیرہ صفات پر بحث کی جاتی ہے تو وجہ ترجیح کا خود پتہ لگ جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بجز متبحرین علم حدیث اور اصول اجتہاد کے کوئی شخص اتباع سلف سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ ہر ایک شخص خود بخود حکم صحیح کا استنباط نہیں کر سکتا ۔

رہا سید احمد خان کا انکار حدیث ۔ سو یہ کوئی حجت نہیں ۔ یہ وہ صاحب ہیں جنہیں علم حدیث کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اور ان کا انکار بر بناء اختلاف مذکورہ بالا نہیں تھا بلکہ بر بنائے مفروضہ قانون قدرت کے چنانچہ جہاں اپنے مطلب کے اثبات میں کوئی حدیث مل جائے تو جھٹ اخذ کر لیتے ہیں ۔ الغرض مذکورہ بالا اعتراض صرف بصورت ناواقفیت اصول پیدا ہوتا ہے ورنہ درحقیقت کوئی اعتراض نہیں ۔

[1] الہدایہ ؛ ج ۴ ـ ۵ صـ ۴۰

س - امام ہمام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے اور علمائے شافعیہ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ کیا یہ صحیح ہے؟[1]

ج - ہرگز ناممکن نہیں ہم لوگ اپنی پستی ہمت کو دیکھ کر جملہ ابرار و صلحاء کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگتے ہیں ان بزرگواروں کا کھانا اور سونا قدر ما لابد منہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا اور شوق محبت و اخلاص جو عبادت کے لئے روح و رواں ہیں انکی غذا تھی اور یہ بات صرف امام ابوحنیفہ رض تک ہی محدود نہیں بلکہ جماعت تابعین رضی اللہ عنہم میں کئی ایک ایسے مردان خدا تھے جو اس قسم کی سخت اور دشوار ریاضتوں کے پابند تھے جن کا بجا لانا ہم الیوں سے بالکل ناممکن ہے۔ بایں ہمہ انکی عبادات کی نوعیت طریق مسنون سے خارج نہیں ہوتی تھی۔ یہ خیال کہ امام صاحب سوتے کب ہونگے خاکسار کو بھی کھٹکا کرتا تھا مگر جب امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ کی عبارت ذیل نظر سے گزری تو رفع ہو گیا وہ اپنی طبقات میں لکھتے ہیں۔ " وکان نومه دائماً ساعة بين الظهر والعصر وفي الشتاء ساعة في اول الليل "

تاریخ میں اکبر بادشاہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ رات کو صرف برائے نام لیٹا کرتا تھا اور آٹھ پہر میں تین ساعت سے زیادہ نہ سوتا تھا۔ جب ایک دنیوی سلطنت کا طالب تدابیر ملکی اور مہمات سیاسی میں نیند کو حرام کر سکتا ہے تو انصاف کرو کہ وہ شخص جسکی نسبت یہ لکھا ہے۔ " وکان يُسمع بكاءه حتى يرحمه جيرانه " یعنی آپ رات بھر اتنا رویا کرتے تھے کہ ہمسایہ لوگوں کو بھی آپ کی حالت پر رحم آتا تھا۔ بھلا ذوق عبادت اور خشیت الٰہی میں نیند کی کیا پروا کرتا ہے۔ انہیں کی نسبت لکھا ہے: " وكانوا يسمونه اسطوانة المسجد لكثرة صلوته " یعنی لوگ آپ کو بوجہ کثرت صلاۃ مسجد کا ستون[2] کہا کرتے تھے۔ یہی وہ صاحب ہیں جنکی نسبت لکھا ہے: " کان مستغرقاً في بحار التوحيد " یعنی آپ توحید کے سمندر میں ڈوب گئے تھے۔ ہم بیسیوں عبارات علمائے فحول کی نقل کرکے اس واقعہ کو اور بھی واضح کرتے مگر ہمیں معلوم ہے کہ امام صاحب موصوف کی نسبت تمام مخالفین و موافقین زہد، ورع

---

[1] الھدایہ؛ ج ۱۳ ع ۵ ص ۱۰ - ۱۱

[2] آیۃ " یبیتون لربهم سجداً وقیاماً " پر عمل تھا

والقا کا کامل یقین رکھتے ہیں۔ لہذا جنداں ضروری نہیں ہاں بدظن آدمی کا قائل کرنا مشکل ہے ؎

کارِ نیکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

بھلا جس شخص کا یہ مقولہ ہو "بلغنی أن لیس فی الدنیا أعز من فقیہ ورع" یعنی مجھ صحیح طور پر اپنے مشائخ سے یہ بات پہنچی ہے کہ دنیا میں فقیہ پرہیزگار سے زیادہ کمیاب کوئی چیز نہیں کیا مذکورہ بالا وصف سے متصف ہونا اسکے لئے کچھ مشکل ہے۔ آپ کی اسی عملی حالت کا نتیجہ ہے کہ روئے زمین پر آپ کی جماعت دیگر اسلامی جماعتوں سے بدرجہا بڑھ کر ہے ورنہ بڑے بڑے ائمہ مجتہدین تو اور بزرگوار بھی گزرے ہیں۔

فقط۔

س۔ کیا نزول مسیح کی حدیث مرزا قادیانی کی مؤید ہے؟ [1]

ج۔ جو امر نص آیت یا نص حدیث یا اجماع علمائے امت مرحومہ سے پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے اس میں ایماندار کو چون و چرا کرنے کا کوئی موقع نہیں ہونا چاہئیے۔ ہاں آیت و حدیث کا بروئے اصول عربیت موازنہ کر کے صحیح معنی کا استنباط کرنا ضروری ہے۔ اور علی ہذا اجماع کی صحت کا معیار جو علمائے اصول نے قرار دیا ہے، مدنظر رہنا چاہئیے اور اگر مخالفت کوئی کرنے لگے تو اسے ہرگز اصول سے نہ ہلنے دینا چاہئیے۔ کیونکہ یہ یقیناً صحیح ہے کہ تمام اہل بدعت و ہوا ہمیشہ اصول سے بھاگا کرتے ہیں اور اگر کہیں اصول ان کے موافق پڑتا ہے تو وہ ان شیر کی طرح اہل حق کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اصول کہ الفاظ ہمیشہ اپنے معانی حقیقیہ پر محمول ہوں گے الا اس صورت میں کہ معنی حقیقی کے لینے سے کسی دیگر نص یا اجماع کی مخالفت لازم آئے یا صریح عقل کے رو سے کوئی محال لازم آتا ہو۔ کیونکہ اس صورت میں ضرورتاً ہمیں لفظ کو مجازی معنی پر محمول کرنا پڑے گا اور وہ معنی مجازی منجملہ ان اقسام مجاز کے ہوں گے جن کی تفصیل کتب اصول میں مندرج ہے۔ مثلاً نزول مسیح کی حدیث میں مسیح علیہ السلام کے متعلق یکسر الصلیب (یعنی مسیحؑ

---

[1] الہدیٰ ؛ ج ۱ ع ۶ ص ۳۷-۳۹

صلیب کو توڑیں گے) وارد ہے مگر قادیانی یہ معنی لیتا ہے ۔ لفظ مسیح سے مسیح ابن مریم مراد نہیں ۔ بلکہ مسیح بروزی مراد ہے یعنی ایسا شخص جس میں مسیح علیہ السلام کے کمالات جلوہ گر ہونگے[1] ۔ کسر صلیب سے مراد یہ ہے کہ وہ نصاریٰ کو دلائل کے رو سے مغلوب کرے گا ۔ مگر جب یہ سوال کیا جائے کہ کسر صلیب کو حقیقی معنی پر محمول کرنے سے کون سا امر مانع ہے ۔ دیکھو جب پیغمبر ؐ نے مکہ فتح کیا تو بیت اللہ کے اندر جس قدر بت تھے ۔ سب کو پاش پاش کرا دیا اور شرک کے تمام آثار مٹا دیئے ۔ اسی طرح اگر مسیح علیہ السلام نازل ہو کر کفر کے آثار کو مٹا دیں گے تو اس میں کونسی خرابی لازم آتی ہے ۔ اگر کسر صلیب سے دلائل کے ساتھ مغلوب کرنا مراد ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے ۔ کیونکہ شروع اسلام سے آج تک علمائے امت دلائل قاطعہ کے ساتھ نصاریٰ کا رد لکھتے رہے ہیں اور اس قدر لکھا ہے کہ اب نہ تو کوئی نیا اعتراض پیش ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی شخص نیا جواب دیتا ہے ۔ نصاریٰ کے اعتراضات اسلام و بانی اسلام کے برخلاف مشہور و معروف ہیں اور ان کے جوابات اظہر من الشمس ہیں ۔ چنانچہ اہل علم خوب واقف ہیں کہ پادری لوگ ہمیشہ انہیں چند ایک چبائے ہوئے مضمون کو بار بار چبایا کرتے ہیں ہم نے آج تک کوئی نیا اعتراض نہیں سنا جس کو بزرگان سلف نے نہایت زور کے ساتھ رد نہ کر دیا ہو اور موجودہ صدی کے علماء میں کئی ایک بزرگواروں نے عیسائیوں کا ایسا ناک میں دم بند کیا ہے کہ بجز گریز کے عیسائیوں کو کوئی صورت نظر نہیں آئی ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب " الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح " کیا اہل کتاب کے رد میں کچھ کم ہے ۔ علامہ ابن حزم کی ملل و نحل نے جو خامہ فرسائی کی ہے اور جو جو الزامات نصاریٰ پر قائم کئے کیا نصاریٰ کی شکست کے لئے کافی نہیں ؟ موجودہ زمانہ میں علامہ الوسی بغدادی اور مولوی رحمت اللہ مہاجر کیرانوی مرحوم کے مباحثات ایسے نہیں کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں ہمیں کوئی نئی تیاری کرنی پڑے ۔ انہیں جوابات کو کانٹ چھانٹ کر کے موجودہ علمائے نصاریٰ کی تردید بخوبی کر سکتے ہیں ۔ رہا اہل یورپ کا فتنہ و فساد جو مذہب اسلام میں رخنہ انداز ہو رہا ہے ۔ سو اسے نصاریٰ سے کچھ تعلق نہیں بلکہ وہ علوم جدیدہ کے رو سے حملے کیا کرتے ہیں اور وہ حملے مقدس اسلام کی نسبت مسیحیت پر سب سے پہلے عائد ہوتے ہیں ۔ اور علوم فلسفیہ تو ہمیشہ مذہب کے پہلو بہ پہلو چلا کئے ہیں ۔ مگر مذہب ہی ہمیشہ غالب رہا

---

[1] سچ ہے آدمی جب جھوٹ بولتا ہے تو اسے جھوٹ کو سچ بنانے کے لئے کئی ایک اور جھوٹ گانٹھنے پڑتے ہیں ۔ قادیانی نے جب اپنے تئیں بروزی مسیح قرار دیا تو یہ سوچا کہ مسیح کے کمالات میں مردوں کو زندہ کرنا اور کوڑھیوں اندھوں کا تندرست کرنا بھی قرآن میں مذکور ہے ۔ مخالفین معجزہ کی استدعا کریں گے تو ہمارا ہے پاس کیا ہے ؟ اس لئے ان الفاظ کو ان کے غیر مقصود معانی پر حمل کیا اور یہ ظاہر کیا کہ " اس سے روحانی اندھوں اور کوڑھیوں کا تندرست کرنا مقصود ہے ورنہ درحقیقت مسیح معجزہ نہیں دکھاتے تھے مگر ساتھ ہی اسکے یہ بھی کہتا ہے کہ وہ مسمریزم کا عمل کیا کرتے تھے اگر میں اس عمل کو حقیر نہ سمجھتا تو مسیح سے کم نہ تھا ؟ (عجیب تناقض ہے) ہم کہتے ہیں کہ علمائے امت نے بدلائل ثابت کر دیا ہے کہ کاذب خرق عادات نہیں ۔

ہے۔ کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی۔ دیکھو کہ ہر ایک زمانہ کا فلسفہ اپنے اپنے وقت میں مذہب کا مقابلہ کرتا رہا۔ مگر مذہب بدستور اسی حالت پر قائم رہا۔ اس کے اصول میں سر مو فرق نہیں آیا۔ اس لئے میرزا کا یہ کہنا کہ وہ عیسائیت کو توڑ ڈالے گا دعویٰ بلا دلیل ہے جو ہرگز قابل سماعت نہیں۔ کیونکہ میرزا کی اس قدر خامہ فرسائی سے عیسائیت میں کچھ فرق نہیں آیا۔ عیسائی بدستور اپنی کارروائی کئے جا رہے ہیں اور اگر کہا جائے فی حدّ ذاتہ حق کو باطل سے علیحدہ کر کے دکھانا مقصود ہے خواہ عیسائی مانیں یا نہ مانیں۔ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ کام تو قرآن مجید نے بزمانۂ حیات نبوی پورا کر دکھایا تھا۔ اور بعد ازاں علماء اسلام ہمیشہ ایسا کرتے رہے۔ میرزا نے کون سی نئی بات کی جس سے وہ مستحق نبوت ہو گیا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ آنے والا مسیح تمام اختلاف کو دور کر کے مختلف فرقوں کو ایک بنا دے گا۔ مگر میرزا نے مسلمانوں میں ایسی تفرقہ پیدا کر دی کہ سلام۔ طعام۔ کلام وغیرہ سب کچھ مریدوں سے چھڑوا دیا۔ چنانچہ اب انہیں مسلمانوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہرصورت حدیث نزول مسیح کو میرزا قادیانی سے کسی قسم کا تعلق نہیں اور جو تاویلات رکیکہ وہ پیش کرتا ہے۔ محض بے جوڑ باتیں ہیں جن کی تائید کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

س ۔ ایک شخص قدم عالم اور آریہ مذہب کے مطابق لامتناہی کا قائل ہے۔ اس کا جواب درکار ہے [1]

ج ۔ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ قدمِ عالم والے ادھر تو سلسلہ موجودات کو لامتناہی مانتے ہیں اور
ادھر یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے مادہ اور روح کو ملا دیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ دو متناقض خیال ہیں۔
کیونکہ لامتناہی کا تسلیم کرنا تو یہ بات ثابت کرتا ہے کہ اس سلسلہ کی کوئی ابتداء زمانی نہیں ہوسکتی اور اجسام و
ارواح کے اتصال کا ماننا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس اتصال کے لئے کوئی بدائت زمانی ہے۔ روح اور مادہ قدیم
ہیں اور ان کو خدا نے ملا دیا۔ ظاہر ہے کہ باہم ملانے کی کوئی نہ کوئی ابتداء تو ضرور ہوگی۔ ورنہ یہ اتصال بھی قدیم
ماننا پڑے گا۔ پس خدا معطل ٹھہرا کیونکہ جب یہ سب سلسلہ بدیں حیثیت پہلے ہی سے موجود تھا تو خدا نے کیا کیا؟
سلسلہ لامتناہی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو فطرتِ انسانی قبول نہیں کرسکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی
فطرت ہمیشہ دریافت علّت میں لگی رہتی ہے اور وہ کسی واقعہ کو بدون علت تسلیم نہ کرنے پر مجبور ہے۔ انسان دریافت
علل کے اصول میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ایک آن کے واسطے بھی وہ اس اصول کی پابندی سے علیحدہ نہیں ہوسکتا۔

شیخ الرئیس اپنی کتاب شفاء میں لکھتے ہیں :

" ومن قبل من غیر دلیل و برھان فقد انسلخ عن الطبیعۃ البشریۃ "

یعنی جو شخص بے دلیل کسی بات کو مانتا ہے وہ فطرتِ انسانی سے علیحدہ ہوتا ہے۔ گو ہم کسی واقعہ کی علت
کا صحیح صحیح پتہ نہ لگا سکیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ان کی علت واقعیہ سے انکار کردیں یا یہ مان لیں کہ اس کی کوئی
علت فی الواقعہ بھی نہیں ہوسکتی۔ ہزاروں واقعات ایسے ہیں کہ ہم ان کی علت کی کُنہہ نہیں جان سکتے۔ مگر ہماری
فطرت یہ شہادت دیتی ہے کہ کوئی نہ کوئی اس واقعہ کی ضرور علت ہوگی۔ انسان کی طبیعت میں یہ قدرتی کمزوری
ہے کہ ظہور واقعہ بے علت کو تسلیم نہ کرے۔ بسا اوقات انسان اس قدرتی کمزوری کی وجہ سے کسی واقعہ کی کوئی

[1] الھدایہ : ج ۷ ع ۷ صـ ۲۹ ـــ ۳۱

فرضی علت قرار دیتا ہے جس سے وہ اطمینان حاصل کرتا ہے ۔ اسی بنا پر واقعاتِ عالم کی نسبت جب ہم دریافتِ علل کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہیں ۔ فطرتِ انسانی ایک خاص حد پر جا ٹھہرنے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اور لامتناہی سلسلہ کی صورت میں اسے کچھ علم حاصل نہیں ہوتا ۔ گو ایک حد کا معین کرنا اور اس کے اثبات میں براہین کا قائم کرنا بھی آسان کام نہیں ہے ۔ مگر لامتناہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو فطرتِ انسانی کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی ۔ مادی موجودات میں تو ہمیں کوئی بھی سلسلہ غیر متناہی نظر نہیں آتا ۔ کیونکہ موجوداتِ مادیہ تو محدود ہیں جنہیں ہم بذریعہ حواس محسوس کرتے ہیں ۔ مثلاً جنگل کی ریت کے ذرّے گو ہمارے شمار سے باہر ہوں اور کوئی صورت ان کے شمار کی ممکن نہیں ۔ مگر بہرصورت محدود ہیں ۔ رہ غیر مادی موجودات کا سلسلہ سو اس کے غیر متناہی ہونے پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ۔

بعض لوگ سلسلہ غیر متناہی کے اثبات میں یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ علم ریاضی میں بعض سلسلے ایسے ہیں کہ وہ لا الی النہایۃ چلے جاتے ہیں ۔ مثلاً علم جبر و مقابلہ میں سلسلہ حسابیہ یا سلسلہ موسیقیہ وغیرہ یا علم حساب میں جذر اصم یا کسورِ اعشاریہ متوالی وغیر ذالک ۔ سو ان کو معلوم ہونا چاہئیے کہ اس قسم کے لامتناہی سلسلہ کے ہم بھی قائل ہیں کیونکہ اعداد کا لا الی النہایۃ چلا جانا صرف ہمارے فرض کرنے پر موقوف ہے جہاں ہم کسی خاص عدد سے آگے کسی عدد کا فرض کرنا چھوڑ دیں گے ۔ وہیں خاتمہ ہو جائے گا ۔ لیکن یہ تو صرف فرضی اور اعتباری سلسلہ ہوگا واقعی نہیں ہو سکتا ۔ واقعی سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا سلسلہ جس میں معدود کوئی چیز علاوہ عدد کے ہو ۔ کیونکہ عدد کا واقعی کوئی وجود نہیں ہو سکتا ۔ صرف ہمارے فرض کرنے پر موقوف ہے ۔ مع ہذا سلسلہ اعداد میں ایک عدد اپنے سے اگلے عدد کے لئے علّت نہیں ہوتا بلکہ شرط ہوتا ہے اور علت اور شرط ایک نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ دو امر ہیں ۔ علّت اپنے معلول کے وجود کا افادہ کیا کرتی ہے اور شرط اس امر کو بولتے ہیں کہ جب وہ موجود ہو تو علت اپنا کام کرے ۔ کسی خاص عدد کے وجود کے لئے علّت ہے ہمارا فرض کرنا اور اس خاص عدد سے پہلا عدد کا وجود شرط ہے ۔ کیونکہ جب تک اس خاص عدد کے درجہ کا تحقق نہیں ہوگا ۔ تب تک ہم اس سے اگلے کو فرض نہیں کر سکتے ۔ سلسلہ لامتناہی جو مبحث فیہ ہے ۔ اس میں یہ ضروری شرط ہے کہ وہ علت و معلول کا سلسلہ ہو ۔ نہ کوئی دوسرا سلسلہ پس علت و معلول کے سلسلہ لامتناہی پر خصم کے پاس کوئی دلیل نہیں ۔

جو لوگ ذات و صفات باری کے تعلق کو سمجھتے ہیں ۔ وہ سوا ذات باری کے کسی دوسرے امر کو

کسی واقعہ کی علت قرار نہیں دیتے بلکہ تمام دوسرے امور کو بمنزلہ شرط کے سمجھتے ہیں۔ علت جس کا کام عدم سے وجود میں لانا ہے محض ذات باری کا ہے۔ مگر عام بول چال میں شرط کو ہی علت کہہ دیا کرتے ہیں اور یہ ایک بڑی بھاری غلطی ہے جو مختلف زمانوں کے فلاسفروں نے کی ہے۔ مثلاً عام طور پر آگ کو لکڑی کے جل جانے کی علت بولتے ہیں۔ حالانکہ آگ صرف لکڑی کے جلانے کے لئے شرط ہے اور علت صرف ذات باری ہے۔ علی ہذا القیاس تمام موجودات میں یہی سلسلہ جاری ہے کہ ذات باری ہر ایک کام کی علت ہے اور مختلف آلات یا شرائط پر فعل و انفعال کا تمام سلسلہ چل رہا ہے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ کسی ماہیت یا حقیقت کے وجود کا افادہ کرنا صرف خالق برتر کا کام ہے کیونکہ جو چیز اپنے وجود میں خود محتاج ہے وہ افادۂ وجود کیونکر کر سکتی ہے۔ رہا اہل فلسفہ کا یہ اصل کہ "الواحد لا یصدر منہ الا الواحد"۔ یعنی ایک علت ایک ہی معلول پیدا کر سکتی ہے ایک بے اصل بات ہے۔ جس کی تردید محققین نے نہایت زور کے ساتھ کر دی ہے۔

فقط

س ۔ ذات باری سبحانہٗ کو تمام افراد انسانی سے یکساں تعلق ہے کیونکہ سب کے سب اس کے مخلوق ہیں۔ پھر کسی کو اعلیٰ کسی کو ادنیٰ بنانے میں کیا حکمت ہے؟ یا بعض افراد عیش و آرام میں نظر آتے ہیں اور بعض رنج و تکلیف میں اس کی کیا ضرورت ہے؟ جواب استدلال عقلی پر مبنی ہو۔ نہ مذہبی پیرایہ میں ۔[1]

ج ۔ سائل کا خیال بالکل صحیح ہے کہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے تمام افراد انسانی کو ذات باری سے یکساں تعلق ہے یا یوں کہو کہ تمام افراد انسانی اس کی رحمت عامہ سے یکساں مستفید ہو رہے ہیں۔ رحمت عامہ ذات باری کی وہ صفت جو اس سلسلۂ ہستی کے وجود کا باعث ہوئی اور ہر ایک چیز نے اپنی نوعیت کی مخصوص قابلیت کو ارادہ ازلی کے مطابق حاصل کیا جس کو اس چیز کی فطرت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کوئی چیز اپنی فطرت سے علیحدہ ہو کر کسی ایسے کمال کو حاصل نہیں کر سکتی جس کی قابلیت اس کی فطرت میں نہیں رکھی گئی تھی۔ اسی رحمت عامہ کا اقتضاء ہے کہ ہر چیز ذات باری کے کسی نہ کسی کمال کے آثار کا مظہر ہے چونکہ ہر ایک چیز کسی نہ کسی کمال ذات باری کا مظہر ہے اس لئے وہ فی حد ذاتہ کبھی بری نہیں ہو سکتی۔ بعض کوتہ بین لوگ بعض اشیاء کو برا دیکھتے ہیں اور ان کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ عالم کائنات میں کوئی چیز زمینی ہو یا آسمانی۔ نباتی ہو یا حیوانی۔ مادی ہو یا غیر مادی الغرض کچھ ہو کبھی غیر ضروری نہیں ہو سکتی اور جب غیر ضروری نہیں تو وہ بری کیونکر ہو سکتی ہے۔ کسی چیز کا برا ہونا برا جاننے والے کا اپنا قصور فہم ہے ورنہ یہاں تو یہ حالت ہے۔

اندریں ملک چو طاؤس بکار است مگس

یہ امر ایک محقق کارخانۂ قدرت کے لئے واقعی نہایت تعجب خیز ہے کہ باآنکہ ایک ہی نوع کی اشیاء کی حقیقت اور ان کی فطرت ایک ہی ہے مگر پھر بھی ان میں اس قدر تفاوت نظر آتا ہے جس سے اس صانع حقیقی کے وسیع علم اور بے پایاں حکمت اور زبردست قدرت کا نقشہ ذہن کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ اس خیال

---

[1] الہدایہ ؛ ج ۱ع ۷ ص ۳۱ — ۳۸

کو صرف انسانی افراد تک کیوں محدود سمجھتے ہو ہر ایک چیز کے مختلف افراد میں غور کر کے دیکھ لو باوجود ان
کے متحد الحقیقت ہونے کے انہیں نمایاں تفاوت موجود ہے اور یہ گوناگونی اور رنگارنگی اس کارخانہ ہستی کے لئے
موجب کمال ہے کیونکہ یکسانیت میں مختلف آثار قدرت کا ظہور نہیں ہو سکتا وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم اشیاء کی
قدر و منزلت کا ان کے خواص و آثار کے مطابق اندازہ کرتے ہیں۔ اگر خواص و آثار اشیاء میں یکسانیت ہوتی
تو ان میں مابہ الامتیاز کیا ہوتا اور ذات باری کے مختلف آثار قدرت کا مظہر کیا چیز ہوتی؟ مگر ہم مانتے ہیں کہ
جو کچھ جس حالت میں موجود ہے بروجہ کمال موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کا نقص نہیں کیونکہ بصورت خلاف لازم آتا
ہے کہ یا تو ذات باری نے اظہار کمال میں بخل کیا یا اُسے اس سے بہتر حالت کاملہ کا علم نہیں تھا۔ مگر وہ ذات مبدء فیاض ہے
جس کی وسعت رحمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور وہ ہر ایک چیز کا بروجہ کمال عالم ہے اس لئے ہمیں ضرورتاً تسلیم کرنا پڑتا
ہے کہ جو کچھ جس حالت پر موجود ہے بروجہ کمال موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کا نقص نہیں۔ موجودات کی بناوٹ یا
ان کی حالتوں میں مختلف تغیّرات و انقلابات کا پیدا ہونا اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا نتیجہ ہے جو نہایت
ہی عمیق سلسلہ سبب و مُسبّب کی ذیل میں پورا ہو رہا ہے۔ ہمارا بعض اوقات کسی امر کو اچھا کہہ دینا اور کسی
امر کو بُرا کہہ دینا صرف ہمارے اپنے موجودہ حالات کے ساتھ اس امر کے مناسب یا غیر مناسب ہونے کا نتیجہ ہے
ورنہ وہ امر فی حدّ ذاتہ کسی نہ کسی حکمت یا مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس خیال کی صحت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے
کہ کسی ایک ہی امر کو ہم اپنے موجودہ حالات کے رُو سے نہایت ہی ضروری خیال کرتے ہیں۔ مگر جوں ہی کہ وہ حالات
بدل جاتے ہیں۔ اس امر کو ہم غیر ضروری سمجھنے لگتے ہیں اور یہ ایک ایسا واضح امر ہے جس کے تسلیم کر لینے میں کسی کو
شک نہیں ہو سکتا۔ انسانی فطرتی قواء خواہ دماغی ہوں یا جسمانی اشیاء عالم کے انقلابات سے متاثر ہو کر ترقی
کر سکتے ہیں۔ غور کرو کہ انسانی دنیا میں ایجادات و انکشافات کا انحصار کس چیز پر ہے؟ اور مختلف علوم و فنون کی
تدوین کا اعلیٰ اصل کون سا ہے؟ اس کا صحیح جواب یہ ہو سکتا ہے کہ یہی اختلاف اشیاء انسان کی توجہ کو
طبعاً ان کی تحقیق کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا آج ترقی کے اس مقام پر نہ پہنچتی۔ ہماری اس
تقریر سے اس قدر تو واضح ہو گیا کہ اختلاف اشیاء عین حکمت الہیّہ کاملہ کا اقتضاء ہے اور ہم کسی امر کو جو
حیز وجود میں آتا ہے صرف اس لئے اچھا کہتے ہیں کہ وہ امر ہمارے موجودہ حالات کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور
صرف اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ وہ ہمارے موجودہ حالات کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اب ہم اس عام عالمگیر اصل کی
صحت کا افراد انسانی پر موازنہ کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ مختلف افراد بنی آدم میں بلحاظ انکے عوارض زندگی کے

جو کچھ تفاوت نظر آرہا ہے ۔ وہ عین حکمت و مصلحت ہے اور ہمارا اس کے برخلاف اس کو معاذ اللہ ، ظلم و ستم کہنا یا غلطی قانونِ الٰہی کہنا ہمارے اپنے قصورِ فہم کا نتیجہ ہے ۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کارخانہ ہستی ایک عجیب و غریب سلسلۂ انتظام میں وابستہ ہے ۔ جس کی تکمیل حسب مشیّت ازلی صرف انسان جیسی گرامی قدر مخلوق کی ذات پر منحصر ہے ۔ غور کرو کہ اگر آج انسانی دخل و تصرف کے اثر سے اشیاء عالم کو علیحدہ کر لیا جاوے اور وہ مختلف کوششیں اور تدبیریں جو عالم مادی میں انسانی ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے روک دی جائیں تو وہ کونسا مخلوق ہوگا جو اشیاء عالم میں تصرف کر کے ان کی پوشیدہ طاقتوں کا اظہار کرے اور ان کے فوائد سے مستفید ہوے اور خود انسان کی زندگی کا مدار کس چیز پر ہوگا ؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں دینا چاہئیے ۔ پس ہم کبھی یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ سلسلہ بجز انسانی قوا و فطری کے عمل کے ایک آن کے لئے بھی چل سکتا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا لازم ہے کہ جب افراد انسانی قوا فطری کے رو سے یکساں پایہ نہیں رکھتے ۔ بلکہ باوجود ان کے متحد الحقیقت ہونے کے ان کے قوا میں بلحاظ قوت و ضعف کے نمایاں فرق نظر آتا ہے تو وہ ہرگز مقدارِ عمل اور کیفیت عمل میں بھی ایک ہی پایہ کے نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی اپنی خداداد قابلیتوں کے مطابق مختلف کاموں کو سرانجام دیں تاکہ یہ سلسلہ نظام بلا خلل چلتا رہے ۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ افراد انسانی کی فطرتیں قوت و ضعف کے رو سے مختلف امور کی سرانجام دہی کی قابلیت رکھتی ہیں ۔ تو اس کا ضروری اور قطعی نتیجہ یہ ہونا چاہئیے کہ ان کے عوارض یعنی حالات زندگی بھی ایک ہی درجہ پر نہ ہوں ۔ بلکہ وہ عوارض یا حالات جن میں انسان کی صحت و بیماری ، تونگری ، مفلسی ، عزت و ذلّت ، آرام و تکلیف وغیرہ سب کچھ داخل ہیں ۔ ان کے طبائع کے اختلاف کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہوں گے یہ ایک امر ایک نہایت عمیق سلسلہ سبب و مسبّب پر مبنی ہے کہ ہر ایک شخص کے حالات زندگی کس طرح اس شخص کی فطرت کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتے ہیں اور اگر ہم ان حالات کو اس شخص سے علیحدہ کرنا چاہیں تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ سرسری طور پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حالات زندگی ہمارے طریق عمل پر منحصر ہیں اگر ہم اپنے طریق عمل کو بدل دیں تو ضروری ہے کہ ہمارے حالات زندگی بھی بدل جائیں گے ۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے طریق عمل کو بدلنے پر قادر نہیں کیونکہ وہ طریق اس کی فطرت کا اقتضاء ہے اور اقتضائے فطرت ناقابل تغیّر ہے اور اگر کوئی شخص بعض ایسی مثالیں پیش کرنے لگے ۔ جن سے یہ ثابت ہو کہ اکثر لوگوں کے حالات زندگی میں ہم صریح طور پر انقلاب و تغیّر دیکھتے ہیں ۔ مثلاً زید مفلس تھا ۔ یکایک خارجی اسباب کے پیدا ہونے پر

وہ مالدار بن جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا وہ بیمار تھا۔ کسی ڈاکٹر یا طبیب کے علاج سے تندرست ہو جاتا ہے۔ کیا
ان مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسانی زندگی کے حالات اس کے اقتضائے فطرت کا نتیجہ نہیں ؟ بلکہ طریق
عمل کے تغیر و تبدّل پر منحصر ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی فطرت کے مفہوم اور اس کے اقتضاء کے سمجھنے
میں اکثر لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ یعنی وہ انسان کی فطرت کلیہ اور فطرت جزئیہ کو باہم مختلط کر دیتے ہیں۔ حالانکہ
فطرت کلیہ اور فطرت جزئیہ میں وہی نسبت ہے جو کسی حقیقت کے نوع اور افراد نوع میں ہوا کرتی ہے۔ اس
لئے جو امور انسان کی فطرت کلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں تمام افراد کی طرف یکساں طور پر
منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً انسان کبھی گدھا یا بیل نہیں ہو سکتا۔ یہ قضیہ تمام افراد کی نسبت صحیح ہے مگر
فطرت جزئیہ کا مفہوم صرف شخص واحد یعنی کسی خاص فرد تک محدود ہے۔ چنانچہ اس فرد خاص کی فطرت
ایسے چند مخصوص امور کی مقتضی ہوگی جو دوسرے کسی فرد کے امور مخصوص سے اسی طرح ممتاز ہوں گے۔ جس
طرح ان دو اشخاص کی ظاہری جسمی بناوٹ ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ضروریات
بشری کے پورا کرنے کی خواہش انسانی فطرت میں شامل ہے یہی خواہش انسان کو اسباب مناسبہ کے حصول
پر مجبور کرتی ہے۔ اسباب کا حصول ہماری اس کوشش کا نتیجہ ہے جو قوائے فطریہ کے عمل سے وجود پذیر ہوتی ہے
ہم اپنے قوائے فطریہ سے اسی قدر کام لے سکتے ہیں۔ جس قدر کام کرنے کی قابلیت ان میں ودیعت ہوتی ہے۔ چونکہ
وہ قابلیت تمام افراد میں یکساں نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی کوشش کا نتیجہ یعنی حصول مقصود بھی یکساں
پایہ کا نہ ہو۔ لیں ہم کبھی یہ خیال نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص اپنے اقتضائے فطرت سے زیادہ اپنی امیدوں میں
کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض حالات بظاہر ہمارے قوائے فطریہ کے عمل سے
خارج ہو کر ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً زید کا بیمار ہو جانا کیونکہ بیمار ہو جانے کی خواہش کبھی کسی شخص کے دل میں
پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خواہش سے مراد اقتضائے فطرت ہے اور یہ اقتضائے فطرت ہماری
آزاد مرضی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک گونہ مجبوری کا نام ہے۔ بیماری کی صورت میں اسباب خارجیہ طبیعت انسانی
پر موثر ہوتے ہیں اور طبیعت ان کے اثر کو قبول کرنے کے لئے مستعد ہوتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ طبیعت کے اثر
قبول کرنے سے پہلے ہمارے قوائے فطریہ اپنا وہ عمل پورا نہیں کر چکتے۔ جس کا نتیجہ قبول اثر ہوتا ہے۔ یہ امر
ایسے اندرونی خفی اسباب کا نتیجہ ہے۔ جو نہایت ہی باریک رفتار میں آناً فاناً اپنا عمل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے
ہم نہایت وثوق کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ بیماری کے عوارض کا پیدا ہونا ہماری قوائے فطریہ کے عمل کا نتیجہ ہے۔ بہر صورت

ہماری زندگی کے مختلف انقلابات و تغیرات بتمامہا ہمارے اقتضاء فطرت کا نتیجہ ہیں اور یہ اقتضائے فطرت اللہ
تبارک وتعالیٰ کی مشیت ازلی پر مبنی ہے جس نے ہر ایک امر کا اندازہ بلحاظ اس امر کی کیفیت و کمیت کے اعلیٰ سے
اعلیٰ حکمت پر قائم کیا۔ حتیٰ کہ کوئی امر اس کے علم و ارادہ و قدرت سے خارج ہو کر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا اور
اس امر کا بیان ہم نے اوپر مفصل کر دیا ہے کہ ہمارا کسی امر کو خیر و شر کہنا محض ہمارے اپنے حالات کی مناسبت
وعدم مناسبت پر مبنی ہے۔ ورنہ بارگاہ رب العزت سے کوئی امر بجز خیر کے سرزد نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے
کہ قرآن مجید میں بیدك الخیر سے اپنی ذات کاملہ کی وصف فرمائی نہ بیدك الخیر والشر سے کیونکہ بحیثیت
صدور فعل عن الذات کے کوئی امر شر نہیں ہو سکتا اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ خیر و شر کا خالق و مالک وہی ذات
باری ہے تو یہ بہ نسبت اس امر کے عالم کائنات میں دیگر اشیاء پر موثر ہونے کے کہا جاتا ہے ورنہ
بالنسبۃ الی ذات باری وہ امر بعینہٖ خیر محض ہوگا۔ مع ہذا ہمارا یہ کہنا کہ زید کا عیش و آرام میں ہونا اور
عمر کا رنج و تکالیف میں ہونا منافی عدل و انصاف نظر آتا ہے۔ یہ سراسر ہماری غلطی ہے کیونکہ ان تمام علل و
نتائج پر ہمارا علم محیط نہیں ہو سکتا جن کے رو سے ایسا ہونا ذات باری کے علم میں عین حکمت قرار پایا ہے۔
آسمان پر سے مینہ کا برسنا۔ کون کہتا ہے کہ موجب رحمت نہیں۔ مگر اس مینہ کے برسنے پر بعض تکالیف
بھی پیش آیا کرتے ہیں مگر وہ تکالیف ہرگز تکالیف نہیں کہلا سکتے۔ جبکہ ہمیں یہ یقین ہوتا ہے کہ مینہ کے
بغیر حیوانی زندگی کا سلسلہ ہی منقطع ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی اجڈ جاہل لعین کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ
قدرت تھی کہ وہ بدون تکالیف کے پیدا ہونے کے بھی کسی امر خیر کو پیدا کر دیتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معترض کے
نظر عالم الامر و عالم الخلق کی حقیقت کے ادراک کرنے سے عاری رہی ہے اور وہ نہیں سمجھا کہ کوئی واقعہ عالم الامر میں
شر نہیں ہو سکتا۔ صرف عالم الخلق میں بالنسبۃ الی بعض الافراد اس کو شر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر ہمارا
اسے بظاہر شر کہہ دینا اس امر کا مستلزم نہیں کہ وہ درحقیقت شر ہے کیونکہ موت و بیماری و مفلسی و ذلت
وغیرہ حالات جو انسانی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ یہ سب کے سب اپنے اپنے موارد میں بعض دیگر امور کا
سبب و علت بن جایا کرتے ہیں۔ جو اس شخص کے لئے کسی دوسری صورت میں موجب صلاح و فلاح ہو سکتے
ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اس معین صلاح و فلاح کا مستحق نہ ہوتا۔ اس کی ہزارہا نظیریں دنیا
میں موجود ہیں اور غالباً ہر ایک شخص نے اپنی زندگی میں اس کا تجربہ کیا ہوگا کہ جب تک کسی حادثہ کی علت یا اس
کے نتائج کا اس کو علم نہیں ہوا۔ وہ اس حادثہ کو شر کہتا رہا۔ مگر اس کی حقیقت کے منکشف ہو جانے پر

اس کو خود تسلیم کرنا پڑا کہ بے شک یونہی ہونا چاہیئے تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کس قدر فوائدِ عظیم سے محروم رہتا۔
چونکہ ہر ایک شخص کا ذہن اس قابل نہیں کہ عالمِ کون و فساد کے واقعات کو سلسلہ سبب و مسبب میں
اس طرح ترتیب دے سکے جس سے ان کا ربطِ حقیقی معلوم ہو جائے۔ اس لئے عوام الناس کی زبان پر حوادث خیر و شر
میں امتیاز کیا جاتا ہے مگر ایک عارف ربانی کو ایسا نہ پاؤ گے کہ کسی حادثہ کو گو وہ اس کی مصلحت مضمرہ کا علم نہ
رکھتا ہو۔ شر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرے۔ چونکہ ذاتِ باری حکیم مطلق ہے اور وہ عادل بھی ہے۔ اس لئے اس کے ہر
دو صفات حکمت و عدل کا اقتضاء علیحدہ علیحدہ یہ ہے کہ حکمت کسی امر کے سلسلہ سبب و مسبب میں
پورا ہونے کی مقتضی ہے یعنی کوئی واقعہ عالم کائنات میں بدون سبب و مسبب کے وقوع میں نہیں آ سکتا اور اس کا عدل
اس امر کا مقتضی ہے کہ ہر ایک فرد کو وہی کمال بخشا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ چنانچہ ہم ذاتِ باری کے ان ہر دو
صفات کا نہایت عجیب و غریب طور پر مشاہدہ کرتے ہیں۔ کوئی چیز کسی کمال کو بلا اسباب ضروریہ ہرگز نہیں
حاصل کر سکتی اور نہ وہ اپنی ذاتی استعداد سے بڑھ کر حاصل کر سکتی ہے۔ گویا اس کی حکمت اس کے عدل کے ذیل
میں اور اس کا عدل اسکی حکمت کے ذیل میں اپنا اپنا ظہور کرتے ہیں۔ ہم اگر اس حقیقت واقعیہ پر غور نہ کر کے اس
کو کسی خلاف پہلو پر محمول کر لیں تو یہ ہماری اپنی غلط فہمی ہے۔ ذاتِ باری یقیناً و قطعاً اس سے بری ہے
یہ کہنا کہ ذاتِ باری حوادث کو بلا تکلیف بھی پیدا کر سکتی تھی۔ ذاتِ باری کی اس حکمت کو
غیر ضروری قرار دینا ہے جس پر اس نے اپنے علم ازلی میں اس سلسلہ کائنات کا چلانا موقوف رکھا تھا۔ اس لئے
یہ خیال اس جملہ کا مترادف ہے کہ دنیا کا کارخانہ بلا سبب و مسبب کیوں نہیں چلا گیا۔ یا دوسرے لفظوں
میں اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اور عالم کائنات کی بناوٹ اس طرح کیوں قائم کی گئی ہے جس طرح کہ وہ فی
الواقع ہے؟ بعبارت دیگر (معاذ اللہ) خدا کو کیا اختیار تھا کہ اس نے سلسلہ انتظام عالم کو اس ہیئت کذائی میں رکھا
مگر ایسے خیالات کے عامی اور لغو ہونے میں کس عقلمند کو کچھ کلام ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس نے اپنے صفات کاملہ کے اظہار کے
لئے جہاں بلا سلسلہ سبب و مسبب کے حقائق کا وجود قائم کیا ہے۔ جسکو عالم آخرت کہتے ہیں وہاں
بالمقابل اس کے ایسے حقائق کا وجود بھی قرار دیا ہے جو سلسلہ سبب و مسبب میں وابستہ ہیں جن کو عالم
دنیا بولتے ہیں۔ اس لئے اس عالم دنیا کی ضرورت کے بدیں ہیئت موجودہ موجود ہونے کا انکار کرنا اگر دیوانگی
نہیں تو کیا ہے۔

ناظرین نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ ہم نے سوال مذکورہ بالا کے متعلق مختصر اور ضروری بحث کو پورا کر دیا ہے

اب صرف اس اعتراض کا جواب باقی رہ گیا ہے کہ مذکورہ بالا تقریر سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ امور اختیاریہ اور امور طبیعیہ میں کچھ امتیاز نہ ہو کیونکہ جب انسان کے تمام افعال کو اس کی فطرت کا اقتضاء کہا گیا تو وہ کون سے افعال ہونگے جو انسان کے اختیار پر مبنی ہوں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ بھی من جملہ اسباب افعال کے ایک سبب ہے جو براہ راست اسباب خارجیہ کے پیدا ہونے پر بموجب اقتضائے فطرت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے ارادہ کی نوعیت اس کے قوائے فطریہ کے عمل کا نتیجہ ہے کوئی شخص ایسا ارادہ کبھی نہیں کر سکتا جو موجودہ حالات کے رو سے اس کے قوائے فطریہ کے دائرہ عمل کے اثر سے خارج ہو سکے۔ عمل خارجی بغیر ارادہ کے ناممکن ہے اور ارادہ بجائے خود انسانی قوائے فطریہ کے عمل کا معلول ہے۔ دیکھو قرآن مجید کس زور سے اس کی تائید کرتا ہے: "حیث قال سبحانہ تعالیٰ قل کل یعمل علی شاکلتہ" یعنی ہر ایک اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے:

ہر کسے بر طینتِ خود می تند

رہا اس امر کا جواب کہ اس طرح تو مذہب جبریہ قائم ہو جائے گا۔ اس کا جواب مختصراً یہ ہے کہ "لو لا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ" یعنی اگر امور میں اختلاف اعتبارات نہ ہوتا تو علم حکمت باطل ہو جاتا۔ علمی تحقیق میں سینکڑوں ایسے مسائل ہیں جن کو مختلف اعتبارات سے مختلف سوالوں کے جواب میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی افعال کا صادر ہونا انسانی ارادہ کے لحاظ سے ایک علیحدہ حقیقت ہے اور ذات باری کے مشیت ازلی ہونے کے نتیجہ کے رو سے ایک علیحدہ حقیقت ہے۔ جبر کے ہم قائل نہیں۔ مع ہذا یہ مسئلہ زیادہ تفصیل کا محتاج ہے جس کے واسطے ایک علیحدہ طویل بحث کی ضرورت ہے۔

س ۔ آلۂ گراموفون وغیرہ میں جو ایک نئی ایجاد ہے۔ آیات قرانیہ یا درود شریف یا اور کوئی مقدس کلام کی آواز بند کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ [1]

بظاہر کوئی وجہ ممانعت کی معلوم نہیں ہوتی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آلۂ مذکور میں ہر ایک قسم کی ممنوع اصوات از قسم موسیقی وغیرہ کے بھی بند کئے جاتے ہیں۔ جن سے محض اہل مجلس کی تفریح و دل لگی مقصود ہوتی ہے اس لئے موجب سوء ادب ضرور ہے کیونکہ عموماً ایسے نو ایجاد امور کے دکھلانے سے بجز تفریح کے اور کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وعظ و تبلیغ اگر مقصود ہو تو حرج نہیں۔ مگر خاکسار کے نزدیک احتراز اولیٰ ہے واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] الہدیٰ ؛ ج ۲ ع ۸ ص ۱۲

ایک استفسار کا جواب [1]

ایک صاحب بیمہ زندگی کرانے کا فتویٰ چاہتے ہیں۔ قبل ازیں الہدیٰ سال ۷۰ء میں بیمہ زندگی کی حرمت پر ایک مضمون نکل چکا ہے ناظرین اس میں غور کریں۔ مختصراً عرض گزارش ہے کہ اس قسم کا بیمہ شرعاً جائز نہیں کیونکہ اس میں غرر لازم آتا ہے یعنی احد الجانبین کو ہرگز وثوق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مفاد کو حاصل کر سکے گا مثلاً زید جو بیمہ زندگی کی کمپنی میں شریک ہوتا ہے اگر تاریخ داخلہ سے دوسرے دن ہی مر جائے تو کمپنی اپنے قواعد کے مطابق پابند ہو گی کہ زید کے ورثاء کو وہ رقم معینہ جو ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ سے معین تعداد سالوں میں پوری ہونی چاہیئے تھی ادا کر دی گویا کمپنی دھوکے میں رہی اور اس کو خسارہ اٹھانا پڑا اور اگر کمپنی کا دیوالہ نکل جائے تو زید کو اپنے روپیہ سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس صورت میں زید کو دھوکا لگا۔ خلاصہ یہ کہ بیمہ کمپنی کی بناء ایک گونہ قمار بازی پر ہے اور قمار بازی کے حرام ہونے کی علت بھی غرر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیع کی بعض صورتیں جن میں الکل یعنی محض ظن و گمان پر لین دین ہوتا ہے حرام قرار دی گئی ہیں۔

یہاں یہ خیال صحیح نہیں ہو گا کہ بیمہ کمپنی کے قواعد ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کمپنی یا شریک کمپنی کو احتمال غرر کا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ خیال اگر صحیح ہو تو اکثریہ حالت سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا اس لئے احتمال جانب مخالف بدستور قائم ہے لہٰذا بیمہ زندگی کرانا حرام شرعی ہے۔ لاریب فانہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ بینک سود اور بیمہ زندگی میں شریک ہونے سے بچتے رہیں اور بعض اہل غرض و مصلحان قوم کی واہی تباہی باتوں پر نہ جائیں کیونکہ یہ لوگ رہزنانِ دین و ایمان ہیں۔ شریعت کی حدود کو نگاہ رکھنا ہی ایمان ہے اور جو شخص خود بے باکانہ ارتکاب کرتا اور دوسروں کو اس پر توجہ دلاتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کے مقابلہ میں سامان حرب کی تیاری کرتا ہے۔ نعوذ باللہ منہا +

---

[1] الہدیٰ : ج ۲ ع ۸ ص ۱۳

س ۔ کیا زید کی بہن رضاعی سے زید کا باپ نکاح کر سکتا ہے ؟ [1]

ج ۔ یہ نکاح صحیح ہے کوئی مانع نہیں حدیث یحرم من الرضاع ما یحرم من الولادۃ کے مفہوم میں گو بظاہر داخل ہے اور اسی لئے یہ نکاح ناجائز معلوم ہوتا ہے مگر اس حدیث کے چند مستثنیات ہیں چنانچہ صورت مذکورہ بالا بھی انہیں مستثنیات میں داخل ہے ۔ ہکذا فی کتب الفقہ

س ۔ زید کچھ عرصہ سے دیوانہ ہے اس کی عورت اپنے نان و نفقہ کے لئے محتاج ہے ۔ زید کچھ وجہ معاش نہیں رکھتا نہ اس کی کوئی جائداد ہے کیا اسکی عورت شرعاً دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے ؟ [2]

ج ۔ کتب فقہ میں لکھا ہے کہ مجنوں اور نابالغ کا طلاق معتبر نہیں ۔ ایک حدیث میں جو ترمذی نے بروایت حضرت عائشہ رضہ نقل کی ہے اور دوسری ایک حدیث میں جو صاحب ہدایہ نے نقل کی ہے (گو وہ حدیث غریب ہے) مجنوں کا طلاق، طلاق شرعی نہیں سمجھا گیا ۔

س ۔ ہمارے گاؤں میں اکثر ناخواندہ لوگ نکاح کے وقت ایک ایسی فرضی رقم مہر کی مقرر کر دیتے ہیں ۔ جسکو خاوند ادا نہیں کر سکتا اور اس سے صرف دنیوی نمائش مقصود ہوتی ہے کیا شریعت میں حق مہر کی کوئی

---

1 الھدیٰ ؛ ج ٦ ع ٩ ص ٣٩

2 الھدیٰ ؛ ج ٦ ع ٩ ص ٣٩

مقدار معین ہے؟ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کیا ہونی چاہئیے۔ [1]

ج ۔ زیادہ سے زیادہ کے لئے کوئی شرعی حد معین نہیں ۔ میاں اور بیوی ہر دو کی شرافت اور نسب، اور شوہر کی حالت مفلسی اور تونگری کو ملحوظ رکھنا۔ البتہ کتب فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے ۔ مذکورہ بالا قسم کی فرضی رقمیں جبکہ ان کا ادا کرنا مقصود نہیں ۔ ان مقاصد شرعیہ کے برخلاف ہیں جو شریعت کو سنت نکاح میں ملحوظ ہیں ۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس قسم کی نمائشی کارروائیوں سے بچنا لازم ہے اور کم از کم مہر کی مقدار فقہ حنفی کے رو سے دس درہم ہے اور ان کی دلیل حدیث " ولا مہر اقل من عشرۃ دراھم " ہے ۔ جسکو دار قطنی اور بیہقی نے بروائت جابر رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے ۔

س ۔ اکثر جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ ان کے ہاں رسمی پیر سالانہ نذرانہ لینے کے لئے آنکلتے ہیں اور زکوٰۃ کا روپیہ وصول کر لیتے ہیں یا خوش عقیدہ لوگ خود اپنی مرضی سے زکوٰۃ کی نیت پر انہیں کچھ دے دیتے ہیں ۔ کیا اس طرح پر زکوٰۃ شرعاً ادا ہو جائے گی ۔ [2]

ج ۔ ادا ہونا تو یقیناً نہیں ہو سکتا ہاں اس طرح پر دینے والا اور لینے والا ہر دو گنہگار ہیں کیونکہ زکوٰۃ کا مصرف جائز میں صرف کرنا بجائے خود واجب ہے ۔ یہ پیری مریدی کرنے والا اگر واقعی بنی ہاشم میں سے ہے تو اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں اور اگر بنی ہاشم سے نہیں ہے تو بہ نیت نذر پیر دینا ایک اور گناہ ہے ۔ ہاں اگر وہ شخص واقعی مستحق زکوٰۃ ہے تو بہ نیت ادائے زکوٰۃ نہ بہ نیت ادائے نذرانہ اسے دینا منع نہیں ۔ تعجب ہے کہ لوگوں کے اپنے اقارب میں کئی ایک لوگ مستحق ہوتے ہیں ۔ مگر یہ جاہل انہیں چھوڑ کر ایسے رہزنان دین کو زکوٰۃ دے دیتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں ۔
فقط

[1] الھدایٰ ؛ ج ٦ ع ٩ ص ٣٩

[2] الھدایٰ ؛ ج ٦ ع ٩ ص ٥٠

س ۔ مجلس میلاد شریف کا انعقاد کیونکر اور کس زمانہ سے شروع ہؤا ؟

ج ۔ کوکبوری ترکمان الملقب بہ مظفر الدین بن زین العابدین[۲] جو ۵۸۹ھ سے ۶۳۰ ہجری تک
اربل اور اس کے مضافات پر حکمران تھا اس مجلس کا بانی گزرا ہے ۔ اہل ملک مجلس میلاد شریف کے متعلق اس کے حسن
اعتقاد سے واقف تھے ۔ اس لئے ہر سال اس کے پاس اربل اور قرب و جوار کے شہروں سے جیسے بغداد، موصل، جزیرہ،
نصیبین، سنجار، ملک عجم اور اطراف سے بے انتہا لوگ آتے تھے جن میں علماء صوفیاء و واعظین ۔ حفاظ ۔ شعراء
ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے ۔ محرم سے اوائل ربیع الاول تک لوگوں کے آنے کا سلسلہ قائم رہتا تھا اور مظفر الدین کوکبوری
لکڑی کے قبے اور خیمے قائم کرتا تھا ۔ ہر قبہ چار منزلہ پانچ منزلہ ہوتا تھا قریباً بیس قبے ہوتے تھے جن میں سے اکثر خود
اس کے ہوتے تھے اور باقی امراء اور اعیان دولت کے ہوتے تھے ۔ ہر امیر کا ایک قبہ ہوتا تھا ۔ جب صفر کی پہلی ہوتی تھی تو ان
قبوں اور خیموں میں آرائش ہونی شروع ہوتی تھی اور ہر قبہ میں موسیقی کے مختلف ساز اور باجے ہوتے تھے ۔
یہاں تک کہ کل طبقے بھر جاتے تھے ۔ اس زمانہ میں لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ دیتے تھے اور ان کا سوائے
تماشا بینی اور سیر کے کوئی اور کام نہ ہوتا تھا ۔ یہ قبے قلعہ کے دروازہ سے لے کر خانقاہ کے دروازہ تک
جو میدان کے قریب تھا کھڑے رہتے تھے ۔

مظفر الدین ہر روز عصر کے بعد یہاں آتا تھا اور ایک ایک قبہ پر کھڑا ہو کر گانا سنتا تھا
اور سیر کرتا تھا اور خانقاہ میں رات گزارتا تھا اور اس میں بزم سماع منعقد کرتا تھا ۔ نماز صبح کے بعد سوار
ہو کر شکار کو نکلتا تھا ۔ دوپہر کے قریب شکار سے قلعہ میں واپس آتا تھا اور اسی طرح ہر روز شب ولادت
تک کرتا تھا ۔ مجلس میلاد ایک سال ربیع الاول کی آٹھویں کو کرتا تھا اور ایک سال بارہویں کو کیونکہ تاریخ
ولادت میں اختلاف ہے ۔ جب شب ولادت کے دو دن باقی رہ جاتے تھے تو بے انتہا اونٹ گائیں بھیڑ

[۱] البدایہ ؛ ج ۶ ع ۱۱ ص ۱۳۶ ۔ ۱۴۰

[۳] یہ مظفر الدین کا سال ولادت ہے بقول ابن خلکان وہ ۱۴ سال کی عمر میں اربل کا حاکم بنا ۔ الوفیات ۳ : ۲۷۱

اور بکریاں نکالتا تھا اور ان کو باجے گانے کے ساتھ میدان تک لے جاتا تھا۔ پھر ان کو ذبح کر کے قربانی کرتے تھے اور ہانڈیوں میں قسم قسم کے کھانے پکتے تھے۔ جب شب میلاد آتی تھی تو بزم میلاد منعقد کرتا تھا۔ بعد اس کے کہ نماز مغرب کی قلعہ میں ادا کرتا تھا۔ پھر قلعہ سے اترتا تھا اور اس کے آگے آگے بہت سی شمعیں روشن ہوتی تھیں اور ان میں دو یا چار بڑی بڑی شمعیں خاص جلوس کی ہوتی تھیں جس میں سے ہر ایک شمع ایک ایک خچر پر ہوتی تھی اور پیچھے ایک آدمی ہوتا تھا جو اس کو ٹیک لگائے ہوتا تھا اور وہ شمعیں خچروں کے پیٹوں سے بندھی ہوتی تھیں یہاں تک کہ بادشاہ خانقاہ تک پہنچ جاتا تھا اور اس شب کی صبح کو قلعہ سے سب سامان منگواتا تھا جس کو صوفیاء اپنے ہاتھوں سے اٹھائے ہوتے تھے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی ہوتی تھی اور وہ سب کے سب رئیسوں کے پیچھے ہوتے تھے۔ پھر خانقاہ میں بڑے بڑے لوگ اور ارکان دولت اور سفید پوش لوگ جمع ہوتے تھے ان کے لئے کرسیاں رکھی جاتی تھیں اور مظفر الدین کے واسطے ایک برج ہوتا تھا جس میں چند کھڑکیاں اس طرف لگی ہوتی تھیں اور کرسی وعظ ہوتی تھیں اور دوسری چند کھڑکیاں بھی لٹکا رکھی تھیں۔ یہ میدان بہت وسیع تھا جس میں فوج جمع ہوتی تھی اور ان کے واسطے فرش بچھایا جاتا تھا۔ پھر محتاجوں کی دعوت ہوتی اور دوسرا عام دسترخوان جمع ہونے والوں کے لئے بچھتا تھا اس طرح عصر تک رہتا تھا اور صبح تک سماع ہوتا تھا۔ جب اس میلے سے فرصت ہوتی تھی ہر شخص اپنے وطن میں آنے کا سامان کرتا تھا۔ مظفر الدین کا ہر سال یہی طریق تھا۔ [1]

میلاد نبوی کی پہلی کتاب

ابوالخطاب عمر بن حسن بن دحیہ اندلسی (المولود ۵۴۴ھ المتوفی ۶۳۳ھ) بہت بڑے مشہور عالم اس زمانہ کے تھے۔ علم حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ نحو، ادب، تاریخ عرب میں ماہر تھے۔ طلب علم کے لئے بہت شہروں کا سفر کیا۔ ۶۰۴ھ میں شہر اربل آئے۔ جب وہ خراسان کو جا رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ بادشاہ اربل کو مجلس میلاد سے بہت شوق ہے اور اس کا بہت اہتمام کرتا ہے تو انہوں نے کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر کے نام سے ایک کتاب لکھی اور خود اس کو پڑھا۔

---

[1] کوکبوری کی اس میلاد نبوی کے کوائف کس قدر تفصیل کے ساتھ ابن خلکان نے بیان کئے ہیں۔ الوفیات ۳ : ۲۷۲ – ۲۷۶

س۔ ایک شہر میں متعدد مسجدوں میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ [۱]

ج۔ اس مسئلہ میں گو فقہاء ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے اور متفق علیہا مذہب یہی ہے کہ ایک ہی مسجد میں ادا ہو کیونکہ شوکتِ اسلام کا اظہار اسی میں ہے جو نمازِ جمعہ میں ایک اہم امر ہے مگر عند الضرورت متعدد مساجد میں بھی جواز جمعہ ثابت ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے "تؤدی الجمعة فی مصر واحد فی مواضع کثیرة ہو قول ابی حنیفة و محمد رحمہ اللہ وہو الاصح۔"

س۔ عام طور پر یہ بات مروج ہے کہ عند الضرورت کسی دوسرے شخص سے غلہ گندم یا جو یا نخود موجودہ نرخ سے کم نرخ پر بطور ادھار (نسیہ) لیا جاتا ہے اور مدت معینہ کے گزرنے پر قیمت ادا کی جاتی ہے کیا شرعاً ایسی بیع جائز ہے۔ [۲]

ج۔ یہ بیع جائز ہے کیونکہ مدت اداء ثمن میں تاخیر کی وجہ سے ثمن کو زیادہ کرنا منع نہیں۔
"لانہ یزاد علی الثمن لاجل الاجل" (عینی)

س۔ تصویر روضۂ نبوی علی صاحبہا التحیة والسلام بغرضِ حصولِ ثواب جائز ہے یا نہیں؟ [۳]

۱ الہدایہ: ج ۷ عـ ۲ صـ ۳۷
۲ الہدایہ: ج ۷ عـ ۲ صـ ۳۷
۳ الہدایہ: ج ۷ عـ ۲ صـ ۳۷

ج۔ بغرض حصول ثواب ناجائز ہے کیونکہ قرون ثلاثہ میں اس فعل کا وجود ثابت نہیں اور جو امر قرون ثلاثہ میں قولاً و فعلاً ثابت نہیں وہ بدعت سیئہ ہے ہذا حکم "کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار" کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ مع ہذا کسی چیز کی شبیہ اس چیز کے عین کی جگہ قرار دے کر اس کی تعظیم وتکریم کرنا ایک گونہ بت پرستی ہے۔ قال بعض علماء السنة: "من الاوهام حكم شيئ بشبيهه وهذا الوهم قد اضل عبدة الاصنام من طريق الصواب واوقعهم فی هاوية الجهالة"۔

یعنی ایسا فعل بت پرستی ہے اور بہت سے لوگ اس وجہ سے جہنم میں جا پڑے ہیں۔

بعض خوش اعتقاد لوگ اپنے مشائخ کی تصاویر اپنے پاس رکھتے اور ان کی تعظیم کیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس ضلالت پر آگاہ فرمائے کس قدر جہالت عظیم ہے ہاں اگر شبیہ روضہ مقدسہ میں حصول ثواب کا خیال نہیں تو کوئی حرج نہیں۔

س۔ بازاری عورت نے اپنی حرام کی کمائی سے مسجد بنوائی ہے کیا اس میں نماز جائز ہے؟ [1]

ج۔ اس مسجد کو حکم مسجد کا نہیں دیا جائے گا۔ ایک حدیث میں جو بروایت حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے وارد ہے: "ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا"۔ یعنی اللہ پاک ہے اور پاک عمل ہی کو قبول فرماتا ہے اور قرآن میں کلمۂ حصر کے ساتھ فرمایا: "انما یتقبل اللہ من المتقین"۔ یعنی اللہ تعالیٰ صرف متقی لوگوں کے عمل کو قبول فرماتا ہے۔ اس لئے جب وہ مسجد حکم پاک مسجد کا نہیں رکھتی تو اس میں نماز پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

---

[1] الھدایٰ؛ ج ۷ ع ۲ ص ۳۷-۳۸

س ۔ جھینگا جو بنگال میں بکثرت کھایا جاتا ہے حلال ہے یا حرام ؟ [1]

ج ۔ جھینگا کو فقہاء نے از قسم ماہی قرار نہیں دیا اور اگر ثابت ہو کہ وہ مچھلی کا قسم ہے تو حلال ہے ۔
حنفیہ مچھلی کے سوا دیگر تمام بحری جانوروں کو حرام جانتے ہیں ۔ قرآن مجید کے لفظ صید البحر
میں مچھلی ہی داخل ہے کیونکہ متعارف الناس صرف صید ماہی ہے نہ کچھ اور اسی لئے صید البحر سے جو مفہوم
عموم صید کا ظاہر ہوتا ہے ۔ وہ متفاہم عرب تک ہی محدود رہے گا اور وہ صرف مچھلی ہے ۔ ہذا عندی واللہ اعلم عند اللہ

س ۔ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی کا مذہب درباره تقلید صحیح طور پر اگر آپ کو معلوم
ہو تو ارقام فرماویں کیونکہ اُن کے بعض رسائل سے تقلید کے برخلاف مفہوم ظاہر ہوتا ہے ۔ [2]

ج ۔ مولوی صاحب مرحوم بڑے پکے حنفی تھے اور علی وجہ البصیرت حنفی تھے کورانہ تقلید بیشک
ان کا مذہب نہیں تھا ۔ ان کا مسلک اعتدال کا تھا اور خاکسار نے جس قدر ان کی تحریریں دیکھی ہیں ۔ ان کا
حنفی ہونا بالکل مسلم ہے ۔ ان کا مجموعہ فتاویٰ حنفی کتب سے ماخوذ ہے اور اسی میں وہ ایک فتاویٰ کے جواب
میں حسب ذیل ارشاد فرماتے ہیں :

چار مذہب اور چار اماموں کو حق جانتا ہوں بلکہ تقلید امام اعظم کوفی رحمۃ اللہ علیہ کو سب
کی تقلید سے احسن سمجھتا ہوں ۔ اور میں انہیں کا مقلد ہوں ۔ یہ مسلک امام الحرمین عبدالملک جوینی کے مسلک

[1] الہدیٰ : ج ۷ ع ۲ ص ۳۸

[2] الہدیٰ : ج ۷ ع ۲ ص ۳۸

سے زیادہ معتدل ہے جو لکھتے ہیں کہ تقلید شافعی واجب ہے۔

مولوی صاحب مرحوم جیسے حنفی علماء بہت کم ہیں۔ نہ صرف استعداد علمی میں بلکہ افراط و تفریط کے مابین چلنے والے۔ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق دے۔

س۔ مولود شریف کی مجلس میں قیام اور خوشبوئی کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ [1]

ج۔ نفس مولود کی مجلس تو قابل اعتراض نہیں کیونکہ اس میں ذکر فضائل و اتباع سنت کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ قیام اور خوشبوئی سو قرون ثلاثہ کی مجالس وعظ میں ایسا کرنا ثابت نہیں بالخصوص قیام پر کوئی دلیل نہیں۔ خوشبوئی کا التزام بغرض ثواب صحیح نہیں اور اگر اس خیال پر نہ ہو تو حرج نہیں۔ قرون ثلاثہ کا زمانہ نوے برس تک ہے۔

کما صرح به العینی حیث قال الی انقضاء القرون الثلاثة وهی تسعون سنة و اما بعد ذلك فقد تغیرت الاحوال وکثرت البدع خصوصاً فی زماننا هذا علی ما لا یخفیٰ۔

یعنی نوے برس بعد رحلت نبوی کے بہت سے بدعات پیدا ہو گئے جن کی کوئی اصل نہیں خصوصاً موجودہ ہمارے زمانہ میں۔

بدعات کا وجود صرف دیگر ممالک تک محدود نہیں بلکہ حرمین میں بھی کئی ایک بدعات نکل آئیں۔ ملا علی قاری حنفی نے ایک رسالہ مستقل بدعات حرمین میں لکھا ہے اور ایسا دیگر اعلام حنفیہ نے تصریح کی ہے مگر یہ بدعات عموماً جاہل متصوفہ کا اختراع ہیں۔ نہ علماء شریعت کا۔

---

[1] الهدی، ج ۷ عدد ۷ ص ۳۹

س۔ عورت اپنے خاوند کے گھر سے بلا اجازت اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو اس صورت میں مہر خاوند کے ذمہ واجب الادا ہو گا؟[1]

ج۔ صورت مسئولہ میں صرف نان و نفقہ ساقط ہو گا۔ مہر بدستور واجب الادا رہے گا۔ فقط

س۔ فوٹو کی تصویر کا شرعاً کیا حکم ہے؟[2]

ج۔ بدعات منکرہ میں سے مسلمانوں میں تصویر کا رواج پا جانا بھی ایک عام دستور ہو گیا ہے۔ شریعت اسلام نے تصویر بنانے والے کے حق میں عذاب کی وعید سنائی ہے اور ان کے استعمال کو حرام یا مکروہ تحریمہ جو حرام کا حکم رکھتا ہے قرار دیا ہے۔ بعض بدعتی فرقوں نے خود بخود بلا حجت شرعی تصاویر کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔ ایسے لوگوں سے بچنا چاہئیے۔ فوٹو کی تصویر ہو یا ہاتھ کی ایک ہی حکم رکھتی ہے۔ اگر تصویر کسی ذلیل جگہ میں پاؤں کے نیچے آتی ہو تو بعض فقہا نے لکھا ہے کہ ڈر نہیں مگر فوٹو کی تصویروں سے تو مکانوں کی آرائش کی جاتی ہے اور ان کو باعزت محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لہذا کسی صورت میں تصویر کی شرعاً اجازت نہیں۔

قبل ازیں اس استفتاء کا جواب ہم نے شائع کر دیا تھا جو لوگ اتباع سنت اپنا شیوہ رکھتے ہیں، انہیں ایسی باتوں سے سخت نفرت ہے یعنی جناب رسول اکرم ؐ نے فرمایا کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے۔ ملائکہ سے ملائکہ رحمت مراد ہیں یا عام ملائکہ۔

[1] الہدیٰ؛ ج ۷ ع ۲ ص ۳۹

[2] الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۲ ص ۳۹

س۔ مجلس مولود اور اس میں قیام کا کیا حکم ہے؟ [1]

ج۔ مجلس مولود میں ذکر فضائل و معجزات و ولادت جناب پیغمبر علیہ السلام کا ہونا کسی مسلمان کے نزدیک ناجائز نہیں۔ اگر قیام کا کوئی ثبوت شرعی تاحال خاکسار کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس بارے میں حضرات مشائخ بھی اجتناب کرتے ہیں۔ لہذا اجتناب اولیٰ ہے کیونکہ بلا حجت شرعی کسی امر کو دائرہ جواز میں نہیں لایا جاسکتا۔

[2]

س۔ بعض لوگ کفار افسروں کو تحفہ و نذرانہ بعض تقریبات پر دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

ج۔ کافر کی تعظیم و تکریم کی نیت سے ایسا کرنا ایمان کو باطل کر دیتا ہے۔ دنیوی اغراض کے لئے اگر ایسا کرے تو خیر مضائقہ ندارد۔

س۔ تصور شیخ کا ثبوت شرعی کیا ہے؟ [3]

ج۔ محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب قول جمیل میں اس کا مفصل جواب پڑھ لیں۔

---

1 الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۵ ص ۳۹
2 الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۵ ص ۳۹
3 الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۵ ص ۳۹

س۔ اگر زید کی زوجہ نے زنا کیا ہو تو کیا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا؟ [1]

ج۔ زنا سے نکاح نہیں ٹوٹ جاتا۔

س۔ مردہ کے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں پر جمع ہونا اور کھانا تصدق کرنا درست ہے یا نہیں؟ [2]

ج۔ ان معینہ تاریخوں کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں لہٰذا ان تاریخوں کو حکم شرعی سمجھ کر تصدق کرنا بدعت ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حرج نہیں۔

س۔ ایک نابالغہ کی چچی نے اس کا نکاح کسی نابالغ سے کر دیا۔ کیا نابالغہ کو بلوغ پر حق فسخ حاصل ہے؟ [3]

ج۔ چچی شرعاً ولی نہیں ہو سکتی لہٰذا اسکا نکاح کیا ہوا شرعاً نافذ نہیں ہو سکتا۔

---

1 الہدایہ؛ ج ۸ ع ۵ ص ۳۹
2 الہدایہ؛ ج ۸ ع ۵ ص ۳۹
3 الہدایہ؛ ج ۸ ع ۵ ص ۳۹

س۔ حدیث "اوّل ما خلق اللہ نوری" سے کیا مراد ہے کیونکہ وجود باجود جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمیع حضرات انبیاء علیہم السلام سے آخر میں ظہور پذیر ہوا؟ [1]

ج۔ حضرات اکابر مشائخ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حدیث سے بہت سے مقامات نبوت و ولایت کی تشریح و توضیح کی ہے۔ حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے مکتوبات میں اس پر بحث کی ہے کہ جو اصحاب سلوک و سیر کے مقامات سے بطور حال واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ وجود باجود جناب سرور کائنات کا جامع جمیع کمالات تھا۔ یعنی حقیقت محمدیہ اسماء و صفات ذات باری کا مظہر کامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جو کمالات روحانیہ افراد خلائق میں متفرق طور پر تقسیم ہوئے وہ سب کے سب حقیقت محمدیہ میں مندرج تھے۔ اور دیگر افراد کو بلحاظ حصول کمالات حقیقت محمدیہ سے نسبت قرب و بعد کی حاصل ہوتی ہے اسکو مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ تمام دائرۂ کائنات بمنزلہ ایک دائرہ کے ہے اور حقیقت محمدیہ بمنزلہ نقطہ مرکز کے ہے۔ دائرہ فی حد ذاتہ کوئی چیز نہیں۔ جب تک مرکز معین نہ ہولے۔ مرکز محیط سے قرب و بعد کے لحاظ سے یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مرکز عین اعتدال حقیقی پر مبنی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جامع کمالات ہوا کرتا ہے اور مرکز کے سوا نقطہ بلحاظ کمال حقیقی کے مرکز سے کبھی مساوات نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کمالات کا انحصار موقوف ہے۔ ان کے مرکز سے قرب و بعد پر۔ اس لئے جس قدر کوئی نقطہ مرکز سے زیادہ قریب ہوگا اسی قدر اس کو بلحاظ کمال کے مرکز سے نسبت قریب حاصل ہوگی اور جس قدر بعید ہوگا اسی قدر بلحاظ کمال کے اس کو نسبت بعیدہ ہوگی۔ چنانچہ یہ نسبت ان اکابر حضرات کو جو ظاہر و باطن میں غایت اتباع سنت کو پہنچ چکے ہیں۔ بدرجہ کمال حاصل ہے اور بصورت ثانی جس قدر کوئی شخص اعتقادات باطلہ اور اعمال قبیحہ میں مبتلا ہے اسی قدر وہ مقام کمال سے دور پڑا ہے۔ اس تشریح سے حدیث

---

[1] الہدیٰ؛ ج ۸ ع ۱۱ ص ۱۹-۲۰

قدسی "لولاک لما ظہرت الربوبیۃ " کا مطلب بھی واضح ہو گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فیضان وجود ذات باری کی طرف سے بواسطۂ وجود باجود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے افراد کائنات تک پہنچا۔
اس لئے وجود حقیقۃ محمدیہ کا مقدم ہونا بلحاظ تعین اول کے قرار دیا گیا ہے۔ اسی مضمون کو حدیث "کنتُ نبیاً و آدم بین الماء والطین" واضح کرتی ہے۔ حالانکہ وجود خارجی میں جناب ابوالبشر علیہ السلام کا وجود مقدم ہے اس سے معلوم ہوا کہ اولیت جناب خاتم المرسلین کی بلحاظ تعین اول کے ہے لہٰذا چونکہ کمال کسی چیز کا قرب مبدء پر موقوف ہے۔ یعنی جس قدر کوئی چیز اپنے مبدء سے زیادہ قریب ہوگی اسی قدر وہ آثار مبدء کی زیادہ متحمل ہوگی اور چونکہ حقیقۃ محمدیہ تعین اول ہے اور اس کے اور مبدء فیاض کے درمیان کوئی اور واسطہ نہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ حقیقت محمدیہ تمام اسماء و صفات ذات باری کا کامل مظہر ہے اور حدیث "لولاک لما خلقت الافلاک" میں اگرچہ علماء محدثین نے کلام کیا ہے مگر معنیٰ کے رو سے دیگر احادیث اس کی تائید کرتی ہیں۔ مسند عبد الرزاق میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے جس سے اس حدیث سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں حضور علیہ السلام کے نور کا تعین اول ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہم نے بنظرِ اختصار حدیث کو نقل نہیں کیا (دیکھو مواہب

هذا ما عندی والعلم عند اللہ

س۔ نُصیریہ کون ہیں اور ان کے کیا عقائد ہیں؟ [1]

ج۔ نُصیر ایک شخص کے نام پر یہ فرقہ مشہور ہے جس کی نسبت جہّال شیعہ میں مشہور ہے
کہ یہ شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وفاداری میں بارہا شہید اور بارہا زندہ ہو کر لڑتا رہا۔ یہ شخص
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خدا تعالیٰ مانتا تھا اور مشرک و کافر تھا اس کے پیروان اب بھی بلاد عراق و شام
و فارس میں کہیں کہیں موجود ہیں۔ ان کے عقائد کی تفصیل کے لئے بہت سا وقت درکار ہے مگر مختصراً حسب
ذیل سمجھیں " یہ لوگ خمر کو حلال جانتے ہیں اور تناسخ ارواح کے قائل ہیں۔ عالم کو قدیم جانتے ہیں
اور بعث و حشر سے انکار کرتے ہیں اور نماز پنجگانہ سے علی، حسن و حسین و محسن و فاطمہ رضی اللہ عنہم مراد
ہیں۔ اگر انہیں غسل جنابت کرنا ہو تو انہیں حضرات پنجگانہ کا نام غسل کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور ماہ رمضان
کے روزہ سے تیس مرد اور تیس عورتیں مراد ہیں جن کے نام ان کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان کے ہاں کوئی شخص
نُصیری نہیں ہو سکتا نہ وہ ان کے اندرونی اسرار و مخالطت و معاشرت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ جب تک
تک ان کا معلم اس سے حسب ذیل حلف نہ لے لے کہ وہ اپنا مذہب لوگوں سے مخفی رکھے گا اور وہ اپنے خدا اور
امام (علی) کو پہچانے گا۔ چنانچہ ان کے ایک مشہور امام کا یہ شعر ہے۔

اشہد ان لا الٰہ الا	حیدرۃ الانزع البطین

یہ لوگ عام طور پر لوگوں سے اپنا مذہب ظاہر نہیں کرتے بلکہ ان میں مخلوط و مانوس
رہتے ہیں اور جب تک کوئی اپنے مذہب کا مل جائے تو اس سے اپنا مذہب ظاہر کرتے ہیں۔ قرامطہ،
باطنیہ بھی انہیں لوگوں سے عقائد میں ملتے ہیں۔ کتب تاریخ ان کے عام فسادات و محاربات سے پُر ہیں۔ اسلام
و اہل اسلام کے حق میں ان لوگوں کا وجود مشرکین سے بھی زیادہ ضرر رساں ثابت ہوا ہے۔ فقط

[1] الہدایہ: ج ۹ ع ۳ ص ۳۸

س ۔ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور تاریخ نکاح سے ساڑھے چھ ماہ کے قریب ایک لڑکی پیدا ہوئی اور وہ شخص مر گیا۔ اب وارثوں میں جھگڑا ہے کہ وہ لڑکی متوفی کی دختر ہو گئی یا نہیں [1]
بینوا توجروا ۔

ج ۔ صورت مستفسرہ میں لڑکی کا نسب ثابت ہے اور اس لئے وہ شخص مذکور کے ترکہ سے شرعاً حصہ پا سکتی ہے ۔

واذا تزوج الرجل امرأة فجاءت بالولد لاقل من ستة اشهر منذ تزوجها لم يثبت نسبه وان جاءت به لستة اشهر فصاعدا يثبت نسبه منه اعترف به الزوج او سكت (عالمگیریہ ناقلاً عن الهداية باب ثبوت النسب)

س ۔ ایک شخص نے اپنی عورت کو ناراض ہو کر یوں کہہ دیا میری طرف سے تجھے طلاق اور طلاق اور طلاق اگر خدا کو منظور ہوا تو یونہی ہو گا کیا عورت پر طلاق پڑ جائے گی ۔ [2]

ج ۔ صورت مسطورہ بالا میں طلاق واقع نہیں ہوئی ۔ ولو قال انت طالق وطالق و طالق ان شاء الله يصح الاستثناء ولا يقع شيء (خانیہ ص ۲۸٦ مطبوعہ مصر بہامش عالمگیریہ)

س ۔ ایک مسلمان دکاندار سے جب کوئی شخص روپیہ کا خوردہ (توڑ) لیتا ہے تو تین پائی بطور

---

[1] الھدائے ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۲۴

[2] الھدائے ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۲۴

معاوضہ سکہ کے لے لیتا ہے۔ آیا از روئے شریعت دکاندار مذکور کو ایسا منافع لینا جائز ہے؟[1] بینوا توجروا۔

ج۔ اگر چاندی کے عوض چاندی اور سونے کے عوض سونے کا ادل بدل کیا جائے تو کمی بیشی حرام ہے لیکن جب ہر دو جنسیں مختلف ہوں تو ان کا ادل بدل کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ فی الحدیث: الذهب بالذهب والفضة بالفضة ...... يدًا بيدٍ سواءً بسواءٍ۔

لہذا دکاندار مذکور کو ایسا منافع لینا جائز ہے۔

س۔ اگر عورت نے اپنا مہر خاوند سے نہ لیا ہو اور عورت اور خاوند ہر دو مر جائیں تو کیا عورت کے ورثاء کو خاوند کی جائداد سے مطالبہ کا حق شرعًا حاصل ہے؟[2] بینوا توجروا۔

ج۔ ہاں عورت کے ورثاء کو حق حاصل ہے کہ خاوند کی جائداد سے مہر کو وصول کرلیں مگر شرط یہ ہے کہ خاوند پہلے مرا ہو یا دونو ایک ہی وقت میں مر گئے ہوں یا تقدم و تاخر کا علم نہ ہو لیکن اگر عورت پہلے مری تو بقدر حصہ زوج مہر سے ساقط کیا جائے گا اور باقی ورثاء عورت کا حق ہوگا۔

هكذا في فتح القدير۔

1 الہدایہ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۲۴

2 الہدایہ؛ ج ۹ ع ۵ ص ۲۴

السلام علیکم! ایک عیسائی نے خاکسار سے مفصلہ ذیل سوال کا جواب مانگا ہے از راہ مہربانی تفصیلاً مطلع فرماویں تاکہ میں عیسائی مذکور کو مطمئن کر سکوں۔

س۔ جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتنی اولادیں تھیں اور کس تفصیل کے ساتھ؟ [1]

ج۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ذکور و اناث میں اہل سیر و تواریخ نے بہت اختلاف کیا ہے۔ قسطلانی مواہب لدنیہ میں حسب ذیل لکھتے ہیں۔

حضور علیہ السلام کی وہ اولادیں جو متفق علیہم ہیں۔ چھ ہیں۔ دو بیٹے قاسمؓ ابراہیمؓ اور چار بیٹیاں زینبؓ۔ رقیہؓ۔ ام کلثومؓ۔ فاطمہؓ۔ ان کے علاوہ طیب اور طاہر بھی دو بیٹے تھے مگر ان کی نسبت اختلاف ہے۔ زبیر بن بکار راوی ہیں کہ ابراہیم اور قاسم کے سوا حضور علیہ السلام کا ایک بیٹا عبداللہ نام بھی تھا لڑکپن ہی میں مکہ میں فوت ہوا۔ اس بیٹے کو طیب اور طاہر بھی کہا کرتے تھے۔ یعنی اس بیٹے کے تین نام تھے۔ بعض اہل سیر نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی سات (۷) اولادیں تھیں۔ تین ذکور اور چار اناث۔ مگر بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ طیب و طاہر عبداللہ کے علاوہ اور دو بیٹوں کے نام ہیں۔ اس روایت کے مطابق نو اولادیں ثابت ہوتی ہیں۔ بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ طیب اور مطیب توأم پیدا ہوئے اور پھر طاہر اور مطہر توأم پیدا ہوئے۔ اس روایت کے مطابق گیارہ اولادیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک روایت میں لکھا ہے کہ قبل از بعثت ایک بیٹا عبد مناف بھی پیدا ہوا تھا۔ اس طرح بارہ اولادیں ہو گئیں۔ اس آخر الذکر کے سوا باقی سب اسلام میں پیدا ہوئے۔ مگر مورخ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ بجز ابراہیم کے باقی اولادیں سب قبل از اسلام پیدا ہوئیں اور سب بیٹے قبل از اسلام بحالت شیر خوارگی فوت ہو گئے۔ ان سب اقوال سے معلوم ہوا کہ آپ کے آٹھ بیٹے تھے جن میں دو قاسم اور ابراہیم تو بالاتفاق مسلم ہیں اور باقی چھ مختلف فیہم ہیں مگر اصح مذہب یہ ہے کہ

[1] الہدیٰ؛ ج ۹ ع ۶ ص ۳۰

تین بیٹے اور چار بیٹیاں متفق علیہم ہیں اور یہ سب بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے۔ اور ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اولاد اناث یعنی چاروں بیٹیاں اسلام میں عزت ہوئیں اور وہ مہاجرات میں شمار ہوتی ہیں۔

س۔ خون اور خنزیر کی حرمت شرعی اور ربوا کی حرمت کس مصلحت پر مبنی ہے؟ [1]

ج۔ شریعت حقہ نے حلت و حرمت کے حکم عائد کرنے میں دو بڑی مصلحتوں کو مدنظر رکھا ہے، اول جسمانی مضرتوں سے بچانا دوم اخلاقی یا روحانی خرابیوں کو روکنا۔ غور کر کے دیکھو جس امر کی ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے یا تو کسی جسمانی مضرت کا انسداد مدنظر ہے یا کسی اخلاقی یا روحانی بیماری سے انسان کو بچانا مقصود ہے خواہ وہ بیماری اس شخص کی ذات پر موثر ہو یا اس کا اثر تمدن و معاشرت پر عائد ہو کر دوسرے لوگوں تک متعدی ہوتا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی جاہل اور خود غرض ذاتی اور جزئی منفعت یا لذت کو مدنظر رکھ کر شریعت حقہ کی اس عام مصلحت اور حکمت کو نظرانداز کر دے یا انکار کر بیٹھے مگر ایسے بے باک لوگوں کی شخصی رائے کو جو اصول شریعت پر مبنی نہیں ہوتی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ شریعت کا کام یہ ہے کہ امر و نہی کو واضح کر دے اور اس پر وعد و وعید سنا دے۔ ہر ایک زمانہ کے اہل تحقیق اوامر و نواہی کے حکم و مصالح سے خود آگاہ ہو جاتے ہیں۔

امور مستفسرہ مذکورہ بالا میں خون اور خنزیر بالوضاحت شریعت اسلامی میں حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ خون میں مختلف قسم کے ایسے مواد ملے ہوتے ہیں، جو صحت جسمانی کے لئے سخت مضر ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو تازہ ہوا اندر سے ہو کر باہر آتی ہے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وہ مہلک ہوتی ہے۔ ڈاکٹر لوگ ان اجزاء کو علیحدہ علیحدہ دکھلا سکتے ہیں جو خون میں مختلط ہیں۔

---

1 الہدی؛ ج ۹ ع ۶ ص ۳۱ – ۳۲

انگریزی اصطلاح میں اس قسم کی مختلط المواد ہوا کو کاربن بولتے ہیں۔

خنزیر سابقہ شریعتوں میں بھی حرام تھا۔ اس جانور کے گوشت میں ایسے اجزاء شامل ہوتے ہیں جو خون کو فاسد کرتے ہیں اور فساد خون انواع واقسام کی بیماری کا موجب ہے۔ معہذا بعض اطباء نے لکھا ہے کہ خنزیر کا گوشت مرض جذام کو پیدا کرتا ہے۔ روحانی طور پر اس کے متعلق بعض محققین نے لکھا ہے کہ اس جانور کا گوشت قساوت قلب اور وقاحت (بے شرمی) کا باعث ہے۔ چنانچہ جو اقوام اس کا استعمال کرتی ہیں وہ نسبتاً زیادہ بے غیرت اور بے حمیت ہیں۔

ربٰو خواری ایک ایسا فعل ہے جو تمام آسمانی شرائع میں ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کی حرمت کی وجہ ہر ظاہر ہے کیونکہ اسلام کی بنیاد اصول اتحاد پر مبنی ہے اور سود خواری انسان کو خود غرض۔ لالچی اور ظالم بے رحم بنا دیتی ہے اور یہ تمام صفات نسیان آخرت کا باعث ہوتے ہیں۔ جوں جوں سود کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ سود خوار کی آتش حرص اور بھی مشتعل ہوتی جاتی ہے اور اس کو مدیون کی تباہی اور بربادی کی مطلقاً پروا نہیں ہوتی۔ شرح سود معین ہوتی ہے اور سود خوار کو اپنی آمدنی پر خواہ ماہوار ہو یا سالانہ پورا اعتماد ہوتا ہے اور توکل جو تعلیم اسلام کا روح و رواں ہے نام کو بھی باقی نہیں رہتا۔ برخلاف تجارت کے جس میں محض توکل ذات باری پر کام کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی اعتماد نہیں ہوتا کہ کیا وصول ہوگا بلکہ بسا اوقات خسارہ اٹھانا پڑتا ہے مگر سود خواری میں سود خوار کو کامل وثوق ہوتا ہے کہ مردہ بہشت جائے یا دوزخ ملاّ کو حلوے مانڈے سے کام۔ اس کی رقم تو یوماً فیوماً ایک خاص شرح سود پر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مدیون خواہ جائداد بیچے یا کوئی اور سبیل اختیار کرے سود خوار کو ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ساہوکار نے گھر کا تمام مال واسباب ضبط کرا لیا اور مدیون کے بال بچے روتے رہ گئے۔ مگر اس ظالم بے رحم نے اصل معہ سود وصول کر ہی لیا۔ چونکہ یہ سلوک غائت درجہ کی بے رحمی اور سنگدلی کا نتیجہ ہے جس میں انسانی ہمدردی یا قومی مواسات کا کوئی حصہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اسلئے شریعت حقہ ایسے ناہنجار فعل کو کبھی حلال قرار نہیں دے سکتی۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ تمدن ومعاشرت کے تمام روابط پر سود خواری کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ سود خوار کو صرف کی آمدنی پر مطمئن ہوکر کسی مفید سلسلۂ محنت سے جو تمام افراد جماعت کے لئے ضروری ہے دست بردار ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی روش کاہلی اور بزدلی سے دوسرے افراد پر بہت برا اثر ڈالتا ہے۔ سود خوار اشخاص تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اخلاق حسنہ کے پایہ سے گر جاتے ہیں اور جعد

و کرم اور مروت و عالی ہمتی اور وسیع النظری اور ہمدردی سے کوسوں دور جا پڑتے ہیں۔ بہرصورت شریعت حقہ نے ایک ایسے رذیل فعل کی مخالفت میں انسان کی سینکڑوں تمدنی اور معاشرتی اور اخلاقی مصلحتوں کو مدّنظر رکھا ہے اور یہ صرف فرضی اور وہمی نہیں بلکہ تحقیقی اور نفس الامری ہیں۔ اگر آج کوئی شدید الحرص جاہل جواز سود کی ضرورت پر بحث کرنے لگے تو اس کے توہمات پر حکم شرعی کی اصلیت میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔ اگر اہلِ اسلام شریعت حقہ پر چلتے تو آج انہیں نہ تو سود خواری سے مخالفت شریعت کا موقع ملتا اور نہ کسی دوسری قوم کے آگے سود ادا کرنے کی نوبت آتی۔

آج کل بعض جاہل اردو خواں ایڈیٹران اخبار اور نو تعلیم یافتگان بیاجہ اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ضعف سیاسی کی وجہ یہ ہے کہ وہ دوسری متمدن اقوام کی طرح سود خواری نہیں کرتے کیونکہ تجارت سے قومی دولت بڑھتی ہے اور موجودہ ضروریات کے رُو سے تجارت بجز سود خواری کے ناممکن ہے۔ واضح ہو کہ اس رائے کے مؤید عموماً ایسے لوگ ہیں جو نہ تو صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور نہ اعتقاداً ان کی پابندی کو حکم خداوندی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں ان لوگوں کا جواز سود خواری پر زور دینا جو وقعت رکھتا ہے صحیح الایمان خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تعجّب تو یہ ہے کہ یہ جہّال علمائے شریعت کو عدم جواز سود کا فتوٰی دینے پر کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ تمام مشکلات تمہاری اپنی کرتوتوں کا نتیجہ ہیں۔ علماء تو کلمۃ الحق کہتے ہیں گے تم مانو نہ مانو۔ ان علماء سے جواز سود کے فتوے کی توقع مت رکھو، جو کتاب اللہ اور سنت صحیح سے آگاہ ہیں۔

س۔ جو شخص فری میسن ہو جائے اس کی نسبت شریعت اسلامی کیا حکم دیتی ہے؟ [1]

ج۔ فری میسن کی نسبت شرعی حکم جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ فری میسن کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ سو واضح ہو کہ فری میسن کا طریق کوئی نئی ایجاد نہیں بلکہ مسمریزم کی طرح اس کا رواج بھی قدیم الایام سے چلا آتا ہے جہاں تک ہم نے اس کے متعلق واقفیت حاصل کی ہے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک تسخیر شیاطین کا طریق ہے جو ایک ایسے شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو عقائد حقہ مذہب کا انکار کر دے کیونکہ شیاطین (ارواح خبیثہ ارضیہ) کسی ایسے شخص سے کبھی راضی نہیں ہوتے جو مذہب کے عقائد و اعمال کا پابند ہو اور اسی لئے اس کی تسخیر میں بھی نہیں آسکتے۔ کوئی شخص فری میسن نہیں ہو سکتا جب تک پہلے وہ ترک مذہب کا عہد و پیمان نہیں کر لیتا۔ فری میسن بظاہر اپنے اہل مذہب میں شامل رہتا ہے مگر حقیقتاً وہ اس مذہب سے خارج ہوتا ہے چونکہ اس طریق کی بنیاد سحر و تسخیر شیاطین پر مبنی ہوتی ہے اس لئے فری میسن صریح کافر ہے اور اس لئے شرعاً مرتد کا حکم رکھتا ہے یعنی واجب القتل ہوتا ہے اگر بلا توبہ مر جائے تو اس کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیئے۔

یہ امر کہ فری میسن کافر ہوتا ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

"وما کفر سلیمانُ ولکنّ الشیاطین کفروا۔"

یعنی یہود جو سلیمان علیہ السلام کی نسبت سحر و تسخیر شیاطین کے عمل کرنے کو منسوب کرتے تھے، جھوٹے ہیں کیونکہ ایسا عمل کفر ہے اور سلیمان علیہ السلام اس سے بری ہیں بلکہ یہ شیاطین کا عمل تھا۔ فقط

{خاکسار اصغر علی روحی}

[1] الہدیٰ؛ ج ۹ ع ۱۲ ص ۲۳

س ۔ کیا تناسخ الارواح کے بطلان میں کوئی آیت آچکی ہے ؟ [1]

ج ۔ الہدیٰ سال پنجم کے کسی نمبر میں مختصراً موضوع مذکورہ بالا پر بحث کر کے دکھلایا گیا تھا کہ اسلام تناسخ ارواح کو تسلیم نہیں کرتا مگر اہل اسلام میں بعض متکلمین مثلاً احمد بن حابط اور احمد بن نانوس اور ابومسلم خراسانی اور محمد بن زکریا طبیب رازی تناسخ ارواح کے قائل ہوئے ہیں اور فرقۂ قرامطہ بھی جو اہل اسلام میں ایک مشہور ملحدین کا فرقہ ہے تناسخ کو مانتا ہے لیکن نہ صرف اسلام اس مسئلہ کو باطل ظاہر کرتا ہے بلکہ پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور اُن کے صحائف بھی اس مسئلہ کے مخالف ہیں ۔ مع ہذا حکماء فلاسفہ میں بھی اکثر اس مسئلہ کی اصلیت کو بالکل باطل جانتے ہیں اور درحقیقت کوئی دلیل قطعی اثبات تناسخ میں آج تک قائلین کو نہیں مل سکی ۔ ہمیں یہاں ان تمام بھونڈے دلائل [2] پر جو قائلین تناسخ پیش کیا کرتے ہیں اور اُن کے ابطال پر بحث کرنا مد نظر نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آیا قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت وارد ہوئی ہے جو بطلان تناسخ پر دلالت کرے ؟ کیونکہ امت مرحومہ کے جمیع علمائے فقہاء و محدثین تو بالاتفاق مذہب تناسخ کو باطل قرار دیتے ہیں مگر خصم قرآن مجید کی آیت اس دعوے پر طلب کرتا ہے ۔ سوہم سائل کو اس امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن سے صراحتاً اور اشارۃً مرنے کے بعد عالم آخرت میں جزاء و سزا کا ذکر ہے اور صاف الفاظ میں مذکور ہے کہ ہر ایک شخص کو مرنے کے بعد اپنے نیک و بد اعمال کا جواب دہ ہونا پڑے گا اور ایک خاص دن اس فیصلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی اور وہ وہی دن ہے جس کو قیامت کبریٰ کہا جاتا ہے ۔ تعجب ہے کہ

---

[1] الہدیٰ ؛ ج ۱۰ ع ۹ ص ۳۱ - ۳۲

[2] مسلمانوں میں جو لوگ تناسخ کے قائل ہوئے ہیں ۔ انہوں نے قرآن مجید کے بعض آیات سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہا ہے اور اس بارے میں بالخصوص وہ آیۂ "فی ای صورۃ ما شاء رکبک" اور نیز آیۂ "جعل لکم من انفسکم ازواجاً و من الانعام ازواجاً یذرؤکم فیہ" کو پیش کیا کرتے ہیں مگر حاشا و کلا کہ ان آیات یا بعض دیگر اس قسم کی آیات سے تناسخ ثابت ہوتا ہو کیونکہ یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں ۔ پہلی میں انسان کی خلقت کا ذکر ہے اور دوسری میں اظہار احسان کا اور بس ۔

باوجود اس قدر وضاحت کے کیونکر کسی شخص کو حقیقت تناسخ کے بطلان میں شک رہ سکتا ہے کیونکہ اسلام کا مذکورہ بالا عقیدہ جزاء و سزا منافی تناسخ ہے

مگر با اینہمہ ہم سائل کو آیۂ "وحرام علی قریۃ اھلکناھا انہم لا یرجعون" کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس آیت سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والوں کو پھر اس دنیا میں نہیں آنا ہوگا اگر حقیقت تناسخ کو صحیح مان لیا جاوے تو ضروری ہے کہ بعض روحیں جو پہلے جنم میں نیک عمل رکھتی ہیں پھر کسی ایسے قالب میں منقلب ہوں جو پہلے سے زیادہ بہتر ہو جس طرح بداعمال روحیں بدترین قالبوں میں منقلب ہوتی ہیں مگر آیتِ مسطورہ بالا بالکلیت رجوع کی نفی کرتی ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں ممکن ہے کہ بعض کوتاہ نظر تاویلات رکیک کرنے لگیں۔ مگر حق یہ ہے کہ آیت اپنے مفہوم میں صاف ہے۔ تفسیر واحدی میں اسی آیت کے ذیل میں یوں لکھا ہے۔

وحرام علی قریۃ یعنی قریۃ کافرۃ اھلکناھا ای اھلھا بعذاب الاستئصال ان یرجعوا الی الدنیا ولا زائدۃ فی الآیۃ ومعنی حرام علیہم انہم ممنوعون من ذالک لان اللہ تعالیٰ قضی علی من اھلک ان یبقی فی البرزخ الی یوم القیامۃ۔

قائلین تناسخ کے خیال پر ضروری ہے کہ جب وہ لوگ ہلاک ہو جائیں تو پھر کسی دوسری صورت میں دنیا کی طرف لوٹائے جائیں مگر یہ آیت اس خیال کو باطل ثابت کرتی ہے۔

فقط والعلم عند اللہ۔

س ۔ تصوف میں شریعت کے علاوہ کوئی نئی بات ہوتی ہے یا صرف شریعت کی کامل پابندی کا نام ہے اور اگر کوئی شخص شریعت کی پوری پابندی کرلے تو پھر کسی شیخ کی بیعت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب مفصل تحریر فرمائیے کیونکہ بعض صاحبان بیعت کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ [1]

ج ۔ میرے خیال میں لفظ تصوف نے لوگوں کو بہت کچھ دھوکا دے رکھا ہے۔ اگر اس لفظ (اصطلاح) کو اڑا دیا جائے تو میرے خیال میں بہت سے اصحاب نفسی مسائل میں متفق ہو سکتے ہیں کیونکہ بعض متصوفہ رند مشرب نے متبعین قرآن وسنت کو اپنی بے باکیوں سے بہت کچھ بدظن کر رکھا ہے۔ اس لئے "بدنام کنندۂ نکونامے چند" کا مصداق بن کر اکثر حضرات کو رجوع الی الحق سے روک دیتے ہیں لیکن اگر اس لفظ کو نظر انداز کرکے حقیقت نفس الامری کو دیکھا جاوے تو کوئی امر قابل اعتراض نظر نہیں آتا ؎

گر زسرّ معرفت آگہ شوی لفظ بگذاری سوئے معنی روی

اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ان ہر دو کی اصلاح اس کے لئے ضروری ہے اس لئے شریعت اسلامی ان ہر دو پہلوؤں پر حاوی ہے اور یہی اس شریعت حقہ کی افضلیت کی دلیل ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ وذروا ظاهر الاثم وباطنه ۚ یعنی ظاہر اور باطن گناہوں کو چھوڑ دو۔ ظاہر کے گناہ تو وہ ہیں جن کو سب لوگ جانتے ہیں مگر باطن کے گناہوں سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں اور ظاہر کے گناہوں کو لوگ ہمیشہ چھپایا کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے باطن کے گناہوں کے لئے اخفاء کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود ہی مخفی ہوتے ہیں اور بجز علیم بذات الصدور کے کوئی ان سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی مسلم ہے کہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ جو شخص ظاہر و باطن کے گناہوں سے آگاہ ہو وہ انہیں ترک بھی کردے کیونکہ ترک گناہ کے لئے ضرورت ہے مجاہدہ و محاسبۂ نفس کی اور یہ دونوں باتیں بجز کسی ایسے شخص کے دوسرے کو میسر

[1] الہدیٰ ؛ ج ۱۰ ع ۶ ص ۳۳ ـ ۳۷

نہیں ہو سکتیں جس نے بتوفیق الٰہی تصفیہ و تزکیہ نفس کا التزام کیا ہو اور تزکیہ نفس ہر ایک شخص کا فرض ہے
" قال اللہ تعالیٰ قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا" پس اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا صرف احکام ظواہر شریعت کی پابندی اور
عدم محافظت باطن سے کوئی شخص تزکیہ و تصفیہ حاصل کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب پورے وثوق کے ساتھ یوں دینا
چاہئیے کہ نہیں۔ اس امر کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت نہیں مشاہدہ و تجربہ کافی ثبوت ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں
لاکھوں لوگ ایسے موجود ہیں جو بظاہر تمام احکام شرعیہ کے پابند ہوتے ہیں مگر شیطنت و خباثت میں ابلیس کے قائم مقام
ہوتے ہیں۔ عوام الناس کا تو بھلا کیا ذکر ہے۔ ہمیں تو ایسے نظائر بھی بیسیوں معلوم ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے علوم دینیہ
کو باضابطہ حاصل کیا ہوتا ہے یا مدتوں درس و تدریس میں منہمک رہتے ہوتے ہیں اور مسائل کو حل کرنے میں صحیح
اور قوی دلیل پیش کر سکنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ مگر عملی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عوام الناس سے بھی گرے ہوئے ہوتے ہیں۔
امراض روحانیہ حسد۔ غضب۔ عداوت۔ بغض۔ حرص۔ تکبر۔ ہوس نام آوری۔ خواہش ترفّع و
تغلّب کی تشریح علی طریق کر جانتے ہیں۔ مگر خود انہیں امراض میں ایسے مبتلا ہوتے ہیں جیسے عامۂ ناس۔ امام
غزالی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر کیا خوب لکھا ہے کہ یہ مت سمجھو کہ جو شخص اپنی علمی استعداد اور مطالعہ کتب سلف
سے باریک باریک لطائف و معانی کی تشریح کر سکتا ہے اور امراض روحانیہ کی چارہ جوئی سے آگاہ ہے۔ وہ
فی الحقیقت تصفیہ و تزکیہ کا بھی مالک ہے یا اس کو اطمینان قلب کا مقام حاصل ہے۔

پس جب بخوبی معلوم ہو چکا کہ صرف کسی امر کے جان لینے سے اس امر کی عملی طاقت پیدا نہیں
ہو جاتی بلکہ عملی طاقت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس امر پر بالالتزام مداومت کی جائے چنانچہ کسی فن یا حرفہ
کا کوئی شخص ماہر نہیں کہلا سکتا۔ جب تک مدت العمر اس کو عمل میں نہ لائے اس لئے روحانی تصفیہ و تزکیہ کے لئے
ضروری ہے کہ بالالتزام کتاب و سنت کی پیروی کی جائے چونکہ گناہ کی خواہش فطرتاً انسان میں ودیعت رکھی گئی ہے
اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جس سے انسان کے دل سے گناہ کی خواہش دور ہو جائے۔
کیونکہ گناہ کی خواہش ایک ایسا امر ہے جو باطن سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہر ایک شخص اس پر آگاہ نہیں
ہو سکتا اور جب کوئی شخص آگاہ نہیں اور اس کے دور کرنے پر بھی وہ قادر نہیں ہو سکتا۔ پس کسی ایسے شخص کی
ضرورت ہے جو طالب کو حقیقت گناہ پر آگاہ کر کے اس کو بخوبی ہدایت کر سکے اور جب طالب کو یہ مقام حاصل
ہو گا کہ وہ گناہ کو اپنے تئیں محفوظ رکھ سکے تو اس پر باب رموز و اسرار کا کھول دیا جاتا ہے (وہ رموز
و اسرار مراد نہیں جن کو علمائے قال الفاظ کی ترکیب و تشریح سے استنباط کیا کرتے ہیں بلکہ وہ اسرار و معارف

مراد ہیں جو بطور انکشاف قلب مومن پر عائد ہوتے ہیں) اگر کوئی شخص ان اسرار و معارف کے وجود سے انکار کرنے لگے تو یہ اس کی نادانی کی دلیل ہے۔ الناس اعداء ما جھلوا (انسان جس چیز کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے اسی کی مخالفت کیا کرتا ہے)

اس موقع پر مجھے ایک صاحب کا واقعہ یاد آگیا جو ایک بڑے عالم و فاضل مرد خدا نے میرے پاس بیان کیا جس کی کیفیت وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ علم باطن کے ایک حضرت سخت منکر تھے۔ میں نے انہیں بہت سے دلائل سے قائل کرنا چاہا مگر وہ برابر انکار کئے گئے اتنے میں ان کے شاگرد کتاب صحیح بخاری سامنے لے کر سبق کے لئے آبیٹھے۔ اتفاق سے باب قوله واذ قال موسىٰ لفتاه .... الخ شروع ہوا میں نے پوچھا کہ حضرت وہ کون سا علم تھا جس کے سیکھنے کی استدعا موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام باوجود نبی صاحب شریعت ہونے کے تلقین خضر کے کیونکر محتاج ہوئے؟ ظاہر ہے کہ وہ تعلیم احکام شرعیہ کی تو نہ تھی کیونکہ وہ نبی اللہ تھے جو اپنی قوم کو احکام شریعت کی تبلیغ کیا کرتے۔ اس سوال کے جواب میں مولوی صاحب سے کچھ نہ بن پڑا اور نادم ہو کر خاموش ہو رہے اور حدیث ابوھریرہ رضی اللہ عنہ میں جس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے وارد ہوا ہے کہ میں نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علوم حاصل کئے ان میں سے ایک قسم کو تو میں نے عام طور پر بذریعہ روایت تبلیغ کیا ہے اور ایک قسم کو مخفی رکھا ہے اگر میں اس کا اظہار کروں تو تم لوگ میرا گلا کاٹ دیں۔ ظاہر ہے کہ وہ دوسرے قسم کا علم ایسے حقائق و معارف ہو سکتے ہیں جو عامۃ ناس کے افہام سے بالاتر ہیں اگر انہیں کھلم کھلا بیان کیا جائے تو بوجہ قصور فہم لوگ زندقہ و الحاد کی طرف منسوب کر دیں۔ اس حدیث کی شرح میں بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی اس دوسری قسم علم سے وہ فتنہ و فساد مراد ہیں جو حضور علیہ السلام کی رحلت کے بعد وقوع میں آئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ توجیہ صحیح نہیں کیونکہ اس صورت میں اس حدیث کو کتاب الفتن میں بیان کرنا مناسب تھا نہ کتاب العلم میں۔ مع ہذا آنے والے فتنہ و فساد کے متعلق ابوھریرہ اور دیگر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات برابر کتب احادیث میں مصرح ہیں۔ لہٰذا اس علم سے مراد وہ حقیقی علوم ہیں جو ایک عارف کامل کو مجاہدت و ریاضت نفس کے بعد بطور انکشاف حاصل ہوتے ہیں یہ وہ علوم نہیں جو صرف بطور موہبت الٰہی خاص مقربین بارگاہ پر افاضہ کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل بے وقوف ان کی اصلیت اور ضرورت سے انکار کرنے لگے تو ایسے شخص کو معذور سمجھ کر اس سے تعرض نہیں کرنا چاہیے۔

الغرض جب یہ مسلم ہو چکا کہ انسان کے لئے معرفت ذات باری فرض ہے اور جس قدر کسی شخص پر اسماء و صفات ذات باری کی حقیقت زیادہ منکشف ہو گی اسی قدر وہ شخص زیادہ عارف خدا کہلائے گا۔ اس لئے ضرور ہے کہ اسماء و صفات باری کی حقیقت کو سمجھا جائے اور چونکہ اسماء و صفات کا ادراک بجز تعلیم قرآن و سنت کے ناممکن ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن و سنت کی پابندی کا التزام کیا جائے مگر صرف ظواہر احکام کی پابندی تک محدود رہنا (گو نجات و معرفت کے لئے کافی ہو) مگر انسان کو اس کی غایت حقیقت تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ پابندی شریعت شرط ہے اور بجز اتباع شریعت کے کوئی شخص کچھ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا مگر اتباع شریعت کے بعد طریق وصول کی تعلیم کا درجہ ہے سو اس بارے میں شروع سلسلہ بنی آدم سے سنت الٰہی اس امر پر جاری ہوئی ہے کہ ایک شخص افادہ فیضان کرتا ہے اور دوسرا اس فیضان کو حسب فطرت قابلہ حاصل کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو مدتوں شعیب علیہ السلام کی خدمت میں رہ کر اکتساب فیضان کرنا پڑا اور پھر مقام رسالت کا استحقاق حاصل ہوا۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتب خانہ ادبنی ربی فاحسن تادیبی میں تعلیم وحی حاصل کی اور پھر آپ نے حضرات صحابہ کو اپنی ہدایت سے منزل عرفان تک کھینچا اور اس مقدس جماعت میں جو حضرات اس قابل تھے کہ وہ دوسروں کو روحانی تربیت سے بہرہ یاب کر سکیں۔ انہوں نے آنے والوں کو اس انعام سے بے بہرہ نہ چھوڑا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ فیضان اسی طرح جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسی سلسلہ کے کسی بزرگ متبع شریعت غیر مبتدع کی صحبت میں رہ کر اکتساب کمال کیا جائے لیکن اگر ایسا شخص نہ مل سکے تو اتباع کتاب و سنت سے غافل نہ ہونا چاہیے کیونکہ تمام ترقیات روحانیہ کا اصل اصول یہی اتباع ہے اور بس۔

کتاب و سنت پیغمبر است مرشد ما تو ہیچ ہرزہ مدواں پیچ بادعوی

فقط

رسالہ الہدیٰ میں مولانا مرحوم بعض سوالات کے جواب طبع کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا تمام فتاویٰ الہدیٰ سے ہی نقل کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اُن کے فتاویٰ تو بہت زیادہ تھے لیکن افسوس کہ وہ دستیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ مطبوعہ مواد کے ضمن میں ذیل کے چند فتاویٰ بڑے تجسس و تلاش کے بعد اکٹھے کئے گئے ہیں:

۱۔ الرمح الدیانی علی رأس الوسواس الشیطانی

از

مولوی محمد مصطفیٰ رضا خاں قادری برکاتی نوری

مع

اربعہ رسائل

از

مولوی محمد نبی بخش حلوائی

(ایضاح التلبیس الشیطانی، قہر القہار، ازالۃ التلبیس، الدلائل القویۃ)

مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۱ھ

ایضاح التلبیس میں مؤلف تفسیر نعمانی کے بعض عقیدے جو مخالف اہل سنت تھے تحریر کرکے اُس کا ماحصل بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس پر علمائے کبار کے فتوے اور شہادات ہیں۔ ان علماء میں سے چند ایک کے نام بھی ملتے ہیں۔ مولانا مرحوم کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

واقف علوم عجیبہ ماہر فنون غریبہ محرم اسرار خفی والجلی مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی دام فیضانہ۔

اس کے بعد اُن کا مندرجہ ذیل فتویٰ نقل کر دیا گیا ہے

ص ۹

مولانا اصغر علی صاحب روحی

بی۔ او۔ ایل۔

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

صورت مسئلہ میں جو عقائد پیش کئے گئے ہیں وہ اہل السنت والجماعت کے عقائد نہیں۔ احادیث نبوی کا انکار موجب کفر ہے کیونکہ احادیث درحقیقت تفسیر قرآن مجید ہیں نہ کچھ اور۔ اسلئے ان کا انکار مسلک اہل السنت والجماعت کے برخلاف ہے اور فرقہ ہائے اہل السنت و الجماعت صرف حضرات حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ میں محدود ہیں۔ دنیا میں کوئی محدث فقیہ، شیخ کامل ایسا نہیں گزرا جو ان چاروں فرقوں میں سے کسی ایک کا پابند نہ ہوا ہو۔ چنانچہ کتب اسماء الرجال و سیر و تواریخ اسکی شاہد ہیں۔ چونکہ ایسے معتقدات کا شخص فرقہ اہل السنت والجماعت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا اور اسکی تحریر و تقریر لوگوں کے لئے موجب ضلالت ہے اس لئے ہر ایک صحیح الایمان آدمی کو اسکے میل جول سے برطرف رہنا چاہئیے۔

فقط

والسلام

(تحقہ العبد اصغر علی روحی)

-۲

قصبہ مریدکے ضلع لاہور کی جامع مسجد کے خطیب اور امام مولوی ابو رشید محمد عبدالعزیز مرحوم نے ایک چھوٹا سا رسالہ

عزیز المعظم فی اکرام المکرم

کے نام سے ~~ایک چھوٹا سا رسالہ~~ طبع کیا

جس میں ایک سیدہ خاتون کے غیر سید کے ساتھ نکاح کے جائز نہ ہونے پر بحث کی اور اس پر مختلف علمائے کرام کے فتوے بھی لکھے جن میں مولوی ابو محمد احمد امام مسجد صوفی لاہور نے جن

الفاظ میں اس مسئلہ پر کچھ لکھا حسب ذیل ہے:

۱۲

صورت مسئولہ میں روایت حسن جو مجیب صاحب نے ذکر کی ہے، مفتی بہا ہے لیکن اگر عورت مذکورہ کا ولی کوئی نہیں تو نکاح صحیح اور نافذ ہے۔ بالاتفاق چنانچہ در مختار بر حاشیہ رد المحتار مطبوعہ مصر جلد دوم کے صفحہ ۳۲۳ میں ہے (وان لم یکن لها ولی فهو ای العقد (صحیح) نافذ (مطلقاً) اتفاقاً" لهذا اگر اس عورت مذکورہ کا ولی کوئی نہیں تو نکاح صحیح ہے۔ کسی کو حق فسخ نہیں۔ هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

ابو محمد احمد امام مسجد صوفی لاہور۔

اس پر مولانا روحی مرحوم کے بارے میں لکھا ہے:

۱۲ کی تغلیط جناب استاذ استاذنا مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے یوں کی ہے کہ مولوی ابو محمد صاحب کا حوالہ رد المحتار صحیح ہے۔ صاحب رد المحتار رضائے ولی کے بارے میں حسب ذیل لکھتے ہیں۔ جس پر مولوی صاحب نے توجہ نہیں کی۔

" و هو هذا: قول البحر لم یرض به یشمل ما اذا لم یعلم اصلا فلا یلزم التصریح بعدم الرضا بل السکوت منه لا یکون رضا کما ذکرنا فلا بد حینئذ لصحة العقد من رضاه صریحا وعلیه فلو سکت قبله ثم رضی بعده لا یفید (۳۲۳:۲)" اس حوالہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے خاموش رہنے سے صحت عقد کا قائل ہونا صاحب رد المحتار کی تحقیق کا منافی ہے۔ لہذا جب تک صریح الفاظ میں ولی اپنی رضا کا اظہار نہ کرے تب تک نکاح شرعاً صحیح نہیں۔ فلیحفظ (خاکسار اصغر علی روحی عفا اللہ عنہ)

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔

پھر اس رسالہ کے صفحہ ۱۰ پر یہ استفتاء نقل کیا گیا ہے:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مفتی نے ایک سیدہ کا نکاح تیلی سے کر دیا ہے۔ کیا یہ نکاح درست ہو گیا ہے یا نہ۔ اگر عورت کے ولی اعتراض نہ کریں تو کیا مسلمان باغیرت بسبب ہتک قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعتراض کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مسئلہ کا جواب بالتفصیل مع مواہیر علمائے کرام تحریر فرما کر ارسال کریں۔

اسکے جواب میں دس بارہ علمائے کرام نے مختلف انداز سے ایسے نکاح کے جائز نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ اُن میں مولانا روحی مرحوم نے بعض دیگر علماء کی طرح "الجواب صحیح" کے الفاظ لکھے ہیں۔

-۳

پیر غلام دستگیر صاحب نامی نے ایک چھوٹا سا رسالہ " مولوی احمد علی صاحب کے غلط مسائل کی تصحیح " کے نام سے ۱۳۲۵ھ میں طبع کیا جس میں مختلف علماء کی تقریظیں بھی شامل تھیں۔ اس میں لکھتے ہیں:

" مولوی غلام مرشد صاحب کی تقریظ تو موجود ہے مگر آپ نے مجھ زبانی بتایا کہ آپ نے مسائل کے اندراج سے مولوی احمد علی صاحب کو منع فرمایا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کو اس پر عبور نہیں ہے اسلئے انہوں نے مسائل کی تصدیق نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کا تقریظ لکھنے سے پہلے مسائل کو نہ دیکھنا بھی قابل افسوس ہے اور اس پر بھی افسوس ہے کہ آپ نے حق کی توثیق اور باطل کی تردید میں مولانا روحی صاحب اور مفتی عبدالقادر جیسی جرأت نہیں دکھائی۔

مولوی احمد علی صاحب کا یہ فخر بھی قابل افسوس ہے کہ آپ نے مولانا روحی صاحب اور مفتی صاحب کے مضمون کو جو صرف رواجوں کے خلاف اور شریعت کی تائید میں تھا اور جنہوں نے آپ کے بیان کردہ کسی مسئلہ کی تائید میں ایک حرف نہیں لکھا۔ تحت عنوان " تصدیقات علماء " درج کیا "

اس کے بعد چند علماء کے نام لکھ کر انہوں نے لکھا ہے کہ ان علماء نے میرے اعتراض و تصحیح کو درست قرار دیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے مولانا اصغر علی روحی کا نام آتا ہے اسکے بعد پانچ چھ دیگر علماء کے نام بھی ہیں۔

-۴

پیر غلام دستگیر نامی نے دائرۃ الاصلاح لاہور کے زیر اہتمام ایک رسالہ " دستی

ہدایت نامہ ۹ برائے اہل سنت و جماعت ۔ بدعات محرم کے متعلق حنفی علماء کے فتوے طبع کیا ۔ اس پر مولانا روحی سے بھی تقریظ لکھوائی جو حسب ذیل ہے :

ماتم کی شرعی حیثیت میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ماتم مشیعہ اور سنی شریعت کی رو سے ناجائز ہے ۔ لیں سبیلوں کے ذریعہ ماتم کرنے والوں کی ہمت بڑھانا اور حوصلہ افزائی کرنا کار ثواب نہیں (دائرۃ الاصلاح لاہور) افعال مندرجہ سوال شریعت اسلام میں کسی صورت بھی جائز نہیں سمجھے جا سکتے زمانۂ نبوت اور زمانہ خلافتِ راشدہ اور نیز بعد کی جماعت مسلمین میں اس قسم کے بدعاتِ منکرہ کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا ۔ ہنود کی رسوم دسہرہ اور مذکورہ بالا بدعات کی نوعیت میں کوئی امتیاز نہیں ۔ ایسے افعال کا ارتکاب حضرات اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ عداوت کا مترادف ہے ۔ نعوذ باللہ من ھذہ الضلالۃ والغوایۃ ۔

خاکسار اصغر علی روحی
عفا اللہ عنہ ۔

۵ ۔

مولوی ضیاء محمد صاحب ریٹائرڈ پروفیسر فارسی موضع ملوار ضلع گجرات کے باشندہ تھے ۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اس بات میں اختلاف ہو گیا کہ نماز مغرب کی فرض جماعت کے بعد سنتیں پہلے ادا کی جائیں یا جنازہ پہلے پڑھا جائے ۔ مولوی ضیاء محمد صاحب نے یہ مسئلہ مولانا روحی مرحوم سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ تم یہ سوال مجھے لکھ کر دے دو میں اُس کا تحریری جواب بھجوا دوں گا لیکن مولوی ضیاء محمد صاحب کہنے لگے کہ نہیں مجھے دو تین جملے زبانی لکھوا دیں وہی کافی ہیں ۔ چنانچہ مولانا روحی مرحوم نے انہیں مختصر جواب یہ لکھوایا کہ

" سنت مؤکدہ ادا کرنے کے بعد نماز جنازہ ادا کرے کیونکہ سنت مؤکدہ موقّت ہے اور نماز جنازہ موقّت نہیں ۔ فتاویٰ حنفیہ میں اس بات کی تصریح ہو چکی ہے کہ نماز فرائض

سنت موکدہ کے درمیان توقف جائز نہیں اور یہی صحیح جواب ہے اور جو شخص اس کے برخلاف کہتا ہے اس کو حجت شرعی پیش کرنی چاہیے۔ غیر مجتہد عامی کا قیاس قابل اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ اصغر علی روحی

اس پر مولوی محمد عالم صاحب قلعداری نے اتفاق نہ کیا بلکہ انہوں نے کہا کہ جواب صحیح اور حق صریح یہ ہے کہ پہلے فرض نماز مغرب پڑھے پھر نماز جنازہ ادا کرے بعد میں سنت موکدہ پڑھے جیسا کہ معتبرات میں مذکور ہے:

حضرت وقت صلوۃ المغرب جنازۃ تقدم صلوۃ الجنازۃ علی سنۃ المغرب (فتاوی عالمگیری جلد اول) و فی الغرائب تقدم الجنازۃ علی سنۃ المغرب (عشوہ فی دار السروہ) و وقتھا وقت حضورہا و لذا قدمت علی سنۃ المغرب۔ کما فی الخزانۃ (قہستانی) و ہمچنین مکروہ است اشتغال بنماز جنازہ بحضور صلوۃ مغرب و در غرائب است تقدیم جنازہ بر سنت مغرب (تحفۃ الحسینی) و ھکذا فی اکثر کتب الفقہ۔

علامہ مجیب نے جواب استفتا میں ہرگز فقاہت سے کام نہیں لیا۔ غیر مجتہد عامی کے قیاس کو ناقابل اعتبار ٹھہرا کر سارے کا سارا جواب استفتا قیاس لکھ مارا ہے جو بقول آپ کے ناقابل اعتبار ٹھہرا۔ افسوس کہ آپ کے جواب استفتا میں حجت شرعی تو بالائے طاق فقہ شریف کی کتاب کی عبارت نہیں، حوالہ نہیں، صرف ایک فتاوی حنفیہ کی تصریح ہے جو مسئلہ متنازعہ سے چنداں متعلق نہیں۔ ہاں جس قدر اس کا تعلق ہے وہ ماخن غیر سے مخالف نہیں۔ علامہ مجیب اگر اپنے جواب میں کوئی حجت شرعی لکھتا تو اس وقت اسے یہ کہنے کا حق حاصل ہوتا کہ یہی جواب صحیح ہے بغیر حجت شرعی کے کوئی اس کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ اندریں صورت یہ محض تحکم و ادعا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نمقہ محمد عالم حنفی قلعداری عفی عنہ

۱ – X – ۳۰

مولوی ضیاء محمد صاحب نے مولانا روحی مرحوم کو دوبارہ لکھا کہ مولوی عالم صاحب قلعداری آپ کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ مولانا روحی نے انہیں مندرجہ ذیل تحریری جواب بھیجا جو ایک مراسلہ

کی صورت میں تھا۔

برادرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

علالت طبع اور غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے میں جواب نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اذان صلاۃ مغرب کے قریب مسجد میں مجھ سے مسئلہ متنازعہ فیہ کی بابت پوچھا تو میں نے جواب دیا تھا کہ سوال لکھ کر دے دو جواب ارسال کیا جائے گا۔ آپ نے کہا کہ نہیں دو جملے آپ زبانی لکھوا دیں کافی ہے۔ میں نے جو کچھ پہلے اس مسئلہ کے متعلق معلوم تھا لکھوا دیا۔ ایسے تنگ وقت میں نہ تو کتاب دیکھنے کا موقع تھا نہ زیادہ نقل کی ضرورت مگر آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے مفتی صاحب کہ فتاویٰ عالمگیریہ کی عبارت پر بڑا ناز ہے اور وہ اسے آخری فیصلہ خیال کئے بیٹھے ہیں مگر محقق کے نزدیک صرف اس عبارت پر بس نہیں کی جا سکتی کیونکہ علماء کے فتاویٰ راجح اور مرجوح سے پُر ہیں اور صاحب عالمگیریہ نے زیادہ بحث اس مسئلہ کے متعلق نہیں لکھی۔ بعض فقہا کا یہ بے شک مذہب ہے مگر کوئی اصول پڑھا شخص ہرگز عبارت مذکورہ بالا سے یہ مفہوم اخذ نہیں کر سکتا کہ تقدم صلاۃ جنازۃ علی سنت المغرب کا حکم بطور وجوب کے عائد ہوتا ہے جس کی مخالفت یعنی سنت کو صلاۃ جنازہ پر مقدم کرنے سے عدم جواز سنت کا حکم عائد کیا جائے۔ اگر مفتی صاحب ایسا خیال کرتے ہیں تو یہ ان کی اپنی ذاتی رائے ہے میرے پاس اب بھی اتنی فرصت نہیں کہ میں بہت سی کتابوں کے حوالہ جات نقل کروں صرف ذیل کے چند سطور اطمینان کے لئے کافی ہیں۔

تقدم صلاۃ جنازۃ یا تقدم سنت المغرب کے بارے میں مجھے کوئی خاص اثر معلوم نہیں البتہ تعجیل فریضۂ مغرب کی روایات کثیرہ صحیحہ موجود ہیں۔ کنا نصلّی المغرب مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فینصرف احدنا لانہ لیبصر مواقع نبلہ بخاری ص $\frac{79}{18}$ اور تعجیل صلاۃ جنازہ کی حدیث کی صحت محدثین کے نزدیک مسلّم نہیں چنانچہ الحمد سنت کی روشنی سے واضح ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقدیم فریضۂ مغرب اور تاخیر صلاۃ جنازہ کی تفریع ممکن ہے کہ احادیث کی قوت و ضعف پر مبنی ہو۔ ۲ ۔ فریضۂ مغرب اور سنت مغرب میں اتصال جائز ہے چنانچہ بحر الرائق میں ہے۔ وفی الحلیۃ الفتوی علی تاخیر صلاۃ الجنازۃ عن سنۃ الجمعۃ فعلی ھذا تؤخر عن سنۃ المغرب لانھا

آلہ ۱۲۔ ۳۔ اس عبارت سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ سنۃ جو مؤکدہ ہے صلاۃ جنازہ سے
مقدم رکھی جائے گی مگر سنۃ المغرب جو سنت زیادہ مؤکدہ ہے بھلا جنازہ سے کیوں مقدم نہ کی جائے
زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صلاۃ جنازہ کا تقدم سنت المغرب سے اولیٰ ہے نہ کہ واجب
جس کی مخالفت سے عدم جواز سنت کا فتویٰ دیا جائے چنانچہ اسی کتاب میں آگے یہ عبارت موجود ہے
یبدء بصلوۃ المغرب ثم بالجنازۃ ثم بالسنۃ ولعلہ لبیان الافضلیۃ۔ دیکھو اس
عبارت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ سنت مغرب پر صلاۃ الجنازہ کو مقدم کرنا صرف افضل ہے نہ
واجب۔ مفتی صاحب بتلائیں کہ انہوں نے وجوب تقدم صلاۃ جنازہ کا حکم کہاں سے اخذ کیا۔
افسوس میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو کھولتا۔ اس لئے
میں اپنے پہلے فتویٰ پر قائم ہوں کہ سنۃ مغرب فرض کے ساتھ متصل پڑھ سکتے ہیں اور
نماز جنازہ کا موخر رکھنا سنت سے جائز ہے تعجب یہ ہے کہ مفتی صاحب کو ایک ایسی
معمولی بات سمجھ میں نہیں آسکی اور اپنی بات کی پچ میں دھڑا دھڑ اکٹھے تین بات کہہ رہے ہیں
اگر اس پر تسلی نہ ہو تو علماء ہندوستان کی طرف رجوع کرکے فتویٰ حاصل کریں۔ اللّٰہم ارنا
الحق حقا والباطل باطلا واللہ اعلم بالصواب

خاکسار

اصغر علی روحی

۱۹-۱۰-۳۰

باب سوم

تاثرات

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

تاثرات

جن اصحاب نے اپنے تاثرات اور خیالات بیان کئے ہیں۔ اُن میں مختلف قسم کے افراد شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو براہ راست مولانا کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ بعض ایسے جو خود تو اُن کی شاگردی اختیار نہیں کر سکے لیکن اُن کے والد یا استاد گرامی مولانا کے شاگرد رہے بعض لوگ اُن کے معاصرین میں شامل ہیں جو اُن کے حالات سے باخبر تھے۔ کچھ ایسے افراد ہیں جو اُن کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض اُن کے اہل محلہ ہیں۔

ان تمام اصحاب کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے اس لئے اس باب میں حسب ذیل فصلیں بنا دی گئی ہیں تاکہ اُن کے دیئے گئے تاثرات کی اہمیت واضح ہو سکے۔

فصل اول ——————— تلامذہ
فصل دوم ——————— معاصرین
فصل سوم ——————— اہل محلہ
فصل چہارم ——————— اہل خانہ
فصل پنجم ——————— متفرقات

فصل اوّل

(تلامذہ)

میاں امیرالدین

صدر انجمن حمایت اسلام

میں نے مرحوم و مغفور جناب مولانا اصغر علی روحی صاحب کو پہلی بار جب دیکھا تو میری عمر کوئی گیارہ بارہ برس تھی، (۱۹۰۰ء کے لگ بھگ) اس زمانے میں چوتھی یا پانچویں کا طالب العلم تھا۔ مولانا صاحب ہر اتوار کو تمام سکول سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ مدرسے سے میری مراد ہے، اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ۔

میں اس لڑکپن کے دور میں بھی مولانا صاحب کے خطاب سے بہت متاثر ہوا کرتا تھا۔ شوق سے سنتا تھا اور میں خود کو خوش قسمت جانتا ہوں کہ مجھے لڑکپن ہی میں ایسے روح افزا اور ایمان افروز خطبات سننے کا موقع مل گیا۔ میرے کردار اور میرے ایمان پر مولانا صاحب کے فرمودات کا جو اثر مرتسم ہوا وہ دائمی تھا۔ وہ نقش مٹ نہ سکے۔ زندگی میں میرا عقیدہ کبھی نہ ڈولا۔

ہاں حضرت علامہ اقبال نے بھی اسی زمانے میں انجمن اسلامیہ کے جلسوں کو اپنے خطبات اور اشعار سے نوازنا شروع کیا تھا۔ انجمن اسلامیہ کے سالانہ جلسے اسی سکول میں منعقد ہوتے تھے۔

میں ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گیا۔ مولانا صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھانے لگے —— مگر مجھے اُن کی زیارت کا شرف گاہ گاہ حاصل ہوتا رہتا تھا۔ مولانا صاحب درد، صاحب دل، صاحب ایمان اور صاحب استقلال بزرگ تھے۔ ان کے ان جملہ اوصاف کا خصوصی امتحان اس وقت عمل میں آیا۔ جب جنگ عظیم اوّل کے دوران میں انگریزوں کو علماء و فقہا کے فتاویٰ کی ضرورت پڑی۔ بہت سے علماء نے بلکہ اکثر نے یہ فتویٰ دے دیا کہ انگریز کی حمایت کی جانی چاہیے۔ مگر مولانا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ خاص طور پر میاں سر شفیع مرحوم نے اس ضمن میں بہت کوشش کی۔ مولانا صاحب سر شفیع کو عزیز جانتے تھے مگر اس کے باوصف تقریباً سرزنش کے لہجے میں انکار کر دیا اور ٹال دیا ——

مولانا صاحب کی یہ روش اُس دور میں جبکہ انگریز کی سطوت نصف النہار پر تھی، واقعی بڑی ایمان افروز تھی ـــــ ہاں ہندوستان کی سرزمین میں ایک اور بزرگ بھی تھے جنہوں نے مولانا صاحب ہی کی طرح جرأت ایمانی کا ثبوت دیا وہ مولانا عبد الباری فرنگی محلی صاحب رح تھے۔

مولانا صاحب بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ آواز میں بڑا دبدبہ تھا۔ کسی سے دب کر بات نہ کرتے تھے۔ ہمیشہ بڑے آدمیوں کے ساتھ رعب کے لہجے میں مخاطب ہوتے تھے۔ عموماً کالے چشمے لگائے رکھتے تھے ـــــ عصا بھاری بھرکم ساتھ رہتا تھا۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ کی زبانی پتہ چلتا رہتا تھا کہ مولانا صاحب اگر جلال میں آتے تو ایف اے اور بی اے کے طلبہ کی بھی اسی عصا سے پٹائی کر دیتے تھے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں کالج میں شادی شدہ طلبہ بھی پائے جاتے تھے ـــــ مولانا کے رعب کا یہ عالم تھا کہ اگر پوری جماعت پر ناراض ہو کر برس پڑتے اور پیٹ ڈالتے تو کوئی نہ بولنے کی جرأت کرتا نہ بھاگنے کی۔

مجھ پر مولانا صاحب ہمیشہ مہربان رہے۔ میری ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں سیاسیات میں بھی حصہ دار رہا ہوں۔ انتخابات بھی لڑے ہیں۔ کارپوریشن کے بھی اور اسمبلی کے بھی۔ مولانا صاحب نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون فرمایا اور میری بھرپور تائید کی۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے آج قوم کی حالت دیکھتا ہوں۔ طلبہ کی کیفیت پر نظر ڈالتا ہوں۔ علماء کی روش پر نگاہ ڈالتا ہوں تو بے اختیار کہتا ہوں۔ مولا کریم آیا اس قوم کو حضرت روحی جیسے اصحاب کردار و ارباب ایمان کبھی پھر بھی نصیب ہوں گے؟

بشیر احمد شبلی مرحوم

ہیڈ ماسٹر حسینیہ ہائی سکول لاہور

"حضرت اقدس روحی رح کی بے مثال جرأت"

ایک مرتبہ گورنر ہیلے (Haily) نے سالانہ کانووکیشن کو بطور مہمان خصوصی و صدر

مجلس خطاب کیا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام الٰہی سے ہوا۔ مسٹر ہیلے، تمام اساتذہ اور تمام طلبہ تلاوت کے دوران کھڑے رہے مگر تنہا ان کی ذات تھی جو بیٹھے رہے۔ اب کسے حوصلہ اور جرأت اور کس کی مجال کہ ان سے پوچھے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ بہرکیف! ہم طلبہ اور دوسرے وابستگان کو جو آپ کے قریب تر تھے پوچھنے پر بتایا کہ یہ لوگ تو ہیلے کی وجہ سے احتراماً کھڑے ہوئے۔ اگر قرآن کے احترام میں بھی کھڑے ہوں تو اس احترام کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ اسلاف سے اس قسم کا احترام ثابت نہیں۔

اسلامیہ کالج کا پرنسپل سخت اور جابر انسان تھا جس کا نام مسٹر عبداللہ یوسف علی تھا۔ اور آئی۔ سی۔ ایس۔ ریٹائرڈ تھا اور بالکل انگریز کا افسر ٹائپ آدمی تھا اُس کے سامنے کسی کو مجال تاب نہیں تھی۔ مگر حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ لطف ہے تحقیق ہم علماء کو کسی میٹر اور معیار سے ناپتا ہے۔ ہمارے پرکھنے کی اس کے پاس کیا کسوٹی ہے۔ غرضیکہ ایسے جابر انسان کے سامنے بھی آپ بلا جھجک گفتگو فرماتے بلکہ وہ خود آپ سے مرعوب رہتا۔

اُس کے جبر و استبداد کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ سینئر پروفیسر پاس بیٹھے تھے۔ اُن کا ٹیلیفون آیا۔ پرنسپل صاحب نے ریسیور (Receiver) اٹھا کر کہا "It is Principal's office" اور ریسیور رکھ دیا۔ دوبارہ گھنٹی ہوئی۔ پھر پرنسپل صاحب نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ کہا:

"I have already told you that this is Principal's office. I would not allow anybody to use my Telephone."

جس سے گفتگو ہونا ہے وہ پاس بیٹھے ہیں۔ مگر پرنسپل صاحب اسے اپنے لئے ہتک شان سمجھتے تھے۔ تو اس قسم کے پرنسپل کو حضرت روحی رح کھری کھری سنا دیا کرتے تھے۔

" حضرت رح کی سخاوت و دریا دلی "

بی۔ اے کے بعد میں نے بوجہ مفلسی ترک تعلیم کا ارادہ کیا۔ اس سے حضرت استاد محترم کو ان کے گھر پر آگاہ کیا تو انہوں نے اپنے بیٹے ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق سے فرمایا: ضیاء ٹولی ادھر آنا۔ وہ آئے تو فرمایا کہ طاقچہ میں کچھ رقم رکھی ہے۔ ذرا اٹھا لاؤ۔ آپ نے اس رقم سے میرے ایم۔ اے (عربی) میں داخلہ کا بندوبست فرمایا۔ عام طور پر علماء و زہاد خشک مشہور ہیں مگر ہمارے قبلہ روحی رح بے حد مخیر بھی تھے

حفیظ اللہ

(ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر بہاول پور)

عزیز محترم مولوی فضل اللہ صاحب بہاولپوری نے جناب کا یہ ارشاد مجھے پہنچایا ہے کہ محترم المقام حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری جو ترتیب دی جا رہی ہے اسکے لئے اپنے تاثرات عرض کروں۔ میری علمی و عملی بے بضاعتی کو یہ طاقت کہاں نصیب کہ اتنی عظیم شخصیت کے بارہ میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کرسکوں۔ لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی کوشش کروں تو اور بات ہے۔ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے صرف دینیات پڑھتا رہا ہوں۔ اسلئے چند سطور حاضر ہیں۔

اصحاب اخلاص کے اقوال و اعمال کے تاثرات مکان و زمان کی قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ میں اپنی سمجھ اور تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ استاد محترم حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ اصحاب اخلاص میں سے تھے۔

۱۹۱۶ء کی بات ہے بھاٹی گیٹ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے خیالات عالیہ سے حاضرین کو مستفید فرما رہے تھے۔ باتوں باتوں میں فرمایا کہ حضرت سید العارفین سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "فتوح الغیب" بہت عجیب چیز ہے اور اسکا مطالعہ نہایت ہی نافع ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ہی میں بہاول پور چلا آیا اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ کامل دس گیارہ سال کے بعد ایک دن ۲۷-۱۹۲۶ء میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ اچانک اس صحبت کا سارا موقع آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ حضرت مولانا کا مذکورہ ارشاد دل کی گہرائیوں سے لاوا کی طرح ابھرا اور ساری طبیعت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ کیا عرض کروں مجھ پر کیا گزری جو فیوض و برکات حاصل ہوئے بیان سے باہر ہیں۔ اصحاب اخلاص اپنے ارشادات میں چھپے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی شخصیتوں کے انوار و برکات قاری پر اثر انداز ہوتے چلے جاتے ہیں ؎

در سخن مخفی منم چو بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

غالباً بیگم زیب النساء کا شوہر ہے۔

آخر میں گزارش ہے کہ میری عمر اس وقت ہجری لحاظ سے ۸۶ سال اور عیسوی سِن کے لحاظ سے ۸۳ سال ہے۔ ضعف قلم کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ براہ مہربانی اس تحریر کے نقائص کو دور کرکے اصل مطالب صاف کرلیں۔

شیخ سردار علی

سائنس ٹیچر ایچیسن کالج لاہور

میں ایچیسن کالج لاہور میں سائنس ٹیچر کے طور پر ملازم تھا اور ماہ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوا۔ میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں ۱۹۲۵ سے ۱۹۳۰ تک زیر تعلیم رہا۔ اُس وقت مسٹر عبداللہ یوسف علی پرنسپل تھے۔ وہ دو دفعہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل بنائے گئے لیکن یہ اُن کی تقرری کا پہلا زمانہ تھا۔ یہ صاحب I.C.S سروس کے آدمی تھے اور انتظامی معاملات میں نہایت سخت اور متشدد تھے اور سب پر اُن کا بہت رعب داب تھا۔ اُس زمانے میں کالج میں جمعہ کے روز چھٹی ہوتی تھی اور ہر اتوار کو تدریس کا وقت شروع ہونے سے پہلے کالج ہال میں وعظ ہوا کرتا تھا۔ یہ وعظ عموماً مولانا محمد عمر صاحب "جو ریاست ٹونک (ہندوستان) کے رہنے والے تھے" کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مسٹر عبداللہ یوسف علی نے مولانا اصغر علی روحی مرحوم سے کہا کہ ایک اتوار کو مولوی محمد عمر وعظ کیا کریں اور اگلے اتوار کو آپ کیا کریں۔ لیکن مولانا روحی نے معذرت کی اور کہا کہ دینی مسائل اس قسم کے وعظ میں صحیح طور پر پیش کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت نہایت تھوڑا ہوتا ہے اور بعض دینی مسائل کافی بحث و تمحیص کے مقتضی ہوتے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ مجھے اس کام سے معاف رکھا جائے لیکن پرنسپل صاحب نے انہیں بڑے اصرار سے کہا لیکن انکار، بعد میں ایک موقعہ پر پرنسپل صاحب نے یہ مطالبہ Staff Council میں پیش کرکے حضرت مولانا کی رضامندی حاصل کرلی اور وعظ کا عنوان بھی ممبران سٹاف نے ہی تجویز کیا اور مولانا نے منظور کرلیا۔ چنانچہ مولانا کے پہلے وعظ کا موضوع یہ تھا:

"کیا قرآن مجید کو معانی سمجھے بغیر پڑھنا کچھ مفید ہے یا نہیں"۔

ان دنوں اس مسئلہ کا بڑا چرچا تھا۔ (Topic of the day)

اس موضوع پر مولانا روحی نے قرآن و حدیث کی آیات و روایات سے یہ ثابت کیا کہ ہاں گو قرآن مجید کے معنی سمجھ کر اُسے پڑھنا عمل کرنے کے لئے ضروری ہے لیکن اُس کی مطلق تلاوت بھی غیر مفید نہیں بلکہ اُس سے روح متاثر ہوتی ہے اور اُس کا ثواب بھی ملتا ہے آپ نے اس کی عقلی دلیل یہ پیش کی کہ روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "الروح من امر ربی" یعنی روح اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ اسی طرح قرآن مجید بھی جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے امر ربی ہے یعنی روح اور قرآن مجید ایک ہی جنس سے ہیں اور ایک ہم جنس کو اپنے دوسرے ہم جنس کے ساتھ فطری ربط ہوتا ہے وہ ایک دوسرے کی طرف کھچے آتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے۔ "کند ہم جنس باہم جنس پرواز"

اس طرح گویا قرآن اور روح کا بہت قریبی ربط ہے اور قرآن کے محض تلاوت کرنے سے بھی روح اثر پذیر ہوتی ہے کیونکہ دونوں کی جنس ایک ہے اس لئے یہ کہنا کہ معانی کے بغیر قرآن مجید پڑھنا غیر مفید ہے اور روح پر اثر پیدا نہیں کرتا بالکل غلط ہے۔ مولانا اس قسم کے اور عقلی دلائل بھی پیش کرتے رہے حتیٰ کہ وعظ کا وقت ختم ہو کر گھنٹی بج گئی لیکن مولانا دلیل پر دلیل پیش کرتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ پرنسپل صاحب نے دو تین بار اُن کی طرف دیکھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وعظ ختم کر دیا جائے لیکن مولانا نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی کچھ دیر بعد پرنسپل صاحب نے میز پر پنسل سے ٹک ٹک کیا تاکہ مولانا وعظ ختم کریں لیکن اس کام کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر تنگ آکر پرنسپل صاحب نے ایک چٹ پر لکھ کر اُن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مولانا نے وہ چٹ نہ پکڑی بلکہ طیش میں آکر فرمایا:

"یہ کیا ضلالت ہے میں نے کہا نہیں تھا کہ دینی مسائل اس طرح بیان نہیں ہو سکتے۔"

آخر پرنسپل صاحب اُٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے اُن کے جانے کے بعد مولانا روحی نے اپنے موضوع کو ختم کرنے کے لئے جاری رکھا اور اپنا عصا جو میز پر رکھا تھا اٹھایا اور وہ بھی تشریف لے گئے۔ یہ تمام واقعہ ہال میں سب لڑکوں کے سامنے پیش آیا تھا اور مولانا روحی کا اس لب و لہجہ میں مخاطب ہو کر کہنا لڑکوں پر بہت اثر انداز ہوا اور اُن کی بے باکی اور عظمت کا سکہ اُن کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ پھر جب تک میں کالج میں رہا پرنسپل صاحب نے انہیں دوبارہ وعظ کہنے پر کبھی مجبور نہ کیا۔ بعد کا مجھے کچھ علم نہیں۔

مولانا کا یہ دستور تھا کہ اگر کوئی طالب علم اُن سے کلاس کے علاوہ تعلیم کے لئے وقت چاہتا تو آپ اُس سے کہتے کہ جب صبح میں گھر سے کالج جانے کے لئے نکلوں تو تم راستہ میں پڑھ لیا کرو۔ مولانا بھاٹی دروازہ میں مقیم تھے اور کالج تک ہمیشہ پیدل باغ کے راستے تشریف لے جایا کرتے۔ چنانچہ ضرورت مند طلبہ اُن کے گھر پہنچ جاتے اور پیدل چلتے چلتے اُن سے سبق پڑھ لیا کرتے۔ راستے میں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ یا تانگوں اور سائیکلوں کی آمد و رفت اُن کے سلسلۂ کلام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرتی۔ انہیں اس سلسلہ میں کسی کتاب کے دیکھنے یا حوالے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔

مجھے ایک اور واقعہ یاد آتا ہے جو میرا چشم دید ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص نبوت کا دعویدار تھا۔ لڑکے اُسے گھیر گھار کر مولانا کی کلاس میں لے آئے اُس نے اپنی نبوت کا اظہار کرتے ہوئے کچھ باتیں کہیں جنہیں سُن کر مولانا نے بے ساختہ کہا کہ ہاں اس ملک میں مرزا (غلام احمد قادیانی) نے نبوت کا دروازہ کھول دیا ہے اس لئے اب جس کی مرضی ہو نبی بن بیٹھے۔

ایک دفعہ گورنمنٹ نے مسٹر عبداللہ یوسف علی پرنسپل سے کچھ اسامیوں کو پُر کرنے کے سلسلے میں لائق طلبہ کے نام مانگے لیکن بجائے ایسے لڑکوں کے نام پیش کرنے کے پرنسپل صاحب نے گورنمنٹ کو یہ جواب دیا کہ اس کالج کا کوئی طالب علم اس قابل نہیں جس کا نام بھیجا جائے۔ جب یہ خبر مولانا روحی کو معلوم ہوئی تو انہوں نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ ہمارے کالج میں اچھے اچھے لڑکے موجود ہیں اور وہ ملازمت کے خواہشمند بھی ہیں۔ لیکن پرنسپل صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔

ایسے واقعات سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا روحی نہایت حق گو اور راست باز تھے اور غیر حق بات کے ساتھ بالکل اتفاق نہیں کرتے تھے خواہ کہنے والا کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔

ایک دو اور واقعات جو میرے چشم دید تو نہیں لیکن میں نے معتبر آدمیوں سے سُنے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک سپیرا سانپ دکھاتا پھرتا تھا۔ مولانا بھی اُس کی باتیں سنتے رہے اور سانپ کو دیکھتے رہے۔ آخر میں انہوں نے پوچھا کہ یہ کس نوع کا سانپ ہے۔ سپیرا جاہل شخص تھا اس کا مطلب نہ سمجھ سکا اور کہنے لگا کہ میں اُسے فلاں کلّر والی زمین سے پکڑ کر لایا ہوں مولانا نے کہا کہ کیسا جاہل آدمی ہے میں سانپ کی نوع پوچھ رہا ہوں اور یہ اُس کا وطن بتا رہا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مولانا عام طرزِ کلام میں بھی عربی و فارسی کے موٹے موٹے لفظ بولا کرتے تھے۔

دوسرا واقعہ جو ایک معتبر راوی نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ قادیانی مذہب کا اُس زمانے میں بہت چرچا تھا اور مولانا نے مرزا غلام احمد کے الہامات پر تبصرہ کیا اور اُن میں عربی گرامر کے لحاظ سے غلطیاں نکالیں۔

اُس زمانے میں مولوی حاکم علی (حضرت ایشاں رح کے مزار شریف کے گدی نشین صاحب) جو نومسلم تھے اور ریاضی اور سائنس کے پروفیسر تھے۔ اکثر شکار کو جایا کرتے تھے راستے میں کبھی کبھی ایک درویش کے پاس بیٹھتے تھے اور آخر وہ اُس درویش کے ہاتھ پر اسلام لے آئے اور بعد میں حاکم سنگھ سے مولوی حاکم علی کے نام سے موسوم ہوئے چونکہ وہ نومسلم تھے اسی لئے اسلامی مسائل اور تعلیمات اور قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے مولانا روحی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا روحی پروفیسر حاکم علی کے پاس سائنس کی تجربہ گاہ میں بیٹھے تھے اور طالب علم کوئی تجربہ کر رہے تھے۔ ہائیڈروجن کی ایک شیشی پھٹ گئی اور اُس کے ریزے مولانا کی آنکھ میں آ لگے۔ جس سے مولانا کی ایک آنکھ بیکار ہو گئی۔ مرزا غلام احمد اُس وقت خود تو وفات پا چکا تھا۔ لیکن اُس کے پیروؤں نے بہت سے اشتہار نکالے جن میں یہ لکھا کہ مرزا صاحب کی ایک اور پیشین گوئی درست ثابت ہو گئی کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ جو شخص ہمارے الہامات کی غلطیاں نکالے گا ہم اُس کی آنکھ پھوڑ دیں گے۔

یہ واقعات میری یادداشت میں ابھی تک باقی ہیں اور میں چونکہ عربی کا طالب علم نہیں تھا اس لئے مولانا کے پاس زیادہ اُٹھ بیٹھ نہ سکا لیکن یہ ایک مسلم امر ہے کہ وہ نہ صرف عربی بلکہ دینی مسائل میں بھی نہایت صحیح اور وسیع علم رکھتے تھے اور لوگ اُن کی قابلیت کے علاوہ اُن کے اخلاق اور طالب علموں سے ہمدردی کے نہایت مداح تھے۔ اللّٰھم اغفر لہٗ

پروفیسر میاں شمس الدین (مرحوم)

ریٹائرڈ پروفیسر ایف سی کالج لاہور

مجھے دلی مسرت ہے کہ حضرت مولانا روحی رح کا دیوان مرتب ہو رہا ہے اور آپ نے اس ناچیز کو بھی

اُن کرم فرماؤں میں شامل کر لیا جنکو (مولانا کے بارے میں) ذاتی تاثرات و خیالات کا آپکو انتظار ہے۔

الف۔ اے پاس کرنے کے بعد اور تھرڈ ائر میں داخلہ لینے سے قبل میرے ایک عزیز وفات پا گئے اور اُن کی تدفین کے لئے جب ہم جنازگاہ منزنگ چونگی پہنچے تو اُن کی قبر تیار نہ تھی اسلئے تمام احباب وضو کرنے کے بعد تیار ہونے والی قبر کے قریبی درختوں کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور دھوپ کافی تیز تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں، اور میرے ہم عمر چند رشتے دار تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک مجذوب کے پاس جا پہنچے۔ اُس نے بہت سی باتیں کیں لیکن ہم میں سے کسی کو اُس کی کوئی بات سمجھ نہ آئی۔ جب ہم وہاں سے اُٹھنے لگے تو مجھ سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا کہ سر جھکاؤ۔ میں نے سر جھکا دیا تو اُس نے مجھے مارنے کی بجائے اپنے کپڑے کے تھیلے سے دو کتابیں نکال کر مجھے عطا کیں اور نصیحت کی اور تھپکی بھی دی اور کہا۔ ان کتابوں کو سنبھال کر رکھنا اور ان سے استفادہ کرنا۔ یہ کتابیں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ دبیرِ عجم (فارسی) مصنف: مولانا روحی ؟

۲۔ انگریزی زبان کی ضخیم اور نایاب لغت (Universal Dictionary

یہ دونوں کتابیں اب تک میرے پاس موجود ہیں اور میرے علاوہ میرے بچوں نے بھی ان کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میرے ایک ایرانی استاد کو دبیرِ عجم ازحد پسند تھی۔ ایم۔ اے فارسی کے فائنل ائر میں گرامر کی جانب متعلقہ استاد نے بالکل توجہ نہ فرمائی۔ یونیورسٹی کے صدر شعبہ (پروفیسر Brown کے شاگرد) پروفیسر محمد اقبال نے پروفیسر عابد علی عابد کو فرمائش کی کہ گرامر کا کورس ختم کرنے کے لئے وہ ہفتہ میں دو پیریڈ پڑھانے کی بجائے ایک فالتو پیریڈ لیا کریں۔ پہلے روز انہوں نے صنائع و بدائع اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں ختم کرنے کے بعد طلبہ سے سوالات پوچھے۔ پہلا سوال ایہام کے بارے میں مجھ سے کیا۔ اس ناچیز نے تسلی بخش جواب دیا۔ سید عابد علی مرحوم نے فرمایا: "تمہارا جواب اور مثالیں بھی درست ہیں لیکن مثالیں لطف اور چٹخارے سے خالی ہیں۔ ایک مثال اور بتاؤ۔ فوراً میری زبان سے دبیرِ عجم کا یہ شعر نکلا۔ ؎

۔۔۔

جاں بخشد از لب کشتہ را و انگہ بخوں فرماں دہد

خونخواری آں شوخ بیں کز بہر کشتن جاں دہد

سید عابد علی عابد یہ شعر سُن کر پھڑک اُٹھے اور مجھے خوب شاباش دی۔

تھرڈ ائر میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد میں نے اور میرے ہم جماعت حمید نظامی (نوائے وقت والے) نے فارسی آنرز رکھ لی۔ کل طلبہ کی تعداد چھ تھی۔ یہ کلاس مولانا روحی کو ملی اور مجھے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا۔ مولانا روحی سردیوں میں سٹاف روم کے سامنے باغیچہ میں (جہاں بانیان انجمن میں سے ایک مشہور ہستی (حاجی حنیفا صاحب) کی قبر تھی) کلاس لیا کرتے تھے۔ ہیڈ کلرک جن کا نام غلام محی الدین تھا چپڑاسی بھیج کر مولانا روحی اور طلبہ کے لئے بھی وہاں کرسیاں لگوا دیتے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے قبل مولانا کرسی پر تشریف فرما ہوتے تھے لیکن میرے سمیت تمام شاگرد مولانا کے ادب کے پیش نظر گھاس پر بیٹھ کر (یعنی مولانا کے قدموں میں بیٹھ کر) اس عظیم ہستی اور جید عالم سے علم کے انمول موتی حاصل کرتے رہے۔ اس زمانے میں مثنوی مولانا روم کے پہلے تین ابواب بھی آنرز کے کورس میں شامل تھے۔ یہ ابواب مجھے اب تک یاد ہیں اور تصوف کی وہ گہرائیاں جو مولانا روحی نے بیان فرمائیں وہ آج تک میرے دل پر نقش ہیں۔ آپکی رحلت کے بعد میں نے مسجد وزیر خان کے خطیب مولانا سید ابو الحسنات سے بھی مثنوی مولانا روم کا درس دس ماہ تک لیا اور بعد ازاں ہمارے ایک خاندانی بزرگ نے مکمل مثنوی مولانا روم مجھے اور میرے چند رشتے داروں کو پڑھائی۔ حیران ہوں کہ مثنوی مولانا روم کے پہلے شعر

بشنو از نے چوں حکایت می کند ۔۔۔۔۔ وز جدائی ہا شکایت می کند

کی تشریح تینوں بزرگوں نے من و عن ایک جیسی کی۔ البتہ اندازِ بیاں میں نمایاں فرق تھا

ایک روز کلاس کے بعد (ہمارا اور مولانا روحی کا بھی یہ آخری پیریڈ ہوتا تھا) مولانا روحی ابھی کرسی پر تشریف فرما تھے کہ ایک سپیرا آ پہنچا اور بیٹھ کر بین بجانے لگا۔ مولانا نے فرمایا کہ بین بند کرو اور کوئی خاص سانپ ہے تو دکھاؤ۔ سپیرے نے مٹی کے ایک چھوٹے سے برتن سے ایک چھوٹا سا سانپ نکال کر زمین پر ڈال دیا۔ مولانا روحی نے پوچھا: "اسکی نوعیت کیا ہے؟" سپیرے نے پنجابی میں جواب دیا کہ "میں اسے کالا شاہ کاکو سے پکڑ کر لایا ہوں"۔ مولانا نے فرمایا: "ابے کمبخت میں اس کی نوعیت پوچھتا ہوں اور تو ظرف مکان میں جواب دیتا ہے"۔ سپیرا یہ الفاظ سُن کر گھبرایا اور اپنے سانپ کو

دوبارہ مٹی کے برتن میں ڈال وہاں سے چل دیا۔ مولانا کرسی پر بیٹھے مسکراتے رہے اور تمام شاگرد بھی ہنسنے کی بجائے مؤدب بیٹھے مسکراتے رہے۔

انجمن حمایت اسلام ایسٹر کی چھٹیوں میں انجمن کا سالانہ جلسہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی وسیع گراؤنڈ میں کیا کرتی تھی۔ اس جلسہ کے کئی اجلاس ہوتے تھے اور اکابرین ملت و شعرائے کرام اپنا کلام بھی سنایا کرتے تھے اور لوگ فراخ دلی سے چندہ دیا کرتے تھے۔ جلسہ سے قبل طلبہ اور اساتذہ کو چندہ اکٹھا کرنے کے لئے کاپیاں سپرد کر دی جاتی تھیں۔ سٹاف اور طلبہ کا ایک جلوس بھی اسلامیہ کالج سے نکالا جاتا تھا جو دہلی دروازہ کے اندر سے ہوتا ہوا بھاٹی سکول کے قریب جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ جلسہ سے دو روز قبل جب یہ آرڈر پرنسپل کی جانب سے آیا کہ جلوس اس وقت کالج سے روانہ ہو گا تو چند سینئر اساتذہ فرمانے لگے کہ جلوس کا راستہ بھی غلط ہے اور اساتذہ و طلبہ کی تشہیر اس سے بڑھ کر غلط اور نامناسب ہے۔ انجمن کی جنرل کونسل کا ایک اہم رکن اتفاق سے عین اسی وقت سٹاف روم میں داخل ہوا۔ اس نے مولانا کے مندرجہ بالا الفاظ سن لئے۔ وہ رکن کہنے لگا۔ "مولانا کیا فرمایا ہے آپ نے؟" مولانا نے عصیٰ مطہر (موٹے سے ڈنڈے کو) اٹھا کر نہایت جوش میں آ کر فرمایا: "یہ جلوس ناجائز اور غیر اسلامی ہے۔ جاؤ یہ میرا فتویٰ ہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک کسی سے فتویٰ لے لو۔ یہ جلوس ناجائز ہے"۔ جنرل کونسل کا وہ اہم رکن فوراً دم دبا کر بھاگا اور اس سال اساتذہ و طلبا کا جلوس نہ نکلا۔

مولانا علم الدین سالک خوب مزے لے لیکر معاشیات کے پروفیسر سردار لو۔ کرامت کے بارے میں دوسرا اہم واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک روز رمضان کے مہینے میں سردار لو کرامت نے جونہی سگرٹ سلگایا تو مولانا روحی داخل ہوئے اور غصے میں آ کر اپنا ڈنڈا سردار لو کرامت کے دائیں بازو پر مارا۔ سردار صاحب نے جواباً کہا کہ جب میں روزے نہیں رکھتا تو سگرٹ پینے میں کیا نقصان ہے۔ مولانا روحیؒ نے سردار لو۔ کرامت کے اسی بازو پر ایک اور ڈنڈا مارنے کے بعد ایسا مسکت جواب دیا کہ تمام اساتذہ عش عش کر اٹھے۔ ایک فقرے کا جواب تھا جس میں مذہبی، اخلاقی اور قانونی پہلوؤں میں مبنی مسکت جواب تھا۔ سردار لو۔ کرامت بعد ازاں جب تک اسلامیہ کالج سے وابستہ رہے۔ سگرٹ سلگانے سے قبل سٹاف روم میں بیٹھے ہوئے اساتذہ سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ "ماہ رمضان ختم ہو چکا ہے یا نہیں۔"

میں نے اسلامیہ کالج لاہور کی جانب سے ایم۔اے تاریخ میں داخلہ لیا تھا۔ اُس زمانے میں یونیورسٹی کے علاوہ کالج بھی فیس اور یونین فنڈ وصول کیا کرتے تھے۔ جب کبھی میں فیس ادا کرنے جاتا تو مولانا روحیؒ، مولانا علم الدین سالک، پروفیسر حمید احمد خان اور پروفیسر ایم۔اے غنی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا اور سلام کرنے کے بعد نہایت ادب سے ان تمام اساتذہ کی خیریت دریافت کرنے کے بعد واپس چلا جاتا تھا۔ تاریخ کا ایم۔اے کرنے کے بعد مولانا روحیؒ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے میں نے اور دیال سنگھ کالج کے پروفیسر شجاع الدین مرحوم نے ایم۔اے فارسی کے فائنل ائیر میں داخلہ لے لیا اور اعلیٰ ڈویژن میں یہ امتحان بھی پاس کر لیا۔ اُن دنوں ملازمت کا حصول (خاص طور پر ایک غریب خاندان کے مسلمان کے لئے) تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن مولانا روحیؒ کی دعا سے لیکچرارشپ تو نہ ملی لیکن انٹرویو میں انگریز چیئرمین نے ایک ذو معنی فقرہ کی بدولت مجھے براہ راست انسپکٹر بھرتی کر لیا اور لدھیانہ شہر میں میری تعیناتی ہوئی۔ انٹرویو میں مجھ سے پوچھا گیا کہ "آپ کے رشتے داروں میں سے کوئی سرکاری ملازم ہے؟" میں اس سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ

"Sir my uncle Shihabuddin is a Railway officer."

ابھی میں "is" تک پہنچا تھا کہ انگریز چیئرمین نے کہا: "yes, yes, I Know" اُسی وقت باقی دو ممبران سے سرگوشی کر کے مجھ براہ راست انسپکٹر مقرر کر کے اُس نے مجھے لدھیانہ بھجوا دیا۔ وہ شاید مجھے سر شہاب الدین کا رشتے دار سمجھا۔ یہ مولانا روحیؒ کی دعاؤں کا اثر تھا۔ میں لدھیانہ سے ہر پندرہ روز کے بعد ہفتہ کو بعد از دوپہر روانہ ہو کر براستہ فیروزپور اُسی رات کو لاہور پہنچ جاتا تھا اور دن کو اپنے تمام رشتے داروں اور احباب کو ملنے کے بعد کالج چلا جاتا تھا اور مولانا روحیؒ اور سالک صاحب اور دیگر اساتذہ کی خدمت اقدس میں حاضری دے کر اور اُن کی دعاؤں کے خزانے وصول کر کے واپس چلا جاتا تھا۔

مولانا روحیؒ جب انجمن کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انجمن نے انہیں ایک سو روپیہ ماہوار پنشن عطا کی۔ اُسی روز سٹاف روم میں مولانا کی الوداعی تقریب میں ایک جلسہ ہوا۔ یہ ناچیز اُس زمانے میں ایم۔اے کا طالب علم تھا اور کالج میں فیس ادا کر کے جب سٹاف روم میں پہنچا تو الوداعی تقریب میں شامل ہوا۔ پرنسپل نے ہر ماہ پنشن کا چیک بھجوانے کا وعدہ کیا۔ مولانا روحیؒ نے

فرمایا کہ چیک کی بجائے نقد رقم بھجوا دی جائے تو بہتر ہوگا۔ پرنسپل صاحب مان گئے تو مولانا سالک نے اعلان کیا کہ وہ سات یا آٹھ تاریخ کو پنشن کی رقم وصول کر کے مولانا روحی رح کو خود پہنچا آیا کریں گے (اُس زمانے میں کالج جمعہ کو بند ہوتا تھا اور ماہانہ سٹاف کی تنخواہ سات یا آٹھ تاریخ سے قبل نہیں ملتی تھی) الوداعی تقریب کے بعد تانگہ منگوا کر مولانا روحی رح کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ بعد ازاں مولانا سالک نے مجھ سے سوال کیا کہ تم کالج میں فیس کس تاریخ کو ادا کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ ہر ماہ سات یا آٹھ تاریخ کو۔ سالک صاحب نے فرمایا "بہت خوب! ہم دونوں مولانا روحی رح کی ماہانہ پنشن ادا کریں گے۔ میں بخوشی مان گیا۔ دو ماہ تک یہ ناچیز اور سالک صاحب مولانا روحی رح کے در دولت پر حاضر ہو کر پنشن کی رقم ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد سالک صاحب فرمانے لگے بھئی تم اکیلے ہی یہ پنشن کی حقیر رقم مولانا کی خدمت میں پہنچا دیا کرو۔ میں نے بسر و چشم قبول کیا اور لدھیانہ کی ملازمت ملنے تک پورے آٹھ ماہ تک یہ پنشن پہنچاتا رہا۔ اس کے بعد سالک صاحب نے کوئی اور انتظام کیا۔ لدھیانہ جانے سے قبل یہ ناچیز مولانا روحی کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہوں نے دعاؤں کے ساتھ فرمایا: "سلامت روی و باز آئی"۔

اُن دنوں میرے چچا میاں جلال الدین بھاٹی دروازہ کے اندر مولانا روحی رح کے دولت کدہ کے قریب دوسری گلی میں کرایہ کے مکان میں اپنے بال بچوں سمیت رہائش پذیر تھے۔ ایک روز لدھیانہ سے آ کر میں مولانا روحی رح اور اپنے چچا سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے جا رہا تھا کہ چچا جان بھاٹی دروازہ داخل ہوتے ہی پولیس سٹیشن کے قریب اپنے لڑکے سمیت مل گئے۔ آنکھ کے آپریشن میں اُن کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی اور میرا چچا زاد بھائی انہیں تانگہ پر سوار کر کے بھاٹی دروازہ تک لایا تھا۔ میں چچا جان کو گھر پہنچانے کے لئے اُن کے ساتھ چلا گیا۔ راستے میں چچا جان اور چچا زاد بھائی نے مجھے بتایا کہ مولانا روحی رح دس روز قبل وفات پا چکے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ لدھیانہ کے کسی اخبار نے مولانا روحی رح کی وفات حسرت آیات کی خبر شائع نہیں کی تھی۔ مجھے شجاع الدین پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور سے کافی عرصہ شکایت رہی کہ مجھے ٹیلیگرام بھیج دیتے تاکہ میں نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کر لیتا۔ چچا جان کے گھر سے میں سیدھا مولانا روحی رح کے در دولت پر حاضر ہوا تو حافظ عبد الحق صاحب اور رانا بہاء الحق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم تینوں نے فاتحہ پڑھا اور اظہار افسوس کے بعد میں واپس چلا گیا۔ اس بعد

سے رانا بہاء الحق میرے دوستوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ ڈاکٹر ایم۔ ضیاء الحق صوفی اس سے طویل عرصہ قبل میرے کرم فرماؤں میں شامل تھے

یہ چند سطریں اس ناچیز نے آپ کے کہنے سے قلمبند کر دی ہیں اور آپ کو کامل اختیار ہے کہ جس قسم کی تبدیلی مندرجہ بالا سطور میں مناسب خیال کریں ضرور کر لیں۔

میاں شمس الدین (مرحوم)

(مالک مکتبہ معین الادب)

مولانا اصغر علی روحی میرے استاد تھے۔ مخدوم و محترم، مشفق و محسن، راہنمائے علوم ظاہری اور علوم باطنی کے سالک، بنی نوع انسان کے ہمدرد " واذا مرّوا باللغو مرّوا کراماً " کی زندہ تفسیر، انسانی لغزشوں پر دار و گیر سے بچتے ہوئے عفو و درگزر کرنے والی محبوب شخصیت، بدی سے گریزاں اور پارساؤں کی صحبت کے دلدادہ، دیکھنے سننے اور بولنے میں شریعت کے پابند۔ آج قریباً پینسٹھ برس اُدھر جب چشم تصور سے اس علم و عمل کے پیکر کو جد و جہد زندگی میں مصروف کار دیکھتا ہوں تو صدہا تصورات ذہن کو احاطہ کر لیتے ہیں۔ میرے ماضی کی یہ عظیم شخصیت میری روح سے ہم آہنگ ہو کر مجھ جیسے ہیچمدان اور بے بضاعت انسان کے لئے باعث فخر و مباہات بن جاتی ہے۔ جہاں اس بات پر اترانے لگتا ہوں کہ مولانا جیسی یادگار زمانہ شخصیت سے میں نے اکتساب علم کیا ہے۔ اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوا ہوں۔ اُن سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ وہاں فطرت کی چیرہ دستیوں اور فانی انسان کی مجبوریوں پر خون کے آنسو بہانے لگتا ہوں اور غالب کا یہ شعر دفعتاً زبان پر آجاتا ہے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

میرا حافظہ باایں پیرانہ سالی خدا کے فضل سے اچھا ہے اس کے باوجود اگر میں کسی سہو کا مرتکب نہیں ہوتا تو کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۰۸ء میں حویلی متراں والی اطراف اکبری دروازہ کے ایک ابتدائی

سکول سے میں نے تیسری برانچ پاس کر کے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں جماعت چہارم میں داخلہ لیا۔

اسلامیہ کالج جو آج کئی برسوں سے ایک علیحدہ ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ ان دنوں شیرانوالہ سکول سے ملحق تھا۔ کالج کے پرنسپل (سردار حاکم سنگھ) تھے جو مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد حاکم علی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُدھر میاں محمد حاضر جو کہ فی الواقع اسم بامسمیٰ تھے سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اردو فارسی تاریخ جغرافیہ اور حساب کے استاد بالترتیب جناب خلیفہ حسین بخش، ماسٹر نصیر الدین اور ماسٹر دل محمد تھے۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو مضامین جن اساتذہ کو تفویض کئے گئے تھے ان کی تدریس بس انہی کی ذات تک محدود تھی یا ان کی ذمہ داریاں صرف اسی ایک مضمون سے وابستہ تھیں۔ بلکہ معاملہ یوں تھا کہ ہر استاد اپنی اعلیٰ استعدادِ علمی کی بنا پر دوسرے مضامین کی تدریس سے بطریق احسن عہدہ برآ ہوتا تھا۔ مولوی حسین بخش جو عموماً اردو کا درس دیا کرتے تھے فارسی اور دیگر مضامین بھی پڑھایا کرتے تھے اسی طرح دیگر اساتذہ کا بھی یہی معمول تھا۔ عربی کے اساتذہ میں مولانا اصغر علی روحی، مولوی محمد ذاکر، مولوی محمد یحییٰ اور حافظ غلام محمد خاص طور پر مشہور تھے۔ ان کے علاوہ بھی چند استاد عربی کی تدریس پر مامور تھے جن کے اسماء گرامی کوشش بسیار کے باوجود حافظہ کی گرفت میں نہ آسکے۔ مجھے خوب خوب یاد ہے کہ عربی کے ان اساتذہ میں صرف میرے مولانا یعنی مولوی اصغر علی روحی وہ واحد شخص تھے جن کے علم و فضل کا شہرہ باہر کی دنیا سے ہم طلبہ تک پہنچ چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ طلبہ کے اذہان پر ان کی فضیلتِ علمی مستقلاً اثر انداز ہو چکی تھی۔ ہر چند ہم اپنی کم مائیگی اور ابتدائی جماعت کے متعلمین ہونے کی بنا پر ان کی علمی رفعت اور عالمانہ بصیرت کا اندازہ نہ کر سکتے تھے مگر یہ بات زبان زدِ خاص و عام تھی کہ اس وقت لاہور بھر میں مولانا موصوف سے بڑھ کر کوئی دوسرا عالم موجود نہیں۔

اس کے ثبوت میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جس کا یہاں ذکر کرنا شاید بے محل نہ ہوگا۔ میرے ایک دوست جناب شیخ حسن دین ایل ایل بی تھے۔ آپ نے ایک انگریز کے کہنے پر اخلاقِ جلالی کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا اور کافی محنت اور عرق ریزی کے بعد اس کے بیشتر حصص کا ترجمہ کر ڈالا لیکن چند مقامات ایسے تھے جو باوجود انتہائی غور و فکر کے اُن کے احاطہ ادراک میں نہ آسکے اُدھر وہ اپنے ایمان اور ضمیر کی روشنی میں ایسی عظیم کتاب کے ترجمے میں ذرا سا تساہل برتنا بھی انتہائی بددیانتی کے مترادف

سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں اول اول اس موضوع پر انہوں نے دیگر کتابوں، شرحوں اور مستند لغات کی مدد سے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر ان حضرات کی طرف رجوع کیا جو ان کے نزدیک فلسفۂ اخلاق پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے مگر سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ پھر دیگر علماء کی طرف رجوع کیا مگر اطمینان قلب یہاں بھی نصیب نہ ہوا۔ کوئی نہ کوئی الجھن ایسی باقی رہ جاتی جو مستقلاً ذہن کو پریشان رکھتی۔ آخر ایک روز میرے کہنے پر مولانا اصغر علی روحی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کوتاہی علم کا ذکر کر کے ان مقامات کو پیش کرنے کی جسارت کی۔ مولانا مرحوم نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ ہر مقام کو الگ الگ اور ایک ایک کر کے بیان کریں۔ شیخ مرحوم نے ایسا ہی کیا مگر اپنا مافی الضمیر واضح کرنے کے لئے جب بھی کسی حل طلب نکتہ کے تلازمات کا ذکر شروع کرتے تو مولانا مغفور انہیں ٹوکتے اور فرماتے "ان توضیحات کی ضرورت نہیں آگے چلیئے"۔ چنانچہ جب شیخ صاحب مرحوم اپنی بات ختم کر چکے تو مولانا متوجہ ہوئے اور آہستہ آہستہ اظہار خیال فرماتے۔ الفاظ و معانی کی عالمانہ موشگافیاں ہوتیں۔ پھر اس نکتہ خاص کی عقدہ کشائی اس انداز سے کرنے لگتے گویا ایک جید عالم نو آموز کو ابتدائی سبق سمجھا رہا ہے، دقیق سے دقیق بات پانی کی طرح حل ہوتی چلی جاتی۔ سننے والے کے ذہن میں ایک عمارت سی تعمیر ہونے لگتی اور بالآخر یہی عمارت ایک عظیم محل کی صورت اختیار کر لیتی۔ سامع کو موقع ہی نہ ملتا کہ وہ دخل در معقولات ہو۔ عقدہ ہائے مشکل کی تمام راہیں جو جویائے علم کے ذہن میں ہوتیں مولانا کے بیان سے خود بخود اٹھنے لگتیں اور حقیقت کا روشن پہلو آئینہ ہو جاتا۔ شیخ مرحوم جب مولانا کی وساطت سے اپنی علمی مشکلات حل کر چکے تو میں نے ان سے پوچھا۔ "کہیے شیخ صاحب مولانا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" کہنے لگے "سبحان اللہ، عالم ہو تو ایسا۔ میاں وہ نکات جو میں اور دیگر حضرات مدتوں حل نہ کر سکے مولانا کے نزدیک سامنے کی باتیں تھیں۔ ان کی تقریر کے دوران میں نے بارہا محسوس کیا کہ میرے سامنے علم کا ایک بحر ذخار موجزن ہے جس کے ساحل پر کھڑا ہوں اور جس کی صرف چند موجیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں۔ آپ کی بات دل پر بلاواسطہ اثر انداز ہوتی تھی اور میرے دل میں روحانی اہتزازات جنم لیتے تھے۔ جب میں وہاں سے اٹھ کر آیا تو میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آپ "صاحب دل" بزرگ ہیں"

سکول میں تدریس کا طریق کار

طلبہ کی تدریس کے معاملہ میں اساتذہ کا عام قاعدہ یہ تھا کہ

ایک جماعت کو درس دینے کے بعد وہ کسی دوسری جماعت کو پڑھانے کے لئے چلے جاتے تھے۔ اور اس طرح "پیریڈ" ختم ہونے پر اگلی جماعت کی باری آتی۔ اساتذہ کرام جماعتوں میں خود تشریف لے جاتے مگر مولانا روحی سکول و کالج میں وہ واحد استاد تھے جو اپنی کلاس ہی میں یا کھلے میدان میں یا چھت پر بیٹھ رہتے اور طلبہ خود چل کر حصولِ علم کی خاطر ان کے سامنے حاضر ہوتے۔ جب کسی جماعت کے سب لڑکے کلاس میں حاضر ہو جاتے (یہ جماعت عموماً دس پندرہ طلبہ پر مشتمل ہوتی تھی) تو آپ کسی ایک طالب علم سے مخاطب ہو کر فرماتے: "کل کیا پڑھا تھا؟" لڑکا کتاب کھولتا اور سبق کی نشاندہی کراتا۔ آپ عبارت کے چند جملوں کو دہراتے اور کسی طالب علم سے اس کے معنی و مطالب کے بارے میں استفسار ہوتا۔ وہ صحیح جواب نہ دے سکتا تو اس کی توضیح فرماتے۔ پھر دوسرے لڑکے کی باری آتی۔ اس طرح باقی طلبہ سے بھی یکے بعد دیگرے پوچھا جاتا۔ مولانا کا یہ عمل استفسار پندرہ منٹ سے زیادہ کا کبھی نہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ انداز خاص اسباق یاد رکھنے میں ایسا مؤثر ثابت ہوا کہ ہمیں گھر جا کر انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

نالائق طلبہ سے سلوک

ایسا طالب علم جسے سرے سے پڑھائی سے رغبت ہی نہ ہوتی مولانا کے نزدیک زیادہ قابل توجہ ہوتا۔ آپ پہلے اسے نہایت محبت اور شفقت سے سمجھاتے اور اس معاملہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ اس پر بھی اگر وہ راہ راست پر نہ آتا تو اسے مختلف طریقوں سے غیرت دلاتے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھتے جب تک وہ صحیح معنی میں ایک اچھا طالب علم نہ بن جاتا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم نے کسی بھی طالب علم کو اس کی علمی کوتاہیوں اور لغزشوں پر ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی اور تو اور ان کی زبان شرافت ترجمان سے کبھی کوئی نازیبا کلمہ تک نہ سنا۔ ان کی رحمدلی اور طلبہ سے شفقت کا یہ عالم تھا کہ ہم سکول اور گھر میں حقیقتاً کوئی فرق محسوس نہ کرتے تھے۔ استاد کے بارے میں طالب علم کا وہ روایتی خوف سکول و کالج میں تعلیم کے کسی بھی درجہ پر اس کے ذہن سے جدا نہیں ہوتا یہاں نام کو موجود نہ تھا۔ درس دیتے وقت کرسی پر اس انداز سے بیٹھتے تھے کہ ایک ٹانگ دوسری پر دھری ہے۔ چہرہ سامنے ہے اور سب کو نظر میں لئے ہوئے ہیں۔

طنز و ظرافت کا طبعی عنصر

آپ کا چہرہ بالعموم اور آپ کا انداز بالخصوص متانت و سنجیدگی کا

آئینہ دار تھا مگر قدرت نے انہیں لطیف قوتِ حاسہ اور جوہرِ عالی ظرفی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت کو مزاح کے عنصر سے بھی نوازا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسا طنز بھر دیتے تھے کہ سننے والا بہرحال محظوظ ہوتا۔ سطحی مزاح پر طبیعت مائل ہی نہ ہوتی۔ مزاج درویشانہ اور قلب مومن کا پایا تھا۔ لہٰذا انتہائی گہرے طنز میں بھی سننے والے کی دل آزاری نہ ہوتی۔ برخلاف اس کے وہ بات کی تہ کو پا جانے کے بعد ذہنی انبساط حاصل کرتا۔

عزتِ نفس اور پاسِ وضع

مولانا فی الواقعہ مردِ حُر، قانع اور درویش منش انسان تھے۔ زندگی نہایت سادہ اور ہر قسم کے تکلفات سے عاری تھی۔ لباس بھی سادہ اور خوراک بھی سادہ تھی۔ نام و نمود سے اس طرح گریزاں جیسے متناطیس کے دو مخالف سرے۔ آزادہ روی کا یہ عالم کہ ع

الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

عزتِ نفس اور پاسِ وضع کا یہاں تک خیال تھا کہ زمانہ معلّمی میں جب کبھی بیماری کے باعث کوئی ضروری کام پیش آیا تو ہیڈ ماسٹر سے زبانی کہہ دیا یا کسی سے کہلوا بھیجا۔ تحریری درخواست کبھی نہ دی۔

صاحبِ دل بزرگ

شیخ حسن دین مرحوم نے آپ کے بارے میں کہا تھا "آپ صاحبِ دل بھی ہیں"۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان الفاظ پر غور کرتا ہوں تو چند واقعات ایسے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں جو نہ صرف ان کے قول کی تصدیق کرتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے مجھے نیا زاویہ نگاہ بخشتے ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے صرف دو واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔ پہلا واقعہ براہ راست مجھ سے اور میرے ایک کرم فرما مولوی محمد بشیر مرحوم سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں بلا کم و کاست اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بزرگوں کی زندگیوں کو محض ان کی کرامات کے آئینہ میں کبھی نہیں پرکھا مگر ساتھ ہی ساتھ مابعد الطبیعیاتی حقائق سے انکاری بھی نہیں ہوں۔ کچھ افعال ایسے ضرور ہوتے ہیں جو صرف اللہ کے برگزیدہ بندوں ہی سے منصّۂ شہود پر آسکتے ہیں۔ عام آدمی کی نگاہ سوائے استعجاب و حیرت کے ان کی کُنہ سے کچھ برآمد نہیں کر سکتی۔

ہاں پہلا واقعہ یوں ہے کہ ایک روز میں اور میرے دوست مولوی محمد بشیر مرحوم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اس وقت آپ کے چہرے سے کچھ کچھ فکر مندی اور قدرے پریشانی کے آثار مترشح تھے مگر طبیعت بدستور مائل بہ انتشار نہ تھی۔ ہماری طرف رُخ کر کے حاکمانہ انداز میں فرمایا: "بیٹو! اُٹھو اور بادامی باغ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچو وہاں میرا لڑکا جو گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا ہے موجود ہو گا اسے کہو "وہ واپس گھر آجائے اور کسی دوسرے شہر جانے کا خیال دل سے ترک دے"۔ مولانا کے اس ارشاد پر مولوی بشیر نے کچھ جرأت کرتے ہوئے کہا:

"مولانا! میں خوب جانتا ہوں کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو چکی ہو گی۔ میں گاڑیوں کے آنے جانے کے اوقات سے اچھی طرح باخبر ہوں۔" اس پر مولانا نے پھر وہی کلمات دہرائے اور یقین اور قطعیت بھرے لہجے میں فرمایا:

"وہ لاہور نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے کہو کہ واپس آئے۔"

مولانا کے ان الفاظ نے ہمارے دلوں میں یقین کی ایسی صورت پیدا کر دی کہ دفعتاً ہمارے قدم سٹیشن کی جانب اُٹھ گئے۔ میں مولوی بشیر مرحوم کے بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے دل میں یقین و گمان کی کیفیت کس منزل میں تھی مگر اپنے بارے میں حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے اور مولانا کے صاحبزادے بھی وہیں موجود ہیں۔ چنانچہ جب ہم بھاگم بھاگ اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی لیٹ ہونے کی بنا پر ابھی روانہ نہ ہوئی تھی۔ کئی اشخاص سے اس کے لیٹ ہونے کا سبب پوچھا مگر ایک آدمی بھی معقول جواب نہ دے سکا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا:

"صاحب پتہ نہیں چلتا کہ گاڑی کیوں لیٹ ہے"

اُدھر اُن کے صاحبزادے کو دیکھا تو وہ مضطربانہ اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں آنِ واحد میں ان کے قریب پہنچے اور انہیں مولانا کے حکم سے آگاہ کیا۔ وہ مولانا کا پیغام سنتے ہی بلا چون و چرا ہمارے ساتھ واپس چل پڑے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ واقعہ سرے سے کسی اہمیت کا حامل ہی نہ تھا اور ہر شے مولانا کے اشارے پر عمل کر رہی تھی۔

دوسرا واقعہ کسی دوست نے مجھ سے بیان کیا، کہنے لگے کہ ایک بار نصف شب کے قریب مولانا کے گھر میں چور گھس آئے۔ اس وقت آپ بالائی منزل میں یادِ الٰہی میں ہمہ تن محو تھے۔ ان کی کھسر پھسر سنی تو نیچے صحن کی جانب گردن جھکا کر فرمایا:

"دوستو! کمرے کی بائیں جانب ایک صندوقچے پر مٹی کی ٹھلیا رکھی ہے۔ اس میں کچھ

روپے امانت کے ہیں جو میرے نہیں۔ بقیہ مال فقیر کا ہے جسے بلاخوف و خطر لے جاؤ۔" چوروں نے
جب یہ کلمات سُنے تو فوراً مکان سے باہر نکل گئے اور علی الصباح چھبیس تیس آدمیوں کے ہمراہ مولانا
کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور بار بار معافی مانگنے اور اپنے کئے پر پشیمان ہونے کے بعد اصرار کرنے لگے کہ انہیں
مرید کر لیا جائے۔ مولانا نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ رات کے واقعہ نے چوروں پر رُشد و ہدایت
کی راہ کھول دی ہے مگر ساتھ ہی فرمایا: "مجھے پیری مریدی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں بھی
اللہ کے دوسرے گنہگار بندوں کی طرح اس کا ایک گنہگار بندہ ہوں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں
نیکی کی راہ دکھا دی ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس ستار العیوب کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمارے کئے
ہوئے گناہوں کو معاف فرمائے اور آئندہ نیکی کی توفیق عطا کرے۔" اس پر سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے
اور مولانا نے نہایت خشوع و خضوع سے اپنے لئے اور ان کے لئے دعا فرمائی۔ پھر وہ لوگ مولانا سے معانقہ
کر کے رخصت ہو گئے۔

مولانا کے بارے میں یہ چند حقائق جو میں نے بیان کئے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ان
کی شخصیت کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی پیش کر سکے ہیں یا نہیں۔ مگر اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ
ان کی عظمت کے وہ نقوش جو میری لوحِ دل پر ثبت ہیں صفحۂ قرطاس پر ہرگز منتقل نہیں ہو سکتے۔
کسی نے سچ کہا ہے:

دربیانِ رازِ مشتاقاں قلم نامحرم است

یہ ان کے صاحبزادے کا ارشاد تھا کہ مولانا موصوف کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو ضبطِ تحریر
میں لاؤں۔ لہٰذا اس روحانی نسبت اور نیازمندانہ عقیدت کے پیشِ نظر جو مجھے مولانا روحی مغفور و مبرور
سے ہے انکار کی مجال کب ہو سکتی تھی۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے ہوئے کی۔ اگرچہ
اپنی کوتاہ قلمی پر شرمندہ ہوں مگر جی میں جب یہ خیال آتا ہے کہ جس شخصیت کے بارے میں لکھ
رہا ہوں وہ عفو و درگزر کے اس مقام پر فائز ہے جہاں میری ہزار کوتاہیاں بھی ان کی روح کو شرمندہ نہ
کر سکیں گی تو دل میں اطمینان سا ہونے لگتا ہے۔ وہی بارعب چہرہ نظروں کے سامنے پھر جاتا
ہے۔ اوسط درجے سے نکلتا ہوا قد، گندمی رنگ، ڈاڑھی سیاہ، مختصر اور مقطع، ستواں ناک
درمیانہ مگر ذکاوت کی آئینہ دار آنکھیں۔ کشادہ پیشانی، سیاہ بھویں، درمیانہ سطح کی آواز، دلآویز

وخوش کن چھوٹے چھوٹے فقرے گویا زیر و بم میں بادِ نسیم کی اٹکھیلیاں، خوش پوشی و خوش وضع
و خوش گفتار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شریعت کے لبادہ میں طریقت کے جا ، رحم و کرم کا مجسمہ،
علم و ادب کا محیط بیکراں۔ میں اپنی علمی کم مائیگی کی بنا پر ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ کے عربی، فارسی
اور اردو کے شعری اور نثری کارناموں اور مناظروں پر کچھ لکھ سکوں۔

یہ کام کسی ثقہ عالم اور بالغ نظر ناقد کا ہے مگر اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر
مولانا دبیر عجم کے علاوہ دوسری کتب نہ بھی تصنیف کرتے تو یہی ایک کتاب ان کی حیات جاوید
کے لئے کافی تھی۔ افسوس! فطرت ایسی فیاض نہیں کہ مولانا جیسی ہستیوں کو بار بار جنم دے۔
انسانی دل و دماغ کا فطری طور پر اسی نہج پر واقع ہونا کہ ایک اعلیٰ معیار پر علم و عمل میں چولی
دامن کا ساتھ ہو، خال خال نظر آتا ہے۔ مولانا موصوف بلاشبہ انہی ہستیوں میں سے ایک تھے
میر تقی میر کا یہ شعر آپ جیسے ہی نابغہ انسانوں پر صادق آتا ہے

مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

بے ہنر
شمس الدین

محلہ تکیہ سادھواں
اندرون موچی دروازہ لاہور

مولانا ظفر اقبال

(سابق رجسٹرار محکمہ امتحانات محکمہ تعلیم لاہور سے ایک انٹرویو)

مولانا ظفر اقبال صاحب مولانا اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت عزیز شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ تحقیق سلسلہ میں جن اصحاب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اُن میں سے اکثر مجھ سے پوچھتے کہ مولوی ظفر اقبال صاحب سے بھی آپ نے کچھ معلومات حاصل کئے ہیں یا نہیں۔ اس کام کے لئے میں مولوی ظفر اقبال صاحب کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوتا رہا لیکن مجھ کامیابی نہ ہوتی نظر آتی۔ وہ ہمیشہ یہ فرماتے کہ میں اپنے بیٹے سعید اقبال کو اپنے تاثرات لکھوا دوں گا اور وہ آپ تک پہنچا دیں گے۔ ایسا کئی دفعہ ہوا۔ آخر میں نے کچھ سوالات لکھ لئے اور مولوی صاحب موصوف کو دے آیا تاکہ وہ اُن کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار فرما سکیں کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ جب وہ مولانا روحی مرحوم سے پڑھا کرتے تھے اُس کو بہت وقت گزر چکا ہے اس لئے انہیں کچھ بھی یاد نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ سوالات میں سے وہ مناسب جواب سوچنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پھر مولوی صاحب موصوف نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ میں کسی وقت اُن کی خدمت میں حاضر ہوں چنانچہ میں اگلے روز اُن کا گرامی نامہ لے کر اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور اُن سے عرض کیا کہ میں آپ کا خط پڑھ کر حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا کہ مولانا کے صاحبزادہ صوفی ضیاء الحق صاحب سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اس لئے آپ کسی دن اُن کو ساتھ لے کر آجائیں۔ میں اگلے روز صوفی صاحب کو لے کر پھر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صوفی صاحب سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے اور پھر مجھ سے فرمایا کہ بھلا پوچھو تو سہی کہ تم کس لئے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا آپ سے حالات حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں۔ کہنے لگے۔ کہ کیسے؟ اور کون سے حالات؟ میں نے عرض کیا کہ الف سے ی تک کے حالات۔ وہ سوچنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کہ (مولانا) اصغر علی روحی کے نام کے شروع میں الف ہے اور آخر میں ی۔ اُنہی کے حالات درکار ہیں۔ فرمایا! یہ عجیب نکتہ آفرینی ہے اور پھر مسکراتے رہے۔ چونکہ انہوں نے مزاحیہ انداز میں مجھ سے پوچھا کہ بھلا پوچھو تو، کس کام کے لئے آئے ہو؟ اس لئے میں نے بھی مزاحیہ انداز میں منقد جسب بالا جواب دیا جس کی انہوں نے بہت داد دی۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ جس میں نمکین اور شیریں خوردنی اشیاء موجود تھیں

ہم تینوں مزے لے لے کر پیتے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مولوی صاحب نے صوفی صاحب کا بازو ہاتھ میں لے کر کہا کہ بازو جیسا موٹا ہونا
چاہیے ویسا نہیں۔ بھلا آپ بوجھیں تو سہی آپ کی عمر کتنی ہے؟ صوفی صاحب نے کہا: قریباً ۶۸ سال۔ پھر خود ہی فرمایا
میری تاریخ پیدائش ۱۸۹۷ء کی ہے اس لحاظ سے میری عمر کتنی ہوئی؟ صوفی صاحب نے کہا: قریباً ۸۲ سال۔ پھر فرمایا کہ میرے
نام کے عدد کتنے بنتے ہیں کیونکہ میرا نام تاریخی ہے۔ صوفی صاحب نے حساب کر کے فرمایا کہ "ظفر اقبال" کے اعداد ۱۳۱۲
بنتے ہیں۔ کہنے لگے اب کون سا ہجری سال ہے؟ صوفی صاحب نے فرمایا: ۱۴۰۱۔ پوچھا اس لحاظ سے میری عمر کتنی ہوئی؟
صوفی صاحب نے کہا ۸۷ سال۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ پھر وہ کاغذ میز پر تلاش کرنے لگے جن پر سوالات لکھے ہوئے تھے۔ فرمانے
لگے سعید نے یہیں کہیں رکھے تھے کہنے لگے دو کاغذ تھے جو مل نہیں رہے۔ میں نے اُن کاغذوں کے ڈھونڈنے میں اُن کی مدد
کی اور وہ دونوں کاغذ ڈھونڈ کر اُن کے ہاتھ میں دے دئیے۔ کہنے لگے پہلا سوال کیا ہے؟ پھر جو باتیں
ہوئیں وہ مکالمے کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا روحی مرحوم سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

میں نے ایف۔ اے کا امتحان مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کیا اور پھر بی۔ اے سال سوم میں
اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تو اُس وقت عربی اور فارسی کے جو اساتذہ وہاں موجود تھے اُن میں مولوی محمد عمر صاحب،
مولوی احمد علی صاحب اور مولانا روحی صاحب مجھے یاد ہیں۔ مولوی محمد عمر صاحب فارسی اور دینیات پڑھاتے تھے اور
باقی دونوں بزرگ عربی اور دینیات۔ تھرڈ ائیر کی کلاس کو مولانا روحی عربی پڑھاتے تھے۔ یہ بات میں نے پہلے سے ہی
سُن رکھی تھی کہ عربی اور فارسی کی اعلیٰ تدریس اسلامیہ کالج میں ہوتی ہے اور واقعی وہاں کے اساتذہ کو نہایت محنتی اور
قابل پایا۔ مولانا روحی زیادہ تر کالج گراؤنڈ میں جو بعد از ہوسٹل کے سامنے تھی طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے اور میں
مسجد مبارک کے ساتھ والے مکان میں رہتا تھا۔ مولوی ابراہیم سیالکوٹی مرحوم جب لاہور آتے تھے تو اسی مکان
میں جو مولوی فضل دین مرحوم کا تھا قیام کیا کرتے تھے۔

(۲) آپ نے سال سوم میں داخلہ کب لیا تھا؟

سال مجھے یاد نہیں۔

(۳) مولانا روحی مرحوم سے کتنے سال تک آپ کو شاگردی کا تعلق رہا اور آپ نے اُن سے کیا کیا
پڑھا؟ اُن کے پڑھانے کا طریقہ کیا تھا؟

میں نے اُن سے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں عربی اور دینیات پڑھی اس طرح اُن کے ساتھ یہ

تعلق چار سال تک رہا۔ پڑھانے کا طریقہ خاص معین نہیں تھا۔ بعض وقت سارا دن پڑھاتے تھے اور بعض وقت کم بھی پڑھتے تھے۔ میں نے اُن سے عربی اور دینیات دونوں مضمون پڑھے۔

(۴) کیا مولانا مرحوم سے صرف کالج میں ہی پڑھتے تھے یا کالج کے علاوہ کسی جگہ تحصیلِ علم کے لئے اُن کے پاس جاتے تھے؟

کالج کے علاوہ میں بھاٹی دروازہ میں اُن کے مکان سے متصل مسجد میں اُن سے حدیث پڑھنے کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا جس کے لئے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت مقرر تھا۔ میں شام کی نماز مولانا مرحوم کی اقتدا میں ادا کر کے گھر لوٹا کرتا تھا۔ میری عادت تھی کہ مولانا کی مسجد کے نیچے ایک دودھ کی دکان تھی جس کا مالک اُسی مسجد کا امام تھا لیکن مولانا روحی کی موجودگی میں وہ جماعت نہیں کراتا تھا کیونکہ وہ اتنا جیّد عالم نہیں تھا۔ میں گھر واپس آتے وقت اُس کی دکان سے دودھ خرید کر پیا کرتا تھا۔ ایک دن اُن کے صاحبزادہ ضیاء الحق (جنہیں صوفی صاحب کہتے ہیں) نے مجھے دودھ پیتے دیکھ لیا۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً تین چار سال ہوگی اس لئے جیسا کہ بچوں کی عادت ہے۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں بھی تھوڑا سا دودھ خرید کر پلا دیا۔ پھر روزانہ جب میں دودھ پیتا تو ضیاء الحق صاحب میرے پاس آ جاتے اور میں عموماً انہیں بھی دودھ خرید کر پلا دیتا یا نقد ایک آنہ انہیں دے دیتا۔

جب مولوی ظفر اقبال صاحب نے یہ بات سنائی تو صوفی ضیاء الحق صاحب بھی چونکہ پاس بیٹھے تھے اسلئے انہوں نے کہا کہ یہ اگر میری چار سال کی عمر کا واقعہ ہے تو اب میری عمر ۶۸ سال ہو چکی ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک یعنی ۶۴ سال کا حساب لگا کر مجھے اتنے آنے ادا فرما دیجئے۔ اس پر مولوی ظفر اقبال صاحب نے ہنس کر ٹال دیا۔

(۵) آپ کے زمانے میں مولانا مرحوم سے اور کون کون سے اصحاب استفادہ کیا کرتے تھے۔

سب نام تو مجھے یاد نہیں البتہ مولوی غلام رسول مہر اور مولانا عبد المجید سالک اور پروفیسر مولوی محمد شفیع (پرنسپل) کے نام ابھی تک یاد ہیں۔ اول الذکر دونوں تو کالج میں اُن سے پڑھتے تھے اور پھر بعد میں انہوں نے مل کر روزنامہ "انقلاب" نکالنا شروع کیا تھا لیکن مولوی محمد شفیع کالج میں اُن سے نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ جب انہوں نے مولانا سے تعلیم کی درخواست کی تو مولانا چونکہ زیادہ تر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے اسلئے انہوں نے کہا کہ میرے پاس وقت تو نہیں ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم روزانہ جب میں کالج جانے لگوں تو میرے مکان پر آ جایا کرو اور بھاٹی دروازہ سے کالج تک کا رستہ میرے ساتھ طے کیا کرو اور اُس وقت سبق بھی پڑھ لیا

گروجیا نیز مولوی شفیع صاحب نے زیادہ تر اسی طرح اُن سے پڑھا۔ مولانا باغ کے ساتھ ساتھ جو پیدل چلنے والوں کی سڑک تھی اس پر پیدل چلتے ہوئے کالج جایا کرتے اور اُن کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا جس میں بل پڑے ہوتے تھے۔

(٦) شاگردوں کے علاوہ مولانا کے پاس اور کون لوگ اُن سے ملنے آیا کرتے تھے؟

یہ بہت پرانی باتیں ہیں اس وقت ذہن میں کسی کا نام نہیں آرہا۔ ہاں اُن کے شاگردوں میں سے کچھ لوگوں کے نام یاد آتے ہیں مثلاً کالج گیٹ کے سامنے اسلامی کتابوں کی ایک دکان تھی اُس مالک کا نام اب مجھے یاد نہیں ہے اس پر صوفی صاحب نے مولوی ظفر اقبال صاحب کو لقمہ دیا۔ کیا آپ کی مراد قومی کتب خانہ سے ہے؟ کہنے لگے: ہاں۔ صوفی صاحب نے کہا کہ اُس کے مالک کا نام غالباً نصیر الدین ہمایوں تھا۔ اس پر مولوی ظفر اقبال بے اختیار پکار اُٹھے۔ ہاں ہاں۔ "اَنْتَ رَجُلٌ کَذَا" پھر دونوں ہنستے رہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صدر الدین پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج، قاضی فضل حق پروفیسر فارسی اور چوہدری محمد حسین (قلعہ گوجر سنگھ) جو پرلیس برانچ کے انچارج تھے۔ یہ سب میرے ہم جماعت تھے۔

(٧) روحی صاحب کی مجلسی یا ذاتی زندگی کا کوئی واقعہ جو آپ کے علم یا مشاہدے میں آیا ہو اور جس نے آپ کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا ہو۔

کچھ یاد نہیں آرہا۔ اُس وقت ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا اور ہمیں اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ پیش آنے والے حالات، واقعات کا اس خیال سے مطالعہ کیا جائے۔

(٨) مولانا کے بارے میں آپ کی اور آپ کے ہم عصر ساتھیوں کی بحیثیت ایک استاد اور ایک عالم دین کیا رائے تھی؟

جہاں تک تدریس کا تعلق ہے وہ نہایت فرض شناسی اور باقاعدگی کے ساتھ پڑھاتے تھے اور کوئی وقت ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ تدریس کے وقت وہ بڑے سنجیدہ رہتے اور مزاح وغیرہ سے کام نہیں لیتے تھے باقی رہا عالم دین کی حیثیت، سو اس لحاظ سے بھی اُن کا انتہائی احترام کیا جاتا تھا۔

(٩) آپ کے دیگر اساتذہ مولانا مرحوم کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟

کالج کے تقریباً تمام پروفیسر اُن کا ادب اور احترام ملحوظ رکھتے تھے اور پرنسپل ہنری مارٹن اور عبداللہ یوسف علی جیسے سخت گیر اور نظم و ضوابط کے پابند لوگ بھی مولانا کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ دونوں انگریزی زبان کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے لیکن پرنسپل ولسن نہولامیں (یعنی معیار سے کم) تھا

(۱۰) عربی میں آپ کے دیگر اساتذہ اور مولانا روحی کا مقابلۃً کیا مقام تھا؟

روحی صاحب کی نظر اور علم بہت وسیع تھا اس لئے میرے دوسرے اساتذہ کے ساتھ اُن کے مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۱) اور کوئی بات جس کا آپ ذکر کرنا چاہیں!

مولانا عربی اور فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے لیکن اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ سر سید احمد خاں مرحوم کی وفات پر بہت سے لوگوں نے مرثیے کہے۔ مولانا نے بھی فارسی میں اُن کا مرثیہ لکھا۔ اُس زمانہ کے اہلِ علم مثلاً مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی الطاف حسین حالیؔ وغیرہ کی یہ رائے تھی کہ سب میں سے مولانا روحی کا قصیدہ بہترین ہے۔ وہ غالباً اب بھی مولانا کے فارسی دیوان میں موجود ہوگا۔ شعر کے علاوہ مولانا کی نثر میں بھی کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً دبیرِ عجم جو فارسی زبان میں علم بلاغت پر ایک معیاری کتاب ہے۔ اشاراتِ شیخ بوعلی سینا پر اردو میں امالی۔ چھوٹے چھوٹے رسائل اور کتابچوں کو چھوڑ کر اُن کی آخری اور اردو میں سب سے بڑی تصنیف مانی الاسلام قابلِ ذکر ہے۔ جو صحیح اسلامی عقائد اور عبادات کے بارے میں دو جلدوں میں تقریباً ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد مولوی ظفر اقبال صاحب نے کہا کہ اب تو ایک بج گیا ہے اور پھر کوئی خاص بات بھی یاد نہیں آ رہی اس لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اس پر میں نے اور صوفی صاحب نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور رخصتی کی اجازت چاہی اور سلام کے بعد واپس آ گئے۔

(بروز چہارشنبہ مؤرخہ ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء)

عبدالبشیر آذری مرحوم
(شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

میں ۱۹۲۷ سے ۱۹۳۲ تک بحیثیت طالب علم اسلامیہ کالج میں رہا کیونکہ ۱۹۳۱ میں میں نے
اکنامکس میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۳ میں پولٹیکل سائنس میں اور ۱۹۳۴ میں تاریخ میں۔ پھر اُسی سال سے
میں نے پروفیسر غلام حسین مرحوم پروفیسر اکنامکس کی جگہ پر بطور لیکچرر کام شروع کیا کیونکہ وہ بیمار تھے۔ اُس وقت
بی۔ اے (برکت علی) قریشی پرنسپل تھے پھر یکم اپریل ۱۹۳۵ سے مجھے اُسی کالج میں مستقل طور پر ملازم رکھ لیا گیا اور
میں ۱۹۴۸ء تک وہاں کام کرتا رہا۔ پھر ایچی سن کالج میں اکنامکس اور حالاتِ حاضرہ کا استاد متعین ہوا۔

حضرت مولانا اصغر علی روحی ہمیں کالج میں دینیات پڑھایا کرتے تھے اور مجھے یہ شرف حاصل تھا کہ میں فقہ کی
کتاب قدوری (جو عربی میں ہے) کا متن پڑھا کرتا تھا اور حضرت استاذ اُسکا ترجمہ اور شرح بیان فرمایا کرتے تھے
حضرت کا ہر ایک لفظ بڑا پُر معنی اور دلنشین ہوتا تھا اور طالب علموں کی سہولتوں کے لئے نہایت آسان الفاظ میں
آپ شرح فرماتے تھے۔ ہر اتوار کے روز کالج ہال میں حضرت مولانا کا وعظ ہوتا تھا اور اُس کے بعد تعلیم کا
سلسلہ شروع کیا جاتا تھا۔ میں نے اُس وعظ کے نوٹ لینے کے لئے نہایت خوبصورت کاپی بنا رکھی تھی جسے
میں جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ حضرت مولانا سردیوں میں کالج کی گراؤنڈ میں کلاس لیا کرتے تھے۔
ایک دفعہ آپ گراؤنڈ میں پڑھا رہے تھے کہ ایک سپیرا آ گیا اور اُس نے بین بجانی شروع کر دی۔ حضرت
نے اُس سے پوچھا۔ "اے شخص کہ تو کون ہے؟" اُس نے کہا: میں لڑکوں کو کیڑے (سانپ دکھانا
چاہتا ہوں۔ حضرت نے پوچھا: "تمہارے پاس کس نوعیت کا سانپ ہے؟" سپیرے نے جواب دیا کہ یہ علاقہ
"کالر" کا سانپ ہے۔ حضرت نے فرمایا: کیسا عجیب بیوقوف شخص ہے۔ میں سانپ کی نوعیت
پوچھتا ہوں اور تو اُس کا ظرفِ مکان بتلاتا ہے۔

اسی طرح آپ ایک دفعہ پڑھا رہے تھے کہ آپ کا ایک پرانا شاگرد جو ڈسٹرکٹ جج بن چکا تھا وہ آپ سے ملاقات کے
لئے آیا۔ جب آپ فارغ ہوئے تو اُس نے حاضر ہو کر ملاقات کی۔ فرمایا: اے شخص کہ تو کون ہے؟ وہ ادب کی وجہ سے خاموش
رہا۔ آپ نے پھر پوچھا تو وہ پھر بھی خاموش رہا۔ تیسری بار آپ نے کہا: اے قریب نا مشخص کہ تو کون ہے؟ اُس نے کہا:
حضور میں آپ کا شاگرد ہوں۔

پیار اور شفقت کی وجہ سے آپ نے شاگردوں کے نام اپنی مرضی سے بنا رکھے تھے۔ چنانچہ مجھے
ماڑ ندرانی کہہ کر یاد فرمایا کرتے تھے۔

جب ہم آپ کے زیر تعلیم تھے تو اُن دنوں آپ نے اپنی بے نظیر کتاب تصنیف فرمائی تھی جو علم

فصاحت و بلاغت پر بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے جو خالص فارسی زبان میں لکھی گئی۔ میرے انگریزی کے ایک استاد پروفیسر سراج الدین آذر اس کتاب کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اُن دونوں مولانا نے ایک اور کتاب شرح اسمائے حسنیٰ بھی لکھی تھی۔

ہمارے زمانے میں بہت سے پرنسپل اسلامیہ کالج میں یکے بعد دیگرے آئے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں ایک انگریز Leach Wilson پرنسپل تھا لیکن وہ تھوڑی دیر رہا اُس کے بعد مسٹر عبداللہ یوسف علی پرنسپل بنے۔ وہ بھی ڈھائی تین سال کے بعد چلے گئے۔ پھر Alexander Wilson کا دور آیا اور پھر ڈاکٹر برکت علی قریشی اُن کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین پرنسپل رہے اور پھر عبداللہ یوسف علی دوبارہ پرنسپل بنے اور وہ غالباً ۱۹۳۷ تک رہے۔ بہت پہلے ہنری مارٹن بھی پرنسپل رہ چکا تھا اور مولوی حاکم علی بھی کچھ دیر کے لئے پرنسپل رہے تھے۔ تمام پرنسپل صاحبان آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ایسی کوئی بات نہ تھی جو حضرت نے کی ہو یا کہی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو ——— مجھے ایک اور واقعہ یاد آتا ہے کہ اُس دور میں سر شہاب الدین کا ایک بھتیجا جس کا نام محمد اقبال تھا۔ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور سیڑھیاں اترتے وقت آپ کچھ تکلیف محسوس کرتے تھے۔ اُس نے آپ کو اُٹھا کر نہایت محبت سے سیڑھیوں سے نیچے اُتارا اور اس میں فخر محسوس کیا۔ پڑھاتے وقت آپ کبھی کتاب سامنے نہ رکھتے تھے کیونکہ نصاب کی تمام کتابیں آپ کو زبانی یاد تھیں۔ عبارتوں کی عبارتیں پڑھتے چلے جاتے تھے۔ میں جب حضرت کے پاس جاتا تو پیار سے میرا کان مروڑتے اور جو موٹا سا عصا آپ کے ہاتھ میں رہتا تھا اُس کے ساتھ آہستہ سے ضرب لگاتے تھے۔

عموماً اپنی تقریروں میں آپ فلسفیوں کو بار بار چیلنج کرتے تھے۔ لیکن کسی کو آپ کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میرے ہم جماعت بشیر شبلی مرحوم اور قاضی ظہیر الدین کی روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کے پاس یونیورسٹی کے امتحان، مولوی فاضل یا منشی فاضل کے پرچے بطور ممتحن آئے۔ ایک امیدوار کے بارے میں ایک بڑے آدمی کی سفارش آئی اُس زمانے میں ایک پرچہ ایک سو پچاس (۱۵۰) نمبر کا ہوتا تھا۔ جس میں سے ۵۰ نمبر والا پاس سمجھا جاتا تھا۔ جب اُس امیدوار کا پرچہ نکال کر دیکھا گیا تو اُس کے صرف پانچ نمبر تھے اس پر حضرت نے فرمایا: اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سائل نے کہا یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ صرف ایک صفر اضافہ فرما دیں لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ سائل نے کہا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا۔ یعنی ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اس لئے پانچ کی جگہ پچاس نمبر لگانا

اس آیت کی رُو سے درست ہے لیکن آپ نے مسکرا کر اُس کی بات کو ٹال دیا اور فرمایا کہ یہ تو اللہ میاں کی صفت ہے۔ سائل نے کہا: میں نے ایک حدیث پڑھی ہے یعنی تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ تعالیٰ کی سی عادات پیدا کرنے کی کوشش کرو) لیکن حضرت نہ مانے اور اُسکے عذر نہ بڑھائے۔

میں ۱۹۵۳ میں یونیورسٹی کے ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھاتا تھا ایک دن مجھ خیال آیا کہ مجھے مولانا روحی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے چنانچہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا اُن کے بڑے صاحبزادے فضل حق صاحب کا لڑکا آیا اور پوچھا کس سے ملنا ہے۔ میں نے کہا: حضرت مولانا روحی سے۔ اُس نے کہا: اُن کی طبیعت درست نہیں اور وہ آنے جانے والوں کو کم پہچانتے ہیں اور ایک بات کو بار بار دریافت فرماتے ہیں۔ میں نے کہا: میں اُن کے خاص شاگردوں میں سے ہوں اور میں آپ کی زیارت کر کے جاؤں گا۔ اُس وقت حضرت بالائی منزل پر تھے۔ چنانچہ میں اجازت لے کر اوپر گیا۔ آپ دیوان پر لیٹے تھے اور اوپر سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے سلام عرض کیا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے اپنا نام بتایا لیکن پھر حضرت نے دو تین بار پوچھا اور پھر خود ہی فرمایا کہ آدمی اگر ملتا رہے تو یاد رہتا ہے تم کافی دیر کے بعد آئے ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ جس کالج میں تم ملازم ہو وہ کہاں ہے اور تمہاری تنخواہ کیا ہے اور کہاں سے وصول ہوتی ہے؟ میں نے جواب دیا۔ پھر یہی سوال آپ نے دو تین مرتبہ دہرایا۔ پھر میں نے اپنے ہم جماعتوں قاضی ظہیر، اسد اللہ اور ابشیر بشیر وغیرہ کا نام لیا لیکن آپ نے نہ پہچانا۔ الغرض پندرہ بیس منٹ زیارت کرنے کے بعد میں اجازت لے کر واپس آگیا۔ اُس کے چند دن بعد ہیلی کالج والوں سے میرا کچھ جھگڑا ہو گیا اور میں وہاں سے علیحدہ ہو کر ریڈیو سٹیشن پر ملازم ہو گیا۔ ریڈیو والوں کے کہنے پر میں نے ایک پروگرام آپکے بارے میں نشر کیا۔

آپ حتی الوسع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کاربند رہتے تھے۔ چنانچہ اُن کے بڑے صاحبزادہ فضل حق صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ انگریزی صابن کا استعمال غسل کے وقت نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح فرمایا کرتے تھے کہ پتہ نہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خربوزے کو کیسے کاٹتے تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے عربی میں ایک قصیدہ لکھا۔ بزعم خود اس نے بڑا تیر مارا۔ اپنی مزعومہ نبوت کی حقانیت کی دلیل کے طور پر اہل علم کے سامنے پیش کر کے چیلنج کیا کہ کوئی ہے جو اس جیسا قصیدہ لکھے۔ حضرت روحی رح نے عربی ہی میں قصیدہ لکھ کر اُس کا جواب دیا اور کچھ اعتراضات کئے جن کا جواب اس سے مرتے دم تک نہ بن پڑا۔ اور وہ بہت کھسیانا ہوا۔ مگر اپنی عادت کے مطابق گالی گلوچ پر اتر آیا۔ ویسے بھی جن

حضرات کو اصل کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ مرزا صاحب کی زبان گوہر فشاں نے اچھوتی گالیاں دی ہیں جو اُس کی بد زبانی کا شاہکار ہیں۔

غرضیکہ قبلہ استاذ مکرم کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر کامل دسترس حاصل تھی اور برجستہ اور فی البدیہہ قصیدے لکھتے تھے۔ جنہیں پڑھ کر کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ شاعر عربی ہے یا عجمی۔

عمر کے بالکل آخری دور میں آپ بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ روزہ رکھنے کی مطلق طاقت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اوراد خانہ سے کہتے کہ مجھے کم از کم سحری کے وقت جگا تو دیا کرو کہ ثواب سحر خیزی میں تو شامل ہو جاؤں۔ ان باتوں سے اتباع سنت کا پتہ چلتا ہے۔ اللھم اغفر لہ

عبد البشیر آذری

عبد الحمید مرحوم

(ریٹائرڈ چیف پوسٹ ماسٹر، جی۔ پی۔ او، لاہور)

حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی رحمۃ اللہ علیہ مولوی و منشی فاضل، ایم او ایل فیلو پنجاب یونیورسٹی برصغیر ہند کے علماء میں سے تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۲ء میں مولوی حاکم علی کی معیت میں اسلامیہ کالج لاہور کی بنیاد ڈالی اور اپنے زمانے میں ہی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ حضرت مولانا سے مجھے شروع ہی سے حسنِ عقیدت تھا اور بعد ازاں شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ جب میں ایک ادنیٰ طالب علم تھا وہ ۱۹۱۶ تک اپنی سرپرستی سے نوازتے رہے۔

حضرت روحانی استاد بھی تھے۔ صاحبِ دل اور عشق رسول پاک صلعم سے سرشار تھے۔

سیاہ رنگ جبہ میں ملبوس اور سیاہ چشمہ لگائے۔ ہاتھ میں لمبا عصا لئے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ میں طلبا کی جماعت لگایا کرتے۔ خود کرسی پر جلوہ افروز ہوتے اور طلبا ادرگرد سبز گھاس پر نہایت مؤدبانہ انداز میں بیٹھتے۔ مجھے روزِ اول سے ہی نظر شفقت سے دیکھتے۔ آتے ہی فرماتے: او حمیدی تو کدھر ہے؟" میں عرض کرتا۔ "حضور حقّہ حاضر ہے۔" پھر میں حقّہ تھامے بیٹھا رہتا۔ پرنسپل مارٹن خود ٹوپی اٹھا

کر سلام لیتا۔ جس کا جواب حضرت عصا کے اشارے سے دیتے۔ پروفیسران میں سے بیشتر مثلاً مولوی احمد علی، پروفیسر محمد عمر، خواجہ دل محمد انکے شاگردوں میں سے تھے۔ ایک دفعہ ایک نامور بیرسٹر اپنے کانپتے کسی ضروری کام سے پرنسپل مارٹن کی تلاش میں حضرت مولانا کی جماعت سے گزرتے ہوئے پوچھ بیٹھا "مارٹن صاحب کہاں ملیں گے" مولانا نے ڈنڈے سے پرنسپل دفتر کی طرف اشارہ فرمایا۔ وہ ادھر اُدھر چکر کاٹ کر شامت اعمال سے پھر حضرت مولانا کی جماعت کے قریب آکر بولا: "مارٹن صاحب تو وہاں نہیں ہیں۔" ہمارے حضرت صاحب جلالی تھے۔ عصا کو دراز کرتے ہوئے بولے " او مغربی تہذیب کے شیدائی مجھ کیا معلوم؟ میرا کیوں حرج کرتا ہے۔ میں تدریس میں مصروف ہوں۔" ڈنڈا تانتے ہوئے فرمانے لگے "چلا جا یہاں سے"۔ وہ بیچارہ بھاگا۔ کسی کو چون و چرا کی جرأت نہ ہوئی۔ ہر دل عزیز، صاحب ذوق لغت نویس تھے۔ نہایت احترام کے مالک تھے۔ اللہ پاک جنت نصیب کرے۔ آمین۔

عبدالحمید

عبدُالرَّحِیم

(ریٹائرڈ اور ینٹل ٹیچر وطن ہائی سکول، لاہور)

میں غالباً ۱۹۲۰ سے تادم آخر استاذی المکرم مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہا ہوں۔ اس عرصہ میں، میں نے ان کو باپ سے بھی بڑھ کر شفیق، ہمدرد اور راہنما پایا۔ میں اُن کے بڑے صاحبزادے مسٹر فضل حق صاحب کا ہم درس رہا ہوں۔ مولوی صاحب میری تعلیمی ترقی کے لئے اپنی اولاد کی طرح کوشاں رہے۔ بسا اوقات وہ میری خاطر اپنے بچوں کو ڈانٹا بھی کرتے تھے۔ میرا تعلیمی مفاد ہر وقت ان کے مدنظر رہا کرتا تھا۔ جس ذمہ داری کے ساتھ انہوں نے میری تعلیمی کفالت فرمائی ہے۔ اس کا اندازہ میرے سوا کوئی نہیں لگا سکتا۔ میں بھی حتی الامکان کبھی انہیں ناراضگی کا موقع نہیں دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دبیرِ عجم کے دیباچے میں میرے متعلق نہایت عمدہ دعائیہ جملے ارشاد فرمائے ہیں۔ اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

عبدالرحیم

پروفیسر عبدالقیوم

سابق اُستاد عربی، گورنمنٹ کالج لاہور، سینئر ایڈیٹر، اُردو دائرہ معارف اسلامیہ
(پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

میں اپنے لئے بڑا شرف اور انتہائی سعادت سمجھتا ہوں کہ اپنے ایک نامور استاد کے بارے میں چند باتیں سپردِ قلم کروں۔

حضرت مولانا اصغر علی روحی (نور اللہ مرقدہ) ان بزرگوں میں سے تھے جنہیں میں بچپن سے جانتا تھا۔ مولانا موصوف اسلامیہ کالج لاہور میں عربی زبان کے استاد تھے اور میرے مرحوم والد بزرگوار کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں میرے داخل ہونے سے بہت پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا کالج آتے جاتے والد صاحب سے ملا کرتے تھے۔ جب اسلامیہ کالج کے پہلو میں مسجد مبارک تعمیر ہوئی تو حضرت مولانا روحی کا یہ معمول ہو گیا کہ آپ روزانہ چاشت کی نماز (صلوٰۃ الضحیٰ) ادا کرنے کے لئے باقاعدہ طور پر مسجد مبارک میں آتے۔ نماز اور وظائف سے فارغ ہو کر مسجد کے پڑوس میں والد صاحب کے پاس آ بیٹھتے۔ اس دوران میں علمی و ادبی باتوں کے علاوہ حقہ بھی خوب چلتا۔ اس زمانہ میں والد بزرگوار کو حقہ نوشی کا بڑا شوق تھا اور وہ اپنے لئے تو اہتمام کرتے ہی تھے لیکن حضرت مولانا روحی کے لئے خاص اہتمام ہوتا۔ والد صاحب کی طرح مولانا روحی بھی بہت اچھا تمباکو نوش فرمایا کرتے تھے۔ حج سے واپس آ کر والد محترم نے حقہ نوشی ترک کر دی تھی۔

جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو استاذ محترم پروفیسر مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی اور تدریسی حلقوں میں بڑا چرچا تھا۔ وہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے شہر بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ میں ۱۹۲۷ء میں کالج میں داخل ہوا۔ اس وقت علامہ عبد اللہ یوسف علی ایسے نامور اور شہرہ آفاق شخص اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے اور اساتذہ میں شیخ ایم۔ اے غنی انگریزی ادب پڑھاتے تھے۔ سر الیگزانڈر ولسن انگریزی زبان اور ادب کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر سراج الدین آذر انگریزی کے استاد تھے۔ سید عبد القادر تاریخ کے پروفیسر تھے۔ مسٹر لیو۔ کرامٹ اور پروفیسر غلام حسین اقتصادیات کا درس دیتے تھے۔ مولانا محمد عمر خان

فارسی کے استاد تھے۔ غرضیکہ اس زمانے میں آرٹس اور سائنس پڑھانے والے اساتذہ کرام اپنے اپنے مضمون میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ اس عہد میں پروفیسر محمد دین تاثیر بھی یہاں موجود تھے۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے ساتھ جے ای وی کلاسیں بھی ملحق تھیں۔ میاں عبدالحکیم ان کلاسوں کے سربراہ تھے اور پروفیسر تاثیر ان کلاسوں کی تدریس پر مامور تھے۔ انکے ساتھ ہی وہ ایف۔ اے کی بھی ایک آدھ کلاس کو پڑھایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی (جے اے وی) کلاسوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ بعد میں پروفیسر تاثیر انگلستان چلے گئے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے۔

ان سب بزرگ اساتذہ میں مولانا اصغر علی روحی کی شان بالکل نرالی تھی۔ ایک تو وہ اپنے لباس اور وضع قطع کے لحاظ سے دیگر اساتذہ سے ممتاز اور نمایاں تھے۔ عام طور پر شلوار اور شیروانی، ترکش کوٹ پہنتے تھے۔ سفید ململ یا لٹھے کا قبا زیب تن فرماتے اور سر پر سفید عمامہ باندھتے تھے۔ ہاتھ میں ایک عصا نما چھڑی رکھتے تھے۔ دوسرے انہیں اپنے علم پر بڑا ناز اور وثوق تھا۔ جب بات کرتے تو بڑے دبدبے اور جلال سے۔ ان کی گفتگو میں وقار اور رعب پایا جاتا تھا۔ تمام اساتذہ ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے باعث ان کی بڑی عزت کرتے اور ادب و احترام سے پیش آتے تھے۔

جب ۱۹۲۹ء میں ہم لوگ جی۔ اے میں پہنچے تو بی۔ اے کے سال اول میں حضرت مولانا نے ہمیں عربی کا نصاب پڑھانا شروع کیا۔ ان کا دستور یہ تھا کہ ایک طالب علم کتاب پڑھتا۔ مولانا اس کا زبانی ترجمہ اور تشریح فرماتے۔ ان دنوں بلکہ اس سے بہت پہلے کی بات ہے کہ ان کی بصارت میں فرق آچکا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بینائی جاتی رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عربی اور فارسی علم و ادب سے بے انتہا شغف کے علاوہ انہیں سائنس کے تجربات دیکھنے بلکہ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ جس زمانے میں پروفیسر حاکم علی اسلامیہ کالج میں سائنس (کیمسٹری) پڑھاتے تھے اس زمانے میں مولانا مرحوم کا یہ شوق اور زیادہ ہو گیا۔ پروفیسر حاکم علی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ مولانا اکثر پروفیسر حاکم علی کے ساتھ ان کی لیبارٹری میں چلے جاتے اور ان کے ساتھ گھنٹوں کھڑے تجربات دیکھتے اور ان میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ انہی تجربات کے دیکھنے اور کرنے کے شوق کا نتیجہ تھا کہ ایک تجربے کے دوران میں آپ کی بینائی کو نقصان پہنچ گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ آپ بصارت سے بالکل محروم ہو گئے۔ اسی وجہ سے مولانا موصوف اکثر سیاہ چشمہ لگائے رکھتے تھے۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں میرے ہم جماعت اور رفیق صوفی ضیاء الحق اکثر اپنے والد بزرگوار کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے۔

مولانا نے ہمیں عربی کی تدریس کے دوران میں دیوان الحماسہ کی کچھ نظمیں پڑھائیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر بی۔اے قریشی صاحب نے ہماری تدریس عربی کے فرائض سنبھال لئے۔ ڈاکٹر قریشی بھی اپنی وضع کے خاص بزرگ تھے۔ نہایت نفیس اور شریف انسان، بڑے خوش پوش اور خوش وضع، بہت ہی کم گو اور کم آمیز۔ کتابوں کے شوقین اور کتابوں کو سلیقہ قرینے سے سجانے کے دلدادہ۔ مولانا سے تو عربی بذریعہ اردو زبان پڑھی اور خوب سمجھی۔ انہیں کی محبت اور شفقت کا نتیجہ تھا کہ مجھ عربی زبان اور ادب سے شغف پیدا ہوا اور حماسہ ایسی اہم کتاب کو سمجھنے کے لئے تبریزی کی شرح پڑھنی شروع کی اور آگے چل کر مرزوقی کی شرح کا مطالعہ انہیں بزرگ اساتذہ کی شفقت اور تشویق کا نتیجہ تھا۔

مولانا کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ جو کوئی بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ علم و ادب کے موتی رولتا ہوا اٹھا۔ ایک دو نہیں ان کے تلامذہ میں سینکڑوں نامور اساتذہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ وہ ان بزرگ اساتذہ میں سے تھے جو اپنے تلامذہ کو صحیح ڈگر پر ڈال دیتے اور عمر بھر کے لئے ان کو عربی علوم کا خادم بنا دیتے تھے۔

حضرت استاد مولانا روحی رح کا ایک دلچسپ قصہ میرے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے بیان کیا۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے ایم اے عربی کا امتحان دینا تھا اور میری خواہش تھی کہ کچھ کتابیں مولانا روحی صاحب سے پڑھوں۔ مولانا سے ملا تو انہوں نے اپنے مصروف اوقات کے باعث معذرت کر دی۔ میں نے عزم مصمم کر رکھا تھا کہ ان سے ضرور پڑھنا ہے آخرکار میں نے پوچھا کہ آپ کالج سے کب واپس تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ وہ کالج سے گھر واپس جاتے ہوئے مجھے راستے میں چلتے چلتے پڑھا دیا کریں گے اور ہوا بھی یہی کہ مولانا کالج سے فارغ ہو کر گھر کی راہ لینے لگے تو طلب صادق رکھنے والا شاگرد آموجود ہوتا اور مولانا کے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے سبق سے فارغ ہو جاتا اور آگے چل کر یہی ہونہار طالب علم استاذ الاساتذہ بنا اور تحقیق علمی کے میدان میں پنجاب کا نامور سپوت ثابت ہوا۔

میرے والد ماجد بتایا کرتے تھے کہ مولانا روحی عالم شباب میں فارسی، عربی اور اردو کی شاعری کا بڑا شوق رکھتے تھے اور تینوں زبانوں میں خوب شعر گوئی کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لاہور میں مشاعروں اور علمی مجالس کا بڑا زور تھا۔ ان علمی مجالس اور بالخصوص مشاعروں میں مولانا صاحب فارسی، عربی اور اردو کے اشعار سناتے اور اہل ذوق حضرات سے داد و تحسین حاصل کرتے۔ مولانا کی آواز میں بڑی گرج تھی۔ بلند آواز سے تحت اللفظ شعر پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دیگر علماء اور اہل قلم کی طرح مولانا موصوف

کو علم و ادب کی اشاعت و ترویج کا بھی بڑا شوق تھا۔ انہوں نے ایک علمی اور ادبی ماہنامہ "الہدیٰ" کے نام سے جاری کیا۔ میرے والد صاحب کے پاس اس رسالے کے پورے فائل تھے۔ لیکن انہوں نے حسب عادت کسی دوست کو دیکھنے کے لئے دیئے اور پھر واپس نہ مل سکے

مولانا کو فقہی مسائل پر بھی بڑا استحضار تھا۔ حنفی المسلک ہونے کے باوجود عالم جوانی میں کتب حدیث بالخصوص امام شوکانی کی نیل الاوطار اور موطا امام مالک کے مطالعہ کا خاص شوق تھا اور کہا کرتے تھے کہ ایسی کتابوں کے مطالعہ سے بصیرت پیدا ہوتی ہے اور تعصب و تنگ نظری دور ہوتی ہے۔

آپ کی گفتگو نہایت عالمانہ ہوتی تھی، عام گفتگو میں بھی عربی فارسی کے محاورے کا بھر کم الفاظ استعمال کرتے اور فصیح و بلیغ انداز اختیار فرماتے تھے۔

مولوی صاحب موصوف نہایت نڈر اور بے باک بزرگ تھے۔ لگی لپٹی بات بالکل نہ جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اپنے ہم عصر علماء کے بارے میں بھی بڑی آزادی سے ناقدانہ رائے کا اظہار فرما دیتے تھے۔

کالج میں ہر پرنسپل ان کے علم و فضل کے پیش نظر ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔

مولانا کی زندگی میں لاہور علم و فضل کا مرکز رہا اور اسلامی اور عربی علوم کے بڑے بڑے مشیوخ اور اساتذہ موجود تھے لیکن مولانا کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کے علم سے مرعوب نہ ہوتے اور نہ کبھی اپنے بارے میں احساس کمتری کو راہ دی۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم مثونہ وادخلہ فی الجنۃ۔

عبد القیوم

چوہدری عبدالمجید

(ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، سرگودہا)

میں نے ستمبر ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج میں ایف۔ اے میں داخلہ لیا اور مئی ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے کر کے وہاں سے نکلا۔ اُس دور میں مولانا محمد عمر (فارسی) پڑھاتے تھے۔ غالباً یو۔ پی کے رہنے والے تھے۔ بات بات پر "میاں" کو تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مولانا احمد علی بٹالوی دینیات پڑھاتے تھے اور مولانا روحی، جن کا تعلق گجرات سے تھا۔ عربی کے استاد تھے۔ پورے کالج کے اساتذہ و طلبہ میں مولانا اصغر علی روحی کا جس قدر احترام اور دبدبہ تھا کسی اور کا نہ تھا۔ آج تک میں اپنے دل میں بے حد گہرا احترام اُن کے لئے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اُن کے ذکر سے بڑی ہی خوشی ہوتی ہے۔ میں خود عربی کا طالب علم نہیں تھا اس لئے مولوی صاحب کی شخصیت کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جب میں ایف۔ اے میں داخل ہوا تو مولوی ظفر اقبال اور محمد حسین بھاجڑنگی، جو سیالکوٹ کے قریب موضع بھاجڑنگ کے رہنے والے تھے۔ عربی ایم۔ اے میں پڑھتے تھے۔ یہ دونوں مولانا روحی کے اصل شاگرد تھے اور انہی سے آپ کو اُن کے تفصیلی حالات مل سکتے ہیں۔ محمد حسین بھاجڑنگی کا قابلیت اور حسنِ ادب کے باعث اساتذہ میں بھی بڑا وقار تھا۔

مولانا روحی کی میں بار بار تعریف کرتا ہوں۔ وہ ایک متبحر عالم تھے۔ بڑے آدمی تھے لیکن سادہ و بے تکلف آدمی تھے۔ ہاں اُن کے دبدبے کے باعث کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اُن میں ہمت، جرأت اور فراست بے پناہ تھی۔ کسی کا رعب اور حجاب کبھی اُن کی راہ میں حائل نہ ہو سکتا تھا۔ بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے پوری دلیری سے دل کی بات کہہ گزرتے تھے۔ ایک دفعہ ڈرامہ "ٹمپسٹ" پڑھاتے وقت ایک انگریز پروفیسر کی کلاس میں مرانڈا (Miranda) لڑکی کے تذکرہ پر ایک لڑکے کی زبان سے نازیبا الفاظ نکل گئے تو انگریز پروفیسر کی زبان سے نکل گیا:

"The muslims have no respect for Ladies."

پیریڈ ختم ہونے پر طلبا یہ معاملہ حضرت مولانا مرحوم کے پاس لے گئے۔ آپ جانے پرنسپل

مسٹر مارٹن سے احتجاج کیا۔ پرنسپل صاحب نے کالج کے اساتذہ و تلامذہ کو حبیبیہ ہال میں بلایا اور انگریز پروفیسر کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑے اور معافی مانگنی پڑی۔

اسلامیہ کالج لاہور میں اُن دنوں مولانا کی شخصیت، انکی علمیت، انکی قابلیت، اور انکے اثر کا ہر کروہ قائل تھا۔ زانو تک لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ دراز قد اور باریش چہرہ تھا۔ گفتگو کم کرتے تھے۔ حالیا تقریر بازی کا اُن کو شوق نہ تھا۔ دینی مسائل پر نہایت جچی تلی رائے دیتے تھے۔ ایسے عالم روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک یادگار زمانہ شخصیت تھے۔ تصور کیا جاتا تھا کہ پنجاب بھر میں عربی کا اُن سے بہتر کوئی عالم نہ تھا۔ گفتگو میں عالمانہ ذخیرۂ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ریواز ہاسٹل کے بالکل سامنے ہسٹری کا کمرہ تھا اور اُس کے قریب ہی مولانا روحیؒ کا کمرہ تھا

ایک لطیفہ یاد آیا۔ میں تھرڈ ایئر میں تھا حضرت مولانا اس کلاس کو دینیات پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن کلاس میں تشریف لائے تو طلبا نے شور مچا رکھا تھا۔ فرمانے لگے "تم لوگ کلاس میں ایسے بیٹھے ہو جیسے کشتی میں گدھے" پھر فرمایا: "مسلمانو! تمھاری یہ حالت ہے کہ اگر تم زندوں پر فاتحہ پڑھ دی جائے تو بجا ہو گا۔"

حضرت مولانا رح ایم اے تک طلبا کے کان کھینچتے اور طلبا اس پر اعتراض نہ کرتے

گجرات کے قریب پاپیادہ کچھ قبروں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ایک قبر کی پائنتی سے گزرتے ہوئے کسی نے بتایا کہ یہ مولانا روحیؒ کی قبر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریق رحمت کرے۔ ایسے اساتذہ کرام تو اب ناپید ہیں۔

عبدالمجید عفی عنہ

شیخ عبدالواحد یوسفی

ریٹائرڈ سیکشن آفیسر لاہور

مولانا محمد اصغر روحی مرحوم و مغفور نور اللہ مرقدہ کی یادیں

لکھنے سے پیشتر بیتے ہوئے لمحات کی یاد آفرینی کے بارے میں عرض ہے کہ ایسے جذبات امڈ امڈ کر پھر دب جاتے ہیں جن سے قلبِ سوزاں میں اضطراب بڑھتا ہے اور یادِ ایامِ گزشتہ کے سلسلہ میں ایسی مقدس ہستیوں کی یاد آجاتی ہے جن کی یاد سے اب بھی اس عمرِ رفتہ میں جب کہ سفینۂ حیات کنارے پر آن لگا معلوم ہوتا ہے، قلبی راحت میسر آتی ہے اور جن کے علم سے فیض اور بصیرت سے فیضان حاصل ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک برگزیدہ ہستی مولانا اصغر روحی صاحب مرحوم و مغفور کی ہے۔ یادش بخیر۔ پرانے زمانوں کی بات ہے کہ میں ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا۔ عقل و شعور میں ان دنوں بھی قدرے پختگی تھی۔ عادتاً اپنے سے بڑوں کی محفلوں میں بیٹھنا پسند کرتا تھا اور ان سے ہی اختلاط پذیر رہتا۔ یہ عادت مجھے بچپن سے ملی تھی۔ آغاز یوں ہوا تھا کہ لدھیانہ (حال انڈیا) میں جبکہ میں محض پرائمری جماعت کا طالب علم تھا۔ جماعت چہارم یا پنجم تھی۔ ان دنوں لدھیانہ میں مجالس وعظ و نصیحت اور میلاد و نعت خوانی کی بہت منعقد ہوا کرتی تھیں۔ میں بھی بہت انہماک کے ساتھ بڑوں کے ساتھ شامل ہوتا رہتا تھا۔ ان دنوں معلوم ہوا کہ مولانا سید انور شاہ صاحب مہتمم دیوبند تشریف لائے ہوئے ہیں۔ کچھ تقریروں کا سلسلہ اور میزبانی و مہمانی کی محفلیں سجیں گی۔ میں بھی کشاں کشاں منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ سکول میں غیر حاضریاں لگتی رہیں مگر میں تمام مجالسِ تقاریر و طعام میں عقیدتمندانہ حاضر ہوا کرتا تھا۔ تقریریں بہت بلند پایہ ہوتیں۔ سمجھ کم کم ہی آتی تھیں۔ مگر رونقِ محفل بننا اور خوشبوؤں میں گم رہنا، تقریریں نعتیں سننا اس قدر محبوب و دلپسند مشغلہ تھا کہ سارا سارا دن اور رات گئے تک وہاں ان مجلسوں میں شریک رہتا۔ مولانا سید انور شاہ صاحب کی نہایت ہی وضع دار خوبصورت شخصیت تھی۔ سر پر پگڑی اور کالی عینک لگاتے تھے۔ پان بھی منہ میں چباتے رہتے تھے اور ایک خوش زیب سفید سی چادر اپنے شانوں پر لپیٹے رکھتے جب تقریر فرماتے تو لگتا یوں معلوم ہوتا جیسے علم و عرفان متلاطم خیز ہو اور وہ سامع کے دل کی گہرائیوں میں طوفان برپا کر دے۔ جذب و استغراق کی ایسی ہی کیفیت مولانا روحی صاحب کے لیکچر سن کر وارد ہوتی تھی۔

جب ۱۹۳۰ میں اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تو الیگزانڈر ولسن کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج میں وضع داری اور ڈسپلن بہت ہی خوش کن۔ استاد اور شاگرد میں ادب و حیاء علم و اکتسابِ علم

ظاہر تو ہر گی وناگی میں نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ جس راستے میں کالج کے کمروں میں داخل ہوتا تو ایک بزرگ کالی عینک لگائے اور سفید سی چادر پہنے سید انورشاہ صاحب بیٹھے معلوم ہوتے۔ تجسس بڑھا تو معلوم ہوا کہ آنجناب روحی صاحب ہیں۔ فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا اتنی ہمت نہ ہوتی کہ فوراً ہی اپنے آپ کو بہ احساس عقیدت پیش خدمت اقدس کرتا۔ وہی پرانی عادت کہ بڑوں سے ملوں اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوں، تازہ ہو گئی۔ طالب علم فرسٹ ائیر کا مگر لیکچر سنتا تھا جناب روحی صاحب کا تھرڈ ائیر اور فورتھ ائیر کے طلبا کے ساتھ۔ سمجھ آئیں یا نہ آئیں مگر جب بھی میں شریک ہوتا تو مولانا روحی صاحب کو رواں دواں اور جولاں سمندر کی طرح متلاطم خیز پاتا۔ علم و عرفان کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو کر ایسے ایسے گراں بہا جواہرات طالب علم کے سامنے پیش فرماتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے علم و عرفان کا وہ اتھاہ سمندر ایک انسانی جسم کے اندر اللہ کریم نے بھر دیا ہو اور وہ آج بھی پچاس سال گزرنے کے بعد بھی سامعہ دلنواز میں ویسے ہی متلاطم خیز قائم و دائم ہے اور ان کی یاد سے اب یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے

" خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں "

مولانا سید انور شاہ مرحوم و مغفور مہتمم دیوبند کی بصیرت افروز مجالس جو لدھیانہ میں ہوتی تھیں اور جن میں شریک ہونے کا موقعہ نہایت کم سنی میں مجھے میسر آیا تھا۔ ویسی ہی مجلسوں کا سماں مولانا روحی صاحب کی مجلسوں میں ہوتا ہے۔ مولانا روحی صاحب کی شخصیت گرامی کے بارے میں یہ تاثرات تھے کہ وضع قطع میں (بے ادبی معاف فرمائیے) "بینڈو" سے معلوم ہوتے تھے۔ بعض گستاخ طالب علم ان دنوں بھی آپس میں "بینڈو" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ وائے حسرتا! کیا بے محل لفظ استعمال کرنا پڑا۔ تاہم یوں معلوم ہوتا تھا کہ پڑھے لکھے نہیں۔ پرنسپل الیگزانڈر ولسن پاس سے گزر جاتا تو روحی صاحب نہ تو ان کو سلام کرتے اور نہ تعظیماً اٹھتے۔ خیر پرنسپل صاحب خود "گڈ مارننگ مولانا صاحب" کہتے اور مولانا صاحب بھی سر ہلا دیتے۔ ان کے لیکچروں کا حال یہ ہوتا تھا کہ طالب علم ازراہ ادب خود وہاں چلے آتے جہاں کہ وہ لان میں بیٹھے ہوتے۔ نہایت ادب کے ساتھ لیکچر سنتے اور پڑھاتے وہ منہ زبانی۔ کسی طالب علم کو کہتے کہ کیا پڑھنا چاہتے ہو تو جواباً وہ کچھ کہتا کہ فلاں عربی کا باب ابھی تشنہ تشریح رہا ہے یا فلاں نظم ابھی تشنہ توجہ رہی ہے۔ بس جب پڑھانا شروع کرتے تو ایک طالب علم کچھ ابتدا پڑھنے میں کرتا تو مولانا صاحب کیا کیا علم و عرفان کے دریا بہا دیتے۔ سبع

المعلقات کے بے شمار اشعار یاد ہوتے۔ عہدِ جاہلیہ کے شعراء مثلاً امرؤ القیس اور عنترہ وغیرہ بے شمار یاد ہوتے۔ حضرت حسان بن ثابت کے سینکڑوں اشعار ازبر یاد تھے۔ میں چونکہ فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا۔ مجھے سمجھ کم آتی تھی تاہم اس قدر سرور میسر آتا کہ ناقابلِ بیان۔ اب جب کہ اپنی اس عمر کے ۶۹ سال میں یادِ ایامِ گزشتہ کو آواز دیتا ہوں تو یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

میں تھکا ہارا مسافر تیرگی کی راہ کا
پوچھتا پھرتا ہوں رستہ تیری جلوہ گاہ کا

بات یہ ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ جذبات کا اظہار کچھ مجذوبانہ سا اور کچھ لطیف سا ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جذبات نہایت ہی حساس اور لطیف ہو گئے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگنے سے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ مگر وہ سیلاب آنکھوں کی پلکوں ہی میں گم ہو جاتا ہے۔ آغاز میں آنکھیں روتی ہیں اور آنسو گرتے نظر آتے ہیں۔ عمر رفتہ میں دل روتا ہے اور آنسو نظر نہیں آتے۔ آج بھی وہی جذب و شوق اور کیف و مستی کا استغراق مولانا روحی کی یاد سے مجھ پر طاری ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استاد سے جو کچھ اس کے شاگردوں تک پہنچتا ہے وہ صرف الفاظ میں ڈھلے ہوئے ذہنی تعلقات ہی نہیں ہوتے بلکہ استاد کے ذوقِ مضمون اور اس کی تخلیقی قابلیت کے کچھ اثرات ظاہری ذرائع اظہار کے درمیان میں آئے بغیر ایک غیر محسوس اور پُراسرار طریق سے بھی اس کے شاگردوں تک مدت ہائے مدید تک پہنچتے رہتے ہیں۔ خداوند کریم مولانا روحی صاحب کو کروڑہا رحمتیں نصیب فرمائے۔ وہ نہایت ہی بلند پایہ مجسمۂ علم و عرفان بحرِ زخار تھے جن کی متلاطم خیز موجوں سے آج بھی گراں بہا جواہرات علم و عرفان تصورات میں میسر آتے ہیں اور سرمایہ زیست و آخرت فراہم فرماتے ہیں۔

بندۂ ناچیز
عبدالواحد یوسفی عفی عنہ

خواجہ عبید الرحمٰن

(پرنسپل اسلامیہ ہائی سکولز۔ راولپنڈی)

نذرانۂ عقیدت بحضور حضرت مولانا اصغر علی (مرحوم) سابق پروفیسر عربی و علوم اسلامیہ

اسلامیہ کالج — لاہور

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مولانا اصغر علی روحی (مرحوم) سابق پروفیسر عربی و علوم اسلامیہ ایک جامع صفات شخصیت تھے۔ ۱۹۲۷ تا ۱۹۲۹ء اسلامیہ کالج لاہور میں بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے اُن کی شاگردی کا اعتراف میرے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔ کیونکہ وہ اپنے فیضِ صحبت سے اپنے تلامذہ میں نہ صرف مذہبی، علمی اور ادبی ذوق کی جوت جگاتے رہے بلکہ اپنے مخلصانہ نصائح سے اُن کو ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن رکھنے کی خاطر راہیں بھی متعین کرتے رہے۔

بقولِ اقبال؎

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

مرحوم فاضلِ بے بدل ہونے کے علاوہ عالم باعمل بھی تھے۔ اپنے شاگردوں سے مشفقانہ سلوک اور اپنے رفقائے کار کے ساتھ برادرانہ برتاؤ نے اُن کی پُرکشش شخصیت میں ایک ہمہ گیر جاذبیت پیدا کر دی تھی اور خدمتِ خلق اور خدمتِ دین کے بے لوث جذبہ نے اُن کی سادہ زندگی کو چار چاند لگا رکھے تھے اور یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ مرحوم ایک کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ ایک کامران عاقبت کے لئے بھی راہ ہموار کرتے رہے۔ اپنے اوصافِ حمیدہ کے باعث اُستاد ہی نہیں ایک مثالی انسان کی حیثیت سے بھی یادگارِ زمانہ رہے ہیں ؎

عدم سے آنے والے تو عدم کو لوٹ جاتے ہیں کوئی خوش بخت رہ جاتا ہے زیبِ داستاں ہو کر

یقیناً مرحوم بھی اُن خوش بخت انسانوں میں سے ہیں جن کے نیک نام کو کبھی بھلایا نہ جا سکے گا جب کبھی طالب علمی کا زمانہ یاد آتا ہے تو آپ کا اُجلا کردار اور آپکی پاکیزہ تعلیم اپنی جلا سے ہماری شمعِ زندگی کو فروزاں کر جاتی ہے اور مرحوم کی یاد کے ساتھ بے ساختہ یہ دعا نکلتی ہے: ؎

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

(خواجہ) عبید الرحمٰن

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

(ریٹائرڈ پروفیسر)

دعا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ اس خبر سے مجھے بےحد مسرت ہوئی کہ آپ اُستاد محترم قبلہ مولانا اصغر علی روحی پر مقالہ لکھ رہے ہیں۔ قبلہ مرحوم سے میری راہ و رسم ۱۹۲۰ میں بوساطت برادر اکبر مرحوم پروفیسر نور الحق پیدا ہوئی۔ اُس وقت میرے بھائی اورینٹل کالج کی کسی جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ موچی دروازہ کے محلہ چلہ بیبیاں میں رہتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن مولانا روحی کے ہاں جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ ہو جاتا تھا۔ میں نے ۱۹۲۰ء میں مولوی فاضل کا امتحان دیا تھا۔ آخری پرچہ (جواب مضمون عربی ۱۵۰) کے ممتحن مولانا روحی تھے اور قدرتاً میری یہ خواہش تھی کہ بھائی صاحب مولانا روحی کے پاس میری سفارش کریں۔ لیکن وہ مانتے نہیں تھے۔ انہی دنوں جب وہ مولانا روحی کی ملاقات کو روانہ ہوئے تو میں بھی ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے بار بار مجھے واپس جانے کو کہا لیکن میں نہ مانا اور بھائی کے ڈٹ کے ساتھ اُن کے دولت خانہ پر پہنچ گئے۔ دیکھا کہ وہ مولوی فاضل کے پرچے سامنے رکھ کر نمبر لگا رہے ہیں۔ ہم بیٹھے تو ایک اسیوار اٹھا کر چھیڑ دیا۔ فرمانے لگے۔ ابھی ابھی میں نے ایک پرچے پر ۹۸ نمبر لگائے ہیں۔ اس نے عربوں سے بھی بہتر عربی لکھی ہے۔ پھر وہ پرچہ نکالا اور ایک حصہ پڑھنا شروع کیا

ایہا الناس اسمعوا واذا سمعتم شیئاً فانتفعوا۔ فانی اری الناس یذھبون ولا یرجعون ارضوا بالمقام فقاموا ام ترکوا ھناک فناموا۔ این مَن زخرفَ و نجّدَ۔ وبنی و شیّدَ۔ و جمع فاوعیٰ فقال انا ربکم الاعلیٰ...

۱۹۲۷ میں وہیں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور ریٹائر ہونے کے ایک سال بعد ۱۹۵۰ میں فوت ہوگئے۔

یہی میرا پرچہ تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا تو اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ تھپتھپایا۔ اور بہت دعائیں دیں۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ جو حصہ وہ سُنا رہے تھے وہ میں نے عربی مضامین کے ایک مجموعہ (شاید جواہر الادب نامی) سے نقل کر کے یاد کیا ہُوا تھا۔ میرے پرچے میں یہی حصہ فصیح ترین تھا۔ باقی بھی بُرا نہیں تھا۔ لیکن فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بمنازل فروتر۔

اُن دنوں لاہور میں میرا قیام کم و بیش دو سال رہا۔ اس عرصہ میں بیسیوں مرتبہ حضرت موصوف کی خدمت میں حاضر ہُوا وہ کبھی سیاست، کبھی قوم کے اخلاص انحطاط اور کبھی نظام تعلیم پر اظہار خیال کرتے۔ لیکن ان باتوں کو تقریباً ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ اسلئے کچھ یاد نہیں آرہا۔ مولانا نظریاتی سرحدات کے بے باک محافظ تھے۔ کسی تحریف، تاویل اور خودساختہ تعبیر کو پسند نہیں فرماتے تھے اور اپنے خطبات میں ایسے لوگوں کو سخت رگڑتے تھے۔

میرا واقعہ

میں نے ۱۹۳۰ء میں ایم۔اے عربی میں داخلہ لیا۔ پڑھتا یونیورسٹی میں تھا اور رہتا اسلامیہ کالج لاہور کے ایک اسٹل کریسنٹ میں۔ اسلامیہ کالج کے جن پروفیسروں سے میرے روابط نیاز مندی بہت عمیق تھے۔ ان میں ڈاکٹر ایم۔ڈی (محمد دین) تاثیر سرِ فہرست تھے۔ میں عموماً اتوار کا دن اُن کے ہاں گزارتا۔ میرے ساتھ عموماً محمد خان ("جنگ آمد کا مصنف") یا قاضی گل محمد (اب سپریم کورٹ کے جج) ہوتے۔ چونکہ میں مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل اور درسِ نظامی کا فارغ التحصیل بھی تھا۔ اس لئے ایک اتوار کو ڈاکٹر تاثیر نے مجھے حکم دیا کہ میں خطبہ پیش کروں۔ انکار کی ہمت نہ تھی اسلئے تعمیل ارشاد کی۔ میری تقریر کا موضوع تھا "علماء کا جمود"۔ سارا ہال طلبہ اور اساتذہ سے بھرا ہُوا تھا۔ حضرت رُوحی بھی تشریف فرما تھے۔ جب چالیس منٹ کے بعد میری تقریر ختم ہوئی تو قبلہ روحی صاحب سٹیج پر تشریف لائے اور فرمایا کہ

"اس وقت ہماری نظریاتی سرحدوں پر کئی طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ پادریوں اور آریہ سماجیوں کے علاوہ خود اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلامی حصار پر گولہ باری کر رہے ہیں۔ ان میں سرِ فہرست لکھنؤ کے نیاز فتحپوری ہیں جن کا رسالہ نگار تخریب اسلام اور تشکیک کے لئے وقف ہے۔ آج کے مقرر جن کا نام غلام جیلانی برق ہے اور ایم اے

کے طالب علموں میں امتیاز کے حیلے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا ان شیاطین سے ملّت کو محفوظ رکھے۔"

قبلہ روحی کی اس بیباک اور مومنانہ تنقید سے طبیعت بڑی خوش ہوئی اور آپ سے میری عقیدت میں اضافہ ہو گیا۔

قبلہ مرحوم کے متعلق مجھے اتنا کچھ ہی یاد رہ گیا ہے۔

والسلام

مولانا غلام رسول مہر

(ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" لاہور)

ڈاکٹر صاحب محترم۔ نامہ گرامی کے لئے سپاس گزار ہوں اور شرمسار کہ آپ کے بھیجے ہوئے آدمی کو دو تین مرتبہ زحمت اٹھانی پڑی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی عطا کردہ سند کی مجھے تلاش تھی۔ اگرچہ وہ چند سطریں تھیں اور گنے ہوئے الفاظ۔ لیکن میرے لئے وہ الفاظ دو درجہ سے حد درجہ قیمتی تھے اول وہ اس بزرگ ہستی کے الفاظ تھے جسکی نظر لطف و نوازش کا میں ہمیشہ ممنون رہا اور اسے آج تک فراموش نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ بھی میں ہوں اور جیسا کچھ بھی ہوں، اس میں ایسی ہی چند بزرگ ہستیوں کی دعاؤں کی برکات شامل ہیں جن سے مجھے ہمیشہ عقیدت رہی۔ دوم حضرت نے سند کے آخر میں ایک فقرہ ایسا تحریر فرما دیا تھا جس کا میں اپنے آپ کو اہل تو نہیں پاتا لیکن جب وہ فقرہ لکھا گیا تھا اس وقت کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میری غیر معمولی ترقی کا دائرہ کیا ہوگا تاہم کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے مجھے نمایاں حیثیت عطا کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے واجب الاحترام استاذ کے قلب صافی پر اس کا کوئی نہ کوئی پرتو ضرور موجود تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت کی تحریر گرامی سے قریباً دو سال قبل مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور نے بھی کسی ایک عریضے کے جواب میں ایسے ہی الفاظ تحریر فرمائے تھے۔ یہ خط میری کتاب "نقشِ آزاد" میں چھپ چکا ہے۔

جب مجھے سند مل گئی میں نے اسی روز بیٹھ کر پورا مضمون لکھ دیا۔ آپ کی طرف سے آدمی مدت

تک نہ آیا تو میں نے یوسف ظاہر صاحب کو بھیجا وہ بتا لائے کہ آپ تعطیلات کی وجہ سے نہیں آ رہے۔ میں خود اپنی چند بزرگ ہستیوں کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کر رہا تھا اور حضرت مولانا مرحوم و مغفور بھی ان میں شامل تھے بس وہ مضمون لکھا ہی جانا۔ آپ کی وجہ سے جلد لکھ لیا۔ ادبی ڈائجسٹ والا مضمون اب مجھے یاد آیا۔ یہ انٹرویو تھا جس میں کالج کے زمانے کی کیفیت میں نے بتائی تھی

شیخ حسن الدین مرحوم نے خود یہ واقعہ دو مرتبہ مجھے شیخ مبارک علی کی دکان (اندرون لاہوری دروازہ) میں سنایا۔ جہاں وہ روزانہ جاتے تھے اور وقتاً فوقتاً خصوصاً ہفتے کو میں بھی وہاں جایا کرتا تھا اور پورا دن وہیں گزارتا تھا۔ اب شیخ مبارک علی کچھ سال سے پبلشرز یونائیٹڈ میں آ گئے ہیں لہٰذا میں وہیں جاتا ہوں۔

جن صاحب نے سیرت والا واقعہ کالج کی گراؤنڈ کا لکھا ہے انہیں یا تو اصل واقعہ یاد نہیں رہا یا انہیں اس کا براہ راست علم نہیں کسی سے سن لیا ہے۔ یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے۔ رلواز ہوسٹل میں داخلے کا دروازہ کالج کی جانب ہے اور یہ تقریباً مشرقی سمت ہے۔ مغربی سمت اس دروازے کی طرف ہے جہاں سے ڈائننگ ہال اور باورچی خانوں کی طرف جاتے ہیں۔ میرے زمانے میں مشرقی سمت میں عمارت دو منزلہ تھی اور اس میں اوپر نیچے کیوبیکل تھے مغربی سمت میں ملحقہ ڈارمیٹریز تھیں جن میں تین تین طالب علم رہتے تھے۔ شمالی اور جنوبی جانب چھ چھ طلبہ کی ڈارمیٹریز تھیں۔ شمالی جانب کی ونگ کے درمیان محمد رمضان طالب علم کا کمرہ تھا جو غالباً بی۔ اے میں عربی کا طالب علم تھا۔ حضرت مولانا سے پڑھتا تھا۔ اور حضرت اس کو پیار سے "مُنشیض" کہا کرتے تھے۔ ان کی زبان مبارک سے یہ لفظ سن کر دل پر مستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ڈارمیٹریوں کے باہر برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ساتھ تین تین فٹ چوڑی سڑک تھی جس پر اینٹوں کا فرش تھا۔ دھوپ اس سڑک پر تھی۔ حضرت کی کرسی تھی وہیں تھی ہم لوگ آپ کے آس پاس بیٹھے یا کھڑے تھے۔ وہاں سیرت والا واقعہ پیش آیا تھا۔ مجھے اس وقت بھی وہ منظر اس طرح یاد ہے گویا چشم تصور کے سامنے پیش آ رہا ہے اگرچہ اس پر کم و بیش چھپن سال گزر چکے ہیں۔

میں نے کئی شخصوں سے سنا یا ان کا لکھا ہوا دیکھا کہ مولانا کالج کی گراؤنڈ میں پڑھایا کرتے تھے کالج اور ہوسٹل کی عمارتوں اور گراؤنڈوں کی کیفیت جاننے والے اب شاید بہت کم اصحاب ہوں۔ میرے زمانے میں کیفیت یہ تھی۔ جس طرف آج کل مسجد مبارک ہے اس کے پاس ایک عمارت تھی جس کا ایک حصہ جمنیزیم کہلاتا تھا اور دوسرا حصہ لائبریری۔ دکانوں کی جو قطاریں آج کل برانڈرتھ روڈ پر نظر آ رہی ہیں یہ بالکل ناپید تھیں۔ نہر سے پانی کی ایک نالی ہوسٹل کی طرف آتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک فٹ پاتھ تھا۔

شہر سے طلبہ اور اساتذہ اس فٹ پاتھ سے آتے تھے۔ حضرت مولانا بھی، پروفیسر ایم۔ اے غنی مرحوم بھی اور خواجہ دل محمد بھی۔ مولانا عالم علی مرحوم نے ایک گھوڑا گاڑی بنا رکھی تھی کبھی وہ گاڑی میں آتے کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لاتے۔

میں نے مولانا کو باہر دھوپ میں بیٹھ کر پڑھاتے بارہا دیکھا لیکن وہ زیادہ تر ریلوے روڈ کی طرف کے پلاٹ میں بیٹھتے تھے کیونکہ ادھر دھوپ ہوتی تھی۔ برکی گراؤنڈ (جو حبیبیہ ہال کے سامنے تھی یعنی برانڈرتھ روڈ کی طرف) میں بھی کبھی کبھی بیٹھ جاتے تھے لیکن وہاں وہ حقہ نہیں پی سکتے تھے۔ حقہ ہوسٹل ہی میں پیتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا قریباً ہر سال انجمن حمایت اسلام میں ایک خطبہ ارشاد فرماتے تھے اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ خطبے انجمن کی کارروائیوں میں یقیناً مل جائیں گے۔ میرے پاس بھی چند سال کی کارروائیاں ہیں لیکن کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ میں ذرا فرصت پا کر تلاش کروں گا۔ مل گئیں اور حضرت کے خطبات ان میں ہوئے تو حاضر کر دوں گا ان شاء اللہ۔ تاکہ آپ نقل کرالیں یا میں نقل کرا کے دے دوں گا۔ کیونکہ مجھے ان کارروائیوں کی ضرورت ہے۔

حضرت کی آواز بلند تھی۔ وہ دور تک صاف صاف سنی جاتی تھی۔ وہ خطیبوں کی طرح لفظی سحر طرازیاں نہیں کرتے تھے۔ حقائق نہایت سلجھے ہوئے اور فاضلانہ انداز میں پیش کرتے تھے اور ان کے خطبے توجہ سے سنے جاتے تھے۔

میرے پاس "الہدیٰ" کے کچھ پرچے ضرور ہیں لیکن رسائل کی کسی جلد میں ہیں۔ میرے پاس ایسے رسائل کی دو الماریاں بھری پڑی ہیں یعنی مجلد رسائل کی۔ غیر مجلد رسائل کی تعداد بیان نہیں کر سکتا۔ میں دیکھوں گا لیکن ذرا فرصت پا کر اور اگر ان میں کوئی ایسا نمبر ہے جو آپ کے پاس نہیں تو بے شک اسے لینے اور رکھنے کا حق آپ ہی کو حاصل ہے لیکن میرا دل ڈوبتا ہے کہ حضرت کا کوئی بھی تبرک میرے پاس نہ ہو۔ ان کی چند تصانیف بھی میرے پاس ہیں۔

اب کئی مرتبہ اپنی سیہ بختی پر رونا آتا ہے کہ جب ان جوہروں میں کھیلتے تھے تو ان کی قدر و منزلت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لئے سب کچھ محفوظ نہ رکھا۔ جب ان کی نسبت کا اندازہ ہوا تو وہ دسترس میں نہ رہے۔

معافی چاہتا ہوں بے تکلفی میں بہت کچھ لکھ گیا۔ وہی حافظہ والا معاملہ ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند[1]

ان محبوب ہستیوں کا ذکر چھڑ جائے تو دنیائے حاضرہ سے بالکل بے خبری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اپنے ماضی کے دھندلکے میں مشغول سیر و سیاحت رہیں کہ وہ دھندلکا موجودہ تیرگی و تاریکی کے مقابلے میں اجالا ہے۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ جو الفاظ پڑھے نہیں گئے مہربانی کر کے وہ اپنے قاصد کے ہاتھ میرے پاس بھیجیں۔ ان شاء اللہ میں صاف الفاظ لکھ دوں گا یا انہیں سمجھا دوں گا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی دعا اور نظر لطف کا محتاج

مہر

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم　　بہ ایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

میں جالندھر سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا تو پہلی مرتبہ مولانا اصغر علی صاحب روحی کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اکثر طلبہ سے سنا تھا کہ وہ دورِ حاضر کے بہت بڑے عالم ہیں لیکن جس حد تک مجھے یاد ہے میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ وہ بظاہر کم آمیز تھے۔ بہت کم باتیں کرتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں عموماً عادت کالج سے باہر کسی مناسب مقام پر کرسی رکھوا دیتے۔ جہاں دھوپ خوب لگتی اور بی۔ اے یا ایم کے طلبہ گھاس پر بیٹھ کر عربی کی تعلیم پاتے۔ اوقاتِ تعلیم میں مولانا کا ایک ایک ثانیہ تدریس ہی میں صرف ہوتا۔ فارغ ہوتے تو ریواز ہوسٹل میں چلے جاتے جو پاس ہی تھا وہاں بھی عقیدت مند طلبہ پہلے ہی ان کے لئے ہوسٹل کے صحن میں کرسی ڈال رکھتے۔ مرحوم کے تشریف فرما ہوتے ہی حقہ ان کے سامنے رکھ دیا جاتا اور آہستہ آہستہ طلبہ سے باتیں کرتے رہتے۔ زیادہ تر ان کے متعلق سوالات کا جواب دیتے۔

وعظ اور دینیات　کبھی کبھی مولانا طلبہ کے سامنے وعظ بھی فرماتے۔ کبھی کبھی اس لئے کہا کہ اس

[1] دیوان حافظ ص ۳۰۰

زمانے میں تین مولانا صاحبان کالج کے سٹاف کے لئے باعث زیب و زینت تھے۔ اول مولانا مرحوم جن کا اعزاز و اکرام طلبہ اور اساتذہ کالج کے باہر بھی وسیع حلقے میں مسلّم تھا اور وہ واقعی علوم و فضائل کا ایک وسیع سمندر تھے۔ دوم مولانا احمد علی مرحوم جو الیف۔ اے کی کلاسوں کو عربی پڑھاتے۔ سوم مولانا محمد عمر خان ٹونکی جو فارسی کے پروفیسر تھے۔ تینوں عموماً باری باری وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا روحی مرحوم کا وعظ واقعی دینی حقائق پر مشتمل ہوتا تھا اور اس میں ایک خاص لذت اور گہرائی تھی۔ مولانا احمد علی مرحوم وعظ میں عموماً مثنوی مولانا روم سے پڑھا کرتے تھے۔ مولانا محمد عمر خان کی آواز کو وعظ سے زیادہ مناسبت نہ تھی تاہم وہ بھی ضروری دینی امور پر گفتگو فرماتے تھے۔

وعظ کے علاوہ مولانا روحی مرحوم بعض جماعتوں کو دینیات کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔

ان کی گفتگو کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ایک ایک فقرہ ادبی و علمی فضائل کی دستاویز ہوتا تھا۔ جچے تُلے الفاظ جو فہم عام کی سطح سے ذرا بلند ہوتے تھے لیکن ان کی زبان مبارک سے ادا ہوتے تو دل میں اُتر جاتے۔ کبھی کسی معاملے میں اطناب کو راہ دی جو کچھ تفہیم مطالب کے لئے ضروری ہوتا اسی پر اکتفا کرتے۔ بایں ہمہ توضیح کا کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑتے۔

فاضلانہ اندازِ گفتگو

کالج میں مشہور تھا کہ مولانا روحی کی گفتگو کو سمجھ لینا ہر فرد کا کام نہیں۔ یہ ایک حد تک درست تھا کیونکہ مولانا کا انداز سراسر عالمانہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ خدانخواستہ تکلّف سے مشکل الفاظ استعمال کرتے تھے۔ علوم کے علاوہ عربی و فارسی میں ان کی قلیل الامثال بلند منزلتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں عالمانہ و فاضلانہ داب پیدا ہو گیا تھا۔ کاملاً بے تکلفی کے عالم میں بھی ان کے ارشادات علم و ادب کے نقطۂ نگاہ سے رفعت کے ایک درجۂ خاص پر فائز ہوتے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مرتبہ دلاور ہوسٹل کے صحن میں تشریف فرما تھے، چند طلبہ جن میں سے زیادہ تر عربی خواں تھے۔ اردگرد بیٹھے تھے اسی اثنا میں ایک سپیرا بین بجاتا ہوا ہوسٹل میں داخل ہوا اور وہاں پہنچ گیا جہاں حضرت مولانا تشریف فرما تھے۔ سپیروں کے شیوۂ عام کے مطابق اس نے بین بجاتے بجاتے سانپ نکال کر دکھایا۔ مولانا چند لمحے دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا: "بھئی یہ کس قسم کا سانپ ہے؟" سپیرا بولا: "حضور ابھی ابھی میانی میر کے ویرانے سے پکڑ کر لایا ہوں"۔ مولانا نے یہ جواب

سُنا تو مسکرائے ہوئے فرمایا: دیکھو "میں تو پوچھتا ہوں نوعیت اور یہ بتاتا ہے ظرف مکان"۔

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد اُن پڑھ سپیرے کی سطحِ فہم سے بہت بلند تھا اور بعض طلبہ بھی اس سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن مولانا کا عام اندازِ گفتگو یہی تھا۔

میں نے اپنی زندگی میں صرف دو عالم دیکھے جن کا طبعی اسلوبِ گفتار عام سطح سے قدرے بالا تھا۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور دوسرے مولانا روحی مرحوم و مغفور۔ اس سے ہر سامع صلاحیتِ اخذ و فہم کے مطابق لذت حاصل کرتا تھا۔ اور میں بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس سے مسحور سا ہو جاتا تھا جس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

مولانا کی خدمت کا شرف

میں کالج میں عربی نہیں، فارسی کا طالب علم تھا اور فارسی کے مختلف ادیبوں یا شاعروں کی تصانیف کے مختلف حصے بطور خود مطالعہ کر چکا تھا۔ یہ میرزا غالب کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت کا کرشمہ تھا۔ پہلے میرزا کا اردو دیوان پڑھا۔ پھر اس کے فارسی کلیات کے متعدد حصے دیکھ لئے۔ بعد ازاں بیدل، عرفی وغیرہ سے خاص شناسائی حاصل کر لی۔ اس وجہ سے میرے استاد مکرم مولانا محمد عمر خاں نے فارسی کے پیریڈ میں مجھے حاضری کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔ میں حقہ پیتا تھا اور حقے کا اچھا سامان مہیا کر رکھا تھا۔ مولانا محمد عمر خاں کی مہربانی اور لطف و نوازش سے میں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ فارسی کا پیریڈ شروع ہوتے ہی کالج سے ہوسٹل میں پہنچ جاتا۔ اپنے ہاتھ سے حقہ تازہ کرتا تھا۔ چلم بھرتا اور ہوسٹل میں مناسب مقام پر کرسی رکھ کر مولانا روحی مرحوم کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ حسنِ اتفاق کی بات تھی کہ مولانا اس پیریڈ میں فارغ ہوتے۔ آتے ہی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ میں حقہ حضرت کے سامنے رکھ دیتا اور پاس گھاس پر بیٹھ کر چالیس پینتالیس منٹ تک ان کے ارشادات سے مستفید ہوتا۔

عرفی کا ایک شعر

خود سوال کرنے کی جرأت نہ تھی۔ مولانا کی طبع مبارک میں جو بات آتی فرماتے رہتے۔ اس زمانے میں "الہلال" نیا نیا نکلا تھا اور اس کی بڑی دھوم تھی۔ مولانا روحی مرحوم نے کئی مرتبہ مولانا آزاد کے حسنِ نگارش اور طریق

بحث و نظر کی ستائش فرمائی۔

ایک مرتبہ مجھے عرفی کے مشہور نعتیہ قصیدے کا ایک شعر سمجھنے میں دقت پیش آئی

این جوہر ذات از شرف نسبت آباست　　　سُود است بہ ابر این دُر اگرچہ سرم را

مولانا نے پہلے اس کی تشریح اردو میں فرمائی۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ شاید میں سمجھ نہیں سکا۔ چنانچہ دوبارہ پنجابی میں اس شعر کے مختلف پہلوؤں کی شرح کی اور جب تک میں نے اطمینان کا اظہار نہ کیا انہیں اطمینان نہ ہوا۔

بیدل پڑھنے کا آغاز و انجام

ایک دن مجھے خیال ہوا کہ کیوں نہ مولانا سے کوئی کتاب پڑھ لوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ فرمایا: کیا پڑھو گے۔ اس زمانے میں بیدل میرے دماغ پر سوار تھا۔ عرض کیا "نکات بیدل" پڑھا دیجئے۔ فرمایا: کتاب لے آؤ۔ میں اسی روز شام کو بازار گیا۔ نولکشور کے مطبع میں "کلیات بیدل" کے نام سے ایک نسخہ چھپا تھا۔ جس میں "رقعات"۔ "چہار عناصر"۔ "نکات و اشارات" کے علاوہ دیوان بیدل کا انتخاب بھی شامل تھا۔ سوا روپے یا ڈیڑھ روپے میں وہ نسخہ ملتا تھا۔ میں نے خرید کر جلد بندھوائی اور اگلے روز حضرت مولانا تشریف فرما ہوئے تو کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے کتاب کھولی تو "اشارات بیدل" والا حصہ نکل آیا اس کے آغاز میں چند شعر حمد و نعت میں بہ طریق مثنوی درج تھے۔ ابتدائی شعر یہ تھے

زبانم قابلِ حمدِ خدا شد　　　کہ با نامِ محمد آشنا شد
دو عالم چوں صدف در ہم شکستم　　　کہ آید گوہرِ نامش بدستم

میرا اپنا نسخہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں منتظر تھا کہ مولانا فرمائیں گے: "اچھا، پڑھو"۔ لیکن چند منٹ بعد احساس ہوا کہ ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ جن شعروں کا اثر ان کے قلب صافی پر زیادہ ہوتا تھا انہیں وہ خاص لے میں گنگنانے لگ جاتے تھے۔ اس لے کی نقل چوہدری محمد حسین مرحوم و مغفور نے خوب اتاری تھی۔ وہ مولانا کے عزیز شاگرد تھے اور ان کا بہت ادب کرتے تھے۔

بس مولانا دو چار منٹ میرے نقل کردہ دو شعر بار بار گنگناتے اور جھومتے۔ پھر فرماتے:

"بھئی ہم تو بیدل کے ان شعروں پر مر گئے ہیں۔" بعد ازاں یہی دو شعر بدستور گنگناتے اور جھومتے۔

غرض ان کی بابرکت نشست کا پر لطف انہی دو شعروں کو گنگنانے اور ان پر جھومنے میں گزر گیا۔ بس یہی مولانا سے پڑھنے کا آغاز تھا اور میری بے نصیبی ہے ہی اس کا انجام ہوا۔ نہ مجھ میں اتنا حوصلہ تھا کہ عرض کرتا پڑھائیے نہ اتنا شعور تھا کہ بیدل کی جگہ کوئی اور کتاب پڑھنے کی التماس کر دیتا۔

شعر کی حقیقت

یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ

؎ دو عالم چوں صدف در ہم شکستم   کہ آمد گوہر نامش بدستم

جیسا شعر نعت میں شاید ہی کسی شاعر نے کہا ہو جو محض نعت نہ تھا بلکہ حقیقت حق کا بھی ترجمان تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے سوا دو جہانوں کی صدف میں اور گوہر ہے ہی کون سا جسے یہ گوہر مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔ جو اس گوہر کی جلوہ افروزیوں سے محروم ہوا وہ دو جہانوں کی ہر اس شے سے محروم ہو گیا جو شایان نگہداشت تھی۔ اقبال مرحوم نے یہی بات زیادہ وضاحت سے دوسرے انداز میں فرما دی۔

؎ بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

مرزا بیدل کے یہ دو شعر میں نے پہلے ہی پڑھے تھے لیکن جب تک مولانا روحی مرحوم و مغفور کو انہیں پڑھ کر مسلسل چالیس منٹ کیف وجد کے عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی حقیقی حیثیت دل نشین نہیں ہوئی تھی۔ ایسے ہی مقامات ہیں جہاں مرشد و مربی کا ایک ارادی یا غیر ارادی اشارہ مرید و تربیت طلب کے ذہن و فہم کے لئے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کرا کے مقام مطلوب تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کسی صاحب دل کی بارگاہ میں چند لمحے گزارنا کبھی خالی از منفعت نہیں ہوتا۔ مولانا رومؒ نے یہی حقیقت یوں بیان فرمائی ہے۔

؎ یک زمانہ صحبتے با اولیا   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

خوش بختی اور کم نصیبی

میں نے مولانا روحی مرحوم کی صحبت سے خاص مدت تک فائدہ اٹھایا۔ آج گزرے ہوئے حالات پر نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو اپنے آپ کو بہت خوش نصیب

سمجھتا ہوں۔ کہ میرے ابتدائی دور میں جو نادر شخصیتیں زینت آرائے عالم وجود تھیں۔ ان کی زیارت سے آنکھوں نے روشنی
حاصل کی۔ کانوں نے مکارم و فضائل کے جواہرات سے جھولی بھر لی۔ روح و قلب کو راہ راست کی تلاش میں مدد ملی
تاہم اس امر کا افسوس ہمیشہ رہے گا کہ جب فضائل و مکارم کے یہ سمندر شوق کی دسترس میں تھے تو ان سے استفادے
کا شعور نہ تھا۔ جب کسی قدر شعور پیدا ہوا تو وہ سب دسترس سے باہر جا چکے تھے اور میرے لئے ایک دشت
ناپید و کنار میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

درس دینیات

ایک دفعہ میری کلاس کو بھی حضرت مولانا سے دینیات پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔
فارسی کی ایک مختصر اور سادہ سی کتاب بجائے نصاب دینیات کے لئے مقرر تھی۔ پیریڈ
شروع ہوتا تو حضرت مولانا اس عاجز کو فرماتے "تم پڑھو۔" میں چند فقرے پڑھتا اور مولانا ان کی تشریح فرماتے جاتے
ایک دفعہ تشریح کے سلسلے میں ابوجہل کا ذکر آیا۔ مولانا نے اس کے متعلق کئی الفاظ فرمائے جن میں سے کوئی
بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ آخری لفظ "الدّ الخصام" تھا۔ یہ قرآن مجید سے ماخوذ تھا (سورہ بقرۃ آیت ۲۰۴)
لیکن اس زمانے میں قرآن مجید سے بھی سرسری سی آگاہی تھی۔ اگرچہ ایک مرتبہ پورا قرآن پڑھ چکا تھا۔ میں نے بے تاب ہو
کر عرض کیا۔ حضرت کتاب بذاتِ خود کی فارسی تو آسانی میں سمجھ آجاتی ہے لیکن آپ کی تشریحات میرے کچھ پلے نہیں پڑتیں
حضرت نے حسب معمول ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اپنا عصائے مبارک اٹھا کر اس کا زیریں
حصہ میرے سینے تک پہنچایا اور فرمایا: "ہاں بیٹا" "وہ بڑا ہی ملیح اور مصدر تھا" (یا جو کچھ فرمایا)
ایک مرتبہ امتحان کے پرچے میں مجھ سے "بید" کی جگہ "بیت" لکھا گیا۔ بہت خفا ہوئے۔ فرمایا
"تم سے ایسی غلطی؟" میں شرمندہ بھی ہوا اور معافی بھی مانگی اور عرض کیا کہ خدا جانے عجلت میں کس طرح "د"
کی جگہ "ت" لکھی گئی اور یہ پوری بات کلاس میں ہوئی تاکہ دوسروں کو بھی عبرت ہو۔

ایک بیرسٹر کا واقعہ

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ حضرت مولانا سردیوں میں عموماً کالج
کی عمارت سے باہر گراؤنڈ میں یا ریلوے روڈ کی طرف کے پلاٹ میں بیٹھ
کر جماعت کو پڑھایا کرتے تھے۔ پرنسپل ہنری مارٹن کو یہ طریقہ پسند نہ تھا لیکن مولانا نے اپنی روش نہ بدلی اور پرنسپل
کو ہی آخر اسے قبول کرنا پڑا۔

مولانا ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جنہوں نے مختلف باتوں میں انگریزوں کے طور طریقے اختیار کر لئے تھے۔ اس زمانے میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کے پاس روپیہ تھا اور ولایت میں کچھ مدت گزار کر بیرسٹری کی سند لے آئے بیرسٹری تو وہ کیا کرتے، انجمن حمایت اسلام کے ارکان بن گئے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ تھے اور انجمن کو بھی بظاہر ان کی رکنیت پر اعتراض کی کوئی وجہ نہ تھی۔

انہیں میں ایک بیرسٹر کالج کے قریب رہا کرتے تھے (میں ان کا نام نہ لوں گا)۔ قد متوسط، جسم خاصا بھاری کوٹ پتلون پہن کر نکلتے اور چھوٹی چھڑی ہاتھ میں ہوتی۔ مولانا ریلوے روڈ کی طرف کے پلاٹ میں پڑھا رہے تھے اور جیسا کہ ان کا شیوہ تھا۔ تدریس کے اوقات میں انہماک اس درجے پر پہنچ جاتا کہ کسی دوسری طرف توجہ ہی نہ ہوتی۔ ان کی کرسی اس سڑک کے پاس تھی جو کالج کے ایک پھاٹک سے ڈیوڑھی کی طرف جاتی تھی اور پورچ میں سے ہوتی ہوئی دوسرے پھاٹک پر ختم ہوتی تھی۔ رخ ریلوے روڈ کی طرف تھا۔ بیرسٹر صاحب پھاٹک سے داخل ہوئے اور آتے آتے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مولانا تشریف فرما تھے۔ نہ سلام مسنون کہا، نہ مزاج پوچھا۔ اچانک بولے "پرنسپل صاحب کہاں ہیں؟" یہ سن کر مولانا نو وارد کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنا عصا اٹھا کر پرنسپل کے دفتر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "ادھر ہوں گے" "ہوں گے" اس لئے فرمایا کہ انہیں کیا علم ہو سکتا تھا کہ پرنسپل صاحب کہاں ہیں؟ دفتر میں یا کسی کلاس کو پڑھا رہے ہیں؟ یا باہر چلے گئے ہیں۔ بیرسٹر کے لئے صحیح طریق عمل یہی تھا کہ ان کے دفتر میں جا کر پوچھتے۔ مولانا کو ویسے بھی بیرسٹر کا یہ استفسار پسندیدہ معلوم نہ ہوا کہ سلام مسنون کے بغیر سوال کر دیا۔

مولانا کا غیظ

بیرسٹر کے سر میں خدا جانے کیا سودا سمایا کہ پرنسپل کے دفتر میں گیا وہ نہ ملے تو کسی چپڑاسی یا ہیڈ کلرک سے پوچھے بغیر پھر مولانا کے پاس آ گیا اور خفگی کے عالم میں گویا ہوا:

"میں نے پوچھا پرنسپل صاحب کہاں ہیں، آپ نے
کچھ نہ بتایا۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے؟"

یہ الفاظ سنتے ہی مولانا کو جلال آ گیا۔ غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

"اے مغربی تہذیب کے شیدا! تو مجھے تہذیب

سکھانے آیا ہے؟ انہیں مجھے بتاؤں تہذیب کیا ہوتی ہے۔"

طلبہ مولانا کے قدموں سے لپٹ گئے کہ مہربانی فرمائیے اور بیرسٹر صاحب سے کہا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ مولانا عالم جلال میں جو کچھ فرما رہے تھے وہ تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ صرف یہ الفاظ سمجھ میں آتے تھے: "دیکھو جی! یہ شخص مجھے تہذیب سکھانے آیا ہے"۔

بیرسٹر بالکل دم بخود کھڑا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ سارا ہنگامہ بپا کس بنا پر ہوا۔ کیونکہ جو الفاظ اس کی زبان سے نکلے تھے ان کی صحیح معنویت کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ غالباً سمجھتا تھا کہ یورپ جا کر لوٹ آنے والا ہر فرد واقعی "مہذب" ہوتا ہے اور اس ملک کے مدرسوں میں عمر گزار دینے والا کوئی شخص تہذیب سے روشناس ہو ہی نہیں سکتا۔

مولانا کی زبان سے جب ایک دو مرتبہ یہ الفاظ سُنے کہ "دیکھو جی۔ یہ شخص مجھے تہذیب سکھانے آیا ہے"۔ بیرسٹر نے کہا: "دیکھو جی! یہ مجھے "شخص" کہہ رہا ہے!" یہ کلمہ پے درپے دو تین مرتبہ دہرایا تو مولانا نے فرمایا۔ ارے تجھے "شخص" نہ کہوں تو بتا کیا کہوں؟

آخر طلبہ نے بیرسٹر کو وہاں سے چلتا کیا۔ بعد ازاں کچھ عرصے کے بعد مولانا کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

سیالکوٹ کا ایک واقعہ

دیکھا نہیں سُنا تھا کہ اسی طرح سیالکوٹ کے ایک جلسہ میں جو غالباً تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں تھا۔ بعض اصحاب نے سرسید مرحوم کی تعلیمی پالیسی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ایسے جملے بھی فرمائے، جن سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ علماء نے سرسید کی مذہبی پالیسی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ بھی صحیح نہ تھا۔ سب لوگ خاموش رہے لیکن مولانا مرحوم کو سکوت گوارا نہ ہوا۔ اسی وقت اُٹھے اور بالکل واضح الفاظ میں فرمایا کہ تعلیمی پالیسی کے بارے میں آپ جو مناسب سمجھیں کہیں لیکن علماء کرام نے دینی نقطۂ نگاہ سے جو کچھ کہا تھا۔ اس پر ہم آج بھی قائم ہیں۔ یقیناً ہم سرسید کی بعض دینی تصریحات سے نہ پہلے متفق تھے اور نہ آج متفق ہیں (یا جیسا آپ نے فرمایا)۔

مولانا محمد شفیع مرحوم کا بیان

مولانا محمد شفیع مرحوم پرنسپل اورینٹل کالج و صدر شعبہ دائرۃ المعارف

الاسلامیہ نے کئی مرتبہ اپنی طالب علمی کی داستان سنائی۔ کہتے تھے۔ میں مولانا مرحوم سے پڑھنا چاہتا تھا لیکن ان کے پاس وقت نہ تھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ جب مولانا کالج جائیں تو میں ساتھ ہو جاؤں اور پڑھتا جاؤں۔ جب واپس آئیں تو پھر ساتھ ہو لوں۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج شیرانوالہ دروازہ کے اندر تھا۔ مولانا اپنے مکان (واقع گوجر گلی اندرون بھاٹی دروازہ) سے کالج کی طرف روانہ ہوتے تو مولانا محمد شفیع ساتھ ہو جاتے اور کالج پہنچنے تک پڑھتے جاتے۔ اسی طرح واپسی پر پڑھتے۔

بالکل اسی قسم کا واقعہ مولانا شبلی مرحوم و مغفور کو پیش آیا تھا۔ وہ اعظم گڑھ سے اس لئے لاہور آئے تھے کہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری مرحوم سے ادب پڑھ لیں۔ مولانا کے پاس وقت نہیں تھا۔ انہوں نے مولانا شبلی کے لئے گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک کا وقت مقرر کیا تھا۔

میں نے مولانا شفیع مرحوم سے کئی مرتبہ پوچھا کہ آپ کو بازاروں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جہاں سواریوں کی اتنی کثرت نہ ہوگی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ بازاروں اور گلیوں میں لوگوں کی آمد و رفت کے باعث پڑھنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ فرماتے تھے کہ میں مولانا کے ساتھ ساتھ چلتا اور کان ان کے ارشادات پر رہتے۔

مولانا کو طلبہ سے بہت محبت تھی۔ ان پر حد درجہ شفقت فرماتے۔ پیار کی فراوانی کے باعث ان کے ناموں میں دل آویز تصرف فرما لیتے۔ مثلاً ایک طالب علم کا نام محمد رمضان تھا۔ مولانا اس سے گفتگو فرماتے تو کہتے۔ کہو بیٹا "رمضی" طبیعت کیسی ہے۔

درس قرآن حکیم

مولانا اپنے مکان کے پاس کی مسجد میں روزانہ صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ چودھری محمد حسین مرحوم اس درس میں کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ میں بھی گیا تھا۔ اس روز

"ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون"

کی تفسیر فرماتے ہوئے اس حکم کے مصالح ایسے دل نشین انداز میں بیان کئے تھے کہ آج تک یہ واقعہ اور یہ درس ذہن میں اسی طرح تازہ ہے جس طرح سنا تھا۔

ایک یادداشت

مولانا متوسط قامت کے بزرگ تھے۔ جسم دبلا تھا۔ لمبا جبہ پہنتے تھے

میرے بچوں نے ایک مرتبہ اصرار کیا تھا کہ کسی طرح اپنے ابتدائی دور کے حالات لکھوا دو۔ اسی سلسلے میں کالج کی زندگی کے حالات بھی مختصراً لکھوائے تھے۔ جن میں اپنے بعض اساتذہ کا بھی ذکر کیا تھا۔ مولانا روحی مرحوم کے متعلق جو کچھ لکھوایا تھا اسکا ابتدائی حصہ ذیل میں درج ہے۔

میرے اساتذہ میں آخری مگر سب سے بڑھ کر قابل ذکر شخصیت مولانا اصغر علی روحی مرحوم کی ہے افسوس کہ اس فاضل بزرگ کا ذکر بہت کم ہوا حالانکہ وہ اپنے ہی عہد کے نہیں بلکہ اوصاف و محاسن کے اعتبار سے کئی عہدوں کے قابل قدر فرد تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں جتنے بلند منزلت فضلاء دیکھے ان میں سے ایک مولانا روحی بھی تھے۔ میرے ناچیز اندازے کے مطابق قدیم طرز کے علماء میں وہ ایک آخری بڑی شخصیت تھے۔

طب میں دستگاہ

مولانا کو طب میں بھی پوری دستگاہ حاصل تھی لیکن باقاعدہ مطب کبھی نہ کیا۔ ایک مرتبہ مجھے سخت نزلہ ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتے ہی فرمایا: کاغذ لاؤ۔ نسخہ لکھ دوں۔ میں نے ایک کاپی خدمت والا میں پیش کر دی جو اس وقت ہاتھ میں تھی۔ اس پر پانچ دوائیں تحریر فرمائیں۔ جن میں سے دو اس وقت بھی یاد ہیں یعنی اصل السوس مقشر (چھلی ہوئی ملٹھی) اور سپستان (لسوڑیاں) یہ نسخہ میں نے جوشاندہ کے طور پر پیا۔ خدا کے فضل سے دو ہی مرتبہ پیا تو نزلہ دور ہو گیا۔ میں وہ کاپی سالہا سال اپنے پاس محفوظ رکھی اور جب کبھی نزلہ ہوتا وہی نسخہ استعمال کرتا۔ اب دیکھتا ہوں تو وہ کاپی کہیں نظر نہیں آتی۔ شاید ان کتابوں میں رہ گئی جو میرے وطن (کھول پور ضلع جالندھر) میں تھیں اور ان دو اڑھائی ہزار کتابوں میں سے جن میں نوادر بھی تھے اور بعض اخباروں کے فائل بھی، ایک چیز بھی نہ آ سکی۔

شعر گوئی

مولانا عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کے بعض نعتیہ قصائد میں نے خود ان کی زبان مبارک سے سنے تھے۔ ان میں سے ایک قصیدہ تو غالباً چھاپ بھی دیا تھا۔ لیکن اب میرے پاس ان تبرکات میں سے کچھ بھی موجود نہیں۔

اپنی حالت پر تاسف

اخبار نویسی کے زمانے میں بھی حضرت مولانا کی زیارت سے دو تین مرتبہ شرف یاب ہوا لیکن میرا مشغلہ ایسا تھا جس کے غیر متوقع اور بے پناہ لوازم

مشاغل کی دلدل میں پھنس کر آدمی کسی دوسرے کام کا نہیں رہتا اور چاہے بھی تو پابندی سے کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔

اس زمانے میں مولانا کے مقام و منزلت کا پہلے سے بہتر اندازہ ہو چکا تھا لیکن کم نصیبی کے باعث اس وقت بھی کچھ حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اسکا افسوس ہمیشہ رہے گا۔

مولانا مجھ ایسے عاجزوں یا کثیر الوسائل لوگوں کی طرف سے خدمت گزاری کے خواہاں تو کیا تھے۔ ایسی کوئی بات ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ گزری ہوگی لیکن مجھے اپنی جگہ افسوس ہے کہ ایسے شفیق اور بلند پایہ بزرگ کی کوئی خدمت انجام نہ دے سکا۔

تصانیف

مولانا نے " الہدیٰ " کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا تھا جسے وہ زمانے کی خیرہ ذوقی اور اپنی دوسری بے پناہ مصروفیتوں کے باعث جاری نہ رکھ سکے میرے پاس بھی اس کے ایک دو پرچے بطور تبرک موجود ہیں۔ ان کی تصانیف یعنی "شرح اسماء الحسنیٰ"، "دبیر عجم" "ترجمہ کتاب ابن قیم" وغیرہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ "دبیرِ عجم" فارسی میں ہے۔ ہمارے ہاں آخری دور میں جو عالمانہ اسلوب تحریر تھا اس کا ایک دل آویز مرقع یہ کتاب بھی ہے۔ افسوس کہ یہ اس عہد میں چھپی جب ہمارے ہاں فارسی کا ذوق بالکل آخری دموں پر تھا۔ اس کتاب سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ادب فارسی میں مولانا کی وسعت نظر کا کیا عالم تھا۔

شیخ حسن الدین مرحوم کی شہادت

یہ قصہ شیخ حسن الدین مرحوم وکیل سے کئی مرتبہ سُنا کہ ایک مرتبہ مجھے (شیخ صاحب کو) خیال آیا۔ " اخلاق جلالی کے اس حصے کا انگریزی ترجمہ چھاپ دوں جو بی۔ اے یا ایم۔ اے کے نصاب میں داخل تھا۔ ایک انگریز کا کیا ہوا ترجمہ موجود تھا لیکن اس کے بعض حصے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میں نے ترجمہ شروع کر دیا۔ جا بجا مطالب کتاب سمجھنے میں دقتیں پیش آئیں۔ بیشتر کے انگریزی ترجمے سے بھی ان کے حل میں کوئی مدد نہ مل سکی۔ مختلف ممتاز فارسی دانوں سے مشورہ کیا مگر عقدہ کشائی کی کوئی صورت نہ بنی۔ آخر مولانا روحی کی خدمت گرامی میں پہنچا اور جب تک ترجمہ مکمل نہ ہو گیا۔ انہیں سے استفادہ کرتا رہا۔ مولانا ایک لفظ کی تشریح کے سلسلے میں بے تکلف اشعار سے سندیں دیتے۔ یہ فرماتے کہ صاحب " اخلاق جلالی " کے زمانے میں ان الفاظ و تراکیب کا

مطلب و مفہوم کیا تھا؟ انہیں کی راہنمائی میں یہ منزل طے ہو گئی۔

شیخ صاحب کہا کرتے تھے کہ مولانا ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر اندازہ ہوا کہ علم کسے کہتے ہیں اور فضیلتِ علمی کا اطلاق کن شخصیتوں کے لئے زیبا ہے۔

مولانا کا سرٹیفکیٹ

میں آخر میں اس سرٹیفکیٹ کی عبارت نقل کرنا چاہتا ہوں جو حضرت مولانا نے مجھے اس وقت مرحمت فرمایا تھا جب میں کالج کی تعلیم مکمل کر کے جا رہا تھا۔ چند سطروں کی یہ تحریر آج بھی میرے نزدیک زندگی کے بہترین تبرکات میں ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب میں رسمی طالب علم کا دور پورا کر چکا تھا اور زندگی کے کسی معین دائرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اس وقت ایک نہایت شفیق بزرگ و محسن کے تاثرات مجھ ناچیز در بارۂ علم و فضل کے متعلق کیا تھے۔ میں پہلے بھی ہیچ تھا اور اب بھی اپنے متعلق کسی قسم کے حسنِ ظن کا کوئی سہارا نہیں پاتا لیکن میرے نہایت مکرم و محترم استاذ کے چند شفقت بھرے الفاظ میرے لئے ایسی دستاویز ہیں جسے درماندگی و نارسائی کے باوصف اپنے سینے پر لگائے رکھنا باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ انسان میں خود کوئی جوہر نہ ہونے کے باوجود بزرگوں کے حسنِ ظن کی جانب بے شائبہ ریب اس کے لئے نہایت بیش بہا دولت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"غلام رسول مہر عرصہ چار سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پاتا رہا۔ اس عرصے میں، میں نے اس کے چال چلن اور علمی قابلیت کا پورا پورا موازنہ کیا۔ میں اپنے ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں وہ سب اوصاف موجود ہیں جو ایک شریف، محنتی اور پابندِ فرائض طالب علم میں ہونے چاہییں۔ وہ ایک خاص قابلیت کا جوہر اپنے اندر رکھتا ہے جس سے مجھے اس کی غیر معمولی ترقی کا یقین ہے۔ فقط

۲۔ فروری ۱۹۱۶ء دستخط

اصغر علی روحی ایم۔ او۔ ایل

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مولانا ہمارے عہد کے بہت بڑے صاحبِ علم و عمل تھے۔ پوری زندگی ایک مقدس فرض کی حیثیت سے بسر کی۔ نشر و اشاعتِ علوم خصوصاً علومِ دین سے گہری وابستگی رہی۔ جس مرتبے کے بزرگ تھے اس کا صحیح اندازہ بہت کم لوگوں کو تھا مگر ان کی قدر و منزلت بقدرِ بایست نہ ہو گی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے مرقدِ مقدس کو انوارِ رحمت کے جلووں سے

محفوظ رکھے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

چوہدری فتح محمد بٹالوی

جیل روڈ، لاہور

حضرت روحیؒ کا دین میں تصلب

۱۔ قبلہ روحیؒ صاحب کے استاذ جناب عبداللہ ٹونکیؒ نے بینکوں کے سود کے متعلق جواز کا فتویٰ دیا تھا مگر حضرت روحیؒ کچھ ایسے محتاط، صاحب عزیمت اور دین میں متصلب اور پختہ واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے استاذ کے فتویٰ کے خلاف رائے قائم کی اور اسی پر آخری عمر تک قائم رہے۔ کوئی وقتی مصلحت ان کی اس رائے کو بدل اور عقیدہ کو متزلزل نہ کر سکی۔ حضرت روحیؒ کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ "الہدیٰ" میں اس مسئلہ پر سیر حاصل مواد موجود اور تفصیلات درج ہیں۔

۲۔ یہودیوں کی تحریک "فری میسن" کے متعلق موافق و مخالف آراء قائم ہو گئیں۔ مگر حضرت روحیؒ کی اس کے متعلق دو ٹوک رائے اور فیصلہ تھا۔ حتیٰ کہ حضرتؒ نے فری میسن سے وابستہ اشخاص کا جنازہ پڑھنا پڑھانا ناجائز قرار دیا۔

۳۔ تقسیم ملک کے بعد بھی مسلم قوم پر ایسا ادبار، نکبت اور بدبختی طاری ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی اسلام کے نام پر حاصل کردہ ملک میں اسلام کے نفاذ کے وعدے برابر پس پشت ڈالے جاتے رہے۔ چنانچہ اس ملک میں حضرت جمعہ کے دن احتیاطِ ظہر کے قائل و عامل رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اسلامی کا نفاذ نہ ہو تو ایسے ملک کو کیونکر اسلامی ریاست کہا جا سکتا ہے اور مثال دے کر فرماتے تھے کہ اگر خنزیر کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا جائے تو وہ حلال تو نہیں ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی حال اس ملک کا بھی ہے کہ اگر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خلاف اسلام روش ہو اور اجتماعی طور پر قانون کی سرپرستی میں اسلام دشمن اور خدا فراموشی کی حوصلہ افزائی ہو تو ایسے ملک کو اسلامی ملک نہیں کہا جا سکتا۔ نتیجۃً یہاں "شرعی جمعہ" نہیں ہو سکتا۔ اس لئے احتیاطِ ظہر پڑھنی چاہیے۔

حضرت روحیؒ کی کرامات

۱۔ ایک مرتبہ حضرت کو بخار ہو گیا۔ آدھی رات کے وقت فرمانے لگے کہ اگر میاں رشید محمد شرقپوریؒ سے ملاقات ہو جائے تو غم غلط ہو جائے گا اور بخار اتر جائے گا مگر میری یہ آرزو کیوں کر پوری ہو۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ آپ نے فرمایا "ضیاء جی!" (اسی نام سے پیار کے طور پر ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب کو پکارا کرتے تھے) ذرا دیکھنا۔ میاں رشید محمد آئے ہیں۔ دروازہ کھول دیا۔ فی الواقع آدھی رات کو آنے والے میاں شرقپوریؒ ہی تھے۔ حضرت کی مزاج پرسی کی۔ تھوڑی دیر بیٹھے۔ بفضل ایزد متعال بخار اتر گیا طبیعت پرسکون ہو گئی۔ واپسی کی اجازت طلب کر کے چلے گئے اور اصرار کے باوجود نہ رکے کہ پیچھے شرقپور میں کوئی ضروری کام تھا۔

۲۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت روحیؒ کا ایک کان بند ہو گیا۔ گوجرانوالہ سے ادھر لاہور کی طرف ایک مشہور حکیم تھے۔ حضرت اقدس نے اُن کی طرف چلنے کو فرمایا۔ چنانچہ بندہ، حضرت روحیؒ، اُن کے لڑکے فضل حق (جو اس وقت لڑکے ہی تھے) اور اُن کی والدہ ایک ٹانگے پر سوار ہو کر چلے۔ راستے میں ایک جگہ نماز کے لئے رکے کچی سی مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت پر رقّت طاری ہو گئی (شاید اس خیال و تصور سے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد شریف بھی کچی تھی۔ بارش کے موقع پر کیچڑ ہو جاتا کہ چھت ٹپکتی تھی۔ جس پر پیشانی کیچڑ آلود ہو جاتی) بہر کیف! رقّت کی حالت میں آپ نے نماز ادا کی۔ دعا مانگی تو کان ٹھک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ فرمایا: واپس چلو۔ الحمد للہ صحت یاب ہو گیا ہوں۔ چنانچہ حسبِ ارشاد ہم سب واپس آ گئے۔

شیخ محمد امین بی۔ اے

سابق لائبریرین اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور

حضرت مولانا اصغر علی روحی (قدس سرہ العزیز)

مولانا روحیؒ میرے محترم استاد تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں میرے پانچ سال (۱۳-۱۹۱۸)

قیام کے دوران میں نے ۳ سال بی۔ اے عربی کا نصاب ان سے ہی پڑھا۔

کالج میں داخلہ لینے سے پہلے بھی میں مولانا کو جانتا تھا۔ وہ اس طرح کہ استاد محترم ہمارے محلہ کی مسجد میں کبھی کبھی آکر وعظ فرمایا کرتے تھے ...... میں جدی پشتی طور پر لوہاری منڈی کا رہنے والا ہوں۔ لوہاری منڈی میں ایک جامع مسجد ہے۔ مسجد پٹولیاں والی۔ مسجد میں پرانے وقتوں کا حوض بھی ہے اور وضو کے لئے ٹوٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ مسجد خاصی بارونق ہے اور اہل محلہ اکثر مواقع پر مسجد میں محفل میلاد یا وعظ کی مجالس منعقد کرواتے۔ جب ہم سکول کے طالب علم تھے تو مولانا روحی صاحب کبھی کبھار (اہل محلہ کی استدعا پر) مسجد میں آکر اپنے مواعظِ حسنہ سے مستفیض فرمایا کرتے تھے۔ عامۃ الناس میں وہ مولوی روحی کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ رجب المرجب کے مشہور مہینہ میں شب معراج شریف کے موقع کے لئے مجلس وعظ کا پروگرام زیرِ غور تھا اور کسی خطیب کے لئے سوچا جا رہا تھا تو مولانا کا نام تجویز ہوا مجلسِ مشاورت میں یہ نام متفقہ طور پر منظور ہو گیا۔ اگرچہ ایک صاحب نے اتنا ضرور کہا کہ مولانا اپنے وعظ میں بڑے ثقیل الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ان Remarks کے پیش نظر جب مولوی صاحب سے مجلس میں وعظ کے لئے عرض کیا گیا تو یہ بھی التماس کی گئی کہ بعض احباب کا خیال ہے کہ آپ تقریر میں مشکل الفاظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے یہ عرض ہے کہ ذرا آسان الفاظ میں اپنا مفہوم بیان فرما دیجئے گا۔ نمازِ عشاء کے بعد مجلس شروع ہوئی۔ مسجد خاصی بھری ہوئی تھی۔ تقریر کا موضوع تھا "حیات النبیؐ"۔ مولانا نے کوئی دو گھنٹے سے زیادہ وقت تقریر کی۔ سامعین نے بڑی توجہ سے سنی اور بڑے ہی محظوظ ہوئے۔ خلافِ توقع اور خلافِ معمول مولانا نے اس شب تقریر میں نہایت ہی سادہ الفاظ استعمال کئے اور بہت سے تاریخی واقعات بھی بزرگانِ دین کی ذاتی زندگی سے بیان فرمائے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے اور حیات النبی پر دلالت کرتے تھے اور حیات طیبہ پر روشنی ڈالی۔

مولانا علمی باتیں بیان کرنے کے عادی تھے۔ ان کی تقریر میں دلائل و حقائق ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے ہی کالج کے عربی اور دینیات کے استاد مولوی احمد علی صاحب بٹالوی بھی ہماری مسجد میں وعظ کے لئے بلائے جاتے تو وہ عموماً مثنوی مولانا روم ہی بیان کرتے۔ ان کے وعظ کا موضوع زیادہ تر حب نبی کریمؐ ہوتا تھا۔ وہ خوش الحان تھے۔ ہر وعظ میں نعت نبیؐ سے چند اشعار ضرور پڑھتے اور نہایت خوش الحانی سے ادا کرتے۔

ے ہر درخت کو ندارد میوۂ حب نبی ... اصل او را سر بسر با تیشۂ باید زدن

یہ شعر عجیب ادا میں ادا فرماتے تھے۔

مولانا روحی اپنی تقریر میں اشعار شاذ ہی پڑھتے اور چونکہ عادتاً" وقیع الفاظ زبان سے نکل جاتے۔ پھر سامعین کی استعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے "گویا کہ" "گویا کہ" کے الفاظ کہہ کر اپنے مضمون کی خود ہی تشریح بیان فرما دیتے۔ طلباء میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہ "گویا کہ" مولانا کا تکیہ کلام ہے۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے ہال کے مغرب میں پہلا کمرہ (جو اب سٹاف روم کے طور پر استعمال ہوتا ہے) مولانا کا کلاس روم ہوتا تھا، ہم ڈیسک والے بنچوں پر بیٹھتے تھے۔ مولانا کی کرسی لکڑی کے تخت پوش والے ڈائس پر ہوتی تھی۔ آگے میز اور پیچھے کرسی، مولانا کی پیٹھ مغرب کی طرف ہوتی۔ عموماً میز کے ایک طرف ...... برآمدہ کی طرف کرسی رکھتے اور وہیں بیٹھ جاتے۔

B.A عربی اور M.A عربی کی کلاسیں ہی پڑھاتے تھے۔ ہاتھ میں موٹا ڈنڈا رکھتے تھے۔ کلاس میں ہوتے تو ڈنڈا میز پر ہوتا۔ موسم سرما میں، کبھی کبھی (بلکہ دسمبر، جنوری کے سرد دنوں میں اکثر) ایسا بھی ہوتا کہ کلاس دھوپ میں کالج گراؤنڈ میں ہوتی۔ طلبا گھاس پر بیٹھتے اور مولانا کی کرسی طلبا میں سے ہی کوئی نہ کوئی اٹھا کر لے آتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کرسی اٹھانے کے لئے اکثر کوشش کرتے کہ وہ سبقت حاصل کریں۔

مولانا کے پڑھانے کا طریق بالکل سادہ تھا۔ طالب علم کتاب سے عبارت پڑھتا۔ پھر ترجمہ کی کوشش کرتا۔ مولانا طالب علم کی اعراب کی غلطیاں اور تلفظ کی غلطیاں ساتھ ساتھ درست کرتے جاتے اور ترجمہ کی تصحیح بھی۔ پھر مولانا خود ہی عبارت پڑھتے اور مشکل الفاظ کے معنی اور گرامر کے قواعد بتاتے جاتے۔ زبان اردو ہی استعمال ہوتی۔

مولانا چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ شلوار، کرتہ اور اس پر چوغہ پہنتے تھے۔ ایک موٹا ڈنڈا (عالباً کاہو کی لکڑی کا) ہاتھ میں ہوتا۔ سر پر سفید عمامہ (جس کے نیچے ٹوپی (کپڑے کی) ضرور ہوتی۔ سر کے بال منڈے رکھتے) اور داڑھی گھنی گول شرعی اندازہ کے مطابق ...... حقہ کے عادی تھے۔ کالج سے فراغت کے بعد جب گھر واپس ہوتے تو دستور یہ تھا کہ مبارک مسجد کے عقب میں حاجی فضل دین صاحب (پروفیسر عبدالقیوم اور پروفیسر عبدالحی صاحبان کے والد گرامی) کے پاس نشست ہوتی۔ وہاں حقہ کے کش لگتے۔ فرمایا کرتے حقہ اس لئے پیتا ہوں کہ پیٹ کی نفخ کو فائدہ دیتا ہے۔ آپ پیٹ کی ریح اور نفخ کے مریض تھے ......

(بالعموم پیدل ہی جاتے اور پیدل ہی واپس آتے)

مولانا کا گھر موری دروازہ اور بھاٹی دروازہ کے درمیان شہر کے بیرونی باغ کے قریب تھا۔ گھر سے نکلتے

تو باغوں باغ کالج پہنچ جاتے۔ ڈنڈا ہاتھ میں ہوتا اور سیاہ عینک چہرہ پر۔ رفتار تیز نہ ہوتی۔ سکون سے چلتے
میں کالج جانے کے لئے لوہاری دروازہ سے نکلتا اور باغ میں ہو جاتا۔ متعدد بار ایسا ہوتا کہ مولانا
جا رہے ہوتے اور میں بھی ہمراہ ہو جاتا۔ جب میں نے بی۔ اے میں داخلہ لیا تو ایک مدت بیماری سے نجات تو حاصل ہو گئی لیکن
صحت کا حال اچھا نہ تھا۔ مولانا مجھ دیکھتے تو ضرور میری صحت کے متعلق استفسار فرماتے۔ پھر احادیث کی روشنی
میں مجھ حوصلہ دیتے کہ یہ بیماری کفارہ گناہ ہو جاتی ہے۔ نیک انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

گرمی کے موسم میں گھر سے کالج دوسری سواریوں کے ہمراہ تانگہ میں بھی سوار ہو کر کالج جاتے تھے۔ ایک
دو بار میں بھی اسی تانگے میں شریک ہو گیا اور کیلیوں والی سڑک (برانڈرتھ روڈ کا پہلا نام) پر ہم اترتے۔ تو
میں نے ہی مولانا کے سواری کے پیسے ادا کر دئیے۔ جب آپ کو پتہ چلا تو ناراض ہوئے۔ فرمانے لگے ہمارا حق ہے تمہارے پیسے
ادا کریں۔ ایک بار یوں ہوا، کہ تانگہ میں آ رہے تھے۔ سواریاں پوری تھیں (اس زمانہ میں ۴ سواریوں کا دستور تھا)
لوہاری کے اڈا پر میں جب بیٹھنے کے لئے آگے بڑھا تو کوچوان سے فرمایا، اسکو مت بٹھاؤ۔ یہ گستاخی کرتا ہے۔ مطلب
یہ کہ میرا کرایہ یہ ادا کرتا ہے ....

ایک دفعہ ہم مولانا صاحب کی کلاس میں پڑھ رہے تھے کہ پرنسپل صاحب (ہیری مارٹن) داخل ہوئے۔
ان کے ساتھ ایک اور انگریز بھی تھا۔ پرنسپل صاحب نے اپنے ساتھی کا تعارف مولانا سے کروایا۔ یہ مارگولیتھ تھا۔ فرمایا:
"مشہور مستشرق" (Orientalist) خوب یاد ہے کہ مولانا کرسی پر ہی بیٹھے رہے۔ اور یہ یاد نہیں آ رہا
کہ مولانا نے اس سے ہاتھ بھی ملایا کہ نہیں۔ ایک فقرہ اس نے عربی زبان میں بولا جس کا جواب مولانا نے بھی عربی میں ہی دیا

۱۹۲۱ کے زمانہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ان دنوں ہندوستان میں ترک موالات
کی تحریک بہت زوروں پر تھی (Non-co-operation Movement)۔ انگریز حکومت کے خلاف نفرت
کا جذبہ ہندو، مسلم ...... دونوں قوموں کے دلوں میں موجزن تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل
مسٹر ہیری مارٹن نے C&MG میں ایک چٹھی شائع کروادی جو اس تحریک کے خلاف مضمون پر حاوی تھی۔ اس چٹھی
نے اسلامیہ کالج کے طلبا کو مشتعل کر دیا۔ کالج میں Strike ہو گئی اور ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا اور نعرے لگائے
گئے "پرنسپل کو نکال دو" تا آنکہ شیخ فضل حسین بار ایٹ لا (جو بعد میں سر فضل حسین ہوئے) اور جو ان دنوں کالج
کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ آئے اور مسٹر ہیری مارٹن کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ مسٹر مارٹن کو کمرہ میں بند کر دیا گیا تھا۔
مسٹر مارٹن اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل بنا دئیے گئے۔ لیکن اسلامیہ کالج لاہور ایک قابل،

محنتی اور ہمدرد پرنسپل کی خدمات سے محروم ہو گیا۔ بعد میں یہی مسٹر مارٹن علیگڑھ یونیورسٹی کے Pro. V.C. مقرر ہو گئے
ان ہی دنوں مولوی حاکم علی صاحب کالج کے وائس پرنسپل تھے وہ math کے استاد تھے۔ انہوں نے بہت زور مارا کہ
پرنسپل مارٹن کے خلاف جو تحریک چلی ہے وہ فرو ہو جائے۔ حبیبیہ ہال میں جلسہ بلایا گیا۔ تمام طلبا اکٹھے ہوئے۔ مولوی
حاکم علی صاحب نے تقریر کی جس میں قرآن حکیم کی ایک آیت سے یہ استنباط کرنے کی سعی کی گئی کہ نصرانی، یہودیوں
سے بہتر لوگ ہیں ان میں عبادت گزار بھی ہیں اور زاہد اور راہب بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مولوی حاکم علی صاحب کے یہ الفاظ سن کر مولوی اصغر علی صاحب اٹھے اور فرمایا کہ مولوی حاکم علی صاحب
نے بے محل اور بے ربط یہ آیت استعمال کی ہے اور غلط مفہوم پیش کیا ہے۔

اس شورش کا یہ بھی نتیجہ ہوا کہ مولوی حاکم علی صاحب بھی کالج کی ملازمت سے الگ ہو گئے اور
حکومت نے انہیں D.I. Schools بنا کر منٹگمری بھجوا دیا ....

مولانا روحی ایک بلند پایہ عالم شمار کئے جاتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ عامۃ الناس یا علماؒ کے حلقوں
میں نہایت ادب و احترام سے دیکھے جاتے تھے، بلکہ اولیائے رحمٰن بھی ان کے علم و فضل کے باعث ان کی بہت توقیر کرتے
تھے۔ واقعہ یہ بھی ہے۔ ایک دفعہ اپنی مسجد میں (جو ان کے گھر کے سامنے ہی تھی) عشاؒ کی نماز سے فراغت کے
بعد مولانا نے اپنے چند احباب سے فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ شرقپور شریف جا کر حضرت میاں شیر محمد صاحب کی
زیارت کر آئیں۔

اعلیٰحضرت میاں صاحب اپنے وقت کے غوث تھے یا قطب، یہ تو اللہ کریم ہی جانتا ہے لیکن یہ ضرور
ہے کہ بہت بڑے ولی اللہ تھے .... خدا کا کرنا یہ ہوا کہ آج رات مولانا روحیؒ نے اپنے خیال کا اظہار اپنے
احباب سے فرمایا اور دوسرے ہی روز علی الصبح فجر کی نماز کے بعد حضرت میاں شیر محمد صاحب مولوی صاحب کی مسجد
میں آن وارد ہوئے اور زبان مبارک سے فرمایا، میں کہیا (میں نے اپنے دل میں خیال کیا) ...۔ مولوی صاحب کو
کیوں تکلیف ہو۔ میں خود ہی جا کر مل آتا ہوں۔ (پنجابی زبان میں آپ نے فرمایا تھا" میں کیہا میں آپ ہی جا کے
مل آواں مولوی صاحب نوں کیوں تکلیف دیوئیے) حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ کی خدمت میں
مولانا روحی بھی جاتے رہتے ہیں۔ حضرت قبلہ ان کی بڑی عزت فرماتے اور کچھ مسائل پر بھی گفتگو ہوتی۔

سبحان اللہ و بحمدہٖ۔ کیسا کشف عیاں ہے۔

مولانا روحی صاحب کالج سے فارغ ہونے کے بعد پیدل ہی گھر آتے وہی راستہ لیتے جس سے آتے تھے۔

اکیلے ہی ہوتے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ دو تین شاگرد آپ کے ہمراہ ہو جاتے راستہ باتوں باتوں میں کٹ جاتا تھا۔
ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ چند شاگرد ہمراہ تھے ان میں حافظ برکت علی (مرحوم) (آری پریس لاہور والے) بڑے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ بھی ہمراہ تھے۔ موچی دروازہ کے باغ میں ایک سپیرا منڈلی لگائے بین بجا رہا تھا اور سانپوں کا تماشہ دکھا رہا تھا............ حافظ برکت علی صاحب نے مولانا سے کہا ذرا جی یہ تماشا دیکھتے ہیں آپ ان کی دلجوئی کی خاطر رک گئے اور سانپوں والے نے اپنی بین پر نغمہ دیا پھر ایک اور سانپ اپنی پٹھری سے نکالا..... وہ اسے لے کر مجمع میں گھوم رہا تھا اور لوگوں کو دکھا رہا تھا۔ جب طلبا اور مولانا کے قریب سے گزر رہا تھا تو مولانا نے پوچھا "یہ کس نوع کا ہے" سپیرے کو نوع کا کیا پتہ..........

مولوی محمد بخش مُسلم ایم۔اے

خطیب مسجد مینار والی۔ لاہور

علامہ روحی رح کی زیارت ہلالِ عید کو ہر کوئی دیکھتا ہے، عالم فلکیات و ہیئت دان کے دیکھنے اور عامی کے دیکھنے میں تفاوت ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جوہر را جوہری می شناسد، و ولی را ولی می داند، عالم کی پہچان عالم کر سکتا ہے مگر اس کے فیضان سے عالم بہرہ ور ہوتا ہے، صائب نے کھری بات کی ہے

؎ صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

اسلامیہ کالج لاہور کے مرحوم و مغفور پروفیسر علامہ و فہامہ حضرت مولانا اصغر علی روحی نور اللہ مرقدہ کی نسبت معروف و مسلم اساتذہ، علماؒ و فضلاؒ کا تصور یہ ہے کہ آپ جامع الصفات مردِ مومن تھے۔ علم و فضل کے پیکر تھے۔ فارسی و عربی کے فقید النظیر ادیب، لبیب اور لاجواب شاعر تھے۔ آپ کا تخلص روحی تھا۔ آپ کا کلام روح پرور تھا۔ آپ منقول و معقول علوم و فنون کے یکتا فاضل تھے، مفسر تھے، محدث تھے، فقیہ تھے، متکلم تھے، ولی تھے، عارف تھے۔ منطق، علم بیان، ریاضی، فقہ، تصوف اور علم کلام میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔

میں ہیچ میرز اور ہیچ مداں شخص ہوں، میں نے بھی ان کی زیارت کی ہے، ان کے مواعظ سنے ہیں، ان کے اشعار پڑھے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے انہیں اسی طرح دیکھا ہے جیسے ایک ہیئت ناآشنا عامی انسان ہلالِ عید کو دیکھتا ہے، میری سعادت یہ ہے کہ میں نے انہیں اکثر دیکھا، دور سے دیکھا، نزدیک سے دیکھا۔

میرے تاثرات

میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۱۳ء میں لاہور، موچی دروازہ، کوچہ تیرگراں کی ایک مسجد میں انہیں دیکھا۔ انہوں نے طلباء، علماء، عوام سے خطاب فرمایا۔ ان کی تقریر غایت درجے کی دل پسند تھی۔ ان کا بیان عالمانہ اور ناصحانہ تھا۔ ان کی صورت، سیرت اور فضیلت نے میرے دل پر، میرے ذہن پر، روح پر ایسا ہی اثر کیا جیسے مقناطیس کا اثر لوہے پر ہوتا ہے۔ میں نے لاہور، وزیر آباد، گجرات و دیگر متعدد مقامات پر ان کے بیانات و ارشادات سے کسب فیض کیا، مومنانہ حق گوئی آپ کا شیوہ تھا، خوف، محض لفاظی، بزدلی اور سخن سازی سے آپ کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ آپ کا ہر فقرہ برہان اور تعقل کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ آیات قرآن مجید، ارشادات رسول حمید، فقہ حنفیہ، اقوال اولیاء کی تشریحات، نکات نحوی بیان کرنا ان کی خو تھی۔ وہ اپنے مسلک کی تائید بڑے مدلل پیرائے میں فرماتے تھے۔ لگی لپٹی آپ کا شیوہ نہ تھا۔ کھری کہتے تھے اور بے جھجک کہتے تھے۔ ایک سلیم الطبع، مجسمِ علم و سادہ دل انسان کی مانند آپ کے مزاج میں ایچ پیچ نہیں تھا۔ نفاق سے چڑتے تھے، خلافِ اسلام وضع قطع کو سخت مکروہ تصور فرماتے تھے۔ طالب علموں کو مارنے کے لئے ڈنڈا بھی اٹھا لیتے تھے، آئینے کی طرح صاف دل تھے، دوسروں کو بھی فوراً صاف دل تصور کرتے تھے، گستاخ، شوخ اور بے ادب کو ان کی ڈانٹ ڈپٹ راہِ راست پر لے آتی تھی۔ تصنع اور ریا سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا، اپنی تعریف سننا انہیں گوارا نہ تھا، بڑے ارادت کیش درویش تھے۔ ان کے استغنا کی کوئی حد نہ تھی۔ اعلیٰ مناصب نے ان کی جستجو کی، دولت نے ان کے دامن کو چھونے کی آرزو کی، مگر انہوں نے اسلامیہ کالج کی پروفیسری کو ترک نہ کیا، اور فقر سے قطع تعلق نہ کیا، قناعت کی عادت گور تک ان کے ساتھ گئی۔

"نفس موٹا ہوتا ہے"

میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جریدہ 'حمایت اسلام' کا مدیر تھا۔ انجمن کے دفتر سے باہر ایک انگریز کو دیکھا، اس کا نام تھا

زویمر، بڑا متعصب پادری تھا، مصر میں مقیم تھا۔ اسے اپنی عربی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ مولانا سے ملاقات کا خواہاں تھا۔ قبلہ برآمدہ میں بیٹھے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے، بتایا گیا، زویمر آپ سے گفت و شنید چاہتا ہے۔ برہم ہوئے۔ فرمایا: وہ اخبث ہے، خناس ہے، اسلام کا اشد دشمن ہے۔ ہم اسے دیکھنا نہیں چاہتے۔ بحد اصرار بے تو اس کو لے آؤ، کرسی بچھا دو، آیا۔ فرمایا، آپ عربی نثر میں بات کریں۔ ہم اس کا جواب منظوم دیں گے۔ وہ حیران ہو گیا۔ اس کے کہنے سے لحن کے قواعد و ضوابط کا عربی ترجمہ مولانا نے اس کے لئے کیا۔ اس نے کہا، قابل مبارکباد ہے وہ ادارہ جس سے ایسا بے بدل عالم و ادیب منسلک ہے اور مستحق تہنیت ہیں وہ طلبا جو اس چشمۂ حکمت سے فیض یاب ہوتے ہیں، فرمایا: ایسی باتوں کا تذکرہ میرے سامنے نہ کرو۔ ان کے سننے سے نفس موٹا ہوتا ہے اسلام تزکیۂ نفس کی تعلیم دیتا ہے۔ تکبر شعار ابلیس ہے، آدمیت عجز و فروتنی ہے۔

عرض کی گئی، آپ اپنا فارسی و عربی کلام کا دیوان چھپوا دیں۔ آپ اس پر آمادہ نہ ہوئے کہ لوگ تعریف کریں گے اور آپ کی درویشی اس سے بیزار تھی۔

استاد کا ادب

آپ گجرات جا رہے تھے، میں بھی اسی ٹرین میں تھا۔ جب کھٹرا کا اسٹیشن آیا، آپ نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ فرطِ ادب سے جھک گئے، سوال کرنے پر فرمایا۔ یہاں کے قبرستان میں ہمارے استادِ محترم کا مزار ہے۔ استاد کے ادب پر احادیث پڑھیں، صحابہ کے ارشادات سنائے

دینی غیرت

گجرات میں زمیندارہ مدرسہ کا جلسہ تھا۔ ایک اجلاس کھلے احاطے میں ہوا۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا، سب مذہبی پیشوا، خواہ ان کا تعلق کسی مت یا دھرم سے ہو، مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ہندو بھائیوں کے کرشن سے افضل و برتر ہیں۔ ہندو حاضرین نے اس پر تالیاں بجائیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ صدر صاحب کی اجازت سے میں نے مقرر کا رد کیا۔ اس پر سب سے زیادہ شاد کام مولانا روحی ہوئے۔ کھڑے ہو گئے، فرمایا: اس نوجوان نے میری روح کو زندہ کر دیا ہے۔ ہمیں دینی غیرت سے کام لینا چاہیے ...... ان کی اس ذرہ نوازی نے میرے حوصلے کو بلند کر دیا۔ میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل میں بھاٹی دروازہ کی مسجد جنڈی وڈہ میں جوان کے معرفت کدہ سے متصل تھی۔ آپ کے درسِ قرآن کے فیض سے بہرہ ور

ہونا شروع کردیا۔ تحسین ناشناسی کا اندیشہ یہ لکھنے کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ کا درس کیا تھا؟

اسلام سے محبت میں ان دنوں جریدہ 'سیاست' کا ایڈیٹر تھا۔ درس کے بعد مجھ فرماتے۔ تازہ خبر کیا ہے؟ ممالکِ اسلامیہ کا حال کیا ہے؟ سیاستِ اسلامی کا رُخ کدھر ہے۔ ایک دن عرض کیا۔ حضور ترکوں نے "اڈریانوپل" دوبارہ فتح کر لیا ہے۔ آپ سر پر صافہ کے بغیر اور برہنہ پا مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔ کافی مقدار میں مٹھائی خرید کر لائے اور یہ شیرینی حاضرین میں تقسیم کر دی۔
موچی دروازہ کے باہر جلسہ ہوا، قرار پایا کہ ایران کے لئے چندہ کرنا چاہیئے، آپ نے اپنا کوٹ اتار کر دے دیا اور فرمایا۔ اس میں جو رقم ہے، وہ بھی اور یہ کوٹ بھی اسی مد میں داخل کر دیا جائے۔

رحمدلی، مہربانی غربا، مساکین، نادار طلبا، خویش و اقربا اور ہمسائیوں کے معاملے میں نہایت شفیق، رحمدل، مہربان اور وسیع القلب تھے۔ افطاری سے چند منٹ پیشتر آپ کے گھر سے دودھ کا ایک بڑا برتن آتا۔ آپ آدھے گلاس سے زیادہ نوش نہ فرماتے اور بقایا تمام نمازیوں میں تقسیم فرما دیتے، طلبا کی اس طریق سے مالی اعانت کرنا کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کسی کو کیا دیا ہے۔ آپ کی فیاض کریم النفس کا دستور تھا۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ نیکی پر اترانے اور بھلائی کر کے جتانے سے نیکی برباد ہو جاتی ہے۔

قبلہ شیر ربانی میاں شیر محمدؒ سے محبت مولانا کو حضرت میاں شیرِ ربانی، شیر محمد قدس سرہ العزیز سے والہانہ محبت تھی۔ ایک دفعہ فرمایا، ہمارا ایک شاگرد مخبوط الحواس ہو گیا۔ جھوٹی منطق نے اسے دہریہ بنا دیا۔ ڈر تھا کہ یہ نادان ملحد اپنے ایمان کی متاع کو ضائع کر رہا ہے، دوسروں کے لئے ابلیس نہ بن جائے۔ نگاہ مردِ مومن کا اثر دیکھ کر اسے لے کر میاں صاحبؒ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے تلقین فرمائی: میرے دوست نماز پڑھا کر۔ اثر یہ ہوا کہ وہ پکا نمازی بن گیا اور دوسروں کو خدا پرستی کی موثر انداز میں ہدایت کرنے کے قابل ہو گیا۔ مختصر بات یہ ہے کہ آپ لادینی، بے ادبی، برائی کے مقابلے میں فولاد سے زیادہ سخت، لیکن عبادت، خدمت، اسلامی محبت و عطا کے دائرے میں موم کی طرح نرم۔

سراپا عجز، مجسم جود۔

جس سے دل لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

میں دید و شنید کی بنا پر یہی کہہ سکتا ہوں،

کریم، و عارف و علامہ روحی
فداء قلبی و نفسی و روحی۔

"مسلم"

محمد حسین ملک ایم۔اے
(انسپکٹر آف سکولز (ریٹائرڈ) راولپنڈی)

استاذ المکرم قبلہ مولانا اصغر علی روحی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ عربی اور فارسی علوم و ادبیات کے بحرِ ذخار تھے۔ ان زبانوں کے متداول علوم و فنون کے علاوہ عرب کے دورِ جاہلیت کے شعرائے کرام کا اکثر کلام ازبر تھا۔ موقع و محل کے لحاظ سے ان اشعار کو بے تکلفی سے quote کرتے تھے۔ مولانا کا اپنا عربی اور فارسی کلام اتنا بلند پایہ ہے کہ اس پر اہلِ زبان کے مستند شعراء کے کلام کا شبہ ہوتا ہے۔ مضامین کے تنوّع کے باوجود دونوں زبانوں کے کلام میں اسلام اور روحانیت کا رنگ جھلکتا ہے، جو دراصل مولانا کے تبحّرِ علمی اور پاک عملی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ موجودہ زمانہ اختصاص کا زمانہ ہے۔ اس کے برعکس مشاہیرِ قدما میں بظاہر مختلف علوم و فنون ایک ہی ذات میں مجتمع ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے مولانا کی ذات والاصفات فضلاءِ قدیم سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔

یہ مئی ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے، جب راقم الحروف نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ اس وقت ریواز ہوسٹل بن چکا تھا۔ البتہ کالج کی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ بعض دیگر پروفیسروں کی طرح مولانا بھی عربی اور دینیات کی سینئر کلاسیں ہوسٹل کے سبزہ زار میں لیا کرتے تھے۔ سفید دستار، لمبی سفید عباء، آنکھوں پر سیاہ عینک، کرسی کے دائیں بازو پر ایک مضبوط عصا تھامے ایک پُروقار اور بارعب شخصیت نظر آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا

مصافحے کے بعد نام اور پتہ پوچھا۔ میں نے جواباً "محمد حسین، ضلع گجرات" عرض کیا۔ معاً فرمایا: اچھا تو تم "محمد حسین" ہو۔ اس کے بعد کالج کے چار سالہ قیام کے دوران میں ہمیشہ اسی نام سے پکارا۔ لہجے میں اس قدر خلوص، محبت اور شفقت عیاں ہوتی کہ اس 'عرف' سے پکارے جانے پر ایک ذہنی لطف اور روحانی سرور حاصل ہوتا۔

واضح ہو کہ راقم کو اپنے قیام کالج کے دوران میں کسی مضمون کے کسی ایک سبق کے لئے بھی براہ راست مولانا کی خدمت بابرکت میں زانوئے تلمذ طے کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وجہ یہ کہ راقم کے مضامین، ریاضی، سائنس وغیرہ تھے، جبکہ مولانا کالج کی اعلیٰ جماعتوں کو عربی اور دینیات کا درس دیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مولانا کی ذات اپنی عظمت اور تقدس کے لحاظ سے کالج کے تمام ماحول پر کچھ اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ فرسٹ ایر کے نئے داخل ہونے والے طلبا سے لے کر ایم۔اے تک کے طلباء مولانا کی نگاہِ شفقت سے مستفید ہونے کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے تھے۔

اس زمانے میں ہر اتوار کو صبح کالج کھلتے ہی حبیبیہ ہال میں تمام پروفیسر صاحبان اور طلباء ایک جلسے میں اکٹھے ہوتے تھے، جسے پرنسپل کے علاوہ بالخصوص کالج کے عربی، فارسی اور دینیات کے پروفیسر صاحبان اسلامی، اخلاقی مضامین پر خطاب کیا کرتے تھے۔ مولانا کے خطاب کے دن ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوتا اور شاید ہی کوئی طالب علم ہوتا جو وقت مقررہ سے پہلے ہال میں اپنی نشست محفوظ کر لینے کی کوشش نہ کرتا۔ وجہ یہ تھی کہ بعض دیگر مقررین کے برعکس مولانا کا خطاب اس قدر سائنٹیفک، مدلل اور مبنی بر حقائق ہوتا کہ سامعین میں سے ہر شخص اپنے دل ہی دل میں یہ شعر گنگنانے پر مجبور ہوتا۔

؎ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۱۴ء میں کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی راقم کا رابطہ کم و بیش مولانا سے قائم رہا۔ بالخصوص زمیندار ہائی سکول گجرات کی ہیڈ ماسٹری کے زمانہ میں ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک مولانا کے وطن مالوف کنجاہ میں مولانا کے پند و نصائح سے مستفید ہونے کا موقع میسر آتا رہا۔ مولانا کا معمول تھا کہ اگر جمعہ کی تعطیل کے روز لاہور میں کوئی خاص مصروفیت نہ ہوتی تو وہ کنجاہ میں تشریف لے جاتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب راقم گورنمنٹ ہائی اینڈ نارمل سکولز میانوالی میں بطور پرنسپل کام کر رہا تھا۔ وہاں کی انجمن اسلامیہ نے شیخ صدیق اکبر پی۔سی۔ایس سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل

(جو مولانا کے قدیم ترین شاگردوں میں سے تھے) اور راقم کے اصرار پر مولانا کو جلسۂ سیرت کے سلسلے میں مدعو کیا۔ یہ جلسہ میانوالی کی مشہور عیدگاہ کے وسیع سبزہ زار میں جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے واقع ہے، منعقد ہوا۔ مولانا کی تقریر سننے کے لئے شہر اور مضافات کے مسلمانوں کے علاوہ میانوالی بار ایسوسی ایشن کے چند ہندو وکلا بھی موجود تھے۔ جنہوں نے مولانا کی تقریر کو بے حد سراہا۔

مولانا انجمن حمایت اسلام لاہور کی مالی امداد کے لئے بھی ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ جو بالواسطہ کالج کی امداد تھی۔ ایک ایسے موقع پر راقم مولانا کے مکان واقع بھاٹی دروازہ میں موجود تھا کہ انجمن کے اس وقت کے صدر سید محسن شاہ صاحب ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور، جنرل سیکرٹری انجمن کے ہمراہ تشریف لائے۔ مولانا نے چائے کی تواضع کے بعد اندرون بھاٹی دروازہ کی ایک مخیّر بیوہ کی وصیت کے مطابق اس کے زیورات اور کچھ نقدی جن کی مجموعی مالیت کئی ہزار روپے تھی۔ عہدہ داران انجمن کی خدمت میں پیش کر دئیے۔ جسے انہوں نے بصد شکریہ قبول کیا۔

مجھے یاد ہے کہ کالج کے بعض طلباء مولانا سے استفسار کرتے کہ مولانا خود تو اسلامیہ کالج کے علاء اساتذہ کے معزز رکن ہیں مگر اپنے لڑکے فضل حق کو سنٹرل ماڈل سکول اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم دلوا رہے ہیں۔ مولانا جواب میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ دونوں پرانی درسگاہیں ان کی رہائش کے بالکل قریب ہیں اور حکومت کی براہ راست سرپرستی کے باعث اکثر پرائیویٹ درسگاہوں کے مقابلے میں دنیوی تعلیم میں فوقیت رکھتی ہیں۔ جہاں تک مذہبی تعلیم کا تعلق ہے جو گورنمنٹ کالج کے مقابلے میں اسلامیہ کالج کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسکی کمی مولانا گھر پر باحسن وجوہ پوری کر دیتے ہیں۔

مولانا اپنے وسیع اثر و رسوخ کی بنا پر کالج کے پرانے طلباء کے مسائل حل کرنے اور انہیں ملازمت وغیرہ دلوانے میں مدد کر کے بے حد خوشی محسوس کرتے تھے۔ راقم کے ایک سکول فیلو ڈاکٹر چوہدری فیض الحسن محمد۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کے سرکاری ہسپتال میں میڈیکل افسر تھے۔ انہوں نے بوجوہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر اپنے وطن شہر گجرات میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ مگر ہندو ڈاکٹروں کے مقابلے میں ان کی پریکٹس نہ چمک سکی۔ مولانا کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو زمیندارہ ہائی سکول میں ہائی جین فزیالوجی کی تعلیم کے لئے جز وقتی مدرس لگوا دیا۔ مجھے علم ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ارباب حل و عقد نے مولانا کی علمی اور تدریسی شہرت کی بنا پر ایک سے زیادہ

مرتبہ اورینٹل کالج لاہور کی عربی پروفیسری کی پیش کش کی۔ بعد میں مولانا عبداللہ ٹونکی سینئر پروفیسر عربی اورینٹل
کالج کے انتقال پر مولانا کو پرنسپل کے بعد اس سب سے زیادہ سینئر اسامی پر کام کرنے کی پیش کش کی گئی تو مولانا
نے ہمیشہ کی طرح قومی کالج کی ملازمت کو یونیورسٹی یا گورنمنٹ کی ملازمت پر ترجیح دی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے۔ مولانا نے کسی روحانی پیشوا سے بیعت نہیں کی۔ اگرچہ ہمیشہ
کسی مرد کامل کی تلاش میں رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد گاہے گاہے حضرت میاں شیر محمد" کی خدمت
میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ میاں صاحب بھی مولانا سے خاص تکریم و تعظیم سے پیش آتے تھے۔

"روحوں کو ملانے والے" فقرہ کی تشریح یوں ہے کہ میری شادی قبلہ مولانا کے توسط
سے بکی دروازہ لاہور کے ایک بزرگ حاجی محمد شریف صاحب کے ہاں ہوئی۔ جو مشہد (ایران) کے برٹش کونسل خانہ میں
اٹیچی تھے۔ اور مولانا کے خاص شاگردوں کی صفِ اول میں شمار ہوتے تھے۔ اس سے قبل حاجی صاحب مرحوم کی بڑی
صاحبزادی کا نکاح بھی مولانا ہی کی معرفت طے ہوا تھا۔ یہ صاحب راجہ فیروز الدین مرحوم تیمر کالج فیلو
تھے۔ جب ۱۹۱۰ء میں مسٹر عبدالعزیز۔ ایم۔ اے کینٹب پرنسپل کے خلاف طلباء نے کالج گیر ہڑتال کی تھی
راجہ صاحب موصوف نے احتجاج کے طور پر ریواز ہوسٹل کی دوسری منزل کی چھت سے چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا
تو صرف مولانا کے سمجھانے بجھانے پر وہ اس اقدام (خودکشی) سے باز آئے۔ خیال اغلب ہے کہ راجہ صاحب اور
میرے علاوہ بعض دیگر خاندانوں کو بھی مولانا ہی کے ذریعے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا موقعہ ملا ہوگا
اس لئے ہمارے اہل خانہ مولانا کو تفننِ طبع کے طور پر " روحوں کو ملانے والے " (روحا) کے لقب سے یاد کیا
کرتے تھے

آخر میں ایک ایسے دردناک واقعہ کی طرف اشارہ کرنے پر مجبور ہوں جس کے محض تخیل
سے ہم باوجود امتدادِ زمانہ اب بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ وہ یہ کہ وصال سے کچھ عرصہ پہلے مولانا کا
حافظہ جو کبھی زمانہ میں بے مثل (بمحلہ) رہتی، بہت حد تک جواب دے چکا تھا۔ میرا معمول تھا کہ جب کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہوتا
مولانا کے نیاز حاصل کرنے کی ضرور کوشش کرتا۔ بالعموم عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ان کی معیت میں
گھر کی بیٹھک یا مسجد میں گزارا کرتا۔ یادداشت کی کمزوری کے بعد جب پہلی مرتبہ حاضر ہوا۔ مولانا مسجد
میں تھے۔ عصر کی نماز کے بعد سلام کیا۔ کالج کے زمانہ اور مابعد کی نیاز مندی کے حوالے دیئے مگر مولانا میری طرف اور
میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ اور انہیں کوئی واقعہ بھی یاد نہ آیا ...... ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ

ضعیف العمری میں جب قوائے جسمانی اور ذہنی آہستہ آہستہ مضمحل ہو جاتے ہیں تو سب سے پہلے زمانۂ قریب کے واقعات حافظہ سے مٹنے شروع ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ الٹے قدم رواں دواں قریباً تین سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ واقعات جتنے پرانے ہونگے اتنی ہی دیر سے وہ حافظہ سے محو ہونگے۔ اس حالتِ بے چارگی کو دیکھ کر اس قدر شدید صدمہ ہوا کہ باوجود زبردست تمنا کے اس کے بعد پھر مولانا کی خدمت میں حاضری دینے کی جرأت نہ کر سکا۔ وفات کے بعد ایک دو مرتبہ مزارِ مبارک پر جو گجرات وزیر آباد جرنیلی سڑک کے بائیں ہاتھ پر کھٹالہ گاؤں سے باہر واقع ہے۔ فاتحہ خوانی کی سعادت نصیب ہوئی۔ مولانا فی الواقع ایک عظیم استاد اور عظیم انسان تھے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محمد حسین (ملک)

میجر (ریٹائرڈ) ملک محمد خان

(۴۳۔ ڈی، ماڈل ٹاؤن لاہور)

حضرت مولانا اصغر علی روحی رح

میں نے جون ۱۹۲۵ء کو میٹرک پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں فسٹ ائیر میں داخلہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کالج میں بلند مرتبہ اساتذہ شامل تھے۔ پرنسپل علامہ عبداللہ یوسف علی۔ شیخ عبد الغنی، خواجہ دل محمد، سید عبد القادر، حافظ محمود شیرانی، مولانا اصغر علی روحی، سراج الدین آذر، محمد الدین تاثیر، سردار یو کرامت۔

مندرجہ بالا سب اصحاب اپنے مضامین میں یکتائے زمانہ تھے۔ لیکن ان میں سے مولانا اصغر علی روحی کا رتبہ سب سے بلند تھا۔ ایک تو وہ عالم دین کے علاوہ زہد تقویٰ کے مجسّمہ تھے۔ پھر ان کا شاگردوں سے خلوص سب سے بالا تھا۔ حالانکہ نہ صرف آج کے طلبا بلکہ آج سے پچاس سال پہلے

کے طلبا اپنے پروفیسروں کا مذاق اڑاتے اور کلاس روم میں طرح طرح کی شرارتیں کرتے تھے اور ذہین طلبا جو علم حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے تھے، ان کو بھی پڑھائی کی طرف توجہ مبذول نہ کرنے دیتے اور خاص کر دینیات یعنی اسلامیات کے پیریڈ کو تو وہ ایک پیریڈ سمجھتے تھے کیونکہ یہ مضمون لازمی نہ تھا۔ صرف اسی کالج میں پڑھایا جاتا تھا۔ ہمیں سال اول میں تو مولوی احمد علی صاحب دینیات پڑھاتے تھے اور دوسرے طلبا کی طرح ہم بھی کوئی توجہ نہ دیتے اور مولوی صاحب کے واعظ کی طرف کم ہی توجہ دیتے اور گپوں میں وقت گزار دیتے لیکن جب ہم سیکنڈ ایر میں پہنچے تو دینیات پڑھانے کے لئے مولانا روحی مقرر ہوئے۔ پہلے چند روز طلبا نے یہی سمجھا کہ جس طرح مولوی احمد علی صاحب کے پیریڈ کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ شاید یہ نئے مولانا بھی ویسے ہوں۔ لیکن دو ہی روز میں ہمیں پتہ چل گیا کہ ان کا دبدبہ ان کی علمی فضیلت اور پڑھانے کا طریقہ ہی منفرد ہے۔ معمولی سے مسئلہ کو نہایت سادگی سے اس طرح بیان کرتے کہ یہ بات دل میں اتر جاتی۔ اس کے علاوہ مولانا میں بڑی خاصیت یہ تھی کہ بڑے پیار اور محبت سے طلبا کو سمجھاتے۔ ان کا اخلاق اور خلوص اخلاق محمدی کا بہترین نمونہ تھا۔

میں نے چونکہ ایک کٹر ہندو سکول آریہ سماج سے میٹرک پاس کیا تھا۔ جہاں ہر وقت اسلام کے خلاف زہر اگلا جاتا تھا۔ ان کی بکواس سنتے سنتے کان پک گئے تھے، لہٰذا کئی دفعہ پیریڈ کے بعد خدمت میں حاضر ہو کر ہندوؤں کی اسلام دشمنی کی بابت عرض کرتا تو مجھے نزدیک بٹھا کر بڑے پیار سے مسائل پر روشنی ڈالتے اور جب تک تسلی نہ ہوتی۔ تب تک وعظ جاری رکھتے۔

انہیں دنوں علامہ عبداللہ یوسف علی القرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کر رہا تھا۔ عربی زبان کے محاوروں، تشبیہات کے متعلق جب علامہ کو کوئی الجھن پیدا ہوتی۔ تو گھنٹوں مولانا سے تبادلہ خیال ہوتا۔ اگرچہ ترجمہ علامہ نے اپنے خیالات اور اپنی سمجھ کے مطابق کیا، لیکن علامہ عبداللہ یوسف علی مولانا کی علمیت اور عربی زبان پر ان کے عبور کا قائل ہو گیا تھا۔ کالج کے باقی سب سٹاف سے زیادہ وہ مولانا کی عزت اور احترام کرتا تھا۔

علامہ یوسف علی کی لاہور میں آمد سے پہلے پنجاب یونیورسٹی میں ہندوؤں کا یونیورسٹی میں Department پر پورا تسلط تھا۔ ایم۔اے کی عربی کلاسز صرف پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں رائج تھیں۔ یونیورسٹی میں عربی، ایک انگریز پروفیسر پڑھایا کرتا تھا۔ اسی طرح

یونیورسٹی میں فارسی، ایک ہندو، دیال سنگھ کالج کا پروفیسر مترا پڑھایا کرتا تھا۔ سنڈیکیٹ اور سینیٹ میں مسلمان پروفیسر برائے نام تھے۔ جونہی علامہ یوسف علی نے اسلامیہ کالج کی پرنسپلی سنبھالی، یونیورسٹی میں ہندوؤں کا تسلط کم ہونا شروع ہؤا۔ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی علامہ سے خم کھاتا تھا۔ اور اس وقت کا گورنر لارڈ ھیلی، چند سال پہلے یو۔پی میں علامہ یوسف علی کے ماتحت رہ چکا تھا۔ لہٰذا علامہ یوسف علی پرانا، آئی۔سی۔ایس تھا اور الٰہ آباد میں بہ عہدہ کمشنر تعینات تھا، تو گورنر یو۔پی سے علامہ کا اختلاف ہو گیا۔ تب علامہ نے اتنے بڑے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا تھا اور پروفیسر کی لائن اختیار کر لی تھی۔ ہندو پروفیسروں کے خلاف علامہ یوسف علی نے گورنر سے بات چیت کی اور علامہ نے گورنر کے ذریعہ وائس چانسلر پر دباؤ ڈلوایا کہ سنڈیکیٹ اور سینیٹ میں مسلمانوں کو جائز نمائندگی دی جائے۔

پنجاب یونیورسٹی میں پہلی بار، یونیورسٹی کی ایم۔اے کلاسز کو انگریزی سے اردو میں پڑھانے کی اجازت دی گئی۔ اور علامہ یوسف علی نے اپنے کالج کے دو پروفیسروں، مولانا روحی صاحب کو یونیورسٹی پروفیسر مقرر کر دیا ١٩٢٦ء سے لے کر جب تک مولانا اسلامیہ کالج میں رہے، یونیورسٹی کی ایم۔اے کلاسز کو عربی اُردو میں پڑھاتے رہے یہ واحد مثال تھی کہ ایم۔اے کلاسز کو بجائے انگریزی کے اردو میں پڑھانے کی اجازت ملی۔ مولانا کے علاوہ علامہ یوسف علی نے یونیورسٹی کی فارسی کی کلاسز کو پڑھانے کے لئے بجائے ھندو پروفیسر مترا کے حافظ محمود شیرانی کو تعینات کر دیا۔

مولانا موصوف کا حُلیہ قد درمیانہ، چہرہ کی رنگت گندمی، گھنی سیاہ ریش، سادہ عینک، سر پر دستارِ فضیلت سفید رنگ کی، سفید رنگ کا عربی جبہ، سفید شلوار اور پاؤں میں دیسی جوتی، عام گفتگو کا لہجہ نرم اور دھیما ہے، مگر جب واعظ فرماتے تو آواز بلند ہو جاتی۔ آپ کو کبھی غصہ میں نہیں دیکھا، ہمیشہ سنجیدگی اور متانت سے گفتگو فرماتے، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ نے کئی نامور طلبا پیدا کئے۔

سب سے اہم چودھری رحمت علی، جس نے نہ صرف پاکستان کا لفظ تخلیق کیا بلکہ ١٩٣١ میں، انگلینڈ میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس کے موقع پر ھندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک انگریزی پمفلٹ Now or Never شائع کر کے لیڈروں کو پاکستان کے مطالبہ پر متفق کیا، چودھری رحمت علی کا یہ ایسا

کارنامہ تھا جو دوسرا کوئی مسلمان لیڈر نہ کر سکا۔ چودھری رحمت علی ۱۹۱۴ء میں اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ تعلیمی زندگی کے دوران چودھری رحمت علی سب سے زیادہ مولانا موصوف سے متاثر تھا اور ان کا از حد احترام کرتا تھا۔ چودھری رحمت علی میرے ماموں صاحب کا دوست تھا۔ لہٰذا جب ۱۹۲۵ء میں، میں کالج میں داخل ہوا تو چودھری صاحب میرے گارڈین رہے۔ اکثر مجھے دیکھنے کالج آیا کرتے تو سب سے پہلے وہ مولانا موصوف کی زیارت کرتے اور ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے کہ ساری زندگی میں انہوں نے مولانا جیسا کوئی استاد نہیں دیکھا۔ چودھری رحمت علی مولانا کو مرشد سمجھتے تھے اور ہمیشہ ان سے دعائے خیر کے لئے کہتے۔ ۱۹۳۰ء میں جب چودھری رحمت علی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ جانے لگے تو روانگی سے پہلے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی۔

عربی کے علاوہ مولانا ہفتہ میں چار پیریڈ میں مختلف کلاسز کو دینیات پڑھاتے۔ ان کے لیکچر یعنی واعظ کا اتنا دلکش طریقہ تھا کہ تمام کلاس بڑی خاموشی سے سننے پر مجبور ہو جاتی۔

میجر ملک محمد خان

مولوی محمد شفیع مرحوم

(پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور)

میں نے جب ۱۹۰۰ء کی ابتدا میں اسلامیہ کالج میں الف۔ اے میں داخلہ لیا تو پہلی بار مولانا اصغر علی روحیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چونکہ والد مولوی وہاب الدین کی مولانا سے پہلے سے واقفیت تھی۔ انہوں نے مولانا صاحب سے میرا تعارف کرا دیا۔ بعد میں مولانا نے والد صاحب کی وجہ سے میری طرف خاص توجہ رکھی، مولانا الف۔ اے کو نہیں پڑھاتے تھے بلکہ بی۔ اے کی کلاسیں ان سے زیر تعلیم تھیں۔ الف۔ اے والوں کو پڑھانے کا کام مولوی احمد علی مرحوم کے ذمے تھا جو ضلع بٹالہ کے تھے اور شاہی مسجد کے خطیب تھے۔ وہ صرف کورس تک محدود رہتے اور امتحانی نقطۂ نگاہ سے پڑھاتے تھے۔ جب کبھی مجھ کسی چیز کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تو میں کلاس سے اٹھ کر مولانا روحی کے پاس چلا جاتا۔ مولوی احمد علی صاحب مجھ کلاس سے اٹھ کر جانے سے روکتے تھے۔ اس وقت کالج آج کل کے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ کی عمارت کی بالائی منزل کے مشرقی ونگ میں تھا۔ سائنس کی کلاسیں

نیچے لگی تھیں۔ نیچے صحن میں ہفتہ وار وعظ ہوتا تھا۔ اس وقت ہم مولانا روحی سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے وعظ کو نہایت دلچسپی سے سنا جاتا تھا۔

میں مولانا کے گھر بھی آتا جاتا تھا۔ وہ مجھ پر بہت شفقت کرتے تھے۔ اس وقت وہ حویلی کابلی مل میں کرایہ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ کسی مسجد کے قریب مکان میں رہتے تھے اور فرمایا کرتے: "لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد"۔ وہ نماز ضرور مسجد ہی میں پڑھتے تھے۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا اور مولانا اس کی دوسری منزل میں رہتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں میز کرسی لگا کر بیٹھتے تھے۔ میں ان سے کہا کرتا کہ تھوڑی بہت سیر کیا کریں کیونکہ قرآن مجید میں "سیروا فی الارض" آیا ہے۔ وہ ظرافت کے پیرایہ میں فرماتے کہ آفاق و انفس میں سے میں ابھی انفس سے ہی فارغ نہیں ہوا۔ انہیں کبھی سیر کے طور پر گھر سے باہر نکلتے نہ دیکھا۔ صرف کالج سے گھر اور گھر سے کالج آتے جاتے تھے۔

کئی بار سکول اور کالج کی باتوں کے علاوہ شعر و شاعری کا ذکر بھی ہوتا۔ وہ نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے اور شعر کو خوب سمجھتے تھے۔ مجھے بھی شعر گوئی کا شوق تھا۔ میں اپنے شعر لے جاتا اور وہ خوب توجہ فرماتے اور اسکی اصلاح کر دیتے۔ عبارت کا جھول اور معانی کا نقص خوب بتاتے۔ جب بھی جاؤ، ان کا دروازہ کھلا تھا۔ کبھی بے فرصتی کا عذر نہ کرتے تھے اور کوئی طالب علم چلا جائے وہ خوش آمدید کہتے تھے۔ لیکن ایسے طالب علم کم تھے جو ایسی چیزوں سے دلچسپی رکھتے ہوں۔

ان کا وعظ اتنا دلکش اور دل پر اثر کرنے والا ہوتا کہ قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری مصنف کتاب "مہر نبوت" کا لڑکا قاضی عبدالعزیز ایف اے میں فیل ہو گیا تو صرف مولانا کا وعظ سننے کے لئے وہ ایف اے میں پھر دوبارہ داخل ہو گیا۔ مولانا کو نیچریت اور میرزائیت سے سخت بیر تھا۔ میرزا نے جب دعویٰ کیا تو مولانا اس کے پیش کردہ الہامات میں غلطیاں نکالتے تھے، مگر میرزا کے چیلنج کو قبول نہ کیا۔ مجھ آزاد خیالی پر ڈانٹتے تھے، مگر اس عمر میں سب طالب علم ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، مولانا بعض وقت صدر ہوتے اور طالب علم ان کی موجودگی میں وعظ کرتے، ایک دفعہ میں نے تقریر کی تو مجھے کہا کہ تم نیچریت کی تبلیغ کرتے ہو۔ ان کی کتاب ما فی الاسلام میں وہی خیالات موجود ہیں، جو اس وقت تھے۔ ان کی اپنی عملی حیثیت بہت بڑی چیز تھی۔ انہوں نے آخر عمر تک سادگی کو نباہا اور ایک ہی لباس رکھا۔ مذاق سے طالب علموں کو ڈنڈا بھی مار دیتے تھے۔ طالب علموں سے بہت ظرافت کرتے اور ان میں مل جل کر رہتے۔ اس لئے وہ بہت ہر دلعزیز تھے۔ لیکن

کسی کو بے تکلفی کی وجہ سے حدِ ادب اور احترام سے سرمو تجاوز کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

ان کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ آپ سے جو لفظ پوچھا جاتا، ڈکشنری منگوا کر پوچھنے والے سے ہی اس لفظ کی تحقیق کراتے۔ اپنی کتب پر وہ بہت حواشی عربی اور فارسی میں لکھتے۔ زیادہ لغت کی کتاب منتہی الارب کا استعمال کرتے۔ میں ان کی کتابوں پر لکھے ہوئے حواشی کو اپنی کتاب پر نقل کرتا۔ اورینٹل کالج لائبریری میں ایسی کئی کتابیں تھیں جن پر ان کے حواشی یا اختلاف درج ہیں۔ بعد میں یہ کتابیں یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ تاریخ اور سائنس سے آپ کو بہت دلچسپی تھی۔ اسی سلسلہ میں ان کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی۔ سر عبد القادر اسلامیہ کالج میں ہمیں انگریزی پڑھاتے اور وہ مولانا کے colleague تھے۔ انجمن کا سالانہ جلسہ ایک بہت بڑی تقریب تھی۔ مولانا کا وہاں مقالہ ضرور ہوتا۔ ثقیل الفاظ کے استعمال کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ایک مقالہ "التفریج والتفرعن" کے موضوع پر تھا۔

باوجود زہد و تقشف کے ظرافت اور شگفتگی زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کی فطرت میں تھی۔ اورینٹل کالج کا ہوسٹل ان دنوں روشنائی دروازہ کے اندر ہی تھا۔ وہاں مولانا کے زمانے کا جو باورچی تھا وہی ۱۹۰۵-۰۶ء میں ٹریننگ کالج کے ہوسٹل میں ہمارا باورچی رہا، جبکہ میں اس کالج میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ایس وی کلاس میں داخل ہوا۔ اس باورچی نے بتایا کہ ماہ رمضان میں مولانا مذاق سے سحری ختم ہونے کے وقت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تو اذان کی آواز نہیں سنی یا کہتے کہ میں نے تو صبح صادق کی روشنی نہیں دیکھی۔

مولانا کو اپنے گاؤں سے بہت دلچسپی تھی اور پنجابی زبان کا بہت شوق تھا۔ مجھے خود بھی اس کا شوق تھا۔ میرے گھر میں ہیر وارث کا ۱۸۸۰ء کا چھپا ہوا Hope Press والا ایڈیشن موجود تھا۔ وہ ہیر وارث کی صحیح روایت تھی۔ اس پر بعد میں دانستہ اضافہ کر کے وڈی ہیر کے نام سے یہ کتاب طبع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء کے قریب اسلامیہ کالج میں ہم نے ایک سوسائٹی بنائی تھی جس میں پنجابی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ گجرات کے علاقہ کا ایک شخص وہاں ہیر سنایا کرتا تھا۔ بعض الفاظ مشکل ہوتے، ہم ان کا مطلب مولانا روحی سے پوچھا کرتے بلکہ ان سے ہم ہیر پڑھا کرتے۔

مولانا روحی کو اپنے استاد مولوی عبد اللہ ٹونکی مرحوم سے سود کے معاملہ میں اختلاف تھا۔ مولوی ٹونکی مرحوم بینک سے سود لیا کرتے اور اسے جائز کہتے تھے لیکن مولانا روحی ہر قسم کے سود کے حرام ہونے کے قائل تھے۔ مولوی عبد اللہ ٹونکی باوجود ان کے استاد ہونے کے ان کا بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے لیکن دونوں کی

آپس میں اس موضوع پر بحث ہوا کرتی تھی

مولانا جہاں جاتے، مجھے ساتھ لے جانے میں انہیں خوشی محسوس ہوتی۔ وہ بانساں والا طویلہ میں
ایک طبیب کے پاس اکثر جاتے اور میں بھی ساتھ ہوتا۔ یہ باتیں قریباً ۱۹۰۴ء سے متعلق ہیں۔ اسی سال میں نے بی اے
پاس کیا اور ایم اے انگریزی مشن کالج سے ۱۹۰۵ء میں کیا۔ اس وقت سنٹرل ماڈل سکول کے ایک ایم اے
انگریزی ٹیچر کو صرف ۳۵ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور کالج میں ایم اے پاس ٹیچر کو ۸۰ روپیہ ملتے تھے اور اسے
Principal Pay (معقول تنخواہ) کہا جاتا تھا۔ میں ایم اے کے بعد شملہ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر
سکولز لگا دیا گیا۔ ۸۰ روپیہ تنخواہ اور ساتھ ۳۰ روپیہ گھوڑا الاؤنس ملتا تھا۔ ایک ماہ میں ۲۰ (بیس) روز
کا دورہ لازمی تھا۔ پھر میری تبدیلی لاہور نارمل سکول میں ہو گئی۔ مجھے ایم اے (عربی) اور عربی میں وظیفہ کا شوق
پیدا ہوا۔ میں نے ۱۹۱۳ء میں پرائیویٹ طور پر ایم اے عربی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور وظیفہ کی درخواست
دی۔ ڈاکٹر صدر الدین مرحوم (گورنمنٹ کالج لاہور والے) نے فیل ہونے کے بعد علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور ایم اے (عربی)
پنجاب سے کیا۔ ہوروڈس علی گڑھ کا پروفیسر تھا۔ اس نے وظیفہ کے لئے صدر الدین کی سفارش کی۔ ان کو وظیفہ مل گیا۔
اس وظیفہ کے لئے انگلستان جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شرط تھا۔ ۱۹۱۴ء میں صدر الدین کو انگلستان جانا تھا لیکن
عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ انہوں نے جانے سے انکار کر دیا اور ستمبر کے مہینہ میں نہ جانے کی اطلاع گورنمنٹ کو دیدی
پھر اسی وظیفہ کے لئے میں نے کوشش کی اور ۱۹۱۵ء میں، میں انگلستان چلا گیا۔

ایم اے (عربی) کے لئے میں خود ہی تیاری کرتا۔ دیوان نابغہ ہمارے کورس میں تھا۔ اسکے بعض
حصے میں نے مولانا روحی سے پڑھے۔ مختصر معانی بھی ہمارے نصاب میں تھی۔ اس کے منطقی بیانات واضح نہ تھے، میں نے مولانا
سے مدد چاہی۔ وہ کثیر العبادت ہونے کی وجہ سے فارغ نہ تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب میں کالج سے جایا کروں تو تم
راستہ میں پڑھ لیا کرو۔ کالج سے بھاٹی دروازہ آنے تک وہ مجھے کافی کچھ بتا دیا کرتے۔ میں عبارت پڑھتا اور وہ ازبر
تقریر کرتے چلے جاتے۔ راستہ میں لوگوں کی آمد و رفت یا تانگہ ٹمٹم وغیرہ کی نقل و حرکت سے انہیں کوئی فرق نہ
پڑتا۔ میری رہائش چوک متی کے راستہ میں تھی

مولانا صاحب نے اپنے تمام بچوں کو تعلیم پر لگایا، خاص طور پر فضل حق کو (جو ان کا بڑا لڑکا تھا)
سارے امتحان اپنے سامنے پاس کرائے۔ مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اسکی طرف بڑی توجہ رکھتے تھے اور اس کی
تعلیم کو مقدم سمجھتے تھے۔ بعض وقت غصہ میں آ کر مار بھی لیتے تھے۔ ایک صفہ پر بیٹھتے تھے، حقہ کا بڑا شوق

تھا۔ ان کا کتب خانہ جو مکان کی نچلی منزل میں تھا بہت وسیع تھا۔ انہوں نے ایک دینی رسالہ "الہدیٰ" کے نام سے جاری کیا۔ جس کے مرتب کرنے میں وہ بڑی محنت کرتے تھے۔ انہیں اس سے کوئی مالی فائدہ نہ تھا۔ صاف اور سیدھی بات لکھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے انداز پر لکھنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ دبیرِ عجم فارسی زبان کے علم بلاغت پر نہایت شستہ فارسی زبان میں لکھی گئی۔ میں گھر سے ابتدائی تعلیم لے کر آیا تھا۔ اس لئے میری طبیعت مذہبی تھی لیکن مولانا روحی نے ان باتوں کو مزید مستحکم کر دیا۔ انگلستان جا کر حالانکہ نماز پڑھنا مشکل تھا لیکن میں بناہتا رہا۔ اسلامیہ کالج میں مولانا کی مثال دیکھ کر مجھے بہت تقویت ہوئی ورنہ یقیناً میری زندگی کا راستہ بدل جاتا۔

محمد علی ملک

(ریٹائرڈ پروفیسر فارسی گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان)

استاذنا المکرم حضرت مولانا اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ کی مصنفہ تفسیر دلپذیر زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔ اس موقعہ پر یہ نیاز مند چند گلہائے عقیدت نچھاور کرنا چاہتا ہے۔

ابتدائی حالات مولانائے موصوف علیہ رحمۃ اللہ الرؤف سنہ میں بمقام کمالہ متولد ہوئے۔ آپ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ذوقِ علمی ورثہ میں ملا۔ ابتدائی مراحل تعلیم وطن میں طے فرمانے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں پر فارسی و عربی کے مختلف امتحانات، منشی فاضل، مولوی فاضل، ایم او ایل وغیرہ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کالج میں قیام کے دوران آپکو بعض اجلۂ علماء مثلاً مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا غلام قادر بھیروی، قاضی ظفر الدین وغیرہم مدرسین کالج سے اکتسابِ فیض کا شرف حاصل ہوا اور ان کی صحبت و تربیت نے آپکے زیورِ طبع کو کندن بنا دیا۔

فراغتِ تحصیل کے بعد آپ کو اورینٹل کالج ہی میں ملازمت مل گئی اور آپ ایک عرصہ تک وہاں پروفیسر رہے۔ تبحرِ علمی اور کاوشِ طبعی کے سبب سے آپکی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ چنانچہ وہاں سے آپ کو اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر عربیات و اسلامیات کے عہدہ پر متعین کیا گیا۔ جہاں آپ مدت العمر تشنگانِ علوم کو سیراب کرتے رہے۔

کالج کے علاوہ طالبان و مسترشدان علوم کا آپ کے کاشانۂ اقدس (روحی منزل) پر بھی
تانتا لگا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت صوبہ بھر میں تمام کالجوں اور درسگاہوں میں آپ کے پایہ کا کوئی علوم شرعیہ کا
فاضل معلّم نہ تھا۔ چنانچہ علمی حلقوں میں آپ کا اسم گرامی بطور سند پیش کیا جاتا تھا۔

تصنیف و تالیف

تعلیم و تدریس کے ہمراہ ہی میں آپ تصنیف و تالیف کے شغل سے دم بھر غافل نہ رہے۔ متعدد
بلند پایہ معیاری کتابیں آپ کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ آپ کی ایک نہایت قابل قدر تصنیف
"ما فی الاسلام" اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے ضروریاتِ اسلام کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔ ملاحدۂ
قدیم و جدید کا بطریقِ احسن ابطال فرمایا۔ نیاچرہ حال اور دیگر طوائفِ اہلِ ضلال کا ردِّ بلیغ کیا۔ درحقیقت اس
موضوع پر اس پایہ کی اردو زبان میں کم تصانیف پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ کتاب مستطاب "رسائلِ حمیدیہ" کی طرز
پر تحریر کی گئی ہے لیکن مؤخر الذکر کتاب کے بعض اغلاقات و اطنابات سے بہت حد تک مبرّا ہے۔

آپ کی ایک اور قابل قدر تصنیف "امیر الکلام من کلام الامام" ہے۔ جس میں آپ نے حضرت علی
کرم اللہ وجہہ الکریم کے بعض اقوالِ حکمیہ مندرجہ "نہج البلاغۃ" کو اردو کا جامہ پہنایا اور جناب حیدر کرار رضی اللہ عنہ
کی حلقہ بگوشی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ آپکی تصنیف "دبیرِ عجم" علم بلاغت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ فارسی زبان میں
ایسی دوسری درسی کتاب اس موضوع پر اسکے مقابل ترجیح کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی۔

صحافت

ان تصانیف و تالیف کے علاوہ آپکی پُرجوش طبیعت نے جذبۂ تبلیغ کے زیرِ اثر وادیٔ
صحافت میں بھی قدم رکھا۔ ماہنامہ "الھدیٰ" آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوا اور کئی سال تک
آپ اس کے ذریعے دادِ تبلیغ و اشاعتِ حق دیتے رہے۔ اس رسالے میں آپ مسلسل طور پر الحاد و زندقہ اور دیگر
فتن و ضلالات کا نہایت شدّ و مد کے ساتھ رد فرماتے رہے۔ دینِ حق کو دلائلِ قاہرہ کے ساتھ واضح فرماتے اور
اہلِ باطل کی گمرہی و بیدینی پر نہایت کاری ضربیں لگاتے رہے۔

شاعری

نثر کے علاوہ آپ شعر کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔ ایک نغز گو، قادر الکلام شاعر کی
حیثیت سے آپ نے متعدد نظمیں تصنیف کیں۔ مرغوب طبع قصیدہ گوئی رہی۔ چونکہ آپ عربیت
کے فاضل اور شعر و ادبِ عربی کے بیحد ماہر تھے۔ اس لئے رجحانِ طبیعت شعر و ادبیاتِ عربیہ کے تتبع میں

قصیدہ کی جانب دار قصائد اکثر و بیشتر فارسی اور عربی میں لکھے اور ان میں نعتِ رسولِ اکرم ﷺ، پند و موعظت، اصلاحِ احوالِ قومی کی ضرورت و اہمیت، انحطاطِ قومی پر تاسف، ذکرِ فضائلِ اسلام و ملت اور ردّ و ابطالِ الحاد و ضلالت کے مضامین باندھے۔ قصیدہ "ملت آشوب" میں آپ نے انحطاطِ قومی کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چند الفاظ میں کوزے کے اندر دریا کو بند کرنا آپکی طبعِ رسا کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔ مثال کے طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی بے راہ روی اور گمراہی کا خاکہ بیان کر کے ان لوگوں کی حسنِ اخلاق و آداب سے تہی دستی کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

؎ مرا از معنیٔ حسنِ ادب پرسید تلمیذے . بدو گفتم کہ از اہلِ چہ پرسی آسبق خوانے

الغرض نثر کے علاوہ آپ میدانِ نظم و شعر کے بھی یکتا و سبک رفتار تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے "قصیدۂ الہامی" کے جواب میں بھی قصیدہ تالیف فرمایا جو آج تک لاجواب ہے۔

معمولات و کردار ان مآثرِ علمی کے علاوہ آپ کے معمولات، اطوار و کردار بھی ایک مثالی کیفیت رکھتے ہیں۔ مجسمۂ تشرّع و تدین کامل، شائستگی و تہذیبِ اسلامی کے پیکرِ مجسم، عالمانہ وقار و متانت کے نمونۂ اتم، حسنِ اخلاق و محاسنِ آداب کے حامل و عامل محتشم، آپ ایک صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے۔ حب الفقراء والمساکین آپ کا دابِ پسندیدہ، طلبِ اہل اللہ اور تلاش و جستجوئے سالکانِ راہِ خدا آپ کا محبوب مشغلہ۔ ہر کبیر و صغیر سے برتاؤ پیار کے ساتھ تواضع و انکسار کا برتاؤ آپ کا شیوۂ مستمرہ، اہلِ احتیاج کی امداد و اعانت اور ہر گونہ محرومانِ نادار وہ کی دستگیری و ایالت آپ کے معمولاتِ حسنہ کا ایک نمایاں خاصہ تھا۔ فخر و مباہات، ترفع و تعلّی، ریاء و سمعہ اور دیگر عوارض و مہلکاتِ نفسانی سے آپکی ذاتِ گرامی بمنہٖ و کرمہٖ تعالیٰ پاک و صاف رہی۔ الغرض آپ اکابرِ اسلام کا نمونہ اولیٰ! اور اعتقاداً و عملاً "سبیل المؤمنین" کے جادہ پیما تھے۔ حبّ و اتباعِ سلف آپ کا طغراءِ امتیاز و طیرۂ مقدسہ تھا۔ فالحاصل ایسی نادرۂ روزگار ہستیاں اب کہاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ خداوند قدوس حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے جوارِ رحمت میں مراتبِ قرب پر بیش از بیش فائز و مجسمہ مرام فرمائے اور آپکے متوسلین و مستفیدین باز ماندہ کو آپکے نقوشِ علم و عمل کے ساتھ تمسک پذیری و وابستگی کی توفیق ارزانی فرمائے۔ ؎ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

محمد علی (ملک)

محمد نصیر ہمایوں

(مالک قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور)

مولانا اصغر علی روحیؒ

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک میرا واسطہ استاذ شاگرد کا رہا ہے۔ میں ریواز ہاسٹل میں رہتا تھا اور مولانا بی۔ اے کی جماعت (عربی) کو لے کر ریواز ہوسٹل کے صحن کے وسط میں بیٹھ جاتے تھے۔ حقہ بھی ساتھ رکھتے تھے اور عینک بھی نمایاں تھی۔ کبھی کبھی وہ پیار سے اس طرح پکارتے "اے کہ نجیہ ہمایوں" "پانی پلاؤ" ہم میں ان کی لیاقت کی دھوم مچی تھی کیا مجال ہے کہ ان کے سامنے کوئی چوں کر جائے۔ ان کا پروقار چہرہ، ان کی اونچی مردانہ آواز، ان کا خاموش مطالعہ اور خاموش پڑھانا کس کو یاد نہ ہوگا۔ ان کی شفقت اس بات سے ظاہر ہے کہ میرے علم میں کم از کم دو لڑکوں کی شادی ان کے ذریعے ہوئے ہیں۔

۱۔ ملک محمد حسین ۲۔ چودھری فیروز الدین، بھابھڑہ ضلع لاہور، بھابھڑہ چونکہ اب ماڈل ٹاؤن کا حصہ بن گیا ہے۔ اس لئے اب مجھے ان کا ایڈریس معلوم نہیں۔

میری ایک کتاب تمرینات النحو پر انہوں نے پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ جس کا ایک فقرہ مجھے یاد ہے "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

زیادہ کیا عرض کروں۔ ان کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا مانگتا ہوں۔

خاکسار

محمد نصیر ہمایوں۔

چوہدری محمد یعقوب

(ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز سرگودہا)

میں نے رام سُکھ داس کالج فیروزپور سے ایف۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۱ میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ مولانا اصغر علی رُوحی اُس وقت وہاں Theology کے پروفیسر تھے لیکن یہ اُن کی ملازمت کے اختتام کا زمانہ تھا۔ دو تین ماہ مجھے اُن کی کلاس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہُوا۔ پھر وہ ریٹائر ہو گئے۔ کوئی خاص واقعہ تو مجھے یاد نہیں آتا البتہ مولانا کی مجموعی شخصیت کا تاثر دل پر باقی ہے۔ نہایت نیک سیرت بزرگ تھے۔ قد میانہ، رنگ گندمی، سفید ریش، شلوار قمیص میں ملبوس، بیناؒ اُس زمانے میں جاتی رہی تھی۔ انداز تدریس نہایت دلچسپ تھا۔ ایک پرانے تجربہ کار استاد سے جس مہارتِ تدریس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بدرجۂ اتم اُن میں موجود تھی۔ ۱۹۳۳ء میں میں نے اورینٹل کالج میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لیا۔ یہاں مولانا روحی کے فرزند ضیاء الحق صاحب میرے ہم جماعت ہو گئے۔ نہایت لائق اور شریف انسان تھے۔ ایم۔ اے عربی غالباً ۱۹۳۳ء میں کر چکے تھے۔ ہمارے پرنسپل اُس زمانے میں مولانا صاحب اور بعد ازاں شفیع صاحب تھے اور صدر شعبہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

میں کئی مرتبہ ضیاء الحق صاحب کے ہمراہ بھاٹی دروازے اُن کے مکان پر بھی گیا۔ مگر اُس زمانے کے بعد پھر کبھی اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اُن کے عزیز عبدالحلیم صاحب بھی ایک زمانے میں بلاک ع ۱۲، سرگودھا میں رہا کرتے تھے۔ سلائی کا کام کرتے تھے۔ گونگے بہروں کا سکول بھی انہوں نے جاری کیا تھا۔ اُن کا ایک لڑکا میرا شاگرد بھی رہا۔ اب بہت عرصے سے اُن سے بھی رابطہ باقی نہیں۔ معلوم نہیں اب کہاں ہیں۔

(چوہدری) محمد یعقوب

مولابخش خضر تمیمی
ایڈووکیٹ

حضرت روحیؒ اور ان کی شخصیت

حضرت مولانا اصغر علی روحیؒ کی منفرد اور باوقار شخصیت جو اسلاف صالحین کا عین نمونہ اور غیرتِ اسلامی سے بدرجۂ اتم بہرہ ور تھی کی خدمت میں مجھے حاضر ہونے کا موقع آج سے چھیالیس سال پہلے ۱۹۲۷ء میں نصیب ہوا۔ جب میں گورنمنٹ کالج لائلپور سے ایف۔ اے کی تعلیم مکمل کر کے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے بھی میرا ذہن دینی امور و علوم کی طرف مائل تھا۔ چنانچہ مولانا روحیؒ جو ہمیں دینیات کا درس دیتے تھے ان کی کلاس میں ان کی نیابت میں طلبہ کی حاضری لگانے، آیات زیرِ درس کی تلاوت کرنے اور وقت ختم ہونے کے بعد ان کی ہمراہی میں کلاس روم سے نچلی منزل تک جانے میں ان کی مشایعت کی سعادت حاصل رہتی تھی۔ ہم میں ایک اور وجہِ اشتراک اچھے تمباکو کا شیدا ہونا بھی تھی۔ میرے والد صاحب قبلہؒ اہتمام سے مجھے چنیوٹ کا کڑوا تمباکو بھجوایا کرتے تھے۔ جس میں مولانا کے لئے بھی حصہ نکالا جاتا تھا۔ اس لئے وہ مجھے دوسرے طلباء میں سے جلدی شناخت کر لیتے تھے اور شفقت فرماتے تھے۔ ان کی شفقت کا عام طریقہ یہ تھا کہ جس طالب علم کو فرماتے "ھینگ اپنے تئیں ادھر کو" تو وہ ان کے ہاں جانے کی سعادت حاصل کرتا۔ ان کے دستِ مبارک سے کان اینٹھوانے کی سعادت میں فخر محسوس کرتا اور ہولے ہولے تھپڑ بھی کھاتا۔ مجھے بارہا ان کے دستِ مبارک کے لمس کا اعزاز اس طرح پر حاصل رہا ہے۔

ہم اپنی کم سمجھی سے انہیں صرف ایک عام مولوی ہی سمجھتے تھے لیکن یہ ہماری غلطی تھی۔ میں اسلامیہ کالج کے ادبی مجلے Crescent کے حصہ اردو کا ایڈیٹر تھا اور ہمارے نگران پروفیسر ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم تھے۔ جو خود بھی نہایت شفیق بزرگ اور استاذ تھے۔ طالب علموں کو خود بڑھاوا دیتے تھے کہ یوں نہیں یوں کہو۔ اس طرح وہ بھی ہمارے ذہنی ارتقا میں حصہ لیتے تھے۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جاؤ اور مولانا روحی سے غزل مانگ لاؤ۔ میں نے عرض کی کہ ھیں! وہ تو مولوی ہیں۔ وہ غزل کیسے کہتے ہوں گے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے فرمایا کہ تم کیا جانتے ہو وہ اس وقت عربی فارسی علم و ادب اور دینی علم کا ایک باوقار سنگم ہیں۔ چنانچہ میں مولانا روحی کی خدمت میں حاضر ہوا اور استاذ تاثیر مرحوم کا یہ پیغام ان تک پہنچایا تو انہوں نے فارسی کی ایک غزل مرحمت فرمائی جس کے یہ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ باقی غزل Crescent کے صفحات میں محفوظ ہو گی۔ فرماتے ہیں ؎

بحضرتے کہ نخواہیم مدعا بخشند — قیاس کن کہ چو خواہیم تا چہا بخشند

بکام تشنۂ دوراں مناز و غرّہ مشو — زشاہ باز ستانند و با گدا بخشند

اس دن سے میں ادبی لگاؤ کی وجہ سے بھی مولانا کے زیادہ قریب ہو گیا۔ میں نے ان دنوں داڑھی چھوڑی ہوئی تھی (جو بحمد اللہ ابھی تک برقرار ہے) اس لئے وہ اکثر فرماتے۔ " او محض مولوی! ھینگ اپنے تئیں ادھر کو "

حضرت مولانا اصغر علی روحیؒ نے حضرت علی المرتضیٰ شیرِ خدا کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی ذات بابرکات کی شان میں قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

؎ اگر شیر حق را نبودے وجود　　بگیتی کسے جفتِ زہرا نہ بود

مجھ سے فرمانے لگے کہ یہ کس کا شعر ہے؟ میں نے عرض کیا جناب! آپ کا شعر ہے۔ نہایت شفقت سے میرے کان اور گال تھپتھپا کر فرمانے لگے۔ خوش ذوق آدمی معلوم ہوتے ہو۔

حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف عالم تھے بلکہ محقق بھی تھے۔ آپ نے حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کی شہرت سُن کر اُن سے بالمشافہ گفتگو کے لئے اس زمانے میں لاہور سے شرقپور شریف کا سفر کیا جب وسائل آمدورفت آجکل کی طرح عام نہ تھے۔ بلکہ راستہ بھی کچا تھا اور عام طور پر لوگ گھوڑوں اور تانگے پر سفر کرتے تھے۔ مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ وہاں پہنچے تو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت اپنے دولت خانہ کی ڈیوڑھی میں کتوں کو روٹیاں ڈال رہے تھے۔ حضرت مولانا فرماتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ تمام کتّے مؤدب بیٹھے ہیں اور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جس جانور کی طرف ٹکڑا پھینکتے، صرف وہی اٹھ کر آگے آتا اور اپنا حصہ لے جاتا۔ حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھتے دیکھتے جب میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نحیف و نزار کتے کی طرف ٹکڑا پھینکا تو ایک نسبۃً تندرست زور کتا اس سے لینے کے لئے لپکا۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ تمہاری باری نہیں ہے۔ اس پر وہ لوٹ گیا اور جس کو وہ ٹکڑا ملنا تھا اُس نے آکر لیا جس سے مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ بڑے متاثر ہوئے۔ حضرت روحی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کی واقعی تعبیر سمجھتے تھے۔

؎ تو ہم گردن از حکم داور مپیچ　　کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

ہمارے وقت میں اسلامیہ کالج سٹاف پر کافی ولایت پلٹ اساتذہ موجود تھے جو عہدے اور تنخواہ کے لحاظ سے غالباً حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ سے سینئر بھی تھے۔ مثلاً علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم، ڈاکٹر ملک نذیر احمد مرحوم، ڈاکٹر سعید اللہ اور پروفیسر ہیو کرافٹ۔ لیکن مولانا ان سب میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور جب کبھی بھی ان سے خطاب فرماتے تو ارشاد ہوتا۔ "اے تہذیب مغرب کے راندے ہوئے گدھو!"

ہمارے زمانے میں مولانا نے دیر تجم تحریر فرمائی اس حالت میں کہ بصارت جواب دے چکی تھی لیکن بصیرت اپنے شباب پر تھی۔ کتاب لکھواتے جاتے تھے اور متقدمین کی یاد تازہ کرتے جاتے تھے۔ اس کی پیشانی پر مولانا نے یہ رباعی تحریر فرمائی:-

؎ سوادِ شعب لبان است روحی　　بیا پرکش دو سہ جام صبوحی
بیا در جامِ جم بزمے بیارا:-　　تجلّی ہاست مشتاقِ تماشا

اسی طرح آپ نے مبانی الاسلام تصنیف فرمائی۔ مواد اور موضوعات کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ حضرت مولانا روحیؒ اسلامیہ کالج کے ان مہر و آفتاب اساتذہ میں سے تھے، جو زہد و تقویٰ کے تمام لوازمات کے ساتھ اپنے فرائضِ رشد و ہدایت انجام دیتے تھے۔ ان میں پرنسپل حاکم علی تھے جو گھوڑے پر سوار ہو کر کالج آتے تھے۔ اس ہیئت میں کہ ایک طرف مصلیٰ بندھا ہے اور دوسری طرف لوٹا۔ افسوس کہ مولانا کے سبکدوش ہونے کے بعد

عمر جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

کہنے کو عمر خان ٹونک بھی موجود تھے مگر وہ صرف درسی کتابوں کا گراموفون ریکارڈ تھے۔ طبیعت کی گہرائی میں ان کو تبحرِ علمی اور ملت سے وابستگی نہ تھی، جو حضرت مولانا اصغر علی روحیؒ ہی کا حصہ تھی۔

حضرت مولاناؒ اپنی وضع کے شدت سے پابند تھے۔ بینائی میں کمزوری کی وجہ سے سبز چشمہ لگاتے تھے اور ایک موٹا سا ڈنڈا جسے ہم پیار سے عصائے موسوی یا مولا بخش کہا کرتے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو بجائے خود ایک اتنی وزن دار چیز تھی کہ اس کا اٹھائے اٹھائے پھرنا بھی بجائے خود ایک مشقت طلب امر تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں ان کے درجات بلند فرماوے۔ انہوں نے اپنی دینی بصیرت سے ہر شخص کو بقدرِ ظرف نوازا اور اس طرح

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم   شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

کے مصداق بن گئے۔

فسبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین۔ والحمد للہ رب العلمین۔

سید ناصر حسین رضوی

ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ جیل۔ لاھور

طالب علمی کے زمانہ کو خیر باد کہنے کے بعد انسان زندگی کی بھول بھلیوں میں کچھ اس طرح الجھ کر رہ جاتا ہے کہ ماضی ایک بھولے بسرے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کشمکش کے باوجود اس زمانہ کے اکا دکا واقعات اور مخصوص شخصیتیں ذہن کے افق پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو

زمانہ کے جور و تشدد کے ہوتے ہوئے بھی جن کے گُن رہتے ہیں۔ ایسی ہی مشہور و نامور ہستیوں میں ایک مشہورِ آفاق ہستی مولانا اصغر علی روحی کی تھی۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ میں عربی کا طالب علم تو نہ تھا لیکن مجھ اُن کے ساتھ ایک خاص قسم کی عقیدت تھی اور روحانی لگاؤ تھا۔ کبھی کبھار بی۔ اے کا دینیات کا مضمون اُن کے حصہ میں آجاتا تو ان سے قرب کا موقعہ میسر آتا۔ اُن کی علمیت کے متعلق کچھ کہنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مصداق ہے اور پھر مجھ ایسے ناخواندہ انسان کے لئے یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ یہ فرض کسی اہلِ علم کا ہے۔

خزانۂ علم کے علاوہ اُن کی ذاتی شخصیت، ان کا طرزِ گفتگو، ان کا اندازِ بیان کچھ اس قسم کا ناصحانہ و مشفقانہ ہوا کرتا تھا کہ ایک پتھر دل بھی موم ہو جاتا۔ وہ استاد کے فرائض و منصب سے پوری طرح آگاہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد آج تک نہایت عزت و احترام سے اُن کا ذکرِ خیر کرتے ہیں اور اگر اتفاقاً اُن کا کوئی عزیز مل جائے تو گھنٹوں اُن کا تذکرہ کسی قسم کی اکتاہٹ پیدا نہیں کرتا۔ وہ اگر کبھی ناراض ہوتے تو وہ ناراضگی چند لمحوں کے بعد خود بخود ختم ہو جاتی۔ وہ ایسے ہی ہوتی جیسے ایک مشفق باپ کسی بچہ کی کوتاہی پر اسے ڈانٹ دے اور پھر چند دقیقہ بعد پدرانہ شفقت اُس کو پیار کرنے پر مجبور کردے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ذہن میں آیا۔

مولانا دینیات پر لیکچر دے رہے تھے۔ میں اور میرا ایک دوست سید الطاف حسین بخاری بھی کلاس میں بیٹھے تھے۔ ہم میں سے کسی نے کوئی بدتمیزی کی۔ مولانا کو غصہ آیا اور ہمیں کلاس سے باہر نکال دیا۔ دوسرے روز ہم دونوں کلاس میں نہ گئے اور باہر گراؤنڈ میں گھومنے لگے۔ مولانا کو ہماری عدم موجودگی کا احساس ہوا اور گزشتہ روز کی ہماری بدتمیزی اور اپنی خفگی کا قصہ یاد آگیا۔ فرمایا: "آج وہ طاؤسین کی جوڑی کہاں ہے۔" کسی لڑکے نے باہر گراؤنڈ میں ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آوارہ گردی میں مشغول ہیں۔ ہماری طلبی ہوئی۔ جب اُن کے قریب پہنچے تو نہایت شفقت سے ایک ہاتھ میرے اور دوسرا بخاری صاحب کے کان پر تھا اور خاص انداز سے کانوں میں حرکت پیدا کی جانے لگی۔ اسکے ساتھ ساتھ فرمانے لگے، "گزشتہ روز کی ناراضگی کی وجہ سے کلاس سے غیر حاضر ہو، جلدی بتاؤ"

ہم نے معافی مانگی اور اسطرح یہ قصہ ختم ہوا۔

New China Stationers, Lahore

جناب نذیر نیازی مرحوم

۷- الف چمبہ ہاؤس لین، گالف روڈ - لاہور

السلام علیکم ۔ مزاج گرامی

عنایت نامے کا شکریہ - جواب طلب لفافہ کیا ضروری تھا۔ آپ نے ناحق تکلف سے کام لیا۔ بہرحال مسرت ہے کہ آپ سے تعارف کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا۔

مولانا کی شخصیت بڑی عظیم تھی۔ میرے عم محترم شمس العلماء مولانا مولوی میر حسن (استاد اقبال) بھی ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ان سے راہ و رسم بھی تھی مگر افسوس ہے ان بزرگوں کے تعلقات کی کوئی یادداشت محفوظ نہیں۔ نہ کبھی یہ خیال آیا کہ آئندہ نسلوں کو ان کے حالات کی جستجو ہو گی۔ قومیں اسلاف کی یادوں ہی سے زندہ رہتی ہیں۔ ان سے راہنمائی حاصل کرتی ہیں۔ عقل و دانش میں، علم و حکمت میں، سیرت و کردار میں جن کا شکریہ بزرگ کر سکے۔

در سینۂ ما ز مردم عارف مزار ماست

مگر میان مردم عارف کجاں!

بحمد اللہ کہ آپ نے ان کے سوانح حیات، ارشادات اور علمی خدمات کو مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمائے۔ یہ ایک بہت بڑا فریضہ ہے۔ قوم آپ کی احسان مند رہے گی۔

مجھے مولانا سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ لیکن رسمی۔ یہی کہ ۱۹۱۹ میں بی۔ اے میں داخلہ لیا تو دینیات کی تعلیم ان کے ذمے تھی لیکن ۱۹۱۹ اور ۱۹۲۰ جب میں لاہور چھوڑ کر علی گڑھ چلا گیا۔ یہ زمانہ سیاست کی گرم بازاری کا تھا۔ کالج میں

ہنگامے۔ کالج سے باہر ہنگامے، جلسے، جلوس، نعرے، درس و تدریس کا سلسلہ درہم برہم۔ مولانا کے علم و فضل سے کما حقہ استفادہ نہ کر سکا۔ ان کے اخلاق کریمانہ، شفقت اور محبت۔ طلبا کی خیر خواہی، ملنساری اور رواداری کی یاد اللہ دل میں باقی ہے۔ مولانا تقریر کر رہے ہیں۔ طلبا اس خیال سے کہ دینیات کا مضمون محض ایک تکلف ہے۔ طرح طرح سے مخل ہو رہے ہیں۔ لیکن مولانا ہیں کہ بڑے صبر و تحمل اور خوش اسلوبی سے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ ان کے سوالات کا جواب دے رہے ہیں۔ عربی زبان کے طلبا البتہ ان سے خوب خوب استفادہ کرتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ مولانا ہوازن ہوسٹل کے صحن میں بیٹھ جاتے۔ اردگرد طلباء کا ہجوم ہے۔ مولانا تقریر فرما رہے ہیں۔ کچھ علمی اور اخلاقی نکات بیان کر رہے ہیں۔ زبان عالمانہ ہے۔ عربی الفاظ اور تراکیب سے مملو۔ کچھ لطائف بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی آخر عمر کا زمانہ تھا۔ شاید نزول الماء یا کسی اور وجہ سے سیاہ چشمہ لگائے رکھتے داڑھی کو خضاب کرتے۔ ان کا بزرگانہ چہرہ، جبّہ و دستار، رومال اور عصا اب بھی میرے سامنے ہے۔ آواز میں زور ہے۔ لب و لہجہ پُر وقار۔ نشست و برخاست میں ایک قرینہ ایک شانِ علم۔ بس یہی کچھ یاد رہ گیا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ ان کے فیضانِ صحبت سے محروم رہ گیا۔ میں تو اپنی چند روزہ تعلق میں یہی کچھ باتیں ہیں جو آپ کی خدمت میں عرض کر سکتا تھا۔ مگر لاہور میں ان کے نیاز مندوں کی کثرت تھی۔ باقیات الصالحات سے خوب خوب معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ آپ ان سے راہ و رسم پیدا کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششیں بار آور فرمائے۔ یہ ایک بہت بڑی علمی خدمت ہوگی جو آپ انجام دیں گے

والسلام

احقر

نیازی

شیخ محمد الدین رضوانی مرحوم

سابق سینئر انسپکٹر این ڈبلیو ریلوے، لاہور۔

خوش نسیمِ صبحدم طرفِ چناب آید ہمے — در نظر چوں آفتاب آتش برآب آید ہمے

صد ہزاراں فخرِ شاگردی کنند ہمچوں منے — حضرتِ استادِ من سوئے حق بخواب آید ہمے

عالمِ دیں بیمثال وہم ادیبِ باکمال — فاضلِ دوراں فقیہِ پُر خطاب آید ہمے

وطنِ مالوفش کٹھالہ گوہر از آتش برچناب — سر فگندہ مردماں بر آں جناب آید ہمے

تا بہ دارم مہربانیہائے استادم بیاد — گرچہ عمرم و مبدم اندر حساب آید ہمے

قطرہ ہا از ابر و باراں چوں بدریا میرسند — بر سرِ ہر موج پیدا صد حباب آید ہمے

درد را درماں از و پرسیدم و گفتا عزیز — بحر شو تا حرب و ضرب اندر سحاب آید ہمے

درد را درماں چہ خواہی در طلبِ شش جہات — قلبِ دردہم درد باشد در نقاب آید ہمے

بر درِ جنت چو رضواں باش رضوانی مقیم
تا کہ رحمت وقتِ رحلت بے حجاب آید ہمے

گفتہ: شیخ محمد دین رضوانی

یکم جنوری ۱۹۷۰ء

فصل دوم

(معاصرین)

حفیظ جالندھری

(فردوسیِ پاکستان)

حفیظ صاحب سے مولانا روحیؒ سے متعلق تاثرات کی درخواست کی گئی تو انہوں نے جواباً جو کچھ مرحمت فرمایا۔ درج ذیل ہے :۔

مولانا اصغر علی روحیؒ اُس زمانے میں اسلامیہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔ جب میں جالندھر چھوڑ کر لاہور آبسا تھا۔ میری عمر بائیس برس کی تھی۔ اسلامیہ کالج میں جالندھر کے بہت سے طالبانِ علم میرے ہمسن تھے۔ اُن سے کالج میں یا ہوسٹل ملنے جاتا تھا۔ میں نے اُس زمانے میں مولانا روحی کے علم و فضل و شاعری کا شہرہ سارے لاہور کی علمی فضا پر چھایا ہوا پایا۔

یہ چند شعر اُن کی یاد کے طور پر اپنے بڑھاپے میں حاضر کر رہا ہوں :۔

حضرت اصغر علی روحی مجھے بھی یاد ہیں — اُن کی شاگردی میں تھے، جو آجکل استاد ہیں

میں تو نا پختہ سا تھا اک طفل اُن کے دور میں — روحِ روحی جن دنوں رخشندہ تھی لاہور میں

ان سے لیتے تھے سبق اہلِ سخن اہلِ عرب — سیکھتے تھے فن و اسلوبِ بیاں، شعر و ادب

میرے نزدیک آج بھی وہ زندہ و پائندہ ہیں — اپنے شاگردوں کے ذہن و قلب میں تابندہ ہیں

حفیظ

اس کے بعد مولانا روحیؒ کے اعزّہ و اقارب کے خاندانی مسوّدہ میں بھی حفیظ صاحب کے مندرجہ ذیل شعر نظر آئے

حضرت اصغر علی روحی شاعر و نقاد تھے — قائل اُن کی دانشِ علمی کے سب استاد تھے

میں تو نا پختہ سا تھا اک طفل اُنکے دور میں — جاری و ساری تھا روحی کا سخن لاہور میں

اُن سے لیتے تھے سبق اہلِ زباں اہلِ عرب — سیکھتے تھے فن و اسلوبِ بیاں، حسنِ ادب

دیکھتا ہوں میں۔ کہ حضرت زندہ و پائندہ ہیں اپنے شاگردوں کے ذہن و قلب میں تابندہ ہیں

خادم

حفیظ جالندھری

دلاور علی المعروف بمیرزا ادیب

(کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور)

میں نے ابھی اسلامیہ کالج کی دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ مولانا اصغر علی روحی کا آوازۂ شہرت میرے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ علم و فضل میں مولانا ایک فقید المثال شخصیت متصور ہوتے ہیں اور ہندوستان ہی میں نہیں، حدودِ ہندوستان سے باہر بھی علمی معاملات کی پیچیدگیوں میں مستشرقین ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے اساتذہ میں ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر، خواجہ دل محمد، پروفیسر ایم۔ اے۔ غنی، پروفیسر یو۔ کرامت، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر بی۔ اے۔ قریشی، پروفیسر فیاض محمود، مولانا علم الدین سالک اور پروفیسر غلام حسین جیسے لوگ شامل تھے اور ان میں ہر شخص ہندوستان گیر شہرت کا مالک تھا، مگر جو عزت و تکریم مولانا روحی کے حصے میں آئی تھی وہ کسی اور استاد کو حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام کا ہفت روزہ ترجمان حمایت اسلام، بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا تھا اور میں تسلسل کے ساتھ اس کے صفحات پر اپنی نظمیں اور مضامین بکھیر رہا تھا۔ حمایت اسلام کے ایڈیٹر جناب ساغر سیوہاروی مرحوم تھے۔ نستعلیق قسم کے بزرگ تھے۔ خود شاعر تھے اور نوجوان شعراء کی ہمت افزائی میں قطعاً بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ میں کالج میں داخلہ لینے سے پیشتر بھی ان کے ہاں جاتا رہتا تھا۔ ان کا دفتر اسلامیہ کالج گراؤنڈ کے ایک بعید کے گوشے میں، پریس سے ملحق واقع تھا۔ میں جب اسلامیہ کالج میں پہنچ گیا تو کم و بیش ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملنے لگا۔

ایک بار میں نے سوچا کہ اردو نظمیں تو لکھتا ہی رہتا ہوں، کیوں نہ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی جائے۔ تھی تو یہ ایک قسم کی جرأتِ رندانہ اور اپنی اوقات یا مبلغ علم سے میں خوب واقف تھا، تاہم

میں نے سلطان ٹیپو کے بارے میں سات آٹھ اشعار کی فارسی نظم مکمل کرلی۔ معمول کے مطابق نظم ساحر صاحب کے سامنے پیش کردی۔ انہوں نے پہلا شعر پڑھا۔ میری طرف غور سے دیکھا اور بولے:

"ادیب صاحب!"

"جی جناب!"

"فارسی کی کتنی کتابوں کا مطالعہ کرلیا ہے۔ سعدی، حافظ، قاآنی، خاقانی، فردوسی —" وہ فقرہ مکمل نہ کرسکے۔ شاید انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگالیا تھا کہ میں دل میں شدید خفت محسوس کررہا ہوں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ان کا ردعمل ہمت افزائی کے برعکس ہمت شکنی کے زیادہ قریب تھا۔

انہوں نے دو تین منٹ تک خاموشی سے نظم کا مطالعہ کیا اور کہنے لگے۔

"مجھے فارسی سے دلچسپی تو ضرور ہے تاہم میں فارسی اشعار کی جانچ پرکھ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

میں نے پوچھا:

"تو فارسی نظم کس صاحب کو دکھاؤں۔" فرمانے لگے۔ "آپ کے کالج میں بڑے بڑے استاد موجود ہیں۔ ان سے مشورہ کیجیے"

"مثلاً — کس کے پاس جاؤں!"

کچھ سوچ کر بولے:

"مولانا روحی کے پاس"

میں نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"مولانا عالم فاضل تو یقیناً ہیں۔ کیا شاعر بھی ہیں؟"

مسکرا کر بولے۔

"ان کا اسم گرامی ہے۔ مولانا اصغر علی روحی — آخر اس 'روحی' سے کیا مراد ہے۔ کیا یہ تخلص نہیں ہے؟"

بات سمجھ میں آگئی۔ میں نے دل میں ارادہ کرلیا کہ حمایت اسلام کے دفتر سے نکل کر سیدھا مولانا روحی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ چنانچہ گراؤنڈ سے گزر کر برآمدے سے ہوتا ہوا کالج کے عقبی دروازے کے سامنے آخری کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا، مولانا روحی اسی کمرے میں اپنے شاگردوں کو عربی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ جب کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو داڑھی والے صاحب کو پایا جو ایک ڈیسک میں بیٹھے بڑے انہماک سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں اندر چلا گیا۔

"روحی صاحب تشریف نہیں لائے کیا؟" استفسار کیا

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ دونوں کے چہروں پر تکدّر کا رنگ چھا گیا ہے۔ تکدّر کی وجہ میں نہ سمجھ سکا اور جب ان میں سے ایک صاحب نے کہا:

"مولانا تشریف لے گئے ہیں"

تو وجہ واضح ہو گئی ——— میں نے روحی صاحب کہا تھا۔ مجھے احتراماً مولانا روحی کہنا چاہیے تھا۔

مہینہ کون سا تھا۔ یہ میں آج بھول گیا ہوں مگر یہ بات یاد رہی کہ ان دنوں کالج غالباً ایک ہفتے کے لئے بند ہو گیا تھا۔ ناصبوری شاید میری فطرت ثانیہ تھی۔ میں نظم کو دیکھتا تھا اور دل مضطرب ہو جاتا تھا کہ اب تک منظر عام پر کیوں نہ آ سکی اور ظاہر ہے جب تک مولانا روحی کی نظروں سے نہ گزر جاتی اس کی اشاعت مناسب معلوم نہ ہوتی تھی اور یہ بھی جانتا تھا کہ مولانا سات روز تک کالج نہیں آ سکیں گے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک روز انارکلی میں سے گزرتے ہوئے مجھے کالج کا ایک کلرک مل گیا۔ میں نے اس سے مولانا کے گھر کا پتا پوچھا۔ کہنے لگا۔ بھاٹی کے اندر اس جگہ رہتے ہیں جہاں گوجروں کی بہت سی گائیں اور بھینسیں بندھی رہتی ہیں۔ اس سے زیادہ وہ مجھے کچھ نہ بتا سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ جس مقام کی اطلاع کلرک نے دی تھی، وہاں میرا ایک سکول کا ساتھی عبدالباقی بھی رہتا تھا۔ عبدالباقی ایک لمبا تڑنگا نوجوان تھا اور رنگین مہندی سر کے بالوں پر مہندی لگایا کرتا تھا۔ اس کے یہاں دو تین مرتبہ جا چکا تھا، اس لئے اس کے مکان تک پہنچنے میں کوئی دقت یا دشواری نہیں تھی۔

وہاں جا کر اسے آواز دی۔ عبدالباقی نیچے آ گیا۔

"کہو دلاور؟"

عبدالباقی مجھے میرے حقیقی نام ہی سے پکارتا تھا

"یار مولانا روحی سے ملنا ہے"

"تمھیں ان سے کیا کام؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ سکول کے زمانے میں میں فارسی پڑھا کرتا تھا عربی زبان سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"نظم دکھانی ہے"

عبدالباقی نے بتایا کہ مولانا اپنا زیادہ وقت محلّے کی مسجد میں گزارتے ہیں اور جن لوگوں کو ان سے ملنا ہوتا ہے وہ مسجد ہی میں چلے جاتے ہیں۔ اس نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیانی وقفے میں جانا اس

وقت وہ فارغ ہوتے ہیں۔ عبدالباقی نے اس مسجد کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس میں مولانا اپنے ملنے والوں کو ملاقات کا موقع دیا کرتے تھے۔

مسجد دیکھ لی تو گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب میں خود بھاٹی دروازہ کے اندر محلہ ستھان، چوک دلوی دتا میں رہتا تھا۔ مسجد اور میرے گھر کے درمیان چند منٹ کی مسافت تھی اور اُس وقت دن کے شاید دس بجے تھے۔

دو کا عالم تھا جب میں اپنی فارسی کی کتاب میں نظم کا تہ کیا ہوا کاغذ رکھ کر جلدی جلدی بھاٹی کے دروازے کی طرف قدم اُٹھا رہا تھا۔ دروازے کے قریب بائیں طرف مڑا اور کچھ دور جا کر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ سامنے مسجد کے در و بام دکھائی دے رہے تھے۔

انسانی فطرت کا یہ بھی ایک تقاضا ہے کہ جب ہم کسی ایسے شخص سے ملنے کے لئے جاتے ہیں جس سے پہلی بار ملاقات ہونی ہو تو اس کے بارے میں ایک خاص نقشہ ضرور قائم کر لیتے ہیں۔ مثلاً یہ شخص اس قد و قامت کا ہو گا — اس کا چہرہ اس قسم کا ہو گا۔ اس کا اندازِ گفتگو کچھ یوں ہو گا۔ میں نے اس وقت تک مولانا روحی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ ایک فربہ اندام آدمی ہوں گے۔ بارعب چہرہ، گھنی داڑھی، آواز میں طنطنہ اور دبدبہ، عموماً جبہ پہنے ہوں گے۔ اور اُن کے گرد عقیدت مند شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی ہو گی۔ یہ شاگرد فرطِ احترام سے سر جھکائے بیٹھے ہوں گے۔

یہی تصورات ذہن میں لئے مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ ان لمحوں میں مسجد کے اندر جو کچھ دیکھا اس کے کم و بیش تمام اجزا اب تک حافظے میں محفوظ ہیں۔ مجھ سے کچھ دور چند بچے کتابیں یا تختیاں لئے صفوں کے اوپر بیٹھے تھے۔ آپس میں باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ دو بچے مار کٹائی میں بھی مصروف تھے اور اُن کے درمیان تختیوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔

میں نے سمجھ لیا۔ مولانا ابھی گھر سے تشریف نہیں لائے۔ واپس جانے کی سوچ رہا تھا کہ فضا میں کسی قدر بھاری آواز گونجی۔

"اے کیا ہو رہا ہے"

میں نے اُدھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ایک نحیف و نزار، ضعیف آدمی، مسجد کے پچھلے گوشے میں دو زانو بیٹھا تھا۔ سر پر پگڑی، آنکھوں پر بڑے موٹے شیشوں کی عینک، غالباً ایک ہاتھ میں تسبیح بھی تھی۔ انگلیاں

حرکت کر رہی تھی۔ اس شخص میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ یہ ایک ایسا شخص نظر آتا تھا جسے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو۔ بس ایک عام آدمی تھا۔ میں نے سمجھا کہ سکول کا کوئی فارغ (ریٹائرڈ) ماسٹر ہے جو اپنی بے کاری کے دن محلے کے بچوں کو پڑھا کر گزار رہا ہے یا یہ اس مسجد کا پرانا مولوی ہے جس نے اپنی ساری زندگی یہیں بتا دی تھی۔

بچے ابھی تک تختیوں سے ایک دوسرے کو "تختہ مشق" بنا رہے تھے۔ بزرگ کا سکون بری طرح برباد ہو رہا تھا اس نے پھر کہا:

"یہ کیا ہو رہا ہے!"

وہ لڑکا بولا جس نے اپنے ساتھی کو مارنے کے لئے تختی اوپر اٹھا رکھی تھی۔ "مولبی جی! کھالو (خالو) نے میری تنبی (شلوار) پر سیاہی گرا دی ہے۔"

"او خالد کے بچے!" بزرگ نے غصہ میں خالد کو مخاطب کیا۔ "باز آتا ہے یا نہیں!"

خالد بولا۔

"مولبی جی! یہ مودا (محمود) جھوٹ بولتا ہے"

"بس اب چپ ہو جاؤ"

بزرگ کی یہ للکار سن کر بچے خاموش ہو گئے۔

میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا جہاں نمازی اپنے جوتے اتارتے ہیں۔ اندر جانا بے سود لگا۔ میں نے اشارے سے اس بچے کو اپنی طرف بلایا جو اپنی شلوار پر سیاہی کا داغ دیکھ دیکھ کر شاید رونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرا اشارہ پا کر وہ میرے پاس آ گیا۔

"مولانا روحی کب آئیں گے!"

"مولبی جی"

"نہیں بھائی مولانا روحی"

"بس یہی مولبی ہیں۔" اور وہ تیزی سے اپنے ساتھیوں کے حلقے میں پہنچ گیا۔

مجھے لڑکے کی بدتمیزی پر غصہ آیا کہ یہ بھی نہیں بتا سکا مولانا روحی مسجد میں کب آتے ہیں۔ بہتر سمجھا کہ بزرگ ہی سے مولانا کا اتا پتا پوچھ لیا جائے۔ چنانچہ میں بوٹ اتار کر اس بزرگ کے پاس چلا گیا اور استفسار کیا۔

"مولانا روحی کب آئیں گے!"

"کیں!"

"جی مولانا اصغر علی روحی"

"فرمائیے"

"مجھے ان سے ملنا ہے، میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا ہوں" میں نے اپنی طرف سے تفصیل بیان کر دی۔

"فرمائیے" بزرگ نے دوبارہ کہا۔ ان کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کہوں تو کیا کہوں۔ انہوں نے تو "فرمائیے فرمائیے" کی رٹ لگا رکھی تھی۔

"جی ــــ وہ ــــ میرا مطلب ہے مولانا روحی ــــ کالج بند ہے نا جی ــــ اس لئے ــــ"

میں فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ بولے۔

"کہہ تو رہا ہوں فرمائیے"

"آپ مولانا روحی ــــ"

"جی"

یک لخت یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے تصورات، سارے خواب پاش پاش ہو گئے ہیں۔ چکنا چور ہو گئے ہیں، ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ کہاں مولانا روحی جن کی شہرت پر لگا کر چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی اور کہاں یہ سادہ، غیر اہم، بالکل معمولی بڈھا۔ میں خاموشی سے اپنے مجروح تصورات کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ وہ بولے۔

"کہاں سے آئے ہیں!"

"جی میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا ہوں"

"کوئی مشکل ہے تو بتائیے" مولانا نے مجھے عربی کا طالب علم سمجھ لیا تھا۔

"جی ایک نظم لکھی ہے ــ فارسی میں۔"

اور میں نے کتاب میں سے کاغذ نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیا۔ خیال کیا وہ کاغذ پکڑ لیں گے مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔

"نظم لکھی ہے ــــ اچھا ــ سنائیے۔"

"جی یہ ہے" کہنا یہ چاہتا تھا کہ آپ خود ہی تکلیف کر کے پڑھ لیں مگر مولانا اس قسم کی تکلیف گوارا کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھے۔

"پڑھئے" ارشاد ہوا!

میں تو اس مصیبت کے لئے تیار نہیں تھا۔ بادل نخواستہ کاغذ آنکھوں کے قریب لا کر پہلا شعر پڑھا۔ بس شامت آ گئی۔ "برخوردار یہ تلفظ صحیح نہیں ہے۔ یہ لفظ یوں پڑھو گے تو مصرع وزن سے خارج ہو جائے گا۔" ایسے فقرے سن سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔ اور جب انہوں نے میرے ایک غلط تلفظ پر کہا: "مسٹر! فارسی کی تعلیم کہاں تک ہے ــــ تو اپنے آپ پر بہت غصہ آیا کہ خوامخواہ ان کے پاس آ گیا۔ یہ تو بال کی کھال اتارتے ہیں۔ ان کا رویہ اہانت انگیز ہے۔

کم از کم آدھ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھا رہا۔ عجیب واقعہ یہ تھا کہ جب مسجد میں داخل ہو کر میں نے ان پر پہلی نظر ڈالی تھی تو انہیں ن۔م۔ راشد کے قول کے مطابق ملائے حزیں سمجھا تھا ــــ ایک بہت معمولی آدمی اور اب جب کہ نظم کی تصحیح کروا کر مسجد سے نکلنے لگا تھا تو وہ مجھے بہت غیر معمولی شخصیت نظر آ رہے تھے۔ سراپا علم و فضیلت، ایک ایسے بزرگ جن کے متعلق جگر مراد آبادی نے کہا ہے۔

"جو بیٹھو باادب ہو کر، جو اٹھو باادب ہو کر"

مولانا سے صرف چند ملاقاتیں ہو سکیں اور میں نے ان ملاقاتوں میں محسوس کیا کہ یہ بہت سادہ آدمی تو علم کا بحر بے کراں ہے۔ یہ ایک ایسا شخص ہے جو دیکھنے میں تو ایک خاک نشین معلوم ہوتا ہے لیکن جس کی انگلیاں ستاروں کو چھو رہی ہیں۔ جس کی جبیں اللہ سے ماہ چہاردہم کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں جو ایک ایسا چشمہ ہے جس کی فیضان بخشی کبھی کم نہیں ہوتی۔ جس طرح سورج کا دن بھر چمکنے سے کوئی زیاں نہیں ہوتا دوسری صبح وہ پھر پہلی سی آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہو جاتا ہے۔

مولانا اصغر علی روحی ــــ اپنے وقت کے علامہ دوراں ــــ ایک ایسی ہستی جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے۔

؎ نہ جا ان خرقہ پوشوں پر، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

آج مولانا سے آخری ملاقات اور موجودہ زمانے میں ہزاروں دنوں کے اجالے اور ہزاروں راتوں کی سیاہیاں بچھ چکی ہیں۔ مگر آج بھی جب میں اپنی تنہائیوں میں گزرے زمانے کا خیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے۔ میں بڑی عقیدت سے ایک چھوٹی سی مسجد کے اندر داخل ہو کر ایک نحیف و نزار بزرگ کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا ہوں اور لگتا ہے کہ میں ایک ایسے سمندر کو دیکھ رہا ہوں جس کی کوئی اتھاہ نہیں، جس کا دور دور تک کوئی کنارہ نہیں۔

(ساہیوال)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج اقدس، گرامی نامہ شرف صدور لاکر باعث صد بہجت و مسرت ہوا۔ آنجناب کے لئے عربی سوسائٹی کی صدارت مثمر صد برکات ہو۔

احقر بھی اورینٹل کالج لاہور میں ۱۶ء میں پڑھتا رہا ہے۔ ان دنوں عربی کے اعلیٰ پروفیسر شمس العلماء مولانا محمد عبداللہ ٹونکی مرحوم تھے۔ میں ان سے منشی فاضل کا کورس پڑھا کرتا تھا۔ جب مولانا ٹونکی مرحوم مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کر کلکتہ تشریف لے گئے تھے تو مولوی فاضل کا نصاب پڑھانے کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں حضرت مولانا اصغر علی روحی مرحوم و مغفور کے علاوہ کوئی شخص بھی موزوں نہ مل سکا۔ احقر ۳۶ء میں فارغ ہو چکا تھا اس سال کے بعد کے سال میں مولانا روحی صاحب اورینٹل کالج میں تعینات ہوئے تھے۔

چند ایک ماہ آپ نے کام کیا پھر استعفا دیدیا تھا اس کا باعث یہ ہوا کہ علامہ روحی صاحب کو معلوم ہوا کہ اورینٹل کالج کے اساتذہ کو مشاہرہ سود کی رقم سے ملتا ہے جو راجگان، نوابان ہندوستان کے جمع کردہ فنڈ کے سود سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ علامہ روحی صاحب کے اتقاء کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد احقر سرکلر روڈ پر نماز مغرب کے وقت گزر رہا تھا کہ ایک صاحب نے ذکر کیا کہ حضرت علامہ روحی صاحب موری دروازہ کے باہر ایک مسجد میں اس وقت مغرب کی نماز پڑھا کرتے ہیں۔ احقر اس مسجد میں گیا تو آپ نماز سے فارغ ہو کر تشریف فرما تھے۔ احقر نے سلام عرض کیا، مصافحہ کیا تو فرمانے لگے معاف فرمانا ——— یہ ہے حضرت روحی صاحب کی ملاقات کا اول و آخر ——— ان کی ایک تصنیف کردہ بہترین کتاب "ما فی الاسلام" احقر کے پاس فیروز پور چھاؤنی میں تھی جو بیمثال جامع کتب خانہ کے ساتھ وہیں رہ گئی ——— احقر کے ماہنامہ "شریعت" میں مولانا روحی صاحب کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا تھا آنکھوں میں سخت تکلیف کے باعث یہ لکھ سکا ہوں۔ امید ہے کہ اگر کوئی کوتاہی ہو تو معاف فرمائیں۔

والسلام

احقر شبلی عفی عنہ

قاضی سید احمد

(سینیئر کلرک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور)

حضرت مولانا روحی رح اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں عربی و اسلامیات کے استاد رہے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے جید عالم تھے۔ ان کا رعب اور دبدبہ اساتذہ، طلباء حتیٰ کہ کالج کی عمارت انکی تعظیم پر فخر کرتی تھی۔ میرے زمانے میں ہنری مارٹن، علامہ عبداللہ یوسف علی، J. LEACH WILSON پرنسپل تھے اور اساتذہ میں مولانا محمد عمر خان، حافظ محمود شیرانی وغیرہ تھے اور انجمن کے جنرل سیکرٹری خانصاحب شیخ عبدالعزیز مرحوم تھے۔ جب کبھی کبھار پرنسپل صاحب علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم کو ان سے کسی امور پر بات کرنی ہوتی تو وہ خود چل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

مولانا اصغر علی روحی مرحوم و مغفور نے اپنی کلاس میں کبھی کسی کتاب سے حوالہ نہیں دیکھا بلکہ اپنے حافظ سے کام لیتے اور تمام طلباء کے سوالات کا جواب دیتے۔ انکے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ڈراؤنی شکل کا عصا ہوتا تھا جس سے میں ہمیشہ خوف کھاتا تھا۔ جب کبھی سلام کے لئے حاضر ہوتا تو اس پر ہمیشہ ہاتھ رکھ لیتا کہ مبادا مجھ پر برسے کیونکہ مجھے الفت کی نگاہ سے ہمیشہ یاد فرماتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ہندو وکیل ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کسی مسئلہ پر روشنی چاہی۔ مولانا پہلے تو آرام سے اسے سمجھاتے رہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد غصہ میں آکر اپنا عصا اٹھایا اور وہ معافی مانگتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے عرض کی کہ مولانا یہ ملاقاتی تھا؟ فرمایا کہ بدطینت جان بوجھ کر اسلام کا مذاق اڑا رہا تھا۔

کالج میں جب تک وہ تشریف فرما رہے اس وقت تک کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ دنیا کی بات کرے یا آجکل کے زمانہ کے مطابق بلند آواز سے ہنسی وغیرہ کا لطف اٹھانا۔

ہفتہ میں ایک دن جمعہ کے روز کالج کے حبیبیہ ہال میں سرمن دیا کرتے تھے۔ اس دوران مکمل سناٹا چھایا رہتا۔ اور آپ کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا تھا۔ اور بعد میں وہ ہمیشہ

فرماتے کہ کوئی سوال کرنا ہو تو اجازت ہے۔ بعد میں دعا بھی فرماتے۔ عربی کی شعروشاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے
انجمن کے جلسوں میں قصیدہ بھی پڑھتے تھے اور کالج سے فارغ ہونے کے بعد اپنی محلہ والی مسجد
میں تشریف فرما رہتے اور درس و تدریس میں مشغول رہتے۔ لوگ جوق در جوق جن میں کالج کے طلباء اور اساتذہ
بھی ہوتے تھے، مسجد میں جاکر مستفید ہوتے۔ خاکسار بھی ہفتہ میں تین چار بار سلام کرنے کے لئے حاضر ہوتا اگر کسی
وجہ سے ناغہ ہو جاتا تو مجھے اچھی ڈانٹ پلاتے (یہ میرا نوجوانی کا وقت تھا) مجھے ہمیشہ اپنی اولاد کے برابر سمجھتے
اور مجھے اسی طرح ڈانٹ پلاتے۔

قاضی سید احمد
۳۳۱ - فیروزپور روڈ لاہور۔

مولانا عبدالعزیز المیمنی

(سابق پروفیسر عربی اورینٹل کالج - لاہور)

مما كتبه نحو سنة ۱۹۱۸ من بشاور

الى صديقي العلامة مولانا اصغر علي الروحي

وافى كتابك يا من لست اذكره — الا حدا بي حاد نحو لقياه
فمرحبا بجواب منك يؤنسني — ففيه للقلب منشاه و محياه
واها للاهور من مغنى الهناء فلا — يني ينشطني للوجد ذكراه
من موطن مسرح الآمال مقتطف ال — ازهار لست طوال الدهر انساه
سقيا ورعيا لذاك الدهر من عصر — سقى لي الله ملقاه و مرآه
ونكب الدهر عنك الدهر امته — وكان طوعك يمناه و يسراه

العاجز
عبدالعزيز الميمني
كراچی ۲۳ جولائی ۵۸ء

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

مولانا اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ

اس دفعہ دورانِ سفر یورپ و مشرقِ وسطیٰ بعض احباب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے بعض
قدیم اسلامیہ کالج کے طالب علم بھی تھے۔ ان سے   تذکرہ اسلامیہ کالج پرانے اساتذہ کا ذکر آ گیا اور اکثر کا
ذکرِ خیر دیر تک رہا۔ ان میں سے خاص کر قابلِ ذکر حضرت مولانا اصغر علی روحی صاحب مرحوم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔
جن کا انتقال لاہور میں ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ بمطابق ۳۱ مئی ۱۹۵۴ء کو ہوا۔ مولوی صاحب
کے بعض خاص جملے تک بعض احباب کو اسی طرح یاد تھے جو یہ بے ساختہ طلباء کو اپنا عزیز سرمایہ سمجھ کر کہہ
دیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی یادداشت اور ان کے ساتھ قرب کی وجہ سے بیان کیے۔ اگرچہ میں نے ان سے براہِ
راست پڑھا نہیں اور نہ تلمذ کا موقع ملا۔ چونکہ ہم سفر میں تھے اور مولانا کا ذکر بھی سفر ہی میں پیش آیا اس
لیے میں نے فوراً ایک دفعہ کا ذکر یوں کیا کہ میں ایک مرتبہ جب جنوبی ہند کے سفر سے واپس آیا اور مولانا کالج
کے کمپاؤنڈ میں حسبِ عادت کلاس لے رہے تھے۔ طلباء نے مولانا سے ذکر کر دیا کہ میں کمپاؤنڈ میں سے گزر کر کمرہ میں
جا رہا ہوں تو آپ نے فوراً اس لڑکے کو میرے پیچھے بھیج کر بلایا۔ میں مولانا کے ادب اور عظمت کو مدنظر رکھ کر ذرا
مؤدب ہو کر حاضر ہو گیا اور سلام کیا۔ فرمانے لگے کہ تم کہاں تھے نظر نہیں آئے۔ میں نے سفر کا ذکر کیا، ساتھ سفر کی
صعوبت اور حالات بیان کیے تو آپ نے جواباً فرمایا:

" السفر سقرٌ بل وسیلۃ الظفر "

فرمانے لگے کہ علامہ اقبال کا کیا حال ہے جن کو میں اگلی شام مل چکا تھا تو میں نے فوراً کہا کہ اللہ کا فضل و
کرم ہے بخیریت ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی گزشتہ ملاقات کا ذکر فرمایا جو علامہ سے میرے توسط سے ہوئی تھی۔ میں نے
عرض کیا کہ حضرت ابھی میں سفر سے واپس آیا ہوں اور مختصر ملاقات میں، میں نے علامہ سے کوئی مفصل ملاقات یا گفتگو

نہیں ہوئی۔ مولانا اصغر علی روحی صاحب نے تمام خیریت و حالات دریافت فرمائے۔

مولوی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے بحیثیت طالب علم اورینٹل کالج ۹۳ — ۱۸۹۱ء میں ایم۔ او۔ ایل کی ڈگری حاصل کی تھی اور اسی سال اسلامیہ کالج کے جاری ہونے پر وہاں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مولانا کی عظمت اور وقار سب سے بڑھکر ان کا علمی تبحر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اسی کالج میں ان کے قیام پر ذرا تاریخی نظر ڈالی جائے۔ میرے خیال میں وہ اس کالج سے اسی زمانہ سے منسلک ہوئے تھے جب اس کالج کا آغاز ۱۸۹۲ میں موجودہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور کی عمارت میں دو کمروں سے ہوا تھا، اور جب ۱۹۰۰ء میں بی۔ اے کی جماعتیں جاری کرنا ضروری ہو گیا تو ریلوے روڈ پر جہاں آج کل امروز سینما ہے وہاں مسجد سید مٹھو علی شاہ کی عمارت میں منتقل ہو گیا، جسے میں نے بھی دیکھا ہے اور خاص کر یہ کالج اسلامی درسگاہ ہونے کی وجہ سے بہت مقبول نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں ایک وفد نے جو اسی کالج کے پروفیسروں پر مشتمل تھا بیرون لاہور دورہ کیا جس کے روح رواں مولوی اصغر علی روحی تھے یعنی قائد وفد تھے اور یہ وفد شملہ پہنچا جہاں مسلمان باشندے شملہ میں مولانا کی لیاقت اور تبحر علمی کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور فیاضانہ دریا دلی سے زر کثیر بطور چندہ دیا۔ آپ کے لیکچر اسلامی علوم میں بہت ہی موثر اور اسلامی تاریخ سے پر ہوتے تھے جس کی شہرت بہت تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں اس کالج میں علوم عربیہ کی کلاس جاری ہوئی جو محض آپ کی موجودگی کی وجہ سے اور آپ کی لیاقت پر انحصار کرتے ہوئے جاری کی گئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک یونیورسٹی میں باقاعدہ پڑھانے کا انتظام اورینٹل کالج میں ایم۔ اے کی بجائے مولوی فاضل تک ہی محدود تھا۔ جب ۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ والی افغانستان نے کالج کی بنیاد رکھی جس کی یاد میں کالج کا وسیع ہال آج بھی آپ کے نام پر حبیبیہ ہال کہلاتا ہے اور وہ یادگار بنیادی سنگ مرمر کی سل آج بھی محفوظ ہے۔ اس وقت بھی خاص طور پر مولوی صاحب کو بحیثیت عالم دین امیر حبیب اللہ خان کی خدمت میں متعارف کرایا گیا۔ راقم نے بھی اس عظیم الشان مجمع اور جلسہ میں بحیثیت طالب علم شرکت کی تھی۔

میں جب کالج میں عدم تعاون کے زمانہ ۱۹۱۹ء میں کالج کے جے ۔ اے ۔ وی کے شعبہ میں ڈرائنگ ماسٹر شامل ہوا اور ۱۹۲۱ء تک رہا تو میرے لئے پہلا موقع تھا کہ میں نے مولوی صاحب کو قریب سے دیکھا۔ چونکہ مجھے علوم اسلامیہ سے ایک خاص رغبت رہی اس وجہ سے بھی آپ کے علم سے ہمیشہ مستفید ہوتا اور یہی دیکھا کہ مولوی صاحب ایک خاص متمیز حیثیت رکھتے ہیں اور عربی زبان پر آپ کو بہت عبور تھا اور لوگوں میں آپ کا

ایک وقار تھا۔

میں جب اسلامیہ کالج میں پھر ۱۹۲۵ء میں اسی شعبہ سے ۔ آ ۔ جو ی سے بحیثیت لیکچرار منسلک ہوا اور یہ زمانہ دراصل کالج کی تاریخ میں بہت اہمیت اسی حصہ سے رکھتا ہے کہ کالج کے پرنسپل علامہ عبداللہ یوسف علی تھے جو خاص طور پر لندن سے اقتین ہو کر آئے تھے اور اس وقت کالج میں عربی فارسی کے لئے قابل ذکر مولانا اصغر علی روحی ۔ مولانا محمد عمر خان ٹونکی اور مولوی احمد علی خطیب شاہی مسجد لاہور تھے ۔

میرے خیال میں مولانا کا وجود اس وقت زیادہ لوگوں کے علم میں آیا جب ۱۸۹۷ء میں بعض علماء دین کی رحلت کے باعث علوم عربیہ کو ناقابل برداشت نقصان پہنچا اور انجمن حمایت اسلام کی توجہ زیادہ علوم دینیہ کی طرف منعطف ہوئی اور علماء سے مشورے بھی کئے گئے تو نصاب تعلیم میں ترمیم کی اہمیت محسوس ہوئی ۔ چنانچہ اس وقت بھی مولوی صاحب کی اعانت اور شرکت سے جامع ازہر مصر کے مدرسہ عالیہ اور پنجاب یونیورسٹی کے نصابوں کو مدنظر رکھ کر ایک ایسا نصاب تیار کیا گیا جس سے چھ سال کا عرصہ میں ایک پرائمری پاس طالب علم تعلیم دینی کی تکمیل کر سکے معلومات قدیمہ وجدیدہ سے شناسا ہو کر صاحب فتویٰ ہو سکے اور آپ کے مشورہ سے علم طب بھی اس سال نصاب میں شامل ہوا اور یہی زمانہ وہ ہے جب مدرسہ حمیدیہ جو کئی سال تک درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتا رہا ، جس کے بانی مبانی خلیفہ حمید الدین تھے اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس وقت جو مسئلہ علوم دین اور تبلیغ دین اور سب سے بڑھ کر علوم عربیہ سے متعلق تھا اس میں آپ کی شخصیت کارفرما تھی کیونکہ آپ اسی طرح منفرد علوم میں حیثیت رکھتے تھے جس طرح اس زمانہ میں علوم اسلامیہ کی واحد درسگاہ انجمن حمایت اسلام کا قائم کردہ اسلامیہ کالج شمار ہوتا تھا ۔

چنانچہ انجمن حمایت اسلام نے جو اس وقت دینیات کے رسالے اور کتابیں اسلامی مدارس کے لئے اعلیٰ مولویوں اور عالموں سے لکھوا کر شائع کیں ان کی تمام افادیت اسی سے واضح ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں رائج ہو گئیں اور میرے خیال میں یہی زیادہ انجمن حمایت اسلام کی شہرت کا باعث ہوئیں ۔ یہ تو مجھے علم نہیں کہ ان میں مولانا اصغر علی روحی صاحب کا کیا کردار یا حصہ ہے ۔ مگر یہ مسلّمہ ہے کہ یہ اس وقت انجمن حمایت اسلام کے علماء میں ایک اعلیٰ عالم دین اور اعلیٰ معلم عربی زبان کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے ۔ یہ بھی واضح ہے کہ بحیثیت محفل میں ایک آدمی کے اشارہ سے تمام مسئلہ حل ہو جاتا ہے خواہ وہ مسئلہ طے شدہ اس جماعت کی طرف ہی منسوب ہو ۔

میرے نزدیک آج جو یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے شعبے قائم ہیں اور طلبہ ایم ۔ اے کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں ۔ یوں کہئیے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد علوم اسلامیہ کا بہت ہی احیاء نظر آتا ہے ۔ مگر اگر

غور سے مطالعہ کیا جائے تو معیار جو ہمیں آج ان طلباء و اساتذہ میں نظر آتا ہے وہ بمقابلہ تمام جدوجہد اور اخراجات کے جو آج اسلامیات کی تعلیم پر خرچ ہوتے ہیں اس پہلے زمانہ کے بہت ہی ادنیٰ نظر آتا ہے۔ مجھے اس زمانہ میں ابتداء سے لے کر کم سے کم میٹرک تک کی جماعتوں میں انجمن حمایت اسلام کی مطبوعہ اور تیار کردہ کتب برابر پڑھائی جاتی تھیں اور ان کا بیشتر حصہ مولوی روحی صاحب کے مشوروں اور علمی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

لاہور میں اعلیٰ سوسائٹی میں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ جنگِ عظیم کے بعد قریب ۱۹۱۹ء کے میں پنجاب کے بعض سربرآوردہ مسلمان حضرات نے محض خوشامد کی بنا پر یہ تجویز کیا کہ اگر مقامات مقدسہ مکہ و مدینہ پر انگریز قابض ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس ضمن میں ایک بہت بڑا محضرنامہ تیار کیا گیا جس پر ان حضرات کے دستخط ثبت کئے گئے۔ چنانچہ اسی محضرنامہ کو مولانا اصغر علی روحی صاحب کے سامنے بھی نہایت لطائف الحیل سے پیش کیا گیا کہ وہ اس پر دستخط ثبت کر دیں جس پر مولوی صاحب لاحول و لا قوۃ الا باللہ پڑھنے لگے۔

اگلے روز لاہور میں میاں امیرالدین صدر انجمن حمایت اسلام نے یہی واقعہ بیان کیا کہ لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں پنجاب کے سربرآوردہ حضرات اور علماء کو جمع کیا گیا، بہت بڑی دعوت کی گئی اور لوگوں نے خوشی خوشی اس پر دستخط کر دیئے۔ مگر مولوی روحی صاحب اور ایک اور صاحب نے دستخط نہیں کئے تھے۔

مولانا علم الدین سالک

(پروفیسر فارسی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور)

مولانا اصغر علی روحی رح کے متعلق متفرق قسم کی یادیں ذہن میں موجود ہیں، جو میرے لئے باعثِ افتخار ہیں اور مختصراً وہ حسب ذیل ہیں:-

۱ مولانا رخصت بہت کم لیتے تھے جو پرانی تربیت کا نتیجہ تھا کیونکہ قدیم تعلیم میں رخصت کا دستور نہ تھا۔ میں اس پہلو سے بہت متاثر ہوا اور یہاں تک اثر ہوا کہ بیماری کی حالت میں بھی کالج آ جاتا تھا۔

۲ میرے بھائی فضل الدین نور فارسی ایم۔ اے میں پڑھتے تھے۔ اسلامیہ کالج میں مولانا پڑھاتے تھے۔

اعلیٰ شعر پر لذت محسوس کرتے تھے۔ بیدل کے شعر پر جھومتے تھے۔ لڑکوں کی استدعا پر اردو، پنجابی بالخصوص ہیر کے شعر سناتے تھے

۳ جس طالب علم میں کوئی خوبی ہوتی اس پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ ایسے طالب علم کو عرفیت سے پکارتے تھے مثلاً آدری کو "بڈاوا" کہتے تھے۔ طلبہ سے عموماً بے تکلف تھے مگر سٹاف روم میں نہایت سنجیدہ رہتے تھے۔ جب تشریف لاتے تو سب با ادب ہو جاتے۔

۴ Sermon لازمی چیز تھا۔ طلبہ و اساتذہ کی حاضری لازمی تھی۔ بیشتر دفعہ مولوی محمد عرفان وعظ کرتے تھے، مولانا بھی کبھی کبھی خطاب کرتے تھے۔ بے خوف ہو کر حق بات کہتے تھے۔ ان کا وعظ موثر ہوتا تھا۔ قرآن و حدیث سے باہر نہ جاتے تھے۔

۵ ایبٹ آباد میں ایک دفعہ انہوں نے وعظ کیا تھا۔ میں وہاں گیا تو بیس بائیس برس کے بعد بھی لوگ یاد کرتے تھے قدیم تعلیم والے کہتے تھے کہ صرف ایک شخص دیکھا ہے جس کی قرآن پر گہری نظر ہے اور جو عربی ادب کا ماہر ہے۔

۶ پنجاب یونیورسٹی نے مارگولیتھ کو عربی مورخین پر لیکچر دینے کے لئے بلایا۔ وہ اسلامیہ کالج میں بھی آیا۔ مولانا کا تعارف عبداللہ یوسف علی پرنسپل نے کرایا۔ مارگولیتھ نے عربی بولنا شروع کیا۔ مولوی صاحب اٹک کر بولتے تھے۔ اس کے چہرے سے استہزا ظاہر ہوا۔ پرنسپل نے بات کی تو مولانا نے حماسہ منگایا اور چار پانچ شعروں پر نشان لگا کر کہا: ان کو حل کرو۔ مارگولیتھ نے کہا: وقت دیں۔ مولوی صاحب نے پوچھا: ایک ہفتہ، ایک ماہ، ایک سال۔ اپنے مددگاروں کو بھی لگاؤ اور حل کرو۔ پھر مولوی صاحب نے بلیک بورڈ پر ایک بے اعراب شعر لکھا مگر وہ نہ پڑھ سکا۔ اسکو اعترافِ عجز کرنا پڑا۔ جو لوگ یورپ سے پی ایچ ڈی کر کے آتے تھے۔ ان کو دخاترہ کہتے تھے۔

۷ ایک پروفیسر نے ایک دفعہ رمضان کا احترام نہ کیا۔ سگرٹ پیتا تھا۔ لڑکوں نے شکایت کی۔ مولوی صاحب نے سٹاف روم میں بلایا اور پوچھا کہ سگرٹ کیوں پیتے ہو؟ اس نے کہا: میں نے روزہ نہیں رکھا۔ کہا کہ احترام بھی ہونا چاہیے اس نے کہا: یہ منافقت ہے کیونکہ خدا کو علم ہے کہ میں نے روزہ نہیں رکھا پھر انسان بندوں سے کیوں ڈرے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ شوہر اور بیوی میں جو تعلقات ہوتے ہیں۔ ان کا قائم کرنا، شرعاً، اخلاقاً، قانوناً اور رواجاً ہر طرح جائز ہے۔ لیکن لوگوں کی موجودگی میں آپ ان تعلقات کو پھر بھی قائم نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو جائز ہوتے ہوئے بھی عوام کے سامنے نہیں کئے جا سکتے۔ ماہ رمضان میں سگرٹ پینا بھی ایسا ہی ہے۔

۸ انجمن کے سالانہ جلسہ پر ایک بار رواج تھا کہ باہر سے بڑے بڑے آدمیوں کو بلاتے تھے اور جلسے سے ایک روز پہلے جلوس نکلتا تھا۔ اراکینِ انجمن فٹن اور موٹر پر ہوتے تھے اور سامعین اور طلبہ پیدل تمام شہر کا چکر لگاتے تھے۔ ایک دفعہ انجمن نے صدر دفتر میں اجلاس بلایا۔ جنرل سیکرٹری (غلام محی الدین) تقریر کرنے لگا کہ یہ ہوگا وہ ہوگا۔ مولوی صاحب نے میز پر ڈنڈا مار کر کہا کہ سنو۔ میں مفتیِ دین کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ یہ جلوس حرام ہے۔ سیکرٹری نے دوبارہ بولنا چاہا۔ مولوی صاحب نے ڈانٹا۔ بات بڑھنے لگی تو خلیفہ شجاع الدین نے کہا: جلوس نہیں نکالیں گے۔

۹ سردیوں میں عموماً کلاس گراؤنڈ میں لیتے تھے۔ ایک دفعہ طلبہ سپیرے کو لے آئے۔ وہ سانپ دکھاتا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔ اسکی نوعیت کیا ہے۔ سپیرے نے کہا: یہ فلاں جگہ، فلاں آب و ہوا میں ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر کہا: خناس میں اس کی نوعیت پوچھتا ہوں تو ظرف مکان بتاتا ہے۔ وہ اپنا سامان لے کر بھاگا۔

۱۰ ایک مانگتی ہوئی عورت آئی تو اس نے عربی میں کچھ کہا وہ بھاگ گئی

۱۱ مولوی شفیع نے جب ایم۔ اے عربی کے بعد ولایت جانے کا ارادہ کیا تو وقت مانگا کہ وہ پڑھنا چاہتا ہے تو مولانا نے وقت کی معذرت کی اور یہ اجازت دے دی کہ گھر سے کالج کے راستہ تک پڑھ لیا کرو۔

۱۲ بعض لوگ وابستگی کی خاطر کچھ پڑھنے آتے تھے۔ وہ کبھی اس معاملہ میں بخل نہ کرتے تھے۔

۱۳ مذہب کا پورا احترام خود بھی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کراتے تھے۔ منافق جو بظاہر اسلام کو پسند نہ کرتے تھے اور ہر وقت اُن کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ مولانا ان کو قابلِ خطاب نہ جانتے تھے۔ وہ بات بھی کریں تو منہ دوسری طرف کر لیتے تھے۔

۱۴ ہلال (امرتسر) کا پرچہ نکلتا تھا۔ اس میں روح کے بارہ میں بالاقساط مضمون نکلتا تھا

۱۵ تذکرہ شعرائے پنجاب (کرنل رشید) نے لکھی ہے اس نے بھی مولانا کا کچھ ذکر کیا ہے

۱۶ اپنے محلے میں گوجروں کی اصلاح کی۔

عنایت اللہ چشتی

(چکڑالہ تحصیل وضلع میانوالی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا شفقت نامہ ۲۶ر اکتوبر کا لکھا ہوا ۱۲ر نومبر کو شرف صدور ہوا۔ حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ علماء سلف کا صحیح نمونہ تھے۔ میں نوجوان تھا۔ مولانا عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ ہم انہیں مقدس شخصیت کے تصور سے گاہے گاہے ان کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ مجسم شفقت و رحمت کا پیکر تھے۔ ان کے اپنے بنا کردہ مکان کے سامنے چھوٹی سی مسجد تھی۔ عموماً مسجد میں ہمیں شرف زیارت حاصل ہوتا تھا ہم ان کے علمی معاصر نہیں تھے کہ ان سے کسی علمی گفتگو کی جرأت کرتے۔ ہمارا مقصد زیارت کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اتنا علم ہے کہ وہ اپنے وقت کے متبحر عالم اور پاکیزہ عقائد و اعمال کے حامل تھے۔ ہمیں یہ علم ضرور تھا کہ وہ سنی، حنفی صحیح العقیدہ عالم تھے۔ علم میں ان کے معاصر مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہ علماء تھے۔

عربی زبان کے قادر الکلام فاضل تھے۔ عربی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ انہوں نے ایک رسالہ بھی جاری کر رکھا تھا جو موت تک چلتا رہا۔ اس میں وہ اپنے علمی جواہر لکھتے تھے۔ محترم علی صاحب چشتی سے بڑا قریب کا رابطہ تھا۔ ان کے علوم کا کھوج تو ان کے اس رسالہ سے لگایا جا سکتا ہے، کہیں سے اس رسالے کا فائل مل جائے تو اس سے بہتر ان کے علم و تقویٰ کو سمجھنے کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ معلوم نہیں ہوتا۔ وہ لوگ گئے، وہ علمی محفلیں گئیں

؎ حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند   تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

میری عمر کی کم و بیش اسی منزلیں ختم ہونے والی ہیں۔ ہمیں تو اپنا معاصر بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ حضرت مولانا روحی تو ہم سے پہلے کے ہیں۔ اسلامیہ کالج لاہور میں عمر بھر پروفیسر رہے۔ حکام و طلباء میں ان سے زیادہ کوئی بھی ہر دلعزیز نہیں تھا۔ علم و عمل و اخلاق، صحت عقائد غرضیکہ وہ ہر حمیدہ صفت سے متصف تھے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام دے اور ان شاء اللہ دیا ہوگا۔

میں اس سے زیادہ آپ کے علم میں کچھ بھی اضافہ نہیں کر سکتا۔ بڑھاپا غالب ہو رہا ہے۔ حافظے

بھی جواب دے دیا ہے۔ ایک چھوٹی سی بستی جس کا نام چکڑالہ ہے۔ گوشہ نشین ہوں۔ طبیعت بحال ہو تو مطالعہ کر لیتا ہوں، نہ کوئی سوسائٹی ہے اور نہ کوئی ہماری بات ہی سمجھنے والا کس سے کچھ کہیں، کس کو سمجھائیں۔ یاد آوری کا مشکور ہوں اور کئی دن تک مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ کا تصور دل و دماغ پر چھایا رہے گا۔ میں آپ کا اس لئے بھی ممنون ہوں کہ آپ نے میری بھولی بسری یادیں تازہ کر دی ہیں۔

مولانا کیا عرض کروں، قلم رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ　　　　هو المسك ما کررته یتضوع

والسلام

تابعدار: عنایت اللہ چشتی

مولانا غلام مرشد

(خطیب شاہی مسجد لاہور ۶۶-۱۹۳۵ء)

مولانا اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ سے خاکسار غلام مرشد کی ایک ملاقات

خاکسار نے مروجہ درس نظامی کی تکمیل کے لئے اکتوبر ۱۹۱۱ء سے جولائی ۱۹۱۶ء تک دار العلوم نعمانیہ هند اندرون ٹکسالی دروازہ لاہور اور اورینٹل کالج اور دار العلوم حمیدیہ متصل شیرانوالہ دروازہ لاہور کے اکابر اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ان اکابر اساتذہ کے سرخیل مولانا غلام رسول ساکن بستی انہیال ڈاکخانہ کٹھالہ شیخاں ضلع گجرات، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی بانی مستشار العلماء اور مولانا محمد ذاکر بگوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین تھے۔ اول الذکر بزرگ بسا اوقات مولانا اصغر علی روحی سے ملاقات کرنے کی غرض سے چونڈی والی مسجد میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے ہمراہ خاکسار کو بھی لے گئے اور مشفق استاد کے فرمانے پر مولانا روحی مرحوم نے چند علمی سوالات فرمائے اور خاکسار کے جوابوں سے خوش ہو کر دعا فرمائی۔

موچی دروازہ کے محترم مسلمانوں نے خلیفہ شجاع الدین مرحوم و مغفور کی وساطت سے مسجد تکیہ خان میں قرآن کریم کا درس جاری کرانے کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ نے درس دینا شروع کیا۔ سورۃ فاتحہ

کا ہی درس دیتے تھے "ایاک نعبد وایاک نستعین" کا بڑے محتاط طریق پر یہ ترجمہ فرمایا "صرف تمہاری ہی عبادت کرتے رہیں گے اور صرف تم ہی سے مدد مانگتے رہیں گے"۔ اس ترجمے پر ایک معتقد جوشیلے ملان نے آپ سے دریافت کیا کہ ترجمے میں "اور" "اور ہی" کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے اس کا جواب دیا کہ بندگی کرتے رہیں گے ہم تمہاری اور نہیں بندگی کریں گے ہم تمہارے سوا کسی کی اور مدد مانگتے رہیں گے تم سے اور نہیں مدد مانگیں گے ہم تمہارے سوا کسی سے۔

اس سے متاثر ہو کر اس نے قرآن مجید چوکیوں سے اٹھا کر طاقوں میں رکھ دیئے اور چوکیوں کو ایک طرف کر کے کہا کہ آئندہ اس مسجد میں مت آنا۔ ہم وہابی بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل محمد خلیفہ شجاع الدین نے بتائی۔ یہ واقعہ ۲۳-۱۹۲۲ء کا ہے۔

خاکسار

ایم۔ غلام مرشد

پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری

حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی رحمہ اللہ پنجاب کے بلند پایہ علماء میں سے تھے۔ یوں تو آپ کو تمام علوم عربیہ میں دسترس حاصل تھی لیکن خصوصاً عربی ادب میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ جامع مسجد میاں محمد جان صاحب مرحوم امرتسر میں ہر سال حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے یوم وفات پر جلسۂ عام منعقد ہوا کرتا تھا جس میں پنجاب اور یو۔ پی کے علماء کو دعوت شرکت دی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا روحی کو بھی دو مرتبہ شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ آپ نے جلسہ میں شریک ہو کر تقریر فرمائی۔ آپ کی تقریریں واعظانہ نہیں بلکہ عالمانہ اور محققانہ ہوتی تھیں۔ جن میں موضوع تقریر پر سیر حاصل تبصرہ ہوتا۔ مگر آپ کسی فرقہ اور کسی گروہ کو نشانۂ ملامت نہ بناتے۔ آج اس قسم کے روشن خیال علماء تو گویا نایاب ہو رہے ہیں لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا

(پیرزادہ) محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری عفا اللہ عنہ

ڈاکٹر پیر محمد حسن

(راولپنڈی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا یاد آوری کا شکریہ

گزارش ہے کہ حضرت علامہ روحی صاحب رحمہ اللہ سے مجھے تلمذ نہ تھا اور نہ ہی ان کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ صرف دو مرتبہ ان کی خدمت اقدس میں حاضری دی ہے اور وہ بھی قاضی ظہیر الدین صاحب کی معیت میں۔ دونوں بار زیادہ تر روئے سخن قاضی صاحب کی طرف رہا اور اس مختصر سے عرصہ میں اس خاکسار سے ایک آدھ بات ہی ہوئی۔

مرحوم شبلی اکثر ان کی باتیں بیان کیا کرتا اور شبلی نام بھی ان ہی کا رکھا ہوا تھا۔ بعض حضرات کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت رکھی ہوتی ہے کہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات کا اثر ہوتا ہے اور یہ بات حضرت روحی رحمہ اللہ میں بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کو انہوں نے کسی خاص نام سے پکارا وہی مشہور ہو گیا اور آخر دم تک وہی نام زبان زد خلائق رہا۔

پنجاب یونیورسٹی کا بی۔ اے کورس جو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء کے عرصہ میں تھا۔ اس کی شرح میمن نے لکھی تھی وہ اس وقت ایڈورڈ کالج پشاور میں تھا۔ اس شرح پر حضرت علامہ روحی رحمہ اللہ کی تقریظ عربی زبان میں تھی اور میمن نے اس تقریظ کو اپنی شرح کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس تقریظ کے مضمون سے پہلے میمن نے حضرت کی تعریف میں کلمات لکھے تھے۔ میں نے خود اسے پڑھا ہے۔ مگر وہ الفاظ اب یاد نہیں۔ اگر وہ شرح کہیں سے مل جائے تو بہتر ہوگا

حضرت کی تصانیف میں دبیر عجم آپ کے بلند مقام کا بیّن ثبوت ہے۔ اس میں اگرچہ کسی قدر مختصر المعانی کا تتبع پایا جاتا ہے پھر بھی جو بحثیں انہوں نے اس میں کی ہیں ان کی مثال متقدمین میں سے کسی کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ تمام مثالیں اور بحثیں ان کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہیں اور ان کی علمی اور دماغی

قوت پر دال ہیں۔ علم کلام پر جو کتاب انہوں نے لکھی ہے اگرچہ مجھے اس کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جن لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ بتاتے ہیں کہ اس میں دین حقہ کی تائید میں نہایت دقیق اور پر از معلومات بحثیں آگئی ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ما کل من نال الحمی اسمع الندا　　من اصله اهلا بهذا الالهام

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت کا رعب اور احترام اس قدر تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی بھی آپ کے سامنے چوں نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سر فضل حسین جو کالج کمیٹی کا صدر تھا کلاس میں آگیا۔ آپ اپنا ڈنڈا اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لئے اور کہا کہ تو کلاس میں کیوں گھس آیا۔ فضل حسین کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ وہاں سے بھاگ جائے اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے اس فعل پر اعتراض کر سکے۔ یہ مرد مومن کی علامات میں سے ہے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا شیوہ تھا۔ یہی کچھ باتیں ہیں جو اوروں سے سنی ہیں اور ذہن میں رہ گئی ہیں۔ اگر مجھے ذاتی طور پر ان کی صحبت سے حظ اٹھانے کا موقع ملا ہوتا تو بہت سی باتیں یاد ہوتیں۔

والسلام خیر الختام

پیر محمد حسن

میاں محمد شفیع (م ش)

(ماڈل ٹاؤن لاہور)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۶ مئی پیش نظر ہے۔ حضرت مولانا اصغر علی روحی کی بابت تو میں نے کی ہے۔ ان کا لباس، ان کی آنکھوں پر رنگین عینک، ان کا قد کاٹھ، ان کی وجاہت اور ان کے ہاتھ کا موٹا ڈنڈا سب کچھ یاد ہے، لیکن ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ۱۹۲۹ء میں اسلامیہ کالج میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ ہمارے عربی کے استاد پروفیسر عبدالباسط (علیگ) تھے۔ حضرت مولانا روحی بڑی جماعتوں کو عربی پڑھاتے تھے۔ لہٰذا ان کے سامنے جانے کا کبھی موقع نہ ملا۔

مولٰنا کی عمومی شخصیت بے حد باوقار تھی۔ ان کی صوری شخصیت تو بے حد قابل احترام تھی۔
اس دور میں مولٰنا محمد عمر خاں صاحب دینیات کے معلم ہوتے تھے، لیکن مولانا روحیؒ کے مقابلے میں ان کی شخصیت
ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ دینیات کا پیریڈ لیتے تھے تو طلبہ بہت بدتمیزی کرتے تھے اور مولٰنا
عمر خاں کچھ کر نہیں سکتے تھے لیکن مولانا روحیؒ کا معاملہ دیگر تھا۔ ان کے سامنے کسی کو گستاخی کی جرأت نہ ہو سکتی تھی
یہ اس لئے کہ مولٰناؒ کے ایک عالم باعمل ہونے کی شہرت تھی۔ البتہ نوجوان نسل کی گمراہی پر گہرا رنج والم ہوتا تھا
مجھے افسوس ہے کہ میں مولاناؒ کے دور میں ایک گمنام سا طالب علم تھا جسے مولٰنا کے سامنے حاضر ہونے
کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ البتہ عبدالبشیر آذری جو خدا کے فضل و کرم سے زندہ و سلامت ہیں وہ کالج کے ایک
بہت اہم رکن تھے۔ تھے بھی وہ پکے مسلمان۔ اگر آپ ان سے ملیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو حضرت مولٰناؒ کے
متعلق سیر حاصل باتیں بتائیں گے۔

والسلام

محمد شفیع (م۔ش)

سید بدر محی الدین قادری

سجادہ نشین

دربار قادریہ فاضلیہ (بٹالہ شریف)
فاضلیہ کالونی ۔ فیروزپور روڈ ۔ لاہور۔

الحمدللہ والصلوۃ علی رسولہ الاکرم افضل المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد و علی الہ الذین ہم مخزن علمہ والکتاب العزیز واصحابہ الذین اصبح الدین بہم فی حرز حریز۔
مجھے جناب مولانا اصغر علی روحی (نور اللہ مرقدہ) کے متعلق چند سطور تحریر کرنے کے لئے متوجہ کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ نہایت اختصار سے ممدوح کی علمی عظمت اور ان کے ذوق معرفت الٰہی کے متعلق لکھوں۔

جناب مولانا اصغر علی روحی علمی دنیا میں مستجمع الصفات تھے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اقلیم علوم کے آفاق گیر تھے۔ وہ ان حنفی علماء میں سے تھے جو ارتقائے فکری کا تسلسل جاری رکھتے ہیں اور تحقیق کے عالی اور تفحص کی گہرائیوں سے جواہر نکال کر اسلام کے محتویات کی آرائش جمال میں مصروف رہتے ہیں اور ان کے عالی الشان افکار تبلیغ اسلام کی راہوں کو درخشاں کرتے رہتے ہیں۔ مولانا ممدوح اسلامیہ کالج لاہور میں علم الادب (عربی) کے جلیل القدر استاذ (پروفیسر) تھے۔ ان کی علمی فضیلت کی عبقریت علو ہمت۔ امور دین میں صلابت و حمیت و اخلاص اور تحقیق علوم میں دقیق النظری اور دنیوی امور میں استغنا کی وجہ سے ان کا تشخص کالج میں کالج کے باہر بھی نہایت ممتاز تھا۔ ان کی تدریسی مصروفیتیں دراصل طالب علموں کے دلوں میں اسلام کے روحانی عقائد کے متعلق تعمق جذب و کشش اور ذوق یقین کی تخلیق کے لئے مختص تھیں۔

ماضی کے قریب زمانے کی بات ہے کہ میرے والد محترم مرشد معظم حضرت عارف کامل سید نور محی الدین صاحب قادری (رضوان اللہ علیہ) سجادہ نشین (بٹالہ شریف) کی خدمت میں آپ کے ایک معزز مخلص عقیدت مند نے جناب مولانا اصغر علی صاحب روحی کی تعریف و توصیف کر کے عرض کیا کہ جناب مولانا ممدوح کو دربار قادریہ فاضلیہ کے سالانہ عرس پر تقریر کرنے کے لئے دعوت دی جاتی ہے۔ یہ سالانہ تقریب حضرت غوث اعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا عرس ہے جس کو دربار قادریہ فاضلیہ کی قدیمی روایات میں بڑی اہمیت و حیثیت ہو چکی ہوئی ہے۔ تقریباً تین سو سال سے یہ عرس مبارک قدسی روایات کے مطابق ادا ہوتا ہے۔ اس لئے اس عرس پر تقریر کرنے کے لئے کسی عالم کو بڑی احتیاط سے منتخب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جناب مولانا ممدوح کو دعوت نامہ تقریر کے لئے بھیجا گیا۔ اور انہوں نے عرس مبارک پر تقریر فرمائی اور اس کے بعد متواتر کئی سال آپ بٹالہ شریف کے اس عرس مبارک پر تقریر فرماتے رہے۔

اس کے بعد ایک دفعہ اس رفیع الشان تقریب پر آپ نے تقریر کے اختتام پر تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ اس رفیع القدر تقریب پر متواتر کئی سال سے تقریر کرنے سے مجھ غوث کی تجلیات انوار نے فقر سے ایک واضح تعارف عطا کر دیا ہے اور میں اس عنایت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

یہ فرما چکے تو مولانا ممدوح کافی دیر تک اشکبار رہے اور تقریر ختم ہو گئی۔

حضرت غزالیؒ نے روحانی درجات تجلیات کی جو توضیح فرمائی ہے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ جب کوئی علم و ادراک کا علوّ اور صعود پالینے کے بعد اتنا خوش بخت ہو جائے کہ وہ قرب الٰہی و ذکر الٰہی کی رسائی پالے تو اس کا ثمر تجلیات انوار الٰہیہ کا نزول ہوتا ہے

والسلام

سید بدر محی الدین قادری
سجادہ نشین
دربار قادریہ فاضلیہ (بٹالہ شریف)
فاضلیہ کالونی - فیروز پور روڈ لاہور۔

مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۷۹ء
لاہور

فصل سوم

(اہلِ محلّہ)

میاں حبیب اللہ عرف میاں عبدالباقی ولد میاں قدرت اللہ مرحوم

ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پاکستان ڈیفنس آڈٹ ڈیپارٹمنٹ

میری پیدائش نومبر ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ آٹھ برس کی عمر میں مجھے کچھ شعور حاصل ہوا تو والدین نے بیرون اکبری لاہور کے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا اور ساتھ ہی اپنے گھر سے ملحقہ مسجد میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضلع گجرات کے ایک نابینا حافظ محمد دین کے ہاں شاگرد بٹھلا دیا۔ اسی مسجد میں، جسے جنڈی والی مسجد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا اصغر علی روحی مرحوم صاحب امامت کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ اُن کا روز کا معمول تھا کہ نمازِ فجر کے بعد مصلے پر بیٹھے بیٹھے کچھ دیر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے اور بعد میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے اور جب سورج نمودار ہوتا تو اشراق کے نوافل ادا کر کے گھر چلے جاتے۔ ناشتہ فرما کر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور طلباء کو پڑھانے کے لئے پیدل روانہ ہو جاتے۔

اُن کے سر پر سفید ململ کا عمامہ ہوتا اور بدن پر سفید رنگ کا فراک کوٹ ٹخنوں تک لمبا پہنا ہوتا تھا اور ہاتھ میں ایک موٹا سا لٹھ جس کا سرا مڑا ہوا تھا بطور عصائے موسوی تھاما ہوتا تھا اور آنکھوں پر سیاہ مستطیل شکل کا چشمہ ہوتا تھا اور ساری عمر کالج کے لئے یہی ان کا لباس تھا۔ عصر کی نماز کے بعد مولانا صاحب گھر نہیں جاتے تھے بلکہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد اوابین کے نوافل ادا کرتے اور پھر گھر چلے جاتے تھے۔

میرے والد مرحوم بھی صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی کے ساتھ ادا فرماتے تھے اور صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کی ایک پوری منزل اور ساتھ ہی دلائل الخیرات کا کچھ حصہ ہر روز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت مولانا صاحب کبھی شہر سے باہر جاتے تھے تو میرے والد مرحوم بطور نائب امامت کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔

والد مرحوم ایک تاجر پیشہ تھے وہ صرف فجر اور عشاء کی نماز اسی مسجد میں ادا فرماتے تھے اور بقایا ان کی نمازیں جہاں کہیں ہوتے وہاں ادا فرما لیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان دو نمازوں میں وہ مجھے اپنے ہمراہ مسجد میں لے جاتے۔

دونوں حضرات کا یہ روز کا معمول تھا۔ مجھ کو معلوم نہیں اور نہ یاد پڑتا ہے کہ میری عمر کا کوئی اور بچہ بھی

وہاں موجود ہوتا تھا کہ نہیں۔ اسی سبب سے مولانا مجھے اپنے پاس بلا لیا کرتے تھے اور عصر کے وقت خصوصاً
میں اُن کی صحبت میں ہوتا تھا۔ مجھے شفقت سے کبھی کبھی گود میں بھی لے لیا کرتے تھے اور خوب پیار کیا کرتے تھے۔ میں
بھی اُن کے کبھی پاؤں اور کبھی پنڈلیاں دبایا کرتا تھا۔ اسی دوران آپ پاؤں کے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی سے میری چوٹی
پر چٹکی بھرتے تھے۔ اسطرح آپ اور میں خود بہت ہی محظوظ ہوتے تھے اور ہمارا تعلق بڑھتے بڑھتے باپ اور بیٹا ایسا معلوم
ہونے لگا اور آپ روزانہ عصر کے وقت اپنی جیب سے کچھ نہ کچھ مٹھائی نکال کر مجھے کھلاتے تھے، جب تک میرا لڑکپن رہا مجھے
انکے مواعظ حسنہ کا کچھ شعور نہ تھا۔ یہاں تک کہ میں اور اُن کے منجھلے فرزند صوفی ضیاء الحق صاحب جب اکٹھے با
جماعت نماز ادا کر رہے ہوتے تھے تو سجدہ کی حالت میں ایک دوسرے کے بازوؤں میں باہم پیچ ڈالکر بالعروۃ الوثقیٰ
لا انفصام لھا کا سماں باندھ لیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ کا مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ چھٹی کا دن تھا اور میں ظہر کی نماز جماعت نکل جانے کے بعد اکیلا
پڑھ رہا تھا اور ایک صاحب حضرت مولانا کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور حضرت مولانا سے فرمانے
لگے کہ آپ اس نوجوان کو دیکھ رہے ہیں کہ کتنی سرعت کے ساتھ نماز ادا کر رہا ہے کہ ایک منٹ میں دو دو اور
تین تین رکعتیں سمیٹ رہا ہے۔ آپ نے تمام تر تحمل سے ارشاد فرمایا: "بہت غنیمت ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ اس
عمر کے بچے گلی کوچوں میں آوارہ پھر رہے ہیں اور یہ بچہ نماز میں مشغول ہے۔ اُن کے اس قول سے مجھے بڑی فرحت حاصل ہوئی
اور ساتھ ہی ساتھ میں نماز ادا کرنے میں اور محتاط ہو گیا۔

زمانہ گزرتا گیا، میں پرائمری سکول سے ہائی سکول پہنچ گیا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے دین کی سوجھ بوجھ
حاصل ہوتی گئی اور اُن کی روزانہ کی صحبت مجھ پر اثر انداز ہونے لگی اور اُن کے وہ اوصاف جو عوام الناس سے پوشیدہ تھے
مجھ پر عیاں ہونے لگے۔

میں نے دیکھا اُن میں عشقِ رسول بدرجہ اتم موجود ہے۔ عصر کے وقت بعض اوقات وہ تنہا ہوتے اور کوئی
ملنے والا نہ آتا تو وہ فارسی میں نعتِ رسول یا کوئی قصیدہ پڑھنا شروع کر دیتے۔ پڑھتے پڑھتے اس قدر ان پر
رقت طاری ہو جاتی کہ آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور آواز بھرّا کر ہچکی بندھ جاتی۔ میرے بھی آنسو نکل آتے۔
آپ کی خدمت میں کئی سائل آتے۔ آپ انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دے دیا کرتے کوئی مایوس ہو کر نہ جاتا
بعض واقف کار انہیں تنہائی میں قرضِ حسنہ کی درخواست کرتے آپ اُن سے دریافت فرماتے کتنی رقم چاہیئے؟ جو
جو بیان کرتا تو آپ کہتے کیا اس سے کم میں گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ذرا اور کم کر کے دیکھو تو سہی۔ وہ شخص سوچ

میں پڑ جاتا اور ایک خاص مقدار پر آکر رک جاتا۔ اب وہ رقم اسے اسی وقت دے دیتے یا بعد میں آنے کا وعدہ فرماتے۔ جب وہ دوبارہ آتا تو رقم اس کے حوالہ کر کے کہتے کہ اس رقم کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ اپنا کام چلاؤ۔

ایک دفعہ ایک شخص کے جانے کے بعد میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں اور رقم واپس لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا۔ قرضہ ایک ایسا فتنہ ہے جو آپس کے تعلقات کو منقطع کر دیتا ہے اور مقروض شخص ملنے ملانے سے بھی منہ موڑ لیتا ہے۔ لہٰذا ایسا کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ہاتھ سے نہیں جاتا۔ دوسرے وہ آئندہ بہت محتاط رہنا سیکھ جاتا ہے اور فضول خرچی سے بچ جاتا ہے۔

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ کفایت شعار بندہ بہت خوش وقت رہتا ہے اور مقروض شخص ہر وقت کبیدہ خاطر اور مغموم رہنے لگتا ہے تاوقتیکہ قرض کا بار اُس کے سر سے نہ ٹل جائے۔ یہ سبق مجھے مولانا صاحب کے اس رویہ سے ملا۔ حضرت مولانا لوگوں کے دکھ درد مٹانے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ مالی اعانت کے ساتھ روحانی طور پر بھی اُن کی مدد کرتے تھے۔ کلام الٰہی پڑھ کر جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے۔ گلے یا بازو پر باندھنے کے لئے تعویذ لکھ کر بھی دیا کرتے تھے۔ گویا کہ ہر طرح خدمت خلق پر کمربستہ رہتے تھے۔ بہت کم ناراض ہوتے تھے مگر حمیت دینی اور غیر اسلامی کے سبب غیر معقول اور لغویات پر سخت خفا ہوتے تھے۔ اور کوئی انہیں جب بلاوجہ اذیت پہنچاتا تھا تو خاموشی سے برداشت کر لیتے اور زبان پر حرفِ شکایت نہیں لاتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ خود ہی بہرہ سرائی کرنے والے سے انتقام لے لیتا ہے اور بدخواہ خود ہی شرمندہ ہو کر آپ سے معافی مانگ لیتا تھا۔ ایسا بہت دفعہ دیکھنے میں آیا۔ بندہ نے بذاتِ خود دو دفعہ ایسا ہی واقعہ کا تجربہ کیا ہے۔

ہر مرتبہ بمصداق آیہ کریمہ "و افوض امری الی اللہ بصیر بالعباد" کے صبر کرتے ہوئے معاملہ حق اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا کرتے اور ہر دفعہ تقدیر کا کرنا ایسا ہوا کہ بدخواہ چند ہی روز میں خداوند تعالیٰ کے غضب اور غضب کا شکار ہو گیا۔

اسی ضمن میں ایک واقعہ ازواج مطہرات کا یاد آ گیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کسی دوسری ازواج مطہرات سے کچھ تنازعہ ہو گیا۔ وہ آپ کو یعنی حضرت عائشہ رض کو کوستی رہیں اور حضرت عائشہ رض خاموش سنتی رہیں۔ حضور سرور کائنات بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ جب ان کا

کو صاحب سے بڑھنے لگا تو حضرت عائشہ رض بھی جواب دینے لگیں۔ یہ دیکھ کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جانے کا ارادہ کیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رض فوراً بول اٹھیں: "جب وہ مجھ کو سناتے رہے تو آپ خاموش بیٹھے سنتے رہے اور جب میں نے جواب دینا شروع کیا تو آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جانے لگے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے عائشہ جب تک تو خاموش تھی اللہ تبارک و تعالیٰ اور اسکے فرشتے اُس کے رد میں جواب دے رہے تھے اور جب تم نے خود جواب دینا شروع کر دیا تو انہوں نے اپنا منہ موڑ لیا اسلئے میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔"

مختصر یہ کہ حضرت مولٰنا کی تربیت ہر موڑ پر اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ سخت ترین حالات میں بھی بندہ کے پائے استقلال میں لغزش تک نہیں آئی اور بندہ نے ہر مصیبت خندہ پیشانی سے برداشت کی اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ فلیتوکل المتوکلون

وقت بڑی جلدی سے گزرتا گیا اور میں اسکول سے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور بغرض اعلیٰ تعلیم پہنچ گیا اور حضرت مولٰنا ریٹائر ہو کر شب و روز ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ آپ کی بینائی جاتی رہی اور آپ پڑھنے سے محروم ہو گئے۔ تاہم آپ نے اپنا معمول نہ بدلا بلکہ اُس میں غلو کرنے لگے۔ اس عرصہ میں میں بھی گریجوایشن کرنے کے بعد روزگار کی تلاش کی سعی کرنے لگا

حضرت مولٰنا کے احباب اور ملنے والوں میں چوہدری محمد حسین صاحب انچارج پریس برانچ سول سیکرٹریٹ پنجاب گورنمنٹ لاہور پیش پیش تھے۔ ہفتہ میں ایک دو مرتبہ عصر کے وقت حاضر ہو کر مستفیض ہوا کرتے تھے۔ ایک روز مولٰنا نے اُن کے سامنے میرا ذکر چھیڑ دیا اور فرمایا: "چوہدری صاحب یہ اپنا بچہ ہے۔ بی اے کر چکا ہے اگر آپ کے دفتر میں کوئی اسامی خالی ہے تو اسے وہاں ملازمت دلا دو۔"

چوہدری صاحب نے فرمایا۔ اسے کل صبح سیکرٹریٹ میں بھیج دیں میں پتہ کروں گا۔ دوسرے روز میں وہاں پہنچ گیا۔ کہنے لگے ٹائپ جانتے ہو۔ میں نے عرض کیا: چند روز سیکھنے کی کوشش کی تھی اور ایک مہینہ کی فیس بھی پیشگی ادا کر دی تھی مگر طبیعت نے لوہا کوٹنا گوارا نہ کیا اور یہ کام ترک کر دیا۔ چوہدری صاحب چونکہ پنجابی زبان میں گویا ہوئے۔ "تم بھی بڑے مسیتڑ ہو؟" یعنی مسجد کو چمٹنے والے ہو۔

اُس وقت مجھے کچھ ناگوار سا لگا مگر بعد میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "جب تم کسی کو مسجد کی طرف آتے جاتے دیکھو تو سمجھو کہ اُسکی مغفرت ہو گئی۔"

اس طرح کا ایک واقعہ بعد میں بھی ہوا۔ جب میں نیا نیا سمن آباد لاہور میں اپنی ذاتی کوٹھی تعمیر کر کے

وہاں رہنے لگا تو میری اہلیہ کو ملنے کے لئے ایک پڑوسن آئی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ میں [illegible]
میں بیٹھا تھا کہ قریب مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ میں گھر والوں کو یہ آواز دے کر باہر نکلنے لگا " کہ نماز کے لئے مسجد
جا رہا ہوں " کمرے سے ابھی باہر نکلنے ہی والا تھا کہ پڑوسن کی آواز کان میں پڑی " بہن کیا تمہارا میاں بھی مسیتڑ ہو گیا ہے "
چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم کا قول ازراہ مزاح تھا اور پڑوسن کا کہنا ازراہ تمسخر تھا۔ یہ سُن کر
میں نے دل میں کہا: الحمد للہ۔

جب مولانا صاحب کو چوہدری محمد حسین کے اس طرح کہنے کا پتہ چلا تو تبسم فرما کر کہنے لگے کہ " پھر یہ
غنیمت جانو کہ تم صرف مسیتڑ ہی بنے ہو۔ ہمیں تو کہنے والوں نے تھرڈ کلاس مسلمان کا خطاب عنایت کیا تھا "
میں نے عرض کیا " وہ کیسے ؟ "

فرمانے لگے: ایک نوجوان میرے پاس آیا (وہ آپ کا ایک شاگرد ہی تھا) اور کہنے لگا " جناب آپ کا ایک پرانا
شاگرد اس وقت سول سیکرٹریٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ پر متمکن ہے اور اسی کے ماتحت کچھ اسامیاں خالی
ہیں آپ اُس سے مل کر میری سفارش کر دیں تو کام بن جائے گا " جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپ ہر وقت عوام الناس کی
مدد کرنے میں لگے رہتے تھے۔ آپ نے حامی بھر لی اور اگلی صبح ۸ بجے اُس کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے تاکہ
اُس کے دفتر روانہ ہونے سے قبل اُس نوجوان کی سفارش کر دیں۔ اُس وقت دفاتر کے اوقات ۱۰ بجے سے ۵ بجے
شام کے ہوتے تھے۔ وہ صاحب اُس وقت غسل کرنے کی تیاری میں تھے۔ معذرت کرتے ہوئے بولے۔ مولانا آپ ذرا
تشریف رکھیں میں نہا کر آتا ہوں۔ بعد ازاں اپنے خادم سے کہا کہ ناشتہ یہیں لا کر رکھ دو۔ غسل سے فارغ ہو
کر اور کپڑے بدل کر مولانا صاحب کے پاس آ بیٹھے اور چائے کپ میں انڈیل کر اور ڈبل روٹی کے سلائس پیش
کرتے ہوئے بولے جناب چائے نوش فرمائیں۔

مولانا صاحب نے فرمایا: جناب معاف کیجئے یہ ماہ رمضان ہے اور میں روزے سے ہوں۔ کہنے لگے، واہ
جی واہ! آپ بھی کمال کر رہے ہیں۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے کام تھرڈ کلاس مسلمانوں جیسا کر رہے ہو۔
یہ سنتے ہی میرے تو بدن میں آگ لگ گئی اور میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور واپس گھر کا رُخ کیا۔ وہ بہتیرا
کہتا رہا۔ جناب مولانا ٹھہریے بتائیے تو آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ ایسے ناراض ہو کر واپس کیوں جا رہے ہیں؟
میں نے صرف یہی جواب دیا کہ تھرڈ کلاس مسلمان کا فسٹ کلاس سے کیا کام؟ اور یہ کہہ کر میں اُن کے مکان
سے باہر آ گیا اور پھر کبھی بھی اُس سے ملنا گوارا نہ کیا۔

یہ تھی حضرت مولانا کی دینی غیرت و حمیت کہ جس کام کے لئے گئے تھے اُسکی ذرہ بھر پرواہ نہ کی اور

ایسے بے دین شخص سے مزید کلام کرنا پسند نہ فرمایا۔

حضرت مولانا صاحب اپنے مواعظ حسنہ میں اکثر میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے

اور اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق میاں صاحب کا قول ہی نقل کیا کرتے تھے۔

" مسلمان کے مسلمان اور بے ایمان کہ بے ایمان "

یعنی اس قسم کے لوگوں کا مسلمان ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔

حاجی میاں شیر محمد صاحب ظاہرًا ولی اللہ تھے مگر حضرت مولانا صاحب اپنے آپ کو بہت پوشیدہ رکھتے تھے اور ایسے

ہر قسم کے فعل سے اجتناب فرماتے جس سے عیاں ہو جائے کہ وہ ولایت میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک دفعہ

مجھ سے ذکر کیا: ایک دفعہ رات کو مجھے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ یہ درد، دردِ شقیقہ کی طرح تھا اور اس کا زیادہ

زور میری پیشانی اور آنکھوں میں تھا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری آنکھوں میں نیزہ مارا جا رہا ہے۔ میں درد

سے بے حال ہو رہا تھا اور مجھے موت کا تصور ہونے لگا۔ اسی عالم میں میرے منہ سے نکلا۔ کاش اس وقت میاں صاحب

میرے پاس موجود ہوتے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جونہی میں نے ان کا نام نامی لیا وہ شدت کا درد جو آنکھوں میں چبھن

پیدا کر رہا تھا آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور سر کے درد میں شدت کم ہونا شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ سحری ہو گئی اور

سر درد بالکل مفقود ہو گیا۔ عین اُسی لمحہ مکان کے نیچے سے آواز آئی۔ مولانا روحی صاحب! آواز جانی پہچانی تھی

میں بستر سے فورًا اُٹھ کر کھڑکی کی طرف لپکا اور جواب دیا: "میاں صاحب ہیں؟"

" السلام علیکم! جی ہاں میں ہی ہوں " " آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا، خیریت تو تھی؟ "

میں نے جواب دیا: "وعلیکم السلام۔ کچھ تکلیف ہو گئی تھی کہ آپ کی یاد آئی۔"

" اب کیا حال ہے؟ "

" الحمد للہ اب بالکل تندرست ہوں! آپ ٹھہریں میں حاضر ہوتا ہوں۔ بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں "

" نہیں نہیں! کوئی ضرورت نہیں۔ میں واپس جاتا ہوں۔ والدہ صاحبہ نے حکم دیا تھا جلد لوٹ آنا

وہاں نہ ٹھہرنا میں مزید ٹھہر نہیں سکتا لہذا آپ تکلیف نہ کریں۔ میں واپس جا رہا ہوں "

یاد رہے۔ میاں صاحب کی یہ والدہ سوتیلی تھیں اور انہیں میاں صاحب سے والہانہ محبت تھی

اور گوارا نہ کرتی تھیں کہ میاں صاحب اُن کی آنکھوں سے ایک پل بھی اوجھل ہو جائیں اور میاں صاحب بھی بے حد مؤدب

اور اطاعت گزار تھے کہ اُن کے حکم سے سرتابی نہیں فرماتے تھے۔

یہ مختصر سا واقعہ پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت مولانا ایک پوشیدہ گوہرِ ربانی تھے اور اپنی کسی کرامت کا اظہار کرنا پسند نہیں فرماتے تھے اور دوسرے یہ ثابت کرنا تھا کہ ولی را ولی می شناسد دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ادھر مولانا صاحب کا میاں صاحب کو یاد کرنا، اُدھر اُن کا شرقپور سے پاپیادہ چل کر کوچہ ذیلدار اندرون بھاٹی دروازہ پہنچ جانا اور جوں جوں میاں صاحب لاہور کی طرف قدم بڑھا رہے تھے درد کم ہو رہا تھا یہاں تک کہ جب میاں صاحب مولانا صاحب کے گھر کے نیچے پہنچ گئے۔ درد رفو چکر ہو چکا تھا۔

تاہم اس قسم کے واقعات جب عوام الناس تک پہنچنے شروع ہوئے تو لوگ مولانا صاحب کی زیارت کو عین ثواب سمجھنے لگے اور جمعہ کی نماز میں رونق دوبالا ہونا شروع ہو گئی۔ آس پاس کے بازاروں اور محلوں سے مثلاً موری دروازہ، لوہاری منڈی، بازار حکیماں، بازار نور محلہ، بازار بھاٹی گیٹ، محلہ ہجویری عقب داتا دربار۔ لوگ نماز جمعہ کے لئے جنڈی والی مسجد میں آنا شروع ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم مسجد کو شہید کر کے مشرق اور مغرب کے ملحقہ مکانات کو شامل کر کے از سرِ نو ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کرنی پڑی۔ جو اس وقت اپنی تمام کشادگی کے باوجود اُس وقت کی رونق سے جو اُسے حضرت مولانا کی موجودگی سے حاصل تھی اب بالکل محروم ہے اور گنتی کے آدمی ہی اب نماز کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا ایک راسخ العقیدہ حنفی مسلک کے مسلمان تھے۔

میں نے ایک دفعہ آپ سے دریافت کیا کہ عام لوگ اپنے عزیزوں کے انتقال کے بعد جمعرات کے روز کو ختم قرآن کرواتے ہیں اور کچھ کھانا پکا کر تقسیم کرتے ہیں اور چالیس روز کے بعد ایک خاص اہتمام سے برادری کے لوگوں کو جمع کر کے ختم دلواتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟

فرمایا کہ اس بہانے سے جو کچھ کرتے ہیں میت کو ثواب پہنچ جاتا ہے۔ کچھ نہ کرنے سے یہ بہتر ہے، مگر اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ نمود و ریاء کے لئے ایسا کرنا بے فائدہ ہے مگر یاد رہے کہ ورثا کا حق مار کر ایسا کرنا گناہ ہے ان کی اجازت اور رضامندی ضروری ہے

مسجد مذکورہ میں اسلامی تہواروں کے موقع پر مسجد میں چراغاں بھی ہوتا تھا۔ ذکر و اذکار کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ شیرینی بھی بانٹی جاتی تھی۔ مگر آپ نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ سب کچھ آپ کی موجودگی میں ہوتا تھا۔

چنانچہ مجھے ایک واقعہ دیکھنے میں آیا جس کے متعلق لوگوں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں اور مجھے آپ سے استفسار کرنا پڑا اور میرے اور لوگوں کے شکوک رفع ہوگئے۔

آپ کے چھوٹے بھائی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا تو وہ آپ کے مکان پر افسوس کرنے اور فاتحہ خوانی کے لئے آئے۔ حضرت مولانا صاحب کا روزانہ کا معمول تھا۔ جب گھر پر ہوتے تو مکان کی نچلی منزل یعنی بیٹھک میں موجود رہتے اور ہر کوئی آپ سے بلا جھجک ملاقات کر سکتا تھا۔

بھائی صاحب کی وفات پر تین روز تک آپ نے بیٹھک کے دروازے لوگوں پر بند کرائے اور بالائی منزل پر متمکن ہوگئے اور کسی شخص کو اجازت مرحمت نہ فرمائی کہ وہ فاتحہ خوانی کر سکے۔

بعد میں میں نے جب اس واقعہ کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ فاتحہ خوانی بھی ایک رسم بن کر رہ گئی ہے اور اُسکی روح مفقود ہو چکی ہے۔ لوگ فاتحہ پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ نہ تو ان کے کپڑے پاک ہوتے ہیں اور نہ جسم ہی۔ باوضو تو شاید خال خال ہی ہوں گے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا پڑھنا ہے؟ اور جو پڑھتے ہیں وہ بھی اُن جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ادھر منہ میں بڑبڑ کیا اور دوسری طرف ہو کر دنیاوی باتوں میں لگ گئے اور حقے کے کش پر کش لگانے لگے۔ تمام جسم ہونے کے لئے مستعد کھڑا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منہ بھی صاف نہیں بلکہ تمباکو نوشی سے بدبودار ہے۔

آپ کی یہ سب گفتگو سن کر میں نے انہیں حق بجانب پایا تاہم میں نے سوال کیا کہ لوگوں کے بدن ناپاک ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ فرمایا: تم نے عام طور پر لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ بازار اور گلیوں کی نالیوں پر بیٹھ کر پیشاب کرنے سے شرم نہیں کرتے اور پیشاب کے قطرات مٹی کے ڈھیلے سے خشک کرنے کی بجائے دھوتی یا تہبند کے پلو سے مسل کر کپڑا ناپاک کر لیتے ہیں اور جب چہرہ پر پسینہ آتا ہے تو اُسی ناپاک پلو سے چہرہ پونچھ لیتے ہیں۔ میں اپنے اس فعل سے انہیں احساس دلانا چاہتا ہوں کہ وہ طہارت کی طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ

آپ بزرگ لوگوں کے مزاروں پر جانے اور وہاں جا کر اپنی حاجت کو بیان کرنے اور دعا مانگنے کے قائل تھے اور یہ جائز قرار دیتے تھے۔ اس عقیدہ کا اظہار انہوں نے حافظ ابن قیمؒ کی کتاب الداء والدواء کا ترجمہ کرتے ہوئے کیا اور ان کے قول سے اختلاف کرتے ہوئے کتاب کے حاشیہ میں ایک نوٹ تحریر کر دیا۔ حافظ ابن قیمؒ

قبر پر دعا مانگنے اور اسکی قبولیت کے متعلق رقمطراز ہیں:

" ایک مغالطہ یہ ہے کہ کوئی شخص بحالت اضطرار کسی بزرگ کی قبر کے پاس دعا کرتا ہے اور وہ دعا قبول ہو جاتی ہے تو سمجھنے لگتا ہے کہ قبولِ دعا اس قبر پر جانے کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ دعا کے قبول ہونے کا اصل راز اُسکی بے چارگی اور بے کسی ہے جو بے اختیار بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔"

حضرت مولانا نے اس قول سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:

" خاکسار مترجم کو اس میں کلام ہے کیونکہ سنتِ صحابہ کرام سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اکثر روضۂ مقدس جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوتے اور دعا کیا کرتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبر موسیٰ رضا قبولِ دعا کے لئے اکسیر ہے۔"

لہٰذا آپ اپنے مواعظِ حسنہ میں ان خیالات کا برملا اظہار کرتے تھے اور لوگ مطمئن تھے۔ محلہ میں تین پیشہ ور برادریاں بستی تھیں۔

ایک گوجر برادری۔ دوسرے ارائیں برادری اور تیسرے صراف تھے۔ پڑھے لکھے لوگ بہت کم تھے اور گوجر لوگ تو بالکل نابلد تھے مگر آپ کے مواعظِ حسنہ اور بزرگی کی وجہ سے بہت متاثر تھے۔ اُن میں سے بہت سے لوگوں نے دودھ میں پانی ملانا چھوڑ دیا تھا اور نماز کے لئے بھی حاضر ہو جاتے تھے۔ اُن میں سے ایک شخص نے قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا اس وقت اسکی عمر چالیس سال سے اوپر تھی مگر اُس نے کمر ہمت باندھ رکھی اور پانچ برس کی محنتِ شاقہ سے قرآن مجید ختم کر لیا اور پھر ہر روز صبح سویرے اپنی وفات تک تلاوتِ قرآنِ پاک میں ناغہ نہ کیا۔ آخر کار عمر میں اُس نے فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ اپنے ساتھ اپنی ہمشیرہ اور بھانجی کو بھی حج کروایا۔ اُس شخص کا بہنوئی بے تحاشہ شراب پینے کا عادی تھا اور اُسکی حالت یہ تھی کہ مدہوش ہو کر نالیوں میں گر پڑتا تھا اور جب گھر والوں کو پتہ چلتا تھا تو اٹھا کر گھر لے آتے تھے۔ آہستہ آہستہ اُس کا رجحان مسجد کی طرف ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ باریش مسلمان نمازی ہو گیا اور اسی طرح اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

حضرت مولانا اپنے وعظ شریف میں توبہ استغفار پر بہت زور دیا کرتے تھے اور اکثر فارسی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر گبر و کافر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

حضرت مولانا زبانی کلامی وعظ و نصیحت کے علاوہ تحریرًا پیغام الٰہی اور وصایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے انہوں نے کافی عرصے تک ایک ماہنامہ رسالہ جاری رکھا جس کا عنوان "الہدیٰ" تھا۔ میرے پاس اب بھی اس کی چار عدد کاپیاں جلد ۱ شمارہ ۱۰ بابت ماہ ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ ۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۳۱ھ، ماہ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ اور ماہ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ موجود ہیں۔

سرورق پر چار پانچ مختلف عنوان بطور فہرست مضامین ہوتے تھے۔

۱ ۔ باب التفسیر ۲ ۔ باب عظات الاسلام ۳ ۔ وصایا النبی صلعم کا چند آیات ۴ ۔ منقولات ۵ ۔ مشکوٰۃ الانوار ۶ ۔ اسلامی خبریں۔

اس ماہانہ رسالہ کے مضامین کا پڑھے لکھے لوگوں پر بہت خوشگوار اثر ہوا۔ حتیٰ کہ ایک شخص المسمی ماسٹر پیر بخش جو اسی کوچہ ڈیلاداراں میں رہائش پذیر تھا اور متوسط درجے کے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس نے ایک رسالہ بنام "تائید الاسلام" جاری کر دیا جو اس نے اپنی وفات تک جاری رکھا۔

حضرت مولانا اپنے اور شاگردوں کے ساتھ ساتھ بندہ پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ جب آپ کی بینائی جاتی رہی تو مجھے نماز فجر کے بعد ایک پارہ قرآن سنانے کے لئے حکم دیتے۔ میں تین سال تک برابر یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ میرا تبادلہ کوئٹہ اور بعد میں کراچی شہر ہو گیا۔

تلاوت قرآن کے درمیان بعض اوقات آپ مجھ سے الفاظ کے معنی اور آیات کے مطالب پوچھا کرتے تھے جس کے لئے مجھے تیار رہنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں چھٹی جماعت سے عربی اختیاری مضمون لے رکھا تھا اور بی اے تک عربی میرا پسندیدہ مضمون رہا۔ اسکول میں، میں ہر امتحان اور ہر ٹسٹ میں عربی اور اردو میں اول آیا کرتا تھا اور اسی عربی مضمون کی بدولت میں میٹرک میں اپنے سکول میں اول رہا تھا

جب حضرت مولانا نے میرا اچھی طرح امتحان لے لیا اور میں کسی حد تک کامیاب ثابت ہوا تو آپ جمعہ کے خطبہ کے لئے میری خدمات حاصل کرنے لگے اور جہاں کہیں میں اٹک جاتا یا کوئی غلط بات بیان کرتا تو مجھے ٹوک دیتے اور تصحیح فرما دیتے۔

ایک واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی مشن پر اصحاب صفہ میں سے چند حضرات کو قبیلہ بنی لحیان کی طرف بھیجا۔ انہوں نے وعدہ کی خلاف ورزی اور مسلمانوں سے غداری کرتے ہوئے انہیں قتل کر دیا۔ ان میں حضرت خبیب بھی تھے جنہیں سولی پر لٹکا دیا اور تیروں اور نیزوں سے

اُن پر وار کرنے شروع کر دیئے۔

میں یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت خُبیب کا نام بجائے خُبیب کے حرف ب کو مکسور یعنی خِبیب پڑھا۔ آپ نے مجھ ٹوکا اور اسی وقت تصحیح فرمائی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا بندہ کی خطاب کرنے کی مہارت بڑھتی گئی حتیٰ کہ آپ کی وفات کے بعد بندہ نے آپ کی اسی مسجد میں لوگوں کو اپنے مواعظ سے مستفید کیا۔ میرے نقل مکانی کے باوجود مسجد کے نمازی مجھے گھر سے بُلا لاتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد جب پاکستان معرض وجود میں آگیا تو بندہ کو جامع حضرت داتا گنج بخشؒ میں نمازیوں کو خطاب کرنے کا موقع نصیب ہوا اور وہ اس بات پر مصر ہو گئے کہ میں ہر جمعہ کو وہاں اپنے مواعظ حسنہ سے انہیں مستفید کروں۔ میرے لیے یہ چنداں فخر کی بات نہیں تھی کہ میں لوگوں کو نصیحت کروں اور وہ زار و قطار رونے لگیں۔ کیونکہ میں اُس زمانے میں حضرت سید محمد اسمٰعیل صاحب کرمانوالہ کا جو حضرت میاں شیر محمد صاحب کے خلیفہ اول تھے بیعت ہو چکا تھا اور جناب سید صاحب نے مجھے " بابو مبلغ کا خطاب " دے رکھا تھا " تاہم آپ مجھے منع فرمایا کرتے تھے کہ میں وعظ کرنے کی بجائے ذکر و اذکار سے اپنے نفس کا صفایا کروں مگر لوگ مجبور کرتے تھے۔

ایک دفعہ میں جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا کہ راستہ میں دو بزرگ جو کم از کم ۸۰ اسی برس کی عمر کے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ آپ وعظ خوب کہتے ہیں۔ یہ طریقہ آپ نے خوب اپنایا ہے۔ آپ کے استاد کون تھے۔ میں نے حضرت مولٰنا کا نام نامی بیان کیا۔ کہنے لگے جبھی تو ہم کہتے تھے کہ کسی کامل استاد کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن کاتب ولد میاں قدرت اللہ مرحوم

محلہ کرم آباد۔ وحدت روڈ۔ لاہور

حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات مبارک کسی تعارف کی محتاج نہیں علم دوست حضرات مولاناؒ کی شخصیت سے بخوبی واقف ہیں کہ آپؒ علم و فضل کے بحرِ بیکراں تھے

بندہ بچپن ہی سے مولانا علیہ الرحمۃ کے قدرے قریب رہا۔ آپؒ کا روزمرہ کا دستور یہ تھا کہ آپ روزانہ اسلامیہ کالج جاتے اور جانے سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور بعد ازاں کالج کے لئے روانہ ہوتے اور جب کالج سے تشریف لاتے تو پہلے مسجد ہی میں آتے اور پھر گھر تشریف لے جاتے۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ آپ زیادہ وقت مسجد میں گزارتے۔ صبح کی نماز کے بعد ایک پارہ یا دو پارہ منزل روزانہ سنتے بعد ازاں نوافل و وظائف میں گزارتے اور تقریباً دو اڑھائی گھنٹے کے بعد فارغ ہو کر گھر تشریف لے جاتے اسی طرح آپ عصر سے مغرب تک کا وقت بھی مسجد میں ہی عبادت و وظائف میں رہتے۔ اسی وقت اکثر علماء حضرات اور علم دوست بزرگ آپ کے ہاں مسجد میں تشریف لاتے اور دقیق مسائل حل کراتے

مولانا موصوف حنفی العقیدہ تھے لیکن موجودہ علماء کی طرح فرقہ وارانہ فساد کو ہوا نہ دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بندہ نے مولانا کے ہاں مولانا غلام مرشد صاحبؒ اور دیگر علماء کو اکثر تشریف لاتے دیکھا آپ کے مولانا احمد علی صاحبؒ سے اچھے خاصے مراسم تھے

مولانا بزرگان دین کے بھی بہت معتقد تھے۔ اکثر جمعۃ المبارک کے خطبہ میں قرآن مجید اور حدیث شریف کے ساتھ بزرگان دین کے حوالہ جات دیگر مقتدی حضرات کے علم میں اضافہ فرماتے

مولانا باوجود ضعیفی اور کمزوری کے تقریباً جمعرات کے روز نماز عصر کے بعد حضرت ہجویریؒ یعنی داتا صاحب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لے جاتے۔ چونکہ بینائی جاتی رہی تھی اس لئے دربار جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے۔ میرا ہاتھ تھامے سامنے باغ میں سے ہوتے ہوئے دربار تشریف لے جاتے اور مغرب کی نماز سے ذرا پہلے واپس مسجد میں آجاتے۔ مجھے کافی دفعہ آپ کے ساتھ جانے کا شرف حاصل ہوا ہے

میں نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ کے ہاں میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لایا کرتے تھے الغرض مولانا متعصب۔ بدعتی قسم کے علماء میں سے نہ تھے۔ بہت بلند اخلاق کے مالک تھے۔

آپ بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک کو ملاقات کا شرف بخشتے تھے۔ یہاں تک کہ ہندو پنڈتوں سے ملاقات رکھتے تھے۔ مجھے ایک پنڈت صاحب کے ہاں شاہ عالمی گیٹ کے اندر مجھے [illegible] میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا نے فرمایا کہ فلاں پنڈت صاحب کے ہاں جاؤ۔ وہ قدرے بیمار تھے۔ اُن کی خبر لاؤ۔ جب میں مولانا کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا تو پنڈت صاحب قریب المرگ تھے۔ پنڈت صاحب کے پاس گیا تو مولانا کا پیغام دیا۔ پنڈت صاحب نے اشارہ سے سلام کہا۔ ہاتھ جوڑے اور دعا کے لئے کہا۔ میں واپس آیا اور مولانا سے حالات کہہ سنائے۔ جس سے مولانا کو افسوس ہوا۔ فرمایا کہ یہ بھی ایک پرانا دوست تھا جو جانبر نہ ہو سکا۔

ایک دن مولانا نے عصر کے بعد مجھے بلایا اور فرمایا کہ کیا کر رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ کچھ مسودہ کتابت کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: عصر کی نماز سے مغرب تک کتابت کا کام نہ کیا کرو، کیونکہ عصر کے بعد سورج کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اس لئے نظر پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ واقعی یہ ایک مجرب نسخہ ہے، عصر سے مغرب تک لکھائی وغیرہ نہ کرنا چاہئیے۔

ایک مرتبہ محلے کے چند بزرگوں نے مجھے بلایا۔ یہ موقع نکاح کا تھا۔ چونکہ مسجد کے ملحقہ محلہ کی خوشی و غمی میں حاضر ہونا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں وہاں پہنچا تو نکاح میں تین عمر رسیدہ بزرگ تھے اور ایک عمر رسیدہ دولہا تھا۔ میں نے دریافت کیا، عورت (دلہن) کی طرف سے کوئی ولی وغیرہ ہیں۔ کہنے لگے کہ عورت بھی عمر رسیدہ ہے اور خود مختار ہے۔ میں نے انہیں واضح کر دیا کہ اگر اُس عورت کا کہیں اور نکاح ثابت ہو گیا تو آپ سب کے نکاح ٹوٹ جائیں گے اور چونکہ میرا اپنا نکاح ابھی نہیں ہوا اس لئے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آپ تحقیق کر لیں تو میں نکاح پڑھ دیتا ہوں۔ انہیں میں سے ایک ولی بن گیا۔ کہا تم نکاح پڑھو ہم ذمہ دار ہیں۔ میں نے نکاح پڑھ دیا۔ چند روز بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے بلایا تو میں نے دیکھا کہ وہی چاروں صاحب مولانا کے ہاں حاضر تھے اور وہ سارا قصہ میرے آنے سے پہلے بیان کر چکے تھے۔ مولانا نے انہیں اپنے نکاح دوبارہ پڑھانے کو کہا اور غرباء میں کھانا تقسیم کرنے کو فرمایا اور مجھے تنبیہ کی کہ آئندہ ایسے نکاح نہ پڑھا کرو۔

مولانا پرہیزگاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے متعلقین کے اعمال پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب مسجد از سرِ نو نقشے وسیع کرکے تعمیر کیا جا رہا تھا تو اُن دنوں اینٹ اور ریت وغیرہ گڈھ پر آتی تھی۔ ٹرک وغیرہ استعمال نہ ہوتے تھے۔ ایک دن ایک گڈھ میں پانچ سو اینٹیں اُتاری گئیں۔ کچھ اینٹیں توڑ دیا گئیں بارہ تیرہ زیادہ اُتار کر الگ کر لی گئیں۔ میں نے منتظم سے عرض کی کہ مسجد میں ایسی اینٹیں استعمال نہ کریں لیکن منتظم نے نظر انداز کر دیا۔ میں نے مولانا سے شکایت کی تو منتظم کو بُلا کر آپ نے سختی سے ڈانٹا۔ ایسا کام نہ کرو۔ یہ پرہیزگاری سے بعید ہے لہٰذا اُن اینٹوں کے پیسے ادا کئے گئے۔

مولانا موصوف نمازی بچوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ میں اور میرے چند ایک نمازی دوست نماز کے بعد مولانا کے پاس بیٹھ جاتے۔ ہم مل کر آپ کے پاؤں ہاتھ دباتے اور اسی طرح آپ آہستہ آہستہ بعض نماز کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہمیں سمجھاتے اور ہماری نماز صحیح کراتے۔ وضو کے مسائل پر روشنی ڈالتے۔

کبھی کبھی ہم میں سے کسی کی باری منزل سنانے کی آجاتی جبکہ میاں محمد سعید اور ٹھیکیدار محمد شفیع نے پہلی دفعہ جب میری باری آئی تو مولانا نے فرمایا بیسواں ۲۰ سیپارہ پڑھو۔ میں نے پڑھنا شروع کیا چونکہ میری منزل کچی تھی یعنی میں فر فر کرکے ابھی نہیں پڑھ سکتا تھا اسلئے کافی وقت لگا۔ فارغ ہوا تو فرمایا کہ آج رات اکیسواں ۲۱ پارہ پڑھ کر سونا اور صبح کو سنانا۔ میں نے ایسا ہی کیا واقعی رات کو پڑھ کر سونے سے یاد ہو جاتا ہے۔ میں اس پر عمل کرتا رہا اور اب پون گھنٹے کی بجائے بیس تیس منٹ میں ایک پارہ پڑھ لیتا ہوں۔

مولانا موصوف اچھے خوش طبع تھے۔

ایک دن صبح فارغ ہو کر گھر تشریف لے جاتے وقت مجھے بلایا اور "خلیلی" کہہ کر آواز دی۔ اس سے ایک دن پہلے میں مصدر نامہ فارسی کی کتابت کر چکا تھا۔ اس میں الفاظ معنی کے کالم میں لفظ خلیلی اور معنی کے خانہ میں ہتھکڑی لکھا تھا۔ صبح مولانا نے خلیلی کہہ کر پکارا۔ مقصد سے فارغ ہو کر فرمایا کہ بچے پتہ ہے خلیلی کا مطلب کیا ہے۔ میں نے مصدر نامہ فارسی کا حوالہ دے کر ترجمہ کیا تو آپ نے بے ساختہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے میری گردن پکڑی اور پیار بھرے لہجے میں فرمایا: "ارے جونگ! خلیلی کا مطلب ہے میرا سچا دوست۔"

خلیل الرحمٰن کاتب

میاں عبدالعزیز

(الیکٹریکل انجنیئر پنجاب گورنمنٹ)

مولانا مرحوم لاہور کے مخلص اور بے غرض حضرات میں سے تھے۔ آپ عربی اور علوم دین میں بلند تر استعداد کے مالک تھے۔ بلکہ ان کی قابلیت کے استاد گنتی کے تھے۔ مولانا کی عمر کا بہترین حصہ اسلامیہ کالج لاہور میں عربی اور دینیات کی پروفیسری میں گزرا اور اس کے علاوہ اپنی جائے رہائش یعنی کوچہ ذیلداراں بھاٹی دروازہ لاہور کی مسجد المشہور مسجد جنڈیالی میں سالہاسال تک درس قرآن مجید دیتے رہے اور خطیب کے فرائض ادا فرمائے مگر ان خدمات کا انہوں نے کبھی کوئی معاوضہ نہ لیا۔ جو کچھ مسجد میں چندہ وغیرہ کی صورت میں آتا سب کا سب اصل امام مسجد کو دلا دیتے صرف اپنی تنخواہ میں گزر اوقات فرماتے رہے۔

آپ کی زندگی کے چند واقعات جو مدت تک ہمسایہ ہونے کی وجہ سے میرے علم میں آئے۔ ملاحظہ فرمائیں

١ مولانا مرحوم کا تکیہ کلام اردو میں "گویا کہ" اور پنجابی میں "کی ناں دا" تھا۔ اپنی خداداد اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے بعض اوقات بڑے ثقیل اور عوام کے لئے ناقابلِ فہم الفاظ استعمال کرکے مخاطب کو حیران کر دیتے تھے۔ مثلاً ایک دن پھل بیچنے والے سے پوچھا۔ "وزناً بیچتے ہو یا عدداً"۔ وہ بیچارہ کیا جانے۔ منہ دیکھتا رہ گیا۔

٢ مولانا کی قومی خدمات کے علاوہ انکے اپنے کنبے کی صحیح تربیت کے تمام ہمسایہ گواہ ہیں۔ انہوں نے تمام بچوں کو کان کھینچ کھینچ کر مگر نہایت شفقت سے پڑھایا۔ حالانکہ خود انگریزی نہ جانتے تھے۔ مگر جب ایک دفعہ طالب علم چل نکلے اور اردو پڑھنا اور حساب وغیرہ اور قرآن مجید جان جائے تو پھر انکو علوم مروجہ کی طرف شوق خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کے فضل سے سب بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ عام طور پر مشاہدہ ہے کہ اولاد شاذ و نادر ہی باپ سے بڑھتی ہے۔ مولانا کا عمل ایک اچھا استثنا سمجھئے۔ انہوں نے لڑکوں کی تعلیم کی طرف حد سے بڑھ کر توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ سب بچے صالح اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نکلے جو خال خال خاندانوں میں دیکھا گیا ہے۔ بڑے بیٹے مولانا فضل حق تو اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد حال ہی میں فوت ہو گئے ہیں۔ خدا مغفرت فرمائے اور تربیت کی یہ حالت ہے کہ رزق حلال پر مع باقی کنبہ کے سختی سے عمل کیا۔ مرحوم مولانا فضل حق کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ دوران جنگ سٹیل کنٹرولر تعینات تھے ایک سیٹھ آیا اور ایک لاکھ روپیہ میز پر رکھ

دیا اور کچھ ناجائز رعایت کا طالب ہوا۔ کہتے ہیں کہ مولٰنا کو رعشہ طاری ہو گیا اور کانپنے لگے اور سیٹھ سے کہا کہ اُٹھالو اور خود گھر چلے گئے اور بخار ہو گیا۔ یہ دعا مانگتے تھے کہ خدایا مجھے امتحان میں نہ ڈال اور ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ یہ محض مولٰنا روحی مرحوم کی تربیت کی برکت تھی کہ اولاد کو شیطان کے بہکانے سے محفوظ رکھا اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رکھے گا

۳ اسلامیہ کالج کا واقعہ مرحوم کے شاگرد بیان کرتے ہیں اس سے انگریز سے دلی نا مانوسیت اور بے حد خود داری ظاہر ہوتی ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مولٰنا جماعت کو پڑھا رہے تھے کہ شیخ عبدالعزیز مرحوم سیکرٹری انجمن ایک انگریزی مہمان سیاح کو لے کر جماعت میں آئے، جو عرب ممالک میں رہ چکے تھے اور عربی روانی سے بولتے تھے۔ اب نقشہ یہ تھا کہ دونوں حضرات نیچے کھڑے تھے اور مولٰنا سٹیج پر گاؤن پہنے کھڑے تھے۔ شیخ صاحب نے اشارہ کیا بلکہ گاؤن کو جھٹکا بھی دیا کہ مولٰنا نیچے اتر آئیں مگر مولٰنا ڈٹے رہے اور وہیں سے باتیں ہوتی رہیں۔ البتہ حاضر شاگردوں نے یہ بتایا کہ انگریز فر فر عربی بول رہا تھا اور مولٰنا کو بعض اوقات الفاظ کی تلاش میں دقت معلوم ہوتی تھی

۴ آپ کے شاگردوں میں ہر دلعزیزی کا واقعہ سنئے۔ ایک دفعہ جب آپ بوقت پیری علیل ہوئے تو ان کے فرزند اور بھائی ہسپتال لے گئے۔ وہاں حالت یہ تھی کہ سب ڈاکٹر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے اور مریضوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مولٰنا کے ہمراہیوں میں سے کسی نے جرأت کر کے اندر جا کر کہا کہ مریض جسکو ہم لائے ہیں، مولٰنا اصغر علی روحی ہیں۔ اسی وقت ایک ڈاکٹر فوراً کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، وہ تو میرے استاد ہیں اور جلدی جا کر معائنہ کیا۔

۵ مولٰنا اپنے علم اور قابلیت کی وجہ سے خود اعتمادی اور خودداری میں بعض اوقات ضد کی حد تک بھی پہنچ جاتے تھے۔ مثلاً آپ کا قاعدہ تھا کہ ایم۔ اے عربی کی جماعت کو جس میں صرف چند طلباء ہوا کرتے تھے، ہمیشہ ہوسٹل کے میدان میں پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کرسی پر اور شاگرد چارپائی وغیرہ یا گھاس پر بیٹھتے تھے اور آپ زبانی سبق پڑھاتے۔ انگریز پرنسپل نے بہتیرے نوٹس لگائے کہ کوئی پروفیسر ہوسٹل میں کلاس نہ لے مگر مرحوم ہمیشہ اڑے رہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ حاکم قوم کے خلاف دلی جذبہ رکھتے تھے

۶ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں دو استاد چوٹی کے ایسے دیکھے ہیں جنکو اپنے مضمون پر مکمل دسترس، عبور اور اعتماد تھا۔ مولٰنا مرحوم نے کبھی جماعت میں خواہ دینیات پڑھا رہے ہوں یا عربی کبھی کسی یادداشت

کی مدد نہیں لی۔ سب زبانی حافظہ سے۔ اسی طرح انگلستان نیو کاسل میں الیکٹرک انجینئرنگ کے پروفیسر ڈاکٹر تھامسن تھے۔ جو جماعت میں آتے اور تختہ سیاہ پر سبق شروع کر دیتے۔ نہ انہوں نے کبھی کسی کتاب کی مدد لی اور نہ کسی یادداشت کی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں پتہ نہ ہوتا تھا کہ کہاں تک پڑھایا جا چکا ہے اور کہاں سے شروع کرنا ہے۔ وہ شاگردوں کے نوٹوں سے عبور شدہ کورس معلوم کرتے تھے۔ ان کو اگر چار پانچ دن دے دیئے جائیں تو تمام الیکٹرک انجینئرنگ زبانی تختہ سیاہ پر دہرا دیں۔ اور بھی سینکڑوں استاد ایسے ہیں۔ مگر ان دو نے مجھ پر نمایاں اور گہرا اثر کیا ہے۔

غلام محی الدین

(مالک صداقت پریس بھاٹی دروازہ لاہور)

حضرت قبلہ و کعبہ مولانا اصغر علی صاحب روحی قدس سرہٗ العزیز اپنے وقت کے عارفین میں اعلیٰ مقام کے مالک تھے۔ میرا بچپن حضور کے زیر سایہ گزرا۔ دین کے مایہ ناز عالم خطیب جامع مسجد چندڑی والی میں فیض بیکراں تھے۔ عموماً بڑے بڑے جید عالم حضور کی خدمت اقدس میں فیض سے شرابور ہو کے لوگ بھی اپنی بھوک مٹانے پیاسے لوگ اپنی پیاس بجھانے الغرض جو جس کام کے لئے آیا خالی نہیں لوٹا۔ حضرت قبلہ و کعبہ مولانا اصغر علی صاحب روحی رح حق کے امام تھے۔ حضور منبر رسولؐ پر تشریف فرما ہوتے تو کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے بلکہ حق پر تُل جاتے۔ حضور کی زندگی بھی ایک عجیب و غریب زندگی تھی بالکل سادگی۔ دیکھنے والا یہ نہ جانتا کہ یہ شیر خدا ہے اپنے چہرے پر نقاب اوڑھ لیا کرتے تھے۔ غریبوں کے مشفق تھے۔ امیر امراء سے رعب سے مخاطب ہوتے اور حق و صداقت پر تُلے رہتے۔ و مما رزقنٰہم ینفقون پر ساری زندگی صرف کی۔ عشق کی منزل تھی۔ کہنا آسان ہے۔ مگر عمل کر کے دکھانا بڑی مشکل بات ہے۔ بڑی کٹھن منزل ہے۔ اپنی پونجی راہ حق میں صرف کرنا بہت بڑا جہاد ہے۔ حضور کی عادت شریفہ یہ بھی تھی کہ روپے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتے بلکہ خادموں سے فرماتے۔ سائل کو اتنی رقم دے دو۔ رقم تکیے میں ہے۔

ناچیز
غلام محی الدین

محمد اختر ولد محمد عبداللہ مرحوم

لوہاری دروازہ ، لاہور

حضرت مولانا اصغر علی روحی رح

میں نے اپنا بچپن ۱۲ سے ۱۴ سال تک کا زمانہ اپنے ننھیال میں گزارا کیونکہ میرے نانا میاں غلام نبی مرحوم مجھ سے بہت محبت رکھتے تھے ۔ وہ بھاٹی دروازہ کوچہ ذیلداراں میں مولانا روحی مرحوم کی رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر سکونت پذیر تھے ۔ میں نے اپنی دینی و دنیوی تعلیم اسی جگہ حاصل کی اور نماز عموماً مولانا روحی کے پیچھے جنڈی والی مسجد میں ادا کرتا تھا ۔ وہ جماعت کرانے کے علاوہ جمعہ کی خطابت اور وعظ کے ساتھ ساتھ درس قرآن و حدیث بھی اسی مسجد میں دیا کرتے تھے ۔ وہ دن کا بیشتر حصہ مسجد ہی میں گزارا کرتے تھے ۔ کالج سے واپس آ کر بہت تھوڑا آرام فرماتے تھے ۔ ظہر اور عصر کے درمیان وہ تصنیف و تالیف کی خاطر اپنے کتب خانہ میں بیٹھتے پھر عصر سے عشا تک مسجد ہی میں رہتے اور جسے اُن سے ملنا ہوتا وہ مسجد ہی میں ملتا تھا ۔ اُن کے پاس شہر کے بڑے بڑے علما اور بڑے بڑے سرکاری افسر جن میں سے اکثر اُن کے شاگرد تھے ۔ حاضر ہوا کرتے ۔ انہیں جتنا وقت ملتا اپنے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ۔ افسوس ہے کہ ہمیں اُس وقت بلکہ تمام اہل محلہ کو اُن کی قدر دانی نہ ہو سکی ۔ ہم انہیں ایک عام مولوی سمجھتے رہے اس محلہ میں چونکہ زیادہ تر گوجر اور سنیارے آباد تھے اور اب بھی ہیں ۔ اس لئے وہ اُن کو خاص طور پر اسلام کے خلاف رسومات کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے ۔ شادی بیاہ کے موقع پر یہ جاہل لوگ شراب ، جوا ، آتش بازی ، باجے اور مجرا وغیرہ کو لازم سمجھتے تھے ۔ لیکن مولانا کے وعظ و تلقین کا یہ اثر ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ عادتیں اہل محلہ کو چھوڑ دینی پڑیں ۔ اگر کوئی ایسی حرکت کا مرتکب ہوتا تو اُس کو نہ صرف ملامت کرتے بلکہ بعض وقت جرمانے کے طور پر اُس سے کچھ رقم وصول کر کے مسجد فنڈ میں جمع کر لیتے ۔ جس سے مسجد کی صفیں وغیرہ خرید لی جاتیں ۔

رفتہ رفتہ تقریباً تمام اہل محلہ نہ صرف پکے نمازی بن گئے بلکہ بعد میں قرآن مجید بھی پڑھ لیا اور صحیح

بھی کرآتے لیکن چونکہ اُن کی قدر و منزلت کا انہیں صحیح علم نہ تھا اسلئے وہ یہ کرتے کہ جب گوجروں کی کوئی بھینس دودھ نہ دیتی یا اُس پر بد نظری کا خیال ہوتا تو وہ ایک آٹے کا پیڑہ بنا کر لے آتے اور مولانا سے دم کرا کر اُس بھینس کو کھلا دیتے جس پر وہ دودھ دینے لگ جاتی اور اُسکی تکلیف دور ہو جاتی۔ دینی خدمت یا تبلیغی کام کے لئے مولانا کوئی تنخواہ یا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی اور کالج سے وصول ہونے والی تنخواہ اُن کی ضروریات کو کافی ہوتی تھی۔ اصلی امام مسجد ایک اور صاحب تھے جن کا نام میاں قدرت اللہ تھا۔ وہ کوئی بڑے عالم نہیں تھے۔ اس لئے مولانا کی موجودگی میں امامت کا فریضہ بجا لانا وہ گستاخی اور بے ادبی سمجھتے تھے۔ وہ زمینوں کے دلّال بھی تھے۔ انہوں نے تانگے بھی کرائے کے لئے بنا رکھے تھے اور صبح شام دودھ کی دکان بھی چلاتے تھے۔ یہ دکان مسجد کے ساتھ ہی ملحق تھی۔ وہ صرف اپنے محلے کے گوجروں کے بیاہ شادی کے موقع پر ہی نہیں بلکہ تقریباً تمام شہر کے گوجروں کی شادیوں کے موقع پر منشی گری کا کام بھی کیا کرتے تھے یعنی "نیوتہ" (تنبول) کی رقمیں لکھا کرتے تھے اور انہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ مسجد کے کام کی طرف توجہ کر سکیں۔

مولانا کا وجودِ گرامی امام صاحب کی خوش قسمتی سمجھئے، نہایت غنیمت تھا۔ مولانا آخر دم تک مسجد کی یہ خدمت اور اہلِ محلہ کی اصلاح کا کام فی سبیل اللہ بجا لاتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر بعض لوگ اُن کی خدمت میں اپنے اپنے مسائل پیش کرتے اور مولانا صاحب شریعت کے احکام کے مطابق اُن کا کوئی حل اُن کو بتاتے۔ میں بھی کبھی کبھی اُن کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ نہ صرف اُن کے اخلاق اور عادات انسان کو اُن کا غلام بنا لیتے تھے بلکہ جسمانی طور پر بھی وہ نہایت خوب شکل اور وجیہ بزرگ تھے۔ آخر عمر میں جب اُن کی بینائی کمزور ہو گئی اور کالج سے فارغ ہو کر باہر آمد و رفت ختم ہو گئی تو دیکھنے والوں کو اُن کی کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ ورنہ خواہ مخواہ ہر شخص کا دل اُن کے پاس بیٹھنے کو پسند کرتا تھا وہ باتوں باتوں میں انہیں اسلام کی محبت اور پیغمبرؐ کے اتباع کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔ وعظ کے دوران بعض وقت غصے اور غیرت میں انہیں بُرا بھلا بھی کہہ دیتے اور لوگ اسے بُرا نہ مانتے حالانکہ کئی لوگ عمر میں اُن سے بڑے بھی تھے۔

میں نے اُن کی زبانی جو واقعہ سنا اور اب تک مجھے یاد ہے۔ میں اُسے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ حسبِ ذیل ہے:

انہوں نے فرمایا:

ایک دن ظہر کی نماز کے بعد جب تمام نمازی چلے گئے اور میں اپنے گھر جانے لگا۔ مسجد کے اندر صحن میں جوتے رکھنے والا خانہ تھا۔ اُس میں سے میں نے اپنا جوتا اُٹھایا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ تقریباً دو سوتر موٹا اور تقریباً چار انچ لمبا سانپ اِدھر اُدھر پھر رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ میں نے اس سے سانپ کو مارنے کی کوشش کی۔ چھڑی اس کے سر پر لگی اور وہ سانپ جوتوں والے خانے کی نچلی طرف چلا گیا اور میری کوشش کے باوجود مجھے نہیں ملا۔ چونکہ گھر نزدیک تھا۔ میں گھر سے ہو کر چونکہ واپس مسجد میں کچھ دیر بعد واپس آنا تھا اسلئے میں آگیا اور مسجد کے اندر کے صحن میں بیٹھ گیا۔ میرے تن پر ایک ململ کا جبہ تھا۔ سر پر سادی سی پگڑی تھی۔ ایک سپاہی آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میاں صاحب کچہری جانا ہے۔ چونکہ مجھے فتویٰ دینے کے اختیارات تھے اس لئے میں نے اُسے تعجب نہیں سمجھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے میں اُس سپاہی کے ساتھ چل دیا۔ حکومت برطانیہ میں کچہری کا وقت چار بجے تک تھا۔

بھاٹی کے چوک میں بکر منڈی موجود تھی اس سے ذرا آگے بائیں طرف بیری والا احاطہ تھا۔ جو اب بھی موجود ہے۔ ان سب باتوں کا ذکر کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا:

جب میں بیری والے احاطے تک پہنچا۔ چونکہ یہ راستہ کچہری کا تھا اسلئے میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ احاطے سے گزرتے ہوئے اچانک میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس سے آگے تمام عمارتیں غائب اور ایک جنگل بیابان تھا۔

میں نے سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائی صاحب مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو۔ آگے مجھے کوئی آبادی بھی نظر نہیں آرہی۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میاں صاحب تھوڑے سے قدم اور۔ وہ سامنے کچہری ہے۔ اُس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف جب میں نے دیکھا تو بہت سارے لوگ ایک اجتماع کی صورت میں اکٹھے ہیں اور ایک تخت نما جگہ پر ایک مدبر سا انسان بیٹھا تھا۔ وہ سپاہی مجھے اُن کے پاس لے کر چلا گیا۔ میں نے انہیں السلام علیکم کہا۔ انہوں نے بھی اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ اتنی دیر میں اجتماع میں سے ایک فرد کھڑا ہوا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور اس نے ہاتھ کا اشارہ کر کے یہ بات کہی اپنے اُس سردار کو جو تخت پر بیٹھا ہوا تھا کہ حضور یہ وہ شخص ہے جس نے مجھے مارا ہے۔ میں خاموشی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

ایک اور فرد اُس اجتماع میں سے کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے سردار سے کہا:

چونکہ یہ میرے استاد ہیں اور میں نے ان سے تعلیم حاصل کی ہے اس لئے ان کی طرف سے میں بولوں گا۔

سردار نے اجازت دے دی۔ اُس نے کہا: حضورِ عالی! گزارش یہ ہے کہ چونکہ جنات اور انسان ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں اسلئے مولانا صاحب نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنی بچت کے لئے کیا ہے اس کا حق نہیں بنتا تھا کہ اس صورت میں مسجد میں داخل ہوتا اُس کا یہ کہنا تھا کہ

مولانا رُوحیؒ فرماتے ہیں:

میں اب سمجھا کہ صورت حال کیا ہے اور مجھے یہاں کس لئے بلایا گیا ہے۔ سردار نے اُس کو جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، مخاطب کیا اور کہا: پورا واقعہ بیان کیا جائے۔

ایک تیسرا فرد اُسی اجتماع میں سے کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا: حضور اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں کیونکہ میں اُس وقت اس کے ساتھ تھا۔

سردار نے اجازت دے دی۔

مخلوقِ جنات کے اُس فرد نے سردار کو مخاطب کر کے کہا کہ چونکہ میں نے بھی انہیں سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان کا ذکر اکثر اپنے دوستوں میں کرتا تھا۔ اس میرے دوست نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی اپنے استاد صاحب سے ملاؤ۔ میں اسکو ملانے کا وعدہ کر کے ساتھ لے گیا۔ ظہر کی نماز ختم ہو چکی تھی لوگ باہر نکل رہے تھے۔ ہم گلی والے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے اندر جانے کی خواہش ظاہر کی میں نے اسے منع کیا کہ ابھی نہیں لیکن وہ بضد تھا کہ ابھی جانا ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور وہ اکیلا ہی مسجد کے اندر چلا گیا۔

اتنا واقعہ سنانے کے بعد مولانا صاحب نے فرمایا: وہ شخص جو میری طرف سے بول رہا تھا اس نے اپنے سردار سے مخاطب ہو کر کہا کہ حضور اس نے استاد صاحب کو خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔ یہ اسکی اپنی غلطی ہے اور اسے سزا ملنی چاہئیے۔ اور میرے استاد کو باعزت رہا کیا جائے۔ اتنی دیر میں چار پانچ افراد اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے ہم بھی اپنے استاد کی حمایت کریں گے

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ

سردار نے میرے لئے کرسی منگوائی اور عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا اور میری خدمت و خاطر کے لئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا عصر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے اجازت دی جائے

وہ جو میرے شاگرد تھے انہوں نے اپنے سردار سے کہا۔ چونکہ ہمارے استاد صاحب ہمارے ہاں پہلی مرتبہ

آئے ہیں اس لئے ہم انہیں خالی نہیں جانے دیں گے لہٰذا انہیں انعام دے کر رخصت کیا جائے۔ سردار نے اُن کی یہ
عرض مان لی اور حکم دیا کہ ان کے لئے وہ انعام لاؤ۔ اتنے میں انہیں افراد میں سے ایک شخص لوہے کی انگیٹھی جس
میں کوئلے دہک رہے تھے، لایا اور اپنے سردار کے پاس رکھ دی۔ سردار نے مجھ مخاطب ہو کر کہا کہ جھولی اٹھائیں
میں نے اپنے کرتے کو پھیلا دیا۔ انہوں نے وہ انگیٹھی اٹھا کر میری جھولی میں ڈال دی اور مجھ کہا کہ اسے اوپر سے بند کر
لیں اور گھر جا کر کھولیں، راستے میں نہیں کھولنا۔

اس کے بعد سردار نے انہیں میں سے ایک کو حکم دیا کہ بڑی عزت و احترام کے ساتھ مولانا صاحب کو واپس
پہنچا دیا جائے۔ وہ مجھ لے کر وہاں سے چل پڑا۔ جب میں بھاٹی دروازہ کے بائیں ہاتھ بکر منڈی میں پہنچا۔ وہاں
ایک بوہڑ کا درخت ہے اُس سے چند قدم پیچھے تھا کہ اُس نے مجھ سے اجازت طلب کی اور چلا گیا۔

میرے ذہن میں یہ فکر تھا کہ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا ہے اور وہاں کوئی دوسرا شخص بھی نہیں جو
اذان دے سکے۔ اس لئے میں تیز تیز چلنے لگا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ کیوں کوئلے سے میری جھولی میں
ڈال دیئے ہیں۔ میں نے اُس بوہڑ کے ساتھ اُس جھولی کو الٹ دیا اور بھاٹی دروازے کی طرف تیز تیز چلنے لگا یہاں
تک کہ مسجد میں پہنچ گیا۔ اذان دینے کے لئے وضو کرنے لگا۔ ٹونٹیوں کے آگے جب میں بیٹھا تو کیا دیکھتا ہوں
کہ میرے کرتے میں ایک ٹھیکر سا اٹکا ہوا ہے جس کا بعد میں مجھے علم ہوا کہ یہ سونے کا تھا جس کا وزن تقریباً
چار پانچ تولے تھا۔ میں نے وضو کیا، اذان دی اور بڑے اطمینان سے جماعت کروائی۔ جب لوگ چلے گئے تو
میں اٹھا اور بوہڑ کے پاس پہنچا۔ جہاں پر میں نے کوئلے سمجھ کر اپنی جھولی الٹ دی تھی وہاں پر اب کچھ نہیں
تھا اور مولانا صاحب نے ارشاد کیا کہ

بڑے شرارتی ہوتے ہیں یہ۔ پہلے بھی دو تین کو اِسی وجہ سے چھٹی دے چکا ہوں
اور ساتھ ہی یہ واقعہ بیان فرمایا کہ اسی طرح

ایک بچہ میرے پاس پڑھا کرتا تھا اور میں نے ایک دن اُس کی ڈیوٹی لگائی
کہ بھینس کے لئے سائیکل پر جا کر چار بجے (میٹھی) چارہ لے آئے۔ شام کے قریب جب میں نے اس سے پوچھا تو
اس نے جواب دیا کہ میں نہیں لا سکا۔ میں نے غصے میں اُس سے کہا کہ جاؤ اور ابھی لے کر آؤ۔ اس اثنا میں
میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا چارے کا گٹھا مسجد کی باہر والی دیوار جو میرے گھر کے پاس تھی ایک آواز
کے ساتھ وہاں پر گرا ——— میں سمجھ گیا کہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ اتنی چھوٹی عمر کا بچہ اتنا

بڑا گھر نہیں لا سکتا۔ میں نے اُسے بلایا اور چھٹی دے دی۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے اجازت طلب کی کہ میری خواہش ہے کہ میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آجایا کروں۔ میں نے اُس کی یہ خواہش مان لی اور اُسے تنبیہ کی کہ وہ کبھی کوئی شرارت نہ کرے۔ اُس نے وعدہ کر لیا اور اجازت لے کر چلا گیا۔

یہ دونوں واقعات مولانا نوحی مرحوم و مغفور نے مجھ پر شفقت کرتے ہوئے بڑی محبت اور پیار کے ساتھ بیان فرمائے۔

محمد اختر

میاں محمد اصغر

(سینئر سپرنٹنڈنٹ، واپڈا ریٹائرڈ)

میں اس محترم بزرگ کی جوتیوں کے تلے خاک برابر بھی نہیں اور نہ ہی کچھ زیادہ واقفیت رکھتا ہوں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ میرے بزرگوں کے تعلقات محترم بزرگ سے بہت گہرے تھے۔ باقی اپنے متعلق یہی تحریر کر سکتا ہوں کہ جناب نے ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح مجھ سے سلوک کیا۔ جن دنوں کی یہ بات ہے۔ ان دنوں میرے عزیز برادرم صوفی ضیاء الحق صاحب کے ساتھ بہت گہرے مراسم تھے۔ میٹرک کے بعد قریباً سارا دن عزیز مذکور کے ہاں ہی گزارتا کیونکہ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے بیکار تھا۔ لہٰذا گاہے بگاہے محترم بزرگ کے پاس مسجد میں جا کر بیٹھا رہتا تھا۔ اور اُن سے ملازمت کے سلسلہ میں دعا کا خواستگار رہا کرتا تھا۔ دوسرے محترم بزرگ بھی صوفی صاحب کی وجہ سے اچھا جانتے تھے۔

آنکھوں کی بینائی ضائع ہونے کی وجہ سے محترم بزرگ زیادہ تر مسجد جنڈی والی میں رہتے تھے کیونکہ مسجد مذکور آپ کے مکان کے بالکل نزدیک تھی۔ آپ گاہے بگاہے صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید پر درس دیا کرتے تھے اور تقریباً تمام محلے والے بھی اس میں شرکت کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہر ایک کے نزدیک ہر دلعزیز تھے۔ مذہب کے ساتھ اس حد تک وابستگی تھی کہ کوئی ناگوار الفاظ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نا خلف اور دنیا داروں کی نگاہ میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ مگر آپ نابینا ہونے کی وجہ سے کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

محترم بزرگ نے ایک کتاب "ماذ الاسلام" لکھی تھی جس میں انبیاء، اکابرِ اسلام کے حالات، تفسیر بیان کئے ہیں۔ کتاب جس مقصد کے لئے تحریر کی گئی تھی اس کا فائدہ پورا نہیں حاصل کیا گیا۔ باقی گنہگار نے بھی اس کتاب کو مختلف مقامات سے دیکھا ہے اور یہی بڑی خوبی پائی ہے کہ مجھ جیسے جاہل آدمی کو بہت کچھ حاصل ہو گیا۔ کیونکہ عبارت بہت سلیس ہے۔ یہ کتاب علماء، طلباء (بالخصوص مصنفین اور واعظین کے لئے ایک عجیب تحفہ ہے)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت عقیدت تھی۔ بندہ کو جب بھی ملنے کا اتفاق ہوتا تھا تو حسبِ ذیل فارسی کا شعر بھی زبان پر ہوتا تھا

سلامے یا رسول اللہ سلامے	فرستادم بدرگاہت پیامے
خدارا سوئے مشتاقاں نگاہے	بیا پے گر نباشد، گاہے گاہے

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محترم بزرگ کو اپنے حبیب ؐ کے صدقے جنت الفردوس کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر جگہ عطا فرمائے۔ ان کی جوتیوں کے صدقے مجھ گنہگار کی دنیاوی مشکلات آسان فرمائے اور بعد از مرگ اپنی بزرگوں کے زیرِ سایہ جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

میاں محمد اصغر

میاں محمد حنیف خلف میاں عبد الغنی مرحوم نمبردار

گلی ذیلداراں اندرون بھاٹی دروازہ، لاهور

چند یادیں
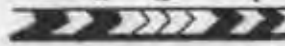
۱۔ عبد اللہ انور بیگ ایڈووکیٹ اکثر مولانا کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ان دنوں وہ ابھی طالب علم تھے اور ایل ایل۔بی کے امتحان کی تیاری کیا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا مسجد میں تشریف فرما تھے کہ عبد اللہ انور بیگ آئے۔ میں بھی خدمت میں حاضر تھا۔ عبد اللہ انور بیگ کہنے لگے۔ مولانا! شیخ سعدی مرحوم فرماتے

نخواہ مشہور ہو گیا ہے۔ وہ کوئی فصیح مؤلف تو نہیں ہے۔ یہ سُن کر مولانا طیش میں آ گئے اور عبداللہ انور بیگ
پر برس پڑے کہ اگر سعدی فصیح عبارت نہیں لکھتا تو کیا تم لکھتے ہو؟

۲۔ حکیم سید عالم شاہ لاہور کے مشہور طبیب اور حاذق تھے جو موچی دروازہ محلہ شیعیاں
میں مقیم تھے۔ ایک بار وہ مولانا کے علاج کے لئے تشریف لائے تو مولانا نے کہا: شاہ صاحب آپ نے نہایت
کڑوی دوائی دی ہے۔ حکیم صاحب کہنے لگے۔ میں آپ کا علاج کر رہا ہوں۔ ضیافت نہیں کر رہا۔
حکیم صاحب کو مولانا کے گھر کا سامان بکھرا ہوا نظر آیا تو مولانا صاحب کے سامنے اس کا ذکر کیا۔ مولانا
نے فرمایا: آپ اولادِ علیؓ ہو کر ایک درویش کی منعت کرتے ہیں۔

۳۔ مسجد کے ایک نمازی نے مولانا صاحب سے عرض کیا کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے یہ
مسئلہ سُنا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں جایا کرتے تھے تو امام حسین رضؓ آپ کی
پشت پر سوار ہو جایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام نے امام حسین کو منع کیا تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں
اگر قرآن پر قرآن کو رکھ دیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مولانا نے نمازی سے کہا کہ جس مولوی نے یہ
مسئلہ بیان کیا ہے اسے میرے پاس بُلا لاؤ۔ وہ نمازی اسے لے آیا۔ اس شخص نے کہا کہ میں اہل تشیع میں سے
ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تم سے حجت بازی نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں تو متشدد قسم کا مسلمان
ہوں اور اس بات پر مجھ فخر ہے

۴۔ ایک دفعہ مولانا اپنے گاؤں سے واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ اس دفعہ میں گجرات میں سائیں
کرم الٰہی عرف کانواں والی سرکار سے مل کر آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ سُنا ہے سائیں صاحب تو ہر آنے جانے والے
کو سخت فحش گالیاں دیتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ہم تو قریباً ایک گھنٹہ سائیں صاحب کے پاس بیٹھے اور لوگ آتے
جاتے رہے مگر انہوں نے ہمارے سامنے تو کسی کو کوئی گالی نہیں دی۔

۵۔ شیخ المشائخ پیر فضل عمر عرف ملا شور بازار افغانی جو حضرت مجدد صاحب کی اولاد میں
سے تھے ایک دفعہ میرے تایا میاں قمردین مرحوم سے ملنے آئے۔ میاں صاحب نے پیر صاحب سے مولانا کا ذکر کیا تو
وہ اچھو سے میاں قمردین کے ہمراہ مولانا کو ملنے آئے۔ مولانا نے ان کی خاطر تواضع کی۔ عشاء کی نماز کے وقت
مولانا نے پیر صاحب سے جماعت کرانے کی درخواست کی۔ پیر صاحب نے فارسی میں جواب دیا کہ میں آپ کی
اقتداء میں نماز پڑھنے کو اپنی سعادت خیال کرتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے امام بن کر نماز پڑھائی اور پیر صاحب

نے ان کی اقتداء میں نماز پڑھی۔

۶۔ مولانا حافظ مہر محمد مرحوم جو اچھرہ میں میرے نانا صاحب میاں قمر دین مرحوم کے جاری کردہ مدرسہ جامعہ فتحیہ کے شیخ الجامعہ تھے۔ نہایت متقی اور قناعت پسند انسان تھے۔ جب مولانا نے وفات پائی تو لوگوں نے مولانا احمد علی لاہوری سے عرض کیا کہ آپ نماز جنازہ پڑھائیں لیکن مولانا احمد علی نے مولانا مہر محمد سے نماز پڑھانے کو کہا چنانچہ انہوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی۔

۷۔ ایک دفعہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری میاں قمر دین مرحوم کے پاس اچھرہ تشریف لائے تو انہوں نے ایک فارسی شعر پڑھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شعر تو ہمارے مولانا روحی صاحب کا ہے۔ یہ سن کر شاہ صاحب نے میری طرف بنظرِ استعجاب دیکھا اور پوچھا تمہارے مولانا روحی کیسے؟ میں نے عرض کیا۔ ہم اُن کے بچے ہیں اور ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے کہا: کیا مولانا روحی ابھی بقیدِ حیات ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں زندہ ہیں مگر بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے مدت سے گوشہ نشین اور علیل ہیں۔ یہ سن کر شاہ صاحب نے دو تین بار اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ آہ! افسوس عمر کے پچیس تیس سال ضائع ہو گئے۔ میں نے آج سے مدتوں قبل یہ سنا تھا کہ مولانا وفات پا گئے ہیں اور میں سالک و مہر کے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتا رہا۔ مجھے کیا علم تھا کہ علاموں کا علامہ ابھی زندہ ہیں۔

۸۔ مولانا کی آخر عمر کا واقعہ ہے کہ میرے نانا میاں قمر دین مرحوم اچھرہ سے اپنے آبائی مکان واقع کوچہ خیلداراں بھاٹی دروازہ میں تشریف لائے۔ میاں قمر دین صاحب ٹانگوں سے معذور ہو چکے تھے اور انہیں ایک خاص طور پر تیار کی گئی گاڑی پر بٹھا کر ادھر اُدھر لایا جاتا تھا۔ چنانچہ بصد دقت وہ اچھرہ سے بھاٹی دروازہ آئے اور مولانا کے مکان کے نیچے بیٹھک میں آ اُترے۔ مولانا مدت سے صاحبِ فراش تھے۔ انہیں میاں صاحب کے آنے کی اطلاع دی گئی مگر ان کا ذہن کام نہ کرتا تھا۔ انہیں بار بار میاں قمر دین مرحوم کا نام لے کر یاد دلایا گیا۔ انہیں کچھ یاد آیا تو آپ نیچے تشریف لائے اور میاں قمر دین کے ساتھ گلے لگ کر بلند آواز سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میاں صاحب بھی روتے رہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ اب ہم دونوں کا آخری وقت ہے۔ کوئی وصیت فرمائیے۔ مولانا صاحب نے کہا کہ نزع کے وقت سے پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ وقت بڑا خطرناک ہے۔ اس وقت کے متعلق بزرگوں کو عجیب عجیب واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ پھر مدت تک مولانا اسی موضوع پر گفتگو فرماتے رہے۔

میاں محمد سعید

(ریٹائرڈ ملازم ریلوے)

پہلی ملاقات جو حضرت مولانا سے میری ہوئی میں اُس وقت تقریباً گیارہ سال کا تھا اور چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ چونکہ میں نے اُس وقت نماز شروع کر دی تھی اسلئے جب مجھے پہلی بار مسجد میں جانے کا موقع ملا تو مجھے اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور آہستہ آہستہ میں نے اُن کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ آپ نے مجھ سے چند سوالات پوچھے۔ کہاں رہتے ہو؟ کہاں پڑھتے ہو، کونسی کلاس میں پڑھتے ہو، قرآن پڑھا ہوا ہے یا نہیں ہے۔ میں اُس وقت قرآن نہیں پڑھا ہوا تھا۔ آپ نے مجھے تنبیہ کی کہ پہلے قرآن مجید پڑھو، پھر ہمارے پاس آؤ۔ لہذا میں نے قرآن پڑھنے کا عہد کر لیا اور بھاٹی گیٹ مسجد ابراہیم والی مشہور تھی وہاں ایک مولوی عبدالغنی کشمیری طالب علم لاہور میں آیا ہوا تھا۔ مسجد نیلا گنبد میں تعلیم حاصل کرتا تھا اُن سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کر دیا اور جلد ہی قرآن پڑھ گیا۔ جب میں نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ میں نے قرآن مجید پڑھ لیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے پیار کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مجھے اُن سے اُنس اور اُن کو مجھ سے محبت ہو گئی جتنی محبت مجھ کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی کو ہوئی ہو اور غالباً کسی اور کو اتنا عرصہ اُن کی خدمت میں رہنے کا نہیں ملا ہو گا۔

آپ کبھی کبھی جوشِ محبت میں آ کر میرے کان پکڑ لیتے، مروڑا دیتے، کبھی گود میں بٹھا لیتے۔ اپنے بچوں کی طرح منہ چومتے، پیار کرتے حتیٰ کہ میں اگر کسی وجہ سے مسجد میں نہ جاتا تو مجھے بلانے کے لئے گھر کسی کو بھیجتے۔ لیکن اکثر میں نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ کالج بھی لے جاتے۔ آپ اکثر کالج جاتے ہوئے پہلے مسجد میں آتے، دو رکعت نماز پڑھتے، پھر مسجد کے دوسرے دروازہ سے نکل کر کالج جاتے۔ واپسی پر آپ پہلے مسجد میں آتے پھر گھر جاتے۔ آپ کی ساری زندگی مسجد کے گوشہ میں ہی گزر گئی۔ صبح کی نماز کے بعد بیٹھے رہتے۔ اشراق کی نماز پڑھتے، چاشت کی نماز پڑھتے، ظہر کی نماز کے بعد کچھ عرصہ کے لئے گھر ٹھہرتے، پھر عصر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے۔ ضعفِ بصارت کی وجہ سے

قرآن روزانہ مجھ سے یا اگر کبھی کوئی اور آ جاتا تو ایک پارہ ضرور سنتے کبھی کوئی ناغہ نہ کرتے۔

تبلیغ و تربیت کا بہت خیال رکھتے۔ ہر ایک کی اصلاح مقصود ہوتی۔ اکثر اوقات جمعۃ المبارک کو وعظ کرتے وقت جوش آ جاتا تو کتنا کتنا وقت لگا دیتے اور بہت سے درویش و دیگر طالبعلم اور ملنے والوں کو مسجد میں ملنے کا موقع مل جاتا وہ دل کھول کر آپ سے جو بات دریافت کرنی ہوتی کر لیتے۔ اُن کی برکت سے بہت سے گوجر جو بالکل جاہل تھے، نماز پڑھنے لگے اور اُن میں سے کئی ایسے تھے جنہوں نے قرآن بھی پڑھ لیا۔ کبھی کبھی پیر جماعت علی شاہؒ اور میاں شیر محمدؒ کے ہاں بھی جاتے۔ اکثر درویشوں اور کامل بزرگوں سے ملاقات ہوتی رہتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ نے بیان فرمایا:

مجھے سخت بخار ہو گیا اور میں پریشان تھا۔ میں نے اسمعیل نمبردار سے کہا کہ کوئی ایسا آدمی ہو جو میاں شیر محمد صاحب کے پاس شرقپور جائے اور میرے لئے دعا کرائے۔ اسی پریشانی میں رات ہو گئی کہ رات دو بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو معلوم ہوا کہ میاں شیر محمد صاحب خود تشریف لے آئے ہیں اور ہاتھ پھیرا فرمایا: خیر ہو جائے گی کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ میں اُسی وقت تندرست ہو گیا۔ انہوں نے جانے کی خواہش کی میں نے عرض کیا کہ ٹھہریں صبح ہو گی تو چلے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت والد صاحب کا ارشاد ہے کہ صبح کی نماز یہاں آ کر پڑھنی ہے۔ اور ہمیں سبق دیا کہ آپ کی والدہ سوتیلی تھیں لیکن اُن کا ادب اور حکم اتنا ملحوظِ خاطر تھا کہ ہر حکم کی بجا آوری کرتے۔

ایک دفعہ ایک درویش جنکا نام حاجی امام دین تھا اور جو بہاولپور میں رہتے تھے اور ہر سال حج کرنے جاتے مسجد میں آ گئے۔ اور کہنے لگے کہ میں مدینہ منورہ میں تھا کہ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آپ کا ایک قصیدہ پیش ہوا۔ اُس سے مجھے آپ کی زیارت کا شوق ہوا اور میں یہاں آ پہنچا۔

اکثر اوقات آغا سید سعید جان پشاور والے جن کا سلسلہ حضرت شاہ محمد غوثؒ سے ہے، جب بھی پشاور سے لاہور آتے تو مولانا صاحب کو مل کر جاتے اکثر لوگ آپ سے علم حاصل کرنے کی خاطر آتے۔ آپ نے کبھی بھی محسوس نہ کیا بلکہ ہر ایک کو وضاحت کے ساتھ سمجھاتے اور اُسکی تسلی کرتے۔ اکثر لوگ آپ سے دعا کرانے آتے آپ نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور آپ کی دعا قبول ہو جاتی۔

ایک شخص آیا اُسکے گھر کے حالات خراب تھے اور وہ بہت پریشان تھا۔ وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ مسجد

میں آکر مولانا صاحب سے عرض کرنے لگا کہ میں بہت مصیبت میں ہوں۔ والدہ کہتی ہے کہ عورت کو طلاق دے دو۔ آپ کو تو علم ہے کہ ساس بہو کا جھگڑا ہمیشہ رہتا ہے۔ کوئی ایسی صورت ہو کہ میری تبدیلی ہو جائے اور میں عورت کو میکے چھوڑ جاؤں اور والدہ گھر پر رہے اور مجھے کچھ سکون ہو۔ چنانچہ چند عرصے کے بعد وہ دہلی تبدیل ہو گیا۔ اس اثنا میں اس نے عورت کو طلاق دے دی اور اسکی والدہ نے اسکی دوسری شادی کر دی۔ حالات پُرسکون ہو گئے۔ کافی عرصے کے بعد وہ پھر دہلی سے لاہور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میری تبدیلی لاہور ہو جائے دعا کیجئے۔ چنانچہ چند ہی دن گزرے کہ Partition ہو گئی اور وہ تبدیل ہو کر لاہور DSP بن کر آ گیا۔

اُن کی برکت سے اس بندہ کو بھی بہت سے بزرگوں کا دیدار نصیب ہوا ہے۔ اُن کے پاس اکثر میرٹھ میں سے گھوڑے شاہ بزرگ، کانگڑہ، دھرم سالہ، گلسانی بازار میں سے سائیں عبدا بزرگ اور سید ظفر مہدی حسن جو اپنے وقت کے قطب اور غوث کا درجہ رکھتے تھے آیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ذاکرین کو ذاکرین کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کو ملتے ہیں۔ میں مولانا کی طفیل اُن کی صحبت سے بہرہ یاب ہوا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی بزرگ ہستی اُنکے پاس آتی رہتی۔ اکثر اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں شعر پڑھتے رہتے اور روتے جاتے۔ ہم بھی اُنہیں دیکھ کر رونے لگتے۔ یہ کوئی عام شعر و شاعری نہ تھی بلکہ اس میں غور کرنا چاہئے۔

آپ اکثر فرماتے کہ قرآن مجید تو سمندر ہے لیکن ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق فائدہ حاصل کرتا ہے اگر کسی کے پاس مشکیزہ ہے تو وہ مشکیزہ بھر لیتا ہے، اگر پیالہ ہے تو پیالہ بھر لیتا ہے۔ خدا جانے اس چھوٹی سی مسجد میں کیا نور کا سمندر تھا ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن اب وہ وقت گیا، وہ چیز اور برکت نہ رہی۔ اب لوگ چاہتے تو ہیں کہ مسجد میں دین کی باتیں لوگوں کو سنائی جائیں لیکن جب سنانے والا تھا تو کوئی نہ سنتا تھا۔ جب سمجھانے والا تھا تو کوئی سمجھنے کے لئے نہ آتا۔ خدا نے اپنے رسول کے لئے فرمایا: لوگوں میں سے تمہارے اندر ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو ہماری نشانیاں دکھلاتا ہے تمہارا تزکیہ کرتا ہے، علم و حکمت سکھاتا ہے اُسکی فرمانبرداری اور اطاعت میں تمہارا فائدہ ہے۔ اسی طرح ایسا عالم جو شریعت پر کاربند ہو اور تم میں موجود ہو، جو اُسکی صحبت فائدہ دے گی محض کتابیں پڑھنا فائدہ نہیں دیتیں۔

آپ اکثر عصر کی نماز سے لے کر مغرب کی نماز کے بعد اوابین کے نفل پڑھ کر شام کا کھانا کھانے جاتے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر عشاء کی نماز آکر پڑھاتے۔ غرض آپ کا سارا وقت مسجد میں ہی گزر جاتا اور ملنے والوں کو بھی کبھی دقت محسوس نہ ہوتی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ باہر سے جتنے لوگ بھی آتے وہ علم حاصل کرنے کے لئے آتے لیکن

محلے والوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نظر نہ آیا جو علم حاصل کرنے کی خاطر آپ کے پاس بیٹھتا۔ اکثر لوگ اپنے گھریلو جھگڑوں کا فیصلہ کرانے آتے تو آپ بڑے احسن طریقہ سے سلجھا دیتے اگر کوئی فتویٰ لینے کی غرض سے آتے تو صحیح مسئلے بتا دیتے لیکن فرماتے فتویٰ لینا ہے تو مسجد وزیر خان جاؤ ہم لکھ کر کبھی کسی کو نہیں دیتے۔ محلے والے صرف امام مسجد سمجھ کر نماز پڑھتے اور چلے جاتے مگر دور سے جو لوگ آتے وہ کسی غرض کی خاطر آتے اور کچھ حاصل کرتے۔ آپ اکثر فرماتے کہ باپ کے پاس تو شہد کے مٹکے بھرے ہیں مگر اولاد کا مزاج گرم ہے ان کی طبیعت کے موافق نہیں۔ رشد و ہدایت کے عجیب عجیب طریقے تھے۔ درود شریف کثرت سے پڑھا کرتے۔ فارسی، عربی و پنجابی کے شعر بھی پڑھا کرتے تھے۔

محمد شفیع

(محلہ جلوٹیاں اندرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور)

مجھ اور میرے والد صاحب مرحوم کو ایک مدت تک مولانا اصغر علی روحی مرحوم کی صحبت کا شرف حاصل رہا اور انہوں نے اس محلے کے اکثر لوگوں کو صحیح معنی میں مسلمان بنایا۔ اُن کی آمد سے پہلے اس محلے کے لوگ تقریباً اور بالخصوص شادی بیاہ کے موقع پر نہایت جاہلانہ اور غیر اسلامی رسوم و رواج کے پابند تھے مثلاً آتش بازی، باجے بجانا، شراب نوشی اور مجرا وغیرہ لیکن مولانا نے تبلیغ و تدریس کے ذریعے رفتہ رفتہ اُن کی یہ تمام عادات چھڑا دیں، حتیٰ کہ سب لوگ بالعموم نمازی اور پرہیزگار ہو گئے۔ مولانا مرحوم کو میں اولیاء اللہ میں سے خیال کرتا ہوں میاں شیر محمد مرحوم شرقپوری بھی اُن کی ملاقات کو آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہیں (مولانا روحیؒ) گردے کے درد کی شکایت ہوئی۔ شدتِ تکلیف میں انہوں نے میاں شیر محمد صاحب کو یاد فرمایا اور کہا کہ اگر وہ دعا کریں تو شاید مجھے آرام ہو جائے۔ اُس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ دو بجے رات کے قریب میاں صاحب تشریف لے آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا نے اپنے بڑے صاحبزادہ سے کہا کہ دیکھو دروازے پر کون ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ میاں شیر محمدؒ ہیں۔ مولانا نے اطلاع پا کر میاں صاحب کو بالائی منزل پر تشریف لانے کی درخواست کی۔ میاں صاحب اوپر تشریف لائے اور السلام علیکم کے بعد فرمایا کہ آپ نے یاد فرمایا تھا۔ میں حاضر ہو گیا

ہوں۔ پھر انہوں نے درد والے مقام پر کچھ پڑھ کر دم کیا، جس سے آرام آ گیا۔ اس کے بعد میاں صاحب نے اجازت چاہی لیکن مولانا نے فرمایا کہ صبح کی نماز آپ پڑھائیں اور اس کے بعد ناشتہ تناول فرما کر تشریف لے جائیں لیکن میاں صاحب نے جواب دیا کہ واپس جا کر میں نے اپنی والدہ ماجدہ کو تہجد کی نماز کے لئے وضو کرانا ہے اس لئے مجھے اجازت دیں۔ اس زمانے میں لاہور سے شرقپور تک کچی سڑک تھی۔ تانگے یا لاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صرف یکے جاتے تھے۔ بہر صورت میاں صاحب واپس تشریف لے گئے۔ یہاں سوچنے کا مقام ہے کہ اولیاء اللہؒ کا روحانی تعلق کیا رنگ لاتا ہے۔ مولانا کی حالت کا میاں صاحب کو کس نے بتایا اور وہ آدھی رات کے وقت کس طرح تشریف لائے اور کیونکر واپس گئے۔ حالانکہ یکوں کی آمدورفت بھی سر شام بند ہو جاتی تھی۔ یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے۔

مولانا نے اس مسجد میں تقریباً پچاس سال باقاعدہ جماعت کرائی اور جمعہ کے روز وعظ فرماتے رہے اور درس و تدریس کے سلسلہ میں دین کی تبلیغ کرتے رہے اور اسکے لئے انہوں نے کوئی معاوضہ نہ لیا بلکہ فی سبیل اللہ سب کچھ کیا۔ مسجد کی تعمیر میں اپنی گرہ سے خاص امداد فرمائی۔

مولانا کے پڑوس میں ایک اور بزرگ میاں اسمٰعیل نمبردار رہتے تھے، جو بڑے سخت دیندار، تہجد گزار اور صاحب سخاوت بزرگ تھے۔ گو ان کی تعلیم اتنی زیادہ نہ تھی۔ تاہم دینی معاملات کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ مولانا کے درس و تدریس اور وعظ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

ایک اور بات جو قابل ذکر ہے یہ ہے کہ اس گلی کے آخر میں جنڈ کا ایک درخت تھا۔ چونکہ اس محلہ کے قریب ہی غیر مسلم لوگ بھی آباد تھے۔ مثلاً کوچہ وسطی رام اور محلہ چلوٹیاں وغیرہ اس لئے وہ لوگ اس درخت کی تعظیم اور پوجا کیا کرتے تھے۔ مولانا نے میرے والد مرحوم میاں غلام نبی سے فرمایا کہ یہاں اس درخت کی پوجا ہوتی ہے اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہئیے۔ میرے والد نے جواب دیا کہ اگر آپ حکم دیں تو میں آٹھ دن تک ختم کر سکتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ کسی ایسے طریقے سے کام ہونا چاہئیے جس سے فتنہ و فساد نہ ہو اور جو خلاف قانون نہ ہو۔ چنانچہ میرے والد صاحب نے ایک دن چپکے سے اس درخت کی جڑوں میں تیزاب ڈال دیا۔ جس کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ سوکھ گیا۔ حتیٰ کہ میونسپل کمیٹی نے اسے کٹوا دیا اور اسکی پوجا خود بخود بند ہو گئی۔

مولانا کے زمانے میں کچھ بہت شریف اور نیک خاندانوں کے لوگ اس محلہ میں آباد تھے۔ مثلاً شیخ علی احمد مرحوم جو سیشن جج تھے اسی طرح میاں اسمٰعیل نمبردار جو محلے کے سب سے معمر شخص تھے۔ پھر میاں فیروزدین خیلدار اٹاری ضلع قصور اور میرے والد میاں غلام نبی مرحوم جو صراف تھے۔

میری شادی کے موقع پر میرا نکاح مولانا نے ہی پڑھا۔ برادری نے میرے والد کو مجبور کر کے اس موقع پر آتش بازی کا مظاہرہ کروایا۔ لیکن مولانا نے اس خلافِ شریعت کام کی وجہ سے نکاح پڑھنے کے لئے یہ شرط پیش کی کہ میرے والد صاحب جرمانہ کے طور پر ایک صد روپیہ مسجد کے لئے چندہ ادا کریں چنانچہ ایسا کیا گیا تب مولانا نے نکاح پڑھا

ایک دفعہ مولانا حسبِ معمول مسجد میں وعظ فرما رہے تھے کہ میاں قمر دین مرحوم نے پوچھا کہ شہید اگر اسلامی عقیدہ کے مطابق زندہ ہیں تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتے۔ مولانا نے فرمایا: وہ سبز چڑیوں کی شکل میں اڑتے پھرتے ہیں۔ جن کی چونچ اور پاؤں بھی سبز ہوتے ہیں۔ میں ایسی چڑیوں کے دیکھنے کے شوق میں متواتر کئی روز دریا کی طرف جاتا رہا، لیکن ایسی چڑیاں مجھے نظر نہیں آتی تھیں۔ آخر ایک روز میں نے وہ چڑیاں دیکھ لیں جن کی چونچیں اور پاؤں واقعی سبز تھے

مولانا مرحوم کے وعظ میں بہت اثر تھا۔ جسے سن کر لوگ بے اختیار رونے لگتے تھے۔ ایک دفعہ وعظ کچھ لمبا ہو گیا اور جمعہ کی نماز کا وقت تھا تو ایک آدمی نے کہا کہ حضرت تین بج گئے ہیں اور نماز کا وقت ہے مولانا نے فرمایا کہ کیا اللہ کا بھی کوئی وقت ہے۔

ایک دفعہ ایک آدمی کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آیا۔ آپ نے قرآن و حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے اس کا جواب دے دیا۔ اس شخص نے کہا کہ مجھے یہ جواب تحریر فرما دیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ چونکہ اس میں کچھ ہیر پھیر ہوتی ہے اس لئے میں لکھ کر نہیں دے سکتا۔

مسجد میں ایک شخص محمد بخش نامی نماز پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا پیشہ یہ تھا کہ بیاہ شادی یا بچہ پیدا ہونے کے موقع پر وہ مجرا کرنے والی عورتوں کے ساتھ مددگار کے طور پر جایا کرتا تھا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا تھا اور نماز کے بعد اپنے کسی وظیفہ کو پورا کر کے گھر چلا جاتا تھا۔ ایک دن جب وہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آیا تو نماز کے بعد وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں چونکہ وہ بہت کم بولتا تھا اس لئے مولانا نے ہمہ تن گوش ہو کر فرمایا کہ کیا بات ہے۔ اس نے بتایا کہ جب میں گھر سے آ رہا تھا تو راستے میں فلاں مکان پر عورتیں ڈھولک بجا رہی اور کچھ گا رہی تھیں لیکن بے کار کیونکہ انہیں سننے اور ان کی داد دینے والا کوئی نہ تھا۔ ہمارا گروہ جب گانا بجاتا ہے تو ہمیں لوگ ہر طرف سے بڑی بڑی رقمیں "ویل" کے طور پر دیتے ہیں اور ہم جیبیں بھر کر واپس آتے ہیں۔ اس وقت میاں قمر

دین محمد مولانا کے پاس بیٹھے تھے۔ مولانا نے اُن سے کہا کہ جاؤ اور اُن عورتوں کو ایسی حرکت کرنے سے منع کرو۔ چنانچہ میاں محمد دین ایک لاٹھی لے کر گئے اور اُس گھر کے دروازے پر بار بار لاٹھی مار کر گانے والیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور سخت سُست کہا۔ جس کے بعد اُن عورتوں نے گانا بجانا بند کر دیا۔

الغرض مولانا نہایت نیک اور دیندار بزرگ تھے اور انہوں نے اردگرد کے تمام محلوں کے لوگوں کو دین اسلام کا صحیح رستہ دکھایا اور جب کہیں کسی بدعت کا انہیں پتہ چلتا تو وہ اُسے ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ لوگ آج تک اُن کا ذکرِ خیر نہایت عزت اور احترام سے کرتے ھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنۃ الفردوس میں اعلیٰ مدارج عطا فرمائے۔ آمین

ایک اور بات مجھے یاد آگئی اُن کے بہت سے شاگرد اور معتقد لوگ جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اُن کی زیارت کی خاطر آتے رہتے تھے۔ چونکہ مولانا کا زیادہ وقت مسجد میں ہی صرف ہوتا تھا اسلئے وہ عموماً مسجد میں ہی اُن کے پاس حاضر ہوتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال جو مولانا کے شروع دور میں بھاٹی دروازہ رہائش رکھتے تھے۔ عموماً اُن کا وعظ اور درس سننے کے علاوہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے اہتمام سے آیا کرتے تھے۔

محمد شفیع۔

محمد شفیع ولد حاجی دین محمد صاحب

(مابین اندرون موری و بھاٹی گیٹ، لاہور)

حضرت مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے چند حالات جو آپ کی صحبت میں مجھے نصیب ہوئے اور جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں قلمبند کرتا ہوں

سب سے پہلے میں یہ بتادوں کہ میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ میری ابتدائی تعلیم یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضرت مولوی صاحب قبلہ سے ہوئی۔ میرے والد ماجد صاحب کو حضرت مولوی صاحب سے بہت عقیدت تھی۔ والد صاحب صوفی منش اور درویش طبع تھے۔ میں نے قرآن مجید حضرت مولانا سے پڑھا۔ پھر میں نے

دھرالی گئی۔ میں بچپن سے ہی نماز باجماعت پڑھنے کا عادی تھا۔ میں صبح کی نماز کے بعد روزانہ ایک پارہ سنایا کرتا تھا
اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتے۔ کبھی کبھی میں اسلامیہ کالج بھی چھوڑنے جاتا تھا۔ مسجد میں اکثر وعظ و نصیحت فرماتے۔ جمعہ کی
نماز میں جوش و خروش سے وعظ فرماتے۔ اہلِ محلہ اکثر قوم گوجر سے تھے۔ حضرت مولوی صاحب کے وعظ سے نمازی
بن گئے تھے۔ حضرت مولانا کی خدمت میں اللہ والے حضرات کثرت سے آتے تھے جو کہ اپنے وقت کے اکابر ولی اللہ تھے
ان کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

حضرت میاں رشید محمد صاحب مرحوم، حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، حضرت مولوی
ظفر علی خان مرحوم، علامہ اقبال مرحوم اور حضرت پیر جماعت علی شاہ مرحوم

یہ سب حضرات آپکی خدمت میں حاضر ہوتے باہم گفتگو ہوتی رہتی۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب
حضرات کو جنۃ الفردوس میں جگہ دیں۔ آمین ثم آمین۔ آپ سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتے اور ہر سائل کا
تسلی بخش جواب دے کر رخصت کرتے۔ حضرت مولانا عربی و فارسی کے اجل عالم تھے۔ اکثر شعر فارسی میں کہا کرتے
تھے۔ قصیدے بھی پڑھا کرتے تھے اور اکثر پڑھتے پڑھتے رو دیا کرتے۔ آپکی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جایا کرتی
تھی۔ میں بھی سن کر رو یا کرتا تھا۔ اہلِ محلہ دعا کے لئے آتے۔ دعا فرماتے اور حاجت روا اللہ کے فضل و کرم سے اپنی
حاجت میں کامیاب ہوتے۔ میں آخری زندگی تک حضرت کے پاس رہا۔ آپکی وفات پر آپ کو پہلے امانت کے طور پر
تکیہ نیلا بل میں سپردِ خاک کیا گیا۔ پھر آپکی وصیت کے مطابق آپ کے آبائی گاؤں موضع کٹھالہ ضلع گجرات میں
دفن کیا گیا۔

آپ کے مزار مبارک پر اللہ کا نور برستا ہے۔ ناچیز گاہے بگاہے مزار پر حاضری دیتا رہتا ہے
دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنۃ الفردوس میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

محمد شفیع عفی عنہ ولد حاجی دین محمد
مرحوم و مغفور لاہور۔

محمد عبداللطیف
ریٹائرڈ سیشن جج

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ میرے حافظہ پر بہت زور ڈالا اور یہ چند امور یاد آئے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ فقط والسلام ۔ محمد عبداللطیف

شیخ مقبول احمد سیشن جج کے والد مرحوم نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ اس مسجد میں (جہاں مولانا اصغر علی رحمۃ اللہ علیہ امامت کرتے تھے) انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز ادا کرتے دیکھا ہے ۔ یعنی خواب کی کیفیت بیان کر رہے تھے

حضرت مولانا رشید محمد رشید قیصری رحمۃ اللہ علیہ کی مولانا اصغر علی مرحوم کے ہاں آمد و رفت تھی ۔ میں نے ایک دفعہ مسجد میں داخل ہوتے یا باہر نکلتے وقت مولانا رشید محمد رشید قیصری رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے دولت خانہ میں داخل ہوتے دیکھا تھا

ایک رات موری دروازہ کے باہر باغ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر تھی ۔ عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب بھی شریک ہوئے ۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا ۔ تقریباً تمام رات شاہ صاحب تقریر کرتے رہے ۔ کبھی سامعین کو ہنساتے کبھی رلاتے ۔ مگر مجھے خاموشی سے وعظ سنتا رہا ۔ آخر میں مولانا اصغر علی صاحب نے فرمایا کہ شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حسن بیان کی نعمت عطا فرمائی ہے ۔ اس وقت شاہ صاحب کے جوانی کے ایام تھے

ایک اور بزرگ (غالباً فضل میراں صاحب جو شاید نو مسلم تھے) اکثر مولانا کے ہاں آیا کرتے تھے ۔ ایک دن میں بھی بیٹھک میں موجود تھا اور مولانا اور فضل میراں صاحب یوں گفتگو کر رہے تھے کہ "ہم نے فاقہ کشی سے کچھ نہیں پایا ۔ طبیعت بہت کمزور ہو گئی ہے" میرا خیال ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ کی ہدایت کے مطابق یہ دونوں بزرگ صوم وصال رکھ رہے تھے یا غذا میں کمی کر دی تھی ۔ میں سکول میں پڑھتا تھا پھر بھی یہ خیال میرے ذہن میں موجود ہے کہ اسی موضوع پر بحث فرما رہے تھے

محمد عثمان فاروقی

اندرون بھاٹی دروازہ، لاہور

حضرت مولوی اصغر علی روحی مرحوم و مغفور

صاحب موصوف سے ذاتی طور پر تو ملاقات نہ ہوئی تھی مگر اپنی بیوی مرحومہ کی زبانی اُن کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ میرے سسرال والے مولوی صاحب کے بڑے مداح تھے اور ہمارا خاندان آپس میں ملتے رہتے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ میری مرحومہ بیوی نے بتلایا کہ جس وقت مولوی صاحب کالج سے واپس گھر آتے تھے تو پتہ چل جاتا تھا ہوتا یوں تھا کہ جس وقت مولوی صاحب بھاٹی گیٹ پولیس سٹیشن کے ساتھ والی گلی جسے جنڈی گلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جب گلی میں قدم رکھتے تھے تو حد نگاہ اور ملحقہ گلیوں میں مولوی صاحب کی وجہ سے جو بچے گلی میں کھیل رہے ہوتے اُن کو دیکھتے ہی شور مچاتے بھاگنے لگتے تھے اور دوسرے بچوں کو اطلاع کرتے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر اُن کو دیکھ کر بچے گلیوں میں کھیلتے نظر نہیں آتے تھے۔ گلی ڈیلاداراں میں "روحی منزل" اُن کی رہائش گاہ تھی۔ روحی منزل تو اب بھی قائم ہے۔ موجودہ مسجد اب تو خیر بہت وسیع ہو گئی ہے۔ مگر اُن کے وقت میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ میاں قدرت اللہ مرحوم اس مسجد کے متولی تھے۔ اُن کا مکان بھی مسجد سے ملحق تھا۔ بعد میں وہ لوگ یہاں سے مکان فروخت کر کے چلے گئے تھے

غالباً مولوی صاحب اپنی فراغت میں اس مسجد میں امامت کے فرائض سر انجام دیتے جس کے نتیجہ میں گوجر برادری میں نماز قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور پہلا گوجر جس نے مولوی صاحب کے پاس سے قرآن پاک ختم کیا اور نماز کا پابند ہوا تھا اور وہ تھا "بودا گوجر"۔ اس نے قرآن پاک میں الفاظ کی درست ادائیگی کی مثال قائم کی۔ اس دور میں اسی مسجد میں ایک حسن صاحب تشریف لے آتے جو کہ سنتے ہیں کہ مولوی صاحب کے مرید بن گئے اور اُن سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور پورا کلام پاک اُن سے پڑھا۔ بودا گوجر کہا کرتا تھا کہ میں جب بھی مولوی صاحب سے اپنا سبق پڑھنے جایا کرتا تھا تو مولوی صاحب صحن میں تشریف فرما ہوتے اور مجھے ایک ہلکی سی جھلک مولوی صاحب کے سامنے محسوس ہوتی۔ مگر جب میں مولوی صاحب کے پاس حاضری دیتا

تو وہ بالکل اکیلے ہوتے۔ اُن دنوں آج کل کی طرح بجلی کے پنکھے نہیں ہوا کرتے تھے۔ دستی پنکھے استعمال میں ہوتے تھے۔
میں مولوی صاحب کے پاس بیٹھ کر یہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی ان دیکھی طاقت اُن کی پیٹھ کی طرف دستی پنکھا چلا
رہا ہے کہ ہوا تو ہے نہیں۔ مگر مولوی صاحب کا کرتہ ایسے ہل رہا ہے کہ جیسے ہوا سے ہل رہا ہو۔

کچھ عرصہ ہوا کہ کراچی سے غالباً اخبار خواتین یا اخبار جہاں نے مولوی صاحب کے بارے میں ایک
مضمون شائع ہوا تھا اور وہ مواد بہت ہی اچھا تھا۔ میں نے اُس میں سے بہت سی باتیں اپنے گھر میں بیوی
کو سنائیں۔ جس نے پوری پوری تائید کی۔ مگر افسوس کہ میں اس اخبار کی حفاظت نہ کر سکا یا مجھ سے
کوتاہی میں اخبار مذکورہ گم ہو گیا۔

محمد عثمان فاروقی

محمد عزیز الرحمٰن

ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ، محکمہ جنگلات (پنجاب)

بھاٹی دروازہ نور محلہ - لاہور

اس عاجز پُر تقصیر کو حضرت مولانا رح سے کئی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا خصوصاً عصر کی
نماز اور مغرب کی نماز کے درمیان۔ جب میں حاضر خدمت ہوتا تو عموماً یہی دیکھتا کہ آپ رح مسجد میں جو اس وقت
چھوٹی سی تھی درمیانی دروازے میں تشریف فرما ہیں اور آپ کا منہ شمال کی طرف ہے۔ میں نے یہی دیکھا کہ آپ کو قوم کی
سربلندی اور اسلام کے اصولوں کے بجا لانے کا ہر وقت خیال رہتا۔ بے نمازیوں کو نماز کی تاکید فرماتے اور نمازیوں
کو نعرہ دیتے کہ اگر نماز درست کر لو گے تو تمہارے سب کام خود بخود درست ہو جائیں گے۔ بہت سے لڑکوں کو آپ رح
نے بغیر کسی اجرت کے منشی سے لے کر منشی فاضل اور مولوی فاضل بنایا۔ آپ کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ جب تک ایک بات
طالب علم کے دماغ میں اچھی طرح نہ بیٹھ جاتی بار بار دہراتے اور پوچھتے کہ سمجھ آ گئی ہے۔ پھر آگے چلتے۔

آپ اول درجے کے عالم باعمل اور چوٹی کے گمنام قسم کے انسان تھے۔ آپ رح کی طبیعت بہت سادہ
تھی۔ ایک اجنبی کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ عالم ہیں۔ آپ کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ اگر کسی وقت

بہت سے طلبا یا دوسرے آدمی حاضر خدمت ہوتے تو سوائے دینی تعلیم کے کوئی اور بات نہ کرتے

آپ ہمیشہ یہی تلقین فرماتے کہ دل سے مسلمان ہو جاؤ۔ یہ دنیا چند روز کی ہے۔ آخرت کے لئے کچھ کر لو۔ نماز قائم کرو اور پابندی سے وقت پر ادا کرو۔ آپ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلی جس کو اپنی حالت بدلنے کا خود خیال نہ ہو۔

محمد عزیز الرحمٰن

حکیم معراج دین بٹ مرحوم

شاگرد حکیم احمد دین مرحوم۔ بھاٹی دروازہ، محلہ جلوٹیاں لاہور

مولانا اصغر علی روحی صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ جب کالج جاتے تو انہوں نے ایک لمبا چوغہ پہنا ہوتا اور ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا ہوتا۔ گو مجھے ان کے پاس بیٹھنے کا اتنا موقع نہیں ملا جتنا میرے بڑے بھائی چراغ دین صاحب مرحوم بیٹھا کرتے تھے۔ پھر بھی میں نے ان کے متعلق جو سنا اور دیکھا وہ بیان کرتا ہوں میں اپنے بھائی کے ساتھ کبھی کبھی میاں صاحبؒ کے پاس آجاتا تھا

ایک دن میں اپنے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ میاں صاحب کے ہاں بیٹھا تھا کہ ایک عورت آئی اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں کیا تھا۔ بہر حال وہ گجر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے میاں صاحب سے کہا کہ ہم بہت غریب ہیں۔ میرے بیٹے کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے اس لئے مجھ سے زیادہ کام کاج نہیں ہوتا کیونکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ میں نے ایک جگہ اپنے بیٹے نبی بخش کے لئے رشتہ مانگا لیکن انہوں نے ہمیں غریب جان کر رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ میاں صاحب کو اس پر بڑا ترس آیا انہوں نے کہا۔ نبی بخش کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ عورت گئی اور نبی بخش کو اپنے ساتھ لے آئی۔ جب وہ آیا تو میاں صاحب کہنے لگے کہ کیا تم نماز پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ میں پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ داتا صاحب کے پیچھے میرا نبی بخش کا گزارا ہے۔ وہاں جا کر قل شریف پڑھو۔ اس نے کہا کتنی

بار تو میاں صاحب نے فرمایا۔ گیارہ (۱۱) مرتبہ پہلے اور گیارہ (۱۱) مرتبہ بعد میں اور گیارہ (۱۱) مرتبہ تسبیح روزانہ
یہ سب رات کو کرنا ہے۔ اس کے پڑھنے کے ساتھ گوشت کا پرہیز کرنا ہے اور پھر مجھے بتانا اور جس مطلب کے لئے
اسے پڑھنا اس کو اپنے دل میں رکھنا۔ اس کے بعد وہ ماں بیٹا چلے گئے اور ہم بھی تھوڑی دیر کے بعد گھر آ گئے۔
٨ دن کے بعد میں نے بخشی سے پوچھا کہ کیا بنا ہے؟ اس نے کہا کہ سات دن کے بعد ہی لڑکی والے رشتہ لے کر
خود بخود ہمارے گھر آ گئے تھے۔ میں نے کہا کیا تم میاں صاحب کے ہاں گئے تھے اس نے کہا کہ ہم اسی دن گئے
تھے اور سارا حال کہہ سنایا کہ میاں صاحب نے مجھے کہا کہ ہم نے جو چیز تمہیں دی تھی وہ ہمیں واپس کر دو
میں نے کہا کہ میں کس طرح واپس کروں تو میاں صاحب نے فرمایا کہ کہو "میں نے واپس کر دی" میں نے کہا
واپس کر دی۔ انہوں نے کہا ہم نے واپس لے لی۔

چند دنوں کے بعد میں میاں صاحب کے پاس پھر آیا۔ دیکھا کہ ایک عورت آئی ہے اس نے بتایا کہ میں
جڑانوالہ سے آئی ہوں۔ اس کے ساتھ اس کی جوان لڑکی بھی تھی۔ عورت نے بتایا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اس پر
کسی چیز کا سایہ ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ میرے سامنے بیٹھو اور جب لڑکی بیٹھ گئی تو میاں صاحب نے کچھ پڑھا اور
لڑکی سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ تو نے اس سے کیا لینا ہے؟ اگر چلے جاؤ تو تمہاری مہربانی ہے اگر نہیں تو اپنے بہن بھائیوں
سے بچھڑ جاؤ گے اس نے جواب دیا کہ میں کس طرح اپنے بہن بھائیوں سے بچھڑ سکتا ہوں۔ میاں صاحب نے کہا کہ تو
مخلوق کو نہیں چھوڑے گا۔ اس نے کہا: نہیں۔ میاں صاحب نے ایک کپڑا لیا اس کو پانی میں بھگو کر اس پر کچھ
پڑھا اور اس کو مروڑ دیا۔ لڑکی نے کہا کہ میں چلا جاتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ آگے سے
ایسی حرکت نہیں کروں گا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ دوسرے دن پھر پیش آیا۔ مریدکے سے ایک شخص جھنڈا نامی جو کہ محلہ
مٹاراں سے تعلق رکھتا تھا۔ آیا۔ وہ تار گھر میں ملازم تھا۔ اس نے کہا کہ میاں صاحب میرا افسر مجھ سے
بڑا بدظن ہے۔ وہ مجھے نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ اگر اللہ نے چاہا تو وہ تجھے نہیں
نکالے گا۔ یہ کہنے کے بعد اس کے ماتھے پر کچھ لکھا اور کہا کہ تو جا اور افسر کے سامنے ہو جا۔ وہ تجھے نکالنے
کی بجائے سینے سے لگا لے گا۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ یہی ہوا کہ افسر نے اسے سینے سے لگا لیا
اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا کہ گجرات سے ایک شخص آیا اس نے کہا کہ میں کٹھالہ سے آیا ہوں
اور میرے رشتہ دار مجھ سے بہت تعصب رکھتے ہیں۔ وہ بڑا نمازی تھا اور اونٹوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ میاں

صاحب نے اسے کہا کہ پانی پر اکیس دفعہ بسم اللہ پڑھ اور اس کے چھینٹے اس شخص پر مار جو تجھ سے تعصب رکھتا ہے
میں نے اپنی عمر میں ان جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ وہ اصل میں ایک بہت بڑے چھپے ہوئے
ولی اللہ تھے لیکن زمانے نے ان کو پہچانا ہی نہیں۔

حکیم معراج دین بٹ

شیخ مقبول احمد

ریٹائرڈ سیشن جج

متفرق یادداشتیں

اسلامیہ کالج لاہور میں جہاں مولانا اصغر علی روحی پروفیسر تھے، ہر اتوار کو درس دیا کرتے تھے
طالب علموں میں بے حد مقبول تھے اور ان کے دلوں میں مولانا کی بہت عزت تھی اور وہ مولانا کو بے حد چاہتے بھی تھے
ڈاکٹر ڈویزی ھیگ انگریزی اور اکانومکس کے پروفیسر تھے۔ ہفت زبان کے ماہر تھے، فرانسیسی، جرمن وغیرہ
نستعلیق قسم کے شخص تھے۔ کالج گھوڑے پر آتے تھے۔ ان کے ساتھ جو سائیس ہوتا وہ باقاعدہ وردی پہنے ہوتا اور اس
نے سونے کی زنجیر بھی لگائی ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر ڈویزی ھیگ مولوی صاحب کے ساتھ والے کمرے میں پڑھا رہے تھے
کہ طالب علموں نے مولوی صاحب سے اونچی اونچی آواز میں سوالات کئے۔ ھیگ نے شکایت کی کہ تمہارا پروفیسر تم پر کنٹرول
نہیں کر سکتا۔ طلبا نے غصے میں آ کر سٹرائک کر دی۔ اس پر اسے بھری محفل میں معافی مانگنا پڑی
مولانا پوستین پہنتے تھے اور گرم عمامہ باندھتے تھے۔ یہ سب چیزیں امیر کابل حبیب اللہ نے شاید
کالج کے افتتاح پر یا کسی سفیر کی معرفت آپ کو تحفہ بھیجی تھیں۔ اس کے کئی سیٹ تھے۔ یہ اعلیٰ قسم کا ہرینہ تھا
اور منقش بھی تھا۔ میں دینیات پڑھتا تھا۔ ہم مولانا کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔ شیخ نثار صاحب بھی کبھی کبھی
تشریف لاتے تھے۔ اور میں اس مجلس میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء تک رہا۔ مولوی صاحب نے گجرات سے حافظ جلال
الدین کو بلایا تھا جو اسی مسجد میں تراویح پڑھاتے تھے جہاں مولوی صاحب نماز پڑھایا کرتے تھے
ایک ذاتی قسم کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک دفعہ ہم منٹو پارک میں کسی سے پوچھے بغیر دوسہرہ دیکھنے
چلے گئے۔ مولوی صاحب کو کسی طرح معلوم ہو گیا۔ انہوں نے والد صاحب کو بلا لیا اور کہنے لگے کہ لڑکوں کی سرزنش

کرنی چاہیئے کیونکہ انہوں نے خلافِ شرع کام کیا ہے۔ والد صاحب نے ہمیں سخت سُست کہا۔ اسکے بعد ہم کبھی بھی دوسہرہ دیکھنے نہیں گئے۔

مولوی صاحب میری شادی پر جلال آباد تربت ناروانی (تحصیل ضلع امرتسر) جو دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے، گئے۔ وہاں مکان پر یادگار کے طور پر لکھا ہے کہ آج مولوی اصغر علی روحی صاحب تشریف لائے ہیں یہ واقعہ جولائی ۱۹۱۹ کا ہے۔ مکان کی دیواریں چونکہ گیلی تھیں اسلئے بہت عمدہ خط میں یہ فقرہ لکھا گیا تھا۔

چھٹیوں میں مولانا گجرات جاتے تھے تو آکر بتاتے تھے کہ یہاں بہت گرمی ہے لیکن گجرات میں رات کو چادر لینا پڑتی ہے۔ چنانچہ جب جج ہونے کے دوران میں گجرات گیا تو ان کے قول کے صادق ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ جب وہاں سے گزرتا ہوں تو ان کے لئے فاتحہ ضرور کہتا ہوں۔

میں سیشن جج ریٹائر ہوا۔ ملازمت کے دوران انجمن حمایت اسلام کا ممبر بھی رہا۔ میرے والد صاحب بھی جج ریٹائر ہوئے تھے اور میں ۱۹۵۵ء میں انجمن کا سیکرٹری منتخب ہوا۔

شیخ نثار احمد
(ایڈووکیٹ ساہیوال)

مولانا روحی صاحب سے میں اسلامیہ کالج لاہور میں دینیات کے شعبہ میں تقریباً چار سال تک پڑھا ہوں۔ شعبہ دینیات رشد و ہدایت کا شعبہ تھا۔ اسکے علاوہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک تقریباً روزانہ اُن کی امامت میں ادائیگی نماز کا شرف حاصل ہوا۔ مزید براں جنڈی والی مسجد میں ادائیگی نماز کے بعد روزانہ کچھ اوقات اُن کے ارشادات گرامی سننے میں صرف کرتا۔ میرے مکان سے اُن کی رہائش تقریباً ۱۰۰ گز کے فاصلہ پر تھی اور جنڈی والی گلی جہاں وہ ادائیگی نماز وغیرہ فرمایا کرتے تھے اُن کے گھر سے ۱۰ قدم کے فاصلہ پر تھی۔ جنڈی والا درخت میرے وہاں سے منتقل ہونے کے بعد یعنی ۱۹۲۷ء میں کاٹا گیا اور میں نے اُن کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر صدر الدین، محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، مولانا ظفر اقبال اور دیگر کئی مستشرقین کو دیکھا ہے اور فضل حق صاحب پروفیسر فارسی کی بھی زیارت کی ہے۔ یہ سب پروفیسر اُن کے قدموں میں

آ کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کے سامنے کوئی پروفیسر اونچا نہیں بول سکتا تھا۔

مولانا نے ایک عربی رسالہ الہدیٰ شائع کیا تھا اور بیرونِ اسلامی ممالک بھی اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ مولانا کو سیاسی حالات سننے کا بہت شوق تھا اور نماز کے بعد اکثر وہ اپنے مخلصین کی جماعت سے نئی نئی خبریں سننے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔

مجھے ایک واقعہ خاص طور پر یاد ہے جس کا ذکر کرنا میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ میں نے اُن کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک نہایت اعلیٰ پایہ کے خطیب ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت نہایت اعلیٰ طریقہ سے فرماتے ہیں۔ چنانچہ مولانا روحیؒ نے خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں اُن کے کسی پبلک جلسہ میں لے چلوں۔ موری دروازہ اور لوہاری دروازہ کے درمیان ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی تقریر کرنی تھی۔ میں مولانا کو وہاں لے گیا تو بخاری صاحب خطاب فرما رہے تھے۔ مولانا روحی صاحب بخاری صاحب کی آخر تک تقریر سنتے رہے اور تلاوت سے محظوظ ہوتے رہے۔

روحی صاحب ایک بلند پایہ عالم تھے اور اسلامی ممالک کے بھی جب کبھی علماء آتے تھے تو یہ ضروری ہوتا تھا کہ وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوں۔

ایک دفعہ مصر سے ایک آدمی آیا اُس نے ایک شعر مولانا کی خدمت میں پیش کیا کہ اس شعر کا ترجمہ چاہیے۔ اس کے متعلق مصری نے بتایا کہ بڑے بڑے عالم لوگ بھی اس کا ترجمہ نہیں کر سکے۔ کیا آپ مجھے اس کا ترجمہ سمجھا سکتے ہیں؟ مولانا نے اُسی وقت اُس کا ترجمہ کر دیا۔ وہ مصری بہت محظوظ ہوا اور اُن کے علم سے کافی متاثر ہوا۔ یہ ہمارے سامنے کا واقعہ ہے۔

مولانا نے دین کی بہت خدمت کی۔ کافی عرصہ جھنڈی والی مسجد میں نماز پڑھاتے رہے اور درس دیتے رہے اور ان سب چیزوں کا کبھی کوئی معاوضہ نہ لیا۔ پروفیسروں میں عالم اگر تھے تو وہ مولانا روحی صاحب تھے

اس سوال پر کہ یہاں انگریزوں کو پرنسپل کیوں رکھا جاتا تھا تو نثار صاحب نے فرمایا کہ "مجبوراً" تو نہیں کہہ سکتے ہاں "ضرورتاً" کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ کنٹرول کرنا اور تعلیم کے لحاظ سے انگریز کی کافی وقعت تھی۔

مولانا کا تقدس اس قدر تھا کہ ہر طالب علم فخر سمجھتا تھا کہ اُس کو یہ موقع نصیب ہوا ہے کہ وہ اُن سے شرفِ تلمذ حاصل کرے۔

نثار احمد

میاں نجم الدین

(پی۔ای۔ایس (ریٹائرڈ) اچھرہ)

چند رُوح افزا یادیں

"او مُوجھر اور نالائق !"

آہ کس قدر محبت اور شفقت بھری آواز تھی جو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جب بھی میرے تصور میں یہ گونج سنائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی میرے سامنے کھڑے ہیں اور میں ادب سے سر جھکائے ان کے سامنے ہوں اور پھر ایک سمت اور بھاری بوجھل ہاتھ کی ایک ہلکی سی چپت میرے گلے پر لگی۔ پھر اس کے فوراً بعد " اوئے ہیں اوئے تو اینویں کیوں ایں " (تو ایسے کیوں ہے) عرض کیا جناب کیسے ہوں۔ فرمایا جیسے تجھے نہیں ہونا چاہیئے۔ جب بھی محبت اور پیار جوش میں آتا تو اسی طرح خطاب فرماتے۔

ایک دفعہ کئی ماہ کے بعد لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ حاضرِ خدمت ہوا۔ سلام مسنون عرض کیا جواب سلام کے بعد فوراً فرمایا۔ "ہوں فیر" اسکا مطلب کیا ہے جناب۔ میں نے عرض کیا۔ فرمایا بچے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ملے تھے اور سلسلۂ کلام جہاں ختم ہوا تھا اس سے آگے شروع کرو۔

جرمنی کی خبریں جنگِ عظیم اول کے دوران بڑھ چڑھ کر آرہی تھیں۔ سب لوگ اخبار پڑھتے اور سنتے تھے ترک چونکہ جرمنی کے حلیف تھے۔ ان کے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ ان کی فتح و نصرت کے لیئے ہر مسلمان کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔ مولانا مرحوم و مغفور ہر دم بے چین رہتے تھے کہ کہیں سے ان کی مکمل فتح کی خبر آجائے۔ ہر روز نمازِ عشاء کے بعد مسجد جنڈیالی میں بعد دعا انکی آواز سنائی دیتی۔ بابو عبد الرحمٰن ! اور وہ حاضرِ خدمت ہو کر دن بھر کی افواہیں سُنا کر ان کا دل ٹھنڈا کرتے۔ کالج میں آپ کا دستور تھا کہ آپ بجائے کالج کے کمرہ کے دیوان ہوسٹل کے صحن میں کلاس لیا کرتے۔ سب سے پہلا پیریڈ ایم۔اے عربی کی کلاس کا ہوتا اور اس میں چوہدری محمد حسین بھاٹڑنگی پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز جب وہ آکر بیٹھے ہی تھے کہ مولانا نے انہیں اپنا انداز کا

خواب سنایا۔ فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مغرب کی طرف سے ایک بہت بڑی ٹرین آ رہی ہے اور اس پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ " الحمد للہ کہ لشکرِ اسلام بہ پنجاب دگربار رسید " گویا آپ کی خواہش اور آرزوئیں متشکل ہو کر اس ٹرین پر آویزاں ہو گئی تھیں۔ ابھی چوہدری محمد حسین وھیں بیٹھے تھے کہ حافظ میراں بخش صاحب مرحوم (آپ ایک مجذوب تھے۔ امرتسر کے رہنے والے تھے۔ حافظ شیرازی کے بھی حافظ تھے اور ان کے عاشق تھے۔ اکثر ان کے دیوان سے شعر پڑھتے رہتے تھے۔ کالج میں جب بھی آجاتے، طلبہ ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ان سے چھیڑ چھاڑ بھی رہتی اور انہیں دیوانِ حافظ سنا سنا کر محظوظ فرمایا کرتے) رِواز ہوسٹل کے دروازہ سے داخل ہوئے اور جہاں مولانا تشریف فرما تھے ان کے پاس سے گزرنے والی روش پر کودتے پھلانگتے گزرے۔ مولانا نے انہیں آواز دے کر بلایا تو جواب میں بے ساختہ کہا " الحمد للہ کہ لشکر اسلام بہ پنجاب دگربار رسید " اور بھاگ گئے۔ مولانا سخت حیران ہوئے کہ پہلا شخص جسے میں نے خواب سنایا ہے۔ ابھی میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ اس شخص کو کیسے آگاہی ہوئی۔ اس واقعہ سے حافظ میراں بخش صاحب کی کرامت بیان کرنا مقصود نہیں۔ صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ حضرت مولانا ترکوں کی فتح و نصرت کی خبریں سننے کے لئے کس قدر مضطرب رہتے تھے۔

انگریز سے انہیں اس قدر نفرت تھی کہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی عمارت نئی نئی بنی تھی اور وائسرائے ہند (غالباً منٹو) کی کالج میں آمد کے انتظامات کئے گئے۔ مولانا ہمیشہ کرسی پر بیٹھ کر درس و تدریس کا کام کیا کرتے تھے مگر اس روز صبح سے کھڑے رہے کہ اگر بیٹھ گئے تو اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا پڑے گا۔ جب وہ آیا اور ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ آپ سٹیج پر کھڑے رہے۔ وہ بھی اوپر چڑھ آیا اور آپ سے ہاتھ ملایا۔ کاربردازانِ انجمن اس کے ہمراہ تھے ان میں نواب فتح علی قزلباش، نواب ذوالفقار علی۔ سر میاں محمد شفیع۔ حاجی شمس الدین سیکرٹری مولوی فضل الدین وائس پریذیڈنٹ انجمن وغیرہ شامل تھے۔ سر میاں محمد شفیع صاحب مولانا کا تعارف کرا رہے تھے اور کچھ مزید گفتگو ہو رہی تھی کہ پیچھے سے انجمن کے کسی ممبر نے مولانا کا جبہ کھینچا کہ آپ نیچے اتر آئیں۔ جس پر مولانا کو سخت غصہ آیا۔ وھیں ڈانٹ پلائی " کیا کرتے ہیں آپ ؟ " اور وہ شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میراں بخش بیرسٹر ایٹ لاء جو جرنیل میراں بخش کے نام سے مشہور تھے اور تعلیم کے لئے جب انگلستان گئے تو ایک یورپین لیڈی ساتھ لے آئے وہ جہاں بھی جاتے، لیڈی ان کے ہمراہ ہوتی۔ لوگ عموماً ان سے نفرت کرتے کیونکہ بیرسٹری سے پہلے کا زمانہ بھی ان کا لوگوں کے نزدیک کوئی پسندیدہ نہ تھا۔ کالج میں پرنسپل کا کمرہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مولانا کے کمرے کے سامنے آکر پوچھا کہ پرنسپل کا کمرہ کہاں ہے۔

مولانا نے ایک لڑکے سے کہا کہ جاؤ انہیں پرنسپل کا کمرہ بتا آؤ۔ لڑکا انہیں لے گیا اور سبق میں حرج کے خوف سے دور ہی سے اشارہ کر کے بتا آیا کہ وہ ہے۔ بیرسٹر صاحب کی نظر کچھ کمزور تھی انہیں پتہ نہ چلا اور گھومتے گھماتے پھر وہیں آ نکلے اور غصہ سے بولے "کیسی تہذیب ہے یہاں کے لوگوں کی کہ اگر کوئی کسی کا پتہ پوچھے تو بتاتے تک نہیں۔" اس پر مولانا کو سخت غصہ آیا اور در حقیقت غصہ اسکی انگریزی وضع قطع پر تھا۔ گرج کر بولے "او مغربی تہذیب کے راندے ہوئے گدھے تو کیا جانے تہذیب کیا ہوتی ہے؟ تیرے جیسے ہزاروں گدھے ہم نے یہاں سے تہذیب سکھا کر اور انسان بنا کر نکالے ہیں۔" مولانا کی گرجتی ہوئی آواز سن کر حاجی شمس الدین مرحوم سیکرٹری جنرل انجمن اپنے کمرہ سے نکل آئے اور انہیں ساتھ لے کر پرنسپل کے کمرہ کی طرف چلے گئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ یہ شخص جھوٹ بول کر سچا ہو جائے گا۔ چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پرنسپل کے کمرہ میں چلا گیا اور جاتے ہی کہا کہ اس شخص سے پوچھئے کہ یہ ہے کون کہ اس نے میرے طالب علموں کے سامنے میری ہتک کی ہے۔ اس پر وہ بولا۔ دیکھو جی دیکھو یہ مجھے شخص کہتے ہیں میں نے کہا تو شخص نہیں تو اور عورت ہے۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ چنانچہ اس نے بھی معذرت کی اور معافی مانگی۔

کالج میں ہر اتوار کو مجلس وعظ منعقد ہوتی۔ حبیبیہ ہال میں کالج کے تمام طلبہ جمع ہوتے۔ مولانا اصغر علی صاحب روحی سینئر پروفیسر عربی، مولانا احمد علی صاحب جونئر پروفیسر عربی اور مولانا محمد عمر صاحب پروفیسر فارسی باری باری وعظ فرماتے۔ مولانا محمد عمر صاحب کی تقریر میں زیروبم بہت کم ہوتا۔ مسلسل بولتے چلے جاتے اس لئے طلبہ میں توجہ اور انہماک پیدا کرنے میں اکثر ناکام رہتے۔ اور ان کی تقریر کے دوران میں طلبہ باتیں کرتے اور ہال شور سے گونج اٹھتا اور بار بار انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرنا پڑتی۔ ایک مرتبہ جب یہ سماں حد سے تجاوز کر گیا اور مولانا محمد عمر صاحب انہیں خاموش کرانے میں ناکام ہو گئے تو مولانا احمد علی صاحب اٹھے۔ آپ بڑے خوش الحان تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی اور طلبہ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے مخصوص لے میں مثنوی مولانا روم کے چند اشعار ترنم سے پڑھنے شروع کئے۔ شیطان چونکہ ابھی ہال میں موجود تھا اور قرآن مجید کی وجہ سے دب کر بیٹھا رہا تھا۔ آپ کے ترنم پر پھر نکل آیا اور طلبہ نے ڈیسکوں پر طبلے کی تھاپ لگانا شروع کر دی۔ حضرت مولانا روحی رحمۃ اللہ علیہ سے نہ رہا گیا۔ اٹھے اور گرج کر فرمایا کہ جس قدر نابہنجار، بے حیا، بدتمیز اور بے ادب طلبہ آج دیکھنے میں آرہے ہیں۔ اس سے پہلے اس ہال میں کبھی کسی آنکھ نے دیکھے نہ کبھی کان نے سنے۔ اور پھر ایسے برسے کہ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی طالب علم کی آواز تو کجا اونچی سانس بھی سنائی دے جاتی۔ آدھ گھنٹہ بولے مگر طلبہ کا یہ حال تھا کہ پسینہ

پسینہ ہو رہے تھے اس کے بعد جب نکلے تو سب سہمے ہوئے تھے اور نہایت نادم و شرمندہ تھے اور پھر اس کے بعد ان کی موجودگی میں کبھی کسی کو ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا بیمار ہوئے تو حکیم عالم شاہ صاحب کو علاج کے لئے بلایا۔ حکیم صاحب نے نسخہ تجویز کیا اور مولانا نے دوائی استعمال کی جو سخت کڑوی تھی۔ دوسرے روز مولانا نے حکیم صاحب سے شکوہ کیا کہ حکیم صاحب دوائی سخت کڑوی ہے۔ حکیم صاحب بولے۔ مولانا میں نے آپ کا علاج کیا ہے ضیافت نہیں کی۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے جا دھر اُدھر دیکھا تو چارپائی کے پاس کچھ ایندھن پڑا دیکھا۔ کہنے لگے مولانا اتنے بڑے کالج کے اتنے بڑے پروفیسر اور کمرہ کا یہ حال! حضرت نے حسب معمول برجستہ فرمایا "یہ شخص علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہو کر حضرت کی منقصت کرتا ہے" اور حکیم صاحب کھسیانے سے ہو کر خاموش ہو گئے گویا حضرت مولانا نے حکیم صاحب کے طنز کا اسی وقت قرضہ چکا دیا۔

عربی ادب میں آپ کا اپنے زمانہ میں کوئی ہم پایہ نہ تھا۔ جملہ کالجوں کے تمام پروفیسر و دیگر علماء کرام انہیں علم ادب میں سند مانتے تھے۔ پروفیسر محمد شفیع صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، مولوی ظفر اقبال صاحب انسپکٹر ورنیکلر ایجوکیشن پنجاب، چوہدری محمد حسین صاحب آنریری سیکرٹری ایلائیڈ حکومت پنجاب کو آپکی شاگردی پر فخر تھا اور یہ سب لوگ آپ کی گرد آلود چٹائیوں پر بیٹھ کر فیض حاصل کرتے رہے۔

نجم الدین

نسیم حسن انصاری

(اندرون بھاٹی دروازہ لاہور)

حضرت علامہ اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ

میں دسویں جماعت کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے عازم لاہور ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ یہ جون ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے۔ ایک روز عصر کے بعد میرے محترم استاد منشی شہاب الدین سے ملاقات ہوئی جو گورنمنٹ ہائی سکول ہانسی میں اردو کے استاد تھے۔ لاہور کے سفر کا ذکر آیا تو خوش ہوئے اور فرمایا کہ ضرور تعلیم

حاصل کرو مگر ایک بات یاد رکھنا کہ لاہور میں قیام کے دوران جب تک تم ایک مردِ حق کا نیاز حاصل نہ کرو گے اور متواتر ان کی خدمت میں حاضری نہ دو گے تو اعلیٰ تعلیم کے باوجود خالی الذہن رہو گے اور سکونِ قلب حاصل نہ ہوگا۔ شفیق استاد نے فرمایا کہ یہ مردِ حق محترم استاد حضرت علامہ اصغر علی روحی ؒ ہیں۔ آپ کا قیام بھاٹی دروازہ کے اندر کوچہ ڈیلاراں میں ہے اور ایک چھوٹی سی مسجد میں زیادہ تر نشست رکھتے ہیں۔

میں یکم جولائی ۱۹۳۲ء کو لاہور آیا اور اسلامیہ کالج میں سالِ اوّل میں داخل ہو گیا۔ دو تین روز کے بعد بھاٹی دروازہ گیا اور علامہ حضرت روحی ؒ کی حاضری کے لئے ان کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ آپ اپنے آبائی گاؤں کٹھالہ تشریف لے گئے ہیں۔ کالج موسم گرما کی تعطیلات کے لئے بند ہو گیا اور میں وطن واپس چلا گیا۔

ستمبر میں کالج کھلا اور پڑھائی شروع ہو گئی۔ چند روز کے بعد حضرت مولٰنا کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے بھاٹی دروازہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ آپ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خوف اور خوشی کا غلبہ طاری ہو گیا۔ خوف اس لئے کہ ایک مردِ حق کے سامنے جانا معمولی بات نہیں، خوشی اس لئے کہ نورانی چہرہ سُرخ و سفید رنگت، پیشانی پر مردِ مومن کا نشان نمایاں۔ کھدر کے کپڑوں میں ملبوس، ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ سلام عرض کیا اور قدموں میں بیٹھ گیا۔ نام دریافت فرمایا۔ عرض کیا: میرا نام نسیم حسین انصاری ہے۔ فرمایا: نہیں تمہارا نام نسیمی ہے۔ اور ہمیشہ مجھے اسی نام سے یاد فرماتے رہے۔ کالج سے معلوم ہوا کہ آپ اسلامیہ کالج میں ۳۵ یا ۴۰ سال تک درس دیتے رہے۔ آپ عربی و فارسی ادبیات کے استادِ اوّل رہے۔ اب ان کی خدمت میں میری حاضری معمول بن چکی تھی اور چند ہفتوں کے بعد اسی محلہ میں میاں محمد اسمٰعیل نمبردار کے یہاں قیام ہو گیا۔ ان کے متعلق مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے۔ میاں اسمٰعیل حقیقتاً ولی اللہ ہیں۔

حضرت کا علم تمام برِّ صغیر میں مسلّم تھا۔ عربی اور فارسی کے معلّمِ زماں تھے۔ ان کی خدمتِ اقدس میں بیٹھ کر جو مشاہدات میرے سامنے آئے وہ حیران کن تھے۔ شاعرِ اسلام علامہ محمد اقبال کو دو بار مولانا کی خدمت میں تشریف فرما دیکھا اور علمی گفتگو مجھ جیسے بے علم انسان کے لئے سکونِ قلب تو تھی مگر سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ ایک روز اتفاق سے علامہ سے فرمایا کہ اقبال تیرا چہرہ کیسا ہے۔ علامہ نے عرض کی کہ مولٰنا کیسا ہے۔ حضرت نے برجستہ جواب دیا جیسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں یہ سمجھا کہ علامہ کا چہرہ مشرع نہ تھا اور حضرت کا اشارہ بھی اسی طرف تھا۔ حضرت نہایت پکے عقیدہ کے مسلمان تھے۔ کتاب و سنت کے خلاف کوئی تنقید کبھی پسند نہ فرماتے۔ بلکہ ایسی بات آپ پر نہایت گراں گزرتی تھی۔

لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج اکثر آپ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ اور کلام پاک کے متعلق اکثر گفتگو ہوتی رہتی۔ ایک روز دوران گفتگو کلام مجید کی زبان کی خوبیوں کے سلسلے میں جج صاحب ایک انگریزی شاعر کی زبان کا مقابلہ کرنے لگے۔ حضرت مولانا ایک دم پریشان ہو گئے اور غصہ سے فرمایا کہ اللہ کے کلام کا مقابلہ کسی انسان کے کلام سے کرنا گناہ ہے۔ اس پر جج صاحب نے معذرت کی۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھ سے معذرت کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جاؤ اس کا کفارہ تین روزے رکھو اور تین بکرے صدقہ دو۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔

آپ کے پاس اکثر ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش بھی حاضری دیا کرتے تھے۔ طبی گفتگو ان کے ساتھ بہت ہی اچھی ہوتی تھی مولانا کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ جس مریض کو شفا بخشنا چاہتے ہیں دوا کو شفا بخش بنا دیتے ہیں۔ لیکن جب مریض کی شفا مطلوب نہ ہو کوئی دوائی اثر نہیں کرتی۔ ڈاکٹر کرنل الٰہی مرحوم نے پہلے اس خیال سے اختلاف کیا لیکن چند ہفتوں میں ان کے تجربے اور مولانا کے دلائل کے بعد اسی خیال کے حامی ہو گئے۔

میں نے علامہ کی خدمت میں جید علماء، اچھے سے اچھے اساتذہ اور شاعروں کو اکثر آتے دیکھا۔ علماء میں سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولانا رشید احمد صدیقی علیگڑھی، مولانا کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا انور شاہ صاحب، مولانا احمد علی، مولانا غلام مرشد، مولانا ظفر علی خان، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، میاں محمد دین اور متعدد علماء۔ اساتذہ میں ڈاکٹر شفیع مرحوم، پروفیسر سراج، مولانا کریم بخش، مولانا علم الدین سالک، مولانا نور الحق، قاضی فضل حق۔ شاعروں اور ادیبوں میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا سید حبیب، مولانا مظہر الدین دہلوی، چوہدری خوشی محمد ناظر (گورنر جموں)، حفیظ جالندھری، سر شیخ عبدالقادر خصوصی طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ چوہدری محمد حسین مرحوم علامہ اقبال رح کے معتمد ساتھی جمعہ کی نماز ان ہی کے پیچھے ادا فرمایا کرتے تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کی علمی، ثقافتی مجالس کا مرکز حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج ہوتا تھا۔ ایک اطلاع نامہ کالج کے نوٹس بورڈ پر نظر سے گزرا کہ فلاں تاریخ کو جامعہ ازہر مصر کا ایک وفد یہاں آرہا ہے اور حبیبیہ ہال میں جلسہ ہوگا۔ میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کی آمد کی خوشی میں عربی میں کچھ فرمائیں تاکہ وہاں وفد کے سامنے پڑھا جائے۔ مولانا نے اصرار کے بعد اپنے صاحبزادے ڈاکٹر ضیاء الحق صوفی کو اپنے پاس بلایا اور عربی میں چند اشعار لکھوا دیئے۔ ان سے چھوٹے صاحبزادے جمال الحق جو اس وقت اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ ان کو یہ شعر اچھی طرح یاد کرا دیئے گئے۔ جلسہ ہوا، عزیز جمال الحق نے یہ شعر پڑھے۔ وفد کے قائد نے دوران تقریر حیرانی کا اظہار کیا کہ اس صاحبزادے نے عربی کا جو کلام پڑھا ہے۔ وہ کسی ہندوستان کے باشندہ کا کہا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ شخصیت کوئی عرب ہے

جس کو قدیم اور جدید عربی پر پوری طرح عبور ہے۔ شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ جو انجمن حمایت اسلام کی نمائندگی فرما رہے تھے۔ آپ نے وضاحت کی کہ یہ مولانا اصغر علی روحی کا کلام ہے۔ جو اسی کالج میں استاد رہے ہیں اور ملک سے باہر نہیں گئے۔ وفد نے حضرت مولانا سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ عصر کے بعد وہ وفد اسی چھوٹی سی مسجد میں آیا۔ مولانا سے گفتگو عربی میں شروع ہوئی ہم جیسے بے علم آدمی کیا سمجھ سکتے تھے کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ مگر جس وقت مولانا جواب دیتے تھے تو وفد کے ارکان اللہ اللہ کا نعرہ بلند کرتے تھے اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے اور پیشانی چومتے تھے اور گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے دباتے تھے۔ یعنی نہایت ہی مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ رخصت ہونے کے بعد وفد کے ارکان کا خیال تھا کہ مولانا عربی زبان کے معلم کامل تھے۔

آپ کا نہایت ہی احترام کیا جاتا تھا۔ لاہور میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ہوا۔ اس واقعہ پر مجلس احرار اسلام اور مولانا ظفر علی خان کا سخت اختلاف ہو گیا اور جگہ جگہ ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ مولانا کے پاس مختلف ذرائع سے اس اختلاف کی خبریں پہنچیں۔ مجھے طلب کیا اور حکم دیا کہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد اسحاق مانسہری، مولانا سید حبیب۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر کو اطلاع دوں کہ یہ سب صاحبان جمعہ کے بعد میرے پاس تشریف لائیں۔ ان کے پاس گیا اور مولانا ظفر علی خان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کو مولانا نے یاد فرمایا ہے۔ حیرانی سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ میں نے گزارش کی کہ آپ سے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا گھبرا گئے اور کہا کہ میں ضرور حاضرِ خدمت ہوں گا۔ یہی پیغام سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو دیا اور کہا کہ مولانا آپ صاحبان سے ناراض ہیں یہ سن کر حضرت آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ میں ابھی چلنے کو تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ جمعہ کے بعد ہی تشریف لائیں جب سب آئیں۔ نماز جمعہ کے بعد یہ سب حضرات آئے اور ان کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے اپنے خاص انداز میں انہیں سخت تنبیہ کی اور اختلاف دور کرنے کی سخت الفاظ میں ہدایت کی اور فرمایا کہ میں نے مولانا عبداللہ کیمبل پوری کو لکھ دیا ہے کہ وہ لاہور تشریف لا کر آپ کے اختلافات دور کرا دیں گے۔ مولانا کے احترام کا یہ منظر تھا کہ یہ تمام قائدین بالکل خاموش رہے اور مولانا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اللہ کے نیک بندوں میں کس قدر روحانی تعلق ہوتا ہے۔ مولانا جس وقت کسی نیک بندہ کو یاد فرماتے دو تین روز کے بعد وہ ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مولانا نے خود ایک واقعہ سنایا کہ سردی کی وجہ سے ان کو نمونیہ کی شکایت ہو گئی۔ عشاء کی نماز کے بعد ان کے پاس میاں محمد اسمٰعیل نمبردار مرحوم و مغفور اور چند دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ میں نے خواہش کا اظہار کیا کہ کاش حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع دے دیں کہ وہ میرے حق میں دعائے صحت فرمائیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد مجھے افاقہ شروع ہو گیا اور نماز فجر میں نے مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد ایک صاحب نے

مجھے سلام کیا اور کہا کہ مولانا میں بشیر محمد ہوں اور شرقپور سے آیا ہوں۔ آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ یہ تقریباً ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔ مولانا جیسا جید عالم مبہم خیال کے تو حامل نہیں ہو سکتے تھے۔ نیک بندوں کی روحانی کشش کا اثر تھا کہ ایک مردِ مومن نے یاد کیا اور دوسرا اللہ کا ولی حاضر ہو گیا۔ مولانا کی دینی معلومات کا یہ حال تھا کہ علماء دیوبند اور علماء بریلی میں لاہور میں چند مسائل پر اختلاف ہو گیا۔ مناظرہ کی تیاری ہونے لگی۔ مولانا نے دونوں فریقوں کو اپنے پاس بلایا اور ان الجھے ہوئے مسائل کو مکمل دینی معلومات کے ذریعے اس طرح سلجھایا کہ وہ مطمئن ہو کر چلے گئے۔

مجھ جیسے ناچیز بندہ کو مولانا کی زندگی میں یہ شرف حاصل رہا کہ میں ان کے پیغام دوسروں کے پاس پہنچایا کرتا تھا۔ سر شیخ عبد القادر مرحوم کو حضرت مولانا سے از حد عقیدت تھی۔ جس وقت ان کی خدمت میں مولانا کا پیغام لے کر تھمیل بعد میں جاتا تو وہ نہایت خوش ہوتے اور مولانا کی بار بار خیریت دریافت فرماتے۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ مولانا کی علمی ادبی اور دینی خدمات کے واقعات اور حالات سناتے۔ آپ نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ مولانا اس قدر حق گو ہیں اور سچی بات کہہ دیتے ہیں۔ چاہے ان کے سامنے کتنی ہی بڑی ہستی کیوں نہ ہو۔ تحریکِ خلافت کے دور میں اس وقت کے گورنر نے علماء اور مشائخ کو جمع کیا اور صاف گوئی سے حضرت مولانا اور حضرت سید مہر علی شاہ گولڑہ شریف نے گورنر کو جواب دیا۔ یہ انہیں کا حق تھا۔ چوہدری سر شہاب الدین آپ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد تھے۔ چوہدری محمد حسین جو ڈی آئی جی ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے کیا۔ اس زمانے میں مسلمان کو نوکری ملنا محال تھا۔ چوہدری صاحب کی عمر ۲۵ سال ہونے میں تین یوم باقی تھے۔ گھبرائے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرضِ حال بیان کیا۔ مولانا نے نہایت شفقت کے ساتھ دعا کی اور مجھے حکم دیا کہ چوہدری صاحب کو چوہدری سر شہاب الدین کے پاس پہنچا آؤں۔ میں چوہدری صاحب کو ان کے پاس لے گیا۔ چوہدری صاحب نے ایک چٹ دی اور کہا کہ پولیس لائن میں جا کر فلاں صاحب سے ملو وہ تمہیں کانسٹیبل بھرتی کر لے گا۔ چوہدری محمد حسین نے اس بات کو پسند نہ کیا۔ چوہدری سر شہاب الدین نے جواب دیا کہ برخوردار جس ہستی نے تمہیں بھیجا ہے انہیں کی دعاؤں سے اور ان کے ستو چرا کر کھانے سے اللہ نے یہ مرتبہ بخشا ہے۔ آپ کے ساتھ بھی ان کی دعا شاملِ حال ہے اور تم بہت جلد ترقی کر جاؤ گے اور یہ بات پوری ہو گئی اور چوہدری محمد حسین صاحب ڈی۔ آئی۔ جی کے عہدے تک جا پہنچے۔

میاں سر فضل حسین (جو گورنمنٹ آف انڈیا سے ریٹائر ہو چکے تھے) کے پاس مولانا نے مجھے بھیجا کہ ان سے

جا کر ملوں اور اُن کا پیغام دوں۔ چنانچہ میں میاں صاحب سے ملا اور مولٰنا کا پیغام دیا۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ اپنے لئے دعا کرانے خود حاضرِ خدمت ہوں گا۔ میاں صاحب تشریف لائے تو نہایت شفقت سے پیار کیا اور تھوڑی دیر گفتگو کرتے رہے اور پھر میاں صاحب چلے گئے

مولٰنا کے شاگردوں کا برِصغیر میں شمار نہیں تھا۔ جس شاگرد کو بھی کوئی کام کہلا بھیجا اس کو نہایت خوشی سے انجام دیتے تھے۔ آپ کا جس محلہ میں قیام تھا۔ وہاں گوجر اور سیال برادریاں آباد تھیں۔ کثرت ان پڑھ لوگوں کی تھی۔ اکثر دونوں برادریاں لڑتی رہتی تھیں۔ مولٰنا دونوں کو بلاتے اور ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور وہ خاموشی سے صلح کر لیتے اس محلے میں آپ کے ہم نشین بزرگ، میاں محمد اسمٰعیل مرحوم، میاں قمر الدین مرحوم، میاں غلام نبی، بابو فیروز الدین اور شیخ علی احمد سیال، بودا گوجر وغیرہ تھے۔ جو نہایت متقی اور پرہیزگار تھے

میاں عبدالغنی

اس محلے میں میاں حاکم دین ایک بزرگ سکونت پذیر تھے جو کافی متمول شخص تھے اور وہ پولیس کے کسی
اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ اپنے بزرگوں کی روحوں کو ایصالِ ثواب کی خاطر قرآن مجید
پڑھا کر ختم دلانا چاہا۔ امام مسجد صاحب کو گھر پر مدعو کیا گیا اور بہت سے قرآن مجید پڑھنے والوں
کو جمع کیا گیا۔ امام مسجد صاحب کو کسی ضروری کام کی وجہ سے دیر ہو گئی اور باقی لوگ انتظار میں
بیٹھے رہے۔ جب امام مسجد صاحب میاں حاکم دین کے ہاں پہنچے تو میاں حاکم دین نے انہیں نہ صرف
سخت سست باتیں کہیں بلکہ پیٹھ پر ایک تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ چند گوجر لوگ بھی محفل میں
شریک تھے۔ انہوں نے احتجاج کیا کہ آپ نے ہمارے امام مسجد کی بے عزتی کر دی ہے۔ ہم آپ سے
اس کا بدلہ لیں گے۔ چنانچہ گوجر لوگ محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔ اب میاں حاکم دین کو فکر ہوئی کہ میں
جب باہر نکلوں گا تو گوجر مجھے پکڑ لیں گے اور شاید میری بے عزتی کریں۔ وہ دیر تک سوچ میں پڑے رہے
کہ کیا کیا جائے۔ آخر ان کے دل میں خیال آیا کہ یہ لوگ مولانا روحی کی ہر بات کو مانتے ہیں اس لئے ان سے
مدد حاصل کرنی چاہیئے تاکہ وہ مجھے گوجروں سے معافی لے دیں۔ مولانا روحی روزانہ صبح کے وقت کالج تشریف لے
جاتے ہوئے میاں حاکم دین کے گھر کے سامنے سے گزرا کرتے تھے کیونکہ کالج کو جانے کا راستہ یہی تھا۔ آخر ایک دفعہ
وہ مولانا روحی کے وہاں سے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب مولانا ادھر سے گزرے تو میاں حاکم دین نے
انہیں سلام کیا اور باتیں کرتے کرتے ان کے ساتھ چلنے لگے۔ انہوں نے مولانا کے سامنے سارا قصہ بیان
کرنے کے بعد درخواست کی کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ مجھے پکڑ کر مار دیں گے اور میری بے عزتی کریں گے اس
لئے آپ مجھے ان سے معافی لے دیں۔ مولانا بات سن کر مسکرا دیئے اور کہا کہ فلاں نماز کے وقت آپ
مسجد میں آجائیں تو میں ان سے آپ کی سفارش کروں گا۔ میاں حاکم دین نے وعدہ کر لیا لیکن مسجد
کا راستہ عین گوجروں کی آبادی سے گزرتا تھا۔ میاں حاکم دین خائف تھے کہ ادھر سے گزرتے ہوئے بھی
گوجر لوگ راہ میں مجھے پکڑ لیں گے۔ آخر انہوں نے دوسری جانب سے چکر کاٹ کر لمبے رستہ سے مسجد

میں پہنچنے کی تدبیر کرلی اور وقت معین پر مسجد میں آگئے۔ مولانا نے گوجروں سے کہا کہ میاں حاکم دین سے غلطی ہوگئی ہے اور انہیں اپنی حرکت پر افسوس اور ندامت ہے اس لئے وہ معافی مانگنے آئے ہیں تم سب کو چاہئیے کہ ان کو معاف کردو۔ پھر میاں حاکم دین نے کھڑے ہو کر ان سے معذرت کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا جس پر گوجروں نے انہیں معاف کردیا۔

الغرض اس محلہ کے لوگ مولانا کی ہر بات کو جو ہمیشہ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہوتی برضا و رغبت مانتے تھے اور کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔

فصل چہارم

(اہلِ خانہ)

فضل حق مرحوم

افسوس کہ ان کے خیالات و تاثرات حاصل نہ ہو سکے کیونکہ وہ یہ مقالہ لکھنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ورنہ اُن سے بہت مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں کیونکہ وہ اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میں نے مرحوم کی بیگم صاحبہ سے درخواست کی تو انہوں نے نہایت مہربانی اور شفقت سے جو کچھ لکھ کر دیا وہ درج کیا جاتا ہے:

بیگم فضل حق مرحوم

محترم و مکرم جناب مولانا اصغر علی صاحب روحی نور اللہ مرقدہٗ کا نام نامی و اسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے مگر پھر بھی فی زمانہ اُن کے جاننے والے بہت کم رہ گئے ہیں اور نئی نسلوں کو تو اب عربی یا فارسی سے کوئی دلچسپی نہیں اس لئے یہ ضرورت پیش آئی۔ وہ اس زمانہ کی ایک عظیم ہستی تھے۔ لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگ تو اُن کی تربیت دینے سے بہرہ ور ضرور ہوئے ہوں گے۔ اُن کے شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے کیونکہ عربی اور فارسی کے وہ ایک بے پایاں سمندر تھے اور اُن کے پاس یہ ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ راہ گزرتا انسان بھی اگر اُن کے پاس کچھ وقت بیٹھ جاتا تو وہ بھی کچھ لے کر ہی اٹھتا تھا۔

محترم مولانا صاحب نے بحیثیت پروفیسر عربی اسلامیہ کالج میں تقریباً تیس سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُن کے شاگرد گھر پر آ کر بھی اُن سے استفادہ کرتے تھے اور مولانا صاحب بڑی خوشی اور شفقت سے انہیں وقت دیتے تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تو وہ تھے ہی، مگر قدرت نے اُن کی طبع مبارک میں ظرافت بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ آپ کو دونوں زبانوں پر بڑا عبور تھا اور آپ بڑے پایہ کے مایہ ناز شاعر بھی تھے

اپنی کم علمی کی وجہ سے میں اُن پر کوئی تبصرہ تو نہیں کر سکتی مگر اتنا مجھے معلوم ہے کہ اس دور
میں تو کوئی اُن کے برابر کا شاعر نہیں۔ اُن کی شاعری محض عام شاعری ہی نہ تھی اس میں حمد
و ثنا کا پہلو بہت اجاگر تھا۔ آپ عاشق رسول تھے۔ آپ کتاب و سنت پر چلنے والے انسان
تھے۔ زندگی نہایت سادہ گزاری۔ خلاف شرع حتی الوسع کوئی کام نہیں کیا۔ عالم با عمل تھے
میرے اپنے چچا قاضی ظہیر الدین فاروقی اُن کے قابل شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ اُن ہی کی
وساطت سے مجھے مولانا صاحب کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا صاحب اپنے
شاگردوں کے ساتھ اس قدر گھل مل جاتے تھے اور اتنے پیار و شفقت سے انہیں پڑھاتے تھے کہ
شاگرد بھی اُن سے اتنی ہی محبت رکھتے تھے۔ اور بلا کسی جھجک کے اُن سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے
تھے۔ اور بڑے بڑے جج اور عہدہ دار زمین پر ایک دری پر اُن کے پاس بیٹھنے میں عار محسوس نہیں کرتے
تھے۔ دنیا کی شہرت اور دکھاوے سے انہیں نہایت نفرت تھی۔ یہاں تک کہ آپ کو شمس العلماء کا
خطاب بھی گورنمنٹ کی طرف سے پیش کیا گیا تو آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ مجھے دنیا کے خطابوں
کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ حق بات کسی بڑے آدمی کے سامنے بھی بلا جھجک کہہ دیتے تھے۔

مولانا صاحب کی تصانیف بھی ہیں جن میں ماثر الاسلام اور دبیر عجم کے نام میں جانتی
ہوں۔ مولانا صاحب قبلہ و کعبہ کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ اُن کے بیٹے پوتے سب ایک سے ایک
بڑھ کر لائق ہیں۔ مگر دیندار ہیں۔ آپ کے ماشاء اللہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ پانچوں
بیٹے ایم۔ اے سب کے سب لائق اور دو نے پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے۔

سب سے بڑے بیٹے مولوی فضل حق مرحوم (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) ایم۔ اے ایل ایل
عربک تھے اور ایم۔ اے فارسی بھی تھے۔ گولڈ میڈلسٹ تھے۔ چار گولڈ اور ایک سلور انہوں
نے وقتاً فوقتاً پانچ تمغے حاصل کئے اور ہمیشہ وظائف حاصل کرتے رہے۔ وہ انڈین آڈٹ
اینڈ اکاؤنٹ سروس میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ڈپٹی آڈیٹر جنرل سینئر کے
عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ کتاب و سنت پر عمل کرنے والے تھے۔

دوسرے بیٹے حافظ عبد الحق قرآن مجید کے حافظ اور ایم۔ اے میتھمیٹکس ہیں۔ وہ بھی
ہمیشہ وظائف حاصل کرتے رہے۔ بہاولپور میں صادق کالج میں لیکچرر کے عہدے سے ترقی کر کے

پرنسپل تھے۔ اسکے بعد ملتان بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ تیرے

بیٹے صوفی ضیاء بھی عربک ایم۔ اے ہیں۔ پھر پی ایچ ڈی بھی کیا۔ وہ ماشاء اللہ
اپنے والد ماجد کی طرح فارسی عربی اردو کے شاعر بھی ہیں۔ شاید کبھی دیوان بھی چھپوائیں
وہ بھی پہلے جھنگ کالج میں لیکرار تعینات تھے اور اس کے بعد پرنسپل کے عہدہ پر منٹگمری کالج
میں رہے۔ پھر لاہور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر اور ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ رہے اور ریٹائر ہونے
کے بعد بھی کالج میں دوبارہ بلائے گئے۔ وہ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ بہت پیار کرتے ہیں
اور اُن کو بہت ہی لگن سے پڑھاتے ہیں۔
چوتھے چھوٹے بیٹے رانا بہاؤالحق گورنمنٹ کالج لاہور میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔
پی ایچ ڈی بھی ہیں اُن کے پاس اور بھی بہت سی ڈگریاں ہیں وہ بھی شاعری میں قدم رکھتے
ہیں۔ اور
پانچویں بیٹے منٹگمری گورنمنٹ کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ اور بیٹی جو کہ اب اس
دنیا میں نہیں بہت ذھین تھی۔ سکول کی انہوں نے کبھی شکل بھی نہ دیکھی تھی مگر گھر پر انہوں نے
اردو فارسی عربی انگلش کافی پڑھی ہوئی تھی۔ اور پنجابی میں تو کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتی تھی۔
خدا انہیں بخشے آمین۔
مولانا مرحوم کے بچوں کی اولاد نے عربی فارسی تو نہیں پڑھی لیکن دنیاوی لحاظ سے وہ بھی
لائق ہے۔

بیگم فضل حق

حافظ محمد عبد الحق

ان سے کئی بار اپنے تاثرات اور خیالات تحریری صورت میں مہیّا کرنے کی درخواست کی گئی لیکن وہ ہر دفعہ یہی فرماتے کہ میرے پاس کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ عزیزوں نے لکھ دیا ہے میں اُس کی پُر زور تائید کرتا ہوں اور مجھے اُس سے کلّی طور پر اتفاق ہے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی

انہوں نے تحریری طور پر کوئی مواد فراہم نہیں کیا کیونکہ وہ میرے مقالے کے نگران بھی ہیں
البتہ انہوں نے کچھ باتیں اور کچھ واقعات زبانی بتائے جن کا ذکر اُن کے نام سے اس مقالہ میں کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا

انہوں نے بھی اپنے ہاتھ سے مجھے کچھ لکھ کر نہ دیا۔ البتہ زبانی کچھ واقعات سنائے جو اُن کے حوالے سے اس مقالہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

محمد مظہر الحق رانا

ان سے بڑی محنت اور کوشش کے ساتھ تحریری طور پر چند واقعات حاصل کئے گئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

سوال ۱ آپ نے والد صاحب سے کوئی علم پڑھا کیونکہ آپ کا مضمون تو ریاضی تھا۔ لیکن عربی اور فارسی بھی آپ نے اُن سے کچھ پڑھی یا نہیں ؟

جواب ۱ میرا مضمون بی۔اے اور ایم۔اے میں ریاضی تھا مگر ایف۔اے تک میں نے عربی پڑھی۔ چھوٹی جماعتوں کا تو مجھے یاد نہیں۔ البتہ میٹرک اور ایف۔اے میں عربی گرامر اور کورس کی کتاب دروس الادب اور قطوف الازھار نامی کتابیں میں نے اُن سے پڑھیں۔ باقی عربی بطور علم سیکھنے کے لئے میں نے نہیں پڑھی۔ کبھی کبھی اردو کے کسی شاعر کی نظم یا غزل بھی برائے تشریح پڑھی

سوال ۲ اُن کا اپنے بچوں کے ساتھ سلوک اور اہل خانہ کی تربیت اور دینداری سکھانے کا کیا طریقہ تھا۔

جواب ۲ ویسے تو تمام اولاد کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرتے تھے اور اُن کی ہر چھوٹی بڑی تکالیف کا خیال رکھتے اور تمام ضروریات زندگی بلکہ کھانے پینے تک کا خیال رکھتے مگر چھوٹے بچوں کو تو بہت پیار کرتے چھوٹے سے مراد ۱۰ - ۱۲ سال تک۔ گود میں بٹھا کر پیار کرتے اور جیب سے کوئی میٹھی چیز جو ہر وقت اُن کے پاس ہوتی تھی وہ نکال کر ہاتھ میں نہیں دیتے تھے بلکہ منہ میں ڈال دیتے۔ غرضیکہ بہت پیار کرتے تھے۔ اخلاق کے لئے وہ بچوں کو ہر وقت نصیحت کرتے اور فرمایا کرتے کہ اگر کسی کا اخلاق اچھا نہیں اور چاہے وہ کتنی اور خوبیوں کا مالک ہو تو وہ انسان نہیں۔ نماز کے لئے پیار سے بھی سمجھاتے اور اگر کوئی بچہ پرواہ نہ کرتا تو صبح سویرے مسجد میں جانے سے پہلے جگا دیتے اور

ناراض تھے اور کہتے کہ سکھوں اور کافروں اور تم میں کیا فرق ہے؟ اگر کوئی عزیز رشتہ دار بھی آپ کے پاس آتا تو اُس کو بھی مذہبی احکام بجا لانے کے لئے سختی سے پیش آتے۔

سوال ۳: اُن کے روزمرہ کے معمولات کیا تھے؟ اہل محلہ کے دلوں میں اُن کا کیا مقام تھا اُن کے پاس آنے والوں اور شاگردوں وغیرہ سے وہ کیسے پیش آتے؟

جواب ۳: میں جب چھوٹا ہی تھا تقریباً ۷ (چھ) سال کا ہوں گا تو اُن کی آنکھوں میں موتیا بند ہو گیا تھا اور اُن کی نظر خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے اُن کی نظر صحیح سے پہلے کی زندگی کے متعلق مجھے بہت کم معلوم ہے۔ میری ہوش میں وہ صرف ایک دو سال نظر بند کے ساتھ مجھے یاد ہے کہ کالج پڑھانے جاتے تھے اور مجھے تختی لکھنے کے لئے کہہ جاتے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بیٹھک میں رہتے۔ اُن کے شاگرد آتے۔ مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے اُن میں ماسٹر عبدالرحیم صاحب، عبدالرحمن بھاٹی والے۔ محمد دین کشمیری اور مولوی محمد شفیع مجھے یاد پڑتے ہیں۔

تمام عمر انہوں نے جنڈسی والی مسجد میں پانچ وقت نماز بحیثیت امام ادا کرتے تھے اور جمعہ بھی پڑھاتے تھے۔ جمعہ کے دن وعظ فرماتے اور چونکہ محلہ میں زیادہ تر گوجر اور بنیا یا قوم تھے اور وہ بہت جاہل اور غیر مہذب تھے۔ وہ اُن کو جمعہ کے دن وعظ میں بہت نصیحت فرماتے کہ کم نہ تولو، دودھ میں پانی نہ ملاؤ وغیرہ اور اسی نصیحت میں انہیں سرزنش فرماتے اور بے ایمان وغیرہ بھی کہتے۔ اکثر محلہ کے لوگ آکر اُن کے پاس مسجد میں بیٹھتے اور کوئی نہ کوئی اپنا ذاتی اور دینی مسئلہ حل کرواتے۔

سوال ۴: گاؤں میں جہاں اکثر لوگ جاہل تھے ہیں انہیں معاشرہ میں کیا مقام حاصل تھا۔

جواب ۴: گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر وہ گاؤں جاتے اور فصل کے موقع پر زمینداروں سے لین دین کرتے اور جب تک گاؤں میں رہتے اکثر بیٹھک میں اُن کے پاس لوگ آتے اور اپنے مسائل حل کرواتے مثلاً کسی کا کوئی ذاتی مقدمہ ہوتا تو وہ کسی ڈی سی یا کوئی پولیس افسر یا گرداور، پٹواری جو اکثر اُن کے شاگرد تھے یا اُن کے واقف ہوتے اُن کی طرف خط وغیرہ لکھ کر اُن کی مدد کرتے جس کو بھی گاؤں میں بلاتے فوراً بھاگا ہوا آتا۔ غرضیکہ گاؤں کے لوگ اُن کی

بہت عزت کرتے۔

سوال ع۔ ۵ اُن کے کوئی علمی یا مجلسی واقعات آپ کو معلوم ہوں تو تفصیل سے بیان فرمائیے

جواب ع۔ ۵ چونکہ میں چھوٹا ہی تھا اور اُن کی نظر خراب ہو چکی تھی اس لئے ان کی ادبی اور علمی
مجلسوں کے متعلق مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں۔

سوال ع۔ ۶ اُن کی کالج کی زندگی کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟

جواب ع۔ ۶ اس کا جواب بھی سوال ع۔ ۵ کے جواب کے مطابق ہے۔

سوال ع۔ ۷ چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ پیش آنے اور حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے
کے بارے میں اُن کا کیا رویہ تھا؟ اُن کی دینداری، تقویٰ اور اخلاق کے بارے میں آپ کو کیا معلوم ہے؟

جواب ع۔ ۷ چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ وہ بہت شفقت اور مہربانی سے پیش آتے۔ اگر
گھر میں کھانا کھاتے ہوئے کوئی رشتہ دار عزیز آجاتا تو کھانا کھانے کے متعلق اس کو اصرار کرتے۔ اگر وہ
کھا لیتا تو خیر اور اگر وہ کہتا کہ میں کھا کر آیا ہوں اور نہ کھاتا تو وہ خود بھی کھانا چھوڑ دیتے تھے
کوئی سائل اُن کے پاس مسجد میں یا گھر آتا۔ چاہے وہ سچا ہو یا جھوٹا کبھی خالی نہ جانے دیتے
چاہے چونی ہی کیوں نہ دیں۔ اکثر حاجت مند اور سائل آتے رہتے اور زکوٰۃ چونکہ باقاعدگی کے ساتھ
ادا کرتے اس لئے اُن کی ضروریات پورا کرتے۔ ہر سال جب رجب کا مہینہ آتا تو زکوٰۃ کا حساب
کرتے اور سب سے پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کو جو اکثر گوجرانوالہ کے ضلع میں رہتے تھے جو
مناسب سمجھتے منی آرڈر کروا دیتے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تو وہ رشتہ دار خود
لاہور پہنچ جاتے اور خالی نہ جاتے۔ نماز روزہ تو فرض چیز ہے اس کے کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ
وہ بروقت باجماعت اور باقاعدگی سے روزے رکھتے۔ بلکہ رات کے پچھلے حصہ میں تقریباً ۲ بجے کے
قریب اٹھتے اور سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور تہجد ادا فرماتے اور مصلیٰ پر بیٹھ کر
حمد و ثنا اور نعتیہ اشعار پڑھتے رہتے حتیٰ کہ صبح کی اذان ہوتی تو مسجد میں چلے جاتے۔ کسی ہندو
یا غیر مذہب والوں کے گھر سے کھانے والی کوئی چیز آتی تو خود نہ کھاتے اور بچوں سے کہتے کہ کھا لو
ایک دفعہ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے پوچھا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو میرے اصرار پر صرف اتنا
بتایا کہ تقویٰ اور پرہیزگاری تو یہی ہے کہ کسی غیر مسلم کے ہاتھ یا گھر کی کوئی چیز نہ کھائی جائے

ورنہ اس امر غیر مذہب والوں کے گھر سے کھانے کی مخالفت نہیں کرتا۔ بچے اتنے پرہیزگار نہیں ہوتے وہ کھالیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب گھر والے گاؤں میں اکٹھے تھے۔ میں اور میری والدہ مرحومہ باہر صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ اور والد صاحب قبلہ برآمدے میں سوئے ہوئے تھے۔ جن کی نظر اس وقت خراب ہو چکی تھی۔ گاؤں میں چونکہ اُس وقت بجلی نہ تھی والدہ نے لالٹین جلا کر اور مدھم کر کے طاق میں جو والد صاحب کی چارپائی کے پائنتی کی طرف تھا اُس میں رکھی ہوئی تھی۔ آدھی رات کو (وقت کا مجھے علم نہیں) میری آنکھ کھل گئی اور میری نظر والد صاحب کی چارپائی کی طرف چلی گئی تو اُس مدھم لالٹین کی روشنی میں، میں کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور جیسے گرمی لگ رہی ہو تو پیچھے سے ململ کا کرتہ (جو اکثر گرمیوں میں پہنتے تھے) اٹھایا ہوا ہے اور کوئی اُن کو ہاتھ کا پنکھی کر رہا ہے۔ صرف ہاتھ اور پنکھی مجھے نظر آتا ہے باقی کس کا ہاتھ ہے وہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ پہلے میں نے سوچا شاید والدہ ہیں مگر وہ تو میرے ساتھ والی چارپائی پر سوئی تھیں۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ شاید اوپر جو گھر کے افراد سوئے ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کون ہے۔ میں دبے پاؤں جوتا پہنے بغیر اُن کی چارپائی کی طرف گیا اور دیکھا کہ نہ وہاں کوئی ہاتھ ہے اور نہ پنکھا۔ صرف والد صاحب اُسی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی کھٹکا وغیرہ بھی نہ کیا جب اُن کے پاس پہنچا تو وہ یکدم بول اُٹھے "کون ہے؟"۔ مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں ہوں۔ جس طرح کوئی بات ناگوار ہو سے کی جاتی ہے اس طرح مجھے پوچھنے لگے کہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے جھوٹ بول دیا کہ مجھے پیاس لگی تھی۔ کہنے لگے جاؤ جاکر سو جاؤ یعنی میرا آنا انہیں اچھا نہیں لگا۔ صبح سویرے جب وہ نماز اور اشراق (جو وہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے تھے اور ۹ - ۱۰ بجے نفل پڑھ کر فارغ ہوتے تھے) کے بعد اور ناشتہ کرنے کے بعد میں نے بھولے پن سے اُن سے پوچھا رات کو آپ پنکھا کون کر رہا تھا۔ جواب نہ دیا۔ میں نے پھر کچھ اور باتیں کیں پھر یہی سوال کیا مگر پھر جواب نہ ملا۔ پھر تیسری دفعہ میں نے بہت ضد کی کہ آپ بتاتے کیوں نہیں۔ پھر کہنے لگے ضروری نہیں تمام باتوں کا جواب دیا جائے۔ اس کے بعد پھر میں نے اُن سے سوال نہ کیا اور مجھے آج تک معلوم نہیں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

سوال ع ۸ اپنے ہمعصر علماء میں انہیں کیا مقام حاصل تھا؟

جواب ع ۸ کیونکہ ریٹائر ہونے سے پہلے ہی اُن کی نظر خراب ہو چکی تھی اس لئے اُن کا باہر آنا جانا اور دیگر علماء سے ملنے جلنے کے متعلق مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں۔ ہاں صرف اتنا یاد ہے کہ اکثر عالم اُن کے پاس آتے اور کسی مسئلہ میں مشورہ اور فتویٰ ضرور لیتے تھے اُن کے نام مجھے یاد نہیں بزرگوں کی عزت کرتے۔ کبھی کبھی داتا دربار بھی جایا کرتے ایک دفعہ مجھے بھی ساتھ لے گئے اور وہاں روضہ کے پاس بیٹھ کر کافی دیر پڑھتے رہے۔

سوال ع ۹ اپنے قرابت داروں، بھائیوں، اولاد اور اپنے اہل خانہ کے حقوق کو پورا کرنے کا وہ کس قدر خیال رکھتے تھے؟

جواب ع ۹ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ زکوٰۃ یا ویسے بھی اللہ کے نام پر یا مروت کے طور پر اپنے عزیز اور قریبی رشتہ داروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اپنی اولاد اور بیوی کے حقوق پورے کرنے تو فرض ہیں۔ ایک عالم اور متقی آدمی کے متعلق تو میرا خیال ہے یہ سوال مہمل ہے۔ بلکہ وہ ضروریات زندگی کے علاوہ بھی اپنے گھر والوں کے لئے کھانے پینے اور استعمال کی چیزیں مہیا کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ البتہ ایسا کوئی کام کسی قیمت پر نہ کرتے جو شرعاً، قانوناً، رواجاً اور یا اخلاقاً منع ہو مثلاً سینما وغیرہ دیکھنا یا کسی ایسی مجلس میں جانا جہاں گانا بجانا اور یا غیر شرعی باتوں کا احتمال ہو۔ وہ اپنے چار بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ اُن کے دو[2] بھائی تو میں نے دیکھے تھے اور سب سے بڑے بھائی محمد علی میری پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ ایک اُن کے بھائی اکبر علی جو گاؤں میں رہتے تھے اور وہ لاولد تھے اور دوسرے بھائی محبوب علی جو محلہ کندی گراں ڈبی بازار میں رہتے تھے۔ عمر رسیدہ بہت بڑے تھے۔ اُن کے ہاں آتے جاتے اور اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُن کی ہر قسم کی مالی امداد (اگر ضرورت ہوتی تو) کرتے تھے۔ چونکہ آپ ایک عالم تھے اور بھائی حالانکہ سب بڑے تھے۔ مگر پھر بھی وہ ان کی عزت کرتے تھے اور (مولوی جی) سے پکارتے تھے

سوال ع ۱۰ آپ چونکہ اُن کے سب سے چھوٹے فرزند تھے کیا آپ کو باقی بچوں کی نسبت وہ زیادہ عزیز سمجھتے تھے یا سب کے ساتھ سلوک یکساں تھا۔

جواب ۱۰ بحیثیت اولاد وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ ہر بچے
کی ضروریات اور تکالیف رفع کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ مگر میں چونکہ چھوٹا تھا۔ مجھے گود میں لے کر
زیادہ پیار کرتے اور میرے چہرے کے بوسے لیتے اور مجھے ایک دو دفعہ کہا "میرا معشوق بیٹا"
پھر جب میں بڑا ہو گیا اور اُن کی نظر خراب ہو گئی تو میری آمد و رفت کے متعلق اور میری
پڑھائی اور تعلیمی حالات کے متعلق اکثر مجھ سے پوچھ گچھ کرتے کہ کہاں گئے تھے اور کیوں گئے تھے
کوئی امتحان ہوتا تو رزلٹ کے متعلق پوچھتے اور اگر میری کوتاہیوں پر مجھے خوب سرزنش
کرتے۔

اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ اور کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں اور نہ مجھے یاد
ہے جو لکھوں۔

قاضی نعیم الرحمٰن

یہ اللہ کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ ان کو اہل خانہ میں اس لئے شمار کیا گیا ہے کہ وہ بیگم
مولوی فضل حق مرحوم کے چچا ہیں اور مولوی فضل حق کے ہم عمر بھی ہیں۔ وہ اکثر اُن سے ملنے کے لئے
مولانا کی خدمت میں تشریف لایا کرتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھ کر دیا وہ حسب ذیل ہے:

مولانا اصغر علی روحی مرحوم

قبلہ مولانا اصغر علی روحی مرحوم سے میرے بزرگوں کی کافی راہ و رسم تھی۔ میرے والد بزرگوار قاضی محمد
ضیاء الدین مرحوم کا اُنکے ساتھ بہت زیادہ میل جول تھا۔ والد مرحوم اُن کا ذکر اکثر فرماتے اور اُن کی
تبحر علمی کے بے پناہ مداح تھے۔ اُن کی درویشانہ زندگی سے بے حد متاثر تھے۔ اکثر اوقات اُن کی
خدمت میں حاضر ہوتے اور دینی مسائل پر اُن سے استفادہ فرماتے۔ مجھے اُن کی قدم بوسی کا شرف
جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۲۸ میں اُس وقت ہوا جب میرے برادر خورد قاضی ظہیر الدین اسلامیہ کالج
میں ایف۔ اے کے طالب علم تھے اور مولانا مرحوم سے عربی پڑھا کرتے تھے وہ بھی اکثر اُن کے آستانہ عالیہ
پر حاضر ہوتے۔ میں بھی ایک روز اُن کے ہمراہ گیا۔ آپ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آئے اور پہلی ہی
ملاقات میں، میں اُن سے بہت قریب ہو گیا۔ اسکی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اُن کے فرزند ارجمند مولوی
محمد فضل حق صاحب مرحوم سے کچھ دوستی کا آغاز ہوا۔ مرحوم اس وقت اپنی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے
اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے مقابلہ کے امتحان بھی دے چکے تھے۔ میں اپنی ڈیوٹی سے
فارغ ہو کر دوسرے تیسرے روز بلاناغہ بھاٹی دروازہ اُن کے ہاں پہنچ جاتا۔ قبلہ مولانا کی خدمت میں
حاضر ہوتا۔ بعد میں برادرم فضل حق مرحوم اور میں دونوں عام طور پر سیر کو نکل جاتے۔ کبھی سینما
دیکھ لیتے اور کبھی میں اُنکو اپنے گھر لے آتا اور اس طرح یہ مراسم اتنے گہرے ہو گئے کہ روزانہ ہی
ملاقات ہو جاتی۔ مولانا مرحوم کالج سے واپس آکر کھانا کھانے کے بعد اپنا وقت اپنی بیٹھک میں ہی

گزارتے۔ اس بیٹھک میں ایک نہایت میلی کچیلی دری بچھی ہوتی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک گاؤ تکیہ اور اُن کے
سامنے ایک چھوٹا سا ڈیسک ہوتا تھا۔ جب تک وہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہے تب تک نماز کے
وقت تک یعنی مغرب سے پہلے پہلے وہیں رہتے۔ جب اس مصروفیت سے فارغ ہو گئے تو تمام تر وقت
ظہر سے عشاء تک مسجد میں ہی معتکف رہتے۔ عقیدت مندوں، شاگردوں اور عزیزوں سے بھی عام طور پر
وہیں ملاقات ہوتی۔ ہر کس و ناکس سے خندہ پیشانی اور شفقت سے پیش آتے۔ طبیعت میں تکلف
نام کو نہیں تھا۔ حاجتمند اور سوالی اکثر ان کو گھیرے رکھتے۔ کسی کے سوال کو رد نہ فرماتے۔

زہد اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ کسی کے ہاں کھانا نہ کھاتے۔ دعوتوں میں بالکل شریک نہ ہوتے۔ ایک
دو دفعہ یہ اظہار فرمایا کہ آج کل کے لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ رشوت عام ہے۔ بینکوں کا
سود لوگوں نے حلال سمجھ لیا ہے۔ اس لئے کسی کے ہاں کا کھانا کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ بناوٹ اور
تصنّع سے انہیں سخت نفرت تھی۔ بذلہ سنجی بھی طبیعت میں کافی تھی۔ بسا اوقات لطائف سے محظوظ
فرماتے۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے اکثر فارسی اور عربی اشعار بڑے لے اور ترنّم سے پڑھتے رہتے۔ میں دبے پاؤں
جاتا اور چپکے سے اُن کے پلنگ کے پاس نماز والی چوکی پر بیٹھ جاتا اور اشعار کا لطف اٹھاتا رہتا۔
آپ حقہ بہت زیادہ پیتے تھے۔ میں بھی حقہ پیا کرتا تھا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں بھی
حقہ پیتا ہوں تو حقے کی نے میری طرف پھیر دیتے اور فرماتے لو پیو۔ میں الأمر فوق الادب کے
تحت آپ کے ساتھ تمباکو نوشی میں شامل ہو جاتا۔ اگر عدیم الفرصتی کے باعث میں چند دن حاضر نہ ہوتا
تو یاد فرمالیتے۔ والد صاحب مرحوم کو کئی بار تین تین چار چار دن اپنے پاس روک کے رکھتے۔ ان کے
ساتھ آپ کا بہت زیادہ روحانی تعلق تھا۔ تاریخ وفات قطعہ کی صورت میں کہنے کا جتنا ملکہ ان کو
تھا شاید ہی کسی اور کو ہو۔ ایک دو گھنٹے میں اشعار موزوں کر لیتے اور قطعہ تاریخ تیار ہو جاتا۔
میرے چند عزیزوں کی قبروں پر جو کتبے ثبت ہیں اُن ہی کے تحریر کردہ ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ غالباً ۱۹۳۸ کا ذکر ہے کہ مجھے آپ نے ایک رقعہ دیا
کہ یہ رقعہ مولانا ظفر مہدی صاحب مرحوم جو ایک جید شیعہ عالم دین تھے اور سید مراتب علی
شاہ صاحب کی کوٹھی میں قیام فرما تھے اُن تک پہنچا دوں۔ اور اگر وہ جواب دیں تو لے
آؤں۔ مولانا مرحوم کو کالے موتیے کی شکایت تھی۔ اور اس وقت اُن کی بینائی نہ ہونے کے برابر تھی

لکھنا پڑھنا بالکل موقوف تھا۔ اس رقعہ میں آپ نے غالباً مولانا سید ظفر مہدی صاحب کی خدمت میں
دعا اور دوا کی درخواست کی تھی۔ جب میں نے یہ رقعہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے
جب کھول کر پڑھا اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس خط کے آغاز میں قبلہ مولانا نے چند اشعار فارسی
میں جناب عالی مقام سیدنا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ کی شان میں تحریر کئے ہوئے تھے۔
استاد صاحب بار بار وہ اشعار پڑھتے، سر دُھنتے اور فرماتے۔ "رُوحا تم نے ہم کو خوش
کردیا اللہ تعالیٰ تمھیں خوش کرے۔ "روحی" کہنے کی بجائے "رُوحا" کہتے۔

نہایت وسیع النظر عالم تھے۔ کبھی انہوں نے کسی عالم پر نکتہ چینی نہیں کی اور نہ ہی فروعی
مسائل کے چکر میں پڑتے تھے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر اسلامیہ کالج میں معمولی مشاہرہ
پر تقریباً ۲۵/ ماہوار پر گزار دی۔ حالانکہ کئی دفعہ باہر سے ان کو ایک ہزار روپیہ ماہوار تک
آفر ہوتے رہے۔ لیکن آپ نے اپنی اسی آمدنی پر قناعت کی اور تمام عمر میں ایک دفعہ بھی اپنی
ترقی کے لئے نہ کسی سے کہا اور نہ ہی درخواست دی اور انجمن حمایت اسلام نے افسوس کہ
ان کی کما حقہ، کوئی قدر نہ کی[1] نہ اُن کی کوالیفیکیشن کو ملحوظ خاطر رکھا اور نہ ہی مدت
دراز کی خدمت کو۔ وہ علوم الشرقیہ، عربی اور فارسی میں ڈبل ایم او ایل تھے۔
۱۹۸۰-۲-۳۰

[1] یہ درست نہیں کیونکہ مولانا مرحوم کی واحد مثال ہے کہ انجمن نے انہیں سہ ماہی کی صورت میں کچھ رقم دینی منظور کی تھی جو وہ
آخری دم تک وصول کرتے رہے۔ علاوہ ازیں کریسنٹ ہوسٹل میں مختلف ملازمین انجمن کے نام پر بلاک بنائے گئے ان میں پہلا بلاک "روحی بلاک" ہے۔

قاضی افضال ربانی

قبلہ محترم مولانا مولوی اصغر علی روحی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی سوانح حیات پر کچھ لکھنا میرے لئے تو ایسا ہے جیسے چراغ کو کہا جائے کہ وہ سورج کے متعلق کچھ بتائے۔ بہرحال جب مجھے قبلہ محترم صوفی ضیاء الحق صاحب جو ان کے فرزند ارجمند ہیں نے حکم دیا کہ میں جو کچھ بھی اُن کے متعلق جانتا ہوں لکھوں تو حکم ارشاد اس کی تعمیل کر رہا ہوں۔ قبلہ مولوی صاحب کی حیات طیبہ میں اُس دور میں داخل ہوا جب کہ میں صرف دس یا گیارہ سال کا تھا یعنی کچھ آج سے ۵۰ سال پہلے اور تقریباً ۲۰ سال تک اُن سے منسلک رہا۔ بچپن میں عام انسان کو اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ خاص رموز سمجھ سکے مگر جیسے جیسے سن شعور تک پہنچا تو مجھ پر یہ چلا کہ مولانا صاحب کی شخصیت کیا تھی۔ میرے بچپنے میں تو میرے ساتھ بچوں جیسا سلوک تھا نہایت خندہ پیشانی اور پیار اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اس وقت بھی دل ان کی طرف خود بخود راغب ہوتا تھا۔ بڑے ہو کر جب سمجھ آئی کہ اللہ والے کی پہچان یہ ہے کہ انسان جب اُن کو دیکھے یا ملے تو اللہ یاد آئے۔ یہ بات خاص تھی جو میرے مشاہدہ کی ہے۔ قبلہ دنیا کی چمک دمک سے بے نیاز تھے۔ اور نمود و نمائش کا اُن کی زندگی میں ذرا بھی دخل نہ تھا۔ وہ صرف خدا کی طرف متوجہ تھے اور زندگی کے ہر مرحلہ پر اس سے لو لگاتے تھے۔ وہ اللہ کے لئے زندہ رہے اور اللہ کے لئے جہاد کرتے رہے۔ اُن کا جینا مرنا دنیا کے لئے نہ تھا۔ صرف خدا کے لئے تھا۔ سچی بات وہ منبر پر کھڑے ہو کر کہہ دیتے تھے۔ نہایت مشفق، مہربان، مہمان نواز دوسروں کے دکھوں میں اُن سے ہمدردی کرنے والے تھے۔ آپ نہایت شفیق اور مہربان استاد تھے اور اپنے شاگردوں کو اپنے بچوں کی سمجھتے تھے۔ اور اُن کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ آپ اُس وقت کے جید عالم تھے۔ آپ عربی اور فارسی کلام کے شاعر بھی تھے۔ آپکی بہت سی تصانیف ہیں جو آج بھی مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔ دین پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو طبع بھی ہو گئیں۔ آپ نے اپنی اولاد کو دین کی تعلیم دی اور ہمیشہ دین پر چلنے کی تلقین

کرتے رہے۔ اللہ کے فضل سے ان کی اولاد نیک اور صالح ہے اور دنیا میں بھی اللہ نے ان کو کامیابیاں عطا فرمائیں۔ اہل اللہ اور صوفیائے کرام سے محبت کرتے تھے۔ جیسکی مثال ان کا قبلہ مولوی مشیر محمد رحمہ اللہ صاحب شرقپوری کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ قبلہ محترم کی مکمل زندگی کے حالات لکھنے کے لئے ایک عرصہ دراز چاہئیے مگر علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

میرے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم تھے۔ اور میرے بہت سے عزیزوں کے استاد بھی تھے۔ ان میں خصوصیت سے قاضی تفضل حسین صاحب، قاضی مظہر حسین صاحب، قاضی علاؤالدین صاحب وغیرہ اور میرے دادا صاحب قاضی ضیاء الدین صاحب کے ساتھ تو خصوصی لگاؤ تھا۔ کئی کئی گھنٹے رازونیاز کی باتیں کرتے تھے اور سوہدرہ تشریف لے جاتے رہے ہیں اور سوہدرہ کے متعلق ایک فارسی قصیدہ بھی انہوں نے لکھا تھا۔

قاضی افضال ربانی

۱۹۸۰-۲-۱۲

فصل پنجم

(متفرقات)

ڈاکٹر قریشی احمد حسین قلعداری

(پروفیسر فارسی گورنمنٹ زمیندار کالج، گجرات)

کٹھالہ گجرات سے لاہور جاتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کی پنجاب کے دیہات میں کوئی اہمیت نہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ مختصر سا گاؤں پنجاب کے چند علمائے دین کا مسکن و ماویٰ رہا۔ مولوی شمس الدین صاحب اس اہل علم خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ مولوی شمس الدین صاحب نہایت متشرع اور متدین قسم کے انسان تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور علم و حکمت سے عشق ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ مولوی صاحب موصوف سید احمد ناظم قلعہ داری شادیوال کے درس سے فارغ التحصیل ہوئے۔ قبلہ والد بزرگوار مولوی محمد عبدالکریم قریشی قلعداری نے آپ کی زبان سے متعدد بار سنا کہ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں نے علم فقہ زیادہ تر علامہ سید احمد ناظم کے کردار سے پڑھا۔ وضو بناتے اور نماز ادا کرتے وقت میں اکثر غور و فکر سے دیکھا کرتا تھا کہ آپ یہ کام کس طرح سر انجام دیتے ہیں۔

مولوی اصغر علی اور مولوی محمد علی، مولوی شمس الدین صاحب کے دو صاحبزادے تھے ان کی بھی ابتدائی تعلیم شادی وال میں ہوئی۔

مولوی اصغر علی روحی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر لاہور اورینٹل کالج میں داخل ہوئے اور مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل، منشی، منشی عالم، منشی فاضل کے امتحانات امتیاز سے پاس کئے۔ الف۔ اے۔ ایف۔ بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے بھی اسی یونیورسٹی سے پاس کئے۔ ہمارے نزدیک ان کے یہ امتحانات امتیاز سے پاس کر لینا کوئی وجہ تفاخر نہیں۔ حضرت مولانا کا مقام ان باتوں سے کہیں بلند ہے۔ مولانا روحی کا طرۂ امتیاز اس حقیقت سے نمایاں ہے کہ آپ سلف صالحین میں سے علمائے گزشتہ کی پوری پوری تصویر تھے۔ آپ جیسا علم و حکمت میں درک اور علم و ادب میں کمال پنجاب کے صرف محدودے چند علماء کو نصیب ہوا۔ ادب عربی پر آپ کو خاص طور پر عبور تھا۔ عربی کے اہم لغت آپ کو ازبر تھے اور ذہنی بصیرت اس پر مستزاد تھی۔ شعر و سخن کے باب میں انوری و خاقانی کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا روحی انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ کٹھالہ کا فیضان علم و حکمت لاہور میں منتقل ہو گیا۔ لاہور میں آپ کے علم و فضل کو فروغ پانے کے نہایت قیمتی مواقع میسر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمانوں میں جید عالم اور مخلص لوگ موجود تھے اور لاہور میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بعض انجمنیں وجود میں آ رہی تھیں۔ مولانا ان تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ مدرسہ حمیدیہ انجمن حمایت اسلام، انجمن نعمانیہ، انجمن تائید الاسلام، انجمن خادم علوم اسلامیہ مولانا روحی کی سرگرمیوں کے اہم مرکز تھے۔ ان انجمنوں میں ملک کے نامور علماء موجود تھے جن سے مولانا کے دوستانہ مراسم رہے اور ملاقاتیں رہیں۔ ان سرگرمیوں نے مولانا روحی کے احساسات کو بہت فروغ دیا اور آپ ان سرگرمیوں کے روح رواں رہے۔

مولانا محمد حسن فیضی، مولانا غلام اللہ قصوری، مولانا محمد عبدالحق مصنف تفسیر حقانی، مولوی محمد سعید الدین، مولوی فضل الدین گجراتی، مولوی یعقوب علی دیوبندی، مولوی غلام احمد بگوی، شمس العلماء مولوی محمد عبداللہ ٹونکی، شمس العلماء مولوی عبدالحکیم کلانوری، قاضی ظفرالدین، حکیم مفتی سلیم اللہ، مولوی غلام محمد شیخ (ہوشیارپوری) قاضی حمید الدین لاہوری، مولوی عبدالمالک، مولوی شیخ عبداللہ ساکن چک عمر، مولوی محمد عبدالکریم قلعداری (والد بزرگوار راقم) مولوی محمد عالم قلعداری، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال آپ کا حلقہ احباب تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں ملک کے اکابر علماء اور رہنما تشریف لاتے رہے۔ اس میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک اور مولوی چراغ علی بالخصوص مہمان خصوصی ہوتے رہے۔ مولانا روحی کی اس وسیلے سے ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔

اسلامیہ کالج لاہور میں مولانا روحی کا زمانہ اپنی خصوصی روایات سے آپ ہی یادگار ہے۔ انگریزی وضع کے کالجوں میں لوگ کہتے ہیں کہ پرانے مدارس نظامیہ کی یاد تازہ تھی۔ اساتذہ کا احترام اور مولانا کی شاگردی کا خصوصی تفاخر طلبہ اپنے لئے سرمایہ سعادت سمجھتے تھے۔ مولانا کے قصے ابھی بھی لوگوں کو یاد آتے ہیں اور دوستوں میں اسکے تذکرے ہوتے رہتے ہیں۔

انجمن حمایت اسلام کی ملازمت کے ساتھ ساتھ دیگر دینی مشاغل میں برابر حصہ لیتے تھے۔ میں نے اس دور کے متعدد فتاویٰ دیکھے ہیں جن پر مولانا روحی کے دستخط موجود ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا روحی لاہور کے اہم علماء میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا عبداللہ ٹونکی کا فتویٰ قبلہ والد بزرگوار علامہ محمد عبدالکریم قریشی قلعداری کے

متعدد فتوے میرے پاس موجود ہیں جن پر مولانا کے اپنے قلم سے دستخط پائے جاتے ہیں

دینی اہم مسائل میں لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک دفعہ موضع قلعدار میں نماز جنازہ اور نماز مغرب کے وقت کی تقدیم و تاخیر میں بحث چل نکلی، مولوی ضیاء محمد قلعداری، سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لائلپور مولانا کا شاگرد تھا۔ آپ کے پاس آیا اور اپنے مدمقابل مولوی محمد عالم قلعداری کے خلاف بغیر ان کے نام کا اظہار کئے چند سطور مولانا روحی سے لکھوا لایا۔ مولانا نے مسئلہ پر بحث نہ کی۔ ایک اصولی سی بات لکھ دی کہ مجتہد عامی کا قول قابل قبول نہیں۔ مولانا محمد عالم کے پاس جب یہ تحریر پہنچی تو آپ نے آڑے ہاتھوں لیا اور ایک رسالہ جواب میں تحریر کیا جس کی ابتدائی سطور حسب ذیل ہیں :۔

"مولوی اصغر علی روحی صاحب کی تحریر نظر سے گزری آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مجتہد عامی کا قول قابل قبول نہیں، چونکہ مولانا خود مجتہد عامی ہیں۔ انہوں نے یہ صحیح لکھا ہے کہ میری بات قابل قبول نہیں، مسئلہ کی صورت اس طرح ہے۔"

آگے مسئلہ سے مفصل بحث ہے۔ مولانا اصغر علی روحی کی تحریر اور یہ رسالہ راقم کے عم بزرگوار مولوی محمد عالم قلعداری کے کتاب خانہ میں موجود ہے۔

شرعی اور دینی امور پر آپ کو فلسفیانہ عبور تھا۔ آپ نے اس موضوع پر ایک جامع کتاب، مافی الاسلام' دو جلدوں میں تحریر فرمائی، جو شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مولانا نے خود اپنے دستخطوں سے راقم کو عنایت فرمایا۔

فن فصاحت و بلاغت میں آپ کی کتاب دبیر عجم مدتوں تک منشی فاضل کے نصاب میں شامل رہی جو آپ کے علمی تبحر پر دلالت کرتی ہے۔

ان کے علاوہ ۱۹۰۵ء - ۱۹۰۶ء کے قریب آپ نے ایک رسالہ "الہدیٰ" بھی جاری کیا۔ جس کا مقصد محض اسلام دینیہ و معتقدات باطلہ فلسفیہ تائید احکام سنت علیٰ صاحبہا الاسلام و تحیۃ تھا اس مجلہ کے متعدد پرچے راقم کے کتاب خانہ میں موجود ہیں۔

مذاہب باطلہ سے آپ کو کلیۃً نفرت تھی ان کی تکذیب میں ہر وقت کوشاں رہتے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے معرکوں میں متعدد بار نبرد آزما ہوئے اور اپنی ایک کتاب میں جہاں اس نے لکھا ہے " کانا فی المدینۃ تسعۃ رھط " ان میں سے مولوی فضل احمد قلعداری، مولوی محمد حسین بٹالوی اور مولوی اصغر علی کا نام

سرِ فہرست تھا۔ یہ ان کی حق گوئی اور حق پرستی پر دلالت ہے کہ وہ اپنے عقیدہ پر سختی سے راسخ تھے۔

ان علمی و دینی خدمات کے علاوہ آپ کا طرہ امتیاز ذوقِ شعر و سخن تھا۔ آپ عربی اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، بلکہ اپنے وقت میں متنبی اور انوری کی یاد کو تازہ کرتے تھے۔ شعروں میں بلند خیالی اور علمی شکوہ آپ کے تبحرِ علمی کی نشان دہی کرتا ہے۔ قصائد طویل اور مشکل قسم کے ہوتے تھے، ان قصائد میں زیادہ تر قصیدے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں دیکھے گئے۔ حضور نبی کریم سے مولانا روحی کو عاشقانہ حد تک عقیدت تھی۔ حضور کی نعت میں بے شمار عربی و فارسی قصیدے تحریر فرمائے۔ کہتے ہیں۔

اے آنکہ شدہ حاصلِ عمرِ تو زیاں	وز شرمِ گناہ مانندگوں سار و نواں
برخیز بزن دستِ بدامانِ رسول	حرفے ست زلبی راست، عیاں را چہ بیاں

نعت کے علاوہ محمڈن بالا انجمنوں کے سالانہ اجلاس میں پڑھنے کے لئے بھی بے شمار قصیدے لکھے۔ ان تمام قصائد کو اگر جمع کیا جائے تو مولانا روحی کے فارسی و عربی دو ضخیم دیوان معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

میرے پاس انجمن حمایت اسلام سالانہ اجلاس کی مکمل رپورٹیں موجود تھیں۔ ان میں آپ کے بے شمار قصائد دیکھنے میں آئے، افسوس وہ رپورٹیں ضائع ہو گئیں اور میرے ہاتھ سے یہ فیض متاع جاتی رہی ہیں۔ ان کے صاحب زادگان سے یہ عرض کروں گا کہ وہ انجمن حمایت اسلام اور انجمن نعمانیہ اور دیگر انجمنوں کی رپورٹوں کی پڑتال کریں اور مولانا موصوف کا سرمایہ شعری جمع کر کے شائع کرا دیں تاکہ یہ گراں بہا متاع ان کی عظمت کو رہتی دنیا تک زندہ رکھے۔

میرے کتب خانہ میں مولانا موصوف کا سرمایہ شعری موجود ہے۔ اسکی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے۔ قصیدہ نعتیہ بزبان عربی۔ مطلع ہے۔

بنفسی أنت لیس لک الوفاء	الی ما ذا التجافی والجفاء

کل ۴۵ شعر

مولانا موصوف کی ایک مکمل تقریر جو آپ نے انجمن حمایت اسلام کے سترھویں جلسہ میں کی تھی پوری تقریر رپورٹ انجمن حمایت اسلام ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔

اس تحریری سرمایہ علم و حکمت اور شعر و سخن کے علاوہ کچھ متعدد روایات لوگوں کی زبانی جمع کی جا سکتی ہیں۔ جو آپ کے خداداد ذوقِ سلیم پر دلالت کرتی ہیں۔

قاضی ارشاد علی ساکن وزیرآباد مولوی صاحب کے عزیز شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں کٹھالہ گیا۔ چھٹیوں کا موسم تھا۔ مولوی صاحب کٹھالہ ہی میں تھے۔ میں بھی رات وہیں رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا صاحب کے صاحبزادگان پرائمری اور مڈل جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ سردیوں میں مولوی صاحب رات کو تصنیف و تالیف میں مصروف تھے اور بڑے صاحبزادہ کو پاس بٹھایا ہوا تھا تاکہ وہ پڑھے۔ وقت زیادہ گزر گیا بچہ تھک گیا لیکن مولوی صاحب اس کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اتفاق سے حقہ کی آگ سرد ہو گئی۔ مولانا آگ بنانے کے لئے بیٹھک سے نکلے۔ صاحبزادہ صاحب نے موقع غنیمت جانا، ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے، کتاب منہ پر رکھ لی اور بڑے موڈ میں کہنے لگے:

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے

مولانا صاحب سن رہے تھے۔ بیٹھک میں تشریف لائے۔ کان سے پکڑا اور اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا:

کھلے آنکھ صلِّ علیٰ کہتے کہتے

ایک دفعہ مولوی صاحب کہیں دعوت پر گئے۔ دعوت مختصر تھی۔ حقیقت میں بالکل دعوتِ شیراز تھی۔ بھوکے گھر آگئے۔ کسی نے روداد پوچھی تو آپ نے قطعہ فرمایا:

رکابی تنگ تر از چشم بلبل ؎ درون سالنے نہادہ ذرہ گل
زبا ورچی چو پرسیدم پیازا ئچ بگفتہ ہیچ نے داریم بالکل

اسی طرح کی ایک روایت بھی سنئے کہ ایک دعوتِ شیراز سے واپس آئے تو آپ نے کہا:

کھانے آیا تھا میں کی روٹی ؎ سر پہ ٹوپی تھی ہاتھ میں سوٹی
چند چاول تھے جن کی چوٹی پر وحدہ لاشریک تھی بوٹی

آپ کی وفات ۱۹۵۴ء میں لاہور میں ہوئی۔ آپ کو اپنے وطن مالوف کٹھالہ میں لا کر دفن کیا گیا اور آپ کا مزار برلب شاہراہ عظیم ایک مسجد کے متصل آنے جانے والے لوگوں کی زیارت گاہ ہے۔

آپ کے بعد آپ کے سارے صاحبزادے علم و ادب کی شمع اسی آب و تاب سے فروزاں کئے ہوئے ہیں جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ فضل حق۔ ریٹائرڈ اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان

۲۔ حافظ محمد عبد الحق۔ چیئرمین سیکنڈری بورڈ ملتان

۳ ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر و صدر شعبہ عربی و اسلامیات گورنمنٹ کالج لاہور

۴ ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر و صدر شعبہ عربی و اسلامیات گورنمنٹ کالج لاہور

۵ محمد مظہر الحق رانا ایم۔ اے پروفیسر و صدر شعبہ ریاضی گورنمنٹ کالج ساہیوال۔

صوفی ضیاء الحق عربی زبان کے بلند پایہ شاعر اور جید عالم ہیں۔ راقم الحروف کے مہربان دوست ہیں۔ ان کا نمونۂ کلام دیکھیے، ہمارے مقالہ شعر العرب فی الگجرات میں۔ آپ کے اشعار میں بزرگان سلف کا عالمانہ شکوہ بھی موجود ہے۔

قریشی احمد حسین احمد قلعداری

حامد علی خان

(ماڈل ٹاؤن، لاہور)

السلام علیکم! آپ کا گرامی نامہ ملا۔ غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ میں اسلامیہ کالج سے میرا تعلق ہوا تھا۔ اس وقت پرنسپل ہنری مارٹن کا دور تھا۔ پروفیسر رچرڈز، غلام رسول شوق اور سراج الدین آذر وغیرہ انگریزی پڑھاتے رہے۔ ایک اہم شخصیت پروفیسر ایم۔ اے غنی کی تھی جو بڑے فاضل اور شیکسپیئر کے بالخصوص ماہر تھے۔ تاریخ سید عبدالقادر پڑھاتے تھے۔ فلسفے کے استاد کا نام غالباً خواجہ عبدالحمید تھا اور وہ بھی بڑے فاضل تھے۔ عربی اور فارسی پڑھانے والوں میں کم از کم تین اساتذہ تھے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا روحی شاید فارسی کے معلم تھے اور میرا مضمون عربی تھا۔ اس لئے اُن سے براہ راست فیض حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر دوسروں کی طرح اُن کے علم و فضل سے میں بھی مرعوب تھا۔ کالج میں آتے جاتے بسا اوقات انہیں بھی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتا تھا (مگر کبھی گفتگو کی جرأت نہ کی) جہاں تک مجھے یاد ہے اُن کا قد بہت لمبا نہ تھا مگر نکلتا ہوا میانہ قد ضرور تھا۔ کوٹ وغیرہ پر لٹھے کا ایک سفید جبہ ضرور پہنتے تھے۔ رنگین چشمہ ہمیشہ آنکھوں پر ہوتا تھا (شاید اس لئے بھی اُن

---

1 مولانا روحی دراصل عربی ہی پڑھاتے تھے لیکن اعلیٰ جماعتوں کو، چھوٹی جماعتوں کو کوئی اور پروفیسر صاحب پڑھاتے ہوں گے

سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوا تی تھی) ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا بھی رکھتے تھے۔ راستے میں اُن کے ساتھ دو تین یا شاید زیادہ شاگرد ضرور ہوتے تھے۔

میں نے مدرسے کی ابتدائی جماعتوں میں کچھ فارسی بھی پڑھی تھی۔ پھر ایک مدت کے بعد میں نے خود فارسی پڑھنی شروع کی اس سے پہلے صرف اردو میں شعر کہتا تھا اب فارسی غزل لکھنے کی جرأت بھی ہوتی۔ میں نے کرم آباد سے دو غزلیں لکھ کر اپنے عزیز منصور احمد مرحوم (ایڈیٹر ہمایوں و ادبی دنیا) کو بھیجیں اور لکھا کہ انہیں روحی صاحب کو دکھا لیجئے۔ اگر درست ہوں تو مجھے اطلاع دیجئے۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ روحی صاحب نے ان غزلوں کو سرسری طور پر دیکھ کر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چنانچہ اُن میں سے ایک میں نے "ہمایوں" کے لئے بھیج دی اور ایک انقلاب کے لئے جسے مولانا مہر نے پورے پہلے صفحے پر چھاپ کر میرے لئے حیرت کا سامان بہم پہنچایا۔ یہ ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ حضرت روحی ایک خاموش طبع عالم تھے۔ کالج میں ذاتی تعلق کے بغیر مجھ پر اُن کے علم کا جو رعب تھا اُسی نے مجھے اُن کو غزلیں دکھانے پر آمادہ کیا کہ انہوں نے بے نیازی سے پڑھ کر شاید درست قرار دیں۔ اس سے زیادہ اور میرے علم میں کوئی بات نہیں۔

مولانا محمد بخش مسلم، سید نذیر نیازی، صوفی تبسم اور بدل حق صاحب (ریڈیو پاکستان) سے شاید کچھ معلوم ہو سکے۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب بھی شاید کسی شاگرد کا پتا بتا سکیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ ان کے کلام کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں مگر یہ جلد ہونا چاہیئے تاکہ ہم لوگ بھی جنہوں نے انہیں دیکھا ہے اُس سے مستفید ہو سکیں۔ میاں امیرالدین اور سید ذوالفقار علی شاہ (Peerages) بھی شاید کچھ بتا سکیں۔

اگر مجھے عدیم الفرصتی نہ ہوتا تو شاید کچھ اور بھی غور کر سکتا۔ کالج میں حضرت مرحوم کے عہد کے طلبہ کا سراغ لگانا چاہیئے۔ لیکن دنیا گزراں ہے اور اکثر شاگرد بھی گزر چکے ہوں گے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا ارادہ نہایت سعادت مندانہ اور قابلِ تعریف ہے مگر اخباروں میں لکھنے سے زیادہ کامیابی شاید نہ ہو۔ لوگوں کو خط لکھئے۔ بہت کم لوگ اپنے بزرگوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ؎ نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

جسٹس ذکی الدین پال

(سابق جج ہائیکورٹ، لاہور)

مولانا اصغر علی روحی والد معظم مولوی سراج الدین احمد پال ایڈووکیٹ کے استاد گرامی تھے۔ مولانا صاحب کافی عرصہ تک اورینٹل کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر رہے۔ اُن دنوں مولانا ایم اے عربی کے طلباء کو پڑھایا کرتے تھے۔ والد صاحب بھی اُن کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ وہ مولانا کے تبحر علمی سے بے حد متاثر تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ بعض اوقات نہایت دقیق مسائل جو طلباء سے متعلقہ کتب کے مطالعہ سے حل نہ ہوتے تھے۔ مولانا باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے خالصہ کالج امرتسر سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور پھر لاہور آگئے، یہاں ایم۔ اے عربی کی کلاس میں داخل لیا۔

وہ یہ واقعہ اکثر بیان کرتے تھے کہ بعض مشکل باتوں کے سمجھنے کے لئے جب مولانا کی طرف رجوع کیا جاتا اور اُن سے اس سلسلہ میں وقت مانگا جاتا تو وہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اکثر کہتے کہ علی الصبح اُن کے کالج کے لئے روانہ ہونے سے قبل اُن کے گھر آجائیں اور وہاں سے کالج تک کا راستہ اُن کے ہمراہ طے کریں۔ مولانا گھر سے کالج تک کے راستہ میں شاگردوں سے اُن کی مشکلات کے متعلق دریافت کرتے اور کالج پہنچنے تک اُن کو مشکل نکات یا مضامین کا مطلب سمجھا دیتے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ اس مشکل مضمون کے متعلق اُن سے دوبارہ رجوع کرنا پڑتا۔

والد صاحب کے کہنے کے مطابق مولانا شاگردوں سے نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آتے اور کوشش کرتے کہ اُن کے دلوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق زیادہ سے زیادہ پیدا ہو۔ پنجاب یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ اور یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر وولنر جو خود علوم شرقیہ کے استاد تھے مولانا کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی علمی قابلیت سے بے حد متاثر تھے ——— والد صاحب کہا کرتے تھے کہ مولانا صاحب کے فیض صحبت کی وجہ سے انہوں نے ایم۔ اے عربی کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اور میڈل حاصل کیا۔ اس کی بنا پر انہیں اورینٹل کالج میں بطور لکچرار متعین کیا گیا اور اس دوران انہوں نے

علمی شوق کی بنا پر جو زیادہ تر مولانا کی شاگردی کا رہین منّت تھا، مولوی فاضل اور منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔

مولانا انتہائی سادہ مزاج کے مالک تھے، سادہ لباس استعمال کرتے۔ اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود طبیعت میں بے حد انکساری تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں کی نظروں میں احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ذکی الدین پال
۵ مئی ۸۰ء

ذوالفقار علی

(خیابانِ اقبال، شاہ جمال، لاہور)

السلام علیکم۔ قبلہ حضرت مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے متعلق مجھے معلومات بہت کم ہیں۔ دوسروں سے ان کی قابلیت اور اخلاقی اثر کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔

میں رنگ محل مشن ہائی سکول کا طالب علم تھا۔ ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان وہیں سے پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اسلامیہ کالج لاہور کا میں طالب علم کبھی نہیں رہا۔

اگر میں غلطی پر نہیں تو جس زمانے میں نیازمند رنگ محل سکول میں پڑھتا تھا، قبلہ مرحوم پاس ہی ایک دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے اور اُن کا نام غالباً "علی" پر ختم ہوتا تھا۔ اُن کے صاحبزادے میرے ایک بھائی کے دوست چوہدری فضل الٰہی کے رفیق تھے۔ اُن کی وساطت سے مجھے اُس گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ مولانا ہمارے لئے بہت عظیم شخصیت تھے، اور ہم عمر میں اتنے چھوٹے تھے کہ آپ سے سلام و نیاز کے بعد بات کرنے کی جرأت بھی نہ تھی۔

میں معافی کا طالب ہوں کہ میری معلومات کچھ ایسی نہیں جو آپ کے لئے مفید ہوں۔

والسلام مع الاکرام

نیازمند ذوالفقار علی

مولانا عطا محمد چشتی

(مدرس دار العلوم مظہریہ امدادیہ بندیال، ضلع خوشاب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا العلامہ اصغر علی صاحب روحی قدس اللہ روحہ

کی چند یادداشتیں

الحمد لاھلہ و الصلوٰۃ والسلام علی اھلھا اما بعد پرانے علماء کرام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ علم کے بحر بیکراں ہونے کے باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، خصوصاً عام لوگوں جیسا لباس پہنا اور بالکل عوام جیسی زبان میں کلام کرنا یعنی تکلم کے وقت بالکل مادری زبان کے سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرنا اور کوئی عربی یا فارسی زبان کا لفظ عوام کے سامنے استعمال نہ کرنا اور کسی آدمی پر اپنی علمی قابلیت کا رعب نہ ڈالنا بخلاف اس کے کہ علمی قابلیت کم اور فروتر لیکن طرز زندگی اور لباس کا ایسا کروفر کہ دوسرے آدمی پر تبحر علمی کا رعب پڑے۔ انہیں پرانے بزرگوں میں سے حضرت الاستاذ مولانا اصغر علی صاحب روحی رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔

تقریباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے کہ بندہ دار العلوم نعمانیہ میں مولانا محب النبی مرحوم و مغفور سے چند اسباق پڑھتا تھا اور میرا قیام بھاٹی دروازہ میں ذیلدار محمد اسماعیل مرحوم کے گھر تھا۔ علامہ اصغر علی صاحب روحی مرحوم و مغفور کا گھر بھی یہاں ہی تھا اور وہ پانچ وقت مسجد میں نماز کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اس وقت وہ آنکھوں کی بینائی نہ ہونے کی وجہ سے معذور تھے، کوئی نہ کوئی آدمی انہیں مسجد میں ہاتھ پکڑ کر لے آتا تھا اور عموماً امامت کے فرائض آپ ہی انجام دیتے تھے۔ اگرچہ مسجد کا امام ایک اور آدمی تھا۔ ایک دفعہ آپ نے کسی آدمی کو مندرجہ ذیل دعا لکھ کر دینی تھی۔ دعا یہ ہے:

" بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیئ فی الارض و لا فی السماء وھو السمیع العلیم۔ "

لیکن چونکہ آپ آنکھوں سے معذور تھے۔ اس لئے دعا درج بالا لکھ نہیں سکتے تھے تو میرے آپ سے عرض

کیا کہ میں یہ دعا لکھ دیتا ہوں تو آپ کے فرمان کے مطابق یہ دعا لکھ کر اسی آدمی کو دے دی۔

ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد ہے کہ آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت ہی وسیع تھا اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اس لئے سفارشی لوگ آپ کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی آدمی نے کسی مضمون کا امتحان دیا تھا اور اس مضمون کا جو ممتحن تھا وہ آپ کے شاگردوں میں سے تھا۔ لہٰذا امتحان دینے والے شخص نے اپنے امتحان کے بارے میں سفارش کے لئے عرض کیا تو آپ نے اس کے لئے بھرپور سفارش لکھی اور سفارش میں یہ لکھا کہ یہ آدمی فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیئے۔ تو مذکورہ بالا ممتحن نے چند دنوں بعد عریضہ لکھا کہ آپ نے جو تحریر فرمایا ہے کہ فلاں آدمی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو۔ یہ تو بڑا ہی مشکل ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو تھرڈ سے نکال کر سیکنڈ میں داخل کر دیا جائے گا۔ آپ اپنی داڑھی مبارک پر مہندی استعمال کرتے تھے اور شمس العلماء مولانا عبداللہ ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں تھے۔ بالکل سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ کسی قسم کا تصنع نہیں تھا۔ شرع شریف کی پوری پابندی فرمایا کرتے تھے۔

اگرچہ آپ کے صاحبزادگان کی عمر خاصی بڑی تھی لیکن ان پر بڑا کنٹرول فرماتے تھے اور ان کے بچے ان سے نہایت ہی مرعوب رہتے تھے۔ نہایت رعب دار آواز تھی۔ تاریخ وفات کو نکالنے کے لئے خاص ملکہ رکھتے تھے اس لئے لوگ اس معاملہ میں آپ سے امداد حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ ذیلداروں کے خاندان سے ایک میاں برکت علی صاحب مرحوم کی وفات کا قطعہ بھی آپ ہی نے تحریر فرمایا تھا۔ جو ابھی تک میاں صاحب مذکور کی قبر پر کندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے، بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ مولانا صاحب کے ایک بڑے صاحبزادہ تھے جنہوں نے کتاب اشارات کا اردو ترجمہ کیا تھا اور شیخ بوعلی سینا کے سوانح بھی اس ترجمہ میں تحریر کئے تھے۔

حررہ احوج الناس الی اللہ الصمد الفقیر

عطا محمد الچشتی الگولڑوی

غلام جیلانی اصغر

(سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج سرگودھا)

میں جس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا تھا تو مولانا روحی جا چکے تھے، لیکن ان

کی یادیں تازہ تھیں۔ وہ زمانہ علم و ادب کی روشنی کا تھا۔ اس لئے کالجوں میں بھی ایسے اساتذہ کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کیا جاتا تھا جن سے کوئی ادبی روایت یا وقار وابستہ ہو۔ خود اسلامیہ کالج میں ایسے اساتذہ موجود تھے جو اپنے مضمون پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہی دنوں دوستوں میں مولانا روحی صاحب کی ادبی وجاہت اور تبحرِ علمی کا چرچا عام تھا۔ ضمیر جعفری نے پہلی بار اُن کا تذکرہ کیا، اُسی مجلس میں تابش صدیقی اور ضمیر کے چچازاد بھائی منظور بھی تھے۔ اس لئے وہ نام میرے ذہن کی لوح پر ایک ایسا نقش بن کر رہ گیا جسے میں کئی سالوں کے بعد بھی فراموش نہیں کر سکا۔ ایک دن مولانا عمر، جو اُس زمانے میں اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے، کی قناعت پسندی، علم دوستی اور دبدبے کا ذکر چل نکلا، ایک دوست نے مولانا روحی مرحوم کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ واقعہ سنایا:

اسلامیہ کالج کے پرنسپل مارٹن صاحب تھے۔ وہی مارٹن صاحب جن کی گرائمر ہم کالج میں پڑھتے تھے۔ انہی دنوں روحی صاحب اسلامیہ کالج کے سٹاف پر تھے۔ ایک دن وہ حبیبیہ ہال کے سامنے چند طلباء کو پڑھا رہے تھے۔ کوئی انگریز مارٹن صاحب سے ملنے آئے۔ مولانا صاحب سے دفتر کے متعلق پوچھا۔ روحی صاحب غالباً کسی عربی قصیدے کی تقطیع میں مصروف تھے۔ انہوں نے زور سے کہا:

"ہوگا کہیں بیچ دفتر کے، جاؤ"

انگریز حیرت سے دیکھتا رہا کہ یہ بوڑھا آدمی عجیب ہے، جو انگریز سے مرعوب نہیں ہوا۔ سوال پھر دہرایا۔ مولوی صاحب برہم ہوئے۔ غالباً کسی طالب علم نے اُس انگریز کی راہنمائی کی۔ اُس نے پرنسپل سے امپیریلزم کے تاریخی احترام کے پیشِ نظر مولانا صاحب کے طرزِ تخاطب کو شکایت کا موضوع بنایا۔ غالباً یہ بھی کہا ہوگا کہ یہ کوئی سرپھرا مولوی ہے۔ لیکن مارٹن نے فوراً اُسے روک دیا اور کہا:

"He is a great scholar"

یہ لفظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد جب میں پروفیسر عبدالحق یا اُن کے برادرِ اکبر فضلِ حق کے متعلق سوچتا تو یہی الفاظ میرے تاثر کی تصدیق کرتے۔ غالباً یہ خانوادہ ہی Great Scholars کا تھا

غلام جیلانی اصغر

صوفی فضل کریم نقشبندی مجددی

(مصری شاہ، عزیز روڈ، گلی نمبر ۱۹ مکان نمبر ۲ لاہور)

حضرت مولانا روحی رحمہ اللہ تعالیٰ

علم و فضل، تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے سب آپ کی عزت کرتے تھے۔ آپ کی طبیعت میں سادگی اور انکساری تھی۔

ایک مرتبہ پروفیسر کرامت نے کلاس میں بیان کیا کہ جھوٹ، زنا کی نسبت بہت بڑا گناہ ہے۔ جب آپ نے یہ بات سنی تو آپ نے اس بات کو غلط کہا اور اس کو تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی بات نہ کرے۔ میں ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔

بقلم خود صوفی فضل کریم

تاثرات صاحبزادہ محبوب عالم

(سجادہ نشین دربار عالیہ، اوان شریف)

بوساطت سید نور محمد قادری (گجرات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب مولانا اصغر علی صاحب روحی رحمۃ اللہ علیہ حضرت صاحبزادہ محبوب عالم صاحب دام فیضہٗ کی نظر میں

۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء کی صبح کو راقم الحروف (سید نور محمد قادری) حضرت صاحبزادہ محبوب عالم صاحب دام فیضہٗ سجادہ نشین دربار عالیہ اوان شریف کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مولانا اصغر علی صاحب روحی رحمہ اللہ

کے عربی کلام پر اُن کے پوتے عزیزی ذوالفقار علی رانا پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے ہیں، چونکہ حضور مولانا صاحب سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے رانا صاحب چاہتے ہیں کہ آپ بھی مولانا کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات سے نوازیں میری گزارش پر حضرت نے فرمایا:

" مولانا اصغر علی صاحب روحی گجرات میں تو اکثر حضرت قاضی سلطان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۱۹ء) سے ملنے کے لئے تشریف لاتے لیکن آوان شریف میں انہیں صرف ایک بار دیکھا ہے۔ جب وہ پہلے پہل مولانا فضل حق سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ساکن حاجی والہ کی معیت میں تشریف لائے، چونکہ حضرت قاضی صاحب پہلے ہی سے مولانا کی علمی و دینی خدمات سے متعارف تھے، بڑی محبت اور احترام سے پیش آئے۔ گجرات میں جب بھی تشریف لاتے تو اُن کی حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے طویل ملاقات ہوتی اور قاضی صاحب بڑے خلوص اور محبت سے پیش آتے۔ حضرت صاحبزادہ نے مزید فرمایا: قاضی صاحب کا عزیز ہونے کی وجہ سے مولانا مجھ پر خاص شفقت فرماتے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے فرمایا: میں مولانا کی تقریباً تمام تصانیف و تالیفات کا مطالعہ کر چکا ہوں، وسیع النظری اور دقیق النظری اُن کا خاص جوہر ہے جو تقریباً ہر تخلیق میں نمایاں ہے۔ خصوصاً ان کی بے مثل تصنیف "مافی الاسلام" اسلام کو سمجھنے کے لئے دلیل راہ کا حکم رکھتی ہے۔ "

سید نور محمد قادری

خاکپائے حضرت محبوب عالم دام ظلہ

۱۵ر فروری ۱۹۸۱ء

محمد اشرف

ایم۔ فارمیسی

مصری شاہ، لاہور

میں جناب روحی صاحب کے پوتے ڈاکٹر رفیع الزمان سعید الحق کا بی فارمیسی میں ہم جماعت تھا سعید الحق صاحب سے ملنے کبھی گھر چلا جاتا تو جناب روحی صاحب کے دیدار کا شرف حاصل ہو جاتا۔ ایک بار جمعہ کے روز ان کے گھر گیا تو ڈاکٹر سعید الحق صاحب نماز جمعہ پڑھنے پاس ہی مسجد میں گئے اور مجھے بتایا کہ دادا جان

خطبہ جمعہ دیتے ہیں۔ آپ کا چہرہ مبارک نورانی تھا اور سفید ریش مبارک چہرے کے نور کو اور دوبالا کرتی تھی۔ جناب روحی صاحب کے پوتے ڈاکٹر سعید الحق صاحب اپنے دادا جان کی علمیت سے بڑے متاثر تھے اور ان کے دل میں اپنے دادا جان کی بڑی عزت تھی۔ ڈاکٹر سعید الحق کے والد محترم جناب فضل حق صاحب بھی اپنے والد محترم کی بڑی عزت کرتے تھے۔

محمد اشرف

حافظ محمد افضل فقیر ایم۔ اے

(محمود آٹو سٹور، نیلا گنبد لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے اس طرح یاد ہے کہ میں اسلامیہ کالج میں تھرڈ ائیر کا طالب علم تھا۔ حضرت مولانا اصغر علی روحی کا فارسی کلام پڑھنے کے بعد ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ مرحوم کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ وہ ان دنوں صاحبِ فراش تھے۔ شعر و سخن موضوعِ بحث بن گیا۔ انہوں نے فرمایا:

غالب کو عربی الفاظ پر ایسا عبور تام نصیب ہے کہ وہ عربی الفاظ کی تمام جزئیات اور لوازم کو بھی بوقتِ استعمال ملحوظ رکھتا ہے۔ بطورِ مثال مفاعلہ کا وزن دو یا دو سے زیادہ افراد کا متقاضی ہے۔ غالب نے معاملہ کا لفظ درج ذیل شعر میں نہایت صحت اور تناسب سے باندھا ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ؎ جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

حافظ محمد افضل فقیر

حافظ محمد شفیع مگھیانوی

(ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ ایگریکلچر ڈویژن، حکومت پاکستان، لاہور)

میرے والد صاحب مولوی غلام علی قبلہ حضرت مولانا کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ قبلہ مولانا

والد صاحب سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی ہر خواہش کو حتی المقدور پورا کرتے تھے۔ یہاں تک
کہ ایک دفعہ والد صاحب نے آپ سے درخواست کی کہ موسم گرما کی رخصتوں میں آپ جھنگ تشریف لائیں۔ ۱۹۰۰ء
میں جھنگ ریل سے ملا ہوا نہیں تھا اور کسی دوسری جگہ جانے کے لئے گاڑی لائل پور سے یا گوجرہ سے پکڑنی پڑتی تھی
اور گوجرہ سے جھنگ تک ۲۵ میل کا فاصلہ تانگے میں طے کرنا پڑتا تھا، جو کہ کافی تکلیف دہ ہوتا تھا لیکن حضرت
صاحب اتنے مشفق تھے کہ اپنے شاگرد کی خوشنودی کے لئے انہوں نے اس درخواست کو قبول فرمایا اور ہمارے
غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔ لیکن راستہ کی تکلیف کے بارے میں ایک رباعی فرمائی جو والد صاحب نے مجھے سنائی
تھی۔ جسکا پہلا شعر مجھے اب تک یاد ہے اور وہ یوں ہے:

؎ فلک می داشت یا روحی سر جنگ — کہ آوردش بہ تانگہ جانب جھنگ

....

افسوس کہ دوسرا شعر مجھے یاد نہیں رہا۔

چونکہ والد صاحب مولانا کے معتمد علیہ شاگردوں میں سے تھے۔ ایک دفعہ مولانا نے انہیں قادیان
بھیجا تاکہ مرزا صاحب کے حالات کا پتہ کریں۔ والد صاحب ایک ہفتہ کی رخصت لے کر قادیان گئے اور مرزا صاحب
کے ایک ہمسایہ کے ہاں ٹھہرے جو مرزا صاحب کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ ایک دن انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ
آج آپ نماز پڑھ کر جلدی آگئے ہیں، کیا وجہ ہے۔ والد صاحب نے کہا: آج مرزا صاحب بیمار ہیں اور وہ
جماعت پڑھانے کے لئے نہیں آسکے۔ اس شخص نے کہا: آیئے میں آپ کو ان کی بیماری کی حقیقت دکھاتا ہوں۔
چنانچہ وہ والد صاحب کو اپنے مکان کی چھت پر لے گئے اور چھپ کر دکھایا کہ مرزا صاحب کے ہاں مستورات
دوپٹے وغیرہ رنگ کر دھوپ میں ڈال رہی تھیں اور مرزا صاحب ان کی مدد میں مصروف ہیں۔ اس
شخص نے کہا کہ کل انہیں ایک شادی میں جانا ہے۔ اگر مرزا صاحب نماز پڑھانے چلے جاتے تو اتنے میں دھوپ
کا وقت جاتا رہتا اور کپڑے خشک نہ ہو سکتے اس لئے مرزا صاحب نے ان کی مدد کرنا ضروری خیال کیا اور
جماعت کے لئے مسجد میں نہ جاسکے

محمد شفیع

تاثرات

قریشی محمد عبداللہ شاہ مرحوم

ایڈووکیٹ سرگودھا

بذریعہ مرزا محمد منور (چیئرمین شعبۂ اقبالیات پنجاب یونیورسٹی لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرحوم قریشی محمد عبداللہ شاہ صاحب ایڈووکیٹ سرگودھا (متوفی ۱۹۶۰ء) جنگِ عظیم اول کے آغاز کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ انہیں حضرت مولانا اصغر علی روحی صاحب سے قلبی لگاؤ تھا اور اُن سے بہ دل و جان محبت کرتے تھے۔ میں مسمیٰ محمد منور، قریشی عبداللہ شاہ صاحب ایڈووکیٹ سرگودھا کے کم عمر دوستوں میں سے تھا اور میرا ان کا دوستانہ کوئی بائیس برس رہا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ قریشی عبداللہ شاہ صاحب کے دل میں اگر کسی استاد کا سب سے زیادہ احترام تھا تو وہ مولانا مرحوم تھے۔ ہاں، میٹرک کے اساتذہ میں سے مرحوم بابا فضل الٰہی صاحب کا ذکر بھی بڑی عقیدت اور شفقت سے کرتے تھے۔ بابا فضل الٰہی ضلع سرگودھا کے محسن تھے۔ سال ہا سال وہ شاہ پور میں ہیڈ ماسٹر رہے اور سرگودھا ایسے پسماندہ ضلع کو اپنی محنت اور توجہ سے نوازا۔

قریشی عبداللہ شاہ صاحب کی زبانی میں نے مولانا اصغر علی روحی صاحب کی باتیں بار ہا سنیں۔ میں نے مولانا اصغر علی روحی مرحوم کی کتاب "دبیرِ عجم" خود بڑی محنت سے پڑھی تھی۔ اس کی عبارت زور دار اور لفظی حسن و خوبی کے اعتبار سے نوادراتِ روزگار میں سے ایک قرار دی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ کتاب عام پڑھے لکھے لوگوں کے لئے مشکل بھی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں کبھی کبھی قریشی عبداللہ شاہ صاحب سے کہا کرتا تھا کہ "ادب اور اصولِ ادب پر میں نے اتنی خوبصورت اور اتنی مشکل کوئی اور کتاب نہیں دیکھی!" قریشی صاحب بعض اوقات دبیرِ عجم کے بعض صفحے الٹ پلٹ کر پڑھتے اور ہنس کر فرماتے:

" بھلا! مولانا کی گفتگو کی زبان بھی اتنی ہی دقیق، اتنی ہی ثقیل اور اتنی ہی مشکل تھی۔ تمہیں تو یہ

کتابی الفاظ دکھائی دیتے ہیں ۔ مگر ہمارے لئے تو یہ استعاعی ہیں ۔ مولانا کی عام گفتگو یہی تھی ۔ جس میں کہ دبیب مجم لکھی گئی ہے ۔ "

قریشی صاحب فرمایا کرتے تھے ۔ " حضرت مولانا مرحوم روحی صاحب اتنے جابر استاد تھے کہ ایک بار بی ۔ اے کے طلباء پر کسی سبب ناراض ہو گئے اور جلالی لہجہ میں فرمایا ــــــ اور وہ الفاظ گیا تھے بجلی کا کڑکا تھا ــــــ : " کوئی لڑکا کسی دروازے یا کھڑکی سے باہر نہ جائے ۔ باری باری ایک ایک کرکے ساری کلاس کو باہر نکالوں گا اور اسی دروازے سے نکلیں گے جس میں میں کھڑا ہوں ۔ " ــــــ چنانچہ مولانا لٹھ (عصا) لے کر دروازے پر کھڑے ہو گئے (یہ وہ وقت تھا جب شادی شدہ اور عیال دار حضرات میٹرک کے طالب علم ہوا کرتے تھے) ۔ کسی طالب علم کی ــــــ اور وہ بڑے کھاتے پیتے اور قد آور لوگ تھے ــــــ یہ جرأت نہ تھی کہ کسی اور دروازے سے نکل جائے یا کھڑکی میں سے کود سکے مسکنت کی تصویر بنے ہر طالب اسی دروازے پر آتا اور مولانا دونوں ہاتھوں سے کمر پر لٹھ برساتے ۔ اسی طرح ایک ایک طالب علم کی پٹائی کی ۔ مگر کسی کی زبان سے چوں تک نہ نکلی ۔

مولانا اگر کسی لڑکے سے ناراض ہو کر کلاس سے چلے جانے کو کہتے تو فرماتے :

" نظر آ دھکیلتا ہوا اپنے تئیں کمرے سے باہر ! " اس قسم کے جملے مولوی حضرات کے عربی فارسی کے ترجمے کا پرتو ہوتے تھے ۔ ایک طرح کا طنز مقصود تھا

قریشی عبداللہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا حقہ کے بڑے شائق تھے اور کڑوے سے کڑوا تمباکو بڑے ذوق و شوق سے منگوایا کرتے تھے ۔ کبھی کبھی شاہ پور کا کڑوا تمباکو قریشی صاحب ہی لایا کرتے تھے ۔ قریشی صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے بارہا مولانا کے لئے خود چلم بھری ۔ مجھ یہ بھی کہتے تھے کہ مولانا قریشی کے بجائے قرشی کہا کرتے تھے مولانا پنجابی نہیں بولتے تھے ۔ بات چیت صرف اردو میں ہوا کرتی تھی ۔ مولانا کے حضور بڑا محتاط رہنا پڑتا تھا بس ذرا غلطی ہوئی اور مولانا نے ہمارا رشتہ ابوجہل سے جوڑ دیا ۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریزوں نے مسلمان فوجی بھرتی کرنے کی خاطر علماء سے انگریزوں کے حق میں لڑنے کا جواز فتوی کی صورت میں طلب کیا ۔ سر شفیع مولانا کے پاس حاضر ہوئے اور رات کے کھانے کی دعوت دی مگر مولانا مرحوم نے انکار کر دیا ۔ عبداللہ شاہ کہتے ہیں کہ میں نے آہستہ سے کہا :

" مولانا ! آج شام تو فارغ ہیں ہی ، چلے چلیں گے ۔ حرج کیا ہے ؟ "

میں ان کا چیلہ یا بیٹا تو تھا ہی۔ اس قسم کے لقمے گفتگو میں ڈرتے ڈرتے ہی سہی دے دیا کرتا تھا۔
مولانا با دلِ نخواستہ مان گئے اور سر شفیع سواری بھیجنے کا وعدہ کرکے چلتے بنے۔ ان کے جانے کے بعد مولانا مجھ پر
برس پڑے: "نامعقول، خرِ نامشخص، قریشی! تمہارے پیٹ میں سر شفیع کی دعوت کے خیال سے ابال اُٹھ
رہے ہیں۔ نامعقول پیٹو! ساتھ مجھے بھی خواہ مخواہ گھسیٹا؟" میں نے بڑے ادب سے کہا: "مولانا! آپ فکر نہ کریں
آپ کھانے کی تکلیف بھی نہ کریں۔ میں آپ کا حصہ بھی خود ہی کھا لوں گا۔ سر شفیع اتنا بڑا آدمی ہے اور آپ
خوب آگاہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دعوت کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ بالآخر میں مولانا کے
ساتھ سر شفیع کی دعوت میں حسبِ وعدہ شریک ہو گیا۔

کھانے کے بعد جب لوگ ادھر ادھر بکھر گئے اور اکثر چلے گئے تو سر شفیع نے بڑے نیاز مندانہ اور
مدبرانہ لب و لہجہ میں جنگِ عظیم اول میں انگریزوں کی شکست کے نتائج پر گفتگو کی اور فتح کی صورت میں مسلمانوں کے
لئے ممکنہ مفادات پر اظہارِ خیال کیا۔ مولانا سمجھ گئے کہ قصہ کیا ہے۔ جب آخری حرفِ مطلب سر شفیع کے
لب پر آیا تو مولانا نے سر شفیع یا میاں صاحب کے بجائے کہا: "شفیع! جاؤ اپنے آقائے ولی نعمت سے جا کر
یہ کہہ دو کہ لاہور میں ایک سر پھرا ملا، جس کا نام یہ ہے، تمہارے حق میں فتویٰ دینے سے علی الاعلان انکاری ہے!"
قریشی عبداللہ شاہ کہتے ہیں کہ سر شفیع کا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن مولانا کا جلال ایسا تھا کہ سر شفیع
عالمِ ندیدگی کی ایک ادنیٰ سی نگاہ بھی حضرت مولانا کے چہرے پر نہ ڈال سکا۔ گویا سر شفیع کے ساتھ مولانا کا
وہ مکالمہ جو پرانے اہلِ لاہور کی یادوں میں اب تک محفوظ ہے، عبداللہ شاہ قریشی نے خود اپنے کانوں سے سنا اور
اس تاریخی منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اب مجھے یاد نہیں کہ سنہ کون سا تھا۔ میں نے مولانا کی وفات کی خبر پڑھی۔ شاید وہ گجرات
کے قریب کسی گاؤں میں راہگرائے فردوس ہوئے تھے ______ میں نے ذکر کیا تو اناللہ ______ کے بعد
قریشی عبداللہ شاہ بولے۔ حیرت ہے۔ مولانا اب فوت ہوئے۔ مجھے تو خیال بھی نہ تھا کہ مولانا اب تک زندہ ہیں ______
مجھے میں تو انہیں سالہا سال سے مرحوم و مغفور جان رہا تھا۔ حد ہے مولانا اب تک زندہ تھے۔ پھر تو لمبی عمر پائی ______
اے کاش معلوم ہوتا کہ حضرت تا حال زندہ ہیں، مگر وہ مفقود الخبر کیوں رہے۔ اتنے سال مفقود الخبر۔
حق یہ ہے کہ مولانا مرحوم استقامت، ایمان اور یقین کی زندہ مثال تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ علم کے وقار کے بھی
کما حقہٗ محافظ تھے۔ گویا ان کی روشن مثال اصحابِ استقامت اور اہلِ علم کے لئے آج بھی قابلِ تقلید ہے۔ بالخصوص ان لوگوں کے

لئے جن کا سوسائٹی میں دینی اعتبار سے احترام اور وقار ہو۔

محمد منور
شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔

چوہدری محمد علی

(سابق وزیر اعظم پاکستان)

السلام علیکم! آپ کا خط ملا مورخہ ۱۱/۹/۸۰۔ میں نے جو آپ کو خط لکھا وہ بالکل صحیح تھا
میرے چھوٹے بھائی کا نام محمد ذوالفقار ہے اور وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں اور قریباً دس ماہ تک واپس آئیں گے۔
مولانا روحی مرحوم سے غائبانہ تعارف تھا کہ وہ عربی کے بڑے عالم ہیں۔
محمد ذوالفقار بھی ان سے واقف نہیں تھے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں۔ واللہ اعلم
مختصر نویسی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے
میں تو ایک لاعلم آدمی ہوں۔ اس لئے معذور ہوں کہ آپ کے علمی کاموں میں آپ کی مدد کر سکوں۔

مخلص
محمد علی

۱؎ ذوالفقار صاحب کو خط لکھا گیا، اُن کی طرف سے جواب موصول ہوا۔ وہ اسلامیہ کالج میں نہیں پڑھتے رہے بلکہ وہ گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے اس لئے کوئی مفید مطلب بات نہیں بتا سکتے۔

حافظ محمد مظفر

سابق خطیب مسجد علی ھجویریؒ

(مولانا اصغر علی روحی مرحوم و مغفور)

چونکہ میرے ننہال بھاٹی دروازہ میں رہتے تھے اور جب کبھی وہاں جاتا تو نماز کے لئے پابندی تھی کہ چوڑی والی مسجد میں ادا کرنی ہے جہاں مولانا اصغر علی روحی رحمہ اللہ تعالیٰ نماز پڑھایا کرتے تھے اس لئے عموماً ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ بچپن میں تقریباً ۹½ سال کی عمر میں خدا نے مجھ پر نعمت عظمیٰ (حفظ قرآن) بخشی تھی۔ مذہب کی طرف رغبت مجھے دودھیال اور ننہال دونوں خاندانوں سے ورثے میں ملی تھی۔ اکثر مغرب کی نماز کے بعد مولانا صاحب کی خدمت میں بیٹھنے کا موقع ملتا، وہاں اور لوگ بھی بیٹھے ہوتے۔ روحی صاحب مجھے پیار سے فرماتے کہ میرا بیٹا قرآن پاک کی کوئی سورت سنائے گا؟ میں اُن کے حکم کی تعمیل کرتا اور کوئی نہ کوئی سورت تلاوت کرتا۔ مولوی صاحب اس سورت کی تفسیر بیان فرماتے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۵۳ء تک رہا۔ پھر وہاں سے نانی جان وفات پاگئیں اور ہمیں بھاٹی دروازے والا مکان چھوڑنا پڑا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جن لوگوں میں بیٹھا ہوں اور جن بزرگوں کی نصیحتیں سنیں اُن میں صرف تین علماء دیکھے، چوتھے کی ابھی تک تلاش ہے لیکن بے سود۔

وہ عالم یہ ہیں:

۱۔ مولانا اصغر علی روحی مرحوم

۲۔ مولانا غلام قادر مرحوم

۳۔ مفتی اعجاز ولی خان مرحوم

میں سب سے پہلے روحی صاحب مرحوم کے درس سے مستفید ہوا اور جتنا میں نے ان سے استفادہ کیا دوسروں سے نہیں۔ مولانا موصوف خود باعمل تھے اس لئے ہر وعظ میں عمل پر زور دیا کرتے تھے۔ آج تک اُن کے نقشِ قدم

پر چلنے کی کوشش کرتا رہا۔

مولانا صاحب کے گھر جانے کا اتفاق اس لئے نہیں ہوا کہ وہ مسجد میں ہی عموماً بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے تعلیم حزب الاحناف میں حاصل کی اُس وقت ابو البرکات مرحوم وہاں پڑھایا کرتے تھے۔

مولانا روحی مرحوم عموماً "انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم" پر زیادہ تر درس دیا کرتے تھے۔ نماز تقریباً مغرب اور عشاء کی اُن کی اقتداء میں پڑھا کرتا تھا۔ بعض وقت اگر اُن کی طبیعت ناساز ہوتی تو مجھے حکم فرماتے اور میں آگے کھڑا ہو جاتا۔

اُن کے علم و عمل میں من و عن مطابقت تھی۔ ایک بال برابر بھی اختلاف نہ تھا۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجسم نمونہ تھے۔ بچوں کے ساتھ ہمیشہ ہنس کر پیش آنا اُن کی عادت تھی۔

انجمن نعمانیہ میرے آباؤ اجداد نے قائم کی اور وہ پہلی پنجاب کی علمی درسگاہ تھی اور یہ پہلے معاون تھے۔ مالی، علمی اور عملی لحاظ سے اُن سے بڑھ کر کوئی معاون نہ تھا۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں عموماً نظمیں پڑھا کرتے تھے اور لیکچر دیتے تھے جو بڑا جامع ہوتا تھا۔

مولانا احمد علی لاہوری، مولوی محمد بخش مسلم، مولانا ابو البرکات اور مولوی غلام مرشد جیسی ہستیاں بھی اسی درسگاہ سے علم حاصل کر چکی ہیں۔

مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے عمل دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ زندگی کا مزہ اسی صورت میں ہے کہ موت کے بعد مخالف بھی آ کر روئے۔

حافظ محمد مظفر بقلم خود

ڈاکٹر نذیر احمد

(سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور)

ایک تاثر

یہ میری قسمت کی کوتاہی کہ میں باوجود اسلامیہ کالج کا طالب علم ہوتے کے حضرت مولانا کے حلقۂ درس

میں نے میٹرک سے ۱۹۲۰ء کے پنجاب کی ایک رائج الوقت ضرب المثل کے مطابق میں "سائنس کُتی" کا طالب علم تھا، اور حضرت مولانا "عربی شریف" کے استاد ہوتے تھے۔ اس بُعد المشرقین کے باوجود میں مولانا کی زیارت اور فیض سے بالکل محروم نہیں رہا۔ ان کے متعلق میرے تاثرات ایسی یادوں سے بندھے ہیں جو اب پچاس[50] سال پرانی ہو چکی ہیں۔ نصف صدی میں یادوں کے دھندلا جانے کی توقع تو خیر ایک طبعی امر ہے لیکن وہ "یادیں" بڑی گمراہ کن ہو سکتی ہیں جو بچپن کی باتوں اور اُن کی پچاس سالہ تکرار سے گویا "مینو فیکچر" یا تخلیق ہو جاتی ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ میرا خوف بے جا ہو اور دور اندیش قاری اپنے ذہن میں بھی میری ان یادوں سے پچاس سال کے مبالغے کا "discount" "ڈسکاؤنٹ" کر لیں۔

تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ کالج کی دوسری منزل پر بیالوجی کی لیبارٹری ہوتی تھی جہاں سردیوں کے موسم میں پریکٹیکل کرتے ہوئے ہمیں حضرت مولانا نیچے گراؤنڈ میں کرسی نشین نظر آیا کرتے۔ ان کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ آرام کرسی پر نیم اکڑوں بیٹھتے۔ جسم کا بوجھ کرسی کی پیٹھ پر کم اور اس کے کسی ایک بازو پر زیادہ ہوتا۔ کرسی کے دوسرے بازو کے ساتھ ان کی اونچی لمبی چھام چڑھی عصا ٹکی رہتی۔ سفید عمامہ زیب سر ہوتا اور سفید عبا میں جسم لپٹا ہوتا۔ جوتے کرسی کے نیچے پڑے رہتے۔ وہ ہمہ وقت سیاہ چشمہ لگائے رہتے؛ ہم نے کبھی انہیں ان کے بغیر نہیں دیکھا۔

مولانا آرام کرسی پر متمکن درس دیتے اور آٹھ دس شاگرد ایک نیم دائرے میں ان کے سامنے گھاس پر بیٹھے ہوتے۔ پیریڈ بجتا تو یہ شاگرد اٹھ جاتے اور ان کی جگہ نئے آ بیٹھتے۔ کبھی کبھی کوئی پرانا شاگرد بھی ادھر آ نکلتا۔ وہ مولانا کو سلام کرتا۔ مولانا فرماتے: اچھا، تو ہے اوے مخدومی بچے اور ہاں تو بھی آیا ہے سلامی بچے! فریدی بچے! نظامی بچے! پھر ہاتھ بڑھا کر ان میں سے کسی کا کان پکڑ لیتے اور اس کا سر نیچے کھینچ لیتے۔ تب عصا حرکت میں آتا۔ پیٹھ پر دو ایک ٹھونگے دیتے۔ پہلے پہل تو ہم یہ سمجھتے رہے کہ شاید ان پرانے شاگردوں کو کوئی بری گھڑی ادھر گھیر لاتی ہے کہ کالج کے صحن میں قدم دھرا نہیں کہ مولانا سے سامنا ہوا۔ لیکن آہستہ آہستہ کھلا کہ انہیں مولانا کے ہاتھوں مار کھانے کا چسکا ہے۔ فارغ التحصیل ہوئے برسوں گزرے، کب کے ڈگری لے چکے، پھر بھی کالج کی پھیرا پھیری سے نہیں گئے۔ کوئی تقریب نہیں تو یونہی کوئی پیغام اٹھا لائے۔ مولانا بھی سمجھ جاتے اور ان پر (عصائے) شفقت فرماتے۔

کالج میں اتوار کے اتوار صبح کے وقت وعظ کا دستور تھا۔ کسی اتوار مولانا کی بھی وعظ کہنے کی

باری آجاتی اور ان کی باری کیا آتی، مغربی تہذیب وتمدن کی شامت آجاتی۔ انگریز کی ہیبت ابھی تک قائم تھی اور مجلسِ وعظ میں انگریز پرنسپل اور نیم انگریز سٹاف بھی موجود ہوتا۔ لیکن مولانا "مغربی تہذیب کے دلدادوں" پر بے دھڑک تنقید کرتے۔ انہیں للکارتے اور انہیں شہوات و وساوسِ فرنگ کی غلامی کے عواقب سے ڈراتے۔ ایسی ہی ایک مجلسِ وعظ میں تاثیر بھی، جو اُن دنوں انگریزی پڑھانے پر مامور تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے اپنے خطبہ کے دوران میں وجدان کے معنی سمجھاتے ہوئے کوئی فارسی شعر پڑھ ڈالا۔ تاثیر نے فی البدیہہ داد دیتے ہوئے "واہ واہ" کا نعرہ لگایا مولانا متوجہ ہوئے اور فرمایا کر "لو دیکھو کیسے بہیمہ سے وجدان کی مثال پیدا ہوگئی۔ میں نے شعر پڑھا تو اس محفل میں بیٹھا ایک صاحبِ وجدان پھڑک اُٹھا لیکن باقی سب ....." اور یہاں انہوں نے اساتذہ اور طلبا کی صفوں کی طرف اشارہ کیا "... لیکن باقی سب اُلو بنے بیٹھے رہے!" کسی استاد نے اُلو کہے جانے پر احتجاج نہ کیا، کسی سٹوڈنٹ لیڈر نے اس پر سٹرائک نہ کی۔

مولانا کی عربی دانی کا شہرہ چار دانگ تھا۔ سبھی کہتے تھے کہ پورے ملک میں کوئی اُن سے بڑھ کر عربی زبان اور ادب میں دستگاہ نہیں رکھتا۔ یہ واقعہ جو میں اب بیان کرنے لگا ہوں، میری طالب علمی کے زمانے میں زیادہ پرانا نہ ہو چکا تھا، خاصا مشہور تھا۔ روایت تھی کہ کالج کے سٹاف روم میں کہیں سے شامت کا مارا مارگولیتھ آنکلا جس نے کبھی قرآن شریف پر کچھ تنقید کی تھی۔ کسی نے مولانا سے جا کر کہا کہ حضرت کچھ خبر بھی ہے سٹاف روم میں مارگولیتھ آیا بیٹھا ہے اور بڑ ہانکے جا رہا ہے۔ مولانا سنتے ہی لپکے اور سٹاف روم میں پہنچ کر مارگولیتھ سے یوں مخاطب ہوئے۔ اوئے تجھے کیا ہوا ہے ——— قرآن کا ناقد، پہلے یہ تو بتا کہ تجھے کچھ عربی بھی آتی ہے؟ میں جاہلیت کے شاعروں کا کلام تیرے آگے پڑھتا ہوں۔ کسی ایک شعر کا درست ترجمہ تو کر کے دکھاؤ۔ پھر جس کتاب کی زبان سے تو اتنا ناواقف ہے اسی پر تنقید کرنے چلا ہے! راوی نے بتایا کہ مارگولیتھ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور سوائے بغلیں جھانکنے کے کچھ نہ کر سکے۔

یہ وہ عالم و فاضل اور غیور و جسور استاد تھے جن سے میں نے براہِ راست کبھی کوئی سبق نہیں پڑھا۔ میرا سب سے بڑا تاثر ان کے متعلق یہ ہے کہ وہ بے حد وقار کے باوصف اپنے شاگردوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ساتھ ہی حق گوئی میں ایسے بے باک تھے کہ وقت کے بادشاہ سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ اللہ ان پر اپنی رحمت فرمائے۔

نذیر احمد

باب چہارم

(مطبوعہ مواد)

مطبوعہ مواد

مولانا مرحوم پر کوئی مستقل کتاب ابھی تک تصنیف نہیں کی گئی۔ تاہم اُن کی قابلیت اور شہرت کے باعث اُن کا ذکر مطبوعہ صورت میں کئی جگہ آیا ہے۔

جو کچھ بھی مجھے مطبوعہ صورت میں دستیاب ہو سکا اور جن مطبوعہ کتب و رسائل و اخبارات میں اُن کا ذکر ملتا ہے اُن کو حتی الوسع حروفِ ابجد کی ترتیب سے ذیل میں دیا گیا ہے اور اُن میں دیا گیا مواد بھی نقل کیا گیا ہے

مطبوعہ مواد

۱- اردو انسائیکلوپیڈیا (فیروز سنز) لاہور

مطبوعہ سنہ ۱۹۶۸ء صفحہ ۱۱۰ کالم ۲

اصغر علی رُوحی، مولانا (-۱۹۵۴ء)

ماہر السنہ شرقیہ، منشی فاضل، مولوی فاضل، ایم او ایل، بڑے قابل اور فاضل تھے۔ گمٹی بازار میں درس کلام مجید دیا کرتے تھے۔ اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ دبیر عجم، العروض والقوافی، ما فی الاسلام ایسی محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۹۰۳ء میں آپ نے لاہور سے "نور الہدیٰ"[1] کے نام سے ایک علمی، ادبی اور مذہبی ماہنامہ بھی جاری کیا۔ عربی اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔

۲- اردو ڈائجسٹ لاہور

شمارہ اگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۲ تا ۲۳

زیر عنوان: غلام رسول مہر کے ساتھ ایک شام (الطاف حسین قریشی)

سوال:- کالج میں آپ کے کون کون سے قابل اساتذہ تھے اور ان میں آپ سب سے زیادہ

ـــــــــــــــــــ

1. اس رسالے کا نام صرف "الہدیٰ" تھا، اور اس کا موضوع خالص مذہبی مضامین تھے۔

کن سے متاثر ہوئے؟

جواب :۔ یوں تو کالج کے اکثر پروفیسر اپنے اپنے مضمون میں یگانہ تھے مگر ان میں سے مولانا اصغر علی روحی، پروفیسر ایم۔ اے غنی، مسٹر ہنری مارٹن پرنسپل، خواجہ دل محمد اور مولانا محمد عمر خاں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر ایم۔ اے غنی شیکسپیئر کے ڈرامے اس انداز سے پڑھاتے تھے کہ وہ ڈرامے کے جیتے جاگتے کردار بن جاتے۔ مسٹر ہنری مارٹن کو الٰہ ملکی کے علاوہ انگریزی شاعری میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ جو لطف ان سے انگریزی نظمیں پڑھنے میں آیا زندگی بھر پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ ان سب اساتذہ میں مولانا روحی ایک خاص امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ مجھے ان کے قریب آنے کے مواقع شروع ہی سے میسر آ گئے تھے۔ میری فارسی کی علمیت دیکھتے ہوئے میرے استاد مولانا محمد عمر خاں نے میرے لئے فارسی کی کلاس میں حاضری کی پابندی اٹھا دی تھی اور مولانا روحی اس پیریڈ میں فارغ ہوتے تھے۔ وہ حقہ کے عادی تھے اس لئے ہوسٹل میں آ جاتے تھے۔ میں پہلے سے حقہ تیار رکھتا تھا۔ ریواز ہوسٹل کے صحن میں مناسب جگہ کرسی رکھ دی جاتی تھی وہ حقہ پیتے اور ہم چند نیازمند ارد گرد زمین پر بیٹھ کر ان کے ارفع خیالات سے مستفید ہوتے۔ انہیں تعلیم و تدریس سے دیوانگی کی حد تک شغف تھا۔ مولوی محمد شفیع صاحب ان کے بارے میں بتایا کرتے ہیں کہ وہ کالج سے نکلتے تو ہم ان کے ساتھ ساتھ ہو لیتے۔ وہ بازاروں اور کوچوں میں سے گزرتے ہوئے ہمیں سبق پڑھاتے چلے جاتے۔ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ کہاں چلے گئے یہ درویش جن کے قدموں کی آہٹ سے علم ادب کے پھول کھلا کرتے تھے۔ اور جن کی نظر سے فکر و خیال کے ان گنت چراغ روشن ہو جایا کرتے تھے۔ آہ ان ہستیوں کے اٹھ جانے کے ساتھ علم و تحقیق کی دنیا بھی ویران ہوتی چلی جا رہی ہے

۳۔ ارکانِ خمسہ

مؤلفہ سید نذیر علی مجددی صوت گڑھ ریاست بیکانیر

مطبع نور الانوار پریس میرٹھ سنہ ۱۹۰۶ء صفحہ ۱-۳

ایک عرصے سے طبیعت میں یہ خیال جوش زن تھا کہ کوئی ایسا رسالہ ہو کہ جس میں ارکانِ اسلام مجموعی طور سے اردو میں مندرج ہوں کیونکہ علم عربی کے مطولات دیکھنے کی تو ہم لوگوں میں

لیاقت نہیں رہی اور جو کچھ ہے دن بدن کم ہوتی جاتی ہے اور اردو میں ایسے رسالے کمیاب ہیں کہ جس سے ہم اردو خواں فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی عرصہ میں ایک اشتہار میری نظر سے گزرا جس کو میرے ارادہ کی تکمیل کا پیش خیمہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ جس سے معلوم ہوا کہ لاہور سے یکم ۱۹۰۷ء مئی ایک رسالہ اردو کا الھدٰی جاری ہوگا جس میں دینی مضامین وقتاً فوقتاً درج ہوا کریں گے۔ میں نے بھی اُسکی خریداری کی درخواست کی جو مہربانی فرما کر مولوی اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور مالک و ایڈیٹر رسالہ الھدٰی نے منظور کی اور میرا نام درج رجسٹر خریداران کر کے رسالہ جاری کر دیا۔ اُن کے مضامین واقعی ایسے نکلے کہ اُس امر کو پورا کرنے والے ہیں کہ جو میری طبیعت میں جوش زن تھا۔ خصوصاً مضامین مسائل نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج اُس میں مولوی احمد علی صاحب کی محنت کے نتیجہ سے درج ہوئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ اُس سے اردو خواں اچھا سبق لے سکیں اور ان مضامین کی جہاں تک اشاعت کی جائے وہ ہم لوگوں کے واسطے بہت مفید ہے۔ مگر رسالہ الھدٰی ایک ماہواری رسالہ ہے اور اُس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ جو خریداری یا خریدار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے بنظر ثواب واقفیت عامہ کے لئے اکثر مضامین کو رسالہ الھدٰی و دیگر کتب معتبرہ سے لے کر علیحدہ علیحدہ رکنوں پر تقسیم کیا اور اس مجموعہ کا نام ارکان خمسہ رکھا۔

۲۔ ہفت روزہ **استقلال** لاہور

ایڈیٹر ظہور عالم شہید

شمارہ ۱۵ فروری تا ۲۱ فروری ۱۹۸۳ء و شمارہ ۲۲ فروری تا ۲۸ فروری ۱۹۸۳ء

اس ہفت روزہ مجلہ میں خواجہ نسیم حسین انصاری نے بعنوان "مولانا اصغر علی روحی" ایک مضمون دو قسطوں میں لکھا ہے جس میں کئی نئے معلومات پائے جاتے ہیں۔ اس مضمون کے بعض واقعات مولانا کے سوانح حیات میں بعنوان " اخلاقی جرأت اور دینی غیرت " اور " مولانا کا حلقہ احباب" میں لکھے جا چکے ہیں اس لئے اس مضمون کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا مضمون تین صفحوں پر مشتمل ہے۔

۵۔ اسلام زندہ باد

مرتبہ عبدالمجید قرشی ـــــ سیرت بک ڈپو (پٹی) لاہور صفحہ ۲۱ - ۲۲

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی یہ روایت مولانا کے سوانح میں بعنوان "مولانا کا حلقہ احباب" گزر چکی ہے۔

۶۔ الإشراق لاہور / الاعلام لاہور

رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ

فرخ فاونڈیشن ۳ شارع حمید نظامی ـــ لاہور

راقم کا یہ مضمون دو قسطوں میں بعنوان 'السید مولانا اصغر علی الروحی المرحوم' چھپا تھا۔ اور یہ عربی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس مجلہ کا پہلا نام الاشراق تھا لیکن بعد میں اس کا نام الاعلام رکھا گیا۔ اس مضمون کے چار صفحات ہیں۔

۷۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام

مصنفہ محمد حنیف شاھد ایم اے

اس میں درج شدہ واقعات کا ذکر مولانا کے سوانح میں بعنوان "تحریک ترک موالات" گزر چکا ہے اور بعض دیگر صفحات جن میں مولانا کا ضمناً ذکر آتا ہے، حسب ذیل ہیں:

صفحہ ۳۰، ۳۷، ۱۸۰، ۱۸۶، ۱۸۷۔

۸۔ اقبال کی صحبت میں

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

صفحہ ۴۴

لیکچروں کی تیاری کے سلسلے میں علامہ اکثر علمائے دین سے مشورہ کرتے تھے۔ مولانا سید طلحہ مرحوم نے مشورہ دیا تھا کہ امام شاطبی کی کتاب الموافقات کا مطالعہ قیاس کے ضمن میں کیا جائے۔ اسی طرح مولانا اصغر علی روحی کو بھی میں ایک روز علامہ کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ کوٹھی کے درمیانی حصے میں بیٹھے حقہ ڈالے ہوئے ہاتھ میں تھی۔ مولانا نے بے تکلفی سے حقے کا رخ اپنی طرف کر لیا مگر معلوم ہوا کہ حقہ بجھا ہوا ہے۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ میں تو حقے سے محض باتیں کر رہا تھا۔ پھر علی بخش کو حقہ تازہ کر کے لانے کو کہا اور مولانا روحی اپنے مخصوص رنگ میں گفتگو کرنے لگے۔ بعض سوالوں کے سلسلے میں مولانا نے کہا کہ وہ لوگ بکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مترادفات سے ایک ہی طرح کے معنی مقصود ہیں۔ نہیں، ہر لفظ الگ الگ اپنا خاص معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔

صفحہ ۱۱۴

مولانا محمود حسن کے فتویٰ میں الحاق کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی خانقاہ کا فتویٰ یا مضمون ترکِ موالات کے مسئلے پر ایک عام بحث ہے۔ ایک دوست سے سنا کہ پروفیسر حاکم علی صاحب اسلامیہ کالج نے اپنے فتوے کی تصدیق میں مولوی احمد رضا صاحب بریلوی سے ایک فتویٰ حاصل کیا۔ پروفیسر خود بھی بریلی تشریف لے گئے تھے۔ لاہور آئے پر انہوں نے مولوی اصغر علی روحی سے استدعا کی کہ وہ بھی مولوی احمد رضا صاحب کے فتوے پر دستخط کر دیں۔ چونکہ حضرات دیوبند اور مولوی اشرف علی تھانوی صاحب پر اس فتوے میں سب و شتم کیا گیا تھا۔ اس واسطے مولوی اصغر علی صاحب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز

صفحہ ۳۰۲

اس زمانے میں لدھیانہ کے مدرسۂ اہلِ حدیث میں ایک مولوی محمد امین صاحب لدھیانی رہتے تھے

یہ مدرسہ میاں عبدالحی کے خسر میاں عبدالرحیم صاحب نے اپنے مکان سے ملحق مسجد میں قائم کر رکھا تھا
دوسرے روز علامہ کے فرمانے پر میں مولوی محمد امین مرحوم کو مدرسے سے علامہ کی خدمت میں لے آیا۔ وہ
علم معقولات کے ضمن میں نہایت مخصوص قابلیت رکھتے تھے۔ علامہ نے ان سے بھی اجماع کے موضوع پر گفتگو
کی۔ مگر ہنوز گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہم لدھیانہ سے لاہور آ گئے۔ پھر یہاں بھی یہ سلسلۂ
گفتگو برابر جاری رہا۔

چنانچہ لاہور آ کر میں علامہ کے حکم پر ان کی خدمت میں مولوی سید طٰہٰ، مولوی اصغر علی
روحی اور مولوی غلام مرشد صاحب کو لے کر گیا اور ان کے ساتھ طویل ملاقاتیں ہوئیں۔

۹۔ اقبال نامہ

حصہ اول یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال

مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صفحہ ۹۷

خط بنام سید سلیمان ندوی

اس میں درج شدہ خط کا ذکر مولانا کے سوانح میں بعنوان "مولانا کا حلقہ احباب"
گزر چکا ہے۔

۱۰۔ انجام آتھم

از میرزا غلام احمد قادیانی، طبع مطبع کریمی لاہور، دسمبر ۱۹۲۲ء

اس کتاب کے تمام واقعات جو مولانا مرحوم کے متعلق تھے اُن کے سوانح میں بعنوان
"مذاہب باطلہ کا رد" لکھے جا چکے ہیں۔

۱۱۔ ائمۂ تلبیس

از ابو القاسم رفیق دلاوری، مطبوعہ لاہور، ۷ جنوری ۱۹۳۷ء

مولانا کے متعلق وہ تمام مواد جو اس کتاب میں موجود ہے وہ مولانا کے سوانح میں
"مذاہب باطلہ کا رد" کے عنوان سے لکھا جا چکا ہے۔

۱۲- ماہنامہ **بینات** کراچی فروری ۱۹۷۷ء

سرپرست : مولانا محمد یوسف بنوری

زیر عنوان : پروفیسر مولانا اصغر علی روحی از قاری فیوض الرحمن

آپ ۱۸۷۰ء کے قریب کٹھالہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا اسم گرامی قاضی شمس الدین تھا۔ دس بارہ سال کے تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم گجرات ہی میں حاصل کی۔ پھر لاہور آ کر ایک جید عالم دین سے پڑھتے رہے۔ انہی کی ترغیب پر اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور "مولوی" "مولوی عالم" "مولوی فاضل" "منشی" اور "منشی فاضل" اور "منشی عالم" کے امتحانات میں نمایاں کامیابی پر یونیورسٹی سے انعامات حاصل کئے۔ اورینٹل کالج میں دیگر اساتذہ کے علاوہ آپ نے سب سے زیادہ فیض حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کیا۔ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ آپ امتحانات سے فارغ ہو گئے۔

تدریس : فراغت تعلیم کے بعد انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں تدریس پر مامور ہوئے۔ جب اسلامیہ کالج کی بنا رکھی گئی تو آپ کی سروس کالج میں منتقل کر دی گئی۔ آپ عربی اور دینیات کی تدریس کرتے رہے۔

دسمبر ۱۹۳۱ء کو کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آپ پہلے استاذ ہیں جن کی بے مثال خدمات کے پیشِ نظر کالج کونسل کے فیصلہ کے مطابق آپ کو ۳۰۰ روپے پنشن دی گئی جو تاحیات ملتی رہی۔

تصانیف : تدریس کے ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ذیل میں آپ کی تصانیف اور تراجم کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- الجفاء والوفاء : یہ حافظ ابن قیم کی "الداء والدواء" کا اردو میں ترجمہ ہے جو ۱۸ × ۲۲ / ۸ سائز کے ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ چودھری قمر الدین صاحب کے اہتمام سے ۱۳۳۱ھ میں لاہور سے شائع ہوا۔

۲۔ امام غزالی کے رسائل "حکمت بالغہ" "نعم التعویذ" وغیرہ کے اردو ترجمے۔
۳۔ شرح اسماء اللہ الحسنیٰ! ۱۳۲۹ھ میں مولوی کریم بخش صاحب کے اہتمام سے ۱۸/۲۲ سائز کے ۲۰۸ صفحات پر شائع ہوئی۔ اس کے آخر میں آپ کا ایک عربی قصیدہ بھی ہے۔
۴۔ ارمغانِ احباب (فارسی قصیدہ) ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں ۱۶ صفحات پر شائع ہوا۔
۵۔ قصیدہ ملت آشوب! ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں ۳۲ صفحات پر شائع ہوا۔
۶۔ دبیرِ عجم۔ یہ کتاب فارسی زبان کے فن فصاحت و بلاغت میں پہلی کتاب ہے جو یونیورسٹی کے امتحانات میں داخلِ نصاب رہی۔
۷۔ تجلیات! یہ بوعلی سینا کی کتاب "اشارات" کا اردو ترجمہ ہے۔
۸۔ عافی الاسلام! جلد اول بڑے سائز کے ۷۱۲ صفحات میں ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی اور جلد دوم ۴۸۴ صفحات پر، یہ اسلام پر عصرِ جدید کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات کا مدلل اور عمدہ جواب ہے۔
۹۔ امیر الکلام من کلام الامام! کلمات طیبات حضرت علیؓ کا یہ اردو ترجمہ ہے جو حکمت و دانش سے پُر ہے۔
۱۰۔ سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام! (اردو) ۲۰۰ صفحات
۱۱۔ العروض والقوافی (فارسی شاعری کے متعلق) ۱۵۰ صفحات
۱۲۔ آخری دو پاروں کی تفسیر! جو قسط وار آپ کے ماہنامہ "الہدیٰ" میں شائع ہوئی۔
۱۳۔ دیوان الروحی (عربی)
۱۴۔ دیوان الروحی (فارسی)

وصال: ۱۹۵۴ء میں آپ کا لاہور میں انتقال ہوا۔

اولاد: ایک دختر اور پانچ فرزند۔ مولوی فضل حق صاحب، حافظ عبد الحق صاحب، ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق صاحب، ڈاکٹر رانا بہاء الحق صاحب اور مظہر الحق صاحب یادگار چھوڑے۔

شاعری: آپ عربی اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ یہاں آپ کے دیوان میں سے صرف ایک نعتیہ قصیدہ پیش کیا جاتا ہے۔

(اُن کا یہ قصیدہ شروع دیوان میں "نعتیہ ہمزیہ قصیدہ" دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ پرشین کمپوزیشن

از علم الدین صاحب ایم۔ اے (سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لودھیانہ) مطبوعہ لاہور ۱۹۳۶ء صفحہ ۱

آخر میں مجھ کو اپنے استاد مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مجھ کو کئی لغزشوں پر مطلع فرما کر ممنون فرمایا۔ خدا ایسے ادب پرور فاضل کو حیات دراز ارزانی کرے۔ جن کی نسبت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی معلومات زیادہ ہمہ گیر ہیں یا مذاق زیادہ سلیم۔

۱۴۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند

مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۲ء دوسری جلد صفحہ ۱۱۴

مولانا اصغر علی روحی

مولانا اصغر علی روحی اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر رہے۔ مولانا عربی زبان و ادب کے فاضل اور اسلامی علوم کے ماہر تھے۔ ۱۹۵۴ء میں فوت ہو گئے۔ دبیر عجم، العروض و القوافی، اور ماقی الاسلام ان کی محققانہ تصانیف ہیں۔ مولانا نے ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ایک ماہنامہ "الہدیٰ" بھی جاری کیا تھا جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

۱۵۔ تذکرہ اکابر اہل سنت (پاکستان)

مرتبہ محمد عبد الحکیم شرف قادری جلد اول مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء صفحہ ۶۰-۶۲

سحبانِ عصر مولانا علامہ اصغر علی روحی رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مولانا اصغر علی روحی ابن مولانا قاضی شمس الدین ابن میاں پیر بخش بن رکن الدین (رحمہم اللہ تعالیٰ) ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں دریائے چناب کے کنارے واقع قصبہ کنجاہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آئے اور اپنے دور کے ممتاز فضلاء مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولوی عبدالحکیم کلانوری اور مولوی قاضی ظفر الدین سے استفادہ کر کے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے اور ایم او ایل کی ڈگری حاصل کی۔

علامہ اصغر علی روحی اورینٹل کالج، لاہور کے پروفیسر رہے، پھر ۱۸۹۲ء سے ۱۹۳۱ء تک[1] اسلامیہ کالج لاہور کے شعبہ عربی کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد اگرچہ پیرانہ سالی کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے لیکن انجمن حمایت اسلام (جس کے زیرِ انتظام اسلامیہ کالج جاری تھا) نے از راہ قدر دانی چار صد روپیہ مشاہرہ تاحیات مقرر کر دیا۔ حضرت علامہ روحی تمام زندگی شریعتِ مبارکہ کے پابند اور ظاہری تکلفات سے بے نیاز رہے۔ انہیں عربی اور فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا اور دونوں زبانوں میں بلا تکلف شعر کہتے تھے۔

بڑے بڑے اہل علم کے آپ سے نیازمندانہ تعلقات تھے۔ مکرمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"عربی اور فارسی ادب میں یکتائے روزگار تھے۔ ایسی قابلیت کے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔ فضلائے عہد آپ کی فضیلتِ علمی کے مدّاح و معترف تھے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال بھی بسا اوقات آپ سے استفادہ کرتے تھے ...... جب مرزا قادیانی نے غلط سلط عربی میں نام نہاد قصیدہ اعجازیہ لکھ کر ڈینگیں مارنا شروع کیں تو علامہ روحی نے فی الفور اس کا جواب لکھ کر پیسہ اخبار، لاہور میں شائع کرا دیا تھا۔"

اردو انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ فیروز سنز میں ہے:۔

[1] ۱۹۳۱ء

"بڑے فاضل اور قابل تھے، گمٹی بازار لاہور میں درسِ کلامِ مجید دیا کرتے تھے۔"

۱۹۰۳ء میں آپ نے لاہور سے ایک علمی و ادبی پرچہ الھدیٰ جاری کیا جس میں تفسیرِ قرآن، تاریخ اسلام اور تصوف پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ علامہ دو[1] سال اس کے مدیرِ مسئول رہے۔

علامہ اصغر علی روحی نے تصانیف کا قابلِ قدر ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ چند مطبوعہ تصانیف (یہ کتابیں لاہور سے شائع ہوئیں) یہ ہیں:-

	نام	موضوع	زبان	صفحات	سنہ
۱۔	دبیرِ عجم	فنِ بلاغت و تنقید	فارسی	۸۰۴	(مطبوعہ ۱۹۳۶ء)
۲۔	العروض والقوافی	علمِ عروض	اردو	۱۴۴	۱۹۳۶ء
۳۔	ترجمہ نصیحۃ التلمیذ از امام غزالی	"	"	۳۶	۱۳۲۷ھ
۴۔	ترجمہ قصیدہ بُردہ	"	"	۱۸۲	۱۳۲۶ھ
۵۔	امیر الکلام من کلام الامام	"	"	۱۲۸	۱۳۲۲ھ
۶۔	شرح اسماءِ حسنیٰ	"	"	۲۴۸	۱۳۲۹ھ
۷۔	سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام، رد عیسائیت	"	"	۱۲۴	۱۳۲۰ھ
۸۔	مافی الاسلام (اسلامی عقائد و احکام) دو جلد	"	"	۱۲۰۰	۱۳۵۰ھ

ان کے علاوہ بعض تصانیف فارسی دیوان چھ ہزار اشعار پر مشتمل اور دیوان عربی پانچسو اشعار پر مشتمل، تفسیر سورہ یٰسین، آخری دو پاروں کی تفسیر اور خطبات عربی ابھی منتظرِ اشاعت ہیں۔ حضرت علامہ روحی کے فرزند ارجمند ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق، ادب عربی کے مسلم فاضل ہیں اور اپنے والدِ گرامی کے کلام کی ترتیب و اشاعت میں کوشاں ہیں۔

حضرت علامہ روحیؒ کا وصال ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں ہوا۔ آپ کا مزار کھلی میں مسجد سے ملحق، برلبِ شاہراہِ عظیم (جی۔ٹی۔ روڈ) واقع ہے۔

(بعض دیگر صفحات جن میں مولانا کا ضمناً ذکر آتا ہے حسب ذیل ہیں: ۵۰، ۹۵، ۲۶۴، ۳۱۳، ۳۷۰)

[1] دس سال

۱۶- تذکرہ
علماء اہل سنّت و جماعت

ترتیب و تالیف : علامہ اقبال احمد فاروقی ، مطبوعہ لاہور ، جنوری ۱۹۷۵ء

اس کتاب میں مولانا مرحوم و مغفور کے علیحدہ حالات نہیں دیئے گئے بلکہ مختلف صفحات پر اُن کا ضمناً ذکر آتا ہے جو حسب ذیل ہیں : ۲۴۱-۲۴۲ ، ۲۵۰ - ۲۵۱ (ان صفحات پر مدرسہ حمیدیہ کے متعلق لکھا گیا ہے ۔ اس کا ذکر مولانا کے سوانح میں " ملازمت کے علاوہ دیگر مشاغل " ہو چکا ہے) ، ۲۶۱ ، ۲۸۵ ، ۲۹۳ ، ۳۰۰ -

۱۷- تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی)

تالیف : خواجہ عبدالرشید ، مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی ۱۳۴۶ھ صفحہ ۱۶۱

(۱۶۹) روحی ۔ اصغر علی گجراتی

مولوی اصغر علی روحی در دھی بنام کتھالہ در نواحی گجرات بسر می برد ۔ اسم پدرش مولوی شمس الدین بود ۔ او بعد از پایان تحصیلات خود در دانشکدۂ اسلامیہ ، لاہور بعنوان دانشیار زبان فارسی و عربی استخدام شد ۔ شعر فارسی بخوبی ، ہرچہ تمامتر میگفت ۔ دیوانش دارای قصائدی است کہ بروش استاد سخن انوری سرودہ است ۔ اشعاری چند از قصیدہ ای کہ در مدح حضرت پیغمبر سرودہ است درج میگردد :

اس کے بعد فارسی نعتیہ قصیدہ میں سے چند اشعار دیئے گئے ہیں ۔

۱۸- تذکرہ علمائے پنجاب

از اختر راہی ، جلد اول ، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۱۴-۱۱۵

اصغر علی رُوحی

مولانا اصغر علی روحیؔ بن مولانا شمس الدین بن میاں پیر بخش بن رکن الدین م ۱۳۸۴ھ

۶۸-۱۸۶۷ء میں موضع کٹھالہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ مولانا قاضی شمس الدین اپنے علاقے کے نمایاں علماء میں سے تھے۔ مولانا روحی کا بچپن تھا کہ اُن کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔

مولانا روحی ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ اُن کے اساتذہ میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۳۰۴ھ) مولانا عبداللہ ٹونکی (م ۱۳۳۸ھ) اور قاضی ظفرالدین جیسے فضلائے وقت شامل ہیں۔ اورینٹل کالج سے ایم او ایل کی سند بھی حاصل کی تھی۔

۱۸۹۲ء/ ۱۰-۱۳۰۹ھ میں اسلامیہ کالج لاہور کے شعبۂ عربی و علوم اسلامیہ میں بطور لیکچرار کام شروع کیا اور زندگی کا بہترین حصہ کالج میں گزارا۔ ۱۹۴۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور (جو کالج کا انتظام چلا رہی تھی) نے مولانا روحی کی علمی و تدریسی خدمات کے پیشِ نظر چار سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ تاحیات مقرر کر دیا۔ مولانا روحی علمی و دینی سرگرمیوں میں مصروف ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء میں فوت ہوئے۔ اُن کی آخری آرام گاہ کٹھالہ میں مسجد کے ملحق اور سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مرحوم کے فرزند ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق جیّد عالم اور صاحبِ نظر استاد تھے۔

مولانا روحی نے مندرجہ ذیل کتب لکھی ہیں:

۱- رسالہ سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ الاٴیام (مطبوعہ ۱۳۲۰ھ) ۲- امیر الکلام من کلام الامام (مطبوعہ ۱۳۲۲ھ) ۳- شرح قصیدہ بردہ (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ) ۴- ترجمہ نصیحۃ التلمیذ (امام غزالی) (مطبوعہ ۱۳۲۷ھ) ۵- الآیۃ الکبریٰ فی شرح الاسماء الحسنیٰ (مطبوعہ ۱۳۲۹ھ) ۶- الجفاء والوفاء، "حافظ ابن قیم جوزیہ حنبلی دمشقی کی تالیف" الجواب الکافی لمن سئل عن الدواء الشافی معروف بہ الداء والدواء کا اردو ترجمہ" (مطبوعہ ۱۳۳۱ھ) ۷- مافی الاسلام (دو جلد) (مطبوعہ ۱۳۵۰ھ) ۸- دبیرِ عجم در فن بلاغت، فارسی (مطبوعہ ۱۳۵۵ھ)، ۹- العروض والقوافی (مطبوعہ ۱۳۵۵) ۱۰- ارمغانِ احباب "فارسی قصیدہ" (مطبوعہ ۱۳۹۵ھ) ۱۱- تفسیرِ روحی "سورۂ یٰسین کی تفسیر" (مطبوعہ ۱۳۹۶ھ) ۱۲- حکمت بالغہ۔ امام غزالی کے ایک مکتوب بنام سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کا اردو ترجمہ (مطبوعہ

سال ہٰذا(رد) ۱۳ - تجلیات شرح اشارات بوعلی سینا ۔

مندرجہ ذیل کتب منتظرِ اشاعت ہیں:

۱۴ - تفسیر پارہ تبارک الذی و عم ۔ ۱۵ - خطبات (عربی) ۱۶ - دیوان فارسی

۱۷ - دیوان عربی

مولانا روحی نے ۱۹۰۳ء میں ایک وقیع دینی ماہنامہ "الہدیٰ" جاری کیا تھا جو تقریباً دو[1] سال اُن کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ۔ اس میں اُن کے کئی مضامین طبع ہوئے جو یکجا نہیں ہُوئے ۔ مولانا روحی عربی اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے ۔

۱۹ - تعارف نامہ (پروفیسر قریشی احمد حسین احمد قلعداری)

از حکیم پیر عبدالواحد بخاری کنجاہی (گجرات) مطبوعہ گجرات ۱۹۷۳ء صفحہ ۳

مولوی اصغر علی روحی کہا کرتے تھے : "میں نے ایک بار علمائے لاہور کا تذکرہ مرتب کرنا چاہا اور علماء کی فہرست تیار کی تو ان میں سے اسی فیصد علماء قلعدار سے فیض یاب تھے ۔"

۲۰ - تفسیر رُوحی

سورۃ یٰسٓ

تالیف، مولانا اصغر علی روحی رحمہ اللہ مطبوعہ المکتبۃ العلمیۃ - لاہور ۱۹۷۶ء صفحہ ۱ — ۳

اس کے شروع میں مکتبہ علمیہ لیک روڈ کے مالک مولوی عبید الحق ندوی صاحب نے اس کتابچہ کا تعارف کراتے ہُوئے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :

حضرت مولانا اصغر علی روحی مرحوم و مغفور کو جاننے والے ابھی کچھ اصحاب زندہ ہیں ۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۵۴ء میں انتقال فرمایا ۔ آپ تقریباً ۴۰ سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں عربی زبان اور دینیات کے استاد رہے اور ہزاروں طالبان علم نے آپ سے فیض پایا اور دینی عقائد و

[1] دس سال

اعمال سے متعلق آپ سے صحیح علم حاصل کیا۔ کلاس لیکچر کے علاوہ کالج کی ہفتہ وار مجلس وعظ
میں آپ نہایت شد و مد سے ملحدانہ اور نیچریانہ عقائد باطلہ کا رد کرتے اور عقلی و نقلی دلائل سے
قرآن مجید اور سنتِ نبویہ کو صحیح شکل میں پیش کرتے۔ آپ نے اپنے چالیس سالہ تجربہ کی بنا پر
انگریزی خواندہ اور مغرب کے دلدادہ نوجوانوں کی نفسیات کا خوب مطالعہ کیا اور اسلام پر
ان کے اعتراضات اور اوہام باطلہ پر آگاہ ہو کر ان کے جوابات دیتے جس کی وجہ سے بے شمار
بدعقیدہ طالبانِ علم کو آپ نے راہ راست پر ڈال کر ان کی کایا پلٹ دی۔ آپ نے سالہا سال لاہور
کی مختلف مساجد میں درس قرآن و حدیث کا سلسلہ جاری رکھا اور پنجاب کے مختلف شہروں
میں اپنے مواعظ حسنہ سے لوگوں کو مستفیض فرمایا۔ آپ اپنے زمانہ کے سربرآوردہ اور
ممتاز علماء دین میں سے تھے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے عقائد و اعمال اسلامیہ پر اپنی مشہور کتاب اردو
میں 'مافی الاسلام' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کی جو آج بھی مغربی تہذیب کے دلدادہ نوجوانوں
اور عامۃ المسلمین کے لئے اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی خاطر خضر راہ کا کام دیتی ہے۔ آپ کی
اور بھی متعدد تصانیف ہیں۔ عربی اور فارسی میں آپ کا ایک ضخیم دیوان بھی موجود ہے جو تاحال
طبع نہیں ہوا۔ لیکن "مافی الاسلام" آپ کی آخری تصنیف ہے جس میں اسلام کی تمام قسم کی
صحیح معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ آپ دس سال تک ایک ماہوار رسالہ "الھدیٰ"
کے نام سے شائع کرتے رہے جس میں عقائد صحیحہ اور دینی تعلیمات پر نہایت گراں قدر مضامین طبع
ہوتے اور عقائد باطلہ اور بدعات سیئہ کا رد کیا جاتا۔ دس سال کے بعد یہ رسالہ عوام الناس کی
بے شوقی کی وجہ سے بند ہو گیا۔

اس رسالہ کے آخری تین سالوں میں قرآن مجید کی تفسیر قسط وار شائع ہونی شروع
ہوئی تھی جس کی ابتداء انتیسویں[۲۹] پارہ سے کی گئی تھی کیونکہ آخری دو پاروں میں بعض نہایت اہم
سورتیں مثلاً سورۂ ملک، سورۂ مزمل، سورۂ واقعہ موجود ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی سورتیں
بھی ہیں جو روزانہ ہر نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ اگر یہ رسالہ جاری رہتا تو مولانا کا ارادہ تھا کہ تیسویں
پارے کی تفسیر ختم کرنے کے بعد ابتداء سے آخر تک کے سپاروں کی تفسیر بھی لکھی جائے مگر ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

رسالے میں تفسیر تیسویں پارے کی سورۂ بروج تک پہنچی تھی کہ رسالہ شائع ہونا بند ہو گیا اور اس طرح کام ادھورا رہ گیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے سورۂ یٰس کی فضیلت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی علیحدہ تفسیر بھی لکھی تھی جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ ہم نے مولانا کے پس ماندگان سے استدعا کی کہ وہ مولانا کے یہ تبرکات ہمیں رسالہ "مسلم" میں قسط وار طبع کرنے کی اجازت دیں تاکہ لوگ ان سے مستفید ہو سکیں۔

مولانا مرحوم کو جو لوگ جانتے ہیں وہ اس تفسیر کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھیں گے۔ میرے والد مرحوم عبدالحق عباسی بانی مدرسۃ البنات مولانا کے انتہائی مداحوں میں سے تھے اور ان کی علمی و دینی خدمات کے حد درجہ معترف تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزاءِ خیر دے اور جنت الفردوس میں درجات عالیہ سے نوازے۔ آمین۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر (محمد ضیاء الحق صوفی) صاحب کی نیت یہ ہے کہ وہ اس تفسیر کو اپنے والد مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کی غرض سے قسط وار رسالہ "مسلم" میں طبع کرا دیں۔ اس اشاعت میں اس کا آغاز سورۂ یٰس سے کیا جا رہا ہے۔ اس صورت کے بعد ان شاء اللہ آخری دو پاروں کی تفسیر بھی قسط وار چھپتی رہے گی۔ قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر مولانا مرحوم کے حق میں دعاء مغفرت کریں اور حتی الوسع اس کے مطالب کو غور سے سمجھنے کے بعد اپنے عقائد و اعمال کو صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ واللہ ولی التوفیق۔

عبیدالحق

۲۱۔ روزنامہ **جنگ** لاہور (۷ رجنوری ۱۹۸۲ء سے پہلے کا کیونکہ ان صفحات پر تاریخ درج نہیں جو میرے پاس محفوظ ہیں)

مضمون زیر عنوان: "جب میں طالب علم تھا" ڈاکٹر نذیر احمد کی یادیں خود اُن کی زبانی۔ ملاقات: منظور الٰہی

اسلامیہ کالج لاہور کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کہتے ہیں:

"یہاں ہم نے عربی کے زبردست عالم مولانا روحی سے بھی کسب فیض کیا جن کا تکیہ کلام مجھے آج بھی یاد ہے۔ "اے مغربی تہذیب کے دلدادہ کتو" یہ تکیہ کلام وہ اپنے ہر لیکچر یا وعظ میں ضرور استعمال کرتے تھے۔

۲۲- خزینۂ معرفت

المسمیٰ بہ

تذکرۂ عاشق ربانی شیر یزدانی رحمۃ اللہ علیہ مؤلف صوفی محمد ابراہیم قصوری

مطبوعہ: شرقپور ضلع شیخوپورہ ۸ نومبر ۱۹۷۶ء ص۲۲۳، ۳۶۶-۳۶۷

اس کتاب میں درج شدہ وہ واقعات جن سے مولانا مرحوم کا تعلق ہے، اُن کے سوانح میں بعنوان "اہل اللہ سے عقیدت" لکھے جا چکے ہیں۔

۲۳- دائرۃ الاصلاح لاہور کی پنج سالہ کارگزاری

مطبوعہ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ مطابق نومبر ۱۹۲۴ء ص۱۷

علمائے کرام کا شکریہ

اراکین دائرہ فاضل مدرسین دار العلوم نعمانیہ، اورینٹل کالج اور مدرسہ تکیہ سادھواں لاہور کے شکر گزار ہیں جنہوں نے شیعی علماء کے کشف مکائد میں علمی معاونت سے کبھی دریغ نہیں فرمایا۔ نیز ممنون احسان ہیں علامۂ زمان مولانا روحی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج۔ مولانا احمد علی صاحب خطیب مسجد شاہی۔ مولانا دیدار علی صاحب خطیب مسجد وزیر خاں۔ مولانا محمد یار صاحب امام مسجد طلائی۔ مفتی عبد القادر صاحب اور مفتی حبیب نواز صاحب امام مسجد کوچہ پیر گیلانیاں۔ کے جو مسائل دینی کے حل فرمانے اور فتوے دینے میں ہمیشہ دائرۃ کے معین و معاون رہے ہیں۔

۲۴- لاہور کے دو قدیم صوفی

مؤلفہ: میاں اخلاق احمد (ایم۔ اے) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء

پروفیسر سید کبیر احمد مظہر صاحب نے حرف ثانی کے عنوان سے اس کتاب کے صفحہ ۳۷ کے حاشیہ میں اپنے جدِ امجد مولوی محمد حبیب اللہ گجراتی کے حالات لکھتے ہوئے اُن کے تعلیمی کوائف یوں بیان کئے ہیں کہ

(۱) علوم دین، عربی و فارسی زبان و ادب از بحر العلوم مولانا محمد عالم آسی امرتسری و مولانا اصغر علی روحی حاصل کئے۔

۲۵۔ روئداد
انجمن نعمانیہ ۱۹۳۶ء

صفحہ ۷ تا ۸

اس روئداد میں ایک واقعہ جو تقریباً دو صفحوں پر مشتمل ہے مولانا روحی مرحوم سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اُن کے سوانح میں بعنوان " ملازمت کے علاوہ دیگر مشاغل " لکھا جا چکا ہے۔

۲۶۔ رئیس قادیان

مؤلفہ ابو القاسم رفیق دلاوری مطبوعہ لاہور ۱۹۴۶ء جلد دوم

اس کتاب میں جو مواد مولانا مرحوم کے متعلق ہے وہ اُن کے سوانح میں بعنوان " مذاہب باطلہ کا رد " شامل کر دیا گیا ہے۔

۲۷۔ ماہوار سب رنگ ڈائجسٹ جلد ۱۳ شمارہ ۱۰۱ - ۱۰۲

مضمون زیر عنوان تابہ کجا از ابو صمصام نقشبندی

سوانح و کرامات حضرت بشیر محمد شرقپوری، مئی جون ۱۹۸۲ء خاص شمارہ صفحہ ۱۰۰-۱۰۲

اس مضمون میں دو واقعات مولانا سے متعلق منسوب ہیں۔ یہ دونوں واقعات تھوڑے بہت ردوبدل سے اُن کے سوانح میں "اہل اللہ سے عقیدت" کے عنوان سے لکھے جا چکے ہیں۔

۲۸۔ روزنامہ سراج الاخبار جہلم

۵ / مارچ ۱۸۹۶ء صفحہ ۳

انجمن نعمانیہ لاہور کا چھٹا سالانہ جلسہ ۱۸ / فروری کو مسجد وزیر خان میں ہوا۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ نیز مندرجہ ذیل اصحاب نے لیکچر دئیے۔ مولوی اصغر علی صاحب، حکیم شجاع الدین صاحب سابق داروغہ نزول، مولوی نور الدین صاحب حکیم، مفتی سلیم اللہ صاحب، مولوی تاج الدین صاحب مختار۔ اس انجمن کو امیر کابل کی طرف سے ایک ہزار روپیہ سالانہ واسطے امداد سکول کے ملتا ہے۔

۱۲ / جون ۱۹۰۶

مسٹر ڈبلیو بیل صاحب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے اسلامیہ کالج لاہور کا پہلا وزیٹر ہونا منظور کیا ہے۔ عربی کے پروفیسر مولوی اصغر علی صاحب ہونگے اور بطور آنریری پروفیسر کے مسٹر فضل حسین صاحب بی۔ اے بیرسٹر انگریزی میں لیکچر دیا کریں گے۔

۲۹۔ سوانح

مرحوم خواجہ دل محمّد ایم۔ اے

مؤلفہ خواجہ گلزار محمد (پسرِ اکبر خواجہ صاحب موصوف) مطبوعہ خواجہ بک ڈپو اندرون بازار۔ لاہور

صفحہ ۳

خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ "میں سکول کے زمانۂ طالب علمی میں ہیڈ ماسٹر عبدالواحد صاحب اور کالج میں مولوی حاکم علی صاحب، ایم۔ اے غنی صاحب، مولوی اصغر علی رُوحی صاحب اور سر شیخ عبدالقادر سے بالخصوص متاثر ہوا۔"

۳۰۔ سیرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مرتبہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۴

ملازمت سے ۱۹۲۲ء میں سبکدوش ہو کر لاہور میں باقاعدہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی مجالس میں شامل ہوتا رہا اور رشتہ ملازمت بھی اسلامیہ کالج سے ہو گیا تھا۔ جہاں شہرۂ آفاق پروفیسران مولانا اصغر علی روحی صاحب، مولوی محمد عمر خان، قبلہ حافظ محمود خان شیرانی جیسوں کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔

۳۱۔ شعر العرب فی الگجرات

از پروفیسر قریشی احمد حسین احمد قلعداری

یہ مقالہ "گورنمنٹ کالج زمیندار" کے میگزین میں چھپا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۴۶

۸۔ اصغر علی روحی :-

کنجاہ ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام مولوی شمس الدین تھا۔ مولوی شمس الدین راقم کے دادا بزرگوار کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ روحی صاحب تحصیل علم کے بعد کافی عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر رہے۔ عربی فارسی پر بلا کا عبور تھا۔ ہر دو زبانوں میں ضخیم دیوانوں کے مالک ہیں۔ آپ کے اشعار دقیق اور پُر معنی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ایک عربی نعتیہ ہمزیہ قصیدہ نقل کیا گیا ہے جو اُن کے دیوان میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۲۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور

اپریل ۱۹۷۵ء

مضمون زیر عنوان : علامہ اقبال کے معززین لاہور سے روابط از محمد دین کلیم ص ۶۹ تا ۷۶

بیٹھک حکیم شہباز الدین

بیٹھک حکیم شہباز الدین (بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ) میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۲ء تک شاعروں اور ادیبوں کی معیاری محفلیں جمتی رہیں۔ ان میں علامہ اقبال کے علاوہ سر شہاب الدین۔ شیخ سر عبد القادر۔ سر میاں محمد شفیع۔ جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں۔ فقیر سید افتخار الدین۔ مولانا اصغر علی روحی۔ شمس العلماء مولانا محمد عبد اللہ ٹونکی۔ مولانا محمد حسن جالندھری

خواجہ رحیم بخش - سید محمد شاہ وکیل - شیخ گلاب دین - مولوی احمد دین وکیل - خواجہ امیر بخش - خواجہ نظام دین - ماسٹر مولا بخش - خواجہ کریم بخش - خواجہ فیروز الدین احمد بار ایٹ لاء - شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری - میرزا سلطان احمد - شہزادہ ارشد گورگانی - ناظر حسین ناظم وغیرہ شامل ہوا کرتے تھے اور شعر و شاعری سے حظ اٹھایا کرتے تھے۔

اس کے بعد صفحہ ۷۶ پر " مولانا اصغر علی روحی " کے عنوان کے تحت جو واقعہ درج ہے، وہ مولانا کے سوانح میں " مولانا کا حلقہ احباب " کے عنوان سے لکھا جا چکا ہے۔

۳۳ - مجلہ **عصر جدید** مرتبہ غلام ثقلین سیکرٹری صیغہ اصلاح تمدن ایجوکیشنل کانفرنس

جلد ۱ ع ۱۲ مقام اشاعت: مالیر کوٹلہ (پنجاب) دسمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵۲۲

مضمون بعنوان " ہمارے سنجیدہ رسالے اور تہذیب الاخلاق کا احیاء "

اس مجلہ کے مضمون کو مولانا کے سوانح میں " مذاہب باطلہ کا رد " کے عنوان سے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایک اعتراض ہے جو مجلہ الہدیٰ پر کیا گیا اور جس کا جواب الہدیٰ میں چھپ گیا تھا۔

۳۴ - علمائے ساہو والا (سیالکوٹ)

کا ایک غیر مطبوعہ

تذکرہ

از محمد اقبال مجددی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء (مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور)

ص ۲

ماضی قریب میں پنجاب نے ایسے ایسے جلیل القدر علماء و فضلاء پیدا کئے جن کی نظیر محال ہے - مگر ان کے حالات پر بھی کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا - حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی، مولانا غلام قادر بھیروی، علامہ محمد حسن فیضی، مولوی محمد الدین فوقی، مولانا سید عبداللہ غزنوی، مولانا غلام رسول قلعہ میہان سنگھ، قاضی ظفر الدین، مولوی محمد عبداللہ پنجابی، مولوی عبداللہ ٹونکی والے، مولانا غلام احمد

صدر مدرس مدرسہ نعمانیہ لاہور، مولانا نور احمد امرتسری، علامہ اصغر علی روحی، مولوی غلام رسول انھی والے ۔ مولوی حسین علی واں بھچراں، مولوی محمد حسین بٹالوی، مولانا محمد عالم آسی، مولوی کرم دین بھین والے، علمائے بگہ، علمائے گھوڑی اور چکوڑی وغیرہ کا جدید اصول تذکرہ نویسی کے تحت تذکرہ مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے ۔

۳۵۔ فارسی گویانِ پاکستان

مؤلف: دکتر سید سبط حسن رضوی

مطبوعہ: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی، ۱۹۷۴م ص ۳۶۱ ـ ۳۶۷

شرح احوال

مولانا اصغر علی متخلص بہ روحی فرزند مولانا قاضی شمس الدین ابن میاں پیر بخش ابن رکن الدین در شہرستان گجرات در قریۂ بہ نام "کتھالہ" کہ کنار رودخانۂ چناب واقع است به سال ۱۲۸۴ق/۱۸۶۷م متولد گشت ۔ دوران کودکی بپرورش در گذشت ۔ پس از تحصیلات مقدماتی برای تحصیلات عالیہ بہ لاہور آمد و از محضر اساتید معروف وقت مانند مولانا فیض الحسن سہارنپوری و مولوی مفتی عبداللہ ٹونکی و مولوی عبدالحکیم کلانوری و مولوی قاضی ظفر الدین استفادہ کرد و در تمام امتحانات عربی و فارسی دانشگاہ پنجاب موفقیت ممتازی بدست آورد ۔ روحی در دانشکدۂ اسلامیہ لاہور در سال ۱۸۹۲م بہ ریاست قسمت عربی و علوم دینی منصوب شد و وظائف تدریس را بہ نحو احسن انجام داد تا این کہ در سال ۱۹۲۱م متقاعد شد ولی انجمن حمایت اسلام کہ دانشکدۂ اسلامیہ را ادارہ می کرد، ماہیانہ چہار صد روپیہ بطور اختصاصی بعنوان قدردانی از خدماتش برای شخص وی مقرر کردہ بود کہ تا آخر عمر بہ وی پرداختہ می شد ۔ روحی در سال ۱۳۷۳ق/۱۹۵۴م از این جہان فانی درگذشت ۔ او مردی متدین و پابند شریعت بود و زندگانی او خیلی سادہ و خالی از تکلف و تجمل و تظاہر گذشت ۔ از دوستان روحی فضل حسین، مولوی محمد شفیع، شہاب الدین و علامہ اقبال قابل ذکر ہستند ۔

سبک و آثار

مولانا روحی عالم و استاد و دانشمند و ناطق و نویسنده و شاعر ارجمند بود و بر زبان و ادبیات عربی و فارسی تسلط کامل داشت و به هر دو زبان شعر می گفت ولی بیشتر آثار منظوم وی به زبان فارسی است. وی در رشته های مختلف شعر آثار وصفی، عشقی، انتقادی، و اخلاقی پر مغزی دارد و در فارسی غزل، قصیده، قطعه، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعی، مثنوی و فرد گفته است. بعضی از غزلیات و قصائدش را در بحور و قوافی عرفی، کاتبی، حافظ، امیر خسرو و منوچهری سروده است و در سرودن قصائد فارسی از سبک انوری پیروی می کرده است. او در عربی بیشتر قصائد نعتیه سروده است و چند خطبه هم به زبان عربی نوشته است.

روحی دو سال[۱] صاحب امتیاز و مدیر مسئول مجلهٔ "الهدیٰ" بود که در آن مضامین در بارهٔ تفسیر قرآن، تاریخ اسلام و تصوف و عرفان چاپ می شد.

وی در مجلهٔ الواعظ سخن طبع خود را آزموده است. در شعر فارسی پیرو سبک متقدمان است. او یکی از دانشمندان ادب شناس و محقق نامدار زمان معاصر است که تتبعات تاریخی و اسلامی وی از لحاظ صحت و دقت زبانزد همهٔ فضلاء و ادبای معاصر و هر یکی در زمینهٔ خود بدیع و بی همتا است.

روحی علوم صرف و نحو، معانی و بیان، عروض و قافیه، منطق و فلسفه، کلام و ادب را عمیقاً مطالعه کرده بود و ازین جهت شیوهٔ بیان او چه در نثر و چه در نظم عالمانه بود و در گفتارها و نوشته های خود بسا اوقات لغات ثقیل و اصطلاحات علمی را می آورد.

آثار

۱۔ دبیر عجم در فن بلاغت و تنقید	فارسی	۴۸۰ صفحه	لاهور	۱۹۳۶ م
۲۔ العروض والقوافی	اردو	۱۴۴	"	"	۱۹۳۶ م

---

[۱] دہ سال

۳- ترجمۂ نصیحۃ التلمیذ غزالی — اردو — ۳۶ صفحہ — لاہور — ۱۳۲۷ ھ ق

۴- ترجمۂ شرح قصیدۂ بردہ — // — ۱۸۲ — // — // — ۱۳۲۶ //

۵- امیر الکلام من کلام الامام — // — ۱۲۸ — // — // — ۱۳۲۲ //

کلمات قصار حضرت امیر (ع)

۶- ترجمۂ حکمت بالغہ — // — ۲۴ — // — // — سال طبع ندارد

مکتوب غزالی بہ سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی

۷- شرح اسماء الحسنیٰ — اردو — ۲۴۸ — // — // — ۱۳۲۹ ھ ق

۸- الجفاء والوفاء — // — ۳۱۰ — // — // — ۱۳۳۱ //

ترجمۂ الداء والدواء امام ابن قیم

۹- رسالہ سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام — اردو — ۱۲۴ — // — // — ۱۳۲۰ //

(ردّ ایراد مبلغین مسیحیت)

۱۰- ما فی الاسلام (دو جلد) — اردو — ۱۲۰۰ — // — // — ۱۳۵۰ //

عقائد و احکام عبادات اسلامی برای

رفع شکوک نوجوانان امروزی

۱۱- ارمغان احباب (قصیدہ فارسی) — فارسی — ۱۶ — // — // — ۱۳۹۵ //

آثار چاپ نشدہ

۱- تفسیر سورۂ یٰسین

۲- تفسیر جزوۂ بیست و نہم و سیم قرآن پاک.

۳- دیوان فارسی دارای شش هزار بیت است و فرزند روحی دکتر محمد ضیاء الحق مشغول تدوین و انتشار آن است.

۴- دیوان عربی دارای پانصد بیت

۵- خطبات عربی.

(اس کے بعد یکجا فارسی نظموں کے نمونے دیئے گئے ہیں)

۳۶۔ الفقیہ امرتسر

جلد ۱ عـ۱ مورخہ ۵ جولائی ۱۹۱۸ صـ۸ کالم ۱-۲

جلسہ فیروز پور

شہر فیروز پور میں ایک انجمن بنام اشاعۃ التعلیم قائم ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ فیروز پور کے مسلمان نادار طلباء کی تعلیم کے لئے وظائف بہم پہنچائے۔ اس کے سالانہ جلسہ میں مرزائی لیکچراروں نے مذہبی پہلو لے لیا۔ جس سے شہر کے اہل سنت ناراض ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جلسہ میں چندہ کم ہوا بلکہ آئندہ کے لئے انجمن سے لوگوں کی بیزاری کا خطرہ تھا۔ منتظمین انجمن نے اہل شہر کو خوش کرنے کے بعد تلافی مافات کی غرض سے یکم و ۲ جون گزشتہ کو ایک جلسہ کیا جس میں اعلیٰ انتظام و اہتمام تھا۔ دو دن کامل جلسہ رہا اور ہر روز رات کو ۱۲ بجے تک مجمع رہتا تھا۔ مولوی بشیر نواب صاحب کشمیری، مولانا مولوی غلام احمد صاحب اختر امرتسری، مولانا مولوی محبوب احمد عرف مولوی خیر شاہ صاحب میر واعظ امرتسری۔ قاضی حاجی مفضل احمد صاحب کورٹ انسپکٹر پنشنر۔ مولوی حاجی محمد حسین صاحب بی۔ اے کلارک آف دی کورٹ آف جج صاحب کرنال۔ بابو پیر بخش صاحب سیکرٹری انجمن تائید الاسلام لاہور۔ مولانا مولوی محمد اکرام الدین صاحب بخاری واعظ اسلام لاہور اور مولانا مولوی محمد اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے مرزائی عقائد کے رد میں موثر وعظ اور تقریریں کیں۔

اہل شہر نہایت محظوظ ہوئے اور تمام مقررین اور واعظین کی تقریر سے عموماً اور مولانا مولوی غلام احمد صاحب امرتسری و مولانا مولوی خیر شاہ صاحب کی تقریر سے خصوصاً بہت ہی خوش تھے۔ مرزائیوں نے جلسہ کو روکنے کی تدبیریں کیں مگر کامیاب نہ ہوئے۔ آخری تدبیر جلسہ کو درہم کرنے کی یہ سوچی کہ اتوار کے دن آ کر درخواست کر دی کہ عین جلسہ میں مناظرہ کا موقع دیا جاوے۔ چونکہ جلسہ صرف لوگوں کو مرزائی عقائد سے آگاہ کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس لئے منتظمین جلسہ نے موقع نہ دیا۔ مگر اہل شہر نے باین خیال کہ جلسہ کے بعد مرزائی شور مچا دیں گے کہ ہم کو مناظرہ کا موقع نہیں دیا گیا۔ اگلے دن مولانا مولوی غلام احمد اور مولوی خیر شاہ صاحب کو بغرض مناظرہ فیروز پور میں ٹھہرا لیا اور

مرزائیوں کو تحریری اطلاع دی اور شرائط مناظرہ پیش کئے اور علاوہ مسئلہ حیات مسیح کے مرزا صاحب کا اسلام نبوت اور دجالیت وغیرہ مسائل زیر بحث تجویز کئے اگر صرف مسئلہ حیات عیسیٰ رکھا جاتا تو وہ بڑے شوق سے میدان میں آتے لیکن چونکہ وہ جانتے ہیں کہ مرزا صاحب کی تصانیف سے مرزا صاحب نہ تو صادق ثابت ہو سکتے ہیں نہ مسلمان نہ نبی بلکہ الٹے دجال کذاب ثابت ہو جائیں گے۔ اس لئے دم نہ مار سکے اور مناظرہ کا شوق فوراً دب گیا اور مسلمانوں کو اس کامیابی پر خوشی منانے کا موقع مل گیا۔

(رقم ایک واقف حال)

۳۷- فیصلہ کن مناظرہ

از مولانا محمد منظور نعمانی ، مطبوعہ مکتبہ مدنیہ ۹ باغبانپورہ جدید گوجرانوالہ ۱۳۸۴ھ

ص ۳۳

اس کتاب میں شامل مواد مولانا کے سوانح میں بعنوان "مسلک" لکھا جا چکا ہے۔

۳۸- الکاویۃ علی الغاویۃ

مصنف و مؤلف: محمد عالم آسی ، مطبوعہ امرتسر ۱۹۳۰ء ص ۸۴-۸۵ و ۳۹۷-۳۹۸

اس کتاب میں درج شدہ وہ تمام واقعات جن کا مولانا کی ذات سے تعلق ہے اُن کے سوانح میں بعنوان "مذاہب باطلہ کا رد" لکھے جا چکے ہیں۔

۳۹- کریسنٹ

(میگزین اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور) جلد ۲۲ (سالنامہ ۱۹۳۰ء) ع ۹

مضمون از چیف ایڈیٹر صفحہ ۵-۸

حضرت مولانا مولوی محمد اصغر علی صاحب روحی

زمانہ پیدائش ۱۸۷۱ء ہے اور کٹھالہ ضلع گجرات (پنجاب) جو لب چناب واقع ہے۔ آپ

کا وطن مالوف ہے۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی شمس الدین صاحب مرحوم و مغفور مفتی وقت اور حاذق حکیم
تھے۔ درس و تدریس آپ کا مشغلہ تھا۔ مولانا صاحب نے صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل
کی۔ ۱۸۸۱ء میں لاہور تشریف لائے اور اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے۔ مولانا فیض رسول (فیض الحسن)
صاحب سہارنپوری اور مولوی محی الدین صاحب سے لاہور میں استفادہ کیا۔ بعد ازاں دہلی جا کر مولانا
نذیر حسین صاحب محدث سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ معقولات کی تکمیل کے لئے مولوی محمد علی صاحب
مدراسی سے مستفید ہوئے۔ ادبیات، تاریخ اور فلسفہ کلام سے آپ کو خاص شوق تھا۔ السنۂ
مشرقیہ کے امتحانات، منشی فاضل ۱۸۸٦ء میں، مولوی فاضل خاص امتیاز سے ۱۸۹۱ء میں
۱۸۹۲ء میں ایم، او، ایل پنجاب یونیورسٹی میں اول رہ کر پاس کئے۔ زمانۂ طالب علمی میں داخل
نصاب کتابوں کے علاوہ آپ دیگر کتب کا ہمیشہ مطالعہ فرماتے رہتے تھے۔ طلبا کو آپ کی یہ نصیحت ہے
کہ کبھی صرف کورس کی کتابوں پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ اساتذہ کی تجویز اور مشورے سے دیگر کتب کا
مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

بتاریخ یکم نومبر ۱۸۹۳ء میں آپ اسلامیہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس سے
بعد کے حالات آپ نے مندرجہ ذیل مصرعے میں ادا فرما دئیے ہیں

از ضعف بہر جا کہ نشستیم نشستیم

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اسلامیہ کالج کے مفاد پر کئی ایک ذاتی اور مالی لحاظ
سے گرانقدر فائدوں کو قربان کر دیا۔

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ دبیر عجم۔ فن بلاغت پر معرکۃ الآراء کتاب جو منشی فاضل کے نصاب میں داخل ہے۔
۲۔ الجفاء والوفاء۔ اس کتاب میں تہذیب و اخلاق پر مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔
۳۔ شرح اسمائے حسنیٰ۔
٤۔ امیر الکلام۔ حضرت علی کے اقوال کا ترجمہ ہے۔
۵۔ "عقائد اسلام پر ایک ناقدانہ نظر" ایک مبسوط اور مدلل کتاب عنقریب شائع
ہونے والی ہے۔

علاوہ ازیں آپ کامل دس سال تک مشہور مذہبی رسالہ "الھدیٰ" کے فرائض ادارت سرانجام دیتے رہے جسے ملک کے علم دوست حضرات نے بے حد پسند کیا۔ آپ صاحبِ دیوان ہیں۔ فارسی، اردو اور عربی میں بے شمار غزلیں لکھی ہیں۔ بطور نمونہ مندرجہ ذیل شعر جو بڑی مشکل سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:-

(اس کے بعد اُن کی کچھ نظمیں جو فارسی میں ہیں نقل کی گئی ہیں۔)

کریسنٹ جلد ۲۵ عدد ۵ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۰

مضمون زیر عنوان:- انجمن حمایت اسلام کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر — از مقبول بدخشانی

"۱۸۹۹ء اس سال کالج کے پروفیسروں کے وفد نے بھی بیرونجات کا دورہ کیا اور بالخصوص سب سے پہلا وفد مولٰنا اصغر علی صاحب کی قیادت میں .... شملہ گیا۔ وہاں مولٰنا کی لیاقت اور تبحرِ علمی کو دیکھ کر اہالیانِ شہر بہت مسرور ہوئے اور فیاضانہ دریادلی سے زرِ کثیر بطور چندہ دیا۔"

۴۔ گلزارِ ادب

یعنی

ضمیمہ کلیاتِ گوشہ نشین

مطبوعہ لاہور یکم دسمبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۶

مولانا اصغر علی صاحب روحی

ایم۔ او۔ ایل۔ پروفیسر اسلامیہ کالج — لاہور

شعر کو ہے ناز تجھ پر اے سخن کو افتخار — تر زباں تیری ثنا میں ہے زبانِ روزگار

غنچۂ جدّت ترا عنبر فشاں آفاق میں — ہے گلِ برجستگی تیرا جہاں میں مشکبار

مردمِ چشمِ فصاحت میں ترا فخرِ کرم — اور چمن زارِ بلاغت کا ہے تو پروردگار

گلبنِ طبعِ رواں زیبِ گلستانِ نسیم — سروِ معنی ہے ترا آرائشِ باغِ بہار

کشتِ نکتہ پروری کو تو سحابِ سیم ریز — نغز گوئی کے چمن کا ہے بدل ہے تو ہزار

شاعری کی سرزمینِ پاک پر ہے بے اشتباہ — حکمراں تیرا تخیل - فکر تیرا تاجدار

جیبِ عقل و ہوش کو سی کر ترا جامِ سخن — دستِ رقاصِ فلک نے کر دیا ہے تار تار

تیرا اندازِ قصیدہ - تیرا اسلوبِ غزل — مملکت میں رفعتِ پرواز کی ہے شہریار

ہے زباں ہے چرخِ ہفتم پر ترا مرغِ ہنر — گام فرسا عرش پر علم و عمل کا راہوار

دانشِ بے مثل - عقلِ دور بیں - ذہنِ رسا — مرحمت کیا کیا ہوئے ہیں تجھ کو گوہر شاہوار

میرے باغِ فکر کا ہے باغباں تیرا کرم — تیرا حسنِ لطف ہے برگ و ثمر سے آشکار

میرے خاشاکِ سخن پر وہ نگاہِ فیض کی — کیمیا میں کر دیا سب منقلب گرد و غبار

دولتِ خونِ جگر یعنی مرا گنجِ سخن — ہے قمر ضو سے ترے خورشید کی ہے نور بار

تیرے دم سے - ہے نظر آتا مجھے اپنا کلام — گلعذارانِ گلستانِ بقا میں گلعذار

ہے کہاں اب - اس پسر کو - تیرے فیض کے طفیل — خدشۂ آسیبِ چشمِ گردشِ لیل و نہار

نظم کے حسنِ جہاں افروز کا گو رشک قیں — ہے ذہانت اور تائیدِ الٰہی پر مدار

۳۱- مختصر تاریخ انجمن حمایت اسلام لاہور

مطبوعہ لاہور دسمبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۶

۱۸۹۳ء میں ہز ہائنس نواب صاحب بہاولپور نے یتیم خانہ کا ملاحظہ فرمایا دوسرے سال انجمن کا وفد بہاولپور پہنچا - مولوی اصغر علی روحی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج نے دربار میں اپنا بے نظیر قصیدہ پڑھا - یہ وفد چھ سو روپیہ سالانہ وظیفہ کا فرمان لے کر فائز المرام واپس ہوا - یہ وظیفہ ۱۹۰۸ء سے دو ہزار روپیہ سالانہ ہو گیا تھا اور آج تک متواتر سال بسال پہنچ رہا ہے -

۴۲ - مرآۃ التصانیف (جلد اول)

مرتبہ: مولانا حافظ محمد عبدالستار قادری چشتی، مطبوعہ لاہور نومبر ۱۹۸۰ء

ص ۱۵

ع شمار ۳۹، تفسیر پارہ ۲۹ از علامہ اصغر علی روحی، غیر مطبوعہ

ع شمار ۴۰، " " " ع ۳۰ " " " " " "

ص ۱۸

ع شمار ۴۷، تفسیر سورہ یسین از " " " " ، مطبوعہ لاہور ۱۳۶۰ھ صفحات ۸۰

ص ۷۵

ع شمار ۱۰۷۹، فتاوٰی روحی " " " " " ، غیر مطبوعہ

ص ۹۱

ع شمار ۱۴۱۸، التنویر فی اسقاط التدبیر از " " " " ، غیر مطبوعہ

ص ۱۰۱

ع شمار ۱۶۳۰، ما فی الاسلام جلد اول از " " " " " ، مطبوعہ لاہور ۱۳۵۰ھ صفحات ۱۲۷

" ۱۶۳۱، " " جلد دوم " " " " " " " " " ۸۲

ص ۱۰۶

ع شمار ۱۷۴۲، اسرار التنزیل از " " " " ، غیر مطبوعہ

ص ۱۰۷

ع شمار ۱۷۶۳، اطباق الشہد فی حل ابیات البردہ از " " ، مطبوعہ لاہور ۱۳۲۶ھ صفحات ۱۸۲

" ۱۷۶۹، امیر الکلام من کلام الامام از " " " " " ۱۳۲۲ھ " ۱۲۸

ص ۱۰۹

ع شمار ۱۸۲۶، تذکرۃ الموتی والقبور از مولانا اصغر " ، غیر مطبوعہ

ص ۱۱۳

۱۳۳۱ھ
عـــ شمار ۱۹۱۵، الجفاء والوفاء از علامہ اصغر علی روحی مطبوعہ لاہور صفحات ۳۶۰

صـــ ۱۱۴

عـــ شمار ۱۹۱۴، حکمت بالغہ " " " " " ۲۴

صـــ ۱۱۸

عـــ شمار ۲۰۱۴، شرح الاسماء الحسنیٰ " " " " ۱۳۲۹ھ صفحات ۲۴۸

صـــ ۱۴۴

عـــ شمار ۲۶۱۵، دیوان عربی " غیر مطبوعہ

صـــ ۱۴۵

عـــ شمار ۲۶۲۲، دیوان فارسی " غیر مطبوعہ

صـــ ۱۵۵

عـــ شمار ۲۸۹۲، دبیر عجم (فارسی) " مطبوعہ لاہور ۱۳۲۷ھ " ۴۰۴

صـــ ۱۵۶

عـــ شمار ۲۹۰۸، العروض والقوافی " " " ۱۳۵۵ھ " ۱۴۴

صـــ ۱۷۰

عـــ شمار ۳۱۶۴، تجلیات " غیر مطبوعہ [1]

صـــ ۲۲۱

عـــ شمار ۳۲۸۰، عظماء اسلام " غیر مطبوعہ

صـــ ۲۲۴

عـــ شمار ۳۷۷۴، مقالات " "

صـــ ۲۶۷،

عـــ شمار ۵۲۲۳، اتمام الحجہ عمن اعرض عن المحجہ از علامہ اصغر علی روحی، غیر مطبوعہ

---

[1] مطبوعہ لاہور، ۱۹۲۸ء صفحات ۲۵۲

ص ۲۷۳

ع شمار ۵۳۴۴ ، اسلام اور عیسائیت از علامہ اصغر علی روحی   غیر مطبوعہ

ص ۲۷۴

ع شمار ۵۳۵۸ ، ساولوس مقدس کی توحید پر تنقید   "   "

" ۵۳۵۹ ، سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام   "   مطبوعہ لاہور ۱۳۲۰ھ صفحات ۱۲

ص ۲۷۶

ع شمار ۵۳۹۸ ، خطبات روحی ،   "   غیر مطبوعہ

۴۳ - روزنامہ مشرق لاہور

۳/ جنوری ۱۹۷۹

مضمون زیر عنوان " درس نظامی میں ردوبدل کا اختیار افسر شاہی کو نہیں دیا جا سکتا " تحریر: مولانا عبد القادر آزاد

ذیلی سُرخی: ندوۃ العلماء

اس اقدام پر موجودہ حکومت یقیناً قابل صد مبارک ہے کہ اس کے دور میں قائد اعظم کے اس خواب کی حقیقی تعبیر اس حکومت نے فراہم کی جو مقام وہ پاکستان میں علماء کو دینا چاہتے تھے۔ پاکستان بننے سے قبل اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور میں مولانا محمد رسول خان فاضل دیوبند - مولانا سید میرک شاہ فاضل دیوبند - مولانا نجم الدین فاضل دیوبند، مولانا عبد اللہ ٹونکی فاضل دیوبند - مولانا فیوض الرحمٰن فاضل دیوبند ، مولانا اصغر علی روحی فاضل درس نظامی اور مولانا نور الحسن خان فاضل دیوبند کے علاوہ بے شمار علماء پنجاب کے کالج اور جامعہ پنجاب میں اساتذہ رہے ۔ تکریم ان کی ایم اے سے زیادہ اور سہولتیں ان کو ایم اے کے برابر فراہم کی جاتی تھیں۔

۴۴ - مقالات دینی و علمی

حصہ اول ، چند دینی و علمی تحقیقی تقریریں ، جو پروفیسر مولوی محمد شفیع نے ریڈیو کے ذریعے نشر کیں ۔

مطبوعہ ، لاہور ۱۹۶۰ء

اس کتاب میں شامل وہ مواد جو مولانا کے متعلق ہے وہ اُن کے سوانح میں بعنوان "طریقِ تعلیم"، "مولانا کا حلقہ احباب" اور "اخلاق و عادات" شامل کیا جا چکا ہے۔

۴۵۔ میرے حضور رحمۃ اللہ علیہ

یعنی

مجموعہ مقالات مولوی محمد حبیب اللہ قدس سرہٗ العزیز

از سید محمد کبیر احمد مظہر مطبوعہ گوجرانوالہ فروری ۱۹۸۱ء

اس کتاب میں پروفیسر کبیر احمد مظہر صاحب نے اپنے دادا مولوی حبیب اللہ صاحب گجراتی کے حالات بیان کرتے ہوئے اُن کے تعلیمی کوائف یوں لکھے ہیں:

ص ۱۷

تعلیمی کوائف: (۱)۔ علوم دین، عربی و فارسی زبان و ادب از بحرالعلوم مولانا محمد آسی امرتسری متوفی ۱۹۴۹ء۔ مولانا اصغر علی روحی متوفی ۱۹۵۴ء

۴۶۔ روزنامہ ندائے ملت لاہور

مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۶۹ء، مضمون زیرِ عنوان: بات سے بات

اس میں مولانا سے متعلق دو لطیفے بیان کئے گئے ہیں جو اُن کے سوانح میں بعنوان "مزاح و ظرافت" لکھے جا چکے ہیں۔

۴۷۔ نقوش

لاہور۔ فروری ۱۹۶۲ء مدیر: محمد طفیل

مضمون زیرِ عنوان: ادیب اور مصنف از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی صفحہ ۹۲۰

اصغر علی

مولانا اصغر علی روحی ایم او ایل، مولوی فاضل، منشی فاضل اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج

لاہور کے پروفیسر رہے۔ بڑے فاضل اور قابل انسان تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ دبیر عجم، العروض والقوافی، ما فی الاسلام وغیرہ محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک ماہوار دینی اور علمی رسالہ الہدیٰ بھی آپ نے لاہور سے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا تھا جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ عربی، فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ دبیر عجم میں نمونۂ کلام موجود ہے۔

اقتباسات از نقوش شمارہ ۱۰۲ بابت ماہ جنوری ۱۹۶۶ء

صفحہ ۱۳-۱۴ مضمون زیر عنوان: لاہور کا چیلسی از حکیم احمد شجاع

جب بھاٹی دروازے کے اندر داخل ہوں تو کچھ دور چل کر بائیں طرف ایک کوچہ ہے جسے کوچہ پٹرنگاں کہتے ہیں۔ آج سے کوئی ساٹھ برس پہلے اس کوچے کے ایک مکان میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جیسے نامور ماہر السنۂ شرقیہ کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے تھے۔ یہ مجمع کمالات تھے اور سرچشمہ ہدایت و رشد۔ ان کے درس کلام مجید کا شہرہ دور دور تھا۔ بعد میں انہوں نے نگلی بازار میں بھی قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بڑے پاک باطن اور فرشتہ صورت انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کی صورت دیکھ کر اسلامی سیرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اور اس زمانے میں جب تک ان کا تعلق نارمل سکول لاہور سے رہا۔ اس کوچے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے مولانا روحی کی شاگردی کے فیض صحبت ہی سے عربی و فارسی کے علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی۔

صفحہ ۱۶

اس کے بالمقابل میرے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ یہ مکان لاہور کی ادبی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ سے ۱۹۲۲ء تک جب تک حکیم شہباز دین زندہ رہے۔ ہر روز شام کو لاہور کے ادیبوں، شاعروں، عالموں اور سیاستدانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا

لٹریری کلب تھا۔ اس میں جو لوگ باقاعدہ ہر شام کو جمع ہوتے تھے۔ ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد حسن جالندھری، مولوی اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام دین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اس محفلِ احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ بیٹھتے تھے۔

THE PAKISTAN TIMES - ۴۸

September 21, 1976

نقوش کے مندرجہ بالا اشتہارہ یعنی جنوری ۱۹۶۶ء میں جو مضمون گزر چلا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ایک صاحب نے اس روزنامہ میں طبع کرایا تھا اور اس میں بھی انہیں غلطیوں کا ارتکاب کیا گیا تھا جو اصل مضمون میں پائی جاتی تھیں۔ (یعنی یہ کہ مولانا اصغر علی روحی محلہ پیر گیلاں کے ایک کوچے میں رہتے تھے وغیرہ)۔

لیکن میاں عبدالعزیز (مرحوم) ۲۱ رحبیب اللہ روڈ نے ۳۰ راکتوبر ۱۹۷۶ء کے پاکستان ٹائمز میں Chelsea of Lahore کے تحت Letters to the Editor کے عنوان سے ان غلطیوں کی درستی کر کے کچھ مزید معلومات بہم پہنچائے تھے۔

۱۰ رمئی ۱۹۷۸ء

میرزا ادیب صاحب کا ایک مضمون اذکار و افکار کے تحت "تب اور اب" کے

نام سے چھپا تھا۔ جس میں انہوں نے مسجد کے کردار پر کچھ روشنی ڈالی تھی اور بتایا تھا کہ مسجد استادی و شاگردی کا کس طرح گزشتہ زمانے میں ایک مرکز بنی رہی جس کا تصور اب مفقود ہو گیا ہے۔

۳ر فروری ۱۹۸۰ء

یادِ رفتگاں

چودھری رحمت علی مرحوم۔ ایک نابغہ روزگار شخصیت

از چودھری بشیر احمد (اسلام آباد)

"چودھری صاحب نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اُس زمانے میں اس دانش کدے میں پروفیسر ایم۔ اے غنی، مولانا اصغر علی روحی، خواجہ دل محمد اور سید عبدالقادر جیسی شخصیات یہاں علم و عرفان کی دولت لٹا رہی تھیں۔ چودھری رحمت علی کی صلاحیتوں کو ان حالات نے جلا بخشی۔"

۷ر ستمبر ۱۹۸۰ء

اس پرچہ میں راقم الحروف کا ایک مضمون یادِ رفتگاں کے تحت "مولانا اصغر علی روحی مرحوم" کے عنوان سے چھپا تھا۔ جس میں اُن کے کچھ حالات بیان کئے گئے تھے۔

یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء

ہم کس قسم کے انسان ہیں؟

"ابن آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی"

تحریر: ڈاکٹر محمد باقر

مولوی اصغر علی روحی (اللہ تعالیٰ انہیں اَن گنت رحمتوں سے نوازے) اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے۔ اسلامیہ کالج میں اپنی پروفیسری کے زمانے میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو ایک سپیرا بین بجا بجا کر سامنے ایک سانپ لہرا رہا تھا۔ پروفیسر صاحب ایک لمحے کے لئے رُکے اور سپیرے کو مخاطب کر کے فرمایا: اس کی نوع کیا ہے؟ سپیرے نے بین روک کر جواب دیا: جناب ابھی شاہدرے سے پکڑ کر لایا ہوں۔ استاد مکرم نے حیرت سے کہا: عجیب احمق ہے۔ ہم نوع کی بات کرتے ہیں یہ مقام سناتا ہے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ پاکستان میں آج کل غنڈوں کی کیفیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ پہلے زمانے (یعنی انگریز کے عہد) میں ہر غنڈے کا ایک مقام ہوتا تھا جہاں پولیس چوبیس گھنٹوں میں ایک دفعہ ضرور اس کی خیریت

دریافت کرنے جاتی تھی لیکن اب مقام کوکوئی اہمیت حاصل نہیں رہی ۔ اب غوغائی اور نامی غنڈوں کے مقابلے میں پاکستانی سوسائٹی میں خاموش غنڈوں نے بڑا مرتبہ پالیا ہے ۔ ----------
---------- اور اس جنگلی کیڑے سے کتنی مختلف ہے جس کی نوع مولوی روحی سپیرے سے دریافت فرما رہے تھے ؟ وہ بھی تو ڈستے وقت آواز نہیں نکالتا ۔

۳ ر مئی ۱۹۸۳ء

م ۔ش کی ڈائری

اسلامیہ کالج لاہور کے دو چمکدار ستارے غروب ہو گئے ۔

(عبدالبشیر آذری ، خواجہ محمد اسلم)

عبدالبشیر آذری کو میں نے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں سنڈے سیمینار کے دوران سٹیج پر پہلی بار یوں دیکھا کہ جب وہ سر پر ترکی ٹوپی اور شلوار قمیض میں ملبوس نمودار ہوئے تو حاضرین کے ایک بڑے حصے نے " واہ واہ " کے بے ساختہ نعرے سے ان کا استقبال کیا ۔ آذری صاحب نے مجمع پر ایک نگاہ ڈالی ۔ تبسم فرمایا ؛ اور مولانا ظفر علی خان رح کی نعت ؎

ع اپنی غریبوں میں گزاری سادی

اپنے مخصوص انداز میں الاپنا شروع کی ۔ جب تک آذری صاحب نعت گاتے رہے ۔ مجمع ہمہ تن گوش بر آواز رہا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کالج کے اساتذہ سید عبدالقادر ، ڈاکٹر نذیر احمد ، پروفیسر یوکرامت ، ڈاکٹر تاثیر ، مولانا علم الدین سالک ، حضرت مولانا روحی رح اور خواجہ دل محمد جیسے نامی گرامی لوگ شامل تھے ۔

۱۳ ر مئی ۱۹۸۳ء و ۲۰ رمئی ۱۹۸۳ء

میاں امیر دین صدر انجمن حمایت اسلام نے یاد ایام کے نام سے اپنے وقت کے حالات اور ذاتی یادداشتیں جمع کر کے چھپوا دی ہیں ، جو ایک کتابی صورت میں بازار سے مل سکتی ہیں ۔ یہی حالات قسط وار نوائے وقت کے جمعہ ایڈیشن میں بھی آج کل طبع ہو رہے ہیں ۔ چنانچہ اُن یادداشتوں

میں مولانا اصغر علی روحی مرحوم کے بارے میں کچھ باتیں میاں صاحب نے لکھی ہیں، جو مولانا کے سوانح میں بعنوان "مولانا کا حلقہ احباب" گزر چکی ہیں۔

مطبوعہ مواد سے اقتباسات کے سلسلے میں جو چیزیں ترتیب دینے کے بعد نظر سے گزریں اُن کو ضمیمہ کے طور پر ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ انجمن نعمانیہ لاہور
کا
ماہواری رسالہ

انجمن نعمانیہ ہند لاہور ہر سال "سالانہ جلسہ" منعقد کیا کرتی تھی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے چنانچہ ۱۳۴۳ھ کو جو سالانہ جلسہ منعقد ہوا، اُسکی کارروائی انجمن کے ماہوار رسالہ بابت ماہ ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ میں چھاپی گئی۔ اس سلسلہ میں جلسہ سے خطاب کرنے والوں کے نام اور اُن کے موضوع رپورٹ میں درج کئے گئے۔

۱۱ ربیع الثانی کے جلسہ میں یہ عبارت ص ۱۶ پر ملتی ہے۔

" اُن کے بعد اپنے ٹھیک وقت مشتہرہ پر حضرت مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاہور تشریف لے آئے جن کا عالمانہ وعظ انکشافِ حقائقِ دین کے متعلق اور ضرورتِ تعلیم و نشر و اشاعت علوم دینیہ پر نہایت نفیس بیان تھا حاضرین بہت ہی محظوظ ہوئے۔ "

۲۔ سبیل الرشاد

کے نام سے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۳۵ء میں ایک مجموعہ مضامین شائع کیا جو سید ممتاز علی نے عید میلاد کے بارے میں جمع کیا تھا۔ اس مجموعہ کے ص ۱۹ تا ۲۰ پر یہ عبارت ملتی ہے:

"اسی ہفتے یعنی تہذیب نسواں مورخہ ۲ر اپریل ۱۹۱۰ء میں ہم نے ایک اور مضمون اسی موضوع پر درج کیا جو حسب ذیل ہے:

مجلس مولود شریف علاوہ معمولی کارروائی کے شعراء نے اپنا اپنا نہایت پاکیزہ نعتیہ کلام سنایا۔ خواجہ دل محمد ایم۔اے پروفیسر حمایت اسلام کالج، مولوی اصغر علی روحی پروفیسر کالج مذکور، مولوی احمد علی صاحب مدرس، منشی اللہ یار خاں صاحب جوگی کے کلام سے حاضرین مجلس بہت محظوظ ہوئے۔"

(۱) آثار الصنادید: از سر سید احمد خان، مطبوعہ مطبع منشی نولکشور، لاہور۔

آزاد = تذکرہ علماء

(۲) الآیۃ الکبریٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ: از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ مطبعۃ الاسلامیہ لاہور ۱۳۲۹ھ۔

(۳) اتمام الحجۃ علیٰ من اعرض عن المحجۃ: از مولانا اصغر علی روحی، (غیر مطبوعہ)

(۴) الابجد، ابجد العلوم المسمّیٰ بالوشی المرقوم: از نواب صدیق بن حسن الحسینی، مطبوعہ مطبع صدیقیہ بھوپال سنۃ ۱۲۹۵ھ - ۱۲۹۶ھ

(۵) الاتحاف، اتحاف النبلاء از سید صدیق حسن خان، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور، سنۃ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء

(۶) احسن المقال فی تحقیق عدم اعتبار الخط فی رویۃ الہلال: از مولوی عبد الرزاق، مطبوعہ مطبع مصطفائی، بمبئی سنۃ ۱۳۳۵ھ

(۷) احکام شب براۃ: از مولانا احمد علی، مطبوعہ شعبۃ التالیف و الاشاعۃ لانجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۶۱ء مطابق صفر المظفر ۱۳۸۱ھ

(۸) احمد علی (مولوی) صاحب کے غلط مسائل کی تصحیح: از پیر غلام دستگیر نامی، مطبوعہ سنۃ ۱۳۴۵ھ

(۹) اخبار الاخیار: از شیخ عبد الحق محدث دہلوی، مطبوعہ فاروق اکیڈمی گمبٹ ضلع خیرپور

الاخیار = اخبار الاخیار

الادباء = معجم الادباء

(۱۰) اردو انسائیکلو پیڈیا (نیا ایڈیشن)، مطبوعہ فیروز سنز سنۃ ۱۹۶۸ء

(۱۱) اردو ڈائجسٹ لاہور ماہنامہ

(۱۲) ارکان خمسہ: از سید نذیر علی مجددی، مطبوعہ نور الانوار پریس میرٹھ سنۃ ۱۹۰۶ء

(۱۳) استقلال لاہور ہفت روزہ

(۱۴) اسرار التنزیل از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

(۱۵) اسلام زندہ باد از عبدالمجید قریشی، مطبوعہ مینیجر سیرت بکڈپو، پٹی، ضلع لاہور

(۱۶) اسلام میں نکاح بیوگان از مولوی احمد علی لاہوری مطبوعہ انجمن خدام الدین لاہور، اپریل ۱۹۶۱ء

(۱۷) الاشراق لاہور مجلہ ماہوار

(۱۸) اطباق الترد فی حل ابیات البردہ از مولانا اصغر علی روحی مطبوعہ مطبعۃ الاسلامیہ لاہور ۱۳۲۶ھ

(۱۹) الطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم از مولانا حبیب الرحمٰن، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۳۴ھ

(۲۰) اعجاز القرآن (بہامش کتاب الاتقان للسیوطی) از ابوبکر باقلانی، مطبوعہ مصر ۱۳۱۸ھ

(۲۱) الأعلام از خیر الدین الزرکلی، مطبوعہ مصر سنۃ ۱۹۵۴ء — ۱۹۵۹ء

(۲۲) الإعلام لاہور مجلہ ماہوار

(۲۳) اقبال اور انجمن حمایت اسلام: از محمد حنیف شاہد (علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے نذرانۂ عقیدت) مطبوعہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور

(۲۴) اقبال کی صحبت میں: از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی۔

(۲۵) اقبال نامہ (یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال) از شیخ عطاء اللہ ایم اے، مطبوعہ علی گڑھ

(۲۶) امام بریلوی: امام احمد رضا بریلوی کے گیارہ اشعار: از علامہ محمود احمد قادری، مطبوعہ الاصلاح پبلی کیشنز کالونی، خانیوال (ملتان)

(۲۷) الامامۃ بالعمامۃ والصلوٰۃ بالمروحۃ: از فضل حق نقشبندی لدھیانوی، مطبوعہ مطبع حمیدیہ لاہور شوال ۱۳۳۰ھ

(۲۸) امیر الکلام من کلام الامام: از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ مطبعۃ الاسلامیہ لاہور ۱۳۲۲ھ

(۲۹) انجام آتھم: از مرزا غلام احمد قادیانی، مطبوعہ مینیجر بکڈپو مطبع کریمی لاہور، دسمبر ۱۹۲۲ء

(۳۰) انجمن حمایت اسلام لاہور مجلہ ماہوار

(۳۱) انجمن نعمانیہ روداد ۱۹۳۶ء

(۳۲) انوار آفتاب صداقت: از حاجی فضل احمد لدھیانوی، مطبوعہ کریمی پریس لاہور، ۱۳۳۸ھ

(۳۳) ائمہ تلبیس از ابوالقاسم رفیق دلاوری، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۷ء

(۳۴) البغیۃ، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ: از حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی، مطبوعہ عیسیٰ البابی الحلبی، مصر سنۃ ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء

(۳۵) بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب از السید محمود شکری الآلوسی البغدادی

مطبوعہ مصر ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء

(۳۶) بیٹے کا حصہ: از مولانا غلام دستگیر نامی، مطبوعہ لاہور ۱۳۳۵ھ

(۳۷) البیّنات کراچی مجلّہ ماہوار

(۳۸) پرشین کمپوزیشن: از علم الدین، مطبوعہ کواپریٹو کیپٹل پریس وطن بلڈنگ لاہور ۱۹۳۷ء

(۳۹) تاج التراجم فی طبقات الحنفیۃ: از الشیخ ابو العدل زین الدین قاسم بن قطلوبغا، مطبوعہ بغداد سنۃ ۱۹۶۲ء

(۴۰) تاج العروس من جواہر القاموس: از امام اللغوی محمد مرتضیٰ الحسینی الزبیدی، مطبوعہ مصر سنۃ ۱۳۰۶ھ

(۴۱) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ: از جرجی زیدان، مطبوعہ دار الہلال مصر سنۃ ۱۹۵۷ء

(۴۲) تاریخ الادب العربی: از احمد حسن الزیات، مطبوعہ مصر سنۃ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء

(۴۳) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد دوم، (پنجاب یونیورسٹی) مطبوعہ المکتبۃ العلمیۃ لاہور ۱۹۷۲ء

(۴۴) تاریخ اورینٹل کالج لاہور: از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطبوعہ سنۃ ۱۹۶۲ء

(۴۵) تاریخ دار العلوم دیو بند: از سید محبوب رضوی، مطبوعہ دہلی ۱۳۹۸ھ

(۴۶) تجلیات فی شرح الاشارات: از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ لاہور

(۴۷) التذکرۃ؛ تذکرہ علمائے ہند: از رحمٰن علی مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لاہور ۱۹۱۴ء

(۴۸) تذکرہ اکابر اہل سنت (پاکستان): از شرف قادری عبد الحکیم، مطبوعہ مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور۔ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء

(۴۹) تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی) از خواجہ عبد الرشید، مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی ۱۳۴۶ھ

(۵۰) تذکرہ علماء (یعنی ہندستان کے چالیس مشاہیر علماء کا تذکرہ): از مولانا محمد حسین آزاد، مطبوعہ مطبع کریمی لاہور ۱۹۲۲ء

(۵۱) تذکرہ علماء اہل سنت و جماعت: از محمد اقبال فاروقی، مطبوعہ مکتبہ جدید پریس لاہور، جنوری ۱۹۷۵ء

(۵۲) تذکرہ علمائے پنجاب: از اختر راہی، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور سنۃ ۱۹۸۱ء

(۵۳) تذکرۃ الموتیٰ والقبور: از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

التراجم = تاج التراجم فی طبقات الحنفیۃ۔

(۵۴) التسہیل فی حل انوار التنزیل : از محمد عبدالعزیز، مطبوعہ کاشی سٹیم پریس سنۃ ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ

(۵۵) تعارف نامہ (پروفیسر احمد حسین احمد قلعداری): از حکیم پیر عبدالواحد بخاری گنجاہی، مطبوعہ مکتبہ ظفر ناشر قرآنی قطعات گجرات سنۃ ۱۹۷۳ء

(۵۶) تعزیز بیتی الحریری : از السید احمد خان، مطبوعہ مطبعۃ المفید الجدیدۃ بدمشق سنۃ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۷۹ء

(۵۶ ب) التفسیر = التفسیر والمفسرون محمد حسین الذہبی

(۵۷) تفسیر روحی (سورۂ یٰسین): از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ المکتبۃ العلمیۃ لاہور جنوری ۱۹۷۶ء

(۵۸) تفسیر نبوی : از نبی بخش حلوائی، مطبوعہ مطبع کریمی لاہور

(۵۹) تمرینات النحو : از مولوی غلام سرور، مطبوعہ سنۃ ۱۹۲۶ء

(۶۰) التنویر فی اسقاط التدبیر : (غیر مطبوعہ) از مولانا اصغر علی روحی

(۶۱) توحید مقبول : از مولوی احمد علی لاہوری، مطبوعہ انجمن خدام الدین لاہور، جمادی الاول ۱۳۸۰ھ

(۶۲) التہذیب، تہذیب التہذیب : از شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی، مطبوعہ حیدرآباد الدکن سنۃ ۱۳۲۵ھ.

(۶۳) ثالوث مقدس کی توحید پر تنقید : از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

(۶۴) الثغر، ثغر عدن : از عبداللّٰہ الطیب با مخرمہ، مطبوعہ لیدن ۱۹۳۶ء

(۶۵) الثقافۃ، الاسلامیۃ فی الہند : از عبدالحی الحسنی، مطبوعہ دمشق سنۃ ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء

جرجی زیدان = تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ

(۶۶) الجفاء والوفاء : از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ لاہور سٹیم پریس لاہور ۱۹۳۷ء

(۶۷) جنگ لاہور روزنامہ

(۶۸) چہار مقالہ : از النظامی العروضی السمرقندی، مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء

(۶۹) الحجۃ، حجۃ اللّٰہ البالغۃ : مصنفہ شاہ ولی اللّٰہ دہلوی مع ترجمہ عبدالحق حقانی، مطبوعہ نور محمد کراچی، ۱۹۵۸ء

(۷۰) الحدائق، حدائق الحنفیۃ : از مولوی فقیر محمد جہلمی، مطبوعہ مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، (طبع چہارم چودھویں صدی ایڈیشن)

(۷۱) حدائق السحر : از رشید الدین وطواط، مطبوعہ تہران شاہ آباد سنۃ ۱۳۳۹ھ، (فی آخر دیوان رشید الدین وطواط)

الحریری = شرح مقامات الحریری البصری

(۷۲) حسن الجرد فی شرح القصیدۃ البردۃ: از ابو البرکات محمد عبدالمالک خان، مطبوعہ مطبعۃ الاسلامیۃ لاہور ۱۳۲۶ھ

(۷۳) الحکم اخبار، روزنامہ

(۷۴) حکمت بالغہ: از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ مطبعۃ الاسلامیۃ لاہور و مکتبہ خلیل لاہور - ۱۹۷۶ء

(۷۵) الحکیم مجلۃ ماہنامہ

(۷۶) الحوادث، الجامعۃ والتجارب النافعۃ فی المائۃ السابعۃ: از کمال الدین ابو الفضل عبدالرزاق بن الفوطی، مطبوعہ المکتبۃ العربیۃ بغداد سنۃ ۱۳۵۱ھ

(۷۷) خزینۂ معرفت المسمیٰ بہ تذکرہ عاشق ربانی شیر یزدانی: از صوفی محمد ابراہیم مطبوعہ مکتبہ نور اسلام شرقپور شریف ضلع شیخوپورہ سنۃ نومبر ۱۹۷۶ء

(۷۸) خزینۃ المیراث: از مولوی فتح الدین اذبر، مطبوعہ قریشی بک ایجنسی کشمیری بازار، لاہور ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء

(۷۹) الخطط، التوفیقیۃ الجدیدۃ لمصر القاہرۃ و مدنہا و بلادہا القدیمۃ والشہیرۃ: از علی باشا المبارک، مطبوعہ المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، مصر سنۃ ۱۳۰۶ھ

(۸۰) خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر: از محمد المحبی، مطبوعہ مصر ۱۲۸۴ھ

(۸۱) دائرۃ الاصلاح لاہور کی پنج سالہ کارگزاری، مطبوعہ لاہور ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ / نومبر ۱۹۲۴ء

(۸۲) دبیر عجم: از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ لاہور مقبول عام پریس لاہور ۱۳۴۲ھ

(۸۳) دستی ہدایت نامہ ۹ برائے اہل سنت و جماعت: از پیر غلام دستگیر نامی، مطبوعہ دائرۃ الاصلاح لاہور۔

(۸۴) دیوان روحی (عربی) غیر مطبوعہ

(۸۵) دیوان روحی (فارسی) غیر مطبوعہ

(۸۶) الرجال، رجال السند والہند (الی القرن السابع) از قاضی ابو المعالی اطہر مبارکپوری مطبوعہ بمبئی سنۃ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء

(۸۷) الرمح الدیانی علی رأس الوسواس الشیطانی: از مولوی محمد مصطفیٰ رضا خان قادری برکاتی مع اربعہ رسائل از مولوی بنی بخش حلوائی، ایضاح التلبیس الشیطانی، قہر القہار، ازالۃ التلبیس

- الدلائل القویّۃ ، مطبوعہ اسٹیم پریس امرتسر باہتمام شیخ عبد العزیز

(۸۸) روئداد انجمن نعمانیہ ۔ ۱۹۳۶ء لاہور۔

(۸۹) رئیس قادیان : از ابو القاسم رفیق دلاوری (یعنی مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مدعیٔ نبوت و مسیحیت کے صحیح و مستند حالات) ، مطبوعہ دار التصنیف ، دہلی مسلم ہوٹل انارکلی لاہور ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء

(۹۰) The Contribution of Indo-Pakistan to Arabic Literature از By M. G. Zubaid Ahmad, Printed in LAHORE 1967

(۹۱) زمیندار اخبار روزنامہ

(۹۲) الزہر الجنی من ریاض الیمنی : از عبد العزیز المیمن ، مطبوعہ مطبع رفاہ عام لاہور سنۃ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء ۔

الزیات = تاریخ الادب العربی

(۹۳) سالانہ رپورٹ انجمن حمایت اسلام ۱۸۹۷ء

(۹۴) سپرنگ ڈائجسٹ

(۹۵) السبحۃ ، سبحۃ المرجان فی آثار ہندستان : از سید غلام علی آزاد بلگرامی ، مطبوعہ بمبئی سنۃ ۱۳۰۳

(۹۶) سبیل الرشاد : از سید ممتاز علی ، مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب لاہور ۔ ۱۹۳۵ء

السحر = حدائق السحر

(۹۷) سراج الاخبار جہلم روزنامہ

(۹۸) سوانح مرحوم خواجہ دل محمد : از خواجہ گلزار احمد ، مطبوعہ خواجہ بک ڈپو اردو بازار لاہور

(۹۹) سوانحات عمر (ملک العلماء علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی مع تاریخ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ) : از محمد الدین فوق ، مطبوعہ لاہور سنۃ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء

(۱۰۰) سیاست لاہور ، روزنامہ

(۱۰۱) سیرت بلال : از ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی ، مطبوعہ کتاب خانہ نورس (کالج بک شاپ) کبیر سٹریٹ لاہور ۔ ۱۹۶۲ء

(۱۰۲) سیطرۃ الاسلام علی النصاری اللئام : از مولانا اصغر علی روحی ، مطبوعہ مطبعۃ الاسلامیہ لاہور ۔ ۱۳۲۰ھ

(۱۰۳) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ : از عبید اللہ سندھی ، مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء

(۱۰۴) شرح آئینہ عجم : از مولوی محمد چراغ جلالپوری ، مطبوعہ سنۃ ۱۹۲۷ء

(۱۰۵) شرح مقامات الحریری البصری : از ابو العباس احمد بن عبد المؤمن القیسی الشریشی ، مطبوعہ مصر ، ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء

(۱۰۶) شعر العرب فی الگجرات : از پروفیسر احمد حسین احمد قریشی قلعداری (یہ مقالہ مجلہ نمیندار گجرات میں چھپا ۔ یہ مقالہ قریشی صاحب کی کتاب " گجرات کا علمی ماحول و گجرات کی ثقافتی تاریخ " کا ایک باب ہے)

(۱۰۷) الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ : از قاضی ابو الفضل عیاض ، مطبوعہ بریلی فی المطبع الصدیقی سنۃ ۱۲۸۶ھ

(۱۰۸) صحیفۂ ادب : از شیخ عبد الرحمن طارق ، مطبوعہ دار التالیف ہند یکی دروازہ ، لاہور سنۃ ۱۹۳۵ء

- الصنادید = آثار الصنادید

(۱۰۹) ضیائے حرم مجلہ ماہوار

(۱۱۰) الطبقات ، الکبریٰ : از ابن سعد ، مطبوعہ بیروت ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء

العارفین = ھدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین ۔

(۱۱۱) العجائب ، عجائب الآثار فی التراجم والاخبار : از شیخ عبد الرحمن الجبرتی الحنفی ، مطبوعہ مطبعۃ العامرۃ الشرقیۃ مصر ، سنۃ ۱۳۲۲ھ

(۱۱۲) عذب المناھل لعطاش الکامل : از نور الحق علوی ، مطبوعہ لاہور ۱۳۴۷ھ

(۱۱۳) عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی ، مطبوعہ ہندستانی اکادمی الہ آباد (یوپی) سنۃ ۱۹۳۰ء

(۱۱۴) العروض و القوافی : از مولانا اصغر علی روحی ، مطبوعہ ، نامی پریس لاہور ۱۳۵۵ھ

(۱۱۵) عزیز المعظم فی اکرام المکرم از ابو رشید محمد عبد العزیز مرنگ لاہور ، مطبوعہ سٹیم پریس لاہور — ۱۳۰۲ھ

(۱۱۶) عصر جدید مجلہ ماہوار

(۱۱۷) عظماء اسلام : از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

(۱۱۸) علمائے ساہو والا (سیالکوٹ) کا ایک غیر مطبوعہ تذکرہ : از محمد اقبال مجددی ، صحیفہ (ادبیات فارسی نمبر) مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، کلب روڈ لاہور ۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء

(۱۱۹) عیسائیت اور اسلام : از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

(۱۲۰) غایۃ المراد فی احتفال المیلاد مترجم مفتی سید محمد اعظم شاہ از کتاب نہایۃ الارشاد از سید عین القضاۃ لکھنوی، مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور، شعبان ۱۳۳۴ھ

(۱۲۱) فارسی گویان پاکستان: از دکتر سید سبط حسن رضوی، مطبوعہ انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی — پاکستان سنۃ ۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۴ء

(۱۲۲) فتاویٰ روحی: از مولانا اصغر علی روحی (یہ فتاویٰ میں نے اپنے مقالے میں جمع کئے ہیں)

(۱۲۳) الفقیہ امرتسر

(۱۲۴) الفوات، فوات الوفیات: از صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی، مطبوعہ بیروت سنۃ ۱۳۸۹ھ / ۱۹۷۰ء

(۱۲۵) الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ: از محمد عبدالحی اللکھنوی الہندی، مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ

(۱۲۶) فیصلہ کن مناظرہ: از مولانا محمد منظور نعمانی، مطبوعہ مکتبہ مدنیہ گوجرانوالہ سنۃ ۱۳۸۴ھ

(۱۲۷) قاموس المشاہیر: از نظامی بدایونی، مطبوعہ نظامی پریس بدایون سنۃ ۱۹۲۴ء

(۱۲۸) قبسۃ الخاطر الشادی المیمن وجذۃ شاطی الوادی الایمن: از عبدالعزیز المیمنی مطبوعہ دہلی ۱۹۱۹ء

(۱۲۹) القرآن

(۱۳۰) قرآن مجید، مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور، باہتمام مولوی ظفر اقبال سنۃ شعبان ۱۳۵۴ھ

(۱۳۱) قرآن مجید کے آخری دو پاروں کی تفسیر از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

(۱۳۲) قرآنی قانون وراثت: از غلام دستگیر نامی، مطبوعہ قریشی بک ایجنسی لاہور سنۃ ۱۳۳۳ھ

(۱۳۳) الکامل فی اللغۃ والادب: از ابوالعباس المبرد، مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

(۱۳۴) کاویہ علی الغاویہ یا تعلیمات جدیدہ پر ایک نظر: از محمد عالم آسی امرتسری، مطبوعہ برقی پریس امرتسر، سنۃ ۱۹۳۱ء

(۱۳۵) کریسنٹ، مجلہ ماہوار اسلامیہ کالج لاہور۔

(۱۳۶) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل: از ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۸ھ

(۱۳۷) الکشف، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون: از مصطفیٰ بن عبداللہ الشہیر بحاجی خلیفہ، مطبوعہ استنبول سنۃ ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء

(۱۳۸) گجرات بعہد قدیم وجدید: از قریشی احمد حسین احمد قلعداری، مکتبۂ ظفر، ناشر قرآنی قطعات، گجرات (پنجاب) سنۃ ۱۹۶۸ء

(۱۳۹) گلزار ادب (یعنی صحیح کلیاتِ گوشہ نشیں)، حسب فرمائش مینجر خواجہ بک ایجنسی لاہور مطبوعہ کوآپریٹو سٹیم پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۳۲ء

(۱۴۰) لاہور کے دو قدیم صوفی: از میاں اخلاق احمد، مطبوعہ میاں اخلاق احمد ام۔ ۲ے ۳۳۳۔ شاد باغ لاہور ۔ ۱۹۸۰ء

(۱۴۱) اللباب، لباب الالباب: از پروفیسر براؤن، طبع لیدن (ہالینڈ) سنۃ ۱۹۰۳۔ ۱۹۰۶ء

(۱۴۲) لسان العرب: از علامہ ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور الافریقی المصری مطبوعہ بیروت سنۃ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء

(۱۴۳) ماثر الاسلام: از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ سنۃ ۱۳۵۰، منظور عام پریس لاہور

(۱۴۴) الماثر، ماثر الکرام: از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مطبوعہ لاہور سنۃ ۱۹۷۱ء

(۱۴۵) المحبوب، محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب: از مولوی خدا بخش خان، مطبوعہ مطبع دکن واقع بلدہ حیدرآباد ۱۳۱۴ھ

المحبی = خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر

(۱۴۶) مختصر تاریخ انجمن حمایت اسلام لاہور: مطبوعہ حسن الدین پرنٹرز و پبلشرز لاہور دسمبر ۱۹۳۸ء

(۱۴۷) مختصر شرح الجامع الصغیر المناوی: از جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی، مطبوعہ عیسی البابی الحلبی مصر سنۃ ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء

(۱۴۸) مخزن، مجلہ ماہوار

(۱۴۹) مرآۃ التصانیف: از مولانا حافظ محمد عبدالستار قادری چشتی، مطبوعہ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور سنۃ ۱۴۰۰ھ

(۱۵۰) المرصّع: از ابن الاثیر، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۹۶ء

المشاہیر = قاموس المشاہیر

(۱۵۱) مشرق لاہور، روزنامہ

(۱۵۲) المطرب من أشعار أہل المغرب: از ابن دحیۃ عمر بن حسن، مطبوعہ دار

— العلم الجمیع بیروت، لبنان سنۃ ۱۹۵۵ء

(۱۵۳) معاہد التنصیص، کتاب شرح شواہد التلخیص المسمی معاہد التنصیص: از عبدالرحیم بن عبدالرحمٰن بن احمد العباسی، مطبوعہ المطبعۃ البہیۃ المصریۃ سنۃ ۱۳۱۶ھ

(۱۵۴) معجم الادباء: از یاقوت الحموی، مطبوعہ مکتبہ عیسیٰ البابی الحلبی مصر سنۃ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء

(۱۵۵) المعجم، معجم البلدان: از شیخ ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ الحموی الرومی البغدادی، مطبوعہ بیروت سنۃ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء

(۱۵۶) المفتاح، مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ: از احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبری زادہ، مطبوعہ حیدرآباد (دکن)

(۱۵۷) مقالات دینی و علمی: از ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور ۱۹۶۰ء

(۱۵۷ و) المناوی = مختصر شرح الجامع الصغیر للمناوی

(۱۵۸) مقالات روحی: از مولانا اصغر علی روحی (غیر مطبوعہ)

(۱۵۹) الملل والنحل: از ابوالفتح الشہرستانی، مطبوعہ مصر سنۃ ۱۳۱۷ھ

(۱۶۰) موج کوثر: یعنی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ کا دور جدید؛ از شیخ محمد اکرام، مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

(۱۶۱) میرے حضور (یعنی مجموعہ مقالات مولوی محمد حبیب اللہ): از سید محمد کبیر احمد مظہر، مطبوعہ حبیب اکیڈیمی ۶۷۔ بی سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ ۔ ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء

(۱۶۲) النحو الجدید: از مولوی محمد عالم آسی

(۱۶۳) ندائے ملت لاہور ہفت روزہ

(۱۶۴) النزھۃ، نزھۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر: از عبدالحی بن فخرالدین الحسنی، مطبوعہ حیدرآباد (دکن) سنۃ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء

(۱۶۵) نسخۂ نصر المقلدین: از حافظ احمد علی بٹالوی، مطبوعہ لکھنؤ سنۃ ۱۳۲۰ھ

نصر المقلدین = نسخۂ نصر المقلدین

(۱۶۶) نعم التعویذ العالی (ترجمۂ نصیحۃ التلمیذ) از مولانا اصغر علی روحی، مطبوعہ مطبع اسلامی دخانی لاہور، شوال المکرم ۱۳۲۷ھ

(۱۶۷) نقش دوام (یعنی حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے سوانح وغیرہ): از انظر شاہ مسعودی، مطبوعہ شاہ بک ڈپو، دیوبند (یوپی) سنۃ ۱۳۹۸ھ

(۱۶۸) نقوش لاہور مجلّہ ماہوار

(۱۶۹) نوائے وقت لاہور روزنامہ

(۱۷۰) النور، تاریخ النور السافر عن اخبار القرن العاشر: از محی الدین عبد القادر بن شیخ بن عبداللہ العیدروسی، مطبوعہ بغداد سنۃ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء

(۱۷۱) نہایۃ الارب فی فنون الأدب : از شہاب الدین احمد بن عبد الوہاب النویری، مطبوعہ مصر

(۱۷۲) الہدیٰ لاہور مجلّہ ماہوار از مولانا اصغر علی روحی

(۱۷۳) ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین : از اسماعیل باشا البغدادی مطبوعہ استانبول سنۃ ۱۹۵۱ء

(۱۷۴) ہندوؤں سے ترک موالات یا اجل خانی فریب : از منشی تاج الدین احمد تاج مطبوعہ سٹیم پریس لاہور، دسمبر ۱۹۲۰ء و مطبوعہ مکتبۂ رضویہ لاہور جون ۱۹۰۲ء

(۱۷۵) The Crescent Hostel Directory and Diary 1963/1964

(۱۷۶) A Literary History of Persia By Edward G. Browne
Printed in Cambridge University Press — 1929

(۱۷۷) The PAKISTAN TIMES LAHORE DAILY

The University of the Punjab.

ENTRANCE EXAMINATION.

ORIENTAL FACULTY.

SESSION 1885.

This is to certify that Asghar ali —
son of S. Shams-ud-din of the Oriental College Lahore
has passed, in the Second Division, the **Entrance Examination** *of the Punjab University, held in May 1885.*

REGISTRAR'S OFFICE:
LAHORE,
The 23rd July 1885.

G. W. Leitner
REGISTRAR,
Punjab University.

The University of the Punjab.

ORIENTAL FACULTY.

SESSION-1888.

This is to certify that Asgar Ali

son of Shamsud-Din and a student of the Oriental College Lahore

has passed, in the Second Division, the Intermediate Examination of the Punjab University held in March, 1888.

Passed also in x Optional Subjects.

SENATE HALL,
LAHORE:
The 26th April 1888

REGISTRAR,
Punjab University.

New Imperial Press, Lahore—14-6-88—100.

The University of the Punjab.

ORIENTAL FACULTY.

SESSION 1889.

This is to certify that Asghar Ali

son of Shamas ud-din and Private student of the Lahore District

has passed the Maulvi Alim (*High Proficiency in Arabic Language, Literature and Law*) *Examination of the Punjab University.*

He stood First in order of merit.

REGISTRAR'S OFFICE:
LAHORE,
The 23rd May 1889.

[signature]
REGISTRAR,
Punjab University.

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB.

ORIENTAL FACULTY

SESSION 1892.

This is to certify that Asghar Ali B.O.L.

son of M. Shams-ud-Din *of the* Oriental College, Lahore

has obtained the Degree of ***MASTER OF ORIENTAL LEARNING*** *in this University at the Examination in the year* 1892, *and that he was placed in the* II *Class.*

Registrar.

Countersigned.

Chancellor of the University of the Punjab.

REGISTRAR'S OFFICE,
LAHORE:

The 11th January 189_

Life And Literary Activities of M. Asghar Ali Ruhi With a Critical Edition of his Arabic Dewan

By

M. Zulfiqar Ali Rana

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. M. Z. Haq Sufi

SUBMITTED TO THE PUNJAB UNIVERSITY AS

A THESIS FOR Ph.D. DEGREE IN ARABIC